معالم القرآن

جلد یازدہم

محمد علی الصدیقی کاندھلوی

ملکیت ——— ادارہ تعلیماتِ قرآن دارالعلوم الشہابیّہ

طابع ——— حافظ شبیر احمد عثمانی

تزئین و آرائش ——— السیّد انور حسین نفیس رقم

کتابت ——— محمد نواز عابد کیلانی حضرت کیلیانوالہ

ناشر ——— قاری عبدالرحمٰن ایم اے

صفحات ——— ۶۷۲

تاریخ اشاعت ——— جنوری ۱۹۹۱ء

مطبع ——— عرفان افضل پریس۔ لاہور

قیمت ——— ۱۲۰/= روپے

ملنے کے پتے

ادارہ تعلیماتِ قرآن۔ دارالعلوم الشہابیہ سیالکوٹ

اسلامی اکادمی۔ ۱۷ اردو بازار۔ لاہور

انتساب

میں معالم القرآن کی جلد یازدہم کو جس میں اسلام کی اجتماعی زندگی کا بھرپور چہرہ پیش کرنے کے بعد دنیا میں اسے قائم کرنے، اس کے لیے محنت کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور بتایا ہے کہ بلکتی انسانیت کے فکری، اخلاقی، مالیاتی معاشی سیاسی اور روحانی بیماریوں کا یہی واحد علاج ہے۔ اور اسلام کے ماننے والوں کے ایمان باللہ کا یہی حقیقی امتحان ہے۔ قابل صد احترام فضیلت مآب الحاج حافظ عبدالرشید خاقان صاحب کے نام سے منسوب کرتا ہوں جن کی اسلام سے مخلصانہ ہمدردی اور اس کے لیے قربانی دریادلی سے یہ جلد یازدہم زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر ہدیہ ناظرین ہو رہی ہے۔

دعا ہے کہ اللہ سبحانہٗ اس جذبہ خیر کو تادیر سلامت رکھے اور ان کے اس مخلصانہ جذبہ سخاوت دنیا و آخرت میں ان کی کامیابی کا بہانہ کر دے۔

(آمین)

قَارِیْ عَبْدُالرَّحْمٰن ایم اے
ناظم ادارہ تعلیماتِ قرآن
دارالعلوم شہابیہ۔ سیالکوٹ

دریا بحباب اندر

حرفِ آغاز

باسمہ سبحانہٗ ....

یہ معالم القرآن کی گیارہویں جلد ہے۔

اگرچہ اس بار کچھ تعلیمی، کچھ انتظامی مصروفیتوں اور کچھ ادھر شعبان کے مہینے میں مجھے عزیز حافظ عبدالرشید خاقان سلمہٗ کی دعوت اہلیہ اور بچی کے ہمراہ کویت کا سفر کرنا پڑا۔ کویت کا یہ سفر پہلے سفروں سے مختلف تھا۔ پہلے کویت کا سفر دارالعلوم الشہابیہ کی خاطر ہوتا تھا لیکن اس بار یہ بات بالکل دھیان میں نہ تھی بلکہ مقصد یہ اور صرف یہ تھا کہ اس بہانے حرمین شریفین زادھا اللہ شرفاً کی زیارت کی سعادت حاصل ہوگی۔ عزیز موصوف کا بھی یہی تاثر تھا کہ ہم تینوں عزیز موصوف کی معیت میں اوّل عمرہ کریں اور پھر حرم طیبہ کی زیارت کی سعادت حاصل کریں۔ گھر سے لے کر گھر تک تمام اخراجات کے لیے عزیز موصوف ہی زیربار ہوئے۔ الحمدللہ مورخہ ۱ر رمضان المبارک کو سیالکوٹ واپسی ہوئی۔ دورانِ سفر عزیز موصوف کے لیے دل کی پہنائیوں سے دعائیں نکلیں۔ اللہ سبحانہٗ ان کو دین و دنیا میں مال و اولاد میں عفو و عافیت سے ہمدوش کرے ان کی کمزوریوں کی پردہ پوشی کرے آگے سے پیچھے سے دائیں اور بائیں سے ان کی حفاظت و نگرانی فرمائے آمین ثم آمین

دورانِ سفر کچھ طبیعت میں ناہمواری آگئی۔ الحمدللہ اس کے باوجود گیارہویں جلد پایۂ تکمیل پہنچ گئی۔

اس جلد میں مجھے جن علمی گہواروں سے استفادہ کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ اُن کے نام یہ ہیں۔

علامہ بقاعی	نظم الدرر
علامہ محمّد طاہر ابن عاشور	التحریر والتنویر
حافظ ابن حجر	فتح الباری
حضرت شاہ ولی اللہ	ازالۃ الخفاء ۔ قرۃ العینین
حافظ ابن تیمیہ	منہاج السنہ
حافظ شمس الدین ذہبی	المنتقیٰ
حافظ ابن القیم	مدارج السالکین

یہ جلد گیارہویں پارے کے مطالب اور تشریحات پر مشتمل ہے۔ گیارہویں پارے میں سورہ برأت کا انجام ہے۔ اور پوری سورہ یونس ہے۔

سورہ برأت کے تمام مطالب اس وقت تک واضح نہیں ہو سکتے۔ جب تک یہ حقیقت پیش نظر نہ ہو کہ یہ اُمت کے نام ایک ودائی اور آخری پیغام ہے۔ اور مقصود مستقبل میں پیش آنے والے حالات و معاملات کے لیے راہنمائی ہے۔

اجتماعی ڈھانچہ میں جس قدر مخلصین کا تناسب صحیح ہو گا۔ اسی قدر اسلام کا نظام اجتماعی، نظام سیاسی اور نظام قانون مضبوط بنیادوں پر استوار ہو گا۔ مخلصین سے مراد یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں ایسے افراد ہوں جو.......

۱ اپنی لغزشوں اور خطاؤں پر نادم ہو کر توبہ کرنے والے ہوں۔

۲ اللہ سبحانہ، سے عابدانہ تعلقات میں سرگرم ہوں۔

۳ زبانیں حمد الٰہی کے ترانوں سے زمزمہ سنج ہوں۔

۴ گھروں میں بیٹھنے والے نہیں، سیر و سیاحت کرنے والے ہوں۔

۵ رکوع و سجود میں اللہ کے سامنے جھکنے والے ہوں۔

۶ پورے عالم میں نیکی کا حکم دینے والے برائی سے روکنے والے ہوں۔

۷ اللہ کی حد بندیوں کی اپنی پوری زندگی میں حفاظت کرنے والے ہوں۔

اجتماعی زندگی میں وہ لوگ ہیں۔ جن کے بارے میں اللہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دے دیا۔ وبشر المومنین، ان مومنوں کو کامیابی کی خوشخبری دے دو۔

اس بات کا بھی مستقبل کے حالات و معاملات سے تعلق ہے۔ کہ کسی بھی نظام کا دارومدار اس پر ہوتا ہے۔ کہ اس کے ماننے والوں میں اس کے جاننے والوں کی عددی طاقت کتنی ہے۔ اگر سو مانتے ہیں۔ اور ننانوے اس نظام سے آشنا نہیں ہیں۔ تو ایک کے جاننے سے نظام، نظام کی حیثیت سے انسانی زندگی میں قائم نہیں رہ سکتا۔ جیسے نظام کی کامیابی کے لیے قربانی اور فداکاری اہم تقاضا ہے۔ ٹھیک اسی طرح کسی بھی نظام کی کامیابی کے لیے اس کی پشت پر ایک نظام تعلیم و تعلم بھی سب سے اہم اور بنیادی تقاضا ہے۔ گویا۔ فلولا نفر من کل فرقۃ طائفۃ لیتفقھوا فی الدین۔ میں یہ کھلا اشارہ ہے کہ دوسرے نظاموں کی طرح اسلامی نظام کی کامیابی کی اہم اور بنیادی شرط یہ ہے کہ اس کی پشت پر پرائمری اسکول سے لے کر گریجویشن تک اسلامی تعلیم کا مکمل نظام ہو۔ اور اس میں اسلام کے ماننے والوں

کو ہر پہلو سے پہلے اسلام سے آشنا بنایا جائے۔ اور ایک مکمل نظام زندگی کی حیثیت سے ....
اسلام کے روحانی نظام، اخلاقی نظام، عائلی نظام، معاشرتی نظام، معاشی نظام، سیاسی نظام اور قانونی نظام سے آشنا کیا جائے، یہ اور اس قسم کے مسائل سے سورہ برأت کے انجام میں بحث کی گئی ہے۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ یہ پوری سورۃ اُمت کے نام بحیثیت اُمت پوری زندگی کے حالات و معاملات کے لیے اللہ سبحانہٗ کا دوامی پیغام ہے۔

اس امت کو امت ہونے کی حیثیت میں اس کی عالمی اور جہانی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا گیا ہے۔

انفروا خفافا وثقالا وجاھدوا باموالکم وانفسکم فی
سبیل اللہ ذالکم خیر لکم ان کنتم تعلمون

مسلمانو: ہلکے ہو یا بوجھل گھروں سے نکلو اور اپنی جانیں اور اموال اللہ کی راہ میں تج کر دو یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ ......

ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسھم واموالھم
بان لھم الجنۃ

اس کے بعد البقرہ کی آیت ذیل بھی پڑھیے۔

وکذالک جعلناکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء
علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا

اس کا صاف اور واضح مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ نبی و رسول ہونے کی حیثیت میں جو کام نبوت کے سپرد کیا گیا۔ وہ نبوت کے دنیا سے روانہ ہونے کے بعد امت کے سپرد کیا گیا ہے۔ اب اس نبوت والے کام کو امت کو کرنا ہے۔ اس اعتبار سے اس امت کی حیثیت دوسرے نبیوں کی امتوں سے الگ ہے۔ پچھلی اُمتیں اگر صرف ایک ذمہ داری رکھتی رہی ہیں۔ اور وہ یہ کہ اپنے دین کی مخلصانہ پیروی کریں۔ تو امت مسلمہ اس عام ذمہ داری کے ساتھ ساتھ ایک ذمہ داری یہ بھی رکھتی ہے۔ کہ بیرونی دنیا کے سامنے اسلام کی اس طرح گواہی دے جس طرح گواہی دینے کا حق ہے۔

دراصل اس معاملے میں صورت واقعہ ہی یہ اور صرف یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ

علیہ وسلم اگرچہ پوری دنیا کے لیے نبی و رسول تھے ۔ اور قیامت تک کے لیے تھے ۔لیکن اس عالمگیر دعوت کے مسلسل جاری رہنے کی عملی شکل اللہ تعالیٰ نے یہ ...... متعین فرمائی تھی اور فطری طور بھی ممکن یہی تھی ۔ کہ آپ اپنا قائمقام ایسا گروہ تیار کردیں ۔ جو اپنے ایمان میں اتنا پختہ اور اپنے عمل میں اتنا معیاری مسلمان ہو کہ وہ آپ کے بعد آپ ہی کی طرح دنیا میں اسلام کی شہادت کا فرض انجام دے سکے ۔ سورہ برأت کے آخر میں قرآن نے اس آیت میں اسی گروہ کا چہرہ پیش کیا ہے۔ والسابقون الاولون من المھاجرین والانصار اور پھر یہ گروہ اپنے بعد کی نسل کو تیار کرے اور یہ سلسلہ آخر تک چلتا رہے ۔قرآن نے والذین اتبعوھم باحسان میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے ۔

اس طرح حقیقت واقعی یہ قرار پائی ہے ۔ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتیں دو ہیں ۔ آپ کی بعثت اہل عرب کی طرف تو براہ راست تھی ۔ مگر باقی دنیا کی طرف اس گروہ .... السابقون الاولون من المھاجرین والانصار والذین اتبعوھم باحسان کے توسط سے تھی ۔ جسے آپ تیار کر گئے تھے ۔ اور جو نسلاً بعد نسل تیار ہوتی رہے گی ۔ جسے قرآن نے رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ، کا سرٹیفکیٹ دیا ہے ۔

اس فکر سے اب سورہ برأت کا مطالعہ کریں گے تو آپ محسوس کریں گے کہ یہ امت کے نام ودائی پیغام ہے اور اسے اس کی یہ ذمہ داری بتانے کے لیے ہے کہ یہ ذمہ داری کوئی معمولی ذمہ داری نہیں ہے ، بلکہ اتنی بڑی اور ہمہ گیر ذمہ داری ہے کہ یہی اس کے وجود کا کل مقصد ہے ۔ اللہ سبحانہ، کا یہ ارشاد ان اللہ اشتریٰ من المومنین الخ اس امت کی یہ حیثیت صاف طور پر مقرر کر رہا ہے ۔

آیئے ذرا سورہ یونس کے موضوع کی تفصیلات پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے ۔ اس سورۃ میں مخاطب مشرکین ہیں ۔ اور سارے مخاطبات کا مرکز توحید ، عبادت ، وحی ، نبوّت اور تذکیر بالآخرۃ ہے ۔

توحید ربوبیت سے توحید الوہیت پر استدلال ہے ۔ اس بات کو مختلف طریقوں سے پوری سورۃ میں پیش کیا گیا ہے ۔کہیں ارشاد ہوا ہے ۔ ذالکم اللہ ربکم فاعبدوہ ۔ پھر دوسرے رکوع میں اسی بات کو اس طرح پیش کیا ہے ۔ ویعبدون من دون اللہ ۔ اس کے بعد پھر چوتھے رکوع میں قل من یرزقکم من السماء

والارض ۔ آیت ہے ۔ اس کی تعبیر بدل کر پھر توحید ربوبیت سے توحید الوہیت پر استدلال ہے ۔ اس کے بعد ساتویں رکوع میں اسی بات کو ایک نئے انداز میں پیش کیا ہے ۔ ما یتبع الذین یدعون من دون اللّٰہ شرکاء ۔ ایک خاص وجدانی دلیل پیش کرکے توحید الوہیت کو ثابت کیا ہے ۔ پھر آخری رکوع میں توحید الوہیت یعنی صرف اللّٰہ سبحانہٗ سے عابدانہ تعلقات قائم رکھنے کو کھول کر پیش کیا ہے ۔ استدلال یہ ہے کہ وہ ذات جس کے قبضے میں تمہاری جان ہے ۔ جو تم پر ایسا مکمل حاکمانہ اقتدار رکھتا ہے کہ جب تک اس کی مرضی ہو اسی وقت تک تم جی سکتے ہو ۔ میں صرف اسی کی عبادت کرتا ہوں ۔

وحی ونبوت کے سلسلے میں مشرکین کے اس استعجاب کا ذکر کیا کہ ایک آدمی اللّٰہ کا رسول ہوکر آیا ۔ ایک طرف رسول کی بشریت کی آڑ میں رسالت کا انکار کرے ۔ دوسری طرف یہ بھی دیکھنے کہ یہ آدمی تو ہے ۔ مگر اور آدمیوں کی طرح نہیں ہے ۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے ۔ جب کچھ بن نہ پڑتا تو کہتے کہ یہ جادوگر ہے ۔

مشرکین عرب نبوّت کی صداقت وفضیلت سے انکار نہیں کر سکتے تھے ۔ اس لیے دوسرے رکوع میں صداقت نبوت کی سب سے زیادہ کھلی اور واضح دلیل پیش کی ۔ فقد لبثت عمرا من قبلہ ۔ ساری باتیں چھوڑ کر صرف اس بات پر غور کرو کہ میں تم ہی میں سے ہوں اور دعویٰ نبوت سے پہلے پوری عمر تم میں گزار چکا ہوں ۔ یعنی چالیس برس تک ۔ اس تمام مدّت میں میری زندگی تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے ۔ بتلاؤ اس تمام عرصہ میں کوئی بات بھی تم نے سچائی اور امانت کے خلاف دیکھی ہے ۔ تمام علمائے اخلاق ونفسیات اس پر متفق ہیں ۔ کہ انسان کی عمر میں ابتدائی چالیس سال کا زمانہ اس کے اخلاق وخصائل بننے کا زمانہ ہے ۔ اگر ایک شخص چالیس سال کی عمر تک صادق وامین رہا ہے ۔ تو کیا یہ ہوسکتا ہے ۔ کہ چالیس سال گزرتے ہی ایسا کذاب و مفتری ہو جائے کہ انسانوں پر ہی نہیں بلکہ اللّٰہ سبحانہٗ پر افترا کرنے لگے ۔ یہ ایک واقعاتی استشہاد ہے

چوتھے رکوع میں نبوت کی صداقت کے لیے اعجاز قرآن سے استدلال کیا ہے اور اس استدلال میں کہا گیا ہے ۔ کہ اگر میں اس دعوے میں مفتری ہوں کہ یہ قرآن میرا ساختہ پرداختہ بلکہ لاریب فیہ من رب العالمین تو آؤ تم بھی اس جیسی ایک صورت بنا کر لے آؤ ۔ فاتوا بسورۃ من مثلہ ۔

پانچویں رکوع کی آخری آیت میں دعویٰ نبوّت کی صداقت کو قسم کھا کر پیش کیا ہے ۔ ایسے لوگ

پہنچائے جو منکر تو نہ تھے۔ مگر تصدیق میں شامل تھے۔ وہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت و امانت کو دیکھتے تو اندر ہی اندر کہتے کہ سچے آدمی کی زبان سے جھوٹی بات نہیں نکل سکتی لیکن جب دیکھتے کہ ان کی دعوت ایسی باتوں کا یقین دلاتی ہے۔ جن سے ان کے آباؤ اجداد یکسر نا آشنا تھے۔ تو حیرت کا شکار ہو کر دریافت کرتے۔ احق ہو۔ کیا فی الواقع ایسا ہی ہے۔ جیسے تم کہہ رہے ہو۔ جواب میں ارشاد ہوا۔ ای وربی انہ الحق۔

قرآن کا عام انداز یہ ہے۔ کہ پہلے وجدانی دلائل بیان کرتا ہے۔ پھر واقعات و شواہد سے استدلال کرتا ہے۔ یہاں بھی قرآن نے نبوت کی صداقت کے لیے حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ کی تاریخی داستان سے استشہاد کیا ہے۔

آخر میں نبوت کے موضوع دو ٹوک فیصلہ سُنا دیا۔ قد جاءکم الحق

اس سورۃ میں تیسری بات تذکیر بالآخرۃ ہے۔ پہلے رکوع میں نشاۃ اولیٰ سے نشاۃ ثانیہ پر استدلال کیا گیا ہے اور فرمایا کہ اگر پہلی پیدائش کو مانتے ہو تو دوسری پیدائش پر کیوں حیران ہو؟ اور بتایا کہ دوسری زندگی اس لیے ضروری ہے۔ کہ جزا و عمل کے قانون کا تقاضا ہے۔ کہ جس طرح ایک زندگی آزمائش عمل کے لیے ہو۔ اسی طرح ایک زندگی جزائے عمل کے لیے ہو۔

تیسرے رکوع میں آخرت کی زندگی میں کامیاب اور ناکام کا تقابلی مطالعہ بڑے لطیف انداز میں پیش فرمایا ہے۔ للذین احسنوا الحسنیٰ وزیادۃ۔ بتایا ہے کہ آخرت کی زندگی ایسی زندگی ہے۔ جس میں اس موجودہ زندگی میں ہونیوالے اعمال کے نتائج پیش آئیں گے۔ اچھے بُرے نتائج کس شکل میں پیش آئیں گے۔ نیک عمل انسان اصحاب حقیقت میں ان کے لیے بہشتی زندگی کی خوشحالیاں ہیں۔ اور دیدار الٰہی کی دائمی نعمت ان کے چہروں پر نہ تو آدمی کی سیاہی ہوگی نہ ذلت کا اثر نمایاں ہوگا۔ بدعمل انسان دوزخ کے باسی ہیں۔ ان کے لیے دوزخی زندگی کی بدحالیاں ہوں گی۔ ان پر خواری چھائی ہوگی۔ ان کے چہروں پر کالک اس طرح چھا جائے گی۔ جیسے اندھیری رات کے ٹکڑے چہرے پر پڑ گئے ہوں۔

یہ سورت یونس کا پیغام اور پیغام کا خلاصہ اور لب لباب

مقدمہ

باسمہ سبحانہٗ

گیارہویں پارے کا آغاز سورہ توبہ کا انجام ہے! انجام صرف ۴ رکوع پر مشتمل ہے۔ اس سے پہلے ان لوگوں کا ذکر تھا۔ جو وقت کے تقاضوں کا جواب نہ دے سکے۔ یعنی غزوۂ تبوک میں شرکت کی سعادت سے ہمدوش نہ ہوئے۔

درمیان میں بتایا کہ امت کے بہترین طبقے تین ہیں۔

مہاجرین میں سے السابقون الاولون

انصار میں سے السابقون الاولون

وہ لوگ جنہوں نے راست بازی کے ساتھ ان کی پیروی کی اور ان کے قدم بقدم چلے۔

قرآن کا اعلان ہے کہ السابقون الاولون مہاجرین اور انصار ...... دونوں میں سے ہیں۔ اس لیے السابقون الاولون عقبہ ثالثہ تک کو محیط ہے۔

دعوت کے دو دور ہیں۔ ایک پوشیدہ دوسرا علانیہ۔ پوشیدہ دعوت کا دور وہ ہے جو دار ارقم کے بعد ہے۔

حافظ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں السابقون الاوّن کے عنوانؒ میں یہ نام لکھے ہیں۔

۱۔ خدیجہؓ بنت خویلد	۷۔ سعد بن ابی وقاصؓ	۱۳۔ عثمان بن مظعونؓ
۲۔ علیؓ بن ابی طالب	۸۔ طلحہ بن عبداللہؓ	۱۴۔ عبیدۃ ابن الحارثؓ
۳۔ ابوبکر الصدیقؓ	۹۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ	۱۵۔ سعید بن زیدؓ
۴۔ زید بن حارثہؓ	۱۰۔ ابوعبیدہ ابن الجراحؓ	۱۶۔ اسماء بنت ابوبکرؓ
۵۔ عثمان بن عفانؓ	۱۱۔ ابوسلمہ ابن عبدالاسدؓ	۱۷۔ خباب بن الارتؓ
۶۔ الزبیر بن العوامؓ	۱۲۔ الارقم بن الارقمؓ	۱۸۔ عمیر بن ابی وقاصؓ

۱۹ - عبداللہ بن مسعودؓ
۲۰ - مسعود بن ربیعہؓ
۲۱ - سلیط بن عمروؓ
۲۲ - عیاش بن ربیعہؓ
۲۳ - اسماء بنت سلامہؓ
۲۴ - خنیس بن حذافہؓ
۲۵ - عامر بن ربیعہؓ
۲۶ - عبداللہ بن جحشؓ
۲۷ - جعفر بن ابی طالبؓ
۲۸ - اسماء بنت عمیسؓ
۲۹ - حاطب بن الحارثؓ
۳۰ - فاطمہ عامریہؓ
۳۱ - خطاب عامریؓ
۳۲ - فکیہہ بنت یسارؓ
۳۳ - معمر بن الحارثؓ
۳۴ - السائب بن عثمانؓ
۳۵ - المطلب بن ازہرؓ
۳۶ - رملہ بنت ابی عوفؓ
۳۷ - النحام نعیم بن عبداللہؓ
۳۸ - عامر بن فہیدہؓ
۳۹ - خالد بن سعیدؓ
۴۰ - امیمہ بنت خلفؓ
۴۱ - حاطب بن عمرو العامریؓ
۴۲ - ابوحذیفہ بن عتبہؓ
۴۳ - واقد بن عبداللہؓ
۴۴ - خالد ابن البکیر
۴۵ - عاقل البکیر
۴۶ - ایاس البکیر
۴۷ - عمار بن یاسرؓ
۴۸ - صہیب بن سنانؓ
۴۹ - ابوذر جندب بن جنادہؓ
۵۰ - ابونجیح عمرو بن عبسہؓ
۵۱ - حمزہ ابن عبدالمطلبؓ
۵۲ - عمر بن الخطابؓ
۵۳ - مصعب بن عمیرؓ
۵۴ - عثمان ابن مظعونؓ
۵۵ - قدامہ ابن مظعونؓ
۵۶ - سالم مولی ابی حذیفہؓ

یہ مہاجرین میں سے السابقون الاولون کے وہ نام ہیں۔ جن کی تفصیل حافظ ذہبیؒ نے سیر اعلام النبلاء میں ص۱۴۴ سے ص۲۰۰ تک دی ہے۔ ان کے علاوہ انصار ہیں وہ سب السابقون الاولون میں داخل ہیں۔ جو عقبہ اولیٰ، عقبہ ثالثہ میں نعمت ایمان سے مالامال ہوئے ہیں۔ ان کے ناموں کی فہرست حافظ ابن حزم محدث نے جامع السیرۃ میں ص۶۹ سے ص۸۵ تک دی ہے۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ السابقون الاولون صرف وہ نہیں ہیں۔ جو دار ارقم میں داخلہ سے پہلے مسلمان ہوئے تھے۔ اس قید کے ساتھ انصار السابقون الاولون میں داخل نہ ہوں گے۔ حالانکہ قرآن کا یہ صاف اعلان ہے کہ السابقون الاولون مہاجرین وانصار میں سے ہیں۔

انصار کی آمد ۱۱ سنہ ہجری میں شروع ہوتی ہے۔

علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں۔

انصار سے مراد عقبہ اولیٰ والے ہیں۔ یہ ۱۱ سنہ نبوت میں آئے۔ ان کی تعداد سات ۷ ہے۔ اور پھر عقبہ ثانیہ والے ہیں۔ یہ ۱۲ سنہ میں آئے۔ یہ تعداد میں ستر مرد اور دو عورتیں ہیں کچھ کے خیال میں عقبہ میں تین بار بیعت ہوئی ہے۔ اور کچھ کی رائے میں ایک عقبہ میں صرف دو بیعتیں ہوئی ہیں۔

اصل میں تو مدینہ والوں کے لیے دعوت کا آغاز عقبہ اولیٰ کی بیعت سے پہلے ہو چکا تھا۔ اس سلسلے میں اوّلین نام سوید بن الصامت کا آیا ہے۔ سوید بن الصامت شجاعت اور شعر گوئی میں اُونچے درجہ کی شخصیت تھی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی آمد کا علم ہوا۔ تو آپ نے اس کے ڈیرے پر پہنچ کر اسے اسلام کی دعوت دی۔

اس کے بعد قبیلہ اوس نے خانہ جنگی کے بعد خزرج سے شکست کھائی تو اوس نے ایک وفد مکۃ المکرمہ روانہ کیا تاکہ قریش سے حلیفانہ روابط ہوں۔ اس وفد کی سربراہی ابوالحیر انیس بن رافع کر رہا تھا۔ اس وفد میں بنو عبدالاشہل کا ایک نوجوان ایاس بن معاذ بھی شامل تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد کو دعوت اسلام دی۔ ایاس بن معاذ دہان نبوت سے نکلی ہوئی آواز سن کر بول پڑا۔ بھائیو؟۔ ہمارے لیے یہ دعوت اس کام سے بہتر ہے۔ جس کے لیے ہم یہاں آئے ہیں۔ ابوالحیر نے ایاس بن معاذ کو جھڑک دیا۔ ایاس بن معاذ خاموش ہو گیا۔ یہ جنگ بعاث سے پہلے کا واقعہ ہے۔ یہ دونوں واقعے ابتدائی مرحلے سے آگے نہ بڑھے۔

سنہ ۱۱ نبوت کے موسم حج میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم معمول کے مطابق دعوت کے لیے نکلے۔ عقبہ میں پہنچے جو حرا نامی پہاڑ اور منیٰ کے درمیان ہے۔ چند افراد سامنے آئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ خزرجی ہیں۔ فرمایا۔ آپ لوگ بیٹھ کر میری کچھ باتیں سُن سکتے ہیں۔ وہ بیٹھ گئے تو آپ نے اسلام کی دعوت دی۔ ان کی تعداد چھ تھی۔ ان کے نام یہ ہیں۔

۱۔ ابو امامہ السعد بن زرارہؓ	۳۔ رافع بن مالکؓ	۵۔ عقبہ بن عامرؓ
۲۔ عوف بن حارثؓ	۴۔ قطبہ بن عامرؓ	۶۔ جابر بن عبداللہؓ

ان کے ذریعے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مدینہ میں اوس وخزرج تک پہنچ گیا۔

سنہ ۱۲ نبوت میں اسی گھاٹی میں اوس وخزرج کے بارہ حضرات نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی۔ ان بارہ میں پانچ وہی تھے۔ جو گزشتہ سال آئے تھے جابر بن عبداللہؓ کسی وجہ سے نہیں آسکے۔ باقی سات آدمیوں کے نام یہ ہیں۔

۱۔ معاذ بن حارثؓ	۴۔ ابو عبدالرحمٰن یزید بن ثعلبہؓ	۷۔ عویم بن ساعدہؓ
۲۔ زکوان بن عبد قیسؓ	۵۔ عباس بن عبادہؓ	
۳۔ عبادہ ابن الصامت	۶۔ ابوالہیثم مالک بن تیہانؓ	

بیعت کے بعد ان ساتھیوں نے یہ درخواست بھی کی۔ کہ ہمارے ساتھ کوئی معلم روانہ کریجئے چنانچہ حضرت مصعب بن عمیرؓ کو ان کے ساتھ روانہ کر دیا۔ حضرت مصعب ابوامامہ السعد بن زرارہ کے گھر فروکش ہوئے۔ ان کی محنت سے گھر گھر اسلام کا چرچا ہو گیا۔ یہاں تک کہ اوس کا ایک قبیلہ بنی عبدالاشہل ایک دن میں مسلمان ہو گیا۔

سنہ ۱۳ نبوت کے حج میں مدینہ سے ۷۳، حضرات مکہ مکرمہ آئے۔ ان میں دو عورتیں بھی تھیں، حافظ ابن حزم نے جامع السیر میں ان سب کو نام بنام لکھا ہے۔ اسی موقعہ پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہی حضرات میں سے بارہ حضرات کو نقیب مقرر فرمایا۔

۱۔ السعد بن زرارہؓ	۵۔ سعد بن عبادہؓ	۹۔ رافع بن مالکؓ
۲۔ عبداللہ بن رواحہؓ	۶۔ برار بن معرورؓ	۱۰۔ عبداللہ بن عمروؓ
۳۔ اُسید بن الحضیرؓ	۷۔ سعد ابن الربیعؓ	۱۱۔ سعد بن خیثمہؓ
۴۔ ابوالہیثم مالک بن تیہانؓ	۸۔ عبادۃ ابن الصامتؓ	۱۲۔ منذر بن عمروؓ

یہ ہیں۔ السابقون الاوّلون من المہاجرین والانصار

علامہ آلوسیؒ حمید بن زیاد اور مشہور مفسر قرآن محمد بن کعب القرظی کا یہ مکالمہ اسی آیت کی تشریح میں نقل کیا ہے۔

حمید۔ صحابہ کے باہمی تنازعات کو پیش نظر رکھ کر آپ مجھے صحابہ کرام کے بارے میں تناظر ہی بتایئے۔

محمد بن کعب۔ قرآن میں اللہ سبحانہٗ نے سارے صحابہ کرام کو مغفرت کا پروانہ دیا ہے۔ اور سب کے لیے جنتی ہونے کا اعلان بھی کیا ہے۔

حمید بن زیاد۔ کہاں

محمد بن کعب۔ تم نے قرآن میں یہ آیت نہیں پڑھی ہے۔ والسابقون الاولون من المہاجرین والانصار اس آیت میں سارے صحابہ مہاجرین وانصار کے مغفور، مرضی اور جنتی ہونے کا اعلان ہے۔ صحابہ کے بعد آنے والے مسلمانوں کے لیے جنتی ہونے کی شرط بھی اس آیت میں ہے۔

حمید بن زیاد۔ شرط کیا ہے؟

محمد بن کعب۔ قیامت تک آنے والے مسلمانوں کے لیے جنتی ہونے کی شرط یہ

ہے۔کہ وہ مہاجرین و انصار کی خوبی کے ساتھ پیروکار ہوں۔ یعنی ان کے اعمال حسنہ میں ان کی پیروی کریں۔ یا مطلب یہ ہے کہ گفتار ان کی خوبی سے ذکر کریں۔ برائی سے گریز کریں اور ان کے کردار پر ناقدانہ نظر سے بچ کر رہیں۔

حمید بن زیاد۔ ان کی تقریر سن کر مجھے محسوس ہوا۔ کہ گویا یہ آیت گرامی اس سے پہلے پڑھی ہی نہ تھی آج ہی پڑھی ہے۔

پارہ یازدہم ایک نظر میں

توحید

رسالت

قرآن کا چہرہ

صحابہ کرام کا چہرہ

اجتماعی قوانین

سیاسی قوانین

مالیاتی قوانین

اخلاقی قوانین

دفاعی قوانین

معاشرتی قوانین

دستوری واقعات

اللہ سبحانہٗ کی صفات

آخرت کی زندگی

اصطلاحاتِ قرآنی

قربۃ: اسی کی جمع قربات آتی ہے۔ اسم مصدر ہے مرتبہ کا قرب، خوشنودی، رضا و راغب مراد خوشنودی حاصل ہونے کا ذریعہ۔ جیسے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا۔ اللہ سبحانہٗ کی خوشنودی اور رضا حاصل ہونے کا ذریعہ ہے۔ اس سے قربان قربانی کو کہتے ہیں یعنی وہ چیز جو اللہ سے قرب کا ذریعہ ہو۔ قربان الملک وہ شخص جو خدمت کے ذریعے بادشاہ کا قرب حاصل کرے۔ علامہ مجدالدین فیروز آبادی بصائر میں لکھتے ہیں۔

کہ بندے سے اللہ کا قرب یہ ہے کہ بندے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا فیضان ہوں یہ قرب روحانی ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد میں اسی روحانی قرب کی نشاندہی فرمائی ہے اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے۔ کہ جو میرے سے ایک بالشت قریب ہوتا ہے۔ میں اس سے ایک ہاتھ قریب ہوتا ہوں۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے سورت مزمل کی تشریحات میں لکھا ہے۔

کہ اللہ سبحانہٗ جسم اور جسمانیت سے بالکل پاک ہے اس لیے اس کا قرب مکانی نہیں۔

اس لیے بندے کا اللہ سے قرب یہی ہے۔ کہ اسے یاد کرئے جگر مراد آبادی نے کیا خوب کہا ہے۔

نہ غرض کسی سے نہ واسطہ مجھے کام اپنے ہی کام سے
تیرے ذکر سے تیرے فکر سے تیری یاد سے تیرے نام سے

احسان: عربی میں احسان کے معنیٰ اچھا کام کرنے اور کسی کام کو اچھے طریقے سے کرنے کے

ہیں۔ اردو میں جن معنوں میں ہم احسان بولتے ہیں۔ عربی میں جب خاص وہ معنیٰ ہوں گے۔ تو اس کا استعمال الی یا باء کے ساتھ ہوگا۔ جیسے وبالوالدین احسانا اور کما احسن اللہ الیک۔ اور جہاں متعدی بغیر صلہ کے آئے گا۔ وہاں معنیٰ...... حسن کاری کرنے اور حسن پیدا کرنے کے ہوں گے۔ قرآن میں محسن اور محسنین کا لفظ بغیر صلہ کے آیا ہے۔ وہاں معنیٰ یہی ہیں کہ وہ اپنے ایمان وعمل میں حسن کار واقع ہوئے ہیں۔ یعنی ایمان وعمل کے ادنیٰ درجے پر قانع نہیں بلکہ ان کے حسن کا جو درجہ ہے۔ اس کے حصول میں کوشاں ہیں۔ لہٰذا المحسنون اہل ایمان کا وہ طبقہ ہے۔ جو زندگی کے تمام شعبوں میں حسن کاری کو پسند کرتا ہو۔ ان حسن کاروں کو اگر جمال مطلق کی محبوبیت کا مقام اگر حاصل ہو۔ جس کا للذین احسنوا الحسنیٰ و زیادہ میں اعلان کیا گیا ہے۔ تو اپنی محنت ومشقت کی بنیاد پر یقیناً وہ اس کے مستحق ہیں۔

ٹھہر جائیے سر رہے معاملہ کے اس پہلو پر بھی غور کیجئے کہ قرآن عزیز نے انسانیت کو عدل واحسان کی تعلیم دی ہے۔ جو کہ اصولی تعلیم ہے۔ عدل کے معنیٰ برابری کے ہیں۔ یعنی جو شخص کسی کے ساتھ برائی کرے اس کی ساتھ اتنی ہی برائی کی جائے۔ یہ عدل ہے اور عدل میں حسن کاری یہ ہے کہ اسے معاف کر دیا جائے۔ دونوں کے مراتب الگ الگ ہیں۔ عدل قانون ہے۔ اور احسان اخلاق ہے۔ قانونِ عدل کو قرآن نے جماعت کے ہاتھ میں دیا ہے، جبکہ احسان ہر شخص کا کام ہے۔ اسلام کی یہی شان جامعیت ہے۔

بیع:۔ اس کے معنیٰ علامہ مجدالدین فیروز آبادی نے بصائر میں قیمت لے کر دینے کے لکھے ہیں۔ اور چیز لے کر قیمت دینے کو شراء کہتے ہیں.... کبھی بیع شراء کے معنیٰ میں اور کبھی شراء بیع کے معنیٰ میں آتا ہے۔ آیت میں اشتراٰی اور بیع دونوں لفظ آئے ہیں۔ یہ گویا خرید وفروخت والا معاملہ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ اور اہل ایمان کے درمیان میں طے پایا ہے۔ اب نہ بیچنے والا اپنی مایہ واپس لے سکتا ہے۔ نہ خرید نے والا قیمت لوٹائے گا۔ چونکہ مقصود اس انداز تعبیر سے اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم کا اظہار ہے۔ اس لیے معاملے کو اللہ سبحانہٗ نے۔ ان اللہ اشتریٰ کہہ کر اپنی طرف سے شروع کیا ہے نہ کہ بیچنے والوں کی طرف سے یعنی تعبیر یہ اختیار نہ کی۔ ان المومنین باعوا انفسھم واموالھم بلکہ فرمایا ان اللہ اشتریٰ الخ اس انداز سے اشارہ کر دیا۔ کہ معاملہ کی طلب اللہ سبحانہٗ کی جانب سے

ہوئی ہے۔ حالانکہ اللہ سبحانہٗ کی ذات اقدس ہر قسم کی طلب و احتیاج سے پاک ہے۔

صادق:۔ صدق سے اسم فاعل صادق سے جمع ہے۔ سچے، راستباز، نیک نام مصدر صدق ہے۔ صدق یصدق۔ اس کے معنیٰ لغت میں سچ کہنے اور سچ کر دکھانے کے ہیں۔ اور چونکہ یہ ذکرِ خیر کا سبب ہے۔ اس لیے مجازاً نیک نام کو بھی صادق کہتے ہیں۔ امام راغب فرماتے ہیں۔

> صدق اور کذب دونوں کا تعلق قول سے ہے۔ خواہ وہ ماضی ہو یا مستقبل وعدہ ہو یا غیر وعدہ اور مراد اولیٰ میں یہ دونوں قول کے علاوہ اور کسی کے لیے نہیں آئے اور ان میں بھی صرف خبر میں ہی ہوتے ہیں۔ اس کے سوا اصناف کلام میں سے اور کسی میں نہیں ہوتے۔ اسی لیے ارشاد ہے۔ ومن اصدق من اللہ قیلا۔ اور انہ کان صادق الوعد ان بالعرض ضمنی طور پر دیگر انواع کلام میں بھی آتا ہے۔ نیز صدق کے معنیٰ ہیں۔ ضمیر یعنی دل اور مخبر عنہٗ دونوں سے قول کے مطابق ہونا۔۔۔ نیز ہر وہ فعل جس میں ظاہری یا باطنی فضیلت ہو۔ اسے صدق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جو فعل اس صفت سے موصوف ہوتا ہے۔ اس کی اس کی طرف اضافت کردی جاتی ہے۔ جیسے ان لھم قدم صدق عند ربھم اور ادخلنی مدخل صدق

قرآن میں سچائی کی اہمیت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ صرف سچائی اختیار کرنے ہی کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ یہ بھی تاکید آئی ہے۔ کہ ہمیشہ سچوں کا ساتھ دو۔ سچوں ہی کی جماعت سے علاقہ اور رابطہ رکھو۔ اور ان ہی کی صحبت میں رہو۔ سچائی کے معنیٰ عام طور پر سچ بولنے کے سمجھے جاتے ہیں۔ مگر قرآن میں اس کے بڑے وسیع معنیٰ ہیں۔ جس کے لحاظ سے اس کے اندر اکیلے قول ہی نہیں۔ بلکہ عمل کی بھی ہر سچائی داخل ہے۔ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں بڑی باریک بینی سے اس کی چھ قسمیں کی ہیں۔ اور ہر ایک کے معنیٰ بتائے ہیں۔

> بات میں سچائی۔ ارادہ اور نیت میں سچائی، عزم میں سچائی، عزم کو پورا کرنے میں سچائی، عمل میں سچائی، اور دینداری کے مقامات اور مراتب میں سچائی۔

لیکن ذرا معنیٰ میں وسعت دیجئے۔ تو اس کی تین ہی قسموں میں ساری سچائیاں آجاتی ہیں۔ یعنی زبان کی سچائی۔ دل کی سچائی اور عمل کی سچائی۔

تفقہ :۔ یہ فقہ سے باب تفعل ہے۔ تفقہ یتفقہ۔ اس باب کا خاصہ مبالغہ ہے۔ فقہ ثلاثی مجرد کے باب سمع سے آتا ہے۔ اس کے معنیٰ سمجھنے کے ہیں۔ راغب اصفہانی کہتے ہیں۔

کہ علم شاہد کے ذریعہ علم غائب تک پہنچنے کا نام فقہ ہے لہذا فقہ علم سے خاص ہے۔

اور اصطلاح میں فقہ احکام شریعت کے علم کو کہتے ہیں۔ سمجھنے کے معنیٰ میں ہو۔ تو باب سمع سے آتا ہے۔ اور مصدر فقہ آتا ہے۔ اور جب دوسرے معنیٰ میں ہو۔ تو مصدر فقاہت آتا ہے۔ اور باب کرم سے استعمال ہوتا ہے۔

فقہاء کی اصطلاحی زبان میں عملی زندگی میں قانونی ضوابط کو دلائل کے ساتھ جاننے کا نام فقہ ہے۔ اس معنیٰ کے اعتبار سے فقہ ایک علمی صفت ہے۔ اور اس کا موصوف فقیہ ہے اس کی جمع فقہاء ہے۔ ضوابط سے مراد وہ احکام ہیں۔ جو اوامر و نواہی کی صورت میں انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے صراحۃً یا دلالۃً راہ نبوت سے آئے ہوں۔ عملی زندگی کی قید سے فکری و اعتقادی مسائل نکل گئے۔ ایمان اور اس کے متعلقات کا محل فقہ نہیں علم کلام ہے۔ گویا فقہ کی آغوش میں بیک وقت دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک احکام دوسرے احکام کا علم جیسے احکام کو فقہ کہتے ہیں۔ ایسے ہی احکام کے علم کو بھی فقہ کہتے ہیں۔ اسی لیے فقہ کی تعریف میں اہل علم میں تعبیری اختلاف ہے۔ مشہور فقیہ علامہ ابن نجیم نے اصولیین کی طرف منسوب کر کے یہ تعریف لکھی ہے۔

فقہ نام ہے۔ احکام شرعیہ عملیہ کو دلائل کے ساتھ جاننے کا۔

علامہ محمد علاء الحصکفی صاحب درمختار بھی علامہ ابن نجیم کے ہمزبان ہیں۔ لیکن امام غزالیؒ نے المستصفیٰ میں اور علامہ آمدی نے احکام الاحکام میں فقہ کا اطلاق صرف شہریوں سے متعلق افعال قانونی احکام کے علم کو کیا ہے اور امام غزالیؒ نے فقہ کو اس طرح سمجھایا ہے۔ ھو معرفۃ القانون قانون کی آشنائی مشہور علم دوست علامہ احمد عبد النبی نے یہ کہہ کر کہ۔۔۔۔

ان احکام کا علم جن کا سرچشمہ نقلی دلائل ہوں۔ اور جن کا شہریوں کی روزمرہ کی زندگی سے تعلق ہو۔

فقہ کے معنیٰ میں ایک خوبی پیدا کر دی ہے۔

تعبیر کے اختلاف سے نظر ہٹا کر آج کی اصطلاحی زبان میں جبکہ اسلام کے قوانین وضوابط منضبط ہیں۔ اگر ہم فقہ کی یہ تعریف کریں تو یہ ایک حقیقت کا اظہار ہوگا۔

فقہ عملی زندگی کے لیے اسلام کے بتائے ہوئے قوانین و احکام کے مجموعے کا نام ہے۔

منازل:۔ نزل کی جمع ہے۔ نزول مصدر ہے۔ نزل ینزل باب ضرب سے آتا ہے۔ چاند کے لیے یکے بعد دیگرے وارد ہونے کی جگہ کو منزل کہا ہے۔ چاند کی ان منزلوں کے لیے ہماری زبان میں نچھتر کا لفظ بولا جاتا ہے۔ چاند زمین کے گرد چکر لگاتا رہتا ہے۔ اور اپنی گردش کو ۲۷ دن سات گھنٹوں اور ۴۳ منٹوں میں پورا کرتا ہے اس دور کو علماء ہیئت چاند کے نجومی دور سے تعبیر کرتے ہیں۔ چاند اپنی گردش کی ہر رات میں کسی ستارہ یا ستاروں کے مجموعے کے پاس ضرور پہنچ جاتا ہے۔ اور وہ گویا چاند کی گردش کے لیے ہر روز کی ایک منزل بن گیا ہے۔ وہ ہمیشہ ایک خاص منزل سے سفر شروع کرتا ہے۔ ہر روز کی مقررہ منزل میں نمایاں ہوتا ہے۔ اور پھر وہیں پہنچ جاتا ہے۔ جہاں سے زمین کا یہ چکر شروع کیا تھا۔ اس طرح ۲۷ دن اور ۷ گھنٹے کی مدت نے ۲۸ منزلیں بنا دی ہیں جب ہم ۳۶۰ کے درجوں کو ۲۸ راتوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ چاند ہر روز تقریباً ۱۳ درجہ مسافت اپنے فلک کی طے کیا کرتا ہے۔ تقریباً اس لیے کہا گیا۔ کہ حساب میں کچھ دقیقے زیادہ ہوتے ہیں حکماء اسلام نے ان منزلوں کو بطلیموس کے نقشہ مندرجہ مجسطی سے تطبیق دی تھی۔ ان منزلوں کے عربی نام یہ ہیں۔

الشرطان، البطین، الثریا، الدبران، الھقعہ، الھنعہ، الذراع، النثرہ، الطرف، الجبھۃ الزبرہ، الصرفہ، العواء السماک الاعزل، الغفر، الزبانی، الاکلیل، القلب، الشولہ، النعائم، البلدہ، سعد الذابح، سعد بلع، سعد سعود، الاخبیہ، الفرغ الاول، الفرغ الثانی، بطن الحوت،

ترجمان القرآن جلد ۲

سلطان:۔ زور، قوت، حجت، برہان، سند، حکومت تاج العروس میں ہے۔ سلطان کے معنی حجت و برہان کے ہیں۔ اور معجزہ کو بھی سلطان اسی لیے کہتے ہیں۔ کہ وہ دعویٰ نبوت

کے لیے دلیل ہوتا ہے۔ اور جب سلطان کے معنی حجت کے ہوتے ہیں۔ تو اس کی جمع نہیں آتی۔ کیونکہ اس صورت میں وہ مصدر کے قائم مقام ہوتا ہے۔ محمد بن یزید کا کہنا ہے۔

کہ یہ سلیط سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی زیتون کے تیل کے ہیں۔ کیونکہ اس سے روشنی ہوتی ہے۔ دلیل بھی ایسی ہونی چاہیئے جو روشن ہو۔

حضرت عبداللہ بن عباس ؓ فرماتے ہیں۔ کہ قرآن میں ہر جگہ لفظ سلطان بمعنیٰ دلیل ہے۔ اور دلیل کو سلطان اس لیے کہا جاتا ہے۔ کہ دلوں پر اس کا دباؤ ہوتا ہے۔ بہر حال اس کے معنی غلبہ اور تسلط کے ہیں۔ اور اسی معنوی رعایت سے دلیل کو سلطان کہتے ہیں۔ عربی میں اس کا معنیٰ بادشاہ کے نہیں۔ بلکہ طاقت اور قوت کے ہیں۔ اور یہ لفظ حکومت اور گورنمنٹ کے مترادف ہے۔ بادشاہ کے معنیٰ میں یہ لفظ غالباً چوتھی صدی میں سلطان محمود کے زمانہ سے بولا جانے لگا ہے۔ احادیث میں بھی یہ لفظ حکومت ہی کے معنیٰ میں ہے۔ السلطان ولی من لاولی له. جس کا کوئی ولی نہ ہو۔ حکومت اس کی ولی ہے۔ اسلامی قانون میں اس پر بہت سے مسائل کا مدار ہے۔ یہ ضابطہ ہے۔ اس کے تحت شہریوں کی ان گنت ضرورتیں آتی ہیں۔ اس قسم کی ساری حدیثوں میں لفظ سلطان حکومت اور سرکار کے معنیٰ میں ہے۔ جیسے

السلطان ظل الله فی الارض یاوی الیه کل مظلوم من عباد الله۔

حکومت زمین میں اللہ سبحانہٗ کا امن کا سایہ ہے جس کے دامن میں بندگان الٰہی میں سے ہر مظلوم پناہ لیتا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق ؓ کا یہ ارشاد ہے۔

السلطان العادل المتواضع ظل الله ورمحه فی الارض

عادل اور متواضع حکمران زمین میں اللہ سبحانہٗ کا سایہ اور نیزہ ہے۔

یہ دونوں حدیثیں اثر کے طور پر باختلاف الفاظ بروایت ابی ہریرہ ؓ ابن النجار میں اور بروایت ابن عمر بیہقی اور مستدرک میں اور بروایت ابی بکر الصدیق ؓ ابن ابی شیبہ میں ہیں۔ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مرفوع نہیں ہے۔ بظاہر ان صحابہ کرام کے اقوال ہیں۔ اگر یہ آثار روائتی اعتبار سے صحیح ہوں۔ تو معنیٰ یہی ہیں۔ کہ حکومت صالحۃ اللہ کا سایہ ہوتی ہے۔ بتانا یہ ہے۔ کہ جو حکومت سرکاری کاموں کو اخلاق اور نیکی کے ساتھ انجام دے۔ اس کو اپنے اس حسن عمل

کا ثواب اسی طرح ملے گا۔ جس طرح دوسری عبادات کا۔ گویا اسلام کی نظر میں حکومت بھی ایک عبادت ہے۔ حکومت صرف سربراہ ہی کا نام نہیں۔ بلکہ ملک کی دفاعی، انتظامی اور عدلیہ کی قوتیں حکومت ہیں۔ جیسے سربراہ مملکت سلطان ہے۔ فوج کا ہر فرد، عدالت کا ہر جج اور انتظامیہ کا ہر کارکن سلطان ہے یعنی حکومت کا ہر جائز نمائندہ سلطان ہے۔

إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ وَهُمْ أَغْنِيَاءُ ۚ رَضُوا بِأَنْ يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۹۳﴾

يَعْتَذِرُونَ إِلَيْكُمْ إِذَا رَجَعْتُمْ إِلَيْهِمْ ۚ قُل لَّا تَعْتَذِرُوا
لَن نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّأَنَا اللَّهُ مِنْ أَخْبَارِكُمْ ۚ وَسَيَرَى اللَّهُ
عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ ثُمَّ تُرَدُّونَ إِلَىٰ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ
فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝۹۴ سَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ
إِذَا انقَلَبْتُمْ إِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوا عَنْهُمْ ۖ فَأَعْرِضُوا عَنْهُمْ ۖ إِنَّهُمْ
رِجْسٌ ۖ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝۹۵
يَحْلِفُونَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۖ فَإِن تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا
يَرْضَىٰ عَنِ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ۝۹۶

الزام تو صرف ان پر ہے جو سرمایہ دار ہو کر جنگ میں شریک ہونے کی آپ سے رخصت مانگتے ہیں۔ ان کو یہ بات پسند ہے کہ پیچھے رہنے والوں کے ساتھ رہیں۔ اور اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے لہٰذا ان کو علم نہیں ہے ۹۳۔ یہی لوگ تمہارے سامنے تمہاری واپسی کے وقت بہانے پیش کریں گے آپ ان سے کہہ دیجئے کہ بہانہ سازیاں نہ کرو۔ ہم تمہاری کوئی بات ہرگز نہ مانیں گے۔ کیونکہ اللہ سبحانہ نے ہمیں تمہارے

حالات سے باخبر کر دیا ہے۔ اور اللہ۔ اللہ کا رسول ضرور تمہارے عمل کا
جائزہ لے گا۔ اس کے بعد تمہیں اللہ عالم الغیب والشہادہ کے حضور پیش کیا
جائے گا وہ ہی تمہیں تمہارے سارے کرتوت بتلائے گا۔[۹۴] مسلمانو! جب تمہاری
ان کی طرف واپسی ہو گی وہ ضرور تمہارے روبرو اس لئے قسمیں کھائیں گے
کہ تم ان سے درگذر کرو۔ ہاں تم ان سے درگذر کرو۔ بلاشبہ یہ لوگ گندے ہیں
اور ان کے کرتوتوں کے بدلے میں ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔[۹۵] وہ تمہیں خوش کرنے
کے لیے تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں۔ اگر تم ان سے خوش ہو ہی جاؤ گے تو
اللہ ان بدکار لوگوں سے خوش نہ ہو گا۔[۹۶]

مفردات کے معانی

اخبار۔ خبر کی جمع ہے ایسی بات جو بتانے سے معلوم ہو۔ اچھی ہو یا بُری۔ سچی ہو یا جھوٹی۔ حال، واقعہ۔ جس میں سچ اور جھوٹ کی گنجائش ہو۔ یہاں علامہ مجد الدین فیروز آبادی نے بصائر ذوی التمیز میں اخبار کے معنے احوال بتائے ہیں۔ من احوالکم التی یخبر عنھا۔

السبیل۔ اصل میں اس راستہ کو کہتے ہیں جو واضح اور آسان ہو۔ اور سبیل کا استعمال ہر اس چیز کے لیے ہوتا ہے جس کے ذریعے کسی چیز تک پہنچا جا سکے۔ چاہے وہ اچھی ہو یا بُری۔ راستہ کو بھی اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ جریر کا شعر ہے۔

أَفَبَعْدَ مَقْتَلِكُمْ خَلِيلَ مُحَمَّدٍ ترجو القيون مع الرسول سبيلا

یہ لفظ قرآن میں مذکر اور مونث دونوں طرح آیا ہے ان یروا سبیل الرشد لا یتخذ وہ سبیلا اور قل ھذہ سبیلی ادعوا الی اللہ۔ یہاں سبیل گناہ کے معنے میں ما علی المحسنین من سبیل کیونکہ گناہ ہی سزا کا ذریعہ ہے۔

رجس ناپاک۔ پلید۔ گندہ۔ عقوبت۔ عذاب، بلا اس کی جمع ارجاس آتی ہے۔ رجس چار طرح کا ہوتا ہے
ا۔ طبعی۔ ۲۔ عقلی۔ ۳۔ شرعی۔ ۴۔ ان تینوں سے مرکب یعنی طبعی عقلی اور شرعی ہو، رجس شرعی جوا اور شراب،
رجس عقلی شرک اور سور کا گوشت تینوں کا مجموعہ مردار ہے۔ قرآن میں سب کے لیے رجس آیا ہے۔ قاضی بیضاوی
نے رجس اور رجز میں ہم آہنگی بتائی ہے۔ لیکن علامہ زمخشری الفائق میں لکھتے ہیں۔ رجز اور رجس کے معنے
عذاب کے ہیں۔ ابو تراب کا بیان ہے کہ میں نے ابو السمیدع حضبی سے سنا ہے وہ کہتے تھے کہ رجز اور رجس
وہ سخت مصیبت ہے جو لوگوں پر نازل ہو۔ یہ اہل عرب کے محاورے ارتجزت السماء بالرعد وارتجست
سے بنا ہے اور وہ ایسی جنبش ہے جس کے ساتھ شور ہو۔ علامہ مجدالدین فیروزآبادی اپنی کتاب بصائر میں لکھتے
ہیں رجز اصل میں اضطراب کو کہتے ہیں۔ اونٹ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھائے اور کمزوری کی وجہ سے قدموں میں
اضطراب ہو تو اس وقت بولتے ہیں۔ رجز البعیر اور ناقۃ رجزاء۔ اسی رعایت سے شعر میں اجزاء
کے قرب کی وجہ سے ارجوزہ بولتے ہیں۔ بہرحال رجز اور رجس میں بنیادی فرق ہے۔

مجرم تو سرمایہ دار ہیں

اسلامی زندگی دراصل کفر کے مقابلے میں جہد و محنت کا نام ہے اور اسلام کی خاطر جہد و محنت ہی کفر و نفاق
میں حدِ فاصل ہے۔ اگر اسلام کی خاطر محنت نہ ہو تو ایمان کی حیثیت صرف دعویٰ بلا دلیل کی ہے قرآن نے یہ بات
اپنے مخاطبوں کو بار بار اور کھول کر سمجھائی ہے۔ احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا امنا وھم لا یفتنون
کیا یہ لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ان کو ایمان کا دعویٰ کرنے کے بعد آزاد چھوڑ دیا جائے گا اور ان کو اسلام کی خاطر
کسی آزمائش سے دوچار ہونا نہ پڑے گا محنت ہی کھرے کھوٹے سچے اور جھوٹے کے لیے کسوٹی ہے۔ بلکہ
قرآن نے ایک موقعہ پر بڑے زور سے یہ بات فرما کر اہل ایمان کو جھنجھوڑا ہے لنبلونکم بشئ من الخوف
والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ اہل ایمان کو اسلام
کی خاطر حوادث، مصائب اور تکالیف سے دوچار ہونا پڑے گا۔ غزوہ تبوک اسلامی زندگی میں اسلام کی موت
وحیات کا پیمانہ تھا۔ اس میں صرف قریش نہیں بلکہ سارے عرب نے اسلام کے خلاف سنگھٹن قائم کر لیا اور عیسائیوں
کی سامراجی طاقت بھی اہل عرب کی ہمنوا بن گئی تھی۔ سفر طویل تھا۔ موسم ناخوشگوار تھا کوئی باقاعدہ فوجی نظام نہ تھا
حمل ونقل کا سرکاری انتظام تھا جو کچھ بھی تھا صرف رضاکارانہ تھا۔ اس موقعہ پر کچھ وہ تھے جو واقعی معذور تھے۔
ان کا چہرہ قرآن نے پیش کر دیا ہے نادار ہیں فقیر ہیں زادِ راہ پاس نہیں ہے مگر جانے کی تڑپ سے ہر دل

کڑھ رہا ہے آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی ساون کی جھڑی بنی ہوئی ہے۔ ان کے بارے میں قرآن بتا چکا ہے۔ ما علی المحسنین من سبیل۔ اور ان کو اللہ سبحانہ نے مغفرت کا پروانہ بھی سنا دیا ہے۔ ان کے مقابلے میں وہ لوگ ہیں جو صحت مند ہیں بہادر ہیں طاقتور ہیں کمزور نہیں۔ دولت مند ہیں فقیر نہیں اس کے باوجود اسلام کی حفاظت سے جی چرا رہے ہیں۔ اور اعذار بارِدہ پیش کر کے رخصتیں لے رہے ہیں۔ ان آیات میں ان ہی لوگوں کا بھرپور چہرہ پیش کیا جا رہا ہے۔ امام رازی نے ان آیات میں اسی تقابلی مطالعہ کو پیش نظر رکھا ہے۔ دونوں پر ذرا گہری نگاہ ڈالیے۔

ایک وہ ہیں جو سب کچھ ہونے اور سب کچھ رکھنے کے باوجود اسلام کے لیے ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ ان کے مقابلے میں وہ ہیں جن کے پاس کچھ نہیں ہے نہ جسمانی قوت ہے اور نہ سرمایہ و دولت کی طاقت ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایمان کی سرشاری کا عالم یہ ہے کہ سب کچھ نہ ہونے کے باوجود جانے کی قسمیں کھا رہے ہیں نذریں مان رہے ہیں۔ موقعہ نہ ملنے پر رو رہے ہیں نہ جانے میں دونوں برابر ہیں مگر نتائج کے لحاظ سے دونوں الگ الگ ہیں۔ ایک کچھ بھی نہ ہونے کے باوجود ماجور اور عنداللہ مقبول ہے اور دوسرا سب کچھ ہونے کے باوجود مازور و معتوب ہے۔ ایک کا اسلام کے لیے سینہ کھلا ہوا ہے جبکہ دوسرے کا سینہ تنگ ہے ایک کے قلب میں ایمان کی بھرپور روشنی ہے جبکہ دوسرے کا دل بیمار ہے اور تاریکیوں میں گھرا ہے ان آیات میں اسی دوسرے طبقہ کو روشناس کرایا گیا ہے۔

۹۸ الزام تو ان پر ہے جو سرمایہ دار ہو کر جنگ میں شریک ہونے کی آپ سے رخصت مانگتے ہیں۔ ان کو یہ بات پسند ہے کہ پیچھے رہنے والیوں کے ساتھ رہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے لہذا ان کو علم نہیں ہے یعنی باوجود قدرت و استطاعت جہاد سے پہلوتہی کرتے ہیں۔ اور نہایت بے ہمتی سے یہ عار گوارا کرتے ہیں۔ کہ عورتوں کی طرح گھر میں چوڑیاں پہن کر بیٹھ جائیں۔ گناہ کی ممارست (پریکٹس) سے آدمی کا دل ایسا مسخ اور سیاہ ہو جاتا ہے کہ اسے بھلے برے اور عیب وغیرہ کی تمیز ہی نہیں رہتی۔ جب بے غیرتی کرتے کرتے کوئی شخص اس قدر پاگل ہو جائے کہ نادم اور متاسف ہونے کی جگہ اس پر الٹا نازاں اور خوش ہو تو سمجھ لو کہ اس کے دل پر خدائی مہر لگ چکی ہے [۹۸ لہ]

امام رازی نے مطلب یہ بتایا ہے کہ وہ لوگ جو جہاد میں پیچھے رہنے کے لیے سرمایہ دار ہونے کے باوجود آپ سے رخصت مانگتے ہیں اللہ کے یہاں اصل اور دراصل ملزم و مجرم ہیں یہ خطاب الٰہی میں دنیا میں عتاب ان کو ہی ہے

لہ افادات شیخ الاسلام

اور آخرت میں عذاب کے مستحق بھی وہی ہیں۔ اگرچہ ماعلی المحسنین من سبیل فرماکران لوگوں کے بارے میں جو واقعی معذور ہیں بتادیا تھا کہ جو لوگ واقعی معذور ہیں اگران کے دل صاف ہوں اور خدا اور رسول سے ان کے معاملات درست ہیں تو ان پر جہاد میں نہ جانے پر کچھ الزام نہیں ایسے مخلصین سے اگر بتقاضائے بشریت کوئی کوتاہی ہوجائے تو حق تعالیٰ کی مغفرت اور رحمت سے توقع ہے کہ وہ درگذر فرمائے گا یہ عام قانون بیان کرنے کے بعد ان محسنین کا ذکر کیا جن کے ایمان و اخلاص کا یہ حال تھا کہ جب ان کے لیے سواری کا انتظام نہ ہوسکا اور حضور اقدس کے ادب و احترام نے اس کی بھی اجازت نہ دی کہ زیادہ اصرار کریں تو خاموش اٹھ کر لوٹ گئے لیکن آنکھیں جو درد دل کی غماز ہوتی ہیں خاموش نہ رہ سکیں حسرت و غم کے آنسو بے اختیار ڈبڈبا آئے قرآن کا خاص انداز بلاغت ہے کہ پہلے معتذرون کا ذکر ہوچکا تھا لیکن پھر خصوصیت کے ساتھ ان کا ذکر کیا اور ان کی محبت ایمانی کی تصویر کھینچ دی اب یہاں نفاق کے ذکر میں انما لاکر پھر ان کی طرف اشارا کر دیا کہ مجرم وہ محسنین نہیں مجرم تو وہ سرمایہ دار ہیں جو سب کچھ رکھتے ہوئے نہیں گئے اور رخصتیں مانگتے رہے ہیں۔ یہ نفاق کے مقابلہ میں ضمناً ایمان کا مرقع پیش کر دیا یعنی ایک تو یہ ہیں اصلی مجرم کہ قدرت کے باوجود ہی نہیں نکلے اور بہانے تراشتے رہے یا ایک وہ ہیں کہ قدرت نہ رکھنے پر بھی دل کی لگن چین سے نہیں بیٹھنے دیتی ہے آنسو بن کر آنکھوں میں ٹپک رہی ہے۔

یہاں علامہ آلوسی، خفاجی اور بیضاوی نے یہ بڑی لطیف بات لکھ دی ہے کہ آگے تعبیری انداز رضوا بان یکونوا استیناف بیانی ہے۔ یعنی اُٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے کہ جب یہ اس قدر اونچا کام ہے کہ معذرت نہ رکھنے والے نہ جانے پر رو رہے ہیں تو پھر معذرت والے کیوں نہیں گئے ہیں۔ آگے اسی سوال کا جواب ہے۔ آلوسی لکھتے ہیں۔

استیناف بیانی۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں استیناف لبیان ماھو السبب دوسرے شارحین قرآن میں ابوحیان اندلسی وغیرہ نے بھی یہی بات لکھی ہے، بات بیحد فکرانگیز ہے گویا پڑھنے والے کے ذہن میں یہ سوال خود بخود چٹکیاں لینے لگتا ہے کہ جب اس قدر اونچا ہے جس پر اسلام کی زندگی کا مدار ہے۔ اور رکاوٹ بھی کوئی نہیں ہے تو پھر انھوں نے جانے سے کیوں جی چرایا ہے جواب میں ارشاد ہوا ہے کہ اس کی دو وجہ ہیں ایک یہ چونکہ ان کو اجتماعی شرف و مجد اور برتری کی جگہ ذاتی اور انفرادی برتری زیادہ پسند ہے اس لیے ان کو عورتوں کی طرح گھروں میں بیٹھے رہنا، آرام کرنا اور عیش و تنعم سے ہم آغوش رہنا محبوب ہے مردھو کر مردانگی کی جگہ شیوہ زنان اختیار کرنا دناءت کمینگی اور بے غیرتی ہے۔ گویا بے غیرت بن کر عورتوں والی

زندگی مردوں کی مجاہدانہ زندگی کے مقابلے میں زیادہ پسند ہے رضوا بان یکونوا مع الخوالف یعنی ان کو عورتوں کے ساتھ گھروں میں رہنا ہی پسند آیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ نفاق کی وجہ سے اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ اس کی وجہ سے ان کو اپنے کردار کی خباثت کا اور اس کے نتیجے میں فوری طور پر نتائج کا ان کو پتہ نہیں ہے۔ ابوحیان لکھتے ہیں کہ ان کو دین کی خاطر محنت کرنے کے منافع کا پتہ ہی نہیں ہے حافظ ابن جریر فرماتے ہیں کہ ان کو نہ جاننے کے انجام کا پتہ نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ ادائے فرض کے وقت عورتوں کی طرح گھروں میں بیٹھ جانا ایک ایسی نامردی کی بات ہے جسے کوئی خوددار آدمی گوارا نہیں کر سکتا۔ لیکن انہوں نے یہ بھی گوارا کر لیا۔ کیونکہ جہل اور بے حسی کی انتہائی حالت ان پر چھا گئی۔ یہی حالت جو انتہا درجہ کی بے حسی غفلت و انکار کا لازمی نتیجہ ہے۔ قرآن اسے مہر لگنے سے تعبیر کرتا ہے۔ طبع کی تشریح پیچھے تفسیر میں ایک سے زیادہ مقامات پر گذر چکی ہے۔

معذرت کی باتیں نہ بناؤ

۹۹۔ یہی لوگ تمہارے سامنے تمہاری واپسی کے وقت بہانے پیش کریں گے۔ ان سے کہہ دیجئے کہ بہانہ سازیاں نہ کرو۔ ہم تمہاری کوئی بات ہرگز نہ مانیں گے کیونکہ اللہ سبحانہ نے ہمیں تمہارے حالات سے باخبر کر دیا ہے۔ اور اللہ اور اللہ کا رسول ضرور تمہارے عمل کا جائزہ لے گا۔ اس کے بعد تمہیں اللہ عالم الغیب والشہادہ کے حضور میں پیش کیا جائے گا وہی تمہیں تمہارے سارے کرتوت بتلائے گا۔ یعنی جیسے تبوک کی طرف روانہ ہونے کے وقت منافقین نے طرح طرح کے حیلے بہانے بنائے جب تم مدینے واپس آؤ گے اس وقت بھی یہ لوگ اعذار باطلہ پیش کر کے تم کو مطمئن بنانا چاہیں گے اور قسمیں کھائیں گے کہ حضرت ہمارا قصد مصمم تھا کہ آپ کے ساتھ چلیں مگر فلاں فلاں عوائق اور موانع پیش آجانے کی وجہ سے مجبور رہے۔ آپ کہہ دیجئے کہ جھوٹی باتیں بنانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ تمہارے سب اعذار لغو اور بیہودہ ہیں۔ ہم کو حق تعالیٰ تمہارے کذب و نفاق پر مطلع کر چکا۔ پھر کس طرح ہم تمہاری لغویات کو باور کر سکتے ہیں۔ اب پچھلے قصہ کو چھوڑو۔ آئندہ تمہارا طرز عمل دیکھا جائے گا کہ اپنے دعوے کو کہاں تک نبھاتے ہو۔ سب جھوٹ سچ ظاہر ہو کر رہے گا اور بہرحال اس عالم الغیب والشہادہ سے تو کوئی راز، عمل اور نیت پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ اسی کے یہاں سب کو جانا ہے وہ جزا دینے کے وقت تمہارا چھوٹا بڑا ظاہری باطنی عمل کھول کر رکھ دے گا اور اسی کے موافق بدلہ دیا جائے گا۔[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

اصل ارشاد میں اعتذار سے یعتذرون آیا ہے۔ اس سے پہلے تعذیر سے معذرون آیا ہے۔ اعتذار اور تعذیر میں باریک سا فرق ہے تعذیر نام ہے صرف جھوٹے بہانے تراشنے کا جبکہ اعتذار میں عذر جھوٹا بھی ہو سکتا ہے اور سچا بھی۔ یہاں یعتذرون صرف باتیں بنانے اور جھوٹے عذر تراشنے کے معنے میں ہے۔ یعنی جب تم اس سفر یعنی تبوک سے واپس پلٹو گے تو یہ منافقین اپنے کردار کے بارے میں مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لیے اپنے من گھڑت عذروں کی داستانیں سنائیں گے۔ اصل روئے سخن تو حضور اقدس کی طرف ہے اور جمع کی تعبیر صرف تعظیم کی خاطر ہے اور اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ دونوں کی طرف روئے سخن ہو تو زیادہ اچھا ہی نہیں بلکہ اس میں معنویت بھی ہے کیونکہ عادۃً رواج کے مطابق پیچھے رہ جانے والے ملاقات کے وقت ہر ایک سے معذرت کرتے ہوں گے اور نہ جانے کی شرمندگی کی سیاہی کو چہروں سے جھوٹے اور بناوٹی عذروں کے پانی سے دھوتے ہوں گے۔ کیونکہ یہ لوگ معاشی لحاظ سے دولت مند بھی تھے اور جسمانی طور پر صحت مند اور تندرست بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ ایک شخص ہٹا کٹا تندرست اور مالی توانائیاں بھی رکھتا ہو وہ اگر وقت کے تقاضے کا جواب نہیں دیتا ہے تو ہر شخص کے لیے سوالیہ نشان بن جاتا ہے اسلامی اجتماعیت ہی کیلئے نہیں بلکہ دنیا کی ہر جماعت کے لیے یہ افراد اجتماعی زندگی کے وہ جراثیم ہوتے ہیں جو اجتماعیت کی کشتی کے ڈوبنے کا سامان ہو جاتے ہیں۔ یہی لوگ مردم شماری کے مسلمان ہوتے ہیں۔ ان کے ذہن میں اسلام کا ایک محدود تصور رہتا ہے۔ وہ دریا میں نہانے والوں کو دیکھ کر کپڑے تو اتار لیتے ہیں مگر ان میں غوطہ لگانے کی ہمت نہیں ہوتی ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہوا ہے ان سے کہہ دیجئے کہ بہانہ سازیاں نہ کرو۔ ہم تمہاری کوئی بات ہرگز نہ مانیں گے۔ کیونکہ اللہ سبحانہ نے ہمیں تمہارے حالات سے باخبر کر دیا ہے۔ اس میں صیغہ افراد کے ساتھ حضور اقدس سے کہا گیا ہے کہ آپ ان سے کہہ دیجئے کیونکہ جواب دینے کا سربراہ ہونے کی وجہ سے منصب آپ کا ہی ہے نہ کہ اور کسی کا۔ یہی اجتماعیت ہے کہ امام ایک ہو باقی سب اس کے مقتدی ہوں۔ بولنا امام کا کام ہے مقتدی کا کام صرف خاموش رہنا ہے۔ اگر امام کی موجودگی میں مقتدی بولیں تو منشاء امامت ہی ختم ہو جاتا ہے یعنی ان سے کہہ دیجئے کہ اعذار بارد پیش نہ کرو اور جھوٹی باتیں نہ بناؤ۔ اب کردار کے اس مظاہرے کے بعد ہم تمہاری کوئی بات نہ مانیں گے۔ اصل ارشاد ہے لن نؤمن لکم یہ استیناف بیانی ہے اور اس اٹھتے ہوئے سوال کا جواب ہے کہ معذرت کیوں نہ پیش کریں۔ جواب میں بتایا اس لیے اعذار پیش نہ کرو کہ ہم تمہارے کسی عذر کو شرف پذیرائی نہ دیں گے۔ اس پر پھر سوال ہوا ہے کہ آپ ہمارا کوئی بھی عذر کیوں نہ مانیں گے۔

جواب میں فرمایا کہ ہم اس لیے نہ مانیں گے کہ قد نبأنا اللہ من اخبارکم اللہ سبحانہ نے وحی کے ذریعے ہم کو تمہارے سارے حالات بتا دیئے ہیں اور تمہارے دلوں کی اندرونی کیفیات سے مطلع کر دیا ہے اس لیے اب تمہاری کسی بات کو بالکل نہ مانیں گے۔

وحی تو صرف ذات نبوت کی طرف آتی ہے پھر اس موقع پر جمع کے صیغے کے ساتھ یہ کہنا کہ اللہ نے ہمیں تمہارے احوال کا پتہ دے دیا ہے اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ اللہ نے پیغمبر کو حکم دیا ہے کہ یہ بات صحابہ کو بھی بتا دیجئے تاکہ ان جھوٹے عذر پیش کرنے والوں کی علی رؤس الاشہاد رسوائی ہو اور لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اس معاملہ میں سربراہ پوری جماعت کی نمائندگی کر رہا ہے۔ آپ کا بولنا ہی سب کا بولنا ہے اور پوری جماعت میں کسی کو اس معاملہ میں اختلاف نہیں ہے۔

اس تعبیر سے یہ بات معلوم ہو رہی ہے کہ ان منافقین کے تمام اعذار بھی بار دھکے ناقابل قبول ہونے کی اصل علت یہ تھی کہ ان کا پردہ خود اللہ سبحانہ نے اٹھا دیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا چونکہ کسی کا یہ درجہ نہیں ہے کہ وہ کسی کے بارے میں اللہ کے بتائے ہوئے علم غیب کا دعویٰ کر سکے اس وجہ سے وہ اس طرح کے معاملات میں صرف حالات اور شرعی دلائل کی بنا پر ہی کوئی حکم لگائیں گے۔ اگر کسی عذر اگر کسی بیان کی تردید کے لیے کوئی عقلی یا نقلی دلیل نہیں ہے۔ تو بہرحال تسلیم کیا جائے گا۔ اگرچہ وہ فی الحقیقت کیسا ہی بے سروپا ہو ہم ہر اس شخص کو مسلمان تسلیم کریں گے جو ایمان و اسلام کا دعویٰ کرتا ہے اگر ہمارے پاس اس کے ایمان و اسلام کا دعویٰ کرتا ہے اگر ہمارے پاس اس کے ایمان و اسلام کے انکار کی کوئی شرعی دلیل نہیں ہے اسی لیے شریعت و قانون میں الہام دلی حجت نہیں ہے مگر مجتہد اور قانون دان کا عقل و نقل پر مبنی اجتہاد حجت ہے

اسلام کی اصلی شہادت عمل ہے

اس کے بعد فرمایا وسیری اللہ عملکم ورسولہ یعنی باتیں بنانے بہانے گھڑنے اور جھوٹی قسموں کو سپر بنانے کی ضرورت نہیں ہے اپنے عمل سے راستبازی اور وفاداری کا ثبوت دو اللہ و رسول تمہارے عمل کو دیکھیں گے یعنی اسلامی نظام اور مملکت تمہارے احوال کا یہاں مطالعہ کرے گی۔ اور آئندہ مملکت میں تمہارے اعمال ہی کے مطابق تم سے معاملہ کیا جائے گا۔ یہ تعبیر قرآن میں اسلامی مملکت کے لیے دی ہے وہ جب بتانا چاہتا ہے کہ اسلامی مملکت کے وفادار اور تابعدار بن کر رہو تو انداز بیان یہی ہوتا ہے اطیعو اللہ و رسولہ اسلامی مملکت سے بے وفائی اللہ و رسول سے بے وفائی ہے۔ مگر یہ بات ذہن میں رکھیے کہ

اسلامی مملکت اور مسلم مملکت میں جوہری فرق ہے۔ یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ اسلام کوئی جسم وجان رکھنے والی چیز نہیں ہے کہ وہ اپنے اس مطلوبہ اقتدار کو خود اپنی کوششوں سے حاصل کرے گا اور حاصل کرنے کے بعد اسے اپنے ہاتھوں میں رکھے گا بلکہ یہ سب کچھ اپنے پیرووں کے ذریعے ہی انجام پائے گا۔ وہی اس اقتدار کو حاصل کرنے کی کوشش کریں گے اور وہی اسے حاصل کرنے کے بعد اپنے ہاتھوں میں رکھیں گے اور اس لیے وہ ہی لوگ اسلام کے سچے پیرو ہوں گے مگر بڑا فرق ہے اس اقتدار میں جو مسلمانوں کو اپنے لیے مطلوب ہو اور اس اقتدار میں جو انہیں اصلاً اسلام کے لیے مطلوب ہو۔ پہلی قسم اقتدار حکومت مسلم اقتدار ہوتا ہے اور دوسری قسم اسلامی اقتدار ہوتا ہے۔ قرآن میں وہ اگر دنیا ہے تو یہ دین ہے وہ اگر شر ہے تو یہ سر تا سر خیر ہے۔ وہ اگر دنیا کا بگاڑ ہے تو یہ دنیا کا سنگار ہے۔ اسی بنا پر اگر ایک طرف قرآن نے اہل ایمان کی یہ تعریف کی لا یریدون علوا فی الارض ولا فسادا وہ زمین میں سربلندی اور فساد نہیں چاہتے ہیں۔ تو دوسری طرف ان کو مخاطب کر کے یہ بھی فرمایا ہے کہ انتم الاعلون ان کنتم مومنین۔ مطلب یہ ہے کہ جو علو اور سربلندی اپنے لیے ہوتی ہے وہ دراصل سرکشی اور جباریت ہوتی ہے۔ دنیا کو خرابیوں سے بھر دیتی ہے اور جو سربلندی اور برتری اسلام کے لیے ہوتی ہے وہ سراپا خیر اور رحمت ہوتی ہے کوئی شک نہیں کہ اقتدار کی یہ دونوں قسمیں مسلم حکومت اور اسلامی حکومت ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ اگرچہ بادی النظر میں دونوں ہی اقتدار ہیں۔ اور دونوں مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں مگر ایک کی حیثیت مقدس امانت کی اور ایک بھاری ذمہ داری کی ہے جبکہ دوسرے کی حیثیت ذاتی ملکیت کی ہے۔ ظاہری نگاہیں سطح کو دیکھ کر دھوکہ کھا سکتی ہیں لیکن اہل نظر پر اتنا بڑا اور بنیادی فرق چھپا نہیں رہ سکتا۔ وہ محسوس کر سکتے ہیں کہ اگرچہ شاہین اور کرگس کی پرواز بظاہر ایک ہی فضا میں ہوتی ہے مگر دونوں کا جہان فی الواقع ایک نہیں ہوتا۔ بتایا یہ جا رہا تھا کہ فسیری اللہ عملکم ورسولہ کا مقصود یہ بتانا ہے کہ اس دنیا میں تمہارے طرز عمل کو اسلامی حکومت دیکھے گی اور اسی کے مطابق تم سے اس دنیا میں سلوک کیا جائے گا دنیا میں ہمیشہ رہنا نہیں ہے۔ جہان سے بہرحال جانا ہے وہاں یعنی آخرت میں کیا ہوگا۔ ثم تردون الی عالم الغیب والشہادۃ فینبئکم بما کنتم تعملون۔ پھر اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے جو ظاہر و پوشیدہ ہر طرح کی باتیں جاننے والا ہے تم کو بتلائے گا کہ دنیا کی زندگی میں کیا کرتے رہے ہو۔ ارشاد میں اگر ایک طرف یہ رہنمائی ہے کہ ایسی تمام کوتاہیوں اور گناہوں سے دامن کو داغدار نہ ہونے دو جن کیلئے معذرت پیش کرنی پڑے۔ تو دوسری طرف یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ علم باری اعمال ظاہری اور باطنی جن کا احاطہ کئے ہوئے ہے اس کے علم کی گرفت

سے پہلے شاید اس لیے لائے ہیں کہ اللہ سبحانہ کے علم کی نسبت سے کوئی چیز باہر نہیں ہے اور غیب کو شہادت
چھپا اور کھلا ایک ہے۔ وجہ بالکل صاف ہے کہ اللہ سبحانہ کا معلومات سے تعلق حصولی نہیں ہے بلکہ ہر چیز کا وجود علم الٰہی میں ہے۔ علامہ آلوسی نے یہاں یہ بات اپنے مخاطبوں کو خوب سمجھائی ہے کہ :

"اشیا سے علم الٰہی کی تحقیق علم و دانش کی درسگاہوں میں مشکل ترین اور پیچیدہ مسائل میں سے ہے اس میدان میں بڑے بڑے شہسواروں کے قدم پھسل گئے ہیں"

آخر میں کنتم تعملون لاکر جتا دیا کہ یہ جتنا نہیں ایک بار برائی کرنے کی نہیں بلکہ برائیوں پر مداومت اور تکرار کی ملے گی۔ منشا یہ ہے کہ یہ تمہارے اعمال کا ناگریز نتیجہ ہے با اسبیہ ہے یعنی تمہارے گوناگوں اعمال اور ان پر مداومت اس کا سبب بنے ہیں۔ جب دنیا دار اسباب ہے تو یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ اعمال انسانی اس سے باہر ہوں بما کنتم تعملون کا فقرہ بتا رہا ہے کہ اعمال کے بھی وہ ہی احکام و نتائج ہیں جو اشیا کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مادیات کے خواص کی طرح معنویات کے بھی خواص ہیں۔ اور خواص و نتائج کا ایک ہی عالمگیر قانون سب جگہ کام کر رہا ہے۔ نفاق۔ کفر۔ اخلاق سیئہ اعمال بد کے نتائج کا بھی وہ قانون ہے جو عالم مادیات میں آگ پانی کا ہے آگ کا خاصہ جلانا ہے ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ آگ روشن ہو اور اس کے شعلوں سے ٹھنڈک نکلے۔ ٹھیک اسی طرح اعمال کے بھی خواص و آثار ہیں اور خواص و نتائج کا ایک ہی عالمگیر قانون یکساں طور پر کام کر رہا ہے

جھوٹی قسمیں کھانے والوں سے اعراض

۱۰۰ مسلمانو! جب تمہاری ان کی طرف واپسی ہوگی وہ ضرور تمہارے روبرو اس لیے قسمیں کھائیں گے کہ تم ان سے درگذر کر دو ہاں تم ان سے درگذر کرو بے شک یہ لوگ گندے ہیں۔ ان کے کرتوتوں کے بدلے میں ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ تبوک سے واپسی کے بعد منافقین جھوٹی قسمیں کھا کر جو عذر پیش کرتے تھے اس کی غرض یہ تھی کہ پیغمبر اور مسلمانوں کو اپنی قسموں اور ملمع سازیوں سے راضی و مطمئن کریں تاکہ بارگاہ رسالت سے ان پر کوئی عتاب و ملامت اور دار و گیر نہ ہو۔ سابق کی طرح یوں ہی معاملہ ابہام میں رہے۔ مسلمان اس سے کوئی تعرض نہ کریں۔ حق تعالیٰ نے فرمادیا کہ بہتر ہے کہ تم ان سے تعرض مت کرو لیکن یہ اغماض و تغافل تعرض نہ کرنا۔ راضی و مطمئن ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ ان کے نہایت پلید اور شریر ہونے کی وجہ سے بھی یہ لوگ اس قدر گندے ہیں کہ ان کے پاک و صاف ہونے کی کوئی توقع نہیں رہی۔

لہٰذا اس غلاظت کی پوٹ کو دور پھینک دینا اور اس سے علیحدہ رہنا ہی بہتر ہے خدا خود ان کو ٹھکانے لگا دے گا۔[1]

آیت میں سب سے پہلی بات یہ جاننے کی ہے کہ اس آیت میں لفظ انقلاب آیا ہے جبکہ پہلی آیت میں رجعتم رجوع سے آیا ہے۔ یہ تعبیرات اس بات کی تائید کر رہی ہیں کہ سورۃ براءۃ کا یہ حصہ تبوک سے واپس ہوتے وقت سفر میں نازل ہوا تھا۔ اس میں ایک بلند آہنگ پیشن گوئی ہے جو حرف بحرف پوری ہوئی۔ تبوک سے واپسی ہونے کے وقت ہی راستہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان تمام واقعات سے مطلع فرما دیا جو کہ اہل نفاق کی جانب سے بطور معذرت پیش آنے والے تھے۔ یہ بات اور زیادہ وزنی ہو جاتی ہے جب اس پس منظر میں اس کا مطالعہ کیا جائے کہ ان منافقین کی ذہنی افتاد یہ تھی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہ اس سفر سے بخیر و عافیت لوٹنے والے نہیں ہیں۔ اسی لیے سفر سے واپسی کا بار بار ذکر کیا ہے۔

دوسری بات یہ بھی ذہن میں رکھنے کی ہے لتعرضوا عنهم فاعرضوا عنهم کی تعبیر میں اعراض کا تکرار اپنے اندر گہری معنویت رکھتا ہے پہلے اعراض کے معنے یہ ہیں کہ ان سے تعرض نہ کرو۔ دوسرے اعراض کا مطلب ہے کہ صرف درگذر نہ کرو بلکہ تم ان کو منہ ہی نہ لگاؤ۔ کوئی تعلق نہ رکھو اور سمجھ لو کہ وہ تمہارے نہیں اور تم ان کے نہیں ہو مطلب یہ ہے کہ وہ قسمیں اس لئے کھائیں گے کہ تم ان سے تعرض نہ کرو یعنی ان کے نہ جانے پر کوئی ڈانٹ ڈپٹ نہ کرو لیکن تمہیں ان سے واقعی کنارہ کش ہو جانا چاہیے۔ یعنی ان سے ہر قسم تعلقات کو ختم کر دینا چاہیے مقاتل نے یہ بات اسی انداز کلام سے سمجھی ہے لاتجالسوهم ولا تكلموهم نہ ان کے پاس بیٹھو اور نہ ان سے بات کرو۔ گویا اعرضوا عنهم ان کے معاشرتی تعلقات ختم کرنے کی ہدایت ہو رہی ہے۔ اس کی علت یہ بتائی گئی ہے انهم رجس یہ قطعاً ناپاک ہیں۔ نجاست معنوی ہے۔ ان سے تمہیں دور رہنا چاہیے ایسا نہ ہو کہ اس کی گندگی سے تمہارا پاک دامن گندا ہو جائے۔ آخر اگر احتیاط نہ کی جائے تو صاف کپڑے پر کوئی نہ کوئی چھینٹا پڑ ہی جاتا ہے۔ اس تفصیل سے یہی بات سمجھی جا رہی ہے کہ اس آیت میں قرآن اہل ایمان کو ان منافقین کے معاشرتی قطع تعلقات کا حکم دے رہا ہے۔

کچھ بزرگوں نے یہ مطلب بتایا ہے کہ یہ منافقین قسمیں اس لیے کھا رہے ہیں تاکہ اے مسلمانو تم ان سے پوچھ گچھ نہ کرو۔ لہٰذا اے مسلمانو تم ان سے روگردانی ہی کرو۔ اور ان کو اس معاملہ پر کچھ نہ کہو۔ ان کو کچھ کہنے اور ملامت کرنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا کیونکہ یہ لوگ ناپاک اور گندے ہیں۔ گندگی میں طہارت قبول کرنے کی صلاحیت ہی نہیں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہوتی ہے۔

پہلے مطلب کی صورت میں ان کی روحانی گندگی اور نجاست کی وجہ سے ان سے قطع تعلقات کا حکم ہے اور دوسرے مطلب میں ان کی اصلاح کے خیال سے دست بردار ہونے کی تلقین ہے۔

آیت کے آخر میں ان اعمال کی آخرت میں جزا بتائی ہے کہ بالآخر ان کو اپنے منافقانہ کردار اور اخلاقی رذائل کی سزا ضرور ملے گی۔ مادیات کی طرح معنویات میں بھی تسبیب کا قانون کام کر رہا ہے یعنی جہنم کا سبب ان کے بداعمال ہوں گے بما کانوا یکسبون میں با سببیہ ہے۔

اصل چیز رضائے الٰہی ہے

۱۰۱ وہ تمہیں خوش کرنے کے لیے تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں اگر تم ان سے خوش ہو ہی جاؤ گے تو اللہ ان بدکار لوگوں سے خوش نہ ہوگا بڑی کوشش یہ ہے کہ مکر و فریب اور کذب و دروغ سے خوش کریں فرض کیجئے کہ اگر چکنی چپڑی باتوں سے مخلوق راضی ہو جائے تو کیا نفع پہنچ سکتا ہے جبکہ خدا ان سے راضی نہ ہو۔ خدا کے آگے کوئی چالاکی اور دغابازی نہیں چل سکتی۔ گویا متنبہ فرمادیا کہ جن لوگوں سے خدا راضی نہ ہو کوئی مومن قانت کیسے راضی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا جھوٹی باتوں سے پیغمبر اور ان کے ساتھیوں کو خوش کر لینے کا خبط انہیں دماغوں سے نکال دینا چاہیے۔ اگر ان کے ساتھ تغافل و اعراض کا معاملہ کیا گیا ہے تو یہ اس کی دلیل نہیں ہے کہ مسلمان ان سے خوش اور مطمئن ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کہتے ہیں کہ جس شخص کا حال معلوم ہو کہ منافق ہے اس کی طرف سے تغافل روا ہے۔ لیکن دوستی و محبت و یگانگت روا نہیں ہے۔

نفاق جب طبیعتوں میں جڑیں بنا لیتا ہے تو اس کی ایک خاص علامت یہ بن جاتی ہے کہ وہ اللہ کے بجائے اللہ کے بندوں کی رضا جوئی میں لگ جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ منافقین اپنے اعذار باردہ پر قسمیں اس لیے کھاتے ہیں کہ تم ان سے راضی ہو جاؤ اور ان سے جیسا پہلے برتاؤ کرتے تھے ویسے ہی حالات جاری رکھو لیکن مسلمانو تمہیں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ تمہارے راضی ہونے سے اللہ سبحانہ راضی نہ ہوگا۔ اس لیے تمہاری رضامندی ان کے لیے سودمند نہیں ہے۔ اور کچھ شارحین قرآن نے رضا کو کنائی زبان میں تلبیس کے معنے میں لے کر مطلب یہ بتایا ہے کہ اگر ان منافقین کے لیے جھوٹی قسمیں کھا کر تمہیں دھوکہ دینا ممکن ہے اور تمہیں اس طرح راضی کر سکتے ہیں تو ان کے لیے اللہ سبحانہ کو دھوکہ دے کر راضی کرنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن علامہ آلوسی اس مطلب کو خلاف الظاہر

لہ افادات شیخ الاسلام

بنایا ہے۔ علامہ نسفی نے اس آیت میں یہ نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ مومنین کی رضامندی اللہ سبحانہ کی رضامندی کو مستلزم نہیں ہے۔ اور الجصاص نے لکھا ہے کہ فقہاء نے اس آیت سے یہ بات سمجھی ہے کہ قسم کے بعد قبول عذر لازمی نہیں ہے۔

یہ انداز تعبیر دراصل اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ مسلمان ان کے جھوٹے عذروں سے دھوکہ میں پڑ کر ان سے راضی نہ ہوں یعنی مسلمانو تم ان سے قطعاً راضی نہ ہو۔ قاضی بیضاوی لکھتے ہیں والمقصود من الاية النهى من الرضا عنهم آیت کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ مسلمان ان سے راضی نہ ہوں۔ آخر میں فان الله لا يرضى عن القوم الفاسقين لا کر بتا دیا کہ راضی نہ ہونے کی علت ان کا فسق اور طاعت نہ کرنا ہے۔ اب جو بھی ان سے راضی ہوگا۔ وہ بھی جادہ طاعت سے ہٹ جائے گا۔ حاصل یہ ہے کہ تمہارا راضی ہونا ان کے لیے سودمند نہیں ہے بلکہ خود تمہارے لیے نقصان دہ ہوگا کہ تم بھی اللہ سبحانہ کی مخالفت کرنے والوں میں ہو جاؤ گے۔

الْأَعْرَابُ أَشَدُّ كُفْرًا وَ
نِفَاقًا وَأَجْدَرُ أَلَّا يَعْلَمُوا حُدُودَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ ۗ
وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٩٧﴾ وَمِنَ الْأَعْرَابِ مَن يَتَّخِذُ مَا يُنفِقُ
مَغْرَمًا وَيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَائِرَ ۚ عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ السَّوْءِ ۗ وَ
اللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٩٨﴾ وَمِنَ الْأَعْرَابِ مَن يُؤْمِنُ بِاللَّهِ
وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنفِقُ قُرُبَاتٍ عِندَ اللَّهِ وَ
صَلَوَاتِ الرَّسُولِ ۚ أَلَا إِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ۚ سَيُدْخِلُهُمُ اللَّهُ فِي ۱۲
رَحْمَتِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٩٩﴾ ع ۱۰ ۱

ان دیہاتیوں میں کفر و نفاق (شہریوں کے مقابلے میں زیادہ ہے اور یہ
لوگ اللہ کی نازل کردہ رسول پر قوانین سے زیادہ بے خبر و ناآشنا ہیں
اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے[۱۰۲]۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ جو کچھ
خرچ کرتے ہیں اسے اپنے اوپر تاوان سمجھتے ہیں اور تم پر وقت کے حوادث
کا انتظار کر رہے ہیں۔ بری گردش ان پر ہی پڑنے والی ہے۔ اللہ سننے
والا جاننے والا ہے[۱۰۳]۔ اور کچھ دیہاتی ایسے بھی ہیں جو اللہ اور آخرت پر
ایمان رکھتے ہیں اور راہ خدا میں خرچ کو اللہ سے قرب اور نبوت کی دعاؤں کا
ذریعہ سمجھتے ہیں۔ آگاہ رہو کہ یہی چیز ان کے لیے اللہ سے قرب کا ذریعہ ہے۔

اللہ ضرور ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا بلاشبہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے

مفردات کے معانی

الاعراب، گنوار، بدو، دیہاتی، علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد عرب ہے اور اعراب دراصل اسی کی جمع ہے جو بادیہ نشینوں کا علم ہوگیا۔ لیکن مجد الدین فیروز آبادی نے قاموس میں تصریح کی ہے کہ اعراب بادیہ نشین عربوں کو کہتے ہیں۔ اس کا واحد نہیں ہے جمع اعاریب آتی ہے۔ اور بصائر ذوی التمیز میں علامہ موصوف رقمطراز ہیں کہ عرب کا اسم نسبت عربی ہے شہریوں کو عربی کہتے ہیں۔ عرب اسم جنس ہے خالص عرب کو العرب العاربہ بولتے ہیں۔ اعراب بادیہ نشینوں کو کہتے ہیں۔ اعراب عرب کی ایسی جمع نہیں ہے جیسے انباط انبط کی جمع ہے۔ اعرب بحجتہ کے معنے ہیں اس نے اپنے موقف کو بڑی بے باکی سے پیش کیا اور کسی سے نہیں ڈرا

علامہ شوکانی فتح القدیر میں رقمطراز ہیں کہ اعراب صحراؤں میں سکونت پذیر لوگوں کو کہتے ہیں۔ اس کے برخلاف لفظ عرب عام ہے کیونکہ اس کا استعمال ان تمام انسانوں کے لیے عام ہے جو ریگستان عرب کے باشندے ہوں۔ سیبویہ نے کہا ہے کہ اعراب صیغہ جمع تو ہے مگر لفظ عرب کی جمع نہیں ہے۔ نیساپوری کہتے ہیں کہ اہل لغت رجل عربی اس شخص کو کہتے ہیں جس کا نسب عرب کی طرح ثابت ہو جیسے مجوس مجوسی، یہود سے یہودی ہے ایسے ہی عرب عربی کی جمع ہے۔ جب کسی اعرابی کو یا عربی کہہ کر بلایا جاتا ہے تو وہ خوشی سے پھول جاتا ہے اور کسی عربی کو یا اعرابی کہا جائے تو وہ غصہ سے تپنے لگتا ہے۔

اجدر، یہ جدر سے اسم تفضیل ہے۔ اصل میں جدر کے معنے نمایاں اور ظاہر ہونے کے ہیں درخت پر پتوں کی نمود ہو جانے سے بولتے ہیں جدر الشجر زمین سے گھاس اگ جاتے تو اسے جدر کہتے ہیں اور اجدرت الارض بولتے ہیں۔ بچے کے چیچک نکل دے جدر الصبی بولتے ہیں جدر یجدر باب کرم سے آتا ہے اسکے معنے قابلیت میں حسن میں نمایاں ہونے کے آئے ہیں اسی سے جدیر لائق اور قابل کے معنے میں آتا ہے اسی سے یہ اجدر ہے اسی سے فعل تعجب ما اجدرہ واجدر بہ آتا ہے۔

مغرماً غرم سے مفعل کے وزن پر ہے۔ دوام اور ہمیشگی کے معنے میں ہلاکت و عذاب دائمی ہو غرام کہلاتا ہے ان عذابھا کان غراماً۔ غرم۔ مغرم اور غرامہ وہ تاوان جس کی ادائیگی لازمی ہو۔ غارم مقروض کو کہتے ہیں۔ مغرم اسیر محبت کو کہتے ہیں۔

دائرۃ یہ لفظ یا تو کاذبۃ اور عافیۃ کے وزن پر مصدر ہے اور مراد دور ہے اسم فاعل ہے۔ علامہ خفاجی لکھتے ہیں کہ نحبت اور اس مصیبت کے معنے میں ہے جو آدمی کی زندگی کا گھیراؤ کرے۔ اسی سے دائرہ خط محیط کو کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔

علامہ مجدالدین فیروز آبادی نے بصائر ذوی التمیز میں یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ جیسے محبوب پسندیدہ حالت کے لیے دولۃ بولا جاتا ہے ایسے ہی ناگوارا اور غیر پسندیدہ کے لیے دائرہ بولا جاتا ہے۔

قربات: یہ قرب یقرب سے قربۃ کی جمع ہے تقرب اور نزدیکی کو بھی کہتے ہیں اور تقرب کے ذریعے اور وسیلے کو بھی کہتے ہیں۔ قاضی بیضاوی نے اسے وسیلے کے معنے میں لیا ہے لیکن عام شارحین قرآن نے قرب کے معنے بتلائے ہیں۔

شہریوں اور بدؤں کا ایمانی موازنہ

ان آیات میں بدوی عربوں سے مراد وہ دیہاتی اور صحرائی عرب ہیں جو مدینے کے اطراف میں آباد تھے۔ یہ لوگ مدینے میں ایک مضبوط اور منظم طاقت کو اُٹھتے دیکھ کر پہلے تو مرعوب ہوئے۔ پھر اسلام اور کفر کی آویزشوں کے زمانے میں ایک مدت تک موقع شناسی اور ابن الوقتی کی روش پر چلتے رہے۔ پھر جب اسلامی حکومت کا اقتدار حجاز اور نجد کے ایک بڑے حصے پر چھا گیا اور مخالف قوتوں کا زور اس کے مقابلہ میں ٹوٹ گیا تو ان لوگوں نے وقت کا تقاضا یہی سمجھا کہ دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ لیکن ان میں کم لوگ ایسے تھے جو اس دین کو دین حق سمجھ کر سچے دل سے ایمان لائے ہوں۔ اور مخلصانہ طریقوں سے اس کے تقاضوں کو پورا کرنے پر آمادہ ہوں۔ بیشتر اعراب کے لیے قبولِ اسلام کی حیثیت ایمان و اعتقاد کی نہیں بلکہ محض مصلحت اور پالیسی کی تھی۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ ان کے حصے صرف وہ مادی فوائد آجائیں جو جماعت مقتدرہ میں داخل ہونے سے حاصل ہوتے ہیں۔ مگر وہ اخلاقی ذمہ داریاں جو اسلام ان پر عائد کرتا تھا وہ نماز کی پابندی جو اسلام میں داخل ہونے کے بعد ان پر لگ جاتی تھی۔ وہ زکوٰۃ جو باقاعدہ سرکاری انتظام میں انکے نخلستانوں اور ان کے جانوروں سے وصول کی جاتی تھی وہ جماعتی نظم و ضبط حکومت جس شکنجے میں وہ اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ کسے گئے تھے۔ وہ جان و مال کی قربانیاں جو اسلام کی برتری کے لیے ان سے طلب کی جارہی تھیں۔ یہ ساری چیزیں ان کو ناگوار تھیں۔ وہ ان سے پیچھا چھڑانے کے لیے ہر طرح کی چالبازیاں اور بہانہ سازیاں کرتے تھے۔ ان کو اس سے کچھ بحث نہ تھی کہ حق کیا ہے انہیں جو کچھ دلچسپی تھی وہ اپنے معاشی فوائد، اپنی آسائش اپنی زمینوں اپنے اونٹوں اور بکریوں

اور اپنے خیمے کے آس پاس کی محدود دنیا کیلئے تھی وہ ایسے ایمان و اعتقاد کے لیے بالکل تیار نہ تھے جو ان کی پوری تمدنی معاشی اور معاشرتی زندگی کو اخلاق و قانون کے ضابطہ میں کس دے اور مزید براں ایک عالمگیر اصلاحی مشن کے لیے ان سے جان و مال کی قربانیوں کا بھی مطالبہ کرے۔

۱۰۲ ان دیہاتیوں میں کفر و نفاق شہریوں کے مقابلے میں زیادہ ہے اور یہ لوگ رسول پر اللہ کے نازل کردہ قوانین سے شہریوں کے مقابلے میں زیادہ بے خبر ہیں۔ اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ یہاں تک مدینہ کے منافقین اور مومنین مخلصین کے حالات بیان ہوئے ہیں۔ اب کچھ حال دیہاتی بدوؤں کا ذکر کرتے ہیں کہ ان میں بھی کئی طرح کے آدمی ہیں کفار، منافقین اور مخلص مسلمان۔ چونکہ دیہاتی لوگ عموماً قدرتی طور پر تند خو اور سخت مزاج ہوتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں ہے من سکن البادیہ جفا۔ اور مجالس علم و حکمت سے دور رہنے کی وجہ سے تہذیب و شائستگی کا اثر اور علم و عرفان کی روشنی بہت کم قبول کرتے ہیں اس لیے ان کا کفر و نفاق شہری کفار و منافقین سے زیادہ ہوتا ہے ان کو ایسے مواقع دستیاب نہیں ہوتے کہ اہل علم و صلاح کی صحبت میں رہ کر دیانت و تہذیب کے وہ قانون اور قاعدے معلوم کریں جو اللہ سبحانہ نے پیغمبر علیہ السلام پر نازل کئے۔ علم و معرفت ہی وہ چیز ہے جو انسان کے دل کو نرم کرتی ہے اور مہذب بناتی ہے جو لوگ اس قدر جہالت میں غرق ہیں ضرور ہے کہ ان کے سخت دل ہوں اور کفر و نفاق کے جس راستے پر پڑ جائیں۔ بہائم اور درندوں کی طرح اندھا دھند پڑتے چلے جائیں۔ اعراب کی سنگدلی کا ذکر متعدد احادیث میں آیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ کسی اعرابی نے حضورؐ سے عرض کیا کہ آپ لوگ اپنے بچوں کا پیار لیتے ہیں خدا کی قسم میں نے اپنی اولاد کا کبھی پیار نہیں لیا۔ فرمایا میں کیا کروں! کہ اگر خدا نے تیرے دل میں سے اپنی رحمت کو نکال لیا ہے آخر میں فرمایا ہے واللہ علیم حکیم

یعنی اس کا علم بنی آدم کے تمام طبقات پر محیط ہے۔ وہ اپنی حکمت سے ہر ایک طبقہ کے ساتھ اس کی استعداد و قابلیت کے موافق معاملہ کرتا ہے حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ اعراب کی طبیعت میں بے حکمی غرض پرستی اور جہالت شدید ہوتی ہے۔ سو اللہ حکمت والا ہے ان سے وہ مشکل کام بھی نہیں لیتا ہے اور درجے بھی بلند نہیں دیتا ہے[1]

اس آیت میں شہریوں اور دیہاتیوں کا ایمانی تقابل پیش کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ ایمان کی حد تک

---

[1] افادات شیخ الاسلام

شہریوں کے مقابلہ میں ایمان کی نعمت دیہاتیوں میں کم ہے یعنی کفر و نفاق میں ان کا حصّہ زیادہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شہریوں کی بہ نسبت یہ اعراب دیہاتی اور بدوی لوگ زیادہ منافقانہ رویہ رکھتے ہیں۔ اور حق سے انکار کی کیفیت ان کے اندر زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ قرآن میں اللہ سبحانہ نے یہ بتائی ہے کہ شہری لوگ تو اہلِ علم اور اہلِ حق کی صحبت سے مستفید ہوکر اللہ کو اور اس کی حدود کو جان لیتے ہیں۔ مگر یہ بدوی چونکہ ساری ساری عمر بالکل ایک معاشی حیوان کی طرح شب و روز رزق کے چکر میں پڑے رہتے ہیں۔ اور حیوانی زندگی کی ضروریات سے بلند تر کسی چیز کی طرف توجہ کرنے کا ان کو وقت ہی نہیں ملتا ہے اس لیے دین اور اس کی حدود سے ان کے ناواقف رہنے کے امکانات زیادہ ہیں۔

دراصل اس سے پہلی آیات میں نفاق کے بارے میں عمومی گفتگو تھی۔ شہری اور دیہاتی کی کوئی تفصیل نہ تھی۔ ان آیات میں خصوصیت کے ساتھ شہریوں کے ساتھ دیہاتیوں کا ذکر کیا ہے اور عام قاعدہ ہے کہ آدمی جس قدر علما اور عقلا کی صحبت سے بیگانہ ہوگا اسی قدر بے علمی میں زیادہ ہوگا۔ آیت میں اعراب سے عربی مراد نہیں بلکہ عرب کے دیہاتی مراد ہیں اور یہ عرب کے دیہاتی کی خصوصیت نہیں بلکہ پوری دنیا کے دیہاتیوں کی یہ خصوصیت ہے۔ ہمارے مشہور مورخ ابن خلدون نے اعراب کو عربی سمجھ کر پورے عرب کی یہ خصوصیت بنا ڈالی کہ وہ تمدن و تہذیب اور شہریت سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ گویا بدویت عرب کی کوئی خاص نشانی ہے۔ حالانکہ صورتحال یہ نہیں ہے عرب کا لفظ ہر عربی کے لیے بولا جاتا ہے۔ جبکہ اعراب صرف بدویوں کو کہتے ہیں۔ عرب میں دیہاتی اور شہری ہوتے ہیں جیسے دنیا کی ساری قوموں میں ہوتے ہیں۔ اور دیہاتیوں کے بارے میں جو یہ فرمایا ہے۔ اجدر ان لا یعلموا حدود ما انزل اللہ علیٰ رسولہ یہ امر واقعہ کا اظہار ہے۔ شہری زندگی میں بھی جو لوگ اہلِ علم اور اہلِ علم کی صحبت سے بیگانہ ہوتے ہیں وہ شہری ہوکر بھی دین سے ویسے ہی بے خبر ہوتے ہیں۔

آیت کے مفہوم سے یہ بات سمجھی جارہی ہے کہ دین سے باخبر ہونے اور واقف ہونے کیلئے اصل چیز اہلِ علم کی صحبت ہے۔ علم دراصل اہلِ علم کی صحبت سے آتا ہے اسی لیے نبوت کے تلامذہ اور مسترشدین کو صحابہ کہا ہے یعنی ان میں علم کے سارے کمالات نبوت کی صحبت سے آئے ہیں۔ الجصاص نے آیت سے یہ بات خوب سمجھی ہے کہ:

> لوگ قرآن کو کم سنتے تھے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہنے کا ان کو موقع کم ملتا تھا۔ اس لیے دین سے ناآشنا اور بے خبر تھے۔

علامہ آلوسی نے یہ بات بہت خوب لکھی ہے کہ سب کا نہیں۔ کچھ کا حکم ہے اور کچھ بھی وہ کفر و نفاق میں شہریوں سے زیادہ ہیں جن کو علمی مجالس میں آنے کا موقعہ نہیں ملتا ہے۔ یہ ایسا ہی حکم ہے کان الانسان کفورا یعنی کچھ

کی ناشکری ہے یہاں پوری انسانی جنس کو کفور قرار دیا ہے۔ ایسے ہی یہاں بھی ہے آگے دیہاتیوں کی تقسیم اس کی دلیل ہے۔

اعراب کی اسلام دشمنی

۱۰۳ ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے اپنے اوپر تاوان سمجھتے ہیں۔ اور تم پر وقت کے حوادث کا انتظار کر رہے ہیں بُری گردش ان پر ہی پڑنے والی ہے اللہ سننے والا جاننے والا ہے یعنی اعراب منافقین میں وہ لوگ ہی نہیں جنہیں اگر کسی وقت خدا کے راستے میں کچھ خرچ کرنا پڑ جاتا ہے تو ایسی کراہیت سے خرچ کرتے ہیں جیسے کوئی جرمانہ اور تاوان ادا کرتا ہو۔ وہ ابھی تک اس کے منتظر ہیں کہ مسلمان حوادث دہر سے کسی گردش اور آفت میں پھنس جائیں تو ہم خوب شادیانے بجائیں۔ یہ خبر نہیں کہ ان کی بھی قسمت گردش میں رہتی ہے اسلام تو غالب اور فائق ہو کر رہے گا۔ اور یہ منافقین سخت ذلیل و رسوا ہوں گے۔ خدا ہر ایک کی باتیں اور دعائیں سنتا ہے اور جانتا ہے کہ کون عزت و کامیابی کا اہل ہے اور کون لوگ ذلت و رسوائی کے مستحق ہیں [۱]

اس سے پہلے مطلق دیہاتیوں کا تعارف تھا اب ان کی قسمیں بتائی جا رہی ہیں۔ کچھ اعرابی ایسے ہیں جو اگر اسلام کی راہ میں کچھ خرچ کرتے ہیں تو محض اس ڈر سے کہ سمجھتے ہیں کہ اس کے بغیر چارہ نہیں ہے اور یہ خرچ کرنا ان کے لیے ایسا ہے جیسے کوئی ناگواری سے جرمانہ بھرے۔ وہ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ مسلمانوں پر کوئی مصیبت آپڑے تو ان پر الٹ پڑیں۔ غزوہ تبوک کے موقعہ پر انھوں نے سمجھا ہوگا کہ رومیوں کے مقابلہ میں مسلمان کب ٹھہر سکتے ہیں اب ان کے دن ختم ہو رہے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ جب مدینے میں اسلامی حکومت وجود میں آگئی اور دیہاتی قبائل محض غلبہ سے حلقہ بگوش اسلام ہو گئے اور مسلمان ہونے کے بعد اسلامی حکومت کی جانب سے ان پر فرائض عائد ہوتے۔ ان میں تنہا ان فرائض نماز اور زکوٰۃ تھے اور یہی دونوں اسلام کی اجتماعیت کے ارکان تھے۔ وہ پراگندہ زندگی کے خوگر تھے اجتماعیت اور نظام وفاداری ان کے لیے ناقابل برداشت تھی جب ان سے زکوٰۃ وصول کی جاتی تو اسے یہ ایک جرمانہ سمجھتے مسافروں کی ضیافت اور مہمانداری کے حق کو وہ اپنے لیے چٹی تصور کرتے۔ اگر دفاع کے موقعہ پر کوئی چندہ دینے

[۱] افادات شیخ الاسلام

تو دلی جذبہ سے رضائے الٰہی کی خاطر نہ دیتے بلکہ بادل ناخواستہ اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لیے دیتے ہیں گویا اسلام اور اس کے نظام کے لیے ان کی بدخواہی کا حال یہ ہے کہ اول تو کھلے دل سے اسلامی نظام کی اطاعت ہی نہیں کرتے اگر ظاہر کی وجہ سے کچھ کرتے ہیں تو ان میں اس کے لیے گرانی ہوتی ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ان کی ہر وقت تمنا یہ ہے کہ اسلام کے نام پر بنا ہوا یہ سیاسی ڈھانچہ کسی طرح ختم ہو جائے اور ان کی جان چھوٹے علیھم دائرۃ السوء یہ تمہارے لیے وقت کی غلط کروٹ کے منتظر ہیں۔ حالانکہ گردش ان پر ہی پڑنے والی ہے شارحین اس فقرے کی تشریح میں مختلف الرائے ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ یہ جملہ انشائیہ ہے اور دعا ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ جملہ خبریہ ہے۔ قاضی بیضاوی، علامہ آلوسی اس کو جملہ انشائیہ بتا رہے ہیں اور دعا کہتے ہیں زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ جملہ خبریہ ہے اور ان کے بارے میں مستقبل میں ہونے والے واقعات کی خبر ہے قرآن کی عادت یہی ہے کہ وہ منافقوں اور مجرموں والے الفاظ ان ہی پر الٹ دیتا ہے اور عملاً یہ پیشین گوئی لفظ بہ لفظ پوری ہو کر رہی۔ اسلام کی فتح مندیوں میں وسعت ہوتی گئی۔ منافقین کی حسرتیں دل ہی میں رہیں۔ ہر طرح ذلیل و خوار ہوتے۔ آیت سے یہ پہلو بھی نکلتا ہے کہ حاسد خود ہی گرفتار بلا ہوتے ہیں۔

اعراب میں مخلصین اور راستباز

۱۰۴ اور کچھ دیہاتی ایسے ہیں جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور راہ خدا میں خرچ کو اللہ سے قرب اور نبوت کی دعاؤں کا ذریعہ سمجھتے ہیں آگاہ رہو کہ یہی چیز ان کے لیے قرب کا ذریعہ ہے۔ اللہ ضرور ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ بلاشبہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ یہاں قرآن حکیم کی معجزانہ تاثیر اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا حیرت انگیز کرشمہ دکھلایا ہے کہ ان میں درشت مزاج، سنگدل تند خو گنواروں میں جو کفر و نفاق اور جہل و طغیانی کی وجہ سے اس لائق ہی نہ تھے کہ خدا کے بتلائے ہوئے ادب اور قاعدے سمجھ سکیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور قرآن کریم کی آواز نے ایسے عارف اور مخلص افراد پیدا کر دیئے جو مبدأ و معاد سب چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ سبحانہ کی راہ میں جو کچھ خرچ کرتے ہیں خالص قرب الٰہی حاصل کرنے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں لینے کی غرض سے کرتے ہیں حق تعالیٰ شانہ نے ان کو بشارت دی کہ بے شک وہ اپنی امیدوں میں حق بجانب ہیں۔ یقیناً ان کو وہ چیز مل کر رہے گی جس کی نیت کی ہے۔ یعنی قرب الٰہی اور اللہ سبحانہ ضرور ان کو اپنی رحمت میں جگہ دے گا۔

رہی پیغمبر علیہ السلام کی دعا، اسے تو وہ اپنے کانوں سے سنتے اور آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ جب کوئی صدقہ

وغیرہ لے کر آتا ہے تو حضور اس کو دعائیں دیتے ہیں حضور کی اس دعا کا ثمرہ بھی وہ ہی رحمت و قرب الٰہی ہے جس کا وعدہ پہلے ہو چکا ہے[1]

عام شارحین قرآن نے تو آیت کی یہی تشریح کی ہے کہ یہ دیہاتی اہل ایمان راہ خدا میں خرچ کرنے کو اللہ کے قرب اور حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعاؤں کے حاصل ہونے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اس صورت میں صلوات الرسول کا عطف ماینفق پر نہیں بلکہ قربات پر ہے اور مطلب ہے کہ یہ اہل ایمان راہ خدا میں خرچ کرنے کو اللہ کے قرب اور حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعاؤں کے حاصل ہونے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اس صورت میں لفظ سبب محذوف ماننا پڑے گا۔ گویا ان مومنین کا انفاق دو چیزوں کا ذریعہ ہوتا ہے

ایک اللہ سے قرب کا ذریعہ ہوتا ہے۔

دوسرے رسول کی دعائیں حاصل ہونے کا ذریعہ ہوتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ صلوات الرسول کا عطف ماینفق پر کیا جائے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ یہ مومنین اپنے انفاق اور رسول کی دعاؤں کو اللہ سبحانہ کے قرب کا ذریعہ بناتے ہیں۔ مطلب دونوں صحیح ہیں اور مآل دونوں کا ایک ہے لیکن انداز تعبیر دوسری صورت سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ اہل تراجم نے بھی پہلی صورت کو شرف پذیرائی دیا ہے اور ہم نے بھی ترجمہ میں اس کی رعایت کی ہے۔

بہر حال اس آیت میں بتا دیا گیا ہے کہ ان اعراب میں سے وہ بھی تھے۔ جن کا ذکر ہو چکا ہے اور یہ بھی ہیں جن کا چہرہ اس آیت میں پیش ہو رہا ہے فرمایا کہ ان اعراب میں سچے اور پکے مسلمان بھی ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر مضبوط ایمان رکھتے ہیں۔ اللہ سبحانہ کی راہ میں خرچ کرنے کو وہ منافقین کی طرح تاوان نہیں سمجھتے بلکہ اپنے انفاق کو اللہ سبحانہ کے قرب اور رسول کی دعاؤں کے ملنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس سے پہلی آیات یعنی پارہ دہم میں حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) کو منافقین کے لیے دعا کرنے سے منع کر دیا ہے۔ اس آیت میں اشارۃً بتا دیا گیا کہ ایمان میں جس کھوٹ کی وجہ سے ان کے لیے دعا سے روکا گیا تھا۔ ایمان میں وہ کھوٹ ان میں بالکل نہیں ہے بلکہ یہ سچے اور پکے مومن ہیں۔ ان میں طاعت رسول کی بھرپور سرشاریاں ہیں اور اللہ سے قرب حاصل کرنے کے لیے وہ راہ خدا میں جان و مال کی بازی لگاتے ہیں۔ ان کے یہی اعمال ان کے لیے رسول کی دعاؤں کو اپنی طرف کھینچ لاتے ہیں۔ اور رسول کی دعاؤں سے مالا مال ہیں۔ ان لوگوں نے اسلام کے سیاسی نظام کو دل و جان سے قبول کیا ہے اور اسلامی حکومت کے واجبات کو خوشدلی اور ایمانی امنگ کے ساتھ ادا کرتے ہیں اور زندگی کے کسی گوشہ میں اسلامی نظام سے سرکشی نہیں کرتے ہیں ایسا نہیں ہے کہ مانتے ہیں قرآن کو خدا کی کتاب اور محمد مصطفےٰ کو اللہ کا رسول اور مقدمات

[1] افادات شیخ الاسلام

کے فیصلے کے لیے جاتے ہیں طاغوت کی عدالت میں یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت اور نہ ایسا ہے کہ مانتے ہیں اسلام کو مگر اسلام کے سیاسی نظام کے عائد کردہ مالی واجبات کو تاوان اور جرمانہ سمجھتے ہیں۔ بلکہ ان کے ایمان میں بھرپور اخلاص ہے۔ ان کو اللہ کا قرب حاصل ہے اور انکے لیے اللہ کے رسول کی دُعائیں ہیں۔ گویا ان کی اسلام کے لیے وفاداریاں ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہیں۔ آیت میں ایمان نفاق کا مقابل ہونے کی وجہ سے بمعنے تصدیق نہیں بلکہ بمعنے اخلاص ہے۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے الا انھا قوبۃ لھم عام شارحین قرآن نے ضمیر کا مرجع ینفق میں انفاق بتایا ہے لیکن علامہ خازن نے ضمیر کا مرجع صلوات کو قرار دیا ہے مطلب یہ ہے کہ حضور کی دعائیں ان کے لیے قرب الہٰی کا ذریعہ ہیں۔ اگر ضمیر کا مرجع ان کا اللہ کی راہ میں جان مال کا خرچ کرنا ہو۔ تو اس صورت میں یہ ان کے اخلاص اسلام سے وفاداری اور اسلام کے سیاسی نظام کی مخلصانہ طاعت کے لیے اللہ سبحانہ کی شہادت ہے۔ سب اعمال ایمانی کا حاصل اور لب لباب اللہ کا قرب ہے اللہ سے قرب مکانی اور جسمانی نہیں ہوتا اللہ کی ذات جسم و مکان سے پاک ہے اللہ سے قربت اور صرف یہ ہے کہ بندہ اس کی بندگی کرے پرستش کرے عبادت کرے طاعت کرے۔ اس کو یاد کرے۔ اسلام میں ساری عبادات کا مآل قرب الہٰی ہے۔ بندے کی جانب سے عبادت ہو طاعت ہو یاد ہو تو اللہ کی جانب سے بندے پر یہ انعام ہوتا ہے۔ سید خلھم اللہ فی رحمتہ ان اللہ غفور رحیم اللہ ان کو ضرور اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ اللہ کی رحمت میں داخل کرنے کا مطلب نہیں ہے کہ صرف آخرت میں جنت کی نعمتوں سے نوازا جائے گا بلکہ فاتاھم اللہ ثواب الدنیا وحسن ثواب الاخرۃ کے مطابق اہل ایمان کو دنیا کے انسانوں کی ہدایت کا ذریعہ بنایا جائے گا اور ان سے امامت کا کام لیا جائے گا پارہ دس میں پڑھ چکے ہو یبشرھم ربھم برحمۃ منہ رحمت میں داخل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ تمہیں صرف انفرادی زندگی میں نہیں بلکہ تمہیں قانونی اخلاقی سیاسی اور عائلی زندگی کے تمام گوشوں اجتماعی طور پر رحمت میں داخل کرے گا۔

پہلی آیت میں وعید کو واللہ سمیع علیم یعنی اللہ سبحانہ ان کے ارادوں کو جانتا ہے اور ان کی باتوں کو سن رہا یہاں فرمایا کہ ان اللہ غفور رحیم۔ رحمت میں اس لیے داخل کرے گا کہ اللہ سبحانہ کی ذات غفور رحیم ہے۔ غفور پہلے یہ بتلانے کے لیے آیا ہے کہ اولاً تمہارے گناہوں کو بخشے گا پھر تم پر اپنی رحمت نازل فرمائے گا یا یہ بتانے کے لیے پہلے لایا گیا ہے کہ رحمت کے راستہ میں جس قدر رکاوٹیں ہیں ان سے تمہاری حفاظت فرمائے گا اور تمہیں اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ اللھم اجعلنا منھم۔

پارہ نمبر ۱۱

تقابلی مطالعہ

یہاں بھی اعراب کا تذکرہ ہے اور سورہ فتح میں بھی اعراب کا ذکر ہو رہا ہے۔ یہاں ان کا تذکرہ غزوہ تبوک کے سلسلے میں ہوا ہے اور سورہ فتح میں ان کا قصہ صلح حدیبیہ کے پیش نظر بیان کیا گیا ہے اور دونوں جگہ منافقین کے تذکرے کے بعد مخلصین اہل ایمان کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ یہاں عنوان ہے السابقون الاولون اور وہاں عنوان ہے لقد رضی اللہ عن المومنین اور پورے دو رکوع سورت کے آخر تک ان مخلصین اہل ایمان کا چہرہ پیش کرنے ان کے مناقب بیان کرنے ان کے مقام تقویٰ اور نظام محبت کو واضح کرنے کے بعد تورات و انجیل تمثیلات کے ذریعے ان کا تعارف پیش کیا ہے۔

یہاں اعراب کی دو قسمیں بتائی ہیں ایک وہ ہیں جو راہ مولیٰ میں خرچ کرنے کو تاوان سمجھتے ہیں اور اپنی بزدلی کی وجہ سے مسلمانوں پر زمانے کی گردش کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ان اعراب میں وہ بھی ہیں جو صحیح معنے میں اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور اس وجہ سے وہ ذکر الٰہی اور فکر آخرت کی نعمت سے مالا مال ہیں۔ وہ راہ خدا میں جو کچھ بھی خرچ کرتے ہیں اسے حق سبحانہ سے قرب و رضا کا اور حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) سے دعائیں حاصل ہونے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

بلا ریب راہ خدا میں دی گئی چیز جب دینے والا اللہ کے قرب کا ذریعہ بنا کر دے وہ اللہ سبحانہ سے قرب کا بہت بڑا مضبوط اور پائیدار ذریعہ ہے اس کے نتیجے میں اللہ سبحانہ ان کو ضرور اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔

یہاں یہ نکتہ خاص طور پر سمجھنے کا ہے کہ اعراب کی کمزوریوں اور خوبیوں کے ذکر سے پہلے یہ لطیف بات بتائی ہے کہ اعراب میں جس قدر برائی دیکھی جا رہی ہے اور ان برائیوں میں جس قدر شدت محسوس ہو رہی ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اعراب کا یہ طبقہ اپنی بدوی زندگی کی وجہ سے اسلام کے فکری، روحانی، معاشی اور سیاسی نظام سے قطعاً بے خبر ہے اور یہ بے علمی ان میں کمزوریوں کو جنم دیتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عمل علم کی پستانوں سے دودھ پی کر پلتا اور جوان ہوتا ہے بے خبر اور بے علم طبقے سے عمل کی محنت کی اور قربانیوں کی توقع بے معنے ہے۔ اشاروں اشاروں میں بتا دیا کہ کسی بھی نظام کیلئے قربانی کی پہلی شرط اس نظام کا نظام ماننے والوں میں علم ہے۔ آج بھی ہماری کمزوریوں، نافرمانیوں اور رسم و رواج کی بندگی کی اصل علت یہی ہے کہ ہم میں سے ... اگر اسلام کو مانتے ہیں تو ۹۹۹ اسلام کو جانتے ہی نہیں ہیں اس کے نتیجے میں آج بھی اگر ہم زکوٰۃ کو تاوان اور کار خیر میں خرچ کو ڈنڈ نماز پڑھنے کو وقت کی اضاعت رمضان کے روزے

فاقہ اور حج بیت اللہ کو پکنک سمجھتے ہیں تو اس پر حیرت نہیں ہے لجدر ان لا یعلموا حدود ما انزل اللہ علی رسولہ کا ناگزیر تقاضا ہے اشد کفرا و نفاقا۔ اسلام ناآشنائی ناخدا شناسی اور خدا کی بغاوت کی جڑ اور اساس ہو تو اس اساس پر جو عمارت اٹھے گی۔ اس میں کفر و نفاق کی شدت ہی شدت ہو گی گذشتہ صدیوں سے مسلمانوں پر جو پست ہمتی بے حسی اور مرعوبیت چھائی ہوئی ہے جس نے مسلمانوں کی عملی قوتوں کو بری طرح مجروح کر دیا ہے اگر اس زمانے پر صرف کفر و نفاق کی طاقتوں کا غلبہ ہے اور اسلام و ایمان کا درخت مرجھا رہا ہے تو اس کی علت اسلام ناآشنائی کے سوا کیا ہے یہ اسلام ناآشنائی ہے کہ مسلمانوں کے عوام اور رہنماؤں میں سے مجاہدانہ زندگی کا ذوق اور راہ حق میں صعوبتیں برداشت کرنے کا حوصلہ کم ہونا شروع ہوا۔

قومی عروج و ترقی اور اجتماعی کامیابیوں کے اسباب کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ مقصد کا شعور نظام سے آشنائی اور اس کے حصول کی طلب و آرزو وہ اصلی قوت ہے جو اقوام ملل کو کامیابی اور عظمت کی راہ پر لگاتی ہے۔ جماعت ہو یا فرد مقاصد کی آشنائی کی کشش اور اس کی جدوجہد کا جذبہ محرک ہے۔ مقصد ہی حیات ہے۔ انفرادی زندگی میں ہم روزانہ اس حقیقت کا مطالعہ کرتے ہیں کہ کامیابی اور عزت انہیں افراد کے حصے میں آتی ہے جو ابتداء سے کسی مقصد کا شعور رکھتے ہیں اور اس کے حصول کی خاطر زندگی کی دوسری دلچسپیوں کو قربان کرنے پر آمادہ رہتے ہیں وہ شخص جو مقصد سے آشنا نہیں اور اپنے مقصد کا پورا شعور نہیں رکھتا کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

یہاں قرآن نے ان لا یعلموا حدود ما انزل اللہ علی رسولہ کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہے اور اپنے مخاطبوں کو سمجھایا ہے کہ جب تک اسلام کے ماننے والوں میں اسلامی شعور کی آبیاری نہ ہو گی ان سے اسلام کی برتری کی امید رکھنا عبث ہے۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ

مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ

پارہ نمبر ۱۱

رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا
الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَمِمَّنْ
حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ړ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ڀ
مَرَدُوْا عَلَي النِّفَاقِ ۣ لَا تَعْلَمُهُمْ ۭ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۭ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ
ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ۝ وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ
خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ
اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

اور وہ مہاجرین اور انصار جنھوں نے ایمان کی دعوت پر لبیک کہنے میں سب سے پہلے سبقت کی ہے۔ اور وہ لوگ جنھوں نے ان کی راست بازی کے ساتھ پیروی کی۔ اللہ ان سے راضی ہو گیا۔ اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ اور اللہ نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے اور تمھارے اردگرد جو اعرابی رہتے ہیں ان میں سے خود مدینہ شہر کے کچھ منافق نفاق پر اڑے ہوئے ہیں تم ان کو نہیں جانتے ہو مگر ہم ان کو خوب جانتے ہیں۔ ہم ان کو دو بار سزا دیں گے۔ پھر ان کو سنگین عذاب کی

طرف لوٹایا جائے گا۔ اور کچھ اور بھی ہیں جنھوں نے اپنی غلطی کو مان لیا ہے۔ انھوں نے ملے جلے کام کیے۔ کچھ اچھے، کچھ برے۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ سبحانہ ان کی توبہ قبول فرمائے۔ اللہ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے ۱۰۲

مفردات کے معانی

السابقون یہ سبق سے اسم فاعل کی جمع مذکر ہے اس کے معنے آگے پہنچنے والے آگے بڑھنے والے مجدالدین نے بصائر میں لکھا ہے۔ ضرب اور نصر دونوں سے آتا ہے چلنے میں آگے ہونے کے معنے میں سبق سے استباق اور تسابق ہے جس کے معنے مقابلہ میں ایک دوسرے سے آگے ہونے کے ہیں۔

الاولون یہ اول کی جمع مذکر سالم ہے۔ خلیل کی رائے میں اس کا مادہ ہمزہ واؤ اور لام ہے۔ اور کچھ کی رائے میں دو واؤ اور ایک لام ہے۔ پہلی صورت میں یہ اول سے مشتق ہوگا آل یؤل کے معنے لوٹنے کے ہیں اس کی اصل صفت سے اوئل ادغام سے اول ہو گیا۔ یہ اصل میں صفت ہے مونث اولیٰ آتا ہے۔ امام راغب رح مفردات میں لکھتے ہیں لفظ اول کئی طرح استعمال ہوتا ہے تقدم زمانی جیسے عبدالملک اولاثم منصور تقدم رتبی جیسے الامیر اولاثم الوزیر تقدم نسبتی عراق سے مکہ کی طرف جانے والے سے آپ کہیں القادسیہ ثم فید جیسے الاساس اولاثم البناء۔ حافظ ابن تیمیہ نے الاکلیل میں اس کی لطیف تحقیق فرمائی ہے کہ آل یؤل کے معنے لوٹنے کے ہیں۔ اسی سے مآل ہے اشتقاق کبیر میں لفظ موئل بھی بنا ہے۔ موئل کے معنے بھی لوٹنے کی جگہ کے ہیں۔ اور اشتقاق صغیر میں لفظ آل بھی اسی سے بنا ہے۔ اسی آل کے لیے ضروری ہے کہ مضاف الیہ مضاف سے زیادہ عظیم ہو۔ اسی سے اول افعل کے وزن پر ہے۔ اس کا مونث اولیٰ آتا ہے۔

امت کے بہترین طبقے

پہلے چونکہ اعراب میں مطلق اہل ایمان کا تذکرہ کیا تھا اس لیے اب ان مومنین کی فرق مراتب کے اعتبار سے قسمیں بتائی جا رہی ہیں۔ اور یہ تقسیم ان کے ناموں اور اشخاص کے لحاظ سے نہیں بلکہ ان کے کاموں اور کردار سے۔

قرآن کا عام اسلوب یہ ہے کہ وہ اعیان و اشخاص سے نظر ہٹا کر اعمال افکار اور اخلاق کو پیش کرتا ہے جن کے سہارے یہ اشخاص شخصیتیں بنتے ہیں اشخاص و اعیان میں تو وہ صرف انبیاء و رسل کا ذکر کرتا ہے۔ باقی کے اشخاص کا نہیں بلکہ اعمال کا ذکر کرتا ہے۔ یہاں بھی ایمان، ہجرت، نصرت اور جہاد میں سبقت کرنے والوں اور ان کاموں میں اولیت کا شرف حاصل کرنے والوں کا ذکر کیا ہے۔ علامہ بقاعی نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ

> اس سے پہلی امت میں چونکہ عام اہل ایمان کا تذکرہ تھا اور ان میں اولیت اور سبقت کے اعتبار سے فرق مراتب تھا۔ اس لئے پہلے یہاں سابقین کا اس انداز سے ذکر کیا ہے کہ شہری اور دیہاتی سب کو شامل ہو جائے۔

ایمان میں اگر صرف ایک ذمہ داری ہے اور وہ یہ کہ اپنے دین کی مخلصانہ طاعت کریں تو ہجرت میں اس عام ذمہ داری کے ساتھ اور ایک ذمہ داری کا بھی ذکر کر دیا ہے۔ اور وہ یہ کہ بیرونی دنیا کے سامنے اسلام کو پیش کرنا اس زندگی کا نصب العین ہے۔ اور یہ پیش کرنا اس طرح ہے جس طرح پیش کرنے کا حق ہے اور جس کا عملی نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سامنے رکھا تھا۔ دراصل اس معاملہ میں صورت واقعہ یہی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ پوری دنیا کے لیے اور قیامت تک کے لیے رسول ہو کر آئے تھے۔ لیکن اس عالمگیر دعوت کے دنیا میں قائم ہونے کی صورت اللہ سبحانہ نے یہ متعین فرمائی کہ آپ اپنا قائم مقام ایک ایسا گروہ بنا کر جائیں جو اپنے ایمان میں اتنا پختہ اور اپنے عمل میں اتنا معیاری ہو کہ رضائے الٰہی کے پیمانے پر پورا اتر سکے اور وہ آپ کے بعد آپ ہی کی طرح نبوت کے کام کو چلا سکے۔ چنانچہ جب عرب فوج در فوج دین کے حلقے میں داخل ہو گئے اور حضور اقدس کے صحابہ کا وہ مقدس گروہ وجود میں آ گیا جو علم و عمل کے اعتبار سے رضائے الٰہی کا معیاری پیمانہ بنا تو آپ رحلت فرمائے دار بقا ہو گئے صلی اللہ علیہ وعلی آلہ و بارک وسلم۔ اور وہ مہاجرین و انصار جنہوں نے دعوت ایمان پر لبیک کہنے میں سب سے پہلے سبقت کی ہے۔ اور وہ لوگ جنہوں نے ان کی راستبازی کے ساتھ پیروی کی ہے۔ اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے اور اللہ نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کئے ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔ اعراب مومنین کے بعد مناسب معلوم ہوا کہ زعماء اور داعیان مومنین کا کچھ ذکر کیا جائے۔ یعنی جن مہاجرین نے ہجرت میں سبقت و اولیت کا شرف حاصل کیا اور جن انصار نے نصرت و اعانت میں پہل کی۔ غرض جن لوگوں نے قبول حق اور خدمت

اسلام میں جس قدر آگے بڑھ کر حصے لیے۔ پھر جو لوگ نیکوکاری اور حسن نیت سے ان پیشروان اسلام کی پیروی کرتے رہے ان سب کو درجہ بدرجہ خدا کی خوشنودی اور حقیقی کامیابی حاصل ہو چکی ہے جیسے انہوں نے پوری خوشی اور انشراح قلب کے ساتھ حق تعالیٰ کے احکام تشریعی اور قضائے تکوینی کے سامنے گردنیں جھکا دیں۔ اسی طرح خدا نے ان کو اپنی رضا و خوشنودی کا پروانہ دے کر غیر محدود انعام واکرام سے سرفراز فرمایا (تنبیہ) مفسرین سلف کے اقوال السابقون الاولون کی تعیین میں مختلف ہیں بعض نے کہا ہے کہ وہ مہاجرین وانصار مراد ہیں جو ہجرت سے پہلے مشرف باسلام ہوئے۔ بعض کے نزدیک وہ مراد ہیں جنہوں نے دونوں قبلوں کعبہ و بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی۔ بعض کہتے ہیں کہ جنگ بدر تک مسلمان سابقین اولین ہیں۔ بعض حدیبیہ تک اسلام لانے والوں کو اس کا مصداق قرار دیتے ہیں اور بعض مفسرین کی رائے ہے کہ تمام مہاجرین وانصار اطراف کے مسلمانوں اور پیچھے آنے والی نسلوں کے اعتبار سے سابقین اولین ہیں۔ ہمارے اور پیچھے آنے والی نسلوں کے اعتبار سے سابقین اولین ہیں۔ ہمارے نزدیک ان اقوال میں تعارض نہیں ہے۔ سبقت واولیت اضافی چیزیں ہیں۔ ایک ہی شخص یا جماعت جس درجہ میں سابق واوّل ہوگی اسی قدر رضائے الٰہی اور حقیقی کامیابی سے حصہ پائے گی۔ کیونکہ سبقت و اوّلیت کی طرح رضا و کامیابی کے بھی بہت مدارج بہت سے ہو سکتے ہیں[1]۔

جیسا کہ محشی علام نے بتایا ہے کہ شارحین قرآن السابقون الاولون کا خارج میں مصداق مقرر کرنے میں مختلف الخیال ہیں قتادہ کہتے ہیں وہ سب جنہوں نے قبلتیں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی عطار ابن ابی رباح کی رائے ہے وہ ہیں جو بدر میں شریک ہوئے اور شعبی کا خیال ہے کہ بیعت رضوان والے ہیں پھر تو مہاجرین کی حد تک اختلاف ہے۔ یہی حال انصار کے بارے میں ہے کچھ کہتے ہیں عقبہ اول میں بیعت کرنے والے ہیں یہ بعثت کے گیارہویں سال میں سات آدمیوں نے کی تھی۔ اور عقبہ ثانیہ میں بیعت والے ہیں ستر افراد پر مشتمل جماعت تھی اور یہ بیعت بعثت کے بارہویں سال ہوئی اور یا وہ لوگ مراد ہیں جو مصعب بن عمیر کی دعوت پر مسلمان ہوئے تھے۔

ہمیں یہاں امام رازی کی بات پسند آئی ہے کہ قرآن نے جس سبقت اور اولیت کا ذکر کیا ہے اس کا تعلق جب خود قرآن میں بطور وصف، موجود ہے تو قرآن سے باہر اس کا متعلق تلاش کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قرآن نے نمایاں طور پر دو وصف بتائے ہیں ایک ہجرت میں پیش پیش ہونے والے اور نصرت میں سبقت کرنے والے۔ یہ دونوں اسلام کی سربلندی کی تاریخ میں اساس کی حیثیت رکھتی ہیں۔

دنیا کی نظروں میں اسلام کے ظہور و اقبال کا دور مدینہ کی زندگی ہے لیکن قرآن کی نظر میں اس کی زندگی کا اصلی دور ہجرت اور نصرت سے وابستہ ہے۔ کیونکہ اس کی ساری قوتوں کی بنیادیں ہجرت و نصرت سے استوار ہوئی ہیں۔ بلاشبہ بدر کے ہتھیاروں نے اپنی غیر مسخر طاقت کا دنیا میں اعلان کر دیا لیکن جو ہاتھ ان ہتھیاروں کے قبضوں پر جمے تھے ان کو طاقت تو ہجرت و نصرت ہی نے فراہم کی تھی بلاشبہ مکہ کی فتح کی راہ کیسے ہموار ہوتی۔ یہ صحیح ہے کہ مکہ ہتھیاروں سے فتح ہوا ہے لیکن مدینہ ہتھیاروں سے نہیں بلکہ ہجرت اور نصرت کے مقدس اعمال سے ہوا ہے۔ لہٰذا اسلامی تاریخ کے سارے مظاہر کی روح ہجرت اور نصرت میں اسلامی ترقیوں کے سارے مظاہر اگر برگ و بار ہیں تو ہجرت و نصرت اسی کا تخم ہے مظاہر اگر ستون و محراب ہیں تو ہجرت و نصرت بنیاد ہیں مظاہر کی حیثیت اگر صورت جسم کی ہے تو ہجرت و نصرت کی حیثیت حقیقت اور روح کی ہے مظاہر خواہ کتنے شاندار ہوں لیکن ہجرت و نصرت کو اولین بنیاد و استعداد کی عظمت حاصل ہے۔

مہاجرین میں سے السابقون الاولون یعنی مکہ کے وہ حق پرست جنہوں نے دعوت حق کی قبولیت میں سبقت کی اور سب سے پہلے ایمان لائے پھر صلح حدیبیہ سے پہلے اپنا گھر بار چھوڑ کر ہجرت کی۔ روایات میں ایمان کے بھی اولیت کی حد تک ایک سے زیادہ نام آئے ہیں کسی روایت میں ہے کہ خدیجۃ الکبریٰ سب سے پہلے ایمان لائی ہیں۔ کسی میں ہے کہ علی مرتضیٰ سب سے پہلے ایمان لائے کسی روایت میں ہے کہ زید بن حارثہ نے پہل کی اور کسی میں ہے کہ ابو بکر سب سے پہلے مومن ہیں۔ تعارض کی صورت میں دو ہی صورتیں ہیں ترجیح دی جائے یا پھر مفاہمت کر دی جائے۔ حافظ ابن کثیر نے البدایہ میں لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہ نے ان چاروں میں اس طرح مفاہمت کی ہے کہ مردوں میں سب سے پہلے ابو بکر عورتوں میں سب سے پہلے خدیجۃ الکبریٰ نوکروں میں سب سے پہلے زید بن حارثہ اور بچوں میں سب سے پہلے علی مرتضیٰ ایمان لائے یاد رہے کہ حضرت علی کی عمر دس سال سے زیادہ نہ تھی۔

حضرت ابو بکر ہجرت مدینہ میں ہی اسبق نہیں۔ جب حضور اقدس کو ہجرت کا حکم ہوا تب حضرت ابو بکر کو ساتھ لے کر غار ثور پہنچ گئے جو کہ مکہ سے تقریباً چند میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑ ہے۔ یہاں آپ نے تین راتیں بسر کیں اور پھر مدینے روانہ ہو گئے۔ یہ تین راتیں حضرت ابو بکر نے کہ شمع نبوت کے پروانے جس عالم میں بسر کی ہونگی اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس نے عشق و محبت کا کچھ بھی ذائقہ چکھا ہو اللہ کا رسول غار میں پوشیدہ تھا دشمن سراغ میں تھا۔ ہر لمحہ اندیشہ تھا کہ کہیں دشمن سراغ نہ پالے۔ ایسی حالت میں ظاہر

ہے کہ ابو بکر کے دل کے حزن و اضطراب کا کیا حال ہوگا۔ حضرت ابو بکر کو انفاق مال میں بھی اولیت کا شرف حاصل ہے تفصیل دیکھنی ہو تو ازالۃ الخفا کا مطالعہ کرو۔

آیت میں یہ اولیت اور سبقیت حقیقی نہیں اضافی ہے سارے ہی مہاجرین کو ایمان و ہجرت میں سبقت حاصل ہے من تبعیضیہ نہیں بلکہ بیانیہ ہے انصار میں سے نصرت میں سابقون اولون مدینہ کے وہ حق شناس ہیں جنہوں نے علیٰ اس وقت جب کہ تمام جزیرہ عرب حضور اقدس کو جھٹلا رہا تھا اور خود اس کے اہل وطن اس کے قتل و ہلاکت کے درپے تھے۔ دعوت حق قبول کی اور عقبہ اولیٰ ثانیہ میں بیعت کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ پہلی بیعت میں سات مرد تھے دوسری میں ستر مرد اور دو عورتیں تھیں۔ دوسری بیعت پہلی سے ایک برس بعد ہوئی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری بیعت والوں کے ساتھ ابو زرارہ ابن مصعب کو بغرض تعلیم بھیج دیا تھا۔ کہ لوگ ان کے جانے پر ایمان لائے اور کچھ اس وقت جب خود آنحضرت نے ہجرت فرمائی۔

ان مہاجرین و انصار کے بعد وہ لوگ جو ان دونوں جماعتوں کے قدم بقدم چلے اگرچہ بعد میں آئے لیکن ان کا شمار بھی ان میں ہی ہوا چونکہ بعد کو ایمان لانے والوں میں بعض منافق اور کچے دل کے آدمی بھی تھے اس لیے باحسان کی قید لگادی یعنی جنہوں نے راست بازی کے ساتھ ان کی پیروی کی۔

دنیا میں جب کبھی سچائی کا ظہور ہوا ہے تو اس کا پہلا عہد ہمیشہ غربت و بے کسی کا رہا ہے اور ان ساری دنیوی ترغیبوں سے خالی رہا ہے جو کسی انسان کے دل کو مائل کر سکتی ہیں۔ پس جو نفوس قدسی اس وقت حق کا ساتھ دیتے ہیں ان کی حق شناسی حق پرستی کے درجہ تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ وہ داعی حق کا پہلے پہل ساتھ دے کر خود بھی داعیان حق کے گروہ میں داخل ہو جاتے ہیں اور ان کی حق پرستی دنیا کے ہر طرح کے تاثرات سے یک قلم منزہ ہوتی ہے۔

تاریخ اسلام میں مہاجرین و انصار کا یہی مقام ہے اسی لیے السابقون الاولون سے زیادہ ان کے وصف میں کچھ کہنا ضروری نہ ہوا۔ کیونکہ یہاں اسبقیت و اولیت سے بڑھ کر اور کوئی بات نہیں ہو سکتی۔

یہی وجہ ہے کہ یہاں ان کا معاملہ ایسے پیرایہ میں بیان فرمایا جس سے بڑھ کر پیرایہ بیان عشاق حق کے لیے نہیں ہو سکتا رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ اللہ ان سے خوشنود ہوا وہ اللہ سے خوشنود ہوئے۔ سورہ مائدہ میں ان ہی کے لیے یہ پیش گوئی ہے یحبھم ویحبونہ اللہ ان سے محبت کرے گا وہ اللہ سے محبت کریں گے۔

آیت میں سبقت سے صرف یہ مراد نہیں ہے کہ زمانہ سابق میں ایمان لائے محض زمانہ کا مقدم ہونا شرعاً کوئی فضیلت نہیں رکھتا بلکہ سبقت سے مراد یہ ہے کہ شخص سابق بعد میں ایمان لانے والوں کے لیے سبب بنا ہے اور پورا اسلام کی علمی اور عملی زندگی ان کی وساطت اور نقل و روایت سے بعد میں آنے والوں کو حاصل ہوئی ہے۔ یہ صفت خصوصاً مہاجرین و انصار میں نمایاں ہے وہ تمام دنیا میں اسلام کی اشاعت کا سبب بنے۔ اسلامی تعلیمات انہیں کی نقل و روایت سے مابعد والوں کو ملیں بلکہ اصلی بات یہ ہے کہ بعد میں جس نے بھی اسلام قبول کیا۔ اس کے ایمان کی بنیاد انہی حضرات کی چشم دید گواہی پر ہے۔ ان ہی بزرگوں نے تمام دنیا میں اعلان کیا کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ان کے معجزات و دلائل کا مشاہدہ کیا ہے اور اسلام کو بلا واسطہ ان سے لیا ہے۔

اس آیت میں اور سورہ حشر کی آیت ۸-۹ میں بہت زیادہ ہم آہنگی ہے آیئے پہلے آیت پڑھ لیجئے پھر دونوں کا تقابلی مطالعہ فرمایئے۔

للفقراء المهاجرين الذين اخرجوا من ديارهم واموالهم يبتغون فضلا من الله ورضوانا وينصرون الله ورسوله. اولئك هم الصادقون والذين تبوؤا الدار والايمان من قبلهم يحبون من هاجر اليهم ولا يجدون في صدورهم حاجة مما اوتوا ويؤثرون على انفسهم ولو كان بهم خصاصة ومن يوق شح نفسه فاولئك هم المفلحون.

یہ مال فئے ان فقراء مہاجرین کے لیے جن کو اپنے گھروں اور سرمائے سے محروم کر دیا گیا۔ حالانکہ یہ لوگ اللہ کے فضل اور اس کی رضا کے متلاشی ہیں۔ ان کا مقصد زندگی اللہ و رسول کی مدد کرنا ہے یہی لوگ اپنے دعویٰ ایمان میں سچے ہیں — اور یہ مال فئے ان لوگوں کے لیے ہے جو اس گھر میں اور ایمان میں مہاجرین کی آمد سے پہلے جاگزین تھے۔ وہ ہر اس شخص سے محبت کرتے ہیں جو ان کے پاس ہجرت کر کے آئے اور نہیں پاتے اپنے دلوں میں کوئی خواہش اس چیز کی جو ان کو دی گئی اور ترجیح دیتے ہیں دوسروں کو اپنی جانوں پر اور اگرچہ خود ان کو تکلیف ہو۔ اور جو بھی اپنے آپ کو حرص سے بچا لیے جائیں وہ ہی بامراد اور کامیاب ہیں اور یہ مال فئے ان لوگوں کے لیے ہے جو ان کے بعد آئیں کہیں اے ہمارے پروردگار بخش دے

ہم کو اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ایمان میں ہم سے سابق تھے اور نہ یہ کہ ہمارے
دلوں میں کھوٹ ایمان والوں کے لیے اے ہمارے رب تو ہی نرمی کرنے والا
مہربان ہے۔

دونوں آیتوں کا تقابلی مطالعہ کیجئے۔

جن کو یہاں المہاجرون کہا ہے سورہ حشر میں ان کا تعارف للفقراء المہاجرین الذین اخرجوا من دیارھم واموالھم یبتغون فضلا من اللہ ورضوانا وینصرون اللہ ورسولہ اُولٰئک ھم الصادقون کے ذریعے کرایا ہے اور جن کو یہاں الانصار کہا ہے سورہ حشر میں ان کا چہرہ والذین تبوؤا الدار والایمان سے فاولٰئک ھم المفلحون کے ذریعے پیش کیا ہے ـــــ اور جن کا ذکر یہاں والذین اتبعوھم باحسان کے الفاظ میں کیا ہے سورہ حشر میں ان کا تذکرہ والذین جاؤا من بعدھم سے ربنا انک رؤف رحیم تک کیا ہے۔

ان دونوں آیتوں کی ہم آہنگی سے دین اسلام کی چند بنیادی حقیقتیں بے غبار ہو کر سامنے آتی ہیں صحابہ کرام میں عدالت ہے۔ صحابہ کرام دنیا میں حق کا معیار اور کسوٹی ہیں۔ صحابہ کرام حضور اقدس کی نبوت کی دلیل ہیں۔

پیش نظر آیت میں اگر اجمال ہے تو سورہ حشر کی آیات میں اسی کی تفصیل ہے اس آیت میں جن کا تعارف السابقون الاولون فرمانے کے بعد صرف من المہاجرین سے کرایا ہے ان ہی کا چہرہ سورہ حشر میں اس طرح پیش کیا گیا ہے للفقرا اس کے ذریعے صرف یہی نہیں بتایا گیا ہے کہ یہ اموال غنیمت کے مستحق ہیں بلکہ یہ وصف اس لیے لائے تاکہ سننے والوں کو علم ہو جائے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو راہ محبوب میں سب کچھ تج کر چکے ہیں اس کی قدر وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کا دل ذوق محبت سے آشنا ہو وہی جانتے ہیں کہ کوئی محبوب اپنے عاشق کو فقیر کہہ کر بلادے تو اس میں کیا لذت ہے۔ پھر فقرا کہنے کے بعد فرمایا المہاجرین یعنی یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے راہ محبت میں قدم رکھنے کے بعد وہ سب کچھ چھوڑ دیا جو اس راہ میں رکاوٹ ہو سکتا تھا۔ صرف وطن نہیں چھوڑا اقتدار چھوڑا دفار چھوڑا کاروبار چھوڑا زندگی کا سکون چھوڑا۔ اس کے بعد فرمایا الذین اخرجوا من دیارھم واموالھم ان کو ان کے گھروں سے نکال کر ظالموں نے بے گھر بنا دیا اور ان کے سارے اموال سے ان کو محروم کر دیا گیا۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں ان مہاجرین نے گھر چھوڑے دولت و سرمائے

پر لات ماری۔ بیوی بچوں اور خاندان کو چھوڑ کر اللہ و رسول کی محبت میں قربانیاں دیں وقت کی ساری ناہمواریوں کے باوجود اسلام کو اپنایا۔ بھوک سے بے تاب ہوتے تو پیٹھ سیدھی رکھنے کے لیے پیٹ پر پتھر باندھ لیتے۔ سردی سے بچنے کے لیے گڑھوں میں پناہ لیتے ـــــ گویا یہ فقرہ لا کر بتا دیا کہ وہ فقیر نہ تھے اگر وہ اسلام کے شیدائی نہ ہوتے تو ان کو کوئی گھر سے بے گھر نہ کرتا وہ فقیر نہ ہوتے مالدار اور سرمایہ دار ہوتے ان کے پاس گھر بھی تھا مال بھی تھا۔ یہ تو سب کچھ راہ عشق میں قدم رکھنے کے نتیجے میں ہوا کیونکہ ان کا پیش نہاد یہ اور صرف یہ تھا کہ یبتغون فضلا من اللہ و رضوانا یہ اللہ سبحانہ کی جانب سے گواہی ہے کہ ان مہاجرین کا نصب العین، ان کا مقصود صرف رضائے الٰہی کی جستجو اور تلاش تھی ترکیب نحوی کے لحاظ سے یہ جملہ حالیہ ہے مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جو اپنے گھروں سے نکالے گئے ان کا جرم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ یہ اللہ سبحانہ کی رضا کے طالب تھے۔ اس کے بعد فرمایا وینصرون اللہ و رسولہ یہ لوگ کسی اقتدار کے خواہاں ہو کر کسی حکومت کی مدد کے لیے نہیں نکلے تھے دنیا کی علمی و تمدنی ترقیاں ان کا نصب العین نہ تھا۔ حیرت انگیز انکشافات اختراعات ایجادات دولت کی فراوانی، تجارت کی عالمگیری، نئی آبادیوں کا قیام ان کا پیش نہاد نہ تھا۔ ان کے پیش نظر یہ اور صرف یہ تھا کہ دنیا میں وہ نظام زندگی قائم ہو جو اللہ کی جانب سے اللہ کا رسول پیش کر رہا ہے۔ آخر میں قرآن نے ان مہاجرین کی زندگیوں کے ہر موڑ کے بارے میں یہ اعلان کیا کہ اولئک ھم الصادقون ان کی زندگی کی کسی شاخ میں صداقت کے سوا کچھ نہیں۔ ان کی روحانی، اخلاقی، عائلی، معاشرتی، معاشی سیاسی اور قانونی زندگی میں صداقت ہی صداقت ہے۔ صداقت کے سوا کچھ نہیں ہے۔

آیت زیر تشریح میں الانصار فرما کر مہاجرین کے ساتھ انصار کا تعارف بھی کرایا تھا۔ سورہ حشر کی آیت میں الانصار کا جو چہرہ پوری قوت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے وہ بھی گوش گذار فرمالیجئے۔ والذین تبوؤ الدار والایمان من قبلھم اور وہ لوگ جو ان مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی مدینہ میں مقیم تھے۔ اس فقرے میں دار کے ساتھ الایمان لا کر بتا دیا کہ ان کے ایمان میں جماؤ اور مضبوطی تھی آگے فرمایا یحبون من ھاجر الیھم یہ لوگ آنے والے مہاجرین سے محبت کرتے ہیں ان میں باہم کوئی چشمک نہیں اس کے بعد فرمایا کہ ولا یجدون فی صدورھم حاجۃ مما اوتوا یعنی جناب رسالت سے مہاجرین کو جو کچھ دیا جاتا ہے اس سے انصار کے دل تنگ نہیں ہوتے بلکہ وہ نہایت سیر چشمی سے اپنی ضروریات پر ان کو ترجیح دیتے۔

آگے فرمایا و یوثرون علی انفسہم ولو کان بہم خصاصۃ وہ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ وہ اپنی جگہ محتاج ہوں اس کے بعد آخر میں ارشاد ہے ومن یوق شح نفسہ فاولئک ھم المفلحون اور واقعہ یہ ہے کہ جن کو دل کی تنگی سے بچا لیا جاتا ہے بس وہی بامراد اور کامیاب ہیں اس میں انصار کو زندگی کی ہر شاخ میں فلاح کی بشارت ہے۔

اس آیت میں انصار کا چہرہ پیش کیا ہے مہاجرین جب مکہ اور دوسرے مقامات سے ہجرت کرکے ان کے شہر میں آئے تو انہوں نے رسول اللہ کی خدمت میں یہ پیش کش کی کہ ہمارے باغ اور نخلستان حاضر ہیں آپ ان کو ہمارے اور ان مہاجر بھائیوں کے درمیان تقسیم کر دیجئے۔ حضور اقدس نے فرمایا کہ یہ لوگ تو باغبانی نہیں جانتے یہ اس علاقے سے آئے ہیں جہاں باغات نہیں ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اپنے ان باغوں میں کام تم کرو اور پیداوار میں سے حصہ ان کو دو۔ انہوں نے کہا سمعنا واطعنا اس پر مہاجرین نے کہا "ہم نے کبھی ایسے لوگ نہیں دیکھے جو اس درجہ ایثار کرنے والے ہوں۔ یہ کام خود کریں گے اور حصہ ہم کو دیں گے ہم تو سمجھتے ہیں کہ سارا ثواب یہی لے لینگے حضور نے فرمایا نہیں جب تک تم ان کی تعریف کرتے رہو گے۔ اور ان کے حق میں دعائیں کرتے رہو گے تم بھی برابر کے اجر و ثواب میں حصہ دار رہو گے۔ پھر جب بنی نضیر کا علاقہ فتح ہوا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب ایک انتظامی شکل سامنے آگئی وہ یہ کہ تمہاری املاک اور یہودیوں کے چھوڑے ہوئے باغات اور نخلستانوں کو ملا کر ایک کر دیا جائے اور پھر اس پورے مجموعہ کو تمہارے اور مہاجرین کے درمیان تقسیم کر دیا جائے اور دوسری صورت یہ ہے کہ تم اپنی جائدادیں اپنے پاس رکھو اور یہ متروکہ املاک مہاجرین میں تقسیم کر دی جائیں۔ انصار نے عرض کیا کہ یہ جائدادیں آپ ان میں تقسیم کر دیں۔ اور ہماری جائدادوں میں سے بھی جو کچھ آپ چاہیں ان کو دے دیں۔ اس پر حضرت ابو بکر نے کہا جزاکم اللہ خیرا یا معشر الانصار۔ اس طرح انصار کی رضامندی سے یہودیوں کے چھوڑے ہوئے اموال بیو تقسیم کیے گئے۔ اور انصار میں سے صرف حضرت ابو دجانہ، حضرت سہل بن حنیف اور ایک روایت کے مطابق حضرت حارث بن الصمہ کو حصہ دیا گیا۔ کیونکہ یہ حضرات بہت غریب تھے اسی ایثار کا ثبوت انصار نے اس وقت دیا جب بحرین کا علاقہ اسلامی حکومت میں شامل ہوا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ اس علاقے کی مفتوحہ اراضی انصار کو دی جائیں۔ مگر انہوں نے عرض کیا کہ ہم ان میں سے کچھ نہ لیں گے۔ جب تک اتنا ہی ہمارے مہاجر بھائیوں کو نہ دیا جائے۔ انصار کا یہی وہ ایثار ہے جس پر اللہ سبحانہ

نے ان کی تعریف کی ہے اور صرف تعریف نہیں کی بلکہ ان کو ملعون قرار دیا ہے۔
آیئے زیر تشریح آیت میں ان دو طبقوں مہاجرین و انصار کے بعد والذین اتبعوھم باحسان کا ذکر کیا ہے یعنی وہ لوگ جو ان دونوں جماعتوں کے قدم بقدم چلے اور اگرچہ بعد میں آئے لیکن ان کا شمار بھی پہلوں میں ہوا۔ سورہ حشر میں ان بعد میں آنے والوں کا بھرپور چہرہ اس طرح پیش کیا ہے والذین جاء و امن بعدھم اور وہ لوگ جو ان مہاجرین و انصار کے بعد آئے یقولون ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان وہ کہتے ہیں اے ہمارے مالک ہمیں اور ہمارے ان سب بھائیوں کی بخشش فرما دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں لا تجعل فی قلوبنا غلا للذین امنو اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کے لیے کوئی کھوٹ نہ رکھ۔
تفصیلات تو آپ انشاء اللہ معالم القرآن کی اٹھائیسویں جلد میں پڑھیں گے۔ بحث کو سمیٹتے ہوئے صرف اتنی بات گوش گذار فرمالیجئے کہ
اولا مہاجرین کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ
(الف) وہ اللہ سبحانہ کے نہایت خالص اور مخلص بندے تھے ان کا اخلاص قطعاً بے غبار تھا۔ ان کا مقصد زندگی محض اللہ سبحانہ کی رضا و خوشنودی کی طلب و جستجو تھا۔ اور اس مقصد کی بجا آوری کی خاطر وہ ہر قسم کے نوازل، حوادث اور مصائب کا نشانہ بنے لیکن ہر حال میں وہ ثابت قدم رہے۔
(ب) یہ کہ وہ اللہ سبحانہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مددگار تھے۔
(ج) یہ کہ وہ اپنے افکار اعمال اور اخلاق میں سر تا سر پیکر صدق تھے۔
ثانیاً انصار کے بارے میں بھی تین باتوں کو واضح کیا گیا ہے۔
اوّل یہ کہ وہ مہاجرین سے محبت کرتے تھے۔
دوسرے یہ کہ وہ قلب کی طہارت اور صفائی کی ایسی تصویر تھے کہ حرص و حسد انکے قرب و جوار میں بھی نہ تھا۔
تیسرے یہ کہ وہ فلاح یاب اور بامراد تھے۔
مہاجرین و انصار کے بعد قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ
(۱) وہ ان مہاجرین و انصار کا اتباع کریں اور بلا قید زندگی کے ہر گوشہ میں ان کے نقش قدم پر چلیں۔

(۲) مہاجرین وانصار کے مشکور ہوں کہ وہ دنیا میں ان کے لیے ذریعہ ہدایت بنے ہیں۔ سب سے بڑا شکریہ ہے کہ ان کے لیے دعا کریں۔

(۳) ایمان وعمل میں ان کی اقدمیت واسبقیت کو سراہیں اور اسلامی زندگی میں ان کی کاپی کریں۔

اسی لیے اہل السنۃ والجماعت کی عقائد کی کتابوں میں یہ بات بطور اساسی عقیدہ بتائی گئی ہے۔

> ہم صحابہ کرام سے محبت کرتے ہیں اور کسی کی محبت میں نہ حد سے بڑھتے ہیں اور نہ کسی سے تبرا کرتے ہیں ہم ہر اس شخص سے دشمنی کرتے ہیں جو صحابہ کرام سے دشمنی کرتا ہے اور جو صحابہ کرام کا ذکر خیر نہیں کرتا۔ ہم صحابہ کرام کا ذکر خیر ہی کرتے ہیں۔ صحابہ کی محبت دین بھی ہے ایمان بھی اور احسان بھی اور ان سے بغض کفر نفاق اور طغیان ہے[۱]

اس عقیدے کی اساس قرآن کی یہی آیت ہے۔ حافظ ابن تیمیہ نے منہاج السنۃ میں یہ آیت اور سورۃ حشر کی آیات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ

> یہ آیات مہاجرین وانصار اور ان لوگوں کی تعریف پر مشتمل ہیں جو مہاجرین وانصار کے بعد آئیں اور ان کے لیے استغفار کریں اور اللہ سے یہ دعا مانگیں کہ ہمارے دلوں میں کینہ نہ ہو ان آیات میں یہ تعریف ہے صحابہ کرام اور اہل السنۃ والجماعت کی جو صحابہ سے محبت کرتے ہیں۔

صحابہ کرامؓ کے تین شرف

قرآن عزیز کی یہ آیت بتا رہی ہے کہ صحابہ کرام میں سے مہاجرین وانصار کو ایمان میں جو اولیت اور اقدمیت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ پوری امت کے اعمال حسنہ اور ایمان کو جمع کر لیا جائے تو اس کے گرد پا کو نہیں پہنچ سکے۔ اس آیت میں قرآن نے صرف اسی شرف کا ذکر نہیں کیا کہ یہ ایمان میں اولیت کا مقام رکھتے ہیں یہ تو منطوق قرآن ہے بلکہ یہ بھی اشارہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت اور مصاحبت کا جو شرف ان کو حاصل ہوا ہے۔ پوری امت کے اعمال حسنہ مل کر بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ذرا سوچیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی دو رکعتیں جن میں صحابہ کرام کو شرکت کی سعادت حاصل ہوئی کیا پوری امت کی نمازیں مل کر بھی ان دو رکعتوں کے ہم وزن ہو سکتی ہیں حضور اقدس صلی اللہ

---

[۱] عقیدہ طحاوی

علیہ وسلم کی دعوت پر جو کسی صحابی نے ایک سیر جو اللہ سبحانہ کے راستہ میں دیئے۔ اور بارگاہ نبوت سے اسے شرف پذیرائی ملا بعد میں آنے والے مسلمان اگر پہاڑ برابر بھی سونا خرچ کریں تو ان کو یہ شرف حاصل نہیں ہو سکتا۔ حضرت شیخ مجدد الف ثانیؒ نے اسی صورت حال کو اس طرح پیش کیا ہے۔

کوئی ولی کسی صحابی کے مرتبے کو نہیں پہنچ سکتا۔ اویس قرنی اپنی تمام تر بلندی شان کے باوجود چونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف صحبت سے مشرف نہیں ہیں اس لئے کسی ادنیٰ صحابی کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکے کسی شخص نے امام حضرت عبداللہ بن مبارک سے دریافت کیا کہ حضرت معاویہ افضل ہیں یا حضرت عمر بن عبدالعزیز۔ فرمایا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں حضرت معاویہ کے گھوڑے کی ناک میں جو غبار داخل ہوا وہ بھی عمر بن عبدالعزیز سے کئی گنا بہتر ہے۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے رضی اللہ عنہم و رضوا اللہ سبحانہ ان سے راضی ہو گیا وہ اللہ سبحانہ سے راضی ہو گئے۔ اس میں بتایا ہے کہ ان مہاجرین وانصار کو ایک تو ایمان میں سبقت اور اولیت کا شرف حاصل ہے اور دوسرے ان کو حضور اقدس کی صحبت کا شرف حاصل ہے یہاں آخر میں بتایا جا رہا ہے کہ ان کو مقام رضوان حاصل ہے۔

مقام رضوان کیا ہے؟ یہی سمجھنے کی بات ہے ایمان وعمل میں ان کو اولیت حاصل ہے اور حضور اقدس کی رفاقت ومحبت کا ان کو شرف حاصل ہے اس شرف صحبت اور شرف اولیت سے بڑھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ مدرسہ نبوت کے ایسے طالب علم تھے جن کے معلم وہادی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ جن کا نصاب تعلیم ملاء اعلیٰ میں مرتب ہوا تھا جن کی تعلیم وتربیت کی نگرانی براہ راست وحی آسمانی کر رہی تھی۔ اور جن کا امتحان علام الغیوب نے لیا جب ان کی تعلیم وتربیت کا ہر پہلو سے امتحان ہو چکا تو حق تعالیٰ شانہ نے انہیں رضی اللہ عنہم کی بشارت دے کر آنے والی پوری انسانیت کی تعلیم وتربیت اور تلقین وارشاد کا منصب تفویض فرما دیا۔ اب شائد آپ کے ذہن میں یہاں یہ خلش ہو کہ یہ مقام تو صحابہ کو رضی اللہ عنہم کے ذریعہ حاصل ہو گیا لیکن اس کے بعد و رضوا عنہ میں کیا معنویت ہے یعنی اللہ کے خوش ہونے کا مطلب تو واضح ہو گیا مگر صحابہ کے خوش ہونے کا مطلب واضح نہیں ہوا۔ اس کا جواب حضرت مولانا ابوالکلام کی زبانی سنئے۔

شرح مقام ورضواعنہ

آیت میں فرمایا رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ اللہ ان سے راضی ہوگیا وہ اللہ سے راضی ہوگئے۔اس آیت میں ورضوا عنہ قابل غور ہے اس پر کیوں زور دیا گیا۔صرف یہ کہہ دینا کافی تھا کہ اللہ ان سے راضی ہوا یہ بات خصوصیت سے کیوں کہی گئی کہ وہ بھی اللہ سے راضی ہوگئے۔

اس لیے کہ ان کے ایمان واخلاص کا اصلی مقام بغیر اس کے نمایاں نہیں ہوسکتا تھا۔

انسان جب کبھی کسی مقصد کے لیے قدم اٹھاتا ہے اور مصیبتوں سے دوچار ہوتا ہے تو دو طرح کی حالتیں پیش آتی۔ کچھ لوگ جوان مرد اور باہمت ہوتے ہیں وہ بلا تامل ہر طرح کی مصیبتیں جھیل لیتے ہیں۔ لیکن ان کا جھیلنا جھیلنا ہی ہوتا ہے۔یہ بات نہیں ہوتی کہ مصیبتیں ان کے لیے مصیبتیں نہ رہی ہوں، عیش وراحت ہوگئی ہوں کیونکہ مصیبت بہرحال مصیبت ہے۔باہمت آدمی کڑوا گھونٹ بغیر کسی جھجک کے پی لیتا ہے لیکن اس کی تلخی کو ضرور محسوس کرے گا اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو صرف باہمت ہی نہ کہنا چاہیے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ سمجھنا چاہیے۔ان میں صرف ہمت و جواں مردی ہی نہیں ہوتی بلکہ عشق و شیفتگی کی حالت پیدا ہوجاتی ہے وہ مصیبتوں کو مصیبتوں کی طرح نہیں جھیلتے بلکہ عیش وراحت کی طرح ان سے لذت یاب ہوتے ہیں۔راہ محبت کی ہر مصیبت ان کے لیے عیش وراحت کی ایک نئی لذت بن جاتی ہے۔اگر اس راہ میں کانٹوں پر لوٹنا پڑے تو کانٹوں کی چبھن میں ان کو ایسی راحت ملے جو کسی کو پھولوں کی سیج پر لیٹ کر نہیں مل سکتی حتیٰ کہ اس راہ میں جس قدر مصیبتیں بڑھتی جاتی ہیں۔اتنی ہی زیادہ ان کے دل کی خوشحالیاں بھی بڑھتی جاتی ہیں ان کے لیے صرف اس بات کا تصور کہ یہ سب کچھ راہ محبوب میں پیش آرہی ہے اور اس کی نگاہیں ہمارے حال سے بے خبر نہیں ہیں عیش و سرور کا ایک ایسا بے پایاں جذبہ پیدا کرتا ہے کہ اس کی سرشاری میں جسم کی کوئی کلفت اور ذہن کی کوئی اذیت محسوس ہی نہیں ہوتی۔

سابقون الاولون کی محبت ایمانی کا یہی حال تھا۔ہر شخص جوان کی زندگی کی سوانح کا مطالعہ کرے گا بے اختیار تصدیق کرے گا کہ انہوں نے راہ حق کی صرف مصیبتیں جھیلی نہیں بلکہ دل کی پوری خوشحالی اور روح کے کامل سرور کے ساتھ اپنی پوری زندگیاں ان میں بسر کر ڈالیں۔ان میں سے جو لوگ اول دعوت میں ان پر شب و روز کی جانکاہیوں اور قربانیوں کے پورے ۲۳ سال گزر گئے لیکن اس تمام مدت میں کہیں سے بھی یہ بات دکھائی نہ دی کہ مصیبتوں کی کڑواہٹ ان کے چہروں پر کبھی نظر آئی ہو۔

انہوں نے مال و علائق کی ہر قربانی اس جوش و مسرت سے کی گویا دنیا جہاں کی تمام خوشیاں اور راحتیں ان کے لیے فراہم ہوگئی ہیں اور جان کی قربانیوں کا وقت آیا تو اس طرح خوش خوش گردنیں کٹوائیں۔ گویا زندگی کی سب سے بڑی خوشی زندگی میں نہیں بلکہ موت میں تھی۔ ان میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جنہوں نے اتنی عمریں نہیں پائیں کہ اسلام کی غربت کے ساتھ اسلام کا عروج و اقبال بھی دیکھ لیتے ـــــ تاہم جب دنیا سے گئے تو اس عالم میں گئے کہ ان سے زیادہ عیش و خوش حالی میں شاید ہی کسی نے دنیا چھوڑی ہو۔ بدر اور احد کے شہیدوں کے حالات پڑھو ایمان لانے کے بعد جو کچھ بھی ان کے حصہ میں آیا وہ بجز رات دن کی کاوشوں اور مصیبتوں کے اور کیا تھا اور پھر اس سے پہلے کو اسلام کی فتح و کامرانیوں میں شریک ہونے کا موقعہ ملتا دشمنوں کی تلواروں سے مقتول میدان جنگ میں دم توڑ رہے تھے لیکن اس کے باوجود ان کے دل کی شادمانیوں کا کیا حال تھا۔ ایسے اطمینان و سکون کے ساتھ عیش و نشاط بستروں پر کسی نے جان نہ دی ہوگی جس طرح انہوں نے میدان جنگ کی ریتلی زمین پر لوٹ لوٹ کر دی۔ ورضوا عنہ میں اشارا اسی طرف ہے کہ اللہ اور اس کے کلمہ حق کی راہ میں جو کچھ بھی پیش آیا انہوں نے اسے جھیلا ہی نہیں بلکہ کمال محبت ایمانی کی وجہ سے خوشحال اور خوشنود ہے۔ اور یہی مقام ہے جو ان کے درجہ کو تمام مدارج و عمل میں ممتاز کرتا ہے۔

آیئے اس آیت پر شارحین قرآن کے علوم سے بھی استفادہ فرمایئے۔

حضرت مولانا اشرف علیؒ فرماتے ہیں:

السابقون الاولون میں سب مہاجرین وانصار آگئے اور والذین اتبعوھم باحسان میں بقیہ اہل ایمان۔ جن میں اول درجہ تو ان کا ہے جو صحابہ ہیں گو مہاجرین وانصار نہیں۔ کیونکہ آخر میں ہجرت فرض نہ رہی تھی مسلمان ہو کر اپنے اپنے گھر رہنے کی اجازت تھی اور دوسرا درجہ تابعین بالمعنے الاصطلاحی کا ہے۔ پھر غیر صحابہ اور غیر تابعین کا پھر خود اس آخری درجہ میں تفاوت ہے کہ تبع تابعین افضل ہیں اور ان سے مقدم ہیں جس طرح صحابہ میں مہاجرین وانصار دوسرے صحابہ سے افضل ہیں۔ اور اولیت کا موجب فضل ہونا معاصرین سے تو اس لیے کہ معاصرین باوجود قدرت کے متاخر رہے اور غیر معاصرین سے اس لیے کہ وہ حضرات بانی اور ہادی ہو کر مصداق من سنۃ حسنۃ اور الدال علی الخیر کفاعلہ کے ہوئے۔ گو یہ غیر معاصرین زمانہ متقدمہ میں نہ ہونے کی وجہ سے ایمان پر قادر نہ تھے۔ اور جب فرق مراتب میں ہے ایسا ہی جزا میں بھی ہے مثلاً رضوان و جنت سابقین کے لیے اوروں سے اعلیٰ ہوگی۔ اور السابقون میں باحسان کی قید اس لیے نہیں لگائی کہ

ان کا مہاجر اور ناصر ہونا خود دلیل ہے ان میں احسان پائے جانے کی۔[1]

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں :

محمد بن کعب قرظی سے کسی نے دریافت کیا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ صحابہ کرام سب کے سب جنت میں ہیں۔ اگرچہ وہ ہوں جن سے دنیا کی زندگی میں کچھ غلطیاں ہوئی ہیں۔ اس شخص نے کہا کہ یہ بات آپ نے کہاں سے کہی ہے۔ فرمایا کہ قرآن کی یہ آیت پڑھو السابقون الاولون اس میں تمام صحابہ کے بارے میں بلا شرط کے رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ فرمایا۔ البتہ تابعین کے بارے میں اتباع باحسان کی قید لگائی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام بلا کسی قید و شرط کے سب کے سب بلا استثناء رضوان الٰہی سے سرفراز ہیں۔[2]

مولانا محمد ادریس فرماتے ہیں۔

والذین اتبعوھم باحسان سے مراد وہ لوگ ہیں جو سابقین اولین کے بعد آئے اور ان کے نقش قدم پر چلے خواہ وہ صحابہ ہوں یا تابعین یا اتباع تابعین یا ان سے بھی بعد۔ غرض یہ کہ والذین اتبعوھم سے وہ تمام لوگ مراد ہیں جو مہاجرین وانصار کی پیروی کریں۔ خواہ وہ کسی زمانے میں ہوں۔ وہ سب جنت کے مستحق ہیں اور اللہ سبحانہ ان سے خوش اور وہ اللہ سبحانہ سے خوش ہیں۔ یہ آیت قیامت تک جملہ مسلمانوں کو شامل ہے جو صحابہ کے طریق پر ہوں اور اقوال وافعال میں ان کے پیروکار ہوں بغیر صحابہ کی اتباع اور پیروی کے اللہ سبحانہ کی رضا اور جنت نہیں مل سکتی ہے۔ اور اہل السنۃ والجماعۃ کا یہی طریقہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور جماعت صحابہ کے طریقہ پر چلتے ہیں اسی لیے ان کو اہل السنۃ والجماعت کہتے ہیں۔[3]

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی سوچتا ہوں کہ وہ حدیث افتراق جسے عام لوگ ضعیف کہتے ہیں۔ سند کے اعتبار سے۔ اگر ضعیف بھی ہو مگر معنی کے اعتبار سے قرآن کی یہی آیت اس کا ماخذ ہے اور حدیث کو ضعیف وہ ہی کہتے ہیں جو فن حدیث سے نا آشنا ہیں۔ میری مراد ترمذی کی یہ حدیث ہے۔

---

[1] بیان القرآن

[2] معارف القرآن

[3] معارف القرآن مولانا محمد ادریس

بنی اسرائیل کے بہتر فرقے ہوئے اور میری امت میں تہتر فرقے ہوں گے۔ سارے ہی دوزخی ہیں سوائے ایک کے صحابہ نے کہا وہ کونسا۔ فرمایا جس طریقہ پر میں اور میرے صحابہ ہیں اس پر چلنے والا فرقہ ناجیہ ہے۔

الفاظ یہ ہیں ما انا علیہ و اصحابی۔ اس میں ما سے مراد طریقہ ہے جسے حضور اقدس اور صحابہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اسی معنوی مناسبت سے فرقہ ناجیہ کا نام اہل السنۃ والجماعت ہو گیا۔ حدیث کا ماخذ اگر قرآن کی یہ آیت گرامی ہے تو نام کا ماخذ ارشاد نبوت ہے۔

آیت میں اتباع صحابہ کا ذکر کر کے ایک بہت اہم بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے اور یہی بات اہل حق کے جسم کے لیے بمنزلہ روح ہے گویا یہ اعلان کر دیا کہ اہل حق ہونے کی کسوٹی یہ ہے کہ پیغمبر کی سنتوں کو صرف الفاظ حدیث سے نہ لیا جائے بلکہ الفاظ کے ساتھ صحابہ کی شخصیتوں کو ملا کر معانی لیے جائیں۔

یہاں حضرت قاری محمد طیب کی یہ بات بڑی ہی خوشگوار ہے کہ اہل السنۃ والجماعت کہنے والے گویا یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم سنن نبوی کو محض الفاظ حدیث سے اخذ نہیں کرتے بلکہ الفاظ کے ساتھ صحابہ کی شخصیات کو ملا کر معانی لیتے ہیں اس سے اہل السنۃ والجماعۃ کا عنوان ایسا جامع عنوان ہے کہ اس میں دینی تربیت کے دونوں بنیادی اصولوں میں یکجائی کر دی گئی ہے کتاب اور شخصیت جن سے ایک سچی جماعت کی تشکیل ہوتی ہے۔

صحابہ کرام دلیل نبوت ہیں

قرآن کی یہ آیت مہات معارف میں سے ہے۔

قرآن نے صداقت نبوت کی دو دلیلیں پیش کی ہیں ایک علمی دوسری عملی۔ علمی دلیل کے بارے میں تو سب جانتے ہیں کہ قرآن عزیز ہے اس میں دو رائیں نہیں ہیں۔ لیکن عملی دلیل پر بطور دلیل کم ہی لوگوں نے غور کیا ہے۔ قرآن عزیز نے عملی دلیل کے طور پر صحابہ کی جماعت کو پیش کیا ہے۔

قرآن کے اوراق آپ کے سامنے کھلے ہوئے ہیں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ صحابہ کرام کا چہرہ پیش کرتے ہوئے کیا انداز اختیار کیا ہے۔ نبی شناسی کا انداز یا اس سے کچھ مختلف۔ اگر دونوں ہم آہنگی ہے تو بلاریب صحابہ کرام صداقت نبوت کی عملی دلیل ہیں۔ اور اس میں شک ہی کیا ہے جب آپ ڈاکٹر اور حکیم کی صداقت کے لیے ڈاکٹر کے نسخے اور اس کے ہسپتال سے نکلے ہوئے تندرست بیماروں کو ڈاکٹر کی صداقت، مہارت اور شرافت کی دلیل سمجھتے ہیں تو پھر قرآن (نسخہ) کے ساتھ صحابہ کرام کو صداقت

نبوت کی دلیل ماننے میں کیوں پس و پیش کرتے ہیں۔

درحقیقت اگر اپنے پھل سے استاد اپنے شاگردوں سے ڈاکٹر اپنے ہسپتال سے نکلے ہوئے شفایاب مریضوں سے پہچانا جاتا ہے تو محمد رسول اللہ بھی صحابہ کرام سے پہچانے جاسکتے ہیں۔ قرآن نے صحابہ کو حضور کے تلامذہ نہیں کہا بلکہ صحابہ کہا ہے اس کی وجہ یہ اور صرف یہ ہے کہ ان کا علم کتابی نہیں بلکہ صحبت کا رہین منت ہے۔

سید سلیمان ندوی نے بڑے پیارے اور اچھوتے انداز میں بتایا ہے۔

دنیا میں دو قسم کی تعلیم گاہیں ہیں ایک وہ جہاں صرف ایک فن سکھایا جاتا ہے دوسری وہ تعلیم گاہیں ہیں جو اپنی وسعت کے مطابق ہر قسم کی تعلیم کا انتظام کرتی ہیں۔ ان کے احاطہ میں مختلف علوم و فنون کی تعلیم ہوتی ہے۔ طلبہ اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق استفادہ کرتے ہیں۔ پھر وہاں سے فوجوں کے جنرل عدالتوں کے جج اور قانون دان کاروبار کے تاجر اور انجینئر ہسپتالوں کے ڈاکٹر اور ماہر سب ہی پیدا ہوتے ہیں۔

آیئے اس جامعہ کے طلبہ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال لیجیے تاکہ آپ جان سکیں کہ یہ جامعہ قومی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔

یہ ابوبکر و عمر، عثمان و علی، طلحہ و زبیر مکہ کے قریشی ہیں۔ یہ ابوذر اور انیس مکہ سے باہر تہامہ کے غفار قبیلہ کے ہیں۔ ابوہریرہ اور الطفیل بن عمرو یمن سے آئے ہیں اور دوسی قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابوموسیٰ اشعری اور معاذ بن جبل بھی یمن سے آئے ہیں۔ یہ ضماد بن ثعلبہ ہیں۔ قبیلہ ازد کے ہیں خباب بن الارت قبیلہ تمیم کے ہیں منقذ بن حبان اور منذر بن حبان عبدالقیس کے قبیلہ سے ہیں بحرین سے آئے ہیں۔ عبید بن جعفر عمان کے رئیس ہیں۔ فروہ معان کے رہنے والے ہیں۔ بلال افریقہ سے آئے ہیں صہیب رومی کہلائے ہیں۔ سلمان ایران کے فارسی فیروز دیلمی بن عمرو دیلمی یہ حضرت موسیٰ کی درسگاہ نہیں جہاں صرف فوجی سپاہی اور یوشع جیسے فوجی اور قاضی اور کچھ مذہبی عہدہ دار پائے جاتے ہیں۔ یہ حضرت عیسیٰ کی خانقاہ نہیں جہاں زہد پیشہ فقرا فلسطین کی گلیوں میں پھرتے ہیں یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جامع اور عمومی درسگاہ اور عظیم الشان یونیورسٹی ہے جس میں ایک طرف اصحمہ حبش کا نجاشی بادشاہ فروہ معان کا رئیس ذوالکلاع حمیر کا رئیس۔ عامر بن نمیر قبیلہ ہمدان کا رئیس، فیروز دیلمی اور مرکبود یمن کے رئیس عبید و جعفر عمان کے رئیس دوسری طرف بلال، یاسر، صہیب، خباب، عمار اور ابوفکیہہ کے غلام امیر غریب شاہ و گدا آقا و غلام سب ایک صف میں کھڑے اور سب اس جامعہ کے طالب ہیں۔

پارہ نمبر ۱۱

ان طلبہ کو غور سے دیکھو کہ ایک استاد سے ایک کتاب پڑھنے والوں میں ایک طرف عقلائے روزگار، اسرار فطرت کے محرم دنیا کے سربراہان مملکت اس درسگاہ سے تعلیم پاکر نکلے ہیں ابوبکر الصدیق، عمر فاروق، عثمان غنی علی مرتضیٰ ہیں۔ معاویہ ابن ابی سفیان ہیں جنہوں نے مشرق سے مغرب تک افریقہ سے ہندوستان کی سرحد تک فرمانروائی کی اور ایسی فرمان روائی جو دنیا کے بادشاہوں حکمرانوں اور سیاست دانوں کی سیاسی تدبیر اور نظم ونسق کے کارناموں پر پانی پھیر گئی۔ ان کے عدل وانصاف کے فیصلوں نے ایرانی دستور اور رومن لا کو بے اثر کر دیا۔

دوسری طرف خالد بن ولید، سعد بن ابی وقاص ابوعبیدہ بن الجراح اور عمرو بن عاص اسی درسگاہ کے طالب علم ہیں جو مشرق ومغرب کی دو ظالم سلطنتوں کا چند سالوں میں تختہ اُلٹ دیتے ہیں اور دنیا کے فاتح اعظم اور سپہ سالار اکبر ثابت ہوئے ہیں جن کے فاتحانہ کارناموں کی دھاک آج بھی دنیا مانتی ہے۔

تیسری طرف باذان بن ساسان۔ خالد بن سعید مہاجرین امیر زیاد بن لبید، عمرو بن حزم یزید بن ابی سفیان علاء ابن حضرمی یمن صنعا رکندہ حضرموت، نجران، یمامہ بحرین صوبوں کے گورنر ہیں اور کامیاب حکومت کر رہے ہیں۔

چوتھی طرف ان طلبہ میں دانشوروں اور قانون دانوں کی صف ہے۔ عمر بن الخطاب علی ابن طالب، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود عبداللہ بن عمرو بن العاص حضرت عائشہ حضرت ام سلمہ ابی بن کعب معاذ بن جبل زید بن ثابت وغیرہ جنہوں نے اسلامی قانون کی بنیادیں استوار کیں اور دنیا کے دانشوروں اور قانون دانوں میں خاص مقام پایا۔

پانچویں طرف ان طلبہ میں مؤرخین اور ارباب روایت ہیں۔ حضرت ابوہریرہ حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت ابوسعید خدری، حضرت عبادہ ابن الصامت، حضرت جابر اور حضرت براء بن عازب وغیرہ صحابہ ہیں جو احکام ووقائع کے ناقل اور راوی ہیں۔

چھٹی جماعت ان طلبہ میں ارباب زہد کی ہے ابوذر غفاری، سلمان فارسی، عبداللہ بن عمر، مصعب بن عمیر، عثمان بن مظعون، محمد بن مسلمہ اور ابوالدرداء ہیں جن کی راتیں نمازوں میں اور دن روزوں میں گذرتے تھے۔ تفصیل دیکھنی ہو تو شاہ ولی اللہ کی ازالۃ الخفا پڑھو پتہ لگ جائے گا کہ قرآن نے صحابہ کرام کو صداقت نبوت کی دلیل کیونکر بنایا ہے۔

علامہ شاطبی غرناطی نے الموافقات کی دوسری جلد میں یہ بات پوری قوت سے بتائی ہے کہ

قرآن نے صحابہ کرام کا چہرہ وہی کچھ پیش کیا ہے جو خود نبوت کا پیش کیا ہے مثلاً حضور اقدس کے بارے میں اگر قرآن میں بتایا ہے کہ ان اللہ وملائکتہ یصلون علی النبی تو صحابہ کے متعلق بھی ارشاد ہوا ہے۔ ھو الذی یصلی علیکم وملائکتہ اور اولائک علیھم صلوات من ربھم ورحمۃ۔ حضور اقدس سے اگر کہا گیا ہے ولسوف یعطیک ربک فترضیٰ اللہ پاک آپ کو وہ کچھ عطا کرے گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے تو صحابہ کے بارے میں ارشاد ہوا ہے لیدخلنھم مدخلا یرضونہ ان کو ایسا مقام عطا کرے گا جس سے وہ راضی ہو جائیں گے۔ ایک طرف اگر حضور اقدس کے لیے غفران کی بشارت دی گئی ہے۔ لیغفر لک اللہ تو ساتھ ہی صحابہ کو بھی یہ خوشخبری سنائی گئی ہے لیدخل المومنین والمومنات جنات تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا ویکفر عنھم حضور اقدس کو اگر تمام نعمت کی بشارت دی گئی ہے ولیتم نعمتہ علیک یھدیک صراطا مستقیما تو صحابہ کرام سے یہی بات کہی گئی ہے ولکن یرید لیطھرکم ولیتم نعمتہ علیکم حضور اقدس سے اگر کہا گیا ہے الم نشرح لک صدرک تو صحابہ کو بھی بتایا گیا ہے افمن شرح اللہ صدرہ للاسلام فھو علی نور من ربہ حضور اقدس اگر ترمذی کی روایت کے مطابق حبیب اللہ ہیں تو صحابہ کرام کو بھی یحبھم ویحبونہ کی نوید سنائی گئی ہے۔ حضور اقدس کی ذات گرامی اگر اکرم الاولین والآخرین ہے تو صحابہ کرام کو قرآن نے خیر امۃ اور امۃ وسطا کا لقب دیا ہے۔ حضور انور کا فریضہ اگر شہادت ہے تو صحابہ کرام کا بھی یہی فریضہ بتایا گیا ہے۔ لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا۔ حضور اقدس کی ذات گرامی نبی ہونے کی وجہ سے مجتبیٰ اور مصطفےٰ ہے صحابہ کرام کو بھی قرآن نے مجتبیٰ اور مصطفےٰ بتایا ہے ھو اجتباکم اور ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا نہ ختم ہونے والے اجر کی حضور کو بشارت ہے ان لک لاجرا غیر ممنون اور صحابہ کو بھی اسی بات کی خبر دی گئی ہے۔ فلھم اجر غیر ممنون۔ حضور اقدس کی ذات کو اگر قرآن میں رحیم کہا ہے تو صحابہ کرام کو بھی رحماء کہا ہے حضور انور کی ذات گرامی اگر معصوم ہے تو زبان نبوت نے صحابہ کو من حیث الجماعۃ معصوم بتایا نبوت اور آپ کے صحابہ میں اوصاف کی یہ ہم آہنگی بتا رہی ہے کہ صحابہ کی جماعت صداقت نبوت کی دلیل ہے بلکہ حضرت شاہ ولی اللہ نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جیسے فرد ہونے کی حیثیت میں حضور اقدس کی بعثت ہوئی ہے ایسے ہی من حیث الجماعۃ صحابہ بھی مبعوث ہوئے ہیں قرآن میں اخرجت للناس کی تعبیر ہی اس طرف اشارہ کر رہی ہے حکیم الامت شاہ ولی اللہ

نے اخرجت للناس پر ازالۃ الخفا میں لکھا ہے ،

کنتم خیر امۃ کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ تم اس صفت سے موصوف ہو۔ دوسرے یہ کہ تم اس صفت سے علم الٰہی میں موصوف تھے اور اخرجت للناس میں نکالنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عدم سے وجود میں آئے ہیں اور نہ یہ کہ کسی تنگنائی سے نکالے گئے بلکہ مطلب یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں لوگوں کی اصلاح کا داعیہ پیدا ہوا اور اسی داعیہ کے ذریعے اندر سے باہر آکر انسانی جماعت کے اس طبقہ کو اس دولت سے سرفراز کیا اور اس نعمت سے مالا مال کیا اس لحاظ سے یہ جماعت اللہ سبحانہ کی جانب سے نکالی گئی ہے اور مبعوث ہوئی ہے اور للناس کا اضافہ یہ بتانے کے لیے ہے کہ اللہ سبحانہ کی جانب سے اس جماعت کو مبعوث کرنے کی علت بندگان خدا کی اصلاح ہے تاکہ دنیا اس گروہ کے ذریعے ہدایت کے نور سے منور ہو۔ ازالۃ الخفا ص ۲۷

یہی وجہ ہے کہ خلافت راشدہ کا مقام ما دون التشریع اور ما فوق الاجتہاد ہے۔ اسی کو حکیم الامت نے اس طرح پیش کیا ہے :

صحابہ کی اجتماعی زندگی کا فیصلہ دین میں حجت ہے حجت ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلمانوں کی رائے عامہ ان کی تقلید کرے کیونکہ یہ مقام تو ائمہ اجتہاد کو حاصل ہے اور یہ معنی بھی نہیں کہ خلیفہ خود ہی واجب الطاعت ہے یہ مقام نبوت ہے بلکہ یہاں مراد ان دونوں کے درمیان درمیان ہے

منزلتے است بین المنزلتین

اسی لیے شاہ صاحب ہی نے بتایا ہے کہ :

ہر نماز، ہر زکوٰۃ، معروف نہیا عن منکر جو بھی صحابہ کی اجتماعی زندگی میں موجود ہوگی وہ یقیناً محمود اور محل رضائے الٰہی ہے۔

بلکہ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں آیت نسخ ماننسخ من ایۃ او ننسہا نات بخیر منہا او مثلہا ہم کسی آیت کو جو منسوخ کردیتے یا اسی کو فراموش کرا دیتے تو ہم اس آیت سے بہتر یا اس جیسی لے آتے ہیں۔ شاہ صاحب کے خیال مبارک میں اس آیت میں نسخ سے نسخ شرائع اور نبوت مراد ہے اور آیت کا مطلب یہ بتایا ہے کہ عام نبوت سے وہ نبوت بہتر ہے

جس کی آغوش میں خلافت ہو اور یہ شرف حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے چنانچہ حجۃ اللہ کے دوسرے مقام پر لکھتے ہیں :

نبیوں میں سب سے عظیم الشان وہ نبی ہے جس کی بعثت کسی دوسری بعثت کا ذریعہ بن جائے ۔ اور یہ اس طرح ہوتا ہے کہ حضور کی نبوت کو ذریعہ بنا لیا ہے لوگوں کے تاریکیوں سے ہٹ کر روشنی میں آنے اور اس بات کا کہ آپ کی قوم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے مبعوث ہو اس طرح آپ کی بعثت ایک دوسری اجتماعی بعثت کا ذریعہ بن گئی قرآن میں دونوں بعثتوں کی طرف اشارہ ہے ھو الذی بعث فی الامیین میں اگر آپ کی بعثت کی طرف اشارہ ہے تو کنتم خیر امۃ اخرجت للناس میں صحابہ کی بعثت کی طرف اشارہ ہے ۔ اور حضور اقدس کا یہ ارشاد بھی اسی کی نشاندہی کر رہا ہے فانما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین تم اللہ کی جانب سے آسانیاں لے کر مبعوث ہوئے ہو سختیاں اور دشواریاں دے کر نہیں روانہ کیئے گئے ہو ۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم وحی الہام کے سارے علوم کے جامع تھے اسی کے تقاضے میں دونوں بعثتیں مکمل ہوتی ہیں ۔ آپ سے پہلے وحی والہام کے علوم میں ایک یا دو علم سے مشرف ہوتے تھے ۔

اسی لیے علماء نے صحابہ کی سنۃ کو سنۃ کہا ہے ۔ علامہ شاطبی غرناطی الموافقات لکھتے ہیں :

سنۃ الصحابۃ سنۃ یرجع الیھا ویعمل علیھا

صحابہ کی سنت بھی سنت ہے قابل استدلال بھی اور قابل عمل بھی

علامہ شاطبی اپنے دعوے پر چار دلیلیں پیش کی ہیں ۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے صحابہ کرام کو بلا استثنا مدح و ثنا پر مشتمل کارکردگی کا سرٹیفیکٹ دیا ہے ۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اتباع کا حکم دیا ہے ۔ امت کے علما نے ترجیح اقاویل میں صحابہ کو مقدم کہا ہے ۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی محبت کا حکم دیا ہے ۔ خود علامہ شاطبی نے سنت کے اطلاقات کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے ۔

نیز لفظ السنۃ صحابہ کرام کے عمل پر بھی بولا جاتا ہے چاہے کتاب وسنت میں ہو یا نہ ہو ۔ یہ یا تو ایسی سنت کی پیروی ہوتی ہے جو ان کو معلوم ہے اور روایتی وتاریخی طور پر ہم تک نہیں پہنچی یا صحابہ کا اجتماعی اجتہاد ہوتا ہے یا پھر خلفائے راشدین

کا فیصلہ ہوتا ہے یہ بھی صحابہ کا اجماع ہے۔

حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں فرقہ ناجیہ کی جو تعریف کی ہے اس میں یہی حقیقت جھلک رہی ہے :

"فرقہ ناجیہ وہ ہے جو عقیدہ وعمل دونوں میں ان واضح اور صاف کتاب وسنت کے احکام کو اپنائے جس پر جمہور صحابہ اور تابعین چلے ہوں"۔

اسی لیے علما نے صحابہ کرام کی عدالت کا اعلان کیا ہے، اعلان عدالت کا مطلب یہ ہے کہ وہ اچھے ہونے کے لئے کسی انسانی رائے کے محتاج نہیں عدالت محدثین کی اصطلاح میں نام ہے حالت ایمان میں فسق کے اسباب سے دور رہنے کا اور مروأت کے خلاف کام نہ کرنے کا عبداللہ بن المبارک سے دریافت کیا گیا کہ عدالت کیا ہے ؟ فرمایا جس میں پانچ باتیں ہوں۔ نماز باجماعت کا پابند ہو، پینے کا خوگر نہ ہو، دین میں کوئی خرابی نہ ہو۔ جھوٹ نہ بولتا ہو اور عقل میں کوئی فتور نہ ہو۔

قرآن کی متعدد آیات میں صحابہ کرام کی عدالت ثقاہت صداقت اور دیانت کی کھلی شہادت ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس پر مدار اسلام ہے اور ان پر جرح کرنا دین کی پوری عمارت گرا دینے کے مترادف ہے۔ حافظ ابن حزم ظاہری نے الاحکام فی اصول الاحکام میں یہ بات واشگاف لکھی ہے۔

"سارے صحابہ بلا استثنا، عادل مرتضی اور صاحب فضیلت ہیں۔ ان کی توقیر وتعظیم ہمارا ایمانی تقاضا ہے۔ ان سے محبت کرنا اور ان کیلئے اللہ سے مغفرت کی درخواست ہمارا فرض ہے راہ خدا میں ان کا ایک کھجور کا صدقہ ہماری پوری زندگی کے صدقہ سے افضل ہے خواہ ان میں کوئی حضور کے زمانے میں بچہ ہو نابالغ ہو سب کا حکم یہی ہے۔ یہ سب صحابہ ہیں"۔

ملا علی فرماتے ہیں :

تمام صحابہ بلاقید عادل ہیں۔ قرآن وسنت اور امت کی اجماعی قوت کا یہی تقاضا ہے (مرقات)

امام ابن الاثیر عز الدین فرماتے ہیں :

حدیث میں صحابہ کی جرح وتعدیل سے بحث نہیں کی جا سکتی ہے۔ یاد رہے کہ عدالت اصطلاح محدثین ہے۔ اور یہ افراد کے لیے ہے ورنہ جماعت کے لیے تو عصمت ثابت ہے یعنی صحابہ کے افراد

کا مجموعہ معصوم ہے اور افراد میں سے ہر فرد کا دامن عدالت سے مالا مال ہے۔ علامہ شاطبی نے اس پر بھی بحث کی ہے۔

ذرا اس پر غور فرمایئے کہ پوری جماعت من حیث الجماعۃ معصوم ہے اور جماعت کا ہر فرد عادل ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ صحابہ کی جماعت کے ایک ایک فرد کا دامن کبائر سے صغائر پر اصرار سے پاک ہے۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے۔

اس لیے کہ صحابہ کرام کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت اور مصاحبت کا جو شرف حاصل ہوا ہے۔ پوری امت کے اعمال حسنہ مل کر بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور رفاقت کے شرف سے بڑھ کر صحابہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ مدرسہ نبوت کے ایسے طالب علم تھے جن کے معلم ہادی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ جن کا نصاب تعلیم ملاء اعلیٰ میں مرتب ہوا تھا۔ جن کی تعلیم و تربیت کی نگرانی براہ راست آسمانی وحی کر رہی تھی۔ اور جن کا امتحان اللہ سبحانہ نے لیا۔ اور امتحان لینے کے بعد جب وہ کامیاب ہو گئے تو ان کو رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کی ڈگری عطا فرمادی اور ڈگری پر ذالك هو الفوز العظیم لکھ کر پوری انسانیت کی تعلیم و تربیت اور تلقین وارشاد کا ان کو منصب عطا کر دیا۔ اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہو گا کہ انبیاء علیہم اسلام کے بعد صرف صحابہ کرام کی ایسی جماعت ہے جن کی تعلیم و تربیت بھی وحی الٰہی کی نگرانی میں ہوئی اور ان کو سند فضیلت بھی اللہ سبحانہ نے دی۔

اس لیے دین وہی ہے جو صحابہ نے اپنایا ہے۔ ان کا ہی دین اللہ کا پسندیدہ ہے ولیمکنن لہم دینھم الذی ارتضیٰ لھم۔ دین کی صحابہ کی طرف نسبت اس بات کی نشاندہی کر رہی ہے۔ کہ اسلام جس دین کا نام ہے، اس کی شناسائی میں صحابہ اور صرف صحابہ معیار حق ہیں۔

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ حدیث کی قبولیت کے لیے امام ابوحنیفہ نے جو یہ شرط لگائی ہے کہ وہ حدیث اس شاہراہ کے خلاف نہ ہو جس پر معاشرہ صحابہ چل رہا تھا اس کا سرچشمہ یہی ہے۔ امام اعظم اخبار آحاد کو اسی پیمانے میں تولتے تھے اور ایسی حدیث کو معلول قرار دیتے جو اس شاہراہ کے خلاف ہو جو صحابہ سے متوارث ہے۔ اسی توارث کو السنۃ اور ماعلیہ الجماعۃ کہتے ہیں۔ اور اس موضوع پر امام اعظم کو دوسری صدی کے مولفین کی حمایت بھی حاصل ہے چنانچہ مصر کے مشہور محدث و فقیہ لیث بن سعد نے امام مالک کے نام جو خط لکھا ہے اس میں امام موصوف نے اس معیار کو واضح لفظوں میں پیش کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں :

جب کوئی ایسا مسئلہ سامنے آجائے جس پر مصر شام عراق میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے زمانہ ابوبکر و عمر و عثمان میں عمل کیا ہو اور اسی پر تا آخر حیات رہے ہوں تو ہماری ایسے مسئلہ کے بارے میں رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کی ہرگز ہرگز اجازت نہ دی جائے گی کہ وہ کوئی ایسا کام کریں جو ان کے اسلاف کے خلاف ہو۔ اعلام الموقعین ج ۳ صد ۹

امام مالک جو عمل اہل مدینہ کی حجت کے قائل ہیں۔ اس کا مبنی بھی یہی ہے حافظ ابن القیم اسی کو عمل مستمر کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک بھی یہ قابل اتباع حجت ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں؛

یہ نقل اور یہ عمل واجب الاتباع حجت اور ایک ایسی سنت ہے جسے تلقی یا لقبول حاصل ہے۔ (اعلام)

دوسری صدی میں تعامل و توارث کی طاقت اس درجہ مسلم تھی کہ اس دور کے مصنفین اپنی کتابوں میں صرف ان حدیثوں کو پذیرائی دیتے تھے جن کی پشت پر تعامل کی قوت ہوتی تھی۔ چنانچہ قاضی ابویوسف فرماتے ہیں؛

علیک من الحدیث ما تعرفہ العامۃ

اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ حدیث کی مقبولیت کی شرط یہ ہے کہ وہ اس محسوس و مرئی شاہراہ کے خلاف نہ ہو جو صحابہ کرام سے وراثت میں امت کو ملی ہے۔ امام ابوحنیفہ اخبار احاد کے مقبول ہونے کے لیے تعامل کے ہمنوا ہونے کی شرط لگاتے تھے۔ اور اسی معیار پر اخبار آحاد کو جانچتے تھے۔ چنانچہ ایک سے زیادہ مسائل میں اسی پیمانہ سے اخبار آحاد کو ناپا گیا ہے۔ نماز میں بسم اللہ پڑھنے کے موضوع پر ایک سے زیادہ حدیثیں آئی ہیں۔ حافظ زیلعی نے توارث اور تعامل کا ہی سہارا لے کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ :

"بسم اللہ کا نماز میں آہستہ پڑھنا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ میراث تھی جس پر لوگ چل رہے تھے اور صرف اتنی ہی بات اس مسئلہ میں اطمینان کے لیے کافی ہے"۔

اسی پیمانہ سے امام اعظم نے رفع یدین کے موضوع پر اخبار آحاد کو ناپا ہے تکبیر تحریمہ کی حد تک تو رفع یدین کا مسئلہ امت میں اتفاقی ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

"تکبیر تحریمہ کے موقعہ پر رفع یدین میں کوئی اختلاف نہیں ہے"۔

اگرچہ حافظ ابن حزم نے مطلق رفع یدین میں تواتر کا یہ کہہ کر دعویٰ کیا ہے کہ احادیث رفع یدین متواتر ہیں لیکن ان کا اس فیصلہ سے دوسرے علماء کو اتفاق نہیں ہے۔ ان کا کہنا کہ صرف تکبیر افتتاح کے وقت رفع یدین متواتر ہے چنانچہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے تنقیح الانظار میں علامہ محمد بن اسماعیل یمانی

نے توضیح الافکار میں اور حافظ زین الدین عراقی نے تصریح کی ہے کہ تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین تواتر سے تکبیر تحریمہ کے علاوہ دوسرے مواقع پر رفع یدین اخبار آحاد سے ثابت ہے اس سلسلے کی سب سے زیادہ مشہور روایت حضرت عبداللہ بن عمر کی ہے یہ روایت خود مواقع رفع یدین میں مختلف ہے۔ چنانچہ ابن عمر کی روایت بطریق سالم میں تین مواقع کا تذکرہ ہے تکبیر تحریمہ۔ عندالرکوع اور رکوع سے اٹھتے وقت اور بطریق نافع میں قعدہ اولی سے اٹھتے وقت بھی رفع یدین مذکور ہے اور دونوں بخاری کی روایات ہیں۔ نیز طبرانی کی روایات میں ایک پانچواں رفع یدین سجدے میں جاتے وقت بھی مذکور ہے و عند التکبیر حین یھوی ساجدا[1] اور علامہ ابن دقیق العید نے شرح العمدہ دونوں سجدوں کے درمیان رفع یدین کو قانونی قرار دیا ہے۔

امام اعظم نے ان اخبار آحاد کو توارث سے معارض ہونے کی وجہ سے معلل قرار دیا۔ اور ان تمام مواقع میں صرف اس رفع یدین کو اختیار فرمایا جو اسناداً متواتر ہے اور جسے توارث کی تائید حاصل ہے یعنی تکبیر تحریمہ کے وقت۔ انہوں نے ان روایات کا جس روشنی میں مطالعہ فرمایا وہ امت کا متوارث عمل ہے کیونکہ کوفہ میں اصحاب امیر المومنین علی مرتضیٰ اور اصحاب عبداللہ بن مسعود رفع یدین نہ کرتے تھے۔ حافظ ابن عبدالبر نے کوفہ کی پوری آبادی کے بارے میں مشہور محدث محمد بن نصر روزی کے حوالہ سے یہ عظیم انکشاف کیا ہے کہ

کوفہ کے سوا تمام شہروں میں ایسا کوئی شہر ہمیں معلوم نہیں جس کی آبادی نے بالاتفاق رکوع میں جاتے اور اٹھتے وقت رفع یدین کیا ہو۔

اور یہی حال زمانہ امام مالک میں مدینہ طیبہ کا ہے۔ چنانچہ ابن رشد نے بدایہ میں امام مالک کے روایت عدم رفع کو اختیار کرنے کی بنیاد بتایا ہے وہ فرماتے ہیں:

"امام مالک سے ترک رفع یدین کی روایت آنے کا سبب عمل اہل مدینہ ہے"۔ بدایۃ المجتہد

مکہ میں رفع یدین عبداللہ بن الزبیر کے زمانہ میں شروع ہوا اس سے پہلے اہل مکہ کا عمل بھی ترک رفع یدین ہے جیسا کہ میمون مکی کے سوال پر ابن عباس کے اس انداز بیان سے لو اراحد ایصلیھا ظاہر ہے جب کوفہ مدینہ اور مکہ کے اہل علم و ایمان اس پر عمل کر رہے ہیں تو یہ تعامل و توارث نہیں تو اور کیا ہے۔ بس اسی پیمانہ پر احادیث رفع یدین کو ناپ کر امام اعظم نے صرف تکبیر تحریمہ والے رفع یدین کو اختیار کر لیا اور باقی کو خلاف اولیٰ قرار دیا۔

بہر حال بتانا یہ چاہتا ہوں کہ امام ابوحنیفہ نے حدیث کی مقبولیت کی راویوں کی ثقاہت اور

سند کے اتصال کے ساتھ یہ شرط جو لگائی کہ عامہ العامہ کے خلاف نہ ہو تو اس کی بنیاد یہی ہے کہ یہ جماعت صحابہ کا ورثہ ہے۔ اور صحابہ صداقت نبوت کی دلیل ہی نہیں بلکہ بطور جماعت نبوت کے مقام پر فائز ہیں۔ زندگی کے کسی گوشہ میں ان سے ہٹ جانا ایمان کی بربادی کے سوا کچھ نہیں ہے اسی لیے حافظ ابن رجب حنبلی نے یہ انکشاف فرمایا ہے۔

ائمہ مجتہدین اور فقہا محدثین حدیث صحیح کی پیروی کرتے ہیں بشرطیکہ وہ حدیث صحابہ اور تابعین میں معمول بہ ہو (فضل علم السلف)

اسی لیے محدثین اور فقہا کے یہاں صحابہ کے اقوال اعمال اور فتاوی سب حجت ہیں۔ حافظ ابن عبدالبر نے امام ابوحنیفہ کے بارے میں لکھا ہے۔

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ اگر مجھے کتاب و سنت میں کوئی مسئلہ نہیں ملتا تو میں اقوال صحابہ پر عمل کرتا ہوں جس کا قول چاہتا ہوں لے لیتا ہوں لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ان کے اقوال سے تجاوز کر کے کسی اور کی بات اختیار کروں (الانتقاء)

امام مالک تو صحابہ کے اعمال و اقوال کو سنت کا درجہ دیتے ہیں وہ فتوی صحابی اور حدیث کے درمیان موازنہ کرتے تھے چونکہ ان اکابر کے یہاں صحابہ کے اعمال و اقوال کا یہ وزن ہے اس لیے ان کے یہاں احادیث کی صحت اور مختلف احادیث میں ترجیح کا معیار بھی یہی ہے۔

بیان تفصیل کا موقعہ نہیں۔ اس پر تفصیلی مباحث امام اعظم اور علم الحدیث میں پڑھتے۔ بتانا یہ ہے کہ اسلام کے روحانی، قانونی معاشی اور سیاسی نظام میں مطاعن اور معیار حق صحابہ کرام ہیں اور صحابہ سے روگردانی قرآن و سنت کے ملکات سے بے رخی ہے۔ یہ روگردانی خواہ حب ال رسول کے شوق میں ہو یا حب طاعت رسول کے پردے میں ہو، اور یا حب اجر و ثواب کے دلوے کی وجہ سے ہو اور یا پھر علم و تحقیق کا شوق اس کا محرک ہو۔

بیان تفصیل کا موقعہ نہیں جب اہل بیت کو بہانہ بنا کر صحابہ کے ایمان اور صحابیت کا انکار یا طاعت رسول کے شوق میں صحابہ کی عدالت اور ان کی سنت کا اور ان کی عملی زندگی کے دین میں حجت ہونے کا انکار یا حب رسول کے پردے میں دین کے نام پر ایسی تمام ایجادیں، رسمیں جن سے صحابہ کی ساری زندگیاں خالی ہیں۔ اور تلاش و تحقیق کے نام پر صحابہ کو مطاعن اور تنقیدات کا نشانہ بنانا یہ سب بے راہ روی اور فکری آوارگی کی تخلیقات نہیں۔

یاد رکھو قرآن میں صحابہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آئینہ ہیں۔ اس آئینے میں نبوت محمدیہ

کا چہرہ قرآن نے دکھایا ہے۔ان پر تنقید کرنا۔جرح کرنا نبوت پر تنقید و جرح ہے۔صحابہ پر تنقید و جرح کے بعد آپ قرآن کو اللہ کی کتاب محمد رسول اللہ کو اللہ کا رسول بھی ثابت نہیں کر سکتے۔جو شخص مقام صحابہ کی رفعتوں سے نا آشنا ہے وہ بلا ریب بارگاہ نبوت کا ادب ناشناس ہے۔صحابہ سے اعتماد ہٹ جانے کے بعد سب کچھ ناقابل اعتماد ہے۔

ایک بار قرآن عزیز کا اس فکر سے مطالعہ کریں کہ قرآن میں نبوت کے دلائل کیا ہیں؟ آپ کو محسوس ہوگا کہ قرآن نے چار قسم کے دلائل بیان کئے ہیں۔

ایک قسم وہ ہے جس قرآن نے آپ کو نبیوں کو ترازو میں رکھ کر تولا ہے اور اس نوعی پیمانے کے ذریعے آپ کی نبوت کو ثابت کیا ہے۔

دوسرے یہ کہ معجزات کے ذریعے آپ کی نبوت کو ثابت کیا ہے۔

تیسرے یہ کہ ذاتی کمالات کو نبوت کی دلیل بنا کر پیش کیا ہے۔

چوتھے یہ کہ صحابہ کرام کے کمالات کو آپ کی نبوت کے لیے بطور دلیل پیش کیا ہے۔

اس قسم کو قرآن میں اللہ سبحانہ نے اس تکرار کے ساتھ پیش کیا ہے کہ عقل انسانی حیران رہ جاتی ہے۔یہ ایک ایسی زبردست دلیل ہے جس کے سامنے بے انصاف مخالفوں کے بھی سر جھک جاتے ہیں۔ حقیقت بیں نگاہوں سے دیکھو کہ اسلام کی علمی اور عملی قوتوں کی کامیابی کا راز اسی میں سمٹا ہوا۔قرآن کھولتے ہی یہ آیت ملتی ہے کہ اولٰئك علی ھدی من ربھم واولٰئك ھم المفلحون۔یہی وہ جوہری قوت ہے جو اسلام کی پشتیبانی نصرت کے لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد صحابہ کی شکل میں اللہ سبحانہ کی جانب سے جمع کر دی گئی تھی۔

یہ کوئی راز نہیں کہ اسی اللہ سبحانہ کی اصطفائی واجتبائی قوت نے حضور اقدس کی زندگی میں دس لاکھ مربع میل اور آپ کے بعد چند ہی سالوں میں روئے زمین کی سب سے بڑی سیاسی طاقت بن کر اسلام کے نام پر ابھری۔تشیع ہو یا انکار حدیث، ابتداع ہو یا صحابہ کی عدالت کے معیار حق ہونے کا انکار یہ سب اسی قوت کے خلاف سازش ہے جس کے بعد اسلام کا دینی سرمایہ ہو یا دنیوی خود بخود صفر ہو کر رہ جائے گا۔ انا للہ فالی اللہ المشتکی

بات ادھوری رہ جائے گی اگر ہم یہاں یگانہ علم و تحقیق حافظ ابن تیمیہ کے صحابہ کے حوالہ سے تاثرات کو نظر انداز کر دیں۔ان کی محققانہ کتاب منہاج السنہ ہمارے پیش نظر ہے۔موصوف صحابہ کی عدالت کو اسلام کی ایک اہم بنیاد مانتے ہیں۔اور ان کو صحابہ کی صداقت اور ثقاہت پر بڑا یقین

ہے وہ صحابہ کو اسلام کی تعلیمات کا سچا نمونہ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت اور فیض صحبت کا بہترین نتیجہ تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک صحابہ کرام کے فضائل ایسے قطعی اور متواتر ہیں۔ اور قرآن حکیم کی ایسی صریح نصوص و آیات اور ایسی صحیح احادیث سے ثابت ہیں کہ وہ کسی تاریخی روایت سے مشکوک نہیں ہو سکتے وہ لکھتے ہیں ؛

جب کتاب و سنت اور نقل متواتر سے صحابہ کرام کے محاسن و فضائل ثابت ہو چکے ہیں تو یہ درست نہیں کہ وہ ایسی منقولات سے رد ہو جائیں جن میں سے کچھ منقطع اور کچھ محرف ہیں اور بعض ایسی روایات ہیں جن سے ان ثابت شدہ حقائق پر کوئی اثر نہیں پڑتا اس لیے کہ یقین شکوک و شبہات سے زائل نہیں ہوتا۔ ہم کو کتاب و سنت اور اپنے پیشروؤں کے اجماع اور ان کی مؤید متواتر روایات اور عقلی دلائل سے اس بات کا یقین ہو چکا ہے کہ صحابہ کرام انبیاء کرام کے بعد افضل الخلق تھے اس یقینی اور متواتر چیز پر ان امور کا اثر نہیں پڑ سکتا جو خود مشکوک و مشتبہ ہیں چہ جائے کہ جن کا باطل ہونا ظاہر ہو چکا ہے[1]

بلاشبہ صحابہ کرام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح معصوم نہ تھے کہ ان سے گناہوں کا صدور ہی نہیں ہو سکتا تھا لیکن اس کے ساتھ یہ ماننا بھی ضروری ہے کہ امت کے تمام لوگوں میں وہ سب سے زیادہ عادل، خدا ترس صادق القول امین اور راست باز تھے۔ اگر ان سے غلطیاں اور گناہ ہوئے تو اس کے مقابلے میں ان سے ایسے اعمال حسنہ اور خدا و رسول کو راضی کرنے والے کام ہوئے جو ان سیئات کا کفارہ بن گئے۔ اور بہرحال ان کے حسنات اور اعمال صالحہ کا پلڑا ان کی تقصیرات پر بھاری ہے۔ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں ؛

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کے بھی گناہوں سے معصوم ہونے کے قائل نہیں چہ جائے کہ خطاء فی الاجتہاد کے بھی قائل نہ ہوں اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے :

والذی جاء بالصدق وصدق به اولٰئك هم المتقون لهم مایشاؤن عند ربهم ذالك جزاء المحسنين ليكفر الله

---

[1] منہاج السنہ جلد ۳ ص ۲۰۹

عنھم اسوأ الذی عملوا ویجزیھم اجرھم باحسن الذی کانو یعملون۔

اور جو سچی بات لایا۔ اور جس نے اس کی تصدیق کی وہی پرہیزگار ہیں۔ ان کے لیے جو کچھ وہ چاہیں گے ان کے رب کے پاس موجود ہوگا۔ حسن کاروں کا یہی بدلہ ہے تاکہ اللہ ان سے وہ برائیاں دور کر دے جو انہوں نے کی تھیں اور اللہ ان کو ان کا اجر دے ان نیک کاموں کے بدلے میں جو وہ کیا کرتے تھے۔"

دوسری جگہ ہے۔

اولٰئک الذین نتقبل عنھم احسن ما عملوا ونتجاوز عن سیأتھم فی اصحاب الجنہ وعد الصدق الذی کانو الیوعدون۔

یہی وہ لوگ ہیں جن سے ہم وہ نیک عمل قبول کرتے ہیں جو انہوں نے کئے اور بہشتیوں میں شامل کر کے ان کے گناہوں سے درگذر کرتے ہیں۔ یہ اس سچے کے وعدے کے مطابق ہوگا جو ان سے کیا گیا۔

صحابہ کرام کی نظیر تاریخ میں نہیں ہے

حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ ان بشری لغزشوں اور کوتاہیوں کے باوجود جو انسانیت کا لازمہ ہیں مجموعی حیثیت سے انبیاء علیہم السلام کے علاوہ افراد انسانی کا کوئی مجموعہ اور انسانوں کی کوئی نسل صحابہ کرام سے بہترین سیرۃ و کردار کی نظر نہیں آتی۔ اگر ان کی زندگی میں کہیں کہیں کچھ ہلکے سے دھبے اور داغ نظر آتے ہیں تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے سفید کپڑے میں کہیں تھوڑی سی سیاہی نظر آجائے۔ یہ عیب چینوں کا قصور ہے کہ ان کو اس کپڑے میں سیاہی کا نقطہ تو نظر آیا ہے اور اس کپڑے کی ساری سفیدی نظر نہ آئی۔ دوسری جماعتوں کا تو حال یہ ہے کہ ان کا سارا نامہ اعمال سیاہ نظر آتا ہے کہیں کہیں سفیدی نظر آتی ہے وہ لکھتے ہیں،

صحابہ کرام اخیار امت ہیں۔ امت محمد میں کوئی ایسا گروہ نہیں ہے جو ان سے زیادہ ہدایت اور دین حق پر مجتمع اور تفرق و اختلاف سے دور ہو۔ ان کی زندگی میں کوئی نقص کی بات بھی نظر آتی ہے تو اگر اس کا کسی دوسری امت کے حالات سے مقابلہ کیا جائے تو اس کے مقابلے میں اس کی حقیقت نہیں معلوم ہوتی۔ غلطی اس شخص کی ہے جس کو سفید کپڑے

کی تھوڑی سی سیاہی تو نظر آتی ہے اور کپڑے کی ساری سفیدی نظر نہیں آتی ہے یہ بڑی نادانی اور بڑا ظلم ہے۔ اگر ان اکابر کا اپنے ہم مرتبہ لوگوں سے مقابلہ کیا جائے تو پھر ان کی ترجیح اور برتری معلوم ہو۔ باقی یہ کہ کوئی شخص اپنے دل میں کوئی خیالی تصویر بنالے ——— یا کوئی معیار تجویز کرے جس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا ہی نہ کیا ہو۔ تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ ایک اپنے دل میں ایک امام معصوم کا تصور قائم کرلیتا ہے۔ ایک شخص ایک اور ایسے امام کا تصور قائم کرتا ہے جس میں اور معصوم میں کوئی فرق نہیں اگرچہ اسے صاف صاف معصوم نہیں کہتا اور وہ تجویز کرتا ہے کہ امام کو یا شیخ کو یا امیر کو یا بادشاہ کو ایسا ہی ہونا چاہیے خواہ وہ کیسا ہی کثیر العلم، کیسا ہی دیندار صاحب محاسن ہو۔ اور اس کے ہاتھ سے اللہ سبحانہ نے کیسے ہی خیر کے کام کرائے ہوں لیکن یہ تجویز کرتا ہے کہ اس کو ایسا کامل العلم ہونا چاہیے کہ اس پر کوئی چیز پوشیدہ نہ ہو اور وہ کسی بھی مسئلہ میں غلطی نہ کرے وہ بشریت کے لوازم و خصائص سے پاک ہو۔ کبھی اس کو غصہ نہ آیا ہو اس کا کوئی علاج نہیں۔

یہ امر واقعہ ہے کہ جس شخص کی نظر پوری تاریخ پر ہوگی اور اس نے مختلف امتوں اور قوموں کے حالات پڑھے ہوں گے اور مختلف انسانی جماعتوں کا تجزیہ کیا ہوگا اس کو اس بات کا یقین ہوگا کہ صحابہ کرام سے زیادہ متحد، حق کا پیرو فتنہ اور افتراق سے نفور، نفسانیت و دنیاداری سے دور کوئی جماعت نہیں گذری۔ حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں :

جس شخص نے دنیا کے تمام فرقوں کے حالات و واقعات کا اہتمام سے مطالعہ کیا ہے اور ان کے حالات کا تتبع کیا ہے وہ جانتا ہے کہ کوئی گروہ ایسا نہیں گذرا جو ہدایت و رشد پر صحابہ کرام سے زیادہ مجتمع ہو اور تفرق و اختلاف سے دور ہو۔ ان کے متعلق اللہ سبحانہ نے شہادت دی ہے کہ وہ اس مخلوق میں سب سے بہتر ہیں وہ فرماتا ہے کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتوءمنون باللہ

اسلامی اجتماعیت میں خیر

اس وقت مسلمانوں میں جو کچھ خیر ہے اور علم و عمل کا جو بھی سرمایہ ہے برکت و رحمت کا جو کچھ

ذخیرہ ہے۔ شعائر اسلام کی بلندی اسلام کی اشاعت، عمل خیر کے جو کچھ محرکات اور جو کچھ توفیق خیر ہے اور سچ پوچھئے تو عالم میں اس وقت جو کچھ خیر وصلاح نظر آرہی ہے وہ سب صحابہ کرام کی جان فشانیوں اہل علو ہمت، ایثار اور قربانیوں کا نتیجہ اور ان کے نفوس قدسیہ کی برکت ونورانیت ہے حافظ ابن تیمیہ بڑے جوش سے لکھتے ہیں:

> خلافت راشدہ اور زمانہ صحابہ سے لے کر مسلمانوں کے پاس جو کچھ خیر ہے ایمان، اسلام، قرآن، علوم و معارف عبادات، جنت میں جانا، جہنم سے بچنا۔ کفار پر غلبہ اعلا کلمۃ اللہ وہ سب صحابہ کرام کی محنتوں کا نتیجہ اور ان کی کوششوں کی برکت ہے جنہوں نے دین کی تبلیغ اور اللہ کے راستہ میں جہاد کیا۔ جو مومن بھی اللہ پہ ایمان لایا اس پر صحابہ کرام کا احسان قیامت تک رہے گا۔

آخر میں لکھتے ہیں:

> وخیر الصحابۃ تبع لخیر الخلفاء الراشدین فھم کانوا اقوم بکل خیر فی الدین والدنیا من سائر الصحابۃ

زعماء منافقین کی نشاندہی

۱۰۱ اور تمہارے اردگرد جو اعرابی رہتے ہیں ان میں سے کچھ اور مدینہ شہر کے کچھ منافق نفاق پر اڑے ہوئے ہیں تم ان کو نہیں جانتے ہو ہم ان کو خوب جانتے ہیں۔ ہم ان کو دوبار سزا دیں گے۔ پھر ان کو سنگین عذاب کی طرف لوٹایا جائے گا۔ پہلے سے دیہاتی عربوں کا ذکر ہے۔ درمیان میں اعراب مومنین کے تذکرہ سے مہاجرین وانصار کی طرف کلام منتقل ہوگیا۔ اب اس آیت میں خاص مدینہ اور اس کے آس پاس رہنے والوں کا بیان ہے یعنی کچھ اہل مدینہ اور گردوپیش کے رہنے والے نفاق کے خوگر ہو چکے ہیں اور اسی پر اڑے ہوئے ہیں لیکن یہ نفاق اس قدر غرلق و عمیق ہے کہ ان کے قرب مکانی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال فطانت وفراست کے باوجود آپ بھی بالتعیین اور قطعی طور پر محض علامات وقرائن سے ان کے نفاق پر مطلع نہ ہو سکے۔ ان کا ٹھیک ٹھیک یقین صرف خدا کے علم میں ہے جس طرح عام منافقین کا پتہ چہرہ لب ولہجہ اور بات چیت سے لگ جاتا تھا جیسا کہ ارشاد ہے:

> ولو نشاء لاریناکھم فلعرفتھم بسیماھم ولتعرفنھم فی لحن القول

اور ہم اگر چاہتے تو آپ کو ان کا پورا پتہ بتا دیتے سو آپ ان کو ان کے حلیے سے پہچان لیتے۔ اور آپ ان کو ان کے طرز کلام سے ضرور پہچان لیں گے۔

لیکن ان کا نفاق اس قدر گہرا ہے کہ اس قسم کی ظاہری علامات بھی ان کا پردہ فاش نہیں کرتی ہیں فرمایا ہم انکو دوبارہ عذاب دیں گے بڑا عذاب دوزخ کا ہے۔

ان المنافقین فی الدرک الاسفل من النار

بلاشبہ منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے

اس عذاب سے پہلے کم از کم دو بار ضرور عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے ایک عذاب قبر دوسرا وہ عذاب جو اسی دنیوی زندگی میں پہنچ کر رہے گا۔ مثلاً ابن عباس کی ایک روایت کے موافق حضور اقدس نے جمعہ کے روز ممبر پر کھڑے ہو کر تقریباً ۲۶ آدمیوں کو نام بنام پکار کر فرمایا اخرج فانک منافق یعنی تو منافق ہے مسجد سے نکل جا یہ رسوائی بھی ایک قسم کا عذاب تھی۔ یا پہلے اسی سورت میں گذرا کہ ان کے اموال و اولاد کو حق تعالیٰ نے ان کے حق میں عذاب بنا دیا۔

فلا تعجبک اموالہم ولا اولادہم انما یرید اللہ لیعذبہم بہا فی الحیاۃ الدنیا۔

یا ان میں سے کچھ بھوک وغیرہ آفات ارضی و سماوی میں مبتلا ہو کر ذلت کی موت مرے یا اسلام کی ترقی و عروج کو دیکھ کر چڑنا اور دانت پیسنا بھی ان کے حق میں سوہان روح تھا۔ میرے نزدیک یہ سب قسم کے عذاب مرتین کے احاطہ میں داخل ہیں۔ اور دو کا عدد یا تو مطلق تعدد کے لیے ہے جیسے ثم ارجع البصر مرتین میں اور یا دو بار سے مراد نوعی اثنینیت ہے یعنی عذاب قبر اور عذاب قبل الموت [1]

مردوا علی النفاق کے معنی نفاق میں ماہر اور فن کار ہو گیا۔ نفاق کی فن کاری کی وجہ سے وہ اہل ایمان کو بڑی کامیابی سے دھوکہ دے سکتے ہیں یعنی منافقانہ زندگی گذارتے گذارتے اس کی ایسی مشق اور مہارت ہو گئی کہ نو آموزوں کی طرح پکڑے نہیں جا سکتے۔ یہ لوگ اس بناوٹ میں ایسے فن کار ہو گئے ہیں کہ ممکن نہیں کہ آپ ان کو پہچان سکیں۔ لا تعلمہم نحن نعلمہم میں مسلمانوں کو بھی تنبیہ ہے اور ان منافقین کو بھی۔ مسلمانوں کو یہ تنبیہ ہے کہ ان کے معاملے میں بڑی زیرکی اور ہوشیاری

---

[1] افادات شیخ الاسلام

سے کام لو اور برابر چوکنے رہو یہ ایسی عیاری سے کام لیتے ہیں کہ ہر شخص ان کو پہچان نہیں سکتا اور تو اور حضور اقدس بھی ان کو نہیں جانتے اور منافقین کو یہ تنبیہ ہے کہ تم کیسی ہی عیاری اور چالاکی کرو دوسرے تمہیں پہچاننے میں دھوکہ کھا سکتے ہیں لیکن اللہ تم کو اچھی طرح جانتا ہے سنعذبھم مرتین کی تشریح شارحین قرآن نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق کی ہے شیخ الاسلام کی تشریح آپ سن چکے۔ کچھ علماء کہتے ہیں کہ دو بار کا مطلب یہ ہے کہ ایک سزا نفاق کی دوسری کمال نفاق کی وجہ سے دہرے عذاب کے مستحق ہو گئے۔ پہلی استعداد یہ کہ منافق ہوئے دوسری یہ کہ اس میں ماہر اور فن کار ہو گئے۔

قرآن بار بار یہ بتاتا ہے کہ اعمال کے نتائج ٹھیک ٹھیک ان کی حالت اور درجہ کے مطابق رونما ہوتے ہیں اگر ایک شخص نے زہر کھا لیا معمولی قسم کا ہو تو نتیجہ بھی معمولی قسم کا ہوگا اگر زہر قاتل ہو تو نتیجہ بھی قاتل ہی ہوگا۔ یہی قانون مادی زندگی کی طرح روحانی زندگی میں بھی کام کر رہا ہے اچھائیوں کی طرح برائیوں کے بھی درجات واقسام ہیں۔

یہاں علامہ بقاعی بڑی ہی لطیف بات فرما گئے ہیں۔ ان کی یہ بات واقعات وحالات سے ہم آہنگ ہے اس لیے زیادہ اہم ہے۔ منافقین کو دو بار عذاب کی واقعاتی صورت یہ ہے کہ پہلی بار اس طرح وہ عذاب میں مبتلا ہوں گے کہ آپ بخیر و عافیت اور صحیح و سالم تبوک سے مدینے واپس تشریف لائیں گے۔ مدینہ میں آپ کا نظام حکومت مضبوط ہوگا۔ آپ کی شان بلند ہوگی اطراف واکناف آپ کا آوازہ ہوگا۔ نبوت کا آفتاب تاباں ہوگا کیونکہ تبوک جاتے وقت ان منافقین کو یقین تھا کہ آپ اس سفر سے واپس نہ آئیں گے کیوں؟ اس لیے کہ ان کے خیال میں آپ کے مدمقابل طاقت زبردست تھی۔ آپ کا بہادر شیروں سے مقابلہ تھا۔ رومیوں کی عظمت اور برتری سے وہ ذہنی طور پر مرعوب تھے ان کی فوجی طاقت ان کی افرادی قوت کا بھوت ان کے دماغوں پر مسلط تھا لیکن ان کو پتہ نہ تھا کہ مخلوق کی خالق کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں۔ آپ کی واپسی ان کے لیے دکھ تکلیف اور عذاب بن گئی۔ یہ عذاب کی پہلی باری ہے۔

عذاب کی دوسری باری اس وقت سامنے آئی جب آپ رحلت فرمائے دار بقا ہوئے مدینہ اور مدینہ کے ارد گرد آبادی نے آپ کے لگائے ہوئے باغ کو نذر آتش کرنے کی کوشش کی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دل سوزی بہادری اور دلیری کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا۔ اور منافقین کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔

مدینہ کے ارد گرد جن قبائل نے حضور اقدس کی مخلصانہ اطاعت اپنالی تھی وہ یہ قبائل تھے

جہینہ، اسلم، اشجع، غفار، لحیان، اور عصیہ اللہ سبحانہ نے حضور اقدس کو بتایا ہے کہ ان میں کچھ بناوٹی طور پر مسلمانی کا لبادہ پہنے ہوئے ہیں۔ سارے ہی مخلص نہیں ہیں خود اہل مدینہ میں مخاصمین تھے جنہوں نے فی الواقع اسلام کو ایک دین سمجھ کر قبول کیا تھا لیکن ان میں بھی کچھ منافقین کا بقیہ موجود تھا اہل مدینہ ہوں یا مدینہ کے اردگرد کے باشندے ہوں ان میں کچھ منافق تھے۔ اسی لیے آیت میں من تبعیضیہ لائے ہیں۔ یعنی ایک چھوٹی سی ٹولی ہے۔ جس کا نفاق اس حد کمال کو پہنچا ہوا ہے اس قدر خفی ہے کہ آپ کو بھی فطانت و ذکاوت اور کمال فراست کے باوجود ان کے منافق ہونے کا علم نہیں ہے۔ صرف اللہ ہی کو ان کے منافق ہونے کا علم ہے مولانا اشرف علیؒ نے مسائل السلوک میں لکھا ہے۔

"یہ آیت گرامی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے علم غیب کُلی کی نفی میں تصریح ہے"۔

یعنی یہ آیت گرامی اس بات کی صاف اور واضح دلیل ہے کہ ان منافقوں کو جن کا نفاق حد کمال کو پہنچا ہوا تھا اور جو نفاق پر اڑے ہوئے اور بضد تھے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نہیں جانتے تھے۔ ان کا علم صرف اللہ سبحانہ کو تھا۔ اگر آپ دانائے غیب ہوتے تو بلا ریب آپ کو ان منافقوں کے حالات کا پتہ ہوتا اور اللہ سبحانہ یہ نہ فرماتے کہ آپ ان کو نہیں جانتے ہیں اللہ سبحانہ ہی جانتا ہے۔

حضورؐ کی غیب دانی پر استدلال

چونکہ اس آیت گرامی میں کچھ لوگوں نے معنوی تحریف کر دی ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شارحین قرآن کی زبانی اس آیت کی تشریح پیش کر دی جائے۔

قاضی بیضاوی فرماتے ہیں،

آپ ان منافقوں کی شخصیتوں کو نہیں جانتے۔ اس فقرے میں یہ بات بتائی ہے کہ وہ اپنے نفاق کو چھپانے میں اتنے ماہر ہیں کہ آپ پر بھی انکے حالات پوشیدہ رہتے ہیں حالانکہ آپ کا کمال فراست و ذکاوت مثالی ہے نحن نعلمھم ہم ہی ان کو جانتے ہیں اور ان کے اندرون سے واقف ہیں۔ بیضاوی ص۱۸۶

علامہ نسفی لکھتے ہیں،

لا تعلمھم آپ ان کو نہیں جانتے یعنی وہ آپ پر باوجود آپ کی کمال فطانت اور صدق فراست کے مخفی ہیں کیونکہ آپ ایسے حالات سے بے حد پرہیز کرتے ہیں جو ان کے بارے میں آپ کو شک میں ڈال دے نحن نعلمھم ہم ہی ان جانتے ہیں یعنی اللہ سبحانہ

کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا ہے اور نہ ان کے بھید سے اللہ کے سوا کوئی واقف ہے۔ کیونکہ وہ کفر تو دل میں چھپائے رکھتے ہیں اور آپ کے سامنے وہ مخلص مسلمانوں کی طرح ظاہر ہوتے ہیں۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی لکھتے ہیں:

"لا تعلمھم یعنی آپ باوجود فطانت اور صحیح فراست کے ان کا منافق ہونا نہیں جانتے ہیں۔ قرآن نے یہ کہہ کر منافقین کی نفاق میں مہارت اور فن کاری بتائی ہے۔ ان کی مہارت یہ ہے کہ وہ ایسے حالات ہی پیدا نہیں ہونے دیتے جن سے ان کا منافق ہونا آپ جان سکیں۔ نحن نعلمھم ہم ہی ان کو خوب جانتے ہیں۔ اگر آپ کے سامنے تلبیس سے کام لے سکتے ہیں تو ہمارے سامنے ان کو تلبیس پہ قدرت نہیں ہے۔

علامہ محمود آلوسی لکھتے ہیں:

لا تعلمھم کہ آپ ان کو نہیں جانتے ہیں اس میں اللہ سبحانہ نے منافقین کی سرکشی کو بتایا ہے کہ وہ نفاق میں اتنے گہرے ہیں کہ ان کو عنوان نفاق سے نہیں جانتے ہیں مطلب یہ ہے کہ آپ کو ان کے نفاق کا علم نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ مدینہ طیبہ کے جن منافقین کا یہاں ذکر کیا گیا ہے ان کا نفاق اور ان کے دوسرے ظاہری اور باطنی احوال سب ہی علم غیب ہیں لیکن اس آیت میں اس کی تصریح ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی منافقت اور منافقانہ چالوں اور ریشہ دوانیوں کا علم نہ تھا۔

ملا علی نے موضوعات کبیر میں جلال الدین سیوطیؒ سے نقل کیا ہے کہ ایک فرقہ کا خیال ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اور اللہ سبحانہ کا علم برابر ہے جو کچھ اللہ سبحانہ جانتے ہیں حضور بھی جانتے ہیں یہ بتا کر لکھتے ہیں کہ:

حالانکہ اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے وممن حولکم من الاعراب منافقون ومن اھل المدینۃ مردوا علی النفاق لا تعلمھم نحن نعلمھم یہ ارشاد گرامی سورہ برارت میں ہے جو قرآن کریم کی نزول میں آخری سورت ہے اور منافق بھی دور نہ تھے۔ آپ کے پڑوس میں مدینہ کے اندر رہتے تھے اور جس نے یہ اعتقاد کر لیا کہ اللہ سبحانہ کا اور اس کے رسول کا علم برابر ہے تو وہ اجماع امت کی رو سے کافر ہے (موضوعات کبیر)

ایک شارح قرآن کی تفسیر

حیرت ہے کہ ایک عالم مفسر قرآن نے قرآن کی اس آیت کی ضرب کاری سے بچنے کے لیے اس آیت کو ولتعرفنھم فی لحن القول سے منسوخ کر دیا ہے۔ حالانکہ ایسا خیال قرآن کی شرح و تفسیر نہیں ہے کیونکہ اولاً سورۃ توبہ قرآن کی آخری سورت ہے اور یہ آیت لا تعلمھم اسی میں آتی ہے۔ متقدم سے متاخر کو منسوخ کرنا ہرگز صحیح نہیں ہے۔ ثانیاً لا تعلمھم کا درجہ خبر ہے انشا نہیں ہے نسخ انشا میں ہوتا ہے۔ خبر میں نہیں ہوتا ہے۔ علامہ نسفی لکھتے ہیں؛

"محققین علماء کا مسلک ہے کہ نسخ احکام میں ہوتا ہے اخبار میں نہیں ہوتا۔" مدارک ج ۱

ثالثاً ان دو آیتوں کا محل بھی الگ الگ ہے نہ ان میں تعارض کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ نسخ کا۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

> حق سبحانہ و تعالیٰ شانہ کا یہ ارشاد لا تعلمھم اس کے اس ارشاد ولو نشاء لاریناکھم فلعرفتھم بسیماھم ولتعرفنھم فی لحن القول کے منافی نہیں ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ہم چاہیں تو آپ کو وہ منافق دکھا دیں تو آپ ان لوگوں کو ان کے چہرے بشرے کی نشانیوں سے پہچان سکتے ہیں اور ان کو بات کے ڈھب سے پہچان سکتے ہیں کیونکہ یہ تو ان علامات سے پہچاننا مراد ہے جو ان کے چہرے پر نمایاں ہوں جن سے وہ پہچانے جا سکتے ہیں آیت کا یہ مطلب نہیں کہ آپ نفاق و شک کے سارے لوگوں کو پہچانتے تھے۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۲ صفحہ ۳۸۴)

اور یہی حافظ ابن کثیرؒ ولو نشاء الخ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر ہم چاہیں تو منافقین کو باشخاصہم معین کر کے آپ کو دکھا دیں اور نام بنام مطلع کر دیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے تمام منافقوں کے بارے میں از راہِ تستر امور کو ظاہری سلامت روی پر رکھتے ہوئے اور بھیدوں کو ان کے جاننے والے کے حوالہ کرتے ہوئے ایسا نہیں کیا اور آپ ان کو ان کے ظاہری کلام جو ان کے مقاصد پر دال ہے اور متکلم کی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے پہچان سکتے ہیں کہ وہ کس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ اس کی بات کے الگ ڈھنگ سے اس کو پہچانا جا سکتا ہے اور لحن القول سے یہی مراد ہے۔ ابن کثیر ج ۴ صفحہ ۱۸۰

اس سے معلوم ہوا کہ لا تعلمھم نحن نعلمھم میں حقیقی علم آپ کو نہیں وہ صرف ہمیں کو ہے اور ولو نشاء الایہ میں چہرے بشرے سے اور انداز کلام سے پہچاننا مراد ہے جو صرف ظاہری قرائن اور شواہد کے تحت ہے اور یہ ظن کے درجے اوپر نہیں مانا جاتا کیونکہ منافق اور مخلص کی بات کا ڈہنگ الگ الگ ہوتا ہے۔ جو زور شوکت، پختگی اور خلوص کا رنگ مخلص کی باتوں میں جھلکتا ہے۔ منافق کتنی ہی کوشش اور تصنع سے کام لے وہ اپنے کلام میں پیدا نہیں کر سکتا۔ اور علامہ محمود آلوسی الحنفی ارقام فرماتے ہیں۔

صرف پیشانیوں پر منافق کے لفظ کا ہونا ہی علامت نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم منافقین کو دوسری علامات سے پہچان لیتے تھے۔ ٹھیک اس طرح جیسے قیافہ شناس کسی شخص کے ظاہری حالات اور علامات کو دیکھ کر اس کا حال معلوم کر لیتا ہے۔ اور نظر بھی اس کے دل کی ترجمانی کر دیتی ہے۔ اور ہم نے متعدد حضرات کو دیکھا ہے کہ وہ چہرے پر علامات کو دیکھ کر سنی اور شیعہ بتا دیتے ہیں اور اگر یہ صحیح ہے کہ کچھ اولیاء کرام نیک و بد اور مومن و کافر کو پہچان لیتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ مجھے فلاں سے طاعت کی اور فلاں سے معصیت کی بو آتی ہے۔ اور فلاں سے ایمان کی خوشبو اور فلاں سے کفر کی بدبو محسوس ہوتی ہے تو اس سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے۔ روح المعانی ج ۲۶ ص۷۸

بہر حال اس آیت کو فلعرفتھم بسیماھم والی آیت سے منسوخ بتانا قرآن کی شرح و تفسیر کا منہ چڑانا ہے۔

اس آیت میں منافقوں کے موضوع پر یہ باتیں پوری وضاحت سے بتائی گئی ہیں۔

اوّل یہ کہ منافقین کی دو قسمیں ہیں ایک اعرابی اور بدوی جو مدینہ کے ارد گرد رہتے تھے یعنی مدینہ سے قریب بستیوں میں جن کی سکونت تھی۔

دوسرے خاص مدینہ کے باشندے ان میں سب کو منافق نہیں کہا بلکہ کچھ کو ایسے ہی بدوؤں میں بھی سب منافق نہ تھے بلکہ کچھ منافق تھے اور کچھ کے بارے میں آپ پڑھ چکے ہیں من الاعراب من یومن باللہ والیوم الاخر ویتخذ ماینفق قربات عند اللہ الخ اور جو کچھ منافق تھے وہ نفاق عمل تھا۔ نفاق واقعی نہ تھا اور نفاق کی وجہ بھی یہ تھی کہ صحبت نبوت اور اہل علم سے دور ہونے کی وجہ سے اسلام آشنائی کے اس مقام پر نہ تھے جو ایمان کے تقاضے پورا کرنے کے لیے

ضروری ہے ان لا یعلموا حدود ما انزل اللہ علی رسولہ۔

اس سے واضح ہوا کہ مہاجرین وانصار میں سے کوئی منافق نہ تھا کیونکہ جن کا چہرہ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کے ذریعہ پیش کیا جا چکا ہے وہاں نفاق کا شائبہ بھی ممکن نہیں ہے اس لیے مہاجرین وانصار پر نفاق کا شبہ کرنا اس آیت کی بغاوت ہے بلکہ صریح قرآن کی تکذیب ہے۔

دوم یہ کہ ان کچھ منافقوں کا نفاق شاہراہ عام پر نہ تھا کہ ہر کہ دمہ دیکھ کر فیصلہ کر دے کہ یہ منافق ہے بلکہ اس قدر پوشیدہ تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم باوجود فراست کاملہ اور باوجود اس روشن ضمیری کے ان کے نفاق سے بے خبر تھے۔ معلوم ہوا کہ اہل تشیع جن کو منافق کہتے ہیں کیونکہ بقول ان کے ان کا نفاق اس قدر نمایاں تھا کہ حضور اقدس کو اول روز ہی سے ان کے نفاق کا پتہ تھا۔ سفر ہجرت میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو صرف اس لیے ہمراہ لیا تھا کہ وہ کہیں افشائے راز نہ کر دیں (معاذ اللہ) ثم معاذ اللہ

ثالثاً یہ کہ منافقوں کو عذاب آخرت سے پہلے دو مرتبہ دنیا میں عذاب ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ عذاب عظیم سے مراد بلاشبہ آخرت کا عذاب ہے پس اس سے پہلے جو دو مرتبہ عذاب کرنے کو فرمایا بلاشبہ وہ دنیا میں ہے اس کی تصریح بھی دوسری آیات میں آتی ہے یعذبهم الله عذابا الیما فی الدنیا والآخرۃ۔ شارحین قرآن نے تصریح کی ہے کہ دو مرتبہ عذاب کرنے سے مراد یہ ہے کہ ایک بار ان کا نفاق ظاہر کر کے ان کو رسوا کیا جائے گا اور دوسری مرتبہ ان کو قتل کیا جائے گا۔

عفو و درگذر کی شان عظیم

۱۰۲ اور کچھ اور بھی ہیں جنہوں نے اپنی غلطی کو مان لیا ہے۔ انہوں نے ملے جلے کام کیے، کچھ اچھے اور کچھ برے ہو سکتا ہے کہ اللہ سبحانہ ان کی توبہ قبول کرے اللہ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے۔

اہل مدینہ میں اگر ایک طرف یہ منافقین متمردین ہیں جو اپنی شرارتوں اور جرموں کو پردۂ نفاق میں چھپاتے اور ان پر سختی سے اڑے رہتے ہیں تو دوسری جانب کچھ وہ مسلمان ہیں جن سے بر تقاضائے بشریت کوئی خطا و قصور سرزد ہو جائے تو نادم ہو کر بے تامل اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں ان کی بھلائی اور برائی رلی ملی ہے۔ برائی تو مثلاً یہی ہے کہ نفیر عام کے باوجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر غزوہ تبوک میں حاضر نہ ہوئے بعدہ اس غیر حاضری پر دل سے پشیمان ومتاسف

ہونا اور ظاہراً و باطناً توبہ کرنا اور دوسرے اعمال صالحہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج یا دوسرے غزوات کی شرکت وغیرہ بجالانا۔ یہ سب ان کی بھلائیوں کی فہرست میں داخل ہے ایسے حضرات کو حق تعالیٰ نے معافی کی امید دلائی ہے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ آیت حضرت ابو لبابہ اور ان کے چند ساتھیوں کے حق میں نازل ہوئی جو محض کسل اور تن آسانی کی وجہ سے تبوک میں حاضر نہ ہوئے لیکن جب تبوک سے حضرت کی واپسی معلوم ہوئی تو غایت ندامت سے ان سب نے اپنے کو مسجد کے ستونوں سے باندھ دیا اور قسم کھائی کہ جب تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ان مجرموں اور قیدیوں کو معاف کرکے اپنے ہاتھ سے نہ کھولیں گے۔ اسی طرح بندھے کھڑے رہیں گے۔ آپ نے یہ حال دیکھ کر فرمایا۔ واللہ جب تک خدا ان کے کھولنے کا حکم نہ دے میں ان کو نہیں کھول سکتا۔ آخر یہ آیات نازل ہوئیں۔ تب آپ نے کھولا اور قبول توبہ کی بشارت دی کہتے ہیں کہ یہ لوگ کھلنے کے بعد تکمیل توبہ کے طور پر کچھ مال لے کر حاضر ہوئے کہ اللہ کی راہ میں تصدق کریں۔ اس پر اگلی آیت نازل ہوئی۔[1]

شارحین قرآن نے امام مجاہد اور حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے یہ انکشاف کیا ہے کہ ان آیات کا پس منظر وہی ہے جو حضرت شیخ الاسلام نے اپنے افادات میں بتایا ہے اس واقعہ سے یہ بات پوری قوت کے ساتھ واضح ہوجاتی ہے کہ یہ لوگ غزوہ تبوک میں شرکت سے اس لیے محروم نہ ہوئے تھے کہ جنگ میں جانا نہ چاہتے یا ان کو نبوت میں کوئی شک تھا بلکہ ان کے شریک نہ ہونے کا سبب صرف طبعی تکاسل تھا۔ جیسا کہ حافظ ابن کثیر نے بتایا ہے کیونکہ ابو لبابہ ان لوگوں میں تھے جو بیعت عقبہ کے موقعہ پر ہجرت سے پہلے اسلام سے مشرف ہوئے تھے۔ پھر جنگ بدر، جنگ احد اور دوسرے اہم مواقع پر موجود تھے مگر غزوہ تبوک کے موقع پر ایمان کی کمزوری سے نہیں بلکہ طبیعت کی افتاد کے غلبہ کی وجہ سے بغیر کسی عذر شرعی کے بیٹھے رہ گئے یہ صرف اکیلے نہ تھے بلکہ ان کے کچھ اور بھی ساتھی تھے جد بن قیس، کردم، اوس بن ثعلبہ، ودیعہ ابن حزام، مرداس، ابو قیس اور ابو لبابہ یہ دس حضرات تھے جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک سے واپس آئے اور ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ پیچھے رہ جانے والوں کے متعلق اللہ و رسول کی کیا رائے ہے تو ان میں سے ہر شخص سچائی کے ساتھ اپنی غفلت پر شرمندہ ہوا اور کوئی نہ تھا جس کا دل حسرت و ندامت کے زخموں سے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نہ ہو رہا قبل اس کے کہ کوئی باز پرس ہوئی۔ انہوں نے خود ہی اپنے آپ کو ایک ستون سے باندھ لیا اور کہا کہ ہم پر خواب و خور حرام ہے جب تک ہم معاف نہ کر دیئے جائیں یا پھر ہم مر جائیں چنانچہ وہ کئی روز اسی طرح بے آب و دانہ اور بے خواب بندھے رہے حتیٰ کہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ آخر کار جب ان کو بتایا گیا کہ اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی اور ان کو معاف کر دیا کیونکہ اسکی بخشش و رحمت کا دروازہ کبھی بند نہیں ہو سکتا شرط صرف یہ ہے کہ ہم خود اپنے دلوں کا دروازہ اپنے ہاتھوں نہ بند کر دیں ۔

نہ پہنچی ضعف سے لب تک دعا ہی، ورنہ سدا
در قبول تو اس آرزو میں باز رہا

فرمایا انہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا اور ان کا یہ اعتراف دل کا اعتراف ہے کوئی وجہ نہیں کہ ان کی توبہ قبول نہ ہو اور جو سر اعتراف گناہ میں جھک گیا پھر اس کے لیے محرومی ہو نہیں سکتی

ع کہ مستحق کرامت گنہ گار انند

عسی اللّٰہ ان یتوب علیھم کا شاہانہ انداز اختیار کر کے ان کو قبولیت کی بشارت دی گئی۔ اور بشارت سے پہلے ان کے گناہوں کے اعتراف کی وجہ بتائی گویا ذہنوں میں یہ سوال ابھرا کہ انہوں نے گناہوں کا اعتراف کیوں کیا۔ فرمایا کہ یہ لوگ صرف برائیوں میں نہیں پلے ہیں، بلکہ اس موجود برائی کے ساتھ ان کی زندگی میں عمل صالحہ کا سرمایہ بھی ہے نیکی کی راہ پر چلتے اگر غلطی ہو جاتی ہے تو نیکی کی برکت سے فوراً تنبیہ ہوتا ہے اور اعتراف گناہ کے بعد سر ندامت سے جھک جاتا ہے خلطوا عملا صالحا و آخر سیئا ۔

مفسرین کے نزدیک اگرچہ آیت کا مورد خاص ہے مگر حکم عام ہے ابو عثمان النہدی کہتے ہیں کہ میرے نزدیک قرآن کی یہ آیت اہل ایمان کے لیے بہت بڑی ڈھارس ہے ۔ امام بیہقی نے حضرت مطرف کے حوالہ سے بتایا ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں رات کو بستر پر لیٹتا ہوں اور قرآن پر غور کرتا ہوں اور قرآن کی روشنی میں اپنا جائزہ لیتا ہوں تو میں محسوس کرتا ہوں کہ قرآن نے اہل جنت کا جو چہرہ پیش کیا ہے اس پر میں پورا نہیں اترتا ہوں ۔ جہنمیوں کی بات جو قرآن نے بتائی اس پر جب اپنے کو پیش کرتا ہوں تو اپنے آپ کو ان میں بھی نہیں پاتا ہاں جب قرآن کی اس آیت کو پڑھتا ہوں و آخرون اعترفوا بذنوبھم الخ تو میں اپنے آپ کو اس کے مطابق دیکھتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ میں اس آیت کا مصداق ہوں گا ۔

اس آیت سے محققین نے یہ بات بھی خوب سمجھی ہے کہ گنہ گار کے لیے مایوسی جائز نہیں ہے اور قبول وعفو کی امید اس وقت تک قائم ہے جب تک زندگی میں بدی کے ساتھ نیکی کی آمیزش ہے. آج بھی اگر ایک مسلمان سے نیکیوں کے ساتھ کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اسے رحمت حق سے مایوس نہ ہونا چاہیے عسی اللہ ان یتوب علیھم اور لا تقنطوا من رحمۃ کا یہی مطلب ہے۔ گویا یہ آیت ارحم الراحمین کی بے پایاں رحمت اور عفو و درگذر کی شان عظیم کا اعلان کرتی ہے اور سخت سے سخت مایوس بیماروں کے حق میں اکسیر شفا کا حکم رکھتی ہے کیونکہ اللہ سبحانہ بندے کی توبہ قبول کرلیتا ہے۔ اللھم اغفر لی ذنوبی جمیعًا انہ لا یغفر الذنوب الا انت. رب رحمتک ارجی عندی من عملی و مغفرتک اوسع من ذنوبی۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ
وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ
سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۳﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ
عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾
وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ وَ
سَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ
تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَ
اِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾

اے پیغمبر ان کے مالوں سے زکوٰۃ لو، اس کے ذریعے تطہیر اور تزکیہ کرو گے اور ان کو دعا دو۔ بلاشبہ آپ کی دعا ان کیلئے سامان سکینت ہے اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے[۱] کیا ان کو خبر نہیں ہے کہ اللہ ہی کی ذات گرامی اپنے بندوں کی توبہ کو شرف قبول عطا کرتی ہے اور اللہ ہی صدقات کو پذیرائی دیتا ہے اور اللہ ہی زیادہ سے زیادہ توبہ قبول کرنے والا اور بڑا ہی رحمت کرنے والا ہے[۲] اور اے پیغمبر ان سے کہدو کہ عمل کئے جاؤ اللہ تمہارے

اللہ کا رسول اور سارے مسلمان تمہارے اعمال دیکھیں گے اور
ضرور تمہیں عالم الغیب والشہادۃ کی عدالت میں پیش کیا جائے گا تو وہ تمہیں
بتائے گا کہ تم کیا کرتے تھے [۱۰۵] اور کچھ اور بھی ہیں جن کے معاملے
میں تا حکم الٰہی مہلت دی گئی ہے وہ ان کو عذاب دے اور یا
اپنی رحمت سے ان کو معاف کر دے اللہ سب کچھ جاننے والا
اور حکمت والا ہے [۱۰۶]

مفردات کے معانی

صدقہ خیرات، زکوٰۃ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں۔ صدقہ وہ ہے جس کو اپنے مال میں سے بطور عبادت نکالتا ہے جیسے کہ زکوٰۃ لیکن صدقہ اصل میں نفلی خیرات کے لیے بولا جاتا ہے اور زکوٰۃ واجب کے لیے اور کبھی واجب کو صدقہ سے موسوم کیا جاتا ہے جب کہ اس کا ادا کرنے والا اپنے فعل میں صدق کا ارادہ کرے ارشاد ہے خذ من اموالھم صدقۃ اور انما الصدقات للفقراء اور صدقہ دال کے پیش کے ساتھ مہر ہے۔ فقہاء کی زبان میں صدقہ کی حیثیت بالکل ہبہ کی ہے۔ جیسے ہبہ قبض کے اور تملیک کے بغیر ہبہ نہیں ایسے ہی صدقہ بھی قبض اور تملیک کے بغیر درست نہیں ایک مثال سے سمجھئے چند فقیروں کو بلا کر گھر میں کھانا کھلایا یہ طعام اباحت اور خیرات ہے لیکن صدقہ نہیں ہے اگر ان کو مالک بنا دیا تو یہ صدقہ ہے درمختار میں ہے الصدقۃ کالھبۃ بجامع التبرع تطھر بہ طہر سے تطہیر باب تفعیل ہے اس کے معنی خوب پاک کرنا ہیں اس میں غالب پہلو ظاہری اور باطنی نجاستوں اور رذائل سے پاک کرنے کا ہے قرآن میں وطھر ثیابک آیا ہے حضرت ابراہیم واسماعیل کو حکم طھرا بیتی میرے گھر کو پاک کرو۔ عام شارحین قرآن نے اس کا متعلق ذنوب بنایا ہے مطلب یہ ہے کہ صدقہ کے ذریعے آپ ان کے دامنوں سے گناہوں

کے داغ ہٹادیں۔ یہ گویا تخلیہ یعنی صفائی اور منجھائی ہے۔
تزکی زکو سے نکلا ہے تزکیہ اس کا مصدر ہے۔ اصل میں زکوٰۃ کے معنی بڑھوتری کے آتے ہیں امام راغب فرماتے ہیں وہ افزونی جو اللہ تعالیٰ کی برکت سے حاصل ہوتی ہے زکوٰۃ ہے جب کھیتی میں افزونی و برکت حاصل ہو اسے کہا جاتا ہے زکا الزرع قرآن میں ایھا ازکی طعاما اسی سے آیا ہے اور اسی سے زکوٰۃ اس شے کو کہتے ہیں جسے انسان فقیروں کے لیے نکالتا ہے اور اس لیے کہا گیا کہ اس میں برکت کی امید ہوتی ہے یا اس لیے کہ نفس کا تزکیہ ہوتا ہے یعنی خیرات و برکات کے ذریعے اس میں ترقی ہوتی ہے۔ دراصل نفس تزکیہ اور طہارت کی بدولت انسان اس حیثیت میں ہوجاتا ہے کہ دنیا میں اوصاف حمیدہ کا گہوارہ بن جائے اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ انسان اس کوشش میں لگ جاتا ہے جس میں اس کی پاکیزگی ہوتی ہے۔
تزکیہ کی نسبت کبھی بندہ کی طرف ہوتی ہے کیونکہ وہ اکتساب کرتا ہے جیسے قد افلح من زکھا اور کبھی اللہ سبحانہ کی طرف ہوتی ہے کیونکہ فی الواقع وہی فاعل ہے اللہ یزکی من یشاء اور کبھی اس کی نسبت نبی کی طرف ہوتی ہے کیونکہ خدا کی جانب سے آنے والے تزکیہ میں وہی واسطہ ہوتا ہے تطھرھم و تزکیھم بھا اور یتلوا علیکم آیاتنا ویزکیکم
صلّ علیھم۔ اس کا مصدر تصلیۃ ہے اور اس کا اسم مصدر صلوٰۃ ہے۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں۔ بہت سے اہل لغت کا بیان ہے کہ صلوٰۃ کے معنی دعا کرنے، برکت مانگنے اور بزرگی سے یاد کرنے کے ہیں۔ بولا جاتا ہے۔ صلیت علیہ یعنی میں نے اس کے دعا کی اور بزرگی سے یاد کیا۔ حدیث میں ہے اذا دعی احدکم الی الطعام فیجب وان کان صائما فلیصل جب تم میں کسی کو کھانے کی دعوت دی جائے تو قبول کرے اگر روزہ ہو تو دعا دے دے۔ صل علیھم ان صلٰوتک سکن لھم ان کو دعا دو بے شک تمہاری دعا ان کے لیے سکون کا سامان ہے یصلون علی النبی یا ایھا الذین آمنوا صلوا علیہ رحمت بھیجنے میں پیغمبر پر اے ایمان والو تم بھی رحمت کی دعا کرو صلوات الرسول پیغمبر کی دعائیں۔ اللہ سبحانہ کی طرف سے مسلمانوں پر صلوٰۃ کا مطلب حقیقت میں ان کو سراہنا ہے ارشاد ہے اولئک علیھم صلوات من ربھم و رحمۃ ایسے لوگوں پر شاباشیں ہیں ان کے رب کی جانب سے اور مہربانی۔ علامہ عینی فرماتے ہیں صلوٰۃ کے معنی لغت میں دعا کے آتے ہیں۔ لفظ صلوٰۃ اسم مصدر ہے اور اس کے معنی اللہ کی جانب سے ہو تو رحمت کے ہیں فرشتوں اور اہل ایمان کی جانب سے ہو تو دعا کے ہیں

حضور اقدس کے حق میں صلاۃ کے شرعی معنے یہ ہیں کہ اے اللہ حضور اقدس کی بات کو دنیا میں اونچا کر اور آپ کی شریعت کو زندہ کر کے حضور کو بڑا بنا دے، اور آخرت میں رفع درجات اور مقام شفاعت عطا فرما کر آپ کو اونچا کر دے یہی معنے میں نے اپنے عظیم اساتذہ سے سنے ہیں۔

زکوٰۃ کے لیے اجتماعی نظام کی ضرورت

زکوٰۃ کے ضروری احکام پارہ دہم میں بیان ہو چکے ہیں۔ اس آیت میں ایک اہم اور ضروری چیز بتائی جا رہی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اسلام میں سارے کام نظام جماعت کے ساتھ ہوتے ہیں۔ انفرادیت کو اسلام پسند نہیں کرتا۔ آپ مسجد سے دور ہوں اور الگ نماز پڑھ لیں نماز تو ہو جائے گی مگر اسلام بھی چاہتا ہے کہ نماز کی ادائیگی باجماعت ہو۔ اسی طرح نظام جماعت نہ ہو الگ زکوٰۃ نکالنا اور خرچ کرنا ہو زکوٰۃ تو ہو جائے گی مگر ایسی ہو گی جیسے نماز بغیر جماعت کے۔

شائد آپ کے ذہنوں میں یہ خلش ہو کہ زکوٰۃ کے موضوع پر نظام جماعت سے کیا مقصود ہے؟ اسلام جماعت سے مقصود افراد کا ایسا مجموعہ ہے جس میں اتحاد، ایتلاف امتزاج اور نظم ہو۔

اتحاد کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اعمال حیات میں منتشر نہ ہوں ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں اور ان کے تمام اعمال مل جل کر انجام پائیں کسی گوشہ عمل میں بھی پھوٹ اور بیگانگی نہ ہو۔

ایتلاف کا مرتبہ اتحاد سے بلند تر ہے۔ اتحاد صرف باہم مل جانا ہے ضروری نہیں کہ کسی تناسب کے ساتھ باہم ملے ہوئے ہوں لیکن ایتلاف سے ایسا اتحاد مراد ہے جو محض اتحاد نہ ہو بلکہ ایک صحیح اور مناسب ترکیب کے ساتھ ہو۔ یعنی منتشر افراد اس طرح باہم ملے ہوں کہ جس فرد کو اس کی صلاحیت و اہمیت کے مطابق جو جگہ ملنی چاہیے وہی جگہ اسے ملی ہو اور ہر فرد کی انفرادی قوت کو جماعتی ترکیب میں اتنا ہی دخل دیا جائے جتنی اس میں استعداد ہو۔

امتزاج ترکیب کا تیسرا درجہ ہے اس میں کمیت سے زیادہ کیفیت کا اتحاد ہونا چاہیے یعنی مختلف افراد کو باہم اس طرح ملایا جائے کہ جس فرد کا اجتماعی مزاج جس قسم کے مزاج کے ساتھ مل کر ایک متحدہ کیفیت حاصل کر سکتا ہے ویسا ہی مزاج اس کے ساتھ ملایا جائے۔

نظم سے مقصود جماعت کی وہ ترتیبی اور تقویمی حالت ہے کہ اس کے تمام افراد اپنی اپنی جگہوں میں قائم اپنے اپنے دائرہ میں محدود اور اپنے اپنے فرائض و اعمال کے انجام دینے میں سرگرم ہوں۔

اجتماعی زندگی کے یہ خواص نہ تو حاصل ہو سکتے ہیں اور نہ قائم رہ سکتے ہیں جب تک کوئی بالاتر فعال

دمدبرطاقت موجود نہ ہو لہذا ایک امام کا وجود ناگزیر ہے اور اسی لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اپنا امام وسربراہ بنائیں۔ جماعتی طاقت کا اصل مرکز امام ہے اس اجمالی تمہید کے بعد سب سے زیادہ اہم مسئلہ سامنے آتا ہے یعنی اسلام کا نظام شرعی یہ ہے کہ ہر مسلمان خلیفہ وقت اور سربراہ مملکت کی اطاعت کرے جب تک وہ مسلمان ہے اور اللہ ورسول کے خلاف کوئی حکم نہیں دیتا ہے۔ یہی اسلام کی جماعت ہے اور اسی کا نام اسلام کا اجتماعی نظام ہے۔ اس اجتماعی نظام کی ہیئت ترکیبی پر ہم پانچویں پارے میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔

آیت ۱۰۸ اے پیغمبر ان کے مالوں سے زکوٰۃ لو اس کے ذریعے تم ان کی تطہیر اور تزکیہ کرو گے۔ اور ان کو دعا دو۔ بلاشبہ آپ کی دعا ان کے لیے سامان سکینت ہے اور اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

صدقہ کا ترجمہ حضرت شیخ الہند نے زکوٰۃ کیا ہے۔ لیکن اگر لفظ صدقہ کو عام رکھا جائے تو زکوٰۃ اور صدقات نافلہ سب کو شامل ہو جائے تو بہتر ہے۔ کیونکہ اکثر روایات کے موافق یہ آیت ان ہی لوگوں کے حق میں نازل ہوئی ہے جو بعد معافی تکمیل توبہ کے طور پر صدقہ لے کر حاضر ہوئے تھے جیسا کہ ابھی پچھلے فائدے میں نقل کیا جا چکا ہے ہاں عموم الفاظ کو دیکھتے ہوئے حکم کو مورد نص پر مقصور رکھنے کی ضرورت نہیں اسی لیے سلف رحہم اللہ مسئلہ زکوٰۃ میں اس آیت کو پیش کرتے ہیں۔ توبہ سے گناہ معاف ہو جاتا ہے یعنی اس پر مواخذہ باقی نہیں رہتا لیکن ایک قسم کی روحانی کدورت وظلمت وغیرہ جو گناہ کا طبعی اثر ہے وہ ممکن ہے باقی رہ جاتی ہو جو بالخصوص صدقہ اور عموماً حسنات کی مباشرت سے زائل ہوتی ہے بایں لحاظ کہہ سکتے ہیں کہ صدقہ گناہوں کے اثرات سے پاک وصاف کرتا اور اموال میں حرکت برکت بڑھاتا ہے۔ زکوٰۃ کے لغوی معنی بھی بڑھنے کے ہیں۔ اور ایک بڑا فائدہ صدقہ کرنے میں یہ تھا کہ صدقہ کرنے والوں کو حضور دعائیں دیتے تھے جن سے دینے والوں کا دل بڑھتا تھا اور سکون حاصل ہوتا تھا بلکہ آپ کی دعا کی برکت دینے والے کی اولاد در اولاد تک پہنچتی تھی۔ اب بھی ائمہ کے نزدیک مشروع ہے کہ جو شخص صدقہ لائے امام مسلمین بحیثیت وارث نبی ہونے کے اس کے لیے دعا کرے۔ البتہ جمہور کے نزدیک لفظ صلاۃ کا استعمال نہ کرے جو حضور کا مخصوص حق تھا۔[1]

واقعی شارحین قرآن نے اس آیت کے پس منظر میں یہ بات لکھی ہے اور ایک نے نہیں بلکہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بہت سے شارحین نے حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے بتایا ہے کہ جب ان لوگوں کو جنہوں نے تبوک میں شرکت نہ کرنے کی سنگینی کو خود ہی محسوس کر کے اپنے آپ کو ستون سے باندھ دیا اور کہا ہم پر کھانا پینا حرام ہے جب تک ہمیں معافی کا پروانہ نہ مل جائے۔ بالآخر جب ان کو بتایا گیا کہ اللہ و رسول نے ان کو معاف کر دیا تو انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں عرض کیا کہ ہماری توبہ میں یہ بھی شامل ہے کہ جس گھر کی آسائش نے ہمیں وقت کے تقاضے سے غافل کیا اسے اپنے تمام مال کو اللہ سبحانہ کی راہ میں دے دیں مگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سارا مال دینے کی ضرورت نہیں صرف ایک تہائی کافی ہے۔ چنانچہ وہ اسی وقت فی سبیل اللہ وقف کر دیا۔

اس میں سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ سب حضرات مخلصین میں سے تھے ان کا ماضی ان کے اخلاص ایمانی کی منہ بولتی شہادت تھا۔ ان میں سے کسی نے کوئی بہانہ پیش نہیں کیا بلکہ اپنے قصور کو خود ہی قصور مان لیا۔ انہوں نے اعتراف قصور کے ساتھ اپنے طرز عمل سے ثابت کر دیا کہ واقعی وہ نہایت نادم اور اپنے اس گناہ کی تلافی کے لیے سخت بے چین ہیں۔

کچھ شارحین قرآن نے یہاں یہ لطیف بات لکھی ہے کہ جہاد میں تبوک سے ان کا رہ جانا دو باتوں کو دامن میں سمیٹے ہوئے تھا ایک جان کر جہاد میں شرکت نہ کرنا دوسرے جہاد میں مال خرچ نہ کرنا اس آیت میں دونوں میں سے ایک کے تدارک کا طریقہ بتایا ہے پہلے کا تدارک توبہ سے ہوا اور دوسرے کا تدارک انفاق مال سے ہوا پہلے تدارک کو عسی اللہ ان یتوب علیھم کے ذریعہ قبول کیا گیا ہے تو دوسرے تدارک کو خذ من اموالھم صدقۃ کے ذریعے شرف پذیرائی عطا ہوا۔ علامہ بقاعی نے اس سے زیادہ لطیف بات لکھی ہے کہ رضائے الٰہی کا پیمانہ چونکہ راہ الٰہی میں قربانی کا قبول ہونا ہے اس لیے ان کی تطہیر اور ان کو خوش کرنے کے لیے حضور کو ان سے صدقہ لینے کا حکم ہوا ہے۔

یہاں یہ سوال مخاطبوں کے ذہنوں میں ضرور چٹکیاں لیتا ہے کہ جب توبہ سے گناہ معاف ہو گیا تو صدقہ کے تطہیر و تزکیہ ہونے کے کیا معنے؟ ایک جواب تو حضرت شیخ الاسلام نے دیا ہے کہ وجہ اس کی یہ ہے کہ توبہ سے گناہ ضرور معاف ہو جاتا ہے لیکن گناہ سے اس کی ظلمت و کدورت کا اثر باقی رہ جاتا ہے اگرچہ اس پر مواخذہ نہیں ہے لیکن اس سے آئندہ اور گناہوں کے ہونے کا احتمال ہوتا ہے بس صدقہ سے اس کا انتظام کر دیا گیا ہے یہی بات حضرت تھانوی نے بھی لکھی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ صدقہ سے خواہشیں ضعیف ہو جاتی ہیں اور قوائے نفس ڈھیلے پڑ جاتے ہیں

مادہ شہوت کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ آیت کی یہ تشریح جس پس منظر کے تحت ہے اس صورت میں صدقہ سے صدقہ نافلہ مراد ہے۔ اور کچھ علماء کی رائے میں آیت میں حکم عام ہے اور صدقہ سے زکوٰۃ مراد ہے پہلے یہ بات گذر چکی ہے کہ منافقوں کی زکوٰۃ قبول نہ کرو اور نہ ان کی نماز جنازہ پڑھو۔ یہاں فرمایا ہے کہ جن لوگوں نے اپنی خطاؤں کا اقرار کر لیا ہے اور توبہ کر لی ہے تو وہ جو کچھ راہ خدا میں نکالیں اسے قبول کرو اور ان کے حق میں دعائے خیر کرو۔

محققین نے اس سے یہ بات بھی سمجھی ہے کہ تقسیم صدقات امام مسلمین اور مسلمان سربراہ حکومت کا کام ہے۔ اس لیے کسی شخص کو بطور خود زکوٰۃ ادا کر دینا جائز نہیں کہ اس سے حق سرکار کا اتلاف لازم آتا ہے۔ الجصاص نے لکھا ہے کہ :

> یہ آیت اس کی واضح دلیل ہے کہ زکوٰۃ وصول کرنا مسلمان سربراہ مملکت کا کام ہے۔ اگر کسی شخص نے اپنی زکوٰۃ خود ہی دے دی تو یہ جائز نہ ہوگا کیونکہ زکوٰۃ لینا حکومت کا کام ہے۔ حکومت کے اس حق کو ساقط کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ :

> یہ آیت عام ہے۔ اگرچہ لوگوں نے ضمیر کا مرجع ان لوگوں کو بنایا ہے جنہوں نے گناہوں کا اعتراف کیا تھا۔ اسی لیے عرب قبائل میں سے بعض زائغین نے سرکار کو زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ صرف جناب رسالت کی خصوصیت تھی۔ ان کا استدلال اسی آیت سے تھا۔ لیکن حضرت ابو بکر الصدیق نے ان کی اس تاویل فاسد کو بالکل قبول نہیں کیا۔ ان کے اس اقدام کو بغاوت قرار دیا اور ان سے جنگ کی۔ یہاں تک انہوں نے سرکار کو زکوٰۃ دینا قبول کر لیا۔

زکوٰۃ کے بارے میں اصل قانون زمانہ نبوت میں یہی تھا کہ زکوٰۃ لینا مسلمان سربراہ مملکت کا حق ہے بلکہ عہد شیخین میں بھی اسی پر عمل رہا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس میں جدید اسلامی نظام زندگی کی جو شادابی اور تر و تازگی عہد نبوت اور عہد صحابہ میں تھی وہ بعد کو باقی نہ رہی۔

زکوٰۃ کے نظام میں تاریخی تغیر

زکوٰۃ کے اس نظام کی پہلی اینٹ حضرت عثمان کے زمانے میں اپنی جگہ سے ہٹ گئی، آپ نے زکوٰۃ کی اور تمام مدوں کو تو باقی رکھا لیکن روپے اشرفی سونا چاندی کی زکوٰۃ کو بجائے سرکار لوگوں

کو انفرادی طور پر دینے کی اجازت دے دی۔ اوروں کا پتہ نہیں الجصاص نے لکھا ہے۔

الاموال سونا چاندی کی زکوٰۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر عمر اور عثمان کے زمانہ میں سرکاری طور پر وصول کی جاتی تھی حکومت کے خزانے میں داخل ہوتی تھی پھر حضرت عثمان نے ایک روز خطبہ دیا اور فرمایا کہ رمضان کا مہینہ تمہاری زکوٰۃ ادا کرنے کا مہینہ ہے بس دین پر کوئی باقی ہو وہ ادا کرے اور اپنے بقیہ مال کو چھوڑ دے۔

سوال یہ ہے کہ جب یہ قرآنی قانون ہے اور سب لکھ رہے ہیں کہ یہ قرآنی قانون ہے چنانچہ علامہ عبداللہ بن محمود بن مودود الموصلی الاختیار میں لکھتے ہیں۔

جو شخص زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کرے مسلمانوں کا سربراہ مملکت اس سے جبراً لے گا اور اسے استعمال کرے گا۔ قرآن میں ہے خذ من اموالھم۔

دوسرے علماء نے بھی یہی لکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود لکھتے ہیں کہ

سربراہ مملکت اموال باطنہ کی زکوٰۃ لینے کا حقدار نہیں یہ مال کے مالکوں کے صوابدید پر موقوف ہے کہ اموال باطنہ کی زکوٰۃ خود دیں۔

یہ الماوردی کی تصریح ہے۔ ابویعلی الموصلی نے بھی الاحکام السلطانیہ میں یہی بات لکھی ہے سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں کہا گیا ہے۔ الجصاص نے لکھا ہے کہ

حضرت عثمان نے زکوٰۃ دینے والوں کو اختیار دے دیا کہ خود براہ راست مسکینوں کو دے دیا کریں۔

جب یہ قرآنی قانون ہے اور تنظیم جو قرآن نے قائم کی تھی اس کا تقاضا بھی یہی ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت عثمان کے قول سے یہ کیسے سمجھ لیا گیا کہ آئندہ ہمیشہ کے لیے مالی زکوٰۃ کی حد تک یہ قانون منسوخ ہو گیا۔ حضرت عثمان کے ارشاد سے زیادہ سے زیادہ ثابت ہوتا ہے کہ خاص طور پر اس سال حضرت عثمان نے کسی خاص وجہ سے اموال باطنہ کی زکوٰۃ کا اختیار خود مالکوں کو عطا فرما دیا۔ اور یہ ہو سکتا ہے کہ امام کسی سال اپنی مرضی سے اپنے کسی اختیار کو دوسرے کے سپرد کر دے لیکن اس کو دوامی قانون بنا دینا اور حضرت عثمان کے بعد ہر سربراہ مملکت سے اس حق کو چھین لینا جو قرآن کا عطا کیا ہوا ہے بلکہ سپرد کی ہوئی خدمت ہے آخر کس بنا پر جائز ہو سکتا ہے۔

زکوٰۃ کا نظم شرعی

اس موقعہ پر حضرت مولانا آزاد کی یہ بات بالکل برمحل ہے کہ قرآن نے زکوٰۃ کا معاملہ ایک خاص نظام سے وابستہ کیا ہے اور اسی نظام کے قیام پر اس کے تمام مقاصد و مصالح کا حصول موقوف ہے زکوٰۃ ایک ٹیکس ہے بالکل اسی طرح کا ٹیکس جس طرح آج کل انکم ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ پس اس کی ادائیگی کا یہ طریقہ نہ تھا کہ ہر شخص خود ہی اپنا ٹیکس نکالے اور خود ہی خرچ بھی کر ڈالے۔ بلکہ یہ تھا کہ حکومت اپنے کلکٹروں کے ذریعے ہر شخص سے وصول کر کے بیت المال میں جمع کرے اور پھر ضروریات وقت کے مطابق جس مصرف کو مقدم سمجھے اس میں خرچ کرے۔ جب ایک شخص نے حکومت کے مقرر کردہ عامل کو اپنی زکوٰۃ دے دی۔ اس کی زکوٰۃ ادا ہو گئی چنانچہ اسی لئے عاملوں اور کلکٹروں کی تنخواہ کا بوجھ بھی زکوٰۃ پر ڈال دیا۔ اور صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا العاملین علیھا جو کارندے زکوٰۃ کی وصولی کے لیے مقرر ہوں ان کے ضروری مصارف اگر ادائیگی کے لیے یہ بات ضروری نہ ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ مصارف کی رو میں مستقلاً عمال حکومت کا ذکر کیا جاتا۔

اور پھر یہی وجہ ہے کہ صاف وصریح لفظوں میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ اس باب میں عمال حکومت کی اطاعت کریں۔ اور بلا عذر زکوٰۃ ان کے حوالے کردیں حتیٰ کہ اگر عمال ظالم ہوں۔ یا بیت المال کا مال ٹھیک طور پر صرف نہ ہوتا ہو جب بھی اصلاح مال کی سعی کے ساتھ ادائیگی کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیئے۔ یہ نہیں کرنا چاہیئے کہ زکوٰۃ کو بطور خود خرچ کریں بشیر بن خصاصہ کی روایت میں ہے کہ لوگوں نے کہا ان قوما من اصحاب الصدقۃ یعتدون علینا عمال کا ایک طبقہ صدقہ لینے میں ہم پر زیادتیاں کرتا ہے کیا اس کا مقابلہ کریں ؟ فرمایا نہیں۔ سعد بن ابی وقاص کی روایت میں ہے۔ ادفعوا الیھم ما صلوا جب تک نماز پڑھیں زکوٰۃ ان کو دیتے رہو۔

بنوامیہ کے زمانے میں جب نظام خلافت بدل گیا اور حکام ظلم و تشدد پر اتر آئے تو بعض لوگوں کو خیال ہوا ایسے لوگ ہماری زکوٰۃ کے کیوں امین سمجھے جائیں ؟ لیکن تمام صحابہ نے یہی فیصلہ کیا کہ زکوٰۃ انہیں کو دینی چاہیے۔ یہ کسی نے نہیں کہا کہ خود اپنے ہاتھ سے خرچ کر ڈالو۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے ایک شخص نے پوچھا کہ اب زکوٰۃ کسے دیں کہا کہ وقت کے حاکموں کو اس نے کہا کہ وہ تو زکوٰۃ کا روپیہ اپنے کپڑوں اور عطروں میں صرف کر ڈالتے ہیں۔ فرمایا "اگرچہ ایسا کرتے ہوں مگر دو انہیں کو۔" (ابن ابی شیبہ) کیونکہ زکوٰۃ کا معاملہ بغیر نظام کے قائم نہیں

رہ سکتا۔

صدر اول سے لے کر آخر عہد عباسیہ تک یہ نظام بلا انتشار قائم رہا لیکن ساتویں صدی ہجری میں جب تاتاریوں کا سیلاب۔ تمام اسلامی ممالک میں امنڈ آیا اور نظام خلافت معدوم ہو گیا تو سوال پیدا ہوا اب کیا کرنا چاہیے۔ فقہاء احناف کے جس قدر شروح و متون اور کتب فتاوی آج کل متداول ہیں زیادہ تر اسی دور میں یا اس کے بعد لکھے گئے۔ اس وقت پہلے پہل اس بات کی تخم ریزی ہوئی کہ زکوٰۃ کی رقم بطور خود خرچ کر ڈالی جائے کیونکہ غیر مسلم حاکموں کو نہیں دی جا سکتی مگر ساتھ ہی فقہاء نے اس پر زور دیا کہ جن ملکوں میں اسلامی حکومت قائم نہیں رہی ہے۔ اور اعادہ حالت فوراً ممکن نہیں ہے وہاں مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ کسی اہل مسلمان کو اپنا امیر مقرر کر لیں تاکہ اسلامی زندگی کا نظام قائم رہے معدوم نہ ہو جائے۔ لیکن افسوس ہے کہ بعد کو بتدریج اس نظام کی اہمیت سے مسلمان غافل ہو گئے۔ اور رفتہ رفتہ یہ حالت ہو گئی کہ لوگوں نے سمجھ لیا کہ زکوٰۃ نکالنے کا معاملہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ خود حساب کر کے ایک رقم نکال لیں اور پھر جس طرح چاہیں خرچ کر ڈالیں۔ حالانکہ جس زکوٰۃ کی ادائیگی کا قرآن نے حکم دیا ہے اس کا قطعاً یہ طریقہ نہیں ہے اور جو مسلمان اپنی زکوٰۃ کسی بیت المال کو حوالہ کرنے کی جگہ خود خرچ کر ڈالتا ہے وہ دیدہ دانستہ حکم شریعت سے انحراف کر رہا ہے وہ یقیناً عند اللہ اس کے لیے جوابدہ ہو گا۔

اجتماعی زندگی کا پورا نقشہ

اسلام نے اجتماعی زندگی کا ایک پورا نقشہ بنایا تھا جہاں اس کے چند خانے بگڑ گئے سمجھ لو کہ پورا نقشہ بگڑ گیا۔ چنانچہ اس ایک نظام کے فقدان نے مسلمانوں کی پوری اجتماعی زندگی مختل کر دی ہے لوگ اصلاح کے لیے طرح طرح کے ہنگامے بپا کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انجمنوں اور قومی چندوں کے ذریعے وقت کی مشکلوں اور مصیبتوں کا علاج ڈھونڈھ نکالیں گے۔ حالانکہ مسلمانوں کے لیے اصل سوال یہ نہیں ہے کہ کوئی نیا طریقہ نکالیں سوال یہ ہے کہ اپنے گم گشتہ طریقہ کا کھوج لگائیں۔

درازی شب دبیداری من این ہمہ نیست
زبخت من خبر آرید تا کجا خفت است

دامان تحریر دراز ہو رہا ہے ہو سکتا ہے کہ دامن کی درازی ناظرین معالم القرآن کے لیئے بار خاطر کا سامان ہو جائے۔ مگر موضوع کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اسے کھول کر بیان کر دیا جائے۔ بلا شبہ یہ

موضوع ہمارے موجودہ حالات میں شدید توجہ طلب اور مشکل ترین مسائل میں سے ہے یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ ہی صحیح ہے بلکہ اہل علم کی خدمت میں اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ وہ اس موضوع پر پوری متانت سے غور فرما کر وقت کے تقاضے کا جواب دیں۔

اس موضوع پر مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا مناظر گیلانی کے علاوہ ادارہ تحقیقات اسلامی کے ریڈر جناب مولانا عبدالرحمٰن طاہر سورتی نے مفید معلومات پیش کی ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ معالم القرآن پڑھنے والے احباب بھی زیر نظر آیت کی تفسیر میں اس سے استفادہ کریں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ یہ نظام جب تک قوت سے جاری رہا مسلمانوں میں افتراق کے جراثیم کو نشوونما پانے کا موقع نہ ملا۔ ہمیں حضرت عثمانؓ کے عہد تک مملکت اسلامی میں حکومت اور رائے عامہ میں دوری اور بیگانگی کا پتہ ملتا ہے اختلافات ہوتے تھے لیکن نظام صلوٰۃ و زکوٰۃ انہیں بڑھنے نہیں دیتا تھا بلکہ جلد ہی ان کا حل تلاش کر لیتا حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ خلافت میں جب کچھ قبائل نے نظام زکوٰۃ میں خلل اندازی کرنے کی کوشش کی اور یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنی زکوٰۃ بجائے بیت المال میں داخل کرنے کے نجی طور پر تقسیم کریں گے اور بقول حافظ ابن کثیرؒ انہوں نے اسی آیت خذ من اموالھم سے استدلال کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے شدت سے ان کا یہ مطالبہ رد کر دیا اور نہ صرف رد کیا بلکہ ان کے خلاف کارروائی کر کے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ زکوٰۃ سرکاری خزانہ میں داخل کریں اور اس طرح اسلامی تعلیمات کے اس دانائے راز نے اپنی اصابت رائے اور حکمت عملی سے مسلمانوں کی امامت و جماعت کا نظام درہم برہم ہونے سے بچا لیا اور اس گروہ کو جس نے زکوٰۃ نجی طور پر ادا کرنا چاہی اسلامی مملکت کا باغی تصوّر کیا۔

زکوٰۃ اور اس کا نظام

اس آیت میں نظام زکوٰۃ کی طرف رہنمائی کی گئی ہے یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت سربراہ مملکت کہا گیا ہے خذ من اموالھم صدقۃ۔ صدقہ کی تعریف میں ابو عبید نے کتاب الاموال میں تصریح کی ہے۔

> صدقہ مسلمانوں کے مال کی وہ زکوٰۃ ہے جو سونے چاندی اونٹ گائے بیل بھیڑ بکریاں غلہ اور پھلوں سے لی جاتی ہے وہ ان آٹھ اصناف میں خرچ ہو گی جو اللہ سبحانہ نے بنائی ہیں۔

یہ وہ اموال ہیں جن کی زکوٰۃ مسلمان سربراہوں کے ذریعے وصول کی جاتی تھی اور ان ہی کے ذریعے خرچ ہوتی تھی چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

وہ اموال جن کی نگرانی مسلمان سربراہ کرتے تھے یہی وہ تین ہیں جنہیں حضرت عمرؓ نے بیان کیا ہے اور کتاب اللہ سے انہوں نے اس کی تاویل کی ہے یعنی فئی خمس اور صدقہ

ظاہر ہے کہ یہ قرآنی حکم خذ من اموالہم صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ آپ کے خلفا اور اسلامی مملکت کے سربراہ بھی اس حکم میں داخل ہیں۔ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

تؤخذ من اغنیائہم وترد الی فقرائہم

زکوٰۃ مالداروں سے لی جائے اور غریبوں کو دی جائے

بات صاف ہے کہ حکومت سرمایہ داروں سے زکوٰۃ لے گی اور حکومت ہی غریبوں کو دے گی۔ یہ نہیں فرمایا کہ سرمایہ دار اپنی زکوٰۃ غریبوں کو دیں۔ لینے اور دینے کے موضوع پر اغنیا، اور سرمایہ داروں کا ذکر نہیں فرمایا۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ اس ارشاد نبوت کی شرح میں لکھا ہے:

یہ ارشاد نبوت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ امام اور سربراہ مملکت ہی زکوٰۃ کی وصولیابی اور اس کی تقسیم کا ذمہ دار ہے یا تو بذات خود یا اپنے کارندوں کے ذریعے اور جو حکومت کو زکوٰۃ نہ دے اس سے جبراً وصول کی جائے[1]

معلوم ہوا کہ زکوٰۃ ایسا مالی نظام ہے جسے اسلامی مملکت اس سے قائم کرتی ہے کہ معاشرے سے غریبی اور فقیری کو ختم کر کے عوام کو زیادہ سے زیادہ خوش حال بنائے۔ اگر اسلامی مملکت میں رہتے ہوئے حکومت کے تحت یہ نظام چلانے کے لیے کسی وجہ سے مسلمان پہلوتہی کریں تو حکومت کی ذمہ داری ہے کہ ان مسلمانوں کو اس نظام کا جبراً پابند کرے کیونکہ زکوٰۃ کا نظام ہی اسلامی کی اجتماعی زندگی کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اور جب کسی بھی امت کا اجتماعی نظام نہ ہو اس کی حیثیت حیوانوں کے ریوڑ کی ہو جاتی ہے۔

صدقات کا جو نظام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا اور آپ کے بعد سرکاری طور پر جیسے حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان نے باقی رکھا وہ ہی مسلمانوں کی اجتماعیت کا نشان اور

---

[1] فتح الباری

سنگ میل ہے یعنی جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور آپ کے بعد خلافت راشدہ میں زکوٰۃ سرکاری طور پر لیجاتی تھی اسی طرح یہ نظام حضرت عثمان کے عہد تک برقرار رہا۔

امام محمد بن سیرین فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائی جاتی یا اسے دی جاتی جسے آپ نے وصولی کے کام پر لگایا ہوتا۔ آپ کے بعد حضرت ابوبکر کو دی جاتی یا جسے وصولی کے کام پر لگاتے۔ بعدازاں حضرت عمر کو دی جاتی یا جسے وہ اس کام پر لگاتے۔ اس کے بعد حضرت عثمان کو دی جاتی یا وہ وصولی کے کام کا حکم دیتے حضرت عثمان کی شہادت پر صدقہ دینے کے بارے میں لوگوں میں اختلاف ہو گیا۔ کچھ لوگ تو پہلے کی طرح امراو حکام ہی کو دیتے رہے اور کچھ لوگ اپنے طور پر اسے تقسیم کرنے لگے۔ جو لوگ حکام کو دیتے تھے ان ایں بھی حضرت عبداللہ بن عمر ہی تھے۔[1]

بلاشبہ حضرت عثمان کے بعد سیاسی انتشار کا اثر صدقات پر بھی پڑا اور لوگوں نے یہ بات کہنی شروع کر دی کہ اب سیاسی عدم استحکام کی صورت میں ہم کیا کریں؟ اس وقت بھی صدقات کی اہمیت سے باخبر اور سیاسی شعور رکھنے والوں کا فیصلہ یہی تھا کہ صدقات حکمرانوں کو ہی دیئے جائیں۔ خواہ وہ اسے خرچ کرنے میں کیسی بے اعتدالی کریں جن حضرات کا یہ موقف تھا ان سے جب دریافت کیا گیا کہ سیاسی عدم استحکام کا حال یہ ہے کہ ایک بار ہمارے علاقہ پر اہل شام کی حکومت ہوتی ہے اور یک بار اہل عراق کی تو زکوٰۃ کا کیا کریں تو ان کا جواب یہ تھا کہ غالب کو زکوٰۃ دی جائے یا جس سے تم نے بیعت کر لی ہے اسے صدقات دو دیکھئے کتاب الاموال باب دفع الصدقۃ الی الامراء واختلاف العلمائی ذالک۔

اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جب سیاسی استحکام ہو اور مسلمانوں پر ایک اسلامی حکومت کا غلبہ ہو تو اس وقت صدقات کا نظام بہرحال حکومت کے ہاتھ میں ہونا چاہئے اور یہ اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے کہ وہ زکوٰۃ کی قانونی تنظیم کرے۔ کسی کو یہ اختیار نہیں کہ وہ حکومت کو مانتے ہوئے نجی طور پر زکوٰۃ کو تقسیم کرے جو لوگ کسی جگہ مسلمانوں کے مستحکم سیاسی نظام کی موجودگی میں زکوٰۃ اسلام کے سیاسی نظام کو نہیں دیتے وہ اسلام کے اس عظیم رکن کو بے جان بنا کر اسلامی معاشرہ کو پست حال اور پس ماندہ بنانے کے جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

اقامت صلوٰۃ کے بعد نظام زکوٰۃ قائم کرنا اسلامی حکومت کا اولین فریضہ ہے یہ قرآن کی چیختی

---

[1] کتاب الاموال

ہوئی آواز ہے۔

الذین ان مکنا ھم فی الارض اقاموالصلوٰۃ واتوالزکوٰۃ۔ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر

اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ نماز اور زکوٰۃ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا نشان ہیں۔ ان کے بغیر اسلام کی اجتماعی زندگی کا وجود ہی نہیں۔ ہونے کو انفرادی طور پر تو نماز بھی ہو جاتی ہے۔ سوال ہونے نہ ہونے کا نہیں ہے سوال تو یہ ہے کہ جن اجتماعی مقاصد کے لیے قرآن نے نماز اور زکوٰۃ کو اسلام کے نظام حکومت کے مقاصد میں داخل کیا ہے وہ بھی اس دنیا کی زندگی میں پورے ہو رہے ہیں۔ ہماری نمازیں اجتماعیت سے بیگانہ ہو کر اگر ہماری تفریقات کا سامان بن رہی ہیں تو ہماری زکوٰتیں اجتماعیت سے بیگانہ ہو کر مسلمانوں میں پیشہ ور فقرا اور گداگر پیدا کر رہی ہیں۔ زکوٰۃ کا نظام اگر اجتماعی ہو تو اس سے ایک طرف ہمارے معاشرے کے پس ماندہ اور معیاری زندگی سے محروم افراد کی حالت تیزی سے سدھرے گی دوسری طرف وہ افراد اور جماعتیں جو مختلف بہیوں میں اس نظام سے ناجائز فائدہ اٹھا کر عوام کو منتشر اور مرکز سے متنفر کرنے میں کوشاں ہیں بے قوت ہو جائیں گے اور عوام کا تعلق اجتماعیت سے مستحکم ہو گا۔

یہ ہماری شومئی قسمت ہے کہ نظام صدقات کا منشا یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ معاشرے میں مستقل طور پر گداگروں اور فقیروں کا طبقہ باقی رہے تاکہ ان کے لیے امیروں سے صدقات فراہم کرنے کا جواز پیدا ہوتا رہے حالانکہ یہ زکوٰۃ کے اس مقصد کے بالکل برعکس ہے جس کے لیے زکوٰۃ وجود میں آئی زکوٰۃ کا بنیادی مقصد فقر کو ختم کرنا ہے فقر کو پرورش کرنا نہیں ہے۔

زکوٰۃ ایک ایسا مالی فریضہ ہے جس کا پہلا مصرف محتاج و ضرورت مند ہیں یہ جس علاقے کے امیروں سے لیا جائے اسی علاقہ کے غریبوں میں تقسیم کیا جائے گا اور جب تک ان میں ایک بھی ضرورت مند اور بے روزگار رہے گا اس علاقہ کے صدقہ و زکوٰۃ کا زیادہ مستحق وہی ہو گا ایک علاقہ سے لی ہوئی زکوٰۃ دوسرے علاقہ میں اسی وقت جا سکتی ہے جب کہ اس علاقہ میں کوئی اس کا مستحق باقی نہ رہا ہو۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ اقدس میں لوگ صدقات کی وجہ سے اتنے خوش حال ہو گئے تھے کہ ان کو صدقات کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ اور وہ اپنے صدقات حضور اقدس کی خدمت میں پیش کرتے تھے دیکھو عیون الاثر لابن سید الناس

اسی طرح دوسرے علاقوں میں بھی یہی صورت حال تھی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ جن کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۰ھ میں یمن کا عامل مقرر کیا تھا اور آپ کے وصال مبارک کے

بعد حضرت ابوبکرؓ نے ان کو وہیں بحال رکھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں مدینہ تشریف لائے۔ حضرت عمر نے دوبارہ ان کو یمن واپس بھیج دیا۔ ان کا حضرت معاذ نے پہلے سال حضرت عمر کی خدمت میں اپنے علاقہ سے جمع ہونے والی زکوٰۃ کا ایک تہائی روانہ کیا۔ حضرت عمر نے ان پر اعتراض کیا اور ان ہی سے جواب طلبی کی اور لکھا کہ میں نے تمہیں مال جمع کرنے روانہ نہیں کیا بلکہ اس لیے روانہ کیا ہے کہ وہاں کے امراء سے مال لے کر وہاں کے فقراء میں تقسیم کرو۔ حضرت معاذ نے جواب دیا جو کچھ میں نے آپ کو روانہ کیا ہے یہاں اسے لینے والا کوئی مجھے حقدار نہیں ملا ہے۔ دوسرے سال بھی حضرت معاذ نے اپنے علاقے کی آدھی زکوٰۃ مرکزی گورنمنٹ کو بھیج دی۔ اس بار بھی حضرت عمر نے وہی بات کہی اور حضرت معاذ نے وہی جواب دیا۔ تیسرے سال حضرت معاذ نے ساری جمع شدہ زکوٰۃ مرکزی حکومت کو روانہ کر دی۔ اس بار حضرت عمر نے پھر وہی بات کہی حضرت معاذ کا جواب یہی تھا کہ اب مجھے یہاں ایک شخص زکوٰۃ لینے کا حق دار نہیں ملتا۔

اس سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ زکوٰۃ کا بنیادی مقصد علاقہ سے فقر و محتاجی غریبی اور مفلسی کو ختم کرنا ہے۔ اور ان ذہنوں کی صاف تردید ہو رہی ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ زکوٰۃ کا نظام مستقل طور پر معاشرے میں فقراء و مساکین کے باقی رکھنے کا نام ہے۔

زکوٰۃ عبادت ہے یا ٹیکس

آپ پیچھے کچھ بزرگوں کی زبانی سن چکے ہیں کہ زکوٰۃ ٹیکس ہے اس لیے یہ بات سمجھ لیجیے کہ اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گذارنے کا نام عبادت ہے مسلمان کا ہر عمل اللہ کے حکم کے مطابق عبادت ہے۔ اعمال مختلف ہوتے ہیں کچھ اعمال روح کو پاک کرنے اور اسے قوی بنانے والے ہوتے ہیں اور کچھ جسمانی تطہیر کا کام دیتے ہیں۔ نماز اور زکوٰۃ دونوں عبادتیں ہیں لیکن دونوں کے احکام میں جوہری فرق ہے۔ اگرچہ دونوں کا مقصد آخرت کی کامیابی اور دنیا کی فلاح و بہبود ہے۔

اللہ سبحانہ نے اسلامی معاشرے کو باطنی و ظاہری پلیدیوں سے پاک کرنے کے لیے جو عبادتیں مقرر کی ہیں ان میں سے ایک اہم اور بنیادی عبادت زکوٰۃ ہے۔ معاشرے میں دولت کی محبت، معاشی لوٹ کھسوٹ دولت کی دولت مندوں میں گردش۔ حاجت مندوں سے ناجائز فائدہ اٹھانا۔ حاجت مندوں اور غریبوں کا ایک مستقل طبقہ موجود رکھنا یہ وہ پلید بالیں ہیں جن کی موجودگی میں کسی معاشرے کا اسلامی معاشرہ ہونا ناممکن ہے۔ اور زکوٰۃ ان بیماریوں کا مکمل علاج ہے۔ زکوٰۃ مالی عبادت ہونے کے ساتھ جہاد

المال بھی ہے اور جہاد کی کامیابی کا دارومدار نظام کے تحت ہوتا ہے

یہ امر واقعہ ہے کہ اللہ سبحانہ کسی کام میں بگاڑ کو پسند نہیں کرتا واللہ لا یحب الفساد وہ ہر کام کو صحیح طریقہ سے انجام دینے کی تعلیم دیتا ہے واتوا البیوت من ابوابہا معاشرے دولت کے شیطان کی بے اعتدالیاں دور کرنے کے لیے نہایت مضبوط و منظم مہم چلانی پڑتی ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء نے یہ مہم زکوٰۃ و صدقہ کے نام سے حکومت کی نگرانی میں چلائی اور اسے افراد یا پارٹیوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا۔ آج بھی یہ نظام زکوٰۃ اپنے صحیح اور خوشگوار نتائج اسی صورت میں پیدا کرے گا جب وہ حکومت اسلامی کے زیر نگرانی قائم کیا جائے گا۔ زکوٰۃ اس قسم کی عبادت نہیں جسے اسلامی مملکت میں افراد کے حوالہ کر دیا جائے بلکہ ایک ایسی مالی عبادت ہے جس کے نظام کو اسلامی حکومت ان خطوط پر چلائے گی جن کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا اور خلفائے راشدین نے عمل کر کے دکھایا۔ اب یہ آپ کو اختیار ہے کہ آپ اسے زکوٰۃ صدقہ کہہ دیجئے یا محصول ٹیکس۔ اس اعتبار سے کہ زکوٰۃ صدقہ کی ادائیگی اللہ کے حکم کے تحت ہوتی ہے یہ عبادت ہے اور اس لحاظ سے کہ وہ ایک مالی فریضہ ہے اور اسلامی حکومت باقاعدہ حساب و کتاب کے ساتھ اسے مقررہ مقدار میں اس کے مستحقین میں خرچ کرتی ہے بلاشبہ اسلامی مملکت کے مداخل میں سے ایک آمدنی کی بڑی مد ہے اور اس لحاظ سے اسے ٹیکس کا نام دیا جا سکتا ہے مگر اصل میں بات عبادت یا ٹیکس کی نہیں ہے بلکہ اصل فیصلہ طلب یہ بات ہے کہ اسلامی حکومت میں یہ عبادت نجی طور پر ادا کی جائے گی یا حکومت کی نگرانی میں مقدم الذکر صورت قرآن و سنت کے خلاف ہے بلکہ معاشرے کی تمام اقتصادی بے اعتدالیوں کا ذریعہ ہے۔

اسلام کا اجتماعی نظام

یہ آیت جہاں واضح طور پر یہ بات بتا رہی ہے کہ صدقہ اور زکوٰۃ کا نظم مسلمانوں میں انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہونا چاہیے۔ وہاں یہ بھی بتا رہی ہے کہ اجتماعیت کو قائم کرنا اہل ایمان کے فرائض میں سے ہے اسلام میں اجتماعیت سے مقصود پارٹیاں نہیں بلکہ اجتماعیت سے مقصود مسلمانوں کا وہ سیاسی نظام ہے جو ایک امیر کے تحت ہو ایسی اجتماعیت جس میں امیر کی طاعت ہو یہی احادیث میں اسلامی زندگی ہے اور اس کا عکس جاہلیت ہے۔ اسی سیاسی نظام کے بارے میں احادیث میں واشگاف لفظوں میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ جو شخص جماعت اور طاعت امام سے الگ

ہوگیا گویا وہ اسلام سے خارج ہو گیا اس کی موت اسلام پر نہیں بلکہ جاہلیت پر ہوگی اگرچہ نماز پڑھتا ہو روزہ رکھتا ہو اور اپنے کو مسلمان سمجھتا ہو۔ مسند امام احمد میں حضرت حارث اشعری کی حدیث میں اسلام کا سیاسی نظام عمل بتایا گیا ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسلمانو! میں تم کو پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا مجھے اللہ نے حکم دیا ہے جماعت سمع، طاعت، ہجرت اور اللہ کی راہ میں جہاد یقین کرو جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی کی جگہ جاہلیت کی بے قیدی کی طرف بلایا تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے لوگوں نے عرض کیا کیا وہ شخص جہنمی ہوگا اگرچہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو۔ فرمایا۔ ہاں اگرچہ روزہ رکھتا ہو نماز پڑھتا ہو اور اپنے کو مسلمان سمجھتا ہو۔

جماعت اور التزام جماعت کے موضوع پر قرآن و سنت میں جو تصریحات آئی ہیں ان سے مقصود اسلام کا یہی سیاسی نظام ہے مثلاً صحیحین میں ابوہریرہ کی حدیث میں ہے۔

جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے خود میری اطاعت کی۔ اور جس نے امیر سے روگردانی کی اس نے میری اطاعت سے انکار کیا یعنی مسلمان سربراہ مملکت کی اطاعت عین رسول کی اطاعت ہے۔

مسلم کی ایک روایت میں امیری کی جگہ الامیر ہے یعنی جو شخص مسلمان مسلمانوں کی مملکت کا سربراہ ہو اس کی طاعت ضروری ہے صحیحین میں حضرت انس کی حدیث ہے کہ

اگر ایک حقیر صورت حبشی غلام بھی تمہارا امیر بنا دیا جائے تو چاہیے اس کی سنو اور اطاعت کرو۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ آپ بار بار اور بڑی بینات کے ساتھ اپنی تقریروں میں فرماتے تھے اسی لیے مختلف لفظوں میں اور مختلف مواقع میں نقل کیا گیا ہے۔

حجۃ الوداع کے عظیم الشان اور یادگار موقعہ پر جب کہ دو تین ماہ کے بعد آپ رحلت فرمائے دار البقا ہونے والے تھے اور ایک آخری پیغام دنیا کو سنا رہے تھے فرمایا کہ

اگر ایک حبشی غلام بھی تم پر امیر بنا دیا جائے اور وہ کتاب اللہ کے ساتھ تم پر حکومت

کرے تو اس کی سنو اور طاعت کرو۔

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اگر کوئی اپنے امیر کو ایسی بات کرتے دیکھے جو اسے پسند نہ ہو تو اسے صبر کرنا چاہیے اس کی اطاعت سے باہر نہ ہو کیونکہ جو شخص مسلمان حکمران کی اطاعت سے بالشت بھر بھی باہر ہوا اور اسی حالت میں مر گیا تو اس کی موت جاہلیت پر ہوئی۔

حضرت عبداللہ بن عمر کے حوالہ سے ارشاد ہے:

جس نے مسلمان حکمران کی اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیا تو قیامت کے روز وہ اللہ کے دربار میں حاضر ہوگا اور اس کے لیے کوئی بچاؤ نہ ہوگا اور جو مسلمان دنیا سے اس حالت میں گیا کہ مسلمان حکمران کی طاعت سے اس کی گردن خالی ہوئی تو یقین کرو اس کی موت جاہلیت کی موت ہے۔

اس کے علاوہ بے شمار حدیثیں ہیں جن میں اسلام کے سیاسی نظام یعنی جماعت اور التزام جماعت پر زور دیا گیا ہے۔ اور سیاسی نظام کی زندگی کو اسلامی زندگی قرار دیا ہے۔

شائد یہاں آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ آج کے دور میں اسلام کے سیاسی نظام کی تشکیل کیونکر ہو؟

قرآن وسنت اور اجماع اُمت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے سیاسی نظام کے بارے میں دو صورتیں اختیار کی ہیں

پہلی صورت یہ ہے کہ امت کی صائب الرائے جماعت اور اہل حل وعقد ایک شخص کو اہلیت وصلاحیت کے مطابق سربراہ مملکت مقرر کریں اور اس اہل حل وعقد سے مراد یہ لوگ ہیں۔

(۱) عدلیہ کے سربراہ

(۲) انتظامیہ کے سربراہ

(۳) فوج کے سربراہ

(۴) اہل علم و دانشور

حکیم الامت شاہ ولی اللہ ازالۃ الخفا میں فرماتے ہیں۔

از علماء و قضاۃ و امراء وجوہ ناس کہ حضور ایشان میسر شود

یہ ہے اسلام میں طریق انتخاب اور یہ ہے امرھم شوریٰ بینھم پر عمل کی صورت اد

یہی صحیح نظام شرعی ہے۔ یاد رہے کہ امر اصل میں فوجی سربراہوں کو اور ولاۃ انتظامی سربراہوں کو کہتے ہیں اور تغلیباً دونوں کو کہا جاتا ہے۔

قرآن نے انتخاب کرنے والوں کو جو ہدایات دی ہیں وہ بھی گوش گذار کر لیجئے مثلاً ارشاد ہے:

ان اللہ یامرکم ان تودوا الامانات الی اھلھا

اللہ سبحانہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے سپرد کرو جو امانتوں کی اہلیت رکھتے ہیں۔

ارشاد ہے:

یا ایھا الذین امنوا لا تخونوا اللہ والرسول وتخونوا اماناتکم وانتم تعلمون

مسلمانو! اللہ سے اللہ کے رسول سے خیانت نہ کرو اور اپنی امانتوں میں خیانت نہ کرو حالانکہ تم جانتے ہو۔

صحیح بخاری میں ہے۔ حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کچھ لوگوں سے باتیں کر رہے تھے کہ ایک دیہاتی نے دخل در معقولات کرتے ہوئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لیا کہ قیامت کب آئے گی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم باتوں میں مشغول رہے۔ حاضرین میں سے کچھ نے خیال کیا کہ آپ نے سوال سنا ہے لیکن آپ کو اس کی بات ناگوار ہوئی۔ کچھ نے کہا کہ آپ نے دیہاتی کی بات ہی نہیں سُنی ہے جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم گفتگو ختم کر چکے فرمایا ہاں وہ قیامت کے بارے میں پوچھنے والا کہاں ہے وہ بولا حاضر ہوں یا رسول اللہ۔ فرمایا جب امانت ضائع کر دی جائے گی قیامت کا انتظار کرو دیہاتی بولا کہ امانت کی اضاعت کیا ہے۔ فرمایا جب امانت نااہلوں کے سپرد کر دی جائے گی تو قیامت کا انتظار کرنا۔

یہ ہدایات اگرچہ صرف ہدایات ہیں۔ لیکن ان ہدایات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مناسب عملی تدابیر کرنا وقت کے نظام کا کام ہے۔ جس سے دیانتدار اور حکومت چلانے کی اہلیت رکھنے والے لوگ آگے آئیں۔

بہرحال اسلام کے سیاسی نظام کو بروئے کار لانے کی یہ پہلی صورت ہے اسے آپ جمہوری کہہ

لیجئے یا کچھ اور۔ جمہوری اس معنی کے لحاظ کہ یہ مسلط نہیں بلکہ ارباب بست وکشاد کا منتخب ہوتا ہے خلافت راشدہ کا عمل اسی پر تھا۔ خلیفہ اول کا انتخاب عام جماعت میں ہوا خلیفہ دوم کو خلیفہ اول نے نامزد کیا اور اہل حل وعقد نے منظور کیا۔ خلیفہ سوم کو مجلس شوری نے منتخب کیا۔ خلیفہ چہارم کے ہاتھ پر خود تمام جماعت نے بیعت کی۔ بہرحال اسلام میں جمہوری سیاسی نظام کی یہ پہلی صورت ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اگر یہ نظام باقی نہ رہا۔ قوم کے رہنماؤں اور ارباب بست وکشاد کی رائے کو اس میں دخل نہ ہو۔ محض طاقت اور تسلط کی بنا پر کوئی خاندان یا کوئی طاقتور فرد تخت حکومت پر قابض ہو جائے تو اس صورت میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے اس کی طاعت کرنی چاہیے یا اسے ہٹانے کے لیے عوامی بحران کے ذریعے کوئی تحریک اٹھانی چاہیے۔ وہ شرعاً مسلمانوں کا سربراہ حکومت ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس کے تحت وہ تمام احکام انجام پا سکتے ہیں یا نہیں جو از روئے قرآن وسنت مسلمان سربراہ مملکت کے ہونے پر موقوف ہیں۔ اس کو زکوٰۃ دینی چاہیے یا نہیں جمعہ وعیدین صحیح ہیں یا نہیں۔ اس کی عدالت کے فیصلے نکاح وطلاق کے موضوع پر درست ہیں۔ دفاع کے لیے اگر وہ جہاد کی دعوت دے تو اس کی قیادت میں دفاع جہاد ہے کہ نہیں۔ رمضان وعیدین کے ہونے میں اس کا فیصلہ شرعاً نافذ ہے کہ نہیں۔

یہ مسئلہ امت کی اجتماعی زندگی کا بنیادی مسئلہ تھا اور ممکن نہ تھا کہ قرآن وسنت میں اس کی پوری پوری توضیح نہ ہوتی اس موضوع قرآن وسنت کی تصریحات بے شمار ہیں۔ اسی لیے خلافت راشدہ کے بعد بنو امیہ نے فوجی قوت کے ذریعہ حکومت پر قبضہ کر لیا تو صحابہ کرام کو اپنے طرز عمل کے فیصلے میں ذرا بھی تامل نہ ہوا۔ فوراً یکسوئی کے ساتھ فیصلہ کر لیا۔ جو کچھ انہوں نے بتلایا اور کہا اسی پر پوری امت کے اجماع کی مہر لگ گئی اور چودہ صدیوں سے اسلام کا یہی متفقہ اعتقاد وعمل رہا ہے۔

پہلی صورت میں اسلام نے اہلیت وصلاحیت کی وہ تمام شرطیں رکھیں ہیں جو ایک مرکزی منصب کے لیے ضروری ہیں لیکن دوسری صورت میں یعنی اگر نظام شرعی کی جگہ ملکی قبضہ وتسلط کی صورت پیدا ہو جائے اور جمہور کی جانب سے اہل حل وعقد کو موقع نہ ملے تو اس صورت میں از روئے شرع مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے سو اس کی نسبت چونکہ خود احادیث صحیحہ اور اجماع بالکل صاف صاف موجود تھا اس لیے تمام امت بلا اختلاف اس پر متفق ہو گئی کہ جب ایک مسلمان تخت حکومت پر قابض ہو جائے اور اس کی حکومت جم جائے تو ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اسی کو حکمران

تسلیم کرے اس کے سامنے گردن طاعت جھکائے بالکل اسی طرح جیسے ایک اہل اور مستحق کے آگے جھکنا چاہیے اطاعت واعانت کی وہ تمام باتیں جو حکمرانی کے شرعی حقوق میں سے ہیں ایسے سربراہ کو حاصل ہو جاتی ہیں۔ اس سے روگردانی کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں۔ اس کے مقابلے میں حزوج اور دعوے کا حق کسی کو نہیں پہنچتا۔ اگرچہ کیسا ہی افضل اور جامع الشروط کیوں نہ ہو۔

دوسری صورت میں ایسا کیوں حکم دیا اس کی علت ومصلحت اس قدر واضح ہے کہ شرح و تفصیل کی ضرورت نہیں چونکہ یہ بات آج کے ناہموار سیاسی دور میں عام محسوسات کے خلاف ہے اس لئے اس کی قدرے تفصیل ضروری تھی شریعت اور اُمت کا باقی رہنا حکومت کے وجود پر موقوف تھا ساری باتیں نشاخیں ہیں۔ جو بہتر سے بہتر ہو سکتا ہے یعنی اسلامی حکومت کی بنیاد ارباب بست وکشاد کے انتخاب پر رکھی اور ساتھ ہی اس منصب کی ضروری شرطیں بھی بتادیں۔ اور پوری قوت سے یہ اعلان بھی کر دیا کہ لوگوں کو خود سربراہ مملکت بننے اور امارت کا خواہش مند نہ ہونا چاہیے نہ دعوی دار بن کر دوسروں سے لڑنا چاہیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اس عہد پر لوگوں سے عہد لیتے لاینازع الامر اھلہ سربراہی کو جو اہل ہو اسی پر سربراہی چھوڑ دیں گے۔ دنیا اگر اس چھوٹے سے جملے پر عمل کرے تو روئے زمین کے سارے جھگڑے ختم ہو جائیں حضرت امام بخاری نے کتاب الاحکام میں باب باندھا ہے باب ما یکرہ من الحرص علی الامارۃ۔ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری کی روایت لائے ہیں کہ حضور نے فرمایا ہے:

جو شخص خود اس کی حرص رکھتا ہو اور طالب ہو میں یہ کام اس کے ہرگز سپرد نہ کروں گا۔

اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ جب لوگ خود طلب وحرص نہ کریں گے تو مقابلہ اور کش مکش بھی نہ ہو گی۔ اور امت کے ارباب بست وکشاد کے لیے اہل کا انتخاب آسان ہو جائے گا۔

مسئلہ حکومت کا اصلی نظام قرآن وسنت کا پیش کردہ یہ اور صرف یہ ہے لیکن سب جانتے ہیں کہ یہ نظام تیس سال سے زیادہ قائم نہیں رہا اس لیے شرع وملت کی حفاظت کے لیے ضروری تھا کہ اصلی نظام پر زور دینے کے ساتھ ان وقتوں کے لیے بھی صاف صاف احکام دے دیئے جائیں جب اسلامی حکومت کے بارے میں اسلام کا بنایا ہوا طریقہ باقی نہ رہے اور شورائی حکومت کی جگہ شخصی اور استبدادی طریقہ قائم ہو جائے۔

ظاہر ہے کہ اس صورت میں دو ہی راہیں سامنے آتی تھیں اگر ایسے لوگوں کی حکومت تسلیم

کر لی جائے تو اس سے امت کی جمعیت جان و مال کا امن ملک کی حفاظت احکام شرع کا اجرا جماعت کا قیام و بقا اور اس طرح کے بے شمار مصالح و فوائد حاصل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ بلا کسی نزاع کے اسلامی حکومت قائم ہو جاتی ہے اور مزید جنگ و جدال اور کشت و خون کا سدباب ہو جاتا ہے مگر ساتھ ہی غیر شرعی حکومت قائم ہونے سے بہت سی خرابیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں ——— لیکن اگر حکومت تسلیم نہ کی جائے ان کی بغاوت کرنے کی اجازت دے دی جائے تو پھر دائمی سیاسی بحران کشت و خون جنگ و جدال، دعووں میں تصادم، قوتوں میں تزاحم، ہمیشگی کی بدامنی امت کی تباہی ملکوں کی خرابی نظام جماعت کا اختلال احکام شرع کی تعطیل۔ مسلمانوں کی جان و مال کی بدامنی اندرونی خانہ جنگی کی وجہ سے دشمنوں کا حملہ و تسلط اور اسی طرح کی بے شمار ہلاکتوں اور بربادیاں کے بعد شرعی اسلامی حکومت قائم ہو جائے۔

پہلی صورت میں صالح کا بقا و حصول مگر خرابیوں کا امکان ہے دوسری صورت میں خرابیوں کا وقوع مگر مصالح کا امکان تھا۔

اسلام نے پہلی صورت اختیار کی اور پوری قوت کے ساتھ دوسری صورت پر قدغن قائم کر دی یعنی مصالح کے امکان پر ان کے وقوع کی ترجیح دی۔ اس پر تفصیل بحث انشاء اللہ پارہ ۱۸ میں آیت وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کے تشریحی نوٹ میں آ رہی ہے۔

بہر حال یہ آیت گرامی اسلام کے اجتماعی نظام کی ضرورت کی طرف رہنمائی کر رہی ہے۔
شیخ الاسلام نے لفظ صدقہ کے بارے میں لکھا ہے کہ صدقہ کا ترجمہ حضرت شیخ الہند نے زکوٰۃ کیا ہے۔ صرف شیخ الہند ہی نے نہیں بلکہ دوسرے اکابر نے بھی صدقہ سے زکوٰۃ مراد لی ہے۔ جنہوں نے صدقہ نافلہ کو اس کا محمل قرار دیا ہے ان کے پیش نظر صرف ابی لبابہ کا واقعہ ہے۔

صدقہ کی ضروری تشریح

اس لفظ کے لغوی معنی سچائی کے ہیں۔ بات کا اعتقاد و ضمیر کے مطابق ہونا، ظاہر و باطن کا یکساں ہونا، نیز کسی چیز سے جو توقع کی جائے اس پر اس کا پورا اترنا (مفردات القرآن) اسی لیے ہر اس عمل کو جو اللہ پر ایمان کی تصدیق کرتے ہوئے انجام دیا جائے صدقہ کہا جاتا ہے (تاج العروس) اور چونکہ اللہ سبحانہ رفاہ عامہ ہمہ گیر اصلاح خیر اور اخلاق فاضلہ کو پسند کرتا ہے اس

لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام کاموں کے لیے جو رذائل بخلی دور کرتے ہیں یا جن سے نفس کو مہذب و شائستہ بنایا جاتا ہے یا جن سے اجتماعی الفت و محبت اور انسانوں میں ہمدردی پیدا ہوتی ہے صدقات کی تعبیر اختیار فرمائی ہے۔ اہل لغت نے ہر اس چیز کو جو رضائے الہٰی کے حاصل کرنے کے لیے اہل حاجت کو دی جائے صدقہ کہا ہے علامہ مرتضیٰ زبیدی نے تاج العروس میں علامہ جوہری نے صحاح میں یہی موقف اختیار کیا ہے علامہ راغب اصفہانی نے صدقہ کی تعریف اس طرح کی ہے۔ الصدقة ما یخرجه الانسان من ماله علی وجه القربة كالزكوٰة صدقہ وہ چیز ہے جو انسان اپنے مال میں سے قرب الہٰی کے حصول کی خاطر نکالتا ہے جیسے زکوٰۃ۔ قرآن میں اسی سورت میں مصارف زکوٰۃ کے سلسلے میں زکوٰۃ کے لیے صدقات ہی کی تعبیر اختیار کی ہے دراصل چونکہ نماز و زکوٰۃ اسلام کے اجتماعی نظام کے وہ ستون ہیں جن پر اجتماعیت کی ساری عمارت کھڑی ہے اس لیے یہاں جن لوگوں نے اجتماعی تقاضے میں اہل ایمان کا ساتھ نہیں دیا تھا ان کے بارے میں بتایا جا رہا ہے کہ توبہ قبول ہونے کے بعد اب مسلمانوں کی جماعت کے فرد ہیں اور ان سے زکوٰۃ لی جا سکتی ہے آگے ارشاد ہوا ہے تطهرهم وتزكيهم بها اس میں تطہیر سے تطہیر اور تزکیہ سے تزکی آیا ہے۔ تطہیر کے معنی ظاہری باطنی نجاستوں سے پاک صاف کرنے کے ہیں ارشاد باری ہے وثيابك فطهر اور ارشاد ہے وینزل علیکم من السماء ماء ليطهركم به اور ارشاد ہے ويطهركم تطهيرا۔ الغرض جسمانی و روحانی نجاستوں سے پاک کرنے کا نام تطہیر ہے۔ اور صدقہ وہ پانی ہے جو دینے والوں کے قلوب و نفوس کے سارے میلوں کو دور کر دیتا ہے۔ اور تزکیہ کے معنی بڑھوتری اور برکت کے ہیں یعنی رذائل دور کرنے کے ساتھ صلاحیتوں اور خوبیوں کو نشو و نما دینے اور فضائل اخلاق سے آراستہ کرنے کے ہیں۔

ان دونوں کی تشریح میں شارحین قرآن نے لکھا ہے کہ یہ دونوں فقرے یا تو خذ میں ضمیر سے حال ہیں اور یا دونوں صدقہ کی صفت میں قرطبی نے پہلی صورت کو بہترین قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ والجود ان تکون المخاطبة للنبی صلی اللہ علیہ وسلم اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ یا رسول اللہ آپ ان سے صدقہ لیجیے اور اس کے ذریعے آپ ان کے رذائل دور کیجیے اور ان کو محاسن اخلاق کے زیور سے آراستہ کیجیے اور صل علیہم ان کو دعا دیجئے۔ اور دوسری صورت میں مطلب یہ ہے کہ صدقہ ان کو فضائل اخلاق سے آراستہ کرے گا۔ اس صورت میں بھا

کے لانے میں کوئی معنویت نہیں رہتی ہے۔ دونوں میں سے کوئی ہو دونوں کا حاصل یہ ہے کہ صدقہ دو کام کرتا ہے ایک یہ کہ رذائل کو دور کرتا ہے دوسرے یہ کہ فضائل و محاسن کی تخلیق کرتا ہے پہلا اگر تخلیہ ہے تو دوسرا تحلیہ ہے پہلے منجھائی ہوتی ہے پھر اس میں چمک دمک پیدا ہوتی ہے۔ اس سے یہ بات تو فقہاء کرام نے سمجھی ہے کہ آیت کی رو سے زکوٰۃ وصول کرنا مسلمان سربراہ مملکت کا کام ہے۔ الجصاص نے لکھا ہے کہ —— یہ آیت واضح دلیل ہے اس کی کہ زکوٰۃ لینا سربراہ مملکت کا حق ہے لیکن زمانہ ارتداد میں حضرت ابو بکرؓ کے خلاف جن لوگوں نے شورش نے بپا کی تھی۔ ان میں ایک طبقہ مسلمانوں کا ایسا بھی تھا جنہوں نے اس آیت کا سہارا لے کر سربراہ مملکت کے اس حق کا انکار کر دیا تھا۔ ان کا موقف جیسا کہ قرطبی نے لکھا ہے یہ تھا کہ اس آیت میں حضور کو زکوٰۃ لینے کا حکم تھا اور حضور اقدس اس زکوٰۃ لینے کے بدلہ میں تطہیر، تزکیہ اور دعا دیتے تھے اور یہ تینوں کام کسی دوسرے کا منصب نہیں ہے اس لیے ہم زکوٰۃ سربراہ مملکت کو نہ دیں گے ان کے ہی بارے میں حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا تھا واللّٰہ لا قاتلن من فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ۔

صحابہ کی پوری اجتماعی قوت نے ان کے اس موقف کو رد کر دیا تھا ان کی یہ سوچ قرآن سے بے خبری، شریعت کے ماخذ سے ناآشنائی اور دین سے مذاق کے مترادف ہے۔ کچھ ہو اس واقعہ سے یہ بات تو واضح ہو رہی ہے کہ سربراہ مملکت کا زکوٰۃ وصول کرنا صحابہ کرام کا اجتماعی موقف ہے۔ اس اجتماعی موقف میں امت میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں۔ ابن العربی نے لکھا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کے خلاف شورش کرنے والوں میں یہ طبقہ سب سے اچھا تھا۔ حضرت ابو بکرؓ کے ارشاد کا منشا ذرا گہرائی میں جا کر سوچیے کہ کیا فرما رہے ہیں یہی نا کہ جیسے نماز باجماعت امام کے تحت ادا ہوتی ہے ان میں تفریق اس کے سوا کیا ہے کہ نماز باجماعت ادا ہو اور زکوٰۃ بے جماعت ہو۔ وہ زکوٰۃ کی ادائیگی کا انکار نہیں کر رہے تھے۔ وہ تو صرف سرکار کو زکوٰۃ دینے کے منکر تھے۔ ان بے جماعت زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے بارے میں حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا واللّٰہ لا قاتلن من فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ بخدا میں ضرور ان لوگوں سے جنگ کروں گا جو نماز اور زکوٰۃ کے درمیان فرق کریں گے۔

زکوٰۃ کے مقاصد

قرآن کی یہ آیت زکوٰۃ کے مقاصد کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ زکوٰۃ کے معنی پاکی اور صفائی کے ہیں یعنی گناہ اور دوسری روحانی قلبی اور اخلاقی برائیوں سے پاک وصاف ہونا اور فضائل اخلاق سے آراستہ ہونا۔ قرآن پاک میں یہ لفظ اسی معنے میں بار بار آیا ہے۔

قد افلح من زکٰھا :۔ مراد پائی اس شخص نے جس نے اس کو پاک کیا

ایک اور جگہ ہے :

قد افلح من تزکی :۔ مراد پائی اس نے جو پاک وصاف ہوا

یہ تزکیہ اور پاکی وصفائی نبوت کے ان تین عظیم الشان خصوصیتوں میں سے ایک ہے جن کا ذکر قرآن نے کیا ہے یتلو علیھم ایاتہ ویزکیھم

تزکیہ کے معنی پاک کرنے کے ہیں یہ دل کی پاکی روح کی صفائی اور نفس کی طہارت مذہب کی اصل غایت اور نبوتوں کا اصل مقصد ہے۔ انسانوں کی روحانی ونفسیاتی بیماری کے بڑے حصے کا سبب تو اللہ سبحانہ سے خوف ورجا اور تعلق ومحبت نہ ہونا ہے۔ اور اس کی اصلاح نماز سے ہوتی ہے لیکن دوسرا بڑا سبب غیر اللہ کی محبت اور مال ودولت سے دل کا لگاؤ ہے اس کی اصلاح زکوٰۃ سے کی ہے۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر جب کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے غزوہ میں شرکت نہ کرنے کی غلطی ہوئی اور پھر اللہ سبحانہ نے ان کی سچائی اور صداقت کی وجہ سے ان کو معاف کر دیا حضور اقدس کو حکم ہوا :

خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم وتزکیھم بھا

اس سے معلوم ہوا کہ اپنے محبوب مال میں سے کچھ نہ کچھ خدا کی راہ میں دیتے رہنے سے انسانی نفس کے آئینے کا سب سے بڑا زنگ جس کا نام محبت مال ہے دور ہو جاتا ہے۔ بخل کی بیماری کا اس سے علاج ہوتا ہے مال کی حرص بھی کم ہو جاتی ہے دوسروں کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے شخصی مفادات کی جگہ جماعتی تقاضوں کی خاطر اپنے اوپر ایثار کرنا انسان سیکھتا ہے اور یہی وہ دیواریں ہیں جن پر جماعتی زندگی کا نظام مبنی ہے۔

آخر میں فرمایا کہ وصل علیھم یعنی ان کو دعا دو ایک معنی تو یہی ہیں کہ جو زکوٰۃ دیتے ہیں ان کے حق میں دعا کرو لیکن اس سے پہلے حکم گذر چکا ہے کہ منافقین کے صدقات قبول نہ کرو

اور ان کی بخشش کی دعا نہ کرو۔ یہاں ارشاد ہوا کہ جن لوگوں نے اپنی خطاؤں کا اقرار کر لیا ہے اور توبہ کر لی ہے تو وہ جو کچھ راہ حق میں نکالیں ان سے قبول کر لو ان کے حق میں دعائے خیر کرو اگر وہ مر جائیں تو ان کی نماز جنازہ پڑھو۔

شارحین قرآن نے اس سے یہ مسئلہ بھی نکالا ہے کہ جب کوئی مسلمان شہری زکوٰۃ سرکار کے حوالہ کرے تو سربراہ مملکت کو اس کے لیے دعا کرنی چاہیے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں کہ اس موضوع پر اہل علم کا اختلاف ہے کچھ کہتے ہیں کہ دعا کرنا واجب ہے، کچھ کہتے ہیں کہ مستحب ہے، کچھ کی رائے ہے کہ شہریوں کی جانب سے زکوٰۃ آئے تو سربراہ مملکت کو دعا کرنی واجب ہے اور اگر صدقات نافلہ ہوں تو دعا مستحب ہے صحیح بخاری میں ہے عبداللہ بن ابی اوفی کہتے ہیں کہ لوگ حضور اقدس کی خدمت میں صدقات لاتے، تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اللھم صل علیھم کہہ کر دعا دیتے میرے والد صاحب نے بھی صدقہ کی پیش کش فرمائی آپ نے فرمایا اللھم صل علی آل ابی اوفی۔

عربی میں صلوٰۃ کے معنی دعا، استغفار اور رحمت کے آتے ہیں صلوٰۃ تصلیہ سے اسم ہے نماز کو بھی صلاۃ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ دعا پر مشتمل ہوتی ہے امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ بہت سے اہل لغت کا بیان ہے کہ صلوٰۃ کے معنی دعا کرنے برکت مانگنے اور بزرگی سے یاد کرنے کے ہیں بولا جاتا ہے صلیت علیہ میں نے اس کے لیے دعا کی حضور اقدس کا ارشاد ہے جب تم میں سے کسی کو کھانے کی دعوت دی جائے تو قبول کر لینا چاہیے اور اگر روزہ دار ہو تو دعا کرنا چاہیے ان کان صائما فلیصل۔ اہل ایمان اور ملائکہ کی جانب صلوٰۃ کی نسبت ہو تو معنی دعا کے ہیں اور اللہ سبحانہ کی طرف نسبت ہو تو معنی رحمت اور شاباش کے ہیں ارشاد ہے اولائک علیھم صلوات من ربھم ان پر ان کے رب کی جانب سے شاباشیں ہیں۔ یہاں صل علیھم کے معنے دعا دینے کے ہیں اور صلوٰۃ کے معنے دعا کے ہیں معنی یہ ہیں کہ تو ان کو دعا دے تیری دعا ان کے لیے سکون کا سامان ہے۔ سکن کے معنی سکون و اطمینان والی چیز کے ہیں۔ اسی سے رات کو سکون کا ذریعہ بنایا ہے۔ حضور کی دعا ان میں صلاح و رستگی کا ذریعہ اور ان میں خوبیوں کی طرف میلان کی راہ ہموار کرے گی اس لیے سرتاسر سکون بنے گی۔ جیسے مصیبت میں اضطراب اور بے چینی ہوتی ہے ایسے ہی طاعت میں اطمینان سکون ملتا ہے۔ آخر میں دعا کے حوالے سے واللہ سمیع علیھم فرمایا ہے۔ یہاں سمیع کے معنی دعا قبول کرنے کے ہیں

اس میں اشارہ ہے کہ ان کے حق میں حضور اقدس کی دعا قبول ہو گی اور علیہم لاکر یہ بات بتائی ہے کہ دعا کا حکم حضور کو ان کے لیے صرف اسلئے دیا ہے دعا میں ان کے لیے خیر عظیم ہے اور دنیا کی زندگی میں سارے کاموں کی درستگی کی اس میں ضمانت ہے۔

توبہ و انفاق کی ترغیب

۱۰۴ کیا ان کو خبر نہیں ہے کہ اللہ ہی کی ذات گرامی اپنے بندوں کی توبہ کو شرف قبول عطا کرتی ہے۔ اور اللہ ہی صدقات کو پذیرائی دیتا ہے اور اللہ ہی زیادہ سے زیادہ توبہ قبول کرنے والا اور بڑا ہی رحمت کرنے والا ہے یعنی توبہ و صدقات کا قبول کرنا صرف اللہ سبحانہ کے اختیار میں ہے کیونکہ وہ ہی جانتا ہے کہ کس نے اخلاص سے اور شرائط توبہ کی رعایت کے ساتھ توبہ کی یا صدقہ دیا چنانچہ پہلے بعضوں پر عتاب ہو چکا کہ ہمیشہ کے لیے ان کی زکوٰۃ یعنی موقوف ہوئی اور منافقین کے صدقات کو مردود ٹھہرایا گیا۔ اور ان کے حق میں دعا و استغفار کو بھی بے سود بتلایا بلکہ جنازہ پڑھنے کی ممانعت کر دی۔ جن لوگوں کا یہاں ذکر ہے ان کی توبہ قبول کی اور صدقات قبول کرنے کا حکم دیا اور یہ ہی کہ حضور ان کے حق میں (حیاً و میتاً) دعا کریں [۱]

اوپر والی آیت میں مخاطب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تھے آپ کو یہ بتایا گیا تھا کہ جب انہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا ہے تو ان کی ساتھ اجتماعی زندگی میں بالکل مسلمان شہریوں کا سلوک کیا جائے۔ اس آیت میں خود مسلمانوں کو توبہ اور انفاق میں سرگرم ہونے پر ابھارا جا رہا ہے کیونکہ نفاق کی بیماری کا سب سے موثر علاج اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہے یہ بیماری اصلاً اپنے مفادات کی محبت سے پیدا ہوتی ہے جو انفاق سے اس بیماری کی جڑ کٹ جاتی ہے اور جب جڑ پر ضرب لگتی ہے تو ایک طرف رذائل ختم ہوتے ہیں دوسری طرف مکارم و فضائل پروان چڑھتے ہیں۔ یہ فرما کر کہ اللہ سبحانہ اپنے بندوں کی توبہ اور صدقات قبول کرتا ہے انفاق اور توبہ کی ترغیب دی ہے۔ لہٰذا جو لوگ اللہ سبحانہ کی رضا اور قرب کے طالب ہوں تو ان کو چاہیے کہ وہ اللہ سبحانہ کی پسند کے یہ کام زیادہ سے زیادہ کریں۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہو رہی ہے کہ توبہ اور اصلاح کا کام کوئی وقتی کام نہیں ہے بلکہ اس میں دوام اور استمرار مطلوب ہے۔

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

اس آیت میں ضمیر فصل لاکر جو تخصیص پیدا کی گئی ہے اس سے بھی شارحین قرآن نے یہ نکتہ افروزی کی ہے کہ توبہ قبول کرنا صرف اللہ سبحانہ کا کام ہے کسی بندے کا کام نہیں خواہ وہ نبی ہو یا ولی علامہ نسفی حنفی صاحب مدارک لکھتے ہیں۔ ان ذالک لیس الی رسول اللہ انما اللہ ھو یقبل التوبہ توبہ قبول کرنا صرف اللہ سبحانہ کا کام ہے رسول کا کام نہیں ہے۔ علامہ قرطبی نے بھی علامہ نسفی کی ہمنوائی کی ہے۔ یہی صدقات کا بھی حکم ہے قرطبی لکھتے ہیں یہ آیت اس موضوع پر صاف ہے کہ صدقات قبول کرنا اور اس پر ثواب دینا اللہ کا کام ہے حضور اقدس کی ذات گرامی واسطہ ہے۔

علامہ آلوسی نے اس انداز بیان کی بلاغت سے کچھ لوگوں کی طرف نسبت کرکے یہ بات نکالی ہے کہ پہلی آیت میں حضور اقدس کو مخاطب کرکے فرمایا خذ من اموالھم اور اس آیت میں یاخذ الصدقات ارشاد ہوا ہے یعنی پہلے لینے کی نسبت حضور اقدس کی طرف ہوئی ہے اور اس آیت میں لینے کی نسبت اللہ سبحانہ کی طرف ہوئی ہے اس میں اشارہ ہے کہ حضور اقدس کا لینا اللہ سبحانہ کے لینے کی نیابت ہے جیسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کو اللہ پاک کی بیعت بنایا ہے ایسے ہی حضور کا صدقہ لینا بھی اللہ کا لینا ہے۔ اس میں شان نبوت کی برتری ہے لیکن دوسرے شارحین قرآن نے بتایا ہے کہ دونوں آیتوں میں اخذ کے معنی لینا نہیں ہے پہلی آیت میں حضور کے خطاب میں اخذ اگر لینے کے معنی میں ہے تو دوسری آیت میں اخذ قبول کے معنی میں ہے اس اعتبار سے وہ معنوی لطافت نہیں رہتی ہے اسی لیے علامہ آلوسی نے اس بلاغت کے حسن کے اقرار کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا ہے۔ الّا ان فی دعوی الحقیقۃ مالا یخفی اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے شارحین قرآن نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے جو ارشادات پیش کیے ہیں ان کی روشنی میں بھی یہ بات وضاحت سے کھل کر سامنے آتی ہے کہ آیت قرآنی الم یعلموا ان اللہ ھو یقبل التوبۃ عن عبادہ و یاخذ الصدقات میں یاخذ قبول کرنے کے معنی میں ہے۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

> اس آیت میں توبہ اور صدقہ کی ترغیب دی جارہی ہے۔ یہ دونوں چیزیں گناہوں کو کالعدم کر دیتی ہیں۔ اللہ سبحانہ نے اعلان کیا ہے جو اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرتا ہے اللہ سبحانہ اس کی توبہ کو شرف پذیرائی دیتا ہے۔ اور جو شخص مال حلال سے صدقہ کرتا ہے اللہ سبحانہ اس کو قبول کرکے اس کو بڑھاتا ہے اتنا بڑھاتا ہے کہ ایک کھجور کا دانہ جبل احد کے برابر ہوجاتا ہے۔

ارشاد نبوت ہے حضرت ابوہریرہ کہتے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ سبحانہ صدقہ کو قبول کرتا ہے۔ اس کو اپنے دامن میں لے کر اس کی پرورش کرتا ہے ایسے ہی جیسے تم گھوڑے کے بچے کو پالتے ہو۔ اس پرورش کے ذریعے ایک لقمہ بھی صدقہ کیا ہوا اُحد پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔ اس کی تصدیق چاہتے ہو تو قرآن کی یہ آیت پڑھو الم یعلموا الخ۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے صدقہ کی قبولیت کو اس طرح سمجھایا ہے کہ صدقہ محتاج کے ہاتھ میں جانے سے پہلے اللہ کے ہاتھ میں جاتا ہے۔ پھر یہی آیت تلاوت فرمائی۔ علامہ بقاعی نے نظم الدرر میں بھی بڑی لطیف بات لکھی ہے کہ اس انداز بیان میں ان لوگوں پر ایک لطیف طنز ہے جنہوں غزوہ تبوک میں شرکت نہ کرنے کے گناہ کی سنگینی کو محسوس نہیں کیا اور توبہ نہیں کی اور اپنے گناہوں کا ان کی طرح اعتراف نہیں کیا جن کی توبہ اللہ سبحانہ نے قبول فرمائی۔

آیت قرآنی کا خلاصہ یہ ہے کہ گناہوں سے توبہ کرنی چاہیے بطور کفارہ کچھ مال بھی صدقہ کرنا چاہیے یہ ایمان کی علامت ہے۔ صدقہ دینے سے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ روح پاک ہوتی ہے دل گناہوں کی کدورت سے صاف ہوتا ہے گویا اس طرف اشارا ہوا کہ اسلام قربانیوں کا نام ہے جان کی قربانی ہو یا مال کی قربانی۔ ایمان کے کھرے ہونے کے لیے قربانی ناگزیر ہے، توبہ اور قربانی ایمان کی جان ہے۔ اگر جان کی قربانی کا موقعہ نہ ہو تو مال کی قربانی کرے۔

آئندہ کے لیے ہدایت

۱۰۵ اور اے پیغمبر ان سے کہہ دو اللہ سبحانہ، اللہ کا رسول اور سارے مسلمان تمہارے اعمال دیکھیں گے۔ اور ضرور تمہیں عالم الغیب والشہادہ کے حضور میں پیش کیا جائے گا وہ تمہیں بتائے گا کہ تم کیا کرتے تھے یعنی توبہ وغیرہ سے گناہ معاف ہو گئے لیکن آگے دیکھا جائے کہ تم کہاں تک صدق و استقامت کا عملی ثبوت پیش کرتے ہو اس جہاد میں مقصود ہوا تو آئندہ اور جہاد ہوں گے پیغمبر علیہ اسلام کے یا خلفا کے روبرو ان میں امتحان ہوگا کہ کیا عمل کرتے ہو پھر خدا کے یہاں جا کر ہر عمل کا پورا بدلہ مل جائے گا کیونکہ وہ تمام کھلی چھپی چیزوں اور ظاہری عمل اور باطنی نیتوں پر مطلع ہے ہر ایک کے ساتھ واقعی حالت کے موافق معاملہ کرے گا۔ آیت کی یہ تقریر حضرت شاہ کے مذاق کے مطابق کی گئی ہے۔ کیونکہ سیاق قرآنی کے زیادہ مطابق ہے۔[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

جو تشریح حضرت شیخ الاسلام نے حضرت شاہ صاحب کے حوالہ سے اختیار فرمائی ہے آیت کا یہی مطلب کچھ شارحین نے اختیار کیا ہے یہی علامہ بقاعی نے نظم الدرر میں اختیار کیا ہے۔ لیکن دوسرے شارحین قرآن نے وہ تشریح اپنائی ہے جو مجاہد امام سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ یہ بات ڈانٹ اور دھمکی ہے اور اس کے مخاطب وہ لوگ ہیں جو غزوہ تبوک میں شریک نہیں ہوئے اور تا حال انہوں نے اپنے اس جرم پر ندامت محسوس کر کے توبہ نہیں کی حافظ ابن کثیر کا میلان بھی اس طرف ہے اور کچھ شارحین قرآن کی رائے میں اس کے مخاطب سب ہیں وہ بھی جنہوں نے توبہ کر لی ہے اور وہ بھی جنہوں نے توبہ نہیں کی ہے۔ قرطبی کی رائے یہی ہے۔ تشریح میں اس اختلاف کا سرچشمہ یہ ہے کہ آیت میں وعد اور وعید دونوں ہیں جن کی نظر وعد پر ہے۔ انہوں نے بقاعی کی تشریح کو اپنا لیا اور جن کی نظر وعید پر ہے جم گئی انہوں نے مجاہد کی تشریح کو اختیار کیا اور جن کی نظر میں وعد و وعید دونوں یکساں تھے۔ انہوں نے آیت قرآنی کا مخاطب سب کو قرار دیا ہے۔ لیکن میری ناچیز رائے میں سیاق قرآنی کے زیادہ مطابق یہی ہے کہ مخاطب وہی لوگ ہیں جنہوں نے توبہ کی ہے اور مال صدقہ کیا ہے اور اللہ سبحانہ نے ان کا صدقہ قبول اور ان کی توبہ کو شرف پذیرائی دیا ہے۔ انہوں نے اپنے قصور کے لیے جھوٹے عذر پیش نہیں کئے بلکہ جو قصور ہوا ہے اسے صاف صاف مان لیا۔ محدثین نے ان آیات کے شان نزول میں جو واقعہ بیان کیا ہے اس سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ سبحانہ کے یہاں معافی کس قسم کی کمزوریوں کے لیے ہے۔ یہ سب حضرات عادی غیر مخلص نہ تھے بلکہ ان کا پچھلا زمانۂ زندگی ان کے اخلاص ایمان کی دلیل تھا۔ ان میں سے کسی نے عذر نہیں تراشا بلکہ اپنے قصور کو خود ہی مان لیا انہوں نے اعتراف قصور کے ساتھ اپنے طرز عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ واقعی نادم اور اپنے اس گناہ کی تلافی کے لیے سخت بے چین ہیں ان سے ہی کہا جا رہا ہے کہ ہر چند اس وقت تمہیں معافی کا پروانہ مل گیا ہے لیکن اس معافی پر مطمئن نہ ہو جانا بلکہ مستقبل میں اپنے عمل سے بھی تمہیں ثابت کرنا ہوگا اللہ، اس کا رسول اور اہل ایمان سب تمہارے رویہ کو دیکھیں گے۔ آخر میں فرمایا وستردون الی عالم الغیب والشہادۃ۔ علامہ بقاعی نے یہاں یہ لطیف نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ منافقین کے بارے میں جب بھی بات فرمائی تو ارشاد ہوا ثم تردون الی عالم الغیب والشہادۃ لیکن یہاں چونکہ ان مخلص اہل ایمان کا ذکر ہو رہا ہے جن سے وقتی طور پر غلطی ہو گئی ہے اس لیے تعبیر بدل کر فرمایا وستردون الی عالم الغیب مطلب یہ ہے کہ تمہارا معاملہ اس خدا کے ساتھ ہے جس سے کوئی چیز چھپ نہیں سکتی اس لیے بالفرض اگر کوئی شخص دنیا میں

اپنا نفاق چھپانے میں کامیاب ہو جائے اور انسان جن جن معیاروں پر کسی کے ایمان واخلاص کو پرکھ سکتا ہے ان سب پر بھی پورا اتر جائے تو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ نفاق کی سزا پانے سے بچ گیا ہے۔

خاص لوگوں کا ذکر

ااا؎ اور کچھ اور بھی ہیں جن کے معاملے میں تا حکم الٰہی مہلت دی گئی ہے وہ ان کو عذاب دے یا اپنی رحمت سے ان کو معاف کر دے اللہ سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ مدینہ والوں میں سے یہاں ایک اور چھوٹی سی جماعت کا ذکر فرمایا ہے اصل یہ ہے کہ متخلفین عن تبوک یعنی تبوک میں نہ جانے والوں میں تین قسم کے لوگ تھے ایک منافقین از راہ شک ونفاق تبوک نہ گئے دوسرے کچھ اہل ایمان جو محض سستی اور تن آسانی کی وجہ سے شریک جہاد نہ ہوئے۔ پھر ان میں دو قسمیں تھیں اکثر وہ ہیں جنہوں نے واپسی کی اطلاع پاکر اپنے کو مسجد کے ستونوں سے باندھ لیا تھا ان کا ذکر پچھلی آیات میں گزر گیا صرف تین شخصوں کی وہ جماعت تھی جنہوں نے نہ اپنے کو ستونوں سے بندھوایا نہ کوئی عذر تراشا جو واقعہ تھا اور جو قصور ہوا تھا صاف صاف بلا کم و کاست حضور اقدس کے سامنے عرض کر دیا۔ ان کے بارے میں یہ آیت واخرون مرجون الخ اتری یعنی ان کا معاملہ ابھی ڈھیل میں ہے چند روز اللہ سبحانہ کے حکم کا انتظار کرو خواہ ان کو سزا دے یا معاف کر دے جو اس کے علم وحکمت کا تقاضا ہوگا کیا جائے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تا نزول حکم الٰہی ادب دینے کے لیے مسلمانوں کے تعلقات ان تینوں سے منقطع کرا دیے پچاس دن تک یہی معاملہ رہا۔ پھر معافی ہوئی ان واقعات کی تفصیل آگے رکوع میں آرہی ہے؎ مطلب یہ ہے کہ ان مخلصین کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی ہیں جو اللہ سبحانہ کے فیصلہ کا انتظار کر رہے ہیں یعنی ان کی توبہ کی قبولیت اور عدم قبولیت کا ابھی فیصلہ نہیں ہوا یہ کل تین آدمی تھے مرارہ ابن الربیع، ہلال ابن امیہ، کعب بن مالک انہوں نے واپسی پر کوئی معذرت نہیں کی اور کہا کی سچی بات یہ ہے کہ کوئی عذر نہ تھا محض کاہلی اور سستی تھی جس نے نکلنے نہیں دیا اس پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ کے حکم کا انتظار کرو۔ ان لوگوں کا اپنی کوتاہی پر نادم ہونا تو ظاہر ہے لیکن آیت سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ قبول توبہ کے لیے صرف پشیمانی کافی نہیں ہے جب

؎ افادات شیخ الاسلام

امکانی تدارک کا بھی سامان نہ ہو۔ امام رازی فرماتے ہیں ذالک یدل علی ان اللہ امۃ وحدہ لایکون کافیا فی صحۃ التوبۃ۔ لفظ اما آیت میں کلمہ تردد ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ تردد حق سبحانہ کی جانب کیسے وہاں تو ہر فیصلہ قطعی ہوتا ہے لفظ اما کا استعمال محاورہ انسانی کے مطابق ہے اور بندوں کو یہ تعلیم مل رہی ہے کہ وہ صرف حالت امید میں رہیں یہ نکتہ علامہ قرطبی نے پیش کیا ہے۔ اسی بات کو آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہ ان کا معاملہ عام نگاہوں میں مشکوک تھا ان کے ماضی کے پیش نظر نہ ان پر نفاق کی تہمت کی گنجائش تھی اور اسلام کی زندگی کی خاطر محنت سے جی چرانے کی موجودگی ان کا اخلاص واضح تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے معاملہ کو معرض التوا میں رکھا اس لیے نہیں کہ فی الواقع علم الٰہی میں معاملہ مشکوک تھا بلکہ اس لیے کہ مسلمانوں کو کسی مسلمان کے معاملے میں اپنا طرز عمل اس وقت تک متعین نہ کرنا چاہیے جب تک اس کی پوزیشن واضح ہو کر سامنے نہ آجائے۔

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ جب ان لوگوں کا ماضی بظاہر بے داغ تھا ان پر اس قدر عتاب کیوں ہوا ؟

اس کی ایک سے زیادہ وجہ ہو سکتی ہیں

ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ کسی پر عتاب اس نسبت سے ہوتا ہے جس نسبت سے اس پر اعتماد اور اس سے حسن ظن ہوتا ہے۔ بیگانے اگر غلطی کریں تو ان کی کمزوریوں کی وجہ سے ان سے بعید نہیں لیکن ان لوگوں نے جو غلطی کی اس سے اپنے پچھلے بے داغ ریکارڈ کو بھی انہوں نے داغدار بنا لیا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اعتماد اور حسن ظن کو بھی ٹھیس پہنچائی جو ہر مسلمان کا سب سے بڑا قیمتی سرمایہ ہے۔

دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان بزرگوں نے غالباً اس اعتماد کی وجہ سے جو ان کو اپنے ماضی پر تھا اپنی اس غلطی کا شدت سے احساس نہیں کیا جیسا کہ ان کو کرنا چاہیے۔ اس لئے تربیت الٰہی کی حکمت نے چاہا کہ ان کی توبہ کی قبولیت اس عرصہ تک ملتوی رہے کہ ان میں وہ بیقراری نہ پیدا ہو جائے جو توبہ کی قبولیت کے لیے اللہ سبحانہ کی بارگاہ میں ضروری ہے۔

تیسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس طرح اہل ایمان میں نفاق کے خلاف وقتی نفرت پیدا کر دی جائے کہ وہ نفاق کی کسی قسم کو بھی اپنے اندر گوارا کرنے پر راضی نہ ہوں۔

یہاں یہ سوال بھی قرآن کے قاری کے ذہن میں خلش پیدا کرتا ہے کہ تبوک کی جنگ دفاعی نہیں

ہجومی تھی۔ یعنی مسلمان حملہ آور تھے۔ مسلمانوں پر کہیں سے حملہ نہیں ہوا تھا اور سب جانتے ہیں کہ ہجومی حالت میں جنگ میں شرکت فرض کفایہ ہے جب کہ دفاع میں فرض عین ہے فرض کفایہ کا حکم یہی ہے کہ کچھ کے کرنے سے سب سے ذمہ داری کا بوجھ ہٹ جاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس جہاد میں شرکت فرض کفایہ تھی فرض کفایہ کے ترک پر اس قدر عتاب کیوں ہو۔

حافظ ابوالقاسم السہیلی نے الروض الانف میں حافظ ابن بطال کے حوالہ سے یہ جواب دیا ہے کہ انصار پر جہاد فرض عین تھا کیونکہ انہوں نے جہاد کے لیے حضور اقدس کے دست مبارک پر بیعت کی تھی۔ غزوہ خندق میں وہ یہ رجز بڑی لے سے پڑھ رہے تھے۔

نحن الذین بایعوا محمدا
علی الجهاد مابقینا ابدا

ہم ہی تو وہ ہیں جنہوں نے زندگی بھر جہاد کرنے کی حضورؐ سے بیعت کی ہے۔

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا
مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ وَإِرْصَادًا
لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ إِنْ أَرَدْنَآ
إِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكٰذِبُونَ ﴿۱۰۷﴾ لَا تَقُمْ فِيهِ
أَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ
أَنْ تَقُومَ فِيهِ ؕ فِيهِ رِجَالٌ يُّحِبُّونَ أَنْ يَّتَطَهَّرُوا ؕ وَاللّٰهُ
يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ ﴿۱۰۸﴾ أَفَمَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلٰى تَقْوٰى
مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ أَمْ مَّنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلٰى
شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهِ فِي نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي
الْقَوْمَ الظّٰلِمِينَ ﴿۱۰۹﴾ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيبَةً
فِي قُلُوبِهِمْ إِلَّآ أَنْ تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿۱۱۰﴾ ع ۱۱

اور وہ لوگ جنہوں نے اہلِ ایمان کو نقصان پہنچانے، کفر کرنے اور
اہلِ ایمان میں پھوٹ ڈالنے اور اللہ و رسول سے جنگ کرنے والوں
کے لیے کمین گاہ قائم کرنے کی خاطر مسجد بنائی ہے اور وہ ضرور قسمیں
کھا کر کہیں گے کہ مسجد کی تعمیر سے ہمارا مقصد بھلائی کے سوا کچھ

نہیں ہے اللہ کی گواہی یہ ہے کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں[۱] اے اللہ کے رسول تم اس مسجد میں کبھی نہ کھڑے ہونا وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے اس کی حقدار ہے کہ آپ اس میں قیام کریں۔ اس میں ایسے لوگ آتے ہیں جو پسند کرتے ہیں پاک و صاف رہنے کو۔ اور اللہ بھی پاک وصاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے[۲] کیا وہ شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ کے ڈر اور اس کی رضا پر رکھی ہو یا وہ شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد ایک کھائی کے گرے ہوئے کنارے پر رکھی ہو اس کے نتیجے میں وہ عمارت کے ساتھ جہنم کی آگ میں گر گیا ہو۔ اور اللہ سبحانہ ان کو راہ حق نہیں دکھاتا جو ظلم کا وطیرہ اپناتے ہوں[۳] جو عمارت انہوں نے بنائی ہے وہ ان کے دلوں میں ہمیشہ شک وشبہ کی آبیاری کرتی رہیگی مگر یہ کہ ان کے دلوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے[۴]

مفردات کے معانی

ضرار یہ ضار یضار باب مفاعلۃ کا فعال کے وزن پر مصدر ہے جس کے معنی باہم ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے ہیں۔ یہ ضرر سے بنا ہے بمعنے بدحالی ہے خواہ اپنے اندر میں ہو علم و فضل اور عفت کی کمی کی وجہ سے یا اپنے بدن میں ہو کسی عضو کے نہ ہونے کی وجہ سے یا کسی اور بیرونی سبب سے مثلاً مال وغیرہ کی قلت کی وجہ سے۔

ارصاد یہ رصد سے باب افعال ہے۔ اس کے معنی چوکیدارہ دینا گھات میں رہنا گھات میں رہنے کی تیاری کو کہتے ہیں۔ اسی سے رصد اور مرصاد کمین گاہ کے معنی میں ہے۔

شفا اصل میں کنوئیں یا نہر کے معنی میں آتا ہے۔ اس کی جمع اشفا ہے ہلاکت سے قریب ہونے کے لیے ضرب المثل ہے کنتم علی شفا حفرۃ میں اسی معنے میں ہے بطور استعارہ تھوڑے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ جب کہنا ہو کہ تھوڑا سا رہ گیا ہے تو بولتے ہیں ما بقی من کذا الا شفا. تثنیہ شفوان ہے۔ جرف یہ جرفۃ کی جمع ہے۔ اصل میں نہر کا وہ کنارہ جسے پانی کے بہاؤ نے کاٹ دیا ہو اسی سے جرف الدھر ماله زمانہ اس کے مال کو بہا لے گیا۔

ھار یہ ھور سے اسم فاعل ہے ھار النهار کے معنی ہیں عمارت کا پھٹ کر گرنے کے قریب ہو جانا۔ اسی سے فاعل ہائر آتا ہے مگر کبھی ھار بھی بولا جاتا ہے جیسے شائک السلاح کو شاکی السلاح بولتے ہیں۔ انہیار بھی اسی سے باب انفعال ہے جس کے معنی گرنا ہیں۔

مسجد ضرار کی تاریخی حیثیت

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ میں آنے سے پہلے قبیلہ خزرج میں ایک شخص ابو عامر نامی شخص تھا۔ زمانہ جاہلیت میں عیسائی ہو گیا تھا اور عیسائی بننے کے بعد عیسائی مذہب کی تعلیم حاصل کر کے راہب بن گیا تھا۔ اس کا شمار صرف عیسائی علماء میں نہیں بلکہ مشائخ میں ہوتا تھا یعنی اس کی علمیت کے ساتھ اس کی بزرگی کا سکہ بھی مدینہ اور اطراف مدینہ کے جاہل عربوں میں بیٹھا ہوا تھا جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو ابو عامر کی بزرگی کا بہت چرچا تھا مگر یہ علم اور بزرگی اس کے اندر حق شناسی اور حق جوئی پیدا کرنے کی جگہ الٹی اس کے لیے ایک زبردست حجاب بن کر رہ گئی۔ اس نے حضور اقدس کی ذات گرامی کو اپنی عالمانہ شان اور اپنی بزرگی کے لیے حریف

سمجھ کر آپ کی مخالفت کا بیڑا اٹھا لیا۔ شروع کے دو سال تک تو یہ اس امید پر جیتا رہا کہ کفار قریش کی طاقت ہی اسلام کو مٹا دے گی۔ لیکن جنگ بدر میں جب کفار قریش کو شکست ہوئی تو اس کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ اسی سال وہ مدینے سے نکل پڑا اور اس نے قریش اور دوسرے عرب قبائل میں اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی شروع کر دی۔ جنگ احد جن لوگوں کی کوششوں کے نتیجے میں برپا ہوئی ان میں یہ شامل تھا اور غزوۂ احزاب میں جو لشکر ہر طرف سے مدینہ پر چڑھائی کر کے آیا تھا۔ اس کے لانے میں بھی اس کا حصہ تھا اس کے بعد جنگ حنین تک جس قدر لڑائیاں مشرکین عرب اور مسلمانوں کے درمیان ہوئی تھیں ان سب میں یہ عیسائی درویش اسلام کے خلاف شرک کا سب سے بڑا حامی رہا۔ آخر کار اسے اس بات سے مایوسی ہو گئی کہ عرب کی کوئی طاقت اسلام کے سیلاب کو روک سکے گی۔ اس لیے عرب کو چھوڑ کر اس نے روم کا رخ کیا تاکہ قیصر کو اس خطرے سے آگاہ کرے۔ یہ وہ ہی موقع تھا جب مدینے میں یہ اطلاعات پہنچیں کہ قیصر عرب پر چڑھائی کی تیاریاں کر رہا ہے۔

ابو عامر کی ان تمام سرگرمیوں میں مدینے کے منافقین کا ایک گروہ اس کے ساتھ سازش میں شریک تھا۔ اور اس آخری تجویز میں یہ لوگ اس کے ہمنوا تھے کہ وہ اپنے مذہبی اثر کو استعمال کر کے اسلام کے خلاف قیصر روم اور شمالی عرب کے عیسائی ریاستوں سے فوجی امداد حاصل کرے۔ جب وہ روم کی طرف روانہ ہونے لگا تو ان سب نے باہم یہ فیصلہ کیا کہ مدینہ میں یہ لوگ اپنی ایک مسجد بنائیں گے تاکہ عام مسلمانوں سے بچ کر منافقوں کی علیحدہ تنظیم ہو سکے اور وہاں نہ صرف یہ کہ منافقین منظم ہو سکیں اور آئندہ کارروائیوں کے لیے مشورے کر سکیں بلکہ ابو عامر کی جانب سے جو جاسوس خبریں اور ہدایات لے کر آئیں وہ بھی فقیروں اور مسافروں کے بھیس میں اس مسجد میں ٹھہر سکیں یہ تھی وہ ناپاک سازش جس کے تحت مسجد تیار کی گئی۔ اس کی تعمیر کا زمانہ وہ ہے جب حضور اقدس قیصر روم کے مقابلے کے لیے سفر تبوک کی تیاریاں کر رہے تھے۔

بظاہر مسجد بباطن دار حرب

۱۰۷ اور وہ لوگ جنہوں نے اہل ایمان کو نقصان پہنچانے کفر کرنے اہل ایمان میں پھوٹ ڈالنے، اللہ و رسول سے جنگ کرنے والوں کے لیے کمین گاہ قائم کرنے کی خاطر مسجد بنائی وہ ضرور تم سے قسمیں کھا کر کہیں گے کہ مسجد کی تعمیر سے ہمارا مقصد بھلائی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اللہ کی گواہی یہ ہے کہ

یہ لوگ جھوٹے ہیں۔
پہلے ان لوگوں کا ذکر تھا جن سے بظاہر ایک بُرا کام ہو گیا یعنی متخلف عن الجہاد۔ مگر صحت اعتقاد اور اعتراف خطا کی بدولت معافی مل گئی۔ یہاں ایسی جماعت کا بیان ہے جنہوں نے بظاہر اچھا کام کیا یعنی تعمیر مسجد لیکن بداعتقادی کی وجہ سے وبال بن گیا۔
واقعہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے آئے تو اول مدینے سے باہر بنی عمرو بن عوف کے محلہ میں فروکش ہوئے پھر چند روز بعد مدینہ شہر میں تشریف لائے اور مسجد نبوی کی تعمیر کی اس محلہ میں جہاں آپ بیشتر نماز پڑھتے تھے وہاں کے لوگوں نے مسجد تیار کر لی جو مسجد قبا کے نام سے مشہور ہے حضرت اکثر ہفتہ کے روز وہاں جا کر دو رکعت نماز پڑھتے تھے اور اس کی بڑی فضیلت بیان فرماتے تھے کچھ منافقین نے چاہا کہ پہلوں کی ضد پر اسی کے قریب ایک اور مکان مسجد کے نام سے تعمیر کریں اپنی جماعت جدا ٹھہرائیں۔ اور بعض سادہ دل مسلمانوں کو مسجد قبا سے ہٹا کر ادھر لے آئیں۔ فی الحقیقہ اس ناپاک تجویز کا محرک اصل میں ایک شخص ابو عامر راہب خزرجی تھا۔ ہجرت سے پہلے اس نے نصرانی بن کر راہبانہ زندگی اختیار کر لی تھی۔ مدینہ اور اس کے پاس کے لوگ خصوصاً قبیلہ خزرج اس کے زہد و درویشی کے معتقد تھے اور بڑی تعظیم کرتے تھے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے قدوم میمنت لزوم سے جب مدینے میں ایمان وعرفان کا آفتاب چمکا تو اس طرح کے درویشوں کا بھرم کھلنے لگا۔ بھلا نور آفتاب کے سامنے چراغ مُردہ کو کون پوچھتا ہے؟ ابو عامر یہ دیکھ کر چراغ پا ہو گیا۔ حضورؐ نے اس کو اسلام کی دعوت دی اور فرمایا کہ میں ٹھیٹھ ملت ابراہیمی لے کر آیا ہوں کہنے لگا کہ میں پہلے سے اس پر قائم ہوں لیکن تم نے اپنی طرف سے ملت ابراہیمی میں اس کے خلاف چیزیں داخل کر دی ہیں حضور اقدس نے بہت زور سے اس کی تردید فرمائی آخر اس کی زبان سے نکلا کہ جو ہم میں سے جھوٹا ہو خدا اس کو وطن سے یکہ و تنہا غربت دے کسی کی موت مارے آپ نے فرمایا آمین اللہ سبحانہ ایسا ہی کرے جنگ بدر کے بعد جب اسلام کی جڑیں مضبوط ہو گئیں اور مسلمانوں کا عروج وفروغ حاسدوں کی نگاہوں کو خیرہ کرنے لگا۔ ابو عامر کو تاب نہ رہی بھاگ کر مکہ پہنچا تاکہ کفار مکہ کو حضور کے مقابلے کے لیے ابھارے چنانچہ معرکہ احد میں قریش کے ساتھ خود آیا۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے آگے بڑھ کر انصار مدینہ کو جو عہد جاہلیت میں اس کے بڑے معتقد تھے خطاب کر کے اپنی طرف مائل کرنا چاہا۔ احمق یہ نہ سمجھا کہ پیغمبرانہ تصرف کے سامنے اب وہ پرانا جادو کیسے چل سکتا ہے۔ آخر انصار نے جو اسے پہلے راہب کہہ کر پکارتے تھے جواب دیا او فاسق دشمن خدا تیری آنکھ خدا کبھی ٹھنڈی نہ

کرے کیا رسول خدا کے مقابلہ میں ہم تیرا ساتھ دیں گے ؟ انصار کا مایوس کن جواب سن کر کچھ حواس درست ہوتے اور غصہ میں آکر بولا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آئندہ جو قوم بھی تیرے مقابلہ کے لیے اٹھے گی۔ میں برابر اس کے ساتھ رہوں گا۔ چنانچہ جنگ حنین تک ہر معرکہ میں کفار کے ساتھ ہو کر مسلمانوں سے لڑتا رہا۔ احد میں اس کی شرارت سے حضور کو چشم زخم پہنچا۔ دونوں صفوں کے درمیان اس نے پوشیدہ طور پر کچھ گڑھے کھدوائے تھے اس چہرہ مبارک کے زخمی ہونے اور دندان مبارک کے شہید ہونے کا واقعہ پیش آیا۔

حنین کے بعد جب ابو عامر نے محسوس کر لیا کہ اب عرب کی کوئی طاقت اسلام کو کچلنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی تو بھاگ کر ملک شام چلا گیا اور منافقین مدینہ کو خط لکھا کہ میں قیصر روم سے مل کر ایک لشکر جرار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں لانے والا ہوں جو چشم زدن میں ان کے سارے منصوبے خاک میں ملا دے گا اور مسلمانوں کو بالکل پامال کر کے چھوڑے گا العیاذ باللہ تم فی الحال ایک عمارت مسجد کے نام سے بنالو جہاں نماز کے بہانے سے جمع ہو کر اسلام کے خلاف ہر قسم کے سازشی مشورے ہو سکیں اور قاصد تم کو دہیں میرے خطوط وغیرہ پہنچا دیا کرے اور میں بذات خود آؤں تو ایک موزوں جگہ ٹھہرنے اور ملنے کی ہو یہ خبیث مقاصد تھے جن کے لیے مسجد تعمیر ہوئی۔ اور حضور کے روبرو بہانہ یہ کیا کہ یا رسول اللہ ! خدا کی قسم ہماری نیت بری نہیں ہے بلکہ بارش اور سردی وغیرہ میں بالخصوص جاڑوں میں ناتوانوں اور ارباب حوائج کو مسجد قبا تک جانا دشوار ہوتا ہے اس لیے یہ مسجد بنالی گئی تاکہ نمازیوں کو سہولت ہو اور مسجد قبا میں جگہ کی تنگی کی شکایت نہ رہے۔ حضور اقدس ایک مرتبہ وہاں چل کر نماز پڑھ لیں تو ہمارے لیے موجب برکت وسعادت ہو۔ یہ اس لیے کہ حضور اقدس کا طرز عمل دیکھ کر کچھ سادہ دل مسلمان حسن ظن کی بنا پر ان کے جال میں پھنس جائیں اب اس وقت تبوک جانے کے لیے پا بر کاب تھے فرمایا اللہ نے چاہا تو واپسی پر ایسا ہو سکے گا جب حضور تبوک سے واپسی پر بالکل مدینہ کے قریب پہنچے تب جبرئیلؑ یہ آیات لے کر آئے جن میں منافقین کی ناپاک اغراض پر مطلع کر کے مسجد ضرار کا پول کھول دیا گیا آپ نے مالک بن دخشم اور معن بن عدی کو حکم دیا کہ اس مکان کو جس کا نام از راہ خداع وفریب مسجد رکھا ہے گرا کر پیوند زمین کر دو۔ انہوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور جلا کر خاک سیاہ کر دیا اس طرح منافقین اور ابو عامر فاسق کے سب ارمان دل کے دل میں رہ گئے اور ابو عامر اپنی دعا اور حضور اقدس کی آمین کے موافق مقام قنسرین ملک شام میں تنہا سخت بے کسی کی موت مرا فقطع دابر القوم الذین ظلموا الحمد للہ

رب العالمین آیت میں من حارب اللہ ورسولہ سے ابوعامر فاسق مراد ہے۔[۱]

آیت قرآنی کا انداز تعبیر خود بول رہا ہے کہ منافقین میں ایک گروہ منظم تھا جو اسلام کے خلاف سازشیں کر رہا تھا اور ایک شخص کی قیادت میں ان کی اجتماعی تنظیم تھی اور اس اجتماعی تنظیم کے کچھ خاص مقاصد تھے الذین اتخذوا سے ان کی اجتماعیت کی طرف اشارہ کیا ہے اور لمن حارب اللہ سے اس اجتماعیت کی قیادت کو ظاہر کیا ہے اور ضرار کفر، تفریق اور ارصاد لاکر اس اجتماعیت کے مقاصد بتائے ہیں۔ یہ مردم شماری کے مسلمان جنہوں نے دھوکہ دینے کے لیے مسلمانوں کا لباس پہنا ہوا تھا۔

تنظیم کے اراکین

ان کی تعداد شارحین قرآن نے بارہ بتائی ہے ان کے نام یہ ہیں۔

۱۔ حذام بن خالد
۲۔ معتب بن قشیر
۳۔ ابوحبیبہ ابن الازعر
۴۔ عباد بن عفیف
۵۔ جاریہ ابن عامر
۶۔ مجمع بن جاریہ
۷۔ زید بن جاریہ ابن عامر
۸۔ نبتل بن الحارث
۹۔ بجاد بن عثمان
۱۰۔ بحزج
۱۱۔ ودیعہ ابن ثابت
۱۲۔ ثعلبہ ابن حاطب

حافظ ابن کثیر نے یہی فہرست دی ہے لیکن حافظ ابن حزم نے ثعلبہ ابن حاطب کے متعلق

[۱] افادات شیخ الاسلام

تصریحاً لکھا ہے کہ ان کا نام اس فہرست میں شامل کرنا مناسب نہیں ہے وہ بدری ہیں۔[1]
مولانا عبدالروف مرحوم داناپوری نے اس کی تصدیق کی لیکن وہ لکھتے ہیں کہ یہ ثعلبہ بدری نہیں بلکہ دوسرا شخص ہے اصل شخص اور والد کے نام کی یکسانی کے باعث اشتباہ ہوا ثعلبہ ابن حاطب بدری جنگ احد میں شہید ہو گئے تھے۔[2] لیکن مجھے شہدائے احد کی کسی فہرست میں ثعلبہ کا نام نہیں ملا ہے اس فہرست کا پہلا شخص خذام بن خالد وہ ہے جس نے اپنے گھر سے زمین کا ایک ٹکڑا الگ کر کے مسجد کے لیے دیا گویا مسجد ضرار اس کے گھر کے پاس تھی۔ جاریہ ابن عامر کے دو بیٹے اصل کام میں شریک تھے مگر بعد میں انہوں نے عذر پیش کیا کہ وہ عمر میں چھوٹے تھے اور انہیں کچھ معلوم نہ تھا کیا ہو رہا ہے اور کس غرض سے ہو رہا ہے۔ باپ جو کچھ کرتا رہا ہم بھی حالت نادانی میں اس کے ساتھ شامل رہے یہ عذر تسلیم کر لیا گیا زید ابن جاریہ مسجد ضرار کا امام تھا کیونکہ قرآن اچھا پڑھتا تھا مگر اس کا قصور معاف ہو گیا۔ زید بن جاریہ کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے مال میں سے حصہ دیا تھا اور اس نے جنگ صفین میں حضرت علی کا ساتھ دیا تھا۔

تنظیم کے قائد

اس تنظیم کے قائد کے بارے میں آپ پہلے کچھ اشارات پڑھ چکے ہیں یہ شخص قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتا تھا۔ اسی کی قیادت میں مسجد ضرار کا منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔ بہ ظہور اسلام سے پیشتر ہی عیسائی ہو چکا تھا جب حضور اقدس مدینہ تشریف لائے تو کلمہ اسلام کا عروج اس پر شاق گذرا اور اسلام کے خلاف سازشوں میں سرگرم ہو گیا۔ پہلے قریش مکہ کا ساتھ دیا پھر شہنشاہ روم کے پاس پہنچا اور اسے مسلمانوں پر حملے کی ترغیب دی قبا کے کچھ منافقین میں اور اس میں پرانی راہ و رسم تھی۔ یہ انہیں اسلام کے خلاف اکساتا رہتا اور رومیوں کے حملے کا یقین دلاتا آیت میں من حارب اللہ و رسولہ سے اس گروہ کا یہی قائد مراد ہے۔

تنظیم کے مقاصد

آیئے اب اس منافقانہ تنظیم کے مقاصد جو قرآن نے اس آیت میں بتائے ہیں وہ بھی پڑھ لیجیے۔

---

[1] جوامع السیرۃ
[2] اصح السیر

اس تنظیم کے پیش نظر مسجد بنانے سے یہ مقاصد تھے۔

اضرار۔ یہ باب مفاعلت کا مصدر ہے اس کے معنی نقصان پہنچانے کے ہیں علامہ آلوسی لکھتے ہیں والضرار طلب الضرر و محاد ﷲ یعنی اسلام کے مقاصد اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے مطلب یہ ہے کہ ان کا مقصد مسجد بنانے سے قبا کے مسلمانوں کو نقصان پہنچانا ہے کیونکہ مسجد قبا کی وجہ سے مسلمانوں کو ایک خاص عزت حاصل ہو گئی ہے۔ یہ حسد و عناد سے چاہتے ہیں، کہ ان کی یہ خصوصیت باقی نہ رہے۔ یہاں ضرار کا متعلق محذوف یعنی ضرارا بالمسجد اور مسجد کا خود ضرار مقصود نہیں بلکہ مسجد والوں کا ضرار مراد ہے اس سے بطور عبارۃ النص یہ بات تو واضح طور پر معلوم ہو رہی ہے کہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانا حرام ہے۔ چاہے اس مکروہ عزم پر ریا و منافقت کا پردہ اس خوش اسلوبی سے تانا گیا ہو کہ کسی کو اول نظر میں اصل معاملے کی تحقیق و تفتیش کا خیال ہی نہ آئے اور اشارۃ النص سے یہ بات بھی معلوم ہو رہی ہے کہ مسجد کے قرب و جوار میں کمہار کی بھٹی کا ہونا، نائی کے حمام کا ہونا، گندم کا بیدر ہونا اور کنارہ وغیرہ ہونا بھی ناجائز ہے کیونکہ یہ بھی مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہے مولانا آزاد رحمہ اللہ نے یہاں یہ بات خوب لکھی ہے کہ قریب اگر مسجد موجود ہو تو بلاضرورت دوسری مسجد اس کے قریب محض پہلی مسجد والوں کو نقصان پہنچانے کے لیے تعمیر کرنا ناجائز ہے اس سے مسلمانوں کی اجتماعیت کو نقصان پہنچتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام ائمہ اعلام کا اس پر اتفاق ہے کہ ہر شہر میں جمعہ کی جماعت ایک ہونی چاہیے ہاں اگر آبادی اتنی زیادہ ہو جائے کہ ایک جگہ کافی نہ ہو تو بقدر ضرورت ایک سے زیادہ مساجد میں جمعہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ کفر یہ منافقین کی تعمیر مسجد کا دوسرا مقصد یہ ہے کفر کے مقاصد کے پورے ہوں یعنی اپنی ایک الگ مسجد بنائی جائے گی تو مسجد قبا میں جانے کی ضرورت باقی نہ رہے گی اور اس طرح نماز چھوڑنے کا موقع مل جائے گا کیونکہ لوگ سمجھیں گے کہ انہوں نے اپنی مسجد میں نماز پڑھ لی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ترک صلاۃ کی حالت بھی ایک ایسی حالت ہے جسے قرآن کفر کی حالت سے تعبیر کرتا ہے نیز معلوم ہوا کہ نیک کاموں کا نیک ہونا مقصد و نیت پر موقوف ہے ورنہ مسجد بنانے جیسا نیک کام بھی کفر کے لیے ہو سکتا ہے۔

ایک معنی شارحین قرآن نے یہ بھی بتائے ہیں کہ ان کے اس عمل کے منشا کفر کو طاقت ور بنانا ہے یعنی خود مسجد کو بنانا تو کفر نہیں ہے لیکن ان کا یہ کردار اپنے اندرونی کفر کو طاقتور بنانے کے لیے۔ بہرحال خود کفر ہو یا کفر کو طاقتور بنانا ہو حاصل دونوں کا ایک ہے اور قرطبی نے علامہ ابن العربی سے

نقل کیا ہے کہ چونکہ ان کے ذہن میں اس کردار سے مسجد قبا اور مسجد نبوی کا کوئی احترام باقی نہیں رہا تھا۔ اس لیے وہ اس اعتقاد کی وجہ سے راہ کفر اختیار کر رہی ہے۔

۳۔ تفریق بین المومنین مسجد بنانے سے ان کا ایک مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں تفرقہ ڈالا جائے کیونکہ قبا کی تمام آبادی ایک ہی مسجد میں نماز پڑھتی تھی اب بالکل اس کے پاس دوسری مسجد بنے گی تو جماعت بٹ جائے گی کچھ لوگ پہلی مسجد میں جائیں گے اور کچھ نئی میں اور جب ایک جماعت نہ رہی تو مسلمانوں کے باہمی اجتماع و تعارف کا وہ مقصد بھی فوت ہو گیا جو قیام جماعت کے ایک اہم مقاصد میں سے ہے۔ قرطبی نے یہاں یہ لطیف نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ یہ اس بات کی واضح اور صاف دلیل ہے کہ مساجد میں اجتماع سے بلند ترین مقصد دلوں میں ہم آہنگی اور طاعت پر اتحاد ہے اس سے دلوں میں محبت ہو گی۔

اس آیت سے امام مالک نے یہ بات خوب سمجھی ہے کہ ایک مسجد میں دو اماموں کی اقتدا میں دو جماعتیں الگ الگ نہ کی جائیں۔ اگرچہ دوسرے علما کو امام مالک کے اس نقطہ نظر سے اتفاق نہیں ہے۔

علامہ بقاعی نے تفریق بین المومنین کا یہ مطلب بتایا ہے کہ وہ یہ مسجد تعمیر کر کے مسلمانوں کی اجتماعیت کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں اور دھوکہ سے مسلمانوں کو اصل مسجد سے ہٹا رہے ہیں یہی مسلمانوں میں تفریق ڈالنا ہے۔

۴۔ اللہ و رسول سے محاربہ کے لیے کمین گاہ بنانا اس مسجد کی تعمیر کا بنیادی مقصد ہے۔ ان منافقین کے متعلق یہ بات پہلے واضح ہو چکی ہے کہ ان کی تمام ہمدردیاں اسلام سے برسرپیکار طاقتوں کے ساتھ تھیں یہ رات دن ان ہی کی کامیابی کے متمنی رہے اور مسلمانوں کے اندر ان کے ہی ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتے تھے اس مرحلے میں آکر انھوں نے یہ سوچا کہ مسجد کے نام سے ایک اڈا بھی بنایا جائے تاکہ ان کی معاندانہ سرگرمیوں پر پردہ بھی پڑا رہے اور اس پردے میں وہ مسلمانوں کے عین مرکز میں بیٹھ کر اسلام کے دشمنوں کے لیے ایک کمین گاہ بھی فراہم کر دیں۔

بہرحال مسجد کی تعمیر انھوں نے ان گھناونے اور گندے مقاصد کے لیے کی تھی اس سے یہ بات پوری وضاحت سے سامنے آئی ہے کہ کام خواہ کتنا ہی اچھا ہو اور خواہ وہ کتنی بڑی نیکی ہو اگر اسے برے مقاصد کے لیے کیا جائے تو وہ نیکی نیکی نہیں برائی بن جاتی ہے اور اس کا استیصال اسلامی حکومت کے فرائض میں داخل ہے کیونکہ نیک اعمال کے نیک ہونے کا مدار نیت پر ہے۔ اگر نیت اور مقصد غلط ہے تو وہ نیکی خود نیکی نہیں رہے گی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد میں اسی کی طرف

رہنمائی ہے۔

ابوبکر الجصاص نے یہیں سے یہ نکتہ نکالا ہے کہ کام برا چھے اور برے ہونے کا حکم کام کے مقصد اور کام کرنے والے کے ارادے کے لحاظ سے لگایا جائے اور علامہ قرطبی نے بھی الجصاص کی یہ کہہ کر رہنمائی کی ہے الا فعال مختلف بالمقصود والارادات۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد کے ذریعے بھی یہی رہنمائی فرمائی ہے۔

انما الاعمال بالنیات و لکل امری مانوی

اعمال کا دارو مدار مقاصد پر ہے۔ ہر آدمی کے عمل کا مقصد سے تعلق ہے۔

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے شارحین حدیث کام میں نیت ہونے یا نہ ہونے کی بحث میں الجھ کر رہ گئے یعنی کام میں نیت ہو تو عمل ہے اور نیت نہ ہو تو عمل نہیں ہے۔ شارحین حدیث میں علامہ طیبی کی ژرف نگاہی نے اس الجھاؤ کو یہ کہہ کر ختم کیا۔

"میری رائے یہ ہے واقعی علم تو اللہ ہی کو ہے حدیث میں الاعمال اور النیات دونوں پر لام استغراق ہے"۔

اس لیے حدیث میں عمل کی ہر نوع ہر جنس اور ہر قسم مراد ہے دراصل ارشاد نبوت کے ذریعے جو بات امت کو بتائی جارہی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ نیت ہو تو عمل ہوتا ہے نیت نہ ہو تو عمل نہیں ہوتا۔ یہ تو عمل کی خود لغوی حقیقت ہے اور معلوم ہے کہ نبوت کی ذات گرامی مدلولات لغوی بتانے نہیں آئی ہے بلکہ شرعی حقائق سمجھانے کے لیے آئی ہے۔ اور پھر از روئے بلاغت ان معنی کے ساتھ بات بے جان ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہاں جملہ کی پیشانی پر انما لگا ہوا ہے جس کا کام ہی یہ ہے کہ خطا و صواب اور درست و نادرست اگر ملے جلے ہوں تو ان کو نکھار دے۔ اگر عمل میں ارادہ و نیت خود لغوی حقیقت ہے تو پھر انما کا استعمال بے معنی ہے یہ تو ایک زبان دان سے توقع نہیں ہو سکتی من کان عارفا باللغۃ لا یخطئی فی استعمال اللغۃ اور معاذ اللہ ثم معاذ اللہ حضور اقدس کی ذات گرامی۔

حافظ ابن رجب حنبلی فرماتے ہیں کہ انما لکل امری مانوی میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم حکم شرعی بتارہے ہیں یعنی یہ کہ عامل کا اپنے عمل میں نیت ایک مستقل حصہ ہے اگر نیت اچھی ہو تو عمل صالح ہے اور اللہ کے یہاں مقبول ہے اور اگر نیت بد ہو تو عمل عمل فاسد ہے اور مقبول ہونے کی جگہ خود وبال جان اور سامان عذاب ہے۔ اس لیے نہ تو بے نیت عمل سے بحث ارشاد نبوت کا

منشا ہے اور نہ ہی عبادات میں شرط بتانا اس کا مقصود ہے۔ بلکہ منشا رنبوت صرف یہ بتانا ہے کہ عمل صالح کے اچھا اور برُا ہونے کا اصلی معیار مالوی ہے۔ اگر کام سے مقصود رضائے الہی ہے تو عمل عمل صالح ہے اور اگر غرض فاسد ہے تو عمل عمل صالح نہیں ہے۔ پیش نظر آیت میں مسجد کی تعمیر سے مقصود اگر اللہ کی رضا ہوتی تو وہ مسجد پیمانہ تقویٰ ہوتی۔ چونکہ بنانے والوں کی نیت مقصد اور غرض مسجد کی تعمیر سے ضرارہ تفریق بین المومنین ارصاد لمن حارب اللہ ورسولہ تھا اس لیے مسجد نیک کام ہونے کے باوجود نیت اور غرض فاسد کی وجہ سے عمل فاسد ہو کر رہ گئی اور اس غرض فاسد کی وجہ سے نبوت نے اس مسجد کو مسمار کرنے کا حکم دیا۔

ارشاد نبوت کی اسی معنویت کی وجہ سے حضرت امام بخاریؒ الجامع الصحیح کے آغاز میں لے کر آئے ہیں اور اپنے مخاطبوں کے ذہن میں یہ بات اتارنا چاہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی جانب سے جو فرائض، جو اوامر اور جو نواہی لے کر آئے وہ اعمال کے مظاہر ہیں۔ مظاہر کا کوئی مقام نہیں اور اللہ کے یہاں مقبول نہیں جب اعمال کے مظاہر درست ہونے کے ساتھ ان کے مصادر بھی درست نہ ہوں مصادر کی درستگی یہ ہے کہ رضائے الہی کے لیے ہوں اور مظاہر کی درستگی یہ ہے کہ نبوت کی رہنمائی اور اس کے پیش کردہ نمونہ کے مطابق ہوں مصادر کا کھوٹ اگر نفاق کہلاتا ہے تو مظاہر کی تبدیلی بدعت کہلاتی ہے۔ بہرحال قرآن کی آیت کا مدلول اور ارشاد نبوت کا منطوق دونوں میں ہم آہنگی ہے۔

اس کے بعد اللہ سبحانہ نے ان کے بارے میں یہ انکشاف فرمایا ہے کہ ولیحلفن ان اردنا الا الحسنی یہ مسجد تعمیر کرنے والے آپ کو قسمیں کھا کر بتائیں گے کہ اس کام سے ہماری نیت ہماری غرض اور ہمارا مقصد اس مسجد کی تعمیر سے صرف اچھائی تھی یعنی اس نام نہاد مسجد کی تعمیر سے مقاصد تو وہ پیش نظر ہیں جو پہلے واضح کر دیے لیکن یہ منافقین آپ کو قسمیں کھا کر اطمینان دلانے کی کوشش کریں گے کہ یہ کام انہوں نے محض اسلام اور مسلمانوں کی بہبود پیش نظر رکھ کر کیا ہے کہ عبادت کے لیے ایک مسجد کا اضافہ ہو جائے اللہ کی بندگی اور اس کے ذکر کا ایک گھر تعمیر ہو جائے جو مسلمان اندھیری راتوں یا سردی اور بارش میں مسجد قبا کی دوری کے سبب سے جماعت کی حاضری سے محروم رہ جاتے ہیں، ثواب جماعت سے محروم نہ رہیں فرمایا کہ یہ قسمیں کھا کر تمہیں یقین دلائیں گے لیکن اللہ کی گواہی یہ ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں۔ انہوں نے مسجد کو اپنے ناپاک عزائم اور مکروہ سازشوں کو کامیاب کرنے کے لیے نیکی کا یہ لبادہ اوڑھا ہے۔ ان کی ہی خصوصیت نہیں ہے ہر دور میں اپنے اغراض فاسدہ کو

حاصل کرنے کی خاطر اسی قسم کی ملمع کاری کرتے ہیں مقصد پیش نظر کفر کو پروان چڑھانا ہوتا ہے لیکن زبان پر اسلام قرآن ذات نبوت ہوتی ہے۔ دوسرے پارے میں آپ اسی طبقے کا بھرپور چہرہ دیکھ چکے ہیں اس کے لیے دوسری جلد میں آیت ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶ اور ان کے تشریحی نوٹ ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰ اور ۵۹۱ ضرور پڑھیے۔

مسجد کی بنیاد تقویٰ پر

۱۳۱۱ اے اللہ کے رسول تم اس مسجد میں کبھی کھڑے نہ ہونا وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے اس کی حقدار ہے کہ آپ اس میں قیام کریں۔ اس میں ایسے لوگ آتے ہیں جو پسند کرتے ہیں پاک وصاف رہنے کو اللہ سبحانہ پاک وصاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے یعنی اس مسجد میں جس کی بنیاد محض ضد کفر نفاق عداوت اسلام اور خدا و رسول کی مخالفت پر رکھی گئی ہے۔ اب کبھی نماز کے لیے کھڑے نہ ہوں۔ آپ کی نماز کے لائق وہ مسجد ہے جس کی بنیاد اول دن سے تقویٰ پرہیزگاری پر قائم ہوئی (خواہ مسجد قبا ہو یا مسجد نبوی) اس کے نمازی گناہوں اور شرارتوں اور ہر قسم کی نجاستوں سے اپنا ظاہر و باطن پاک وصاف رکھنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ اسی لیے خدائے پاک ان کو محبوب رکھتا ہے حدیث میں ہے کہ حضور نے اہل قبا سے دریافت کیا کہ تم طہارت و پاکیزگی کا کیا خاص اہتمام کرتے ہو جو حق تعالیٰ نے تمہاری تطہیر کی مدح فرمائی۔ انہوں نے کہا کہ ہم پانی سے استنجا کرتے ہیں یعنی عام طہارت ظاہری و باطنی کے علاوہ وہ لوگ اس چیز کا معتاد سے زیادہ اہتمام کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آیت میں مسجد قبا کا ذکر ہے لیکن بعض روایات صریح ہیں کہ مسجد اسس علی التقوی سے مسجد نبوی مراد ہے۔ علماء نے اس پر بہت کچھ کلام کیا ہے ہم نے شرح مسلم میں اس کے متعلق اپنا ناقص خیال ظاہر کر دیا ہے اور روایات میں تطبیق دی ہے یہاں اس کے بیان کا موقع نہیں ہے[۱]

اس آیت میں چند باتیں تشریح طلب ہیں۔

اول یہ کہ مسجد اسس علی التقوی سے کون سی مسجد مراد ہے مسجد قبا یا مسجد نبوی۔ قرآن کا سیاق اور واقعہ کی روداد تو یہی بتا رہی ہے کہ مسجد قبا مراد ہے کیونکہ مسجد قبا ہی کے مقابلے میں قبا میں ابوعامر نے اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کی خاطر مسجد تعمیر کی تھی۔ اسی مسجد سے مسلمانوں کو دور رکھنے کے لیے منافقین نے

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

یہ بہانہ سازی کی تھی کہ بارش وغیرہ کے دنوں میں یہاں آتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے۔ مسجد قبا ہی میں نماز کو عمرے کے برابر بتایا گیا ہے۔ یہی عبداللہ بن عباس، امام ضحاک اور الحسن کی رائے ہے۔ امام شعبی اور امام بخاری کا یہی مختار ہے۔ یہی بات من اول یوم کے مطابق ہے۔ ہجرت کے موقعہ پر پہلا روز تشریف آوری کا قبا ہی میں ہے۔ ارباب تاریخ وسیر نے اس موقعہ پر قبا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام کی مدت صرف چار روز بتائی ہے۔ آپ دوشنبہ کو بعد دوپہر پہنچے تھے۔ ۸ ربیع الاول سہ شنبہ چہارشنبہ اور پنجشنبہ گذار کر جمعہ ۱۲ ربیع الاول مطابق ۲۴ ستمبر ۶۲۲ء کو وہاں سے روانہ ہوگئے صحیح بخاری میں قیام کی مدت اس روز سے کچھ زیادہ بتائی گئی ہے (بضع عشرۃ لیلۃ) چونکہ اس روایت کے مطابق بھی روانگی جمعہ کے دن ہوئی اس لیے کل مدت بارہ روز تھی۔ دوران قیام قبا میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے مسجد کی تعمیر کا انتظام فرمایا۔ تکمیل ہجرت کے بعد یہ پہلی مسجد تھی جس کی بنیاد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دست مبارک سے رکھی۔ اس مسجد کی عمارت بالکل سادہ تھی اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس اس میں شریک رہے ۱۲ ربیع الاول کو بروز جمعہ آپ دوپہر سے پہلے قبا سے روانہ ہوئے۔

تاریخ اسلام میں پہلا جمعہ

بنی سالم بن عوف کے محلہ میں پہنچے تو نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی جگہ جمعہ کی نماز پڑھی۔ اس موقعہ پر آپ نے خطبہ دیا۔

حمد وستائش صرف خدا کے لیے ہے میں اسی کی حمد کرتا ہوں اسی سے مدد مانگتا ہوں، اسی سے بخشش اور ہدایت کا طلبگار ہوں میرا ایمان اسی پر ہے میں اس کی نافرمانی نہیں کرتا۔ اس کی نافرمانی کرنے والوں سے میری عداوت ہے میں گواہی دیتا ہوں کہ اس کے سوا عبادت کے کوئی لائق نہیں ہے وہ یگانہ ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے محمد اس کا بندہ اور رسول ہے۔ اللہ نے محمد کو ہدایت اور نور وموعظت دے کر روانہ کیا ہے اور ایسے وقت میں روانہ کیا ہے جب کہ مدتوں سے کوئی رسول دنیا میں نہیں آیا ہے، علم میں کمی ہے گمراہی بڑھ گئی ہے اسے آخری زمانے میں قیامت کے قریب اور اجل موعود کے نزدیک روانہ کیا ہے جس نے اللہ ورسول کی اطاعت کی وہی کامیاب ہے اور جس نے ان کی نافرمانی کی وہ راستہ سے بھٹکا ہوا ہے میں تمہیں

اللہ سے ڈر کی وصیت کرتا ہوں۔ بہترین نصیحت جو ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو کر سکتا ہے یہی ہے کہ اسے آخرت کی زندگی کی ترغیب دے اور اللہ سے ڈرنے کو بتائے لوگو! جن باتوں سے خدا نے دور رہنے کا حکم دیا ہے ان سے بچو نہ اس سے بڑھ کر کوئی نصیحت ہے اور نہ اس سے بڑھ کر کوئی ذکر ہے آخرت والے کاموں میں جس کا دل اللہ کے خوف سے معمور ہو تقوی اس کے لیے بہترین مددگار ہے۔ اور جب کوئی شخص خلوص نیت سے خدا اور اپنے درمیان معاملات کو درست کرے گا معاملات کھلے ہوں یا پوشیدہ تو ایسا کرنا اس کے لیے ذخیرے کا کام دے گا جو انسان کو اس وقت کام دے گا جب اسے اعمال کی ضرورت پیش آئے گی اپنا اپنا کام کرو اللہ کے حقوق میں فروگذاشت نہ ہونے دو اس نے تمہیں اپنی کتاب سکھائی ہے، اپنا راستہ بتایا ہے تاکہ سچے اور جھوٹوں میں امتیاز ہو جائے۔ تم بھی اللہ سے اپنے اعمال میں حسن کار بنکر رہو جیسے اس نے تمہارے ساتھ حسن کاری کی ہے۔ سب کچھ اللہ کی مدد سے ہوا اللہ کو بہت یاد کرو۔"

یہ ہے بنی عمرو بن عوف میں جمعہ کا خطبہ ۔ نماز جمعہ سے فراغت ہوئی تو آپ مدینہ طیبہ کی طرف روانہ ہوئے۔

اگرچہ کچھ لوگوں نے صحیح مسلم کی حدیث کی وجہ سے لمسجد اسس علی التقوی کا مصداق مسجد نبوی کو قرار دیا ہے۔ حدیث یہ ہے کہ

"دو شخصوں کا اس موضوع پر اختلاف ہو گیا کہ وہ مسجد کونسی ہے جو اسس علی التقوی کا مصداق ہے ایک نے کہا قبا کی مسجد ہے دوسرا بولا کہ مسجد نبوی ہے۔ دونوں خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور آپ سے دریافت کیا حضور نے فرمایا کہ وہ مسجد میری ہے۔"

روایت سہل بن سعد الساعدی کے حوالہ سے آئی ہے۔ اسی قسم کی روایت سعید بن ابی سعید الخدری سے متعدد طرق سے آئی ہے۔ اس لیے کچھ بزرگوں نے مسجد نبوی کو اس کا مصداق بتایا ہے لیکن میری ناقص رائے میں دونوں میں تضاد نہیں ہے۔ واقعی اور اصلی مصداق تو مسجد قبا ہی ہے وجود کے لحاظ سے اولیت اسی کو حاصل ہے قرآن کا سیاق و لحاق اسی کے موافق ہے انہ الا وفق بالسباق واللحاق اور جیسا کہ حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے و السیاق انما هو فی مسجد قبا ارشاد نبوت

کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آیت کا مصداق مسجد قبا نہیں بلکہ میری یہ مسجد ہے منشاء نبوت یہ ہے کہ سائل کے ذہن میں پیدا شدہ خیال کا جواب دیا ہے پوچھنے والے کا ذہن یہ تھا کہ تاسس علی التقوی کی صفت صرف مسجد قبا سے مخصوص ہے۔ حضور نے اسی ذہن کو پڑھ کر جواب دیا ہے کہ میری مسجد بھی اس صفت سے موصوف ہے یہ صرف قبا ہی کی صفت نہیں ہے۔ الشریف السمہودی اور ابو القاسم سہیلی کا یہی موقف ہے اگرچہ علامہ آلوسی کو الفاظ روایت میں اس کی ہمنوائی نہ ہونے کی شکایت ہے۔ مگر ہمنوائی نہ ہونے کی شکایت کا وزن اس وقت ممکن ہے جب کہ حدیث میں روایت بالفظ ہو۔ احادیث کا بیشتر ذخیرہ روایت بالمعنے ہے۔

اسلام میں سنہ ہجری کا آغاز

اسلام کے ظہور سے پہلے دنیا کی متمدن قوموں میں متعدد سنہ جاری تھے۔ زیادہ مشہور یہودی، رومی اور ایرانی سنہ تھے عرب جاہلیت کی زندگی اس قدر متمدن نہیں تھی کہ حساب و کتاب کی کسی وسیع پیمانے کی ضرورت ہوتی۔ اوقات شناسی اور موسموں کی حفاظت کے لیے ملک کا کوئی مشہور واقعہ لے لیتے۔ اس سے وقت کا حساب لگا لیتے جیسا کہ عام الفیل ہے یعنی شاہ حبشہ کے عرب پر حملہ کرنے کا سال عرصہ تک یہی واقعہ عرب کے حساب و کتاب میں بطور سنہ کے استعمال ہوتا رہا ظہور اسلام کے بعد سے صحابہ کی عام عادت یہ ہو گئی تھی کہ زمانہ اسلام کے واقعات میں سے کوئی اہم واقعہ لے لیتے اور اسی سے حساب لگاتے کچھ عرصہ تک اجازت قتال کا سنہ استعمال ہوتا رہا لوگ اسے سنہ اذن بولتے۔ اسی طرح سورہ برارت کے نزول کے بعد بول چال میں سنہ برات کا بھی رواج رہا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری حج سے سنۃ الوداع بولا جانے لگا۔ بعض روایات سے اس طرح کے متعدد سنوں کا پتہ چلتا ہے مثلاً سنۃ التمحیص، سنۃ الترفئہ سنۃ الزلزال، سنۃ الاستیناس۔ بیرونی نے الآثار الباقیہ میں اس طرح کے متعدد سنوں کا ذکر کیا ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال مبارک کے بعد کچھ عرصے تک یہی حالت جاری رہی حضرت عمر کی خلافت کا زمانہ آیا تو دفاتر حکومت کے قیام سے حساب و کتاب کے معاملات زیادہ وسیع ہوئے اور ضرورت پیش آئی کہ سرکاری طور پر ایک قومی سنہ مقرر کیا جائے چنانچہ اس معاملے پر غور کیا گیا اور سنہ ہجری کا تقرر عمل میں آیا۔ اس وقت تک واقعہ ہجرت کے سولہ سال گذر چکے تھے۔ سنہ ہجری کا تقرر عمل میں آیا تو کیوں حضرت عمر اور تمام صحابہ کرام کا ذہن اس طرف گیا کہ

اسلامی سنہ کی ابتدا واقعہ ہجرت سے کی جائے یہ تاریخ اسلام کی ایک ضروری اور نتیجہ خیز بحث ہے۔
اس پر دسویں جلد سورہ برات کے تشریحی نوٹ نمبر ۲۴ میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ تکرار سے بچتے ہوئے ہم
یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ان کا یہ فیصلہ کہ سال کا آغاز ہجرت سے کیا جائے کیوں ہوا۔

اصل یہ ہے کہ نبوت کی تعلیم و تربیت نے صحابہ کرام کا ذہن جس سانچے ڈھال دیا تھا وہ
ایسا سانچہ تھا جس میں قرآن و سنت سے ہٹ کر دوسرے درجہ کا خیال ہی نہ آسکتا تھا۔ بہت
ممکن ہے دنیا کے تمدنی علوم و فنون رائج نہ ہونے کی وجہ سے وہ کوئی بات علمی طریقوں اور مصطلح
زبان میں ادا نہ کر سکتے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض اوقات وہ ایک بات کی علت اس شکل و صورت
میں نہ دیکھتے ہوں جس صورت میں آج دنیا دیکھ رہی ہے لیکن ان کی طبیعت کی افتاد اور ذہنیت
کی روش کچھ اس طرح بن گئی تھی کہ جب کسی معاملہ پر سوچ وچار کرتے تو ارادی اور غیر ارادی طور پر ذہن
اسی طرف جاتا جو قرآن کے روح سے موافقت رکھتا اور جو علم وحکمت کے لیے بہتر سے بہتر اور بلند
سے بلند پہلو ہو سکتا ہے۔ ہجرت سے سال مقرر کرنے میں بھی ان کا فیصلہ قرآن کی روح کے موافق
تھا۔ حافظ ابوالقاسم السہیلی نے الروض الانف میں جو بات لکھی ہے اور جسے علامہ خفاجی نے عنایۃ
القاضی میں نقل کیا ہے وہ اس قابل ہے کہ ہدیہ ناظرین کی جائے۔

اس آیت لمسجد اسس علی التقوی من اول یوم میں فقہ یہ ہے کہ ہجرت
سے سال کا آغاز کرنے کے موضوع پر صحابہ کرام کے موقف کی صحت واضح اور صاف
معلوم ہو رہی ہے حضرت عمر نے صحابہ کرام سے تاریخی سنہ کے بارے میں مشورہ
کیا فیصلہ یہ ہوا کہ ہجرت سے تاریخ کا آغاز ہو کیونکہ ہجرت ہی سے اسلام معزز ہوا
یہی وہ وقت ہے جس میں حضور اقدس کو ان سے دوچار ہوئے مسجدیں بنائی گئیں
اللہ کی پسند کے مطابق اللہ کی عبادت کا نظام قائم ہوا صحابہ کا یہ فیصلہ ظاہر قرآن
من اول یوم کے موافق ہے اور ہمیں ان کے بھی فیصلہ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے
کہ ان کو یہ رہنمائی ملی ہے کہ سال تاریخ کے تقرر میں روز اول ہی ہے۔ اگر صحابہ
نے اسی آیت کی روح کی روشنی میں یہ زریں فیصلہ کیا ہے تو اس پر کوئی حیرانی کی
بات نہیں وہ کتاب اللہ کے سب سے بڑے عالم اور قرآن فہمی میں امت کے
رہنما ہیں اور اگر انہوں نے یہ فیصلہ رائے سے کیا ہے تو یہ اللہ کا انعام
ہے کہ ان کے اجتہاد کا رخ اللہ سبحانہ نے قرآن کی طرف کر دیا ہے۔ جب بھی کوئی

کہے گا خلقۃ اول یوم تو اس سے ہر سمجھ دار کا ذہن مقرر سال مقرر ماہ اور مقرر تاریخ کی طرف جائے گا۔"

غرض فاسد پر مبنی عمل کی تمثیل

۱۰۹ کیا وہ شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ کے ڈر اور اس کی رضا پر رکھی ہو یا وہ شخص بہتر ہے جس نے عمارت کی بنیاد ایک کھائی کے گرے ہوئے کنارے پر رکھی ہو۔ اس کے نتیجے میں وہ عمارت کے ساتھ جہنم کی آگ میں گر گیا ہو۔ اور اللہ سبحانہ ان کو راہ حق نہیں دکھاتا جو ظلم کا وطیرہ اپناتے ہیں یعنی جس کام کی بنیاد تقویٰ یقین و اخلاص اور خدا کی رضا جوئی پر ہو وہ نہایت مستحکم اور پائدار ہوتا ہے برخلاف اس کے کہ جس کام کی بنیاد شک و نفاق اور مکر و خداع پر ہو۔ بودے اور انجام بد کے لحاظ سے ایسا ہے جیسے کوئی عمارت ایک کھائی کے کنارے پر کھڑی کی جائے کہ ذرا زمین سرکی یا پانی کی تھپیڑ کنارے کو لگی۔ ساری عمارت دھڑام سے نیچے آرہی اور آخر کار دوزخ کے گڑھے میں جا پہنچی۔ اللہ ظالم کو راہ حق نہیں دکھاتا یعنی بظاہر کوئی نیک کام بھی کریں جیسے مسجد بنانا ظلم و ناانصافی کی شامت سے بن نہیں ٹھہرتا۔[1]

یہ تمثیل بیان ہوئی ہے ان لوگوں کی جو اپنے عمل کی بنیاد تقویٰ اور رضائے الہٰی کی جگہ کسی غرض فاسد پر رکھتے ہیں فرمایا کہ ان کی مثال ایسی کہ ایک شخص اپنی عمارت ایک کھوکھلی گرتی ہوئی لگر پر بنائے جو بالآخر اس کے ساتھ جہنم میں جا گرے۔ ثبات و قرار اور اخروی فوز و فلاح صرف اسی عمل کے حصے میں ہے جو اللہ کے احکام کے مطابق کیا جائے۔

یہ ایک بے نظیر تشبیہ ہے جس سے زیادہ بہتر طریقے پر اس صورت حال کی نقشہ کشی نہیں ہو سکتی۔ اس کی پوری معنویت کے لیے یوں سمجھئے کہ دنیوی زندگی کی وہ ظاہری سطح جس پر مومن و منافق صالح و فاسق غرض تمام انسان کام کرتے ہیں مٹی کی اس تہ کی مانند ہے جس پر دنیا میں ساری عمارتیں بنائی جاتی ہیں۔ یہ اپنے اندر کوئی خوبی نہیں رکھتی بلکہ اس کی خوبی کا دار و مدار اس پر ہے کہ اس کے نیچے ٹھوس زمین موجود ہو اگر کوئی عمارت ایسی ہو جس کے نیچے کی زمین کسی چیز مثلاً دریا کے پانی سے کٹ چکی ہو تو جو ناواقف انسان اس کی ظاہری حالت سے دھوکا کھا کر اس پر مکان بنالے اسے وہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس کے مکان سمیت لے بیٹھے گی اور وہ نہ صرف خود ہلاک ہوگا بلکہ اس ناپائیدار بنیاد پر اعتماد کرکے اپنا جو کچھ سرمایہ زندگی وہ اس عمارت میں جمع کرے گا وہ بھی برباد ہو جائے گا۔ بالکل اسی مثال کے مطابق حیات دنیا کی وہ ظاہری سطح بھی جس پر ہم سب اپنے کارنامہ زندگی کی عمارت اٹھاتے ہیں۔ بجائے خود کوئی ثبات و قرار نہیں رکھتی بلکہ اس کی مضبوطی اور پائیداری کا انحصار اس پر ہے کہ اس کے نیچے خدا کا خوف اس کے حضور جوابدہی کا احساس اور اس کی رضا کی اتباع کی ٹھوس چٹان موجود ہو۔ جو نادان آدمی صرف دنیوی زندگی کے ظاہری پہلو پر اعتماد کر لیتا ہے اور دنیا میں خدا سے بے خوف اور اس کی رضا سے بے پروا ہو کر کام کرتا ہے دراصل خود اپنی تعمیر زندگی کے نیچے سے اس کی بنیاد کو کھوکھلی کرتا ہے اور اس کا آخری انجام اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ یہ بے بنیاد سطح جس پر اس نے اپنی عمر کا سرمایہ عمل جمع کیا ہے ایک دن یکایک گر جائے اور اسے اس کے پورے سرمائے سمیت لے بیٹھے۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس کام کی ابتداء اللہ کی رضا جوئی اور اخلاص نیت سے کی جائے اسے پائداری نصیب ہوتی ہے اور اس میں برکت ہوتی ہے

امام رازی فرماتے ہیں کہ مجھے پوری کائنات میں اس سے بڑھ کر منافقوں کے حالات پر کوئی مثال نہیں ملی ہے جیسے یہ مومن مخلص اور منافق کے درمیان خط امتیاز واضح کر رہی ہے ایسے ہی مخلص اور منافق کے کردار کا بھی تقابلی مطالعہ پیش کر رہی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ قرآن یہ آیت بتا رہی ہے کہ کردار دو ہیں ایک کردار یہ ہے کہ بنانے والے نے عمارت بنائی ہے اس کے پیش نظر اللہ سبحانہ کی نافرمانی سے بچنا اور اللہ سبحانہ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ اس نے عمارت صرف اس لیے بنائی ہے کہ کفر کی بیخ کنی ہو اور اللہ راضی ہو۔

دوسرا کردار یہ ہے کہ عمارت بنائی ہے مگر عمارت کی بنیاد سر تا سر فساد پر ہے اس نے گہرے گڑھے کے بالکل کمزور کنارے پر عمارت کی بنیاد رکھی یعنی اس کی نسبت میں نفاق و معصیت ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلے شخص کی عمارت اچھی اور افضل ہوگی اور دوسرے کی عمارت کمزور، بودی اور گر جانے والی ہوگی۔ یہی حال مومن و منافق کے کردار کا ہے چونکہ مومن کا مسجد کے بنانے میں کردار خلوص پر مبنی ہے اس لیے افضل اور مقبول اور منافق کا مسجد بنانے میں کردار نفاق پر مبنی ہے گویا وہ دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر بنائی گئی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ دو عمارتیں ہیں ایک کی بنیاد تقوی و رضائے الہی پر ہے اور دوسری کی معصیت و کفر پر۔ پہلی معزز ہے اور باقی رکھنے کے قابل دوسری ذلیل اور گرا دینے کے لائق۔

یہاں علامہ خفاجی نے ایک لطیف نکتہ بلاغت پیش کیا ہے فرماتے ہیں کہ آیت میں اصلی تقابل یوں ہونا چاہیے تھا۔ افمن اسس بنیانہ علی تقوی من اللہ و رضوان ام من اسس بنیانہ علی الباطل لیکن اس انداز کو چھوڑ کر وہ انداز اختیار کیا ہے جو آپ قرآن میں پڑھ رہے ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ باطل کو ناپائیداری میں شفا جرف سے بطور استعارہ تشبیہ دی ہے۔ اور مسجد کی بنیاد کے لیے تقوی کنایہ ہے۔ اس طرح مومن کے کردار کے لیے کنایہ اور منافق کے کردار کے استعارہ لا کر حق بلاغت ادا کر دیا۔

اس آیت سے سرسری نہ گذر جائیے یہ آیت حق و باطل کی آویزش کے موضوع پر مہمات معارف میں سے ہے۔ علامہ مراغی لکھتے ہیں کہ ایمان اور اس کے لوازم میں ثبات و جماؤ ہوتا ہے جب کہ نفاق اور اس کے لوازم میں بے ثباتی اور ناپائیداری ہوتی ہے، ایمان حق ہے اور اپنے وجود کے لحاظ سے انسانیت کے لیے مفید اور نافع ہے جب کہ نفاق باطل ہے اور اپنے مفاسد کی وجہ سے معاشرے کے لیے ضرر رساں ہے۔ قانون اجتماع کی رو سے نافع کو بقا ہے جب کو فاسد کو فنا ہے۔ مسئلہ کتنا دقیق ہے لیکن قرآن نے اجتماعیات کے اس دقیق مسئلہ کو کیسے عامہ الورود مثال سے مخاطبوں کے ذہنوں کو جھنجوڑا ہے فرمایا جب عمارت بنتی ہے اور رہنے والوں کے لیئے قیام اور آسائش کا سامان ہونے لگتا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ ہر عمارت بنانے والا عمارت کے سخت زمین تلاش کرتا ہے اور سخت زمین میں گہری بنیاد کھود کر اس کو مضبوط بناتا ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرا شخص جو بغیر بنیاد کے نہر کے گرے ہوئے کنارے پر مکان تعمیر کرتا ہے۔ پہلا مکان قائم رہتا ہے دوسرا مکان ہوا کے جھونکے سے گر جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لیے کہ یہاں پائیداری کو بقا ہے ناپائیداری کو فنا ہے، جن کی نظریاتی اساس مضبوط نہیں ہوتی ہے محض وقتی طور پر جوش و ولولہ سے اجتماعی زندگی کا گھروندا بناتے ہیں وہ اس کے لائق ہے اور جن کی نظریاتی اساس مضبوط ہوتی ہے۔ اور اعمال و اخلاق صالحہ کی دیواریں کھڑی ہوتی ہیں تو یہ قائم رہتی ہے۔ اس سے لوگوں کا نفع ہوتا ہے۔

نفاق کا دائمی اثر

جو عمارت انہوں نے بنائی ہے وہ ان کے دلوں میں ہمیشہ شکوک و شبہات کی آبیاری کرتی رہے گی۔ مگر یہ ان کے دلوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت

والا ہے ریبہ کا ترجمہ کیا ہے شبہ جس سے مراد نفاق ہے یعنی اس عمل بد کا اثر یہ ہوا کہ ہمیشہ ان کے دلوں میں جب تک موت انہیں پارہ پارہ نہ کر ڈالے نفاق قائم رہے گا جیسے اس سورت میں پہلے گذر چکا ہے۔

فاعقبھم نفاقا فی قلوبھم الی یوم یلقونہ بما اخلفوا اللہ ما وعدوہ وبما کانوا یکذبون۔

بعد ازیں ان کے دلوں میں اس کے نتیجے میں نفاق دائمی ہو گیا اس دن تک کے لیے کہ وہ اللہ سے ملیں کیونکہ انہوں نے اللہ سے وعدہ کی خلاف ورزی کی اور کیونکہ ان کا کام جھوٹ بولنا تھا۔

بعض مترجمین نے ریبہ کا ترجمہ کھٹکا کئے ہیں یعنی جو عمارت انہوں نے ناپاک مقاصد کے لیے بنائی تھی مگر حق تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو مطلع کر کے ان تمام پلید مقاصد کا خاتمہ کر دیا اس کا خیال ان کے دلوں میں ہمیشہ کانٹا سا کھٹکتا رہے گا۔ الراجح عند السلف الاول کما حکی ابن کثیر[۱]

اس آیت کی تشریح میں شارحین قرآن کا کچھ اختلاف ہے۔

ایک تشریح تو وہ ہے جو مولانا عثمانی نے پیش کی ہے یہ حضرت عبداللہ بن عباس کی پیش کردہ تفسیر ہے یعنی وہ مسجد ضرار جو انہوں نے بنائی ہے مرتے دم تک ان کے دلوں کو نفاق کی آماجگاہ بنائے رکھے گی اور ان کے دلوں سے نفاق دور نہ ہو گا بغیر موت کے۔ قاضی بیضاوی نے اسی کو اپنایا ہے وہ فرماتے ہیں:

مطلب یہ ہے کہ ان کی یہ بنائی ہوئی عمارت ہمیشہ ان میں شکوک و شبہات کا سبب اور نفاق میں اضافہ ہی کرتی رہے گی۔

اس تشریح کا منشا یہ ہے کہ یہ نام نہاد مسجد بنا کر ان منافقین نے اپنے دلوں کے اندر نفاق کی جڑ اتنی مستحکم کر دی ہے کہ اب یہ ان کے دلوں کے ساتھ ہے ان کا نفاق اس طرح ایک ایک رگ میں جڑ پکڑ چکا ہے اب اس کو اکھاڑنا دلوں کے پاش پاش کئے بغیر ممکن نہیں ہے۔

دوسری تشریح یہ کی گئی ہے کہ جو عمارت انہوں نے بنائی ہے اس کا خیال ان کے دلوں میں ہمیشہ کانٹے کی طرح کھٹکتا رہے گا۔ یہ تفسیر بھی کچھ شارحین قرآن نے اختیار کی ہے۔ اردو

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

شارحین ہیں مولانا اشرف علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مفتی محمد شفیع صاحب لیجیے ہر ایک کی زبانی سن لیجئے۔

مولانا تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

اُن کی یہ عمارت یعنی مسجد جو انہوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان کے دلوں میں کانٹا سا کھٹکتی رہے گی کیونکہ جس غرض کیلئے مسجد بنائی وہ، پوری نہ ہوئی۔ اور قلعی کھل گئی سو الگ اور پھر اوپر سے منہدم کر دی گئی غرض کوئی ارمان نہ نکلا اس لیے ساری عمر اس کا افسوس اور ارمان باقی رہے گا۔" (بیان القرآن)

مفتی شفیع صاحب نے بھی یہی انداز اختیار کیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں :

جو عمارت انہوں نے بنائی تھی مسجد ضرار ہمیشہ ان کے دلوں کو شک وشبہ سے مضطرب رکھے گی یہ کانٹا نکلنے والا نہیں ہے مگر یہ کہ ان کے دلوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں کیونکہ یہ ان کے نفاق کی ایک بہت بڑی شرارت تھی جو چلی نہیں اس لیے ہمیشہ ان کی وجہ سے خوف وہراس کی حالت میں رہیں گے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اس تشریح کی سدی کی طرف نسبت کی ہے جب کہ حافظ ابن کثیر نے پہلی تشریح کی عبداللہ ابن عباس، مجاہد قتادہ، زید بن اسلم اسدی، حبیب بن ابی ثابت، ضحاک عبدالرحمٰن بن زید اور بے شمار علمائے سلف کی طرف کی ہے۔ پہلی تشریح ہی راجح ہے۔ اس کا لب لباب یہ ہے کہ ان منافقین نے مکر و دغا کے اتنے بڑے جرم کا ارتکاب کرکے اپنے دلوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایمان کی صلاحیت سے محروم کر لیا ہے اور بے ایمانی کا روگ اس طرح ان کے دلوں کے ریشے ریشے میں پیوست ہو گیا ہے کہ جب تک ان کے دل باقی ہیں یہ روگ ان میں موجود رہے ۔ اللہ سبحانہ سے کفر کرنے کے لیے جو شخص علانیہ بت خانہ بنائے اس کے دین سے لڑنے کے لیے کھلم کھلا مورچے اور دمدمے تیار کرے اس کی ہدایت تو کسی نہ کسی وقت ممکن ہے کیونکہ اس کے اندر راستبازی اخلاص اور اخلاقی جرات کا وہ جوہر تو بنیادی طور پر محفوظ رہتا ہے جو حق پرستی کے لیے بھی اسی طرح کام آسکتا ہے جس طرح باطل پرستی کے کام آتا ہے۔ لیکن جو بزدل جھوٹا اور مکار انسان کفر کے لیے مسجد بنائے اور خدا کے دین سے لڑنے کے لیے خدا پرستی کا پُر فریب لبادہ اوڑھے اس کی سیرت کو تو نفاق کی دیمک کھا چکی ہوتی ہے اس میں یہ طاقت کہاں رہتی ہے کہ مخلصانہ ایمان کا بوجھ اٹھا سکے۔

دوسرے معنی آیت کے جن بزرگوں نے اختیار کئے یعنی مسجد کی تعمیر کا خیال ان کے دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہے گا اس تشریح کے لیے معانی ومطالب کی چار صورتیں پیش کی ہیں ۔ علامہ آلوسی نے ان چار صوتوں کو نقل کیا ہے اور علامہ خفاجی عنایۃ القاضی میں اس کو نمایاں جگہ دی ہے۔

اول صورت یہ ہے کہ مسجد کی تعمیر سے منافقین کو بے پایاں خوشی ہوئی تھی لیکن جب ان کے سامنے مسجد کے گرانے کا حکم ہوا تو ان کو اس سے بے پایاں تکلیف ہوئی اور اس شدت احساس سے ان کی گھٹن اور جلن میں اضافہ ہوا اور حضور اقدس کی نبوت ان کے ذہنوں میں اور مشکوک ہوگئی ۔

دوسری صورت یہ ہے کہ جب مسجد کے گرانے کا حکم ہوا تو ان کو یہ خیال ہوا کہ یہ قدم ان کے خلاف اٹھایا گیا ہے اس کے معنے ہیں حضور اقدس سے اعتماد اٹھ گیا اور خوف میں اضافہ ہو گیا اپنا مستقبل اس کو مشکوک نظر آنے لگا کہ ان کو اپنے حال پر چھوڑا جائے گا یا اس کے نتیجے میں ان کو قتل کی سزا ملے گی ۔

تیسری صورت یہ ہے کہ وہ اپنے خیال میں مسجد بنانے میں حسن کار ہوں لیکن جب مسجد کے گرانے کا حکم ہوا تو وہ شک وشبہ کا شکار ہو کر رہ گئے کہ پتہ نہیں مسجد کیوں گرائی گئی ہے ۔

علامہ آلوسی نے پہلے کو صحیح قرار دیا ہے جب کہ علامہ طیبی دوسرے کو ترجیح دیتے ہیں ۔ خلاصہ یہ ہے کہ مسجد کا گرانا ہمیشہ ان کے دلوں کی بے چینی اور ان کے اندرونی اضطراب کا سامان بنا رہے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِى التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِىْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۱﴾

بلاشبہ اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں خرید لی ہیں اور ان کے مال بھی۔ اور اس قیمت پر خریدی ہیں کہ ان کے لیے جنّت ہو گی[1] وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں پس وہ قتل بھی کرتے ہیں اور ان کو قتل بھی کیا جاتا ہے۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے پکّا اس کے ذمہ ہے تورات و انجیل اور قرآن میں یہ وعدہ ہے[2] اور اللہ سے بڑھ کر اپنا عہد پورا کرنے والا کون ہے؟ لہذا مسلمانو! تم اپنے سودے پر جو تم نے اللہ سے کیا ہے خوشیاں مناؤ اور یاد رکھو یہی بڑی کامیابی ہے[3]

اسلامی زندگی میں ایمان کے تقاضے

ان آیات میں بتایا جا رہا ہے کہ دین کا اسلامی تصور اس راہبانہ طرز فکر کے بالکل منافی ہے جس میں محض عبادات ریاضات اور کشف و مراقبہ سے انسان اپنی شخصی نجات حاصل کرنا چاہتا ہے کیونکہ شخصی نجات کے حصول کا یہ طریقہ انسان کو کائنات خارجی میں تبدیل کرنے کی جدوجہد سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ لیکن اسلام انفس و آفاق دونوں کو مرضی الٰہی کے مطابق بدلنا چاہتا ہے کیونکہ ظاہر و باطن کائنات خارجی اور نفس انسانی دونوں ایک ہی اصل کی شاخیں ہیں جنہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور جب کسی ایک کو دوسرے سے جدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے نتیجہ ہمیشہ مہلک ہوتا ہے۔ انسان کے اخلاقی امراض اس کے نفس اور ماحول کے تعامل سے پیدا ہوتے ہیں نہ کہ ان میں سے کسی ایک سے۔ اس لیے صرف ایک کو چھیڑنے اور دوسرے سے تغافل برتنے سے اسباب مرض کبھی رفع نہیں ہو سکتے۔ جب کبھی انسان عبادات و ریاضات میں مشغول ہو کر خارجی ماحول میں تبدیلی کی ضرورت سے بے خبر ہو جاتا ہے اس کی سوسائٹی میں بداخلاقی، بدعملی کی وبا پھوٹ پڑتی ہے جس سے بالآخر وہ خود اپنا دامن محفوظ نہیں رکھ سکتا خواہ وہ راہبانہ اتقا اور زاہدانہ پارسائی سے کتنا ہی بلند ہو۔ اسی طرح جب وہ بیرونی دنیا پر نظر جما کر محض خارجی ماحول کی تبدیلی میں معاشرتی امراض کی دوا ڈھونڈتا ہے اور اپنی باطنی اخلاقی زندگی سے غفلت برتتا ہے۔ بدی کی قوتیں بالکل غیر محسوس طور پر اس کے نفس میں پرورش پاتی ہیں۔ بالآخر اپنے زور طاقت کے ساتھ خارج پر حملہ آور ہوتی ہیں یہاں تک اس کی معاشرت اس کی سیاست اور اس کی معیشت کا گوشہ گوشہ ان کے اثرات سے مغلوب ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام نے صرف عبادات و ریاضات پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اصلاح نفوس اور تزکیہ قلوب کے ساتھ کل نظام زندگی میں اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے اور جب کفار و مشرکین کی جانب سے مخالفت شروع ہوئی تو اسلام نے اجتماعی قوت سے ان کا مقابلہ کیا اور بتا دیا کہ اسلام صرف ایک نظری عقیدہ یا فلسفہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک عظیم الشان انقلابی قوت ہے جو اگر ایک طرف باطن میں نفس انسانی کی شرارتوں اور انسانی خواہشات کی بے قیدیوں کا مقابلہ کرتی ہے تو دوسری طرف ظاہر میں اپنی خارجی ماحول اور اپنی معاشرتی سیاسی اور عمرانی زندگی کے امراض و مفسدات سے آمادہ بپیکار رہتی ہیں۔

اسلام سے عہد وفاداری

[1] بلاشبہ اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں خرید لی ہیں اوران کے مال بھی اوراس قیمت پر خریدے ہیں کہ اس کے بدلے میں ان کے لیے جنت ہوگی۔ اس سے زیادہ سودمند تجارت اور عظیم الشان کامیابی کیا ہوگی کہ ہماری حقیر سی جانوں اور فانی اموال کا خداوند قدوس خریدار بنا ہماری جان و مال جو فی الحقیقت اسی کی مملوک ومخلوق ہے محض ادنی ملابست سے ہماری طرف نسبت کرکے "مبیع" قرار دیا جو "عقد بیع" میں مقصود بالذات ہوتی ہے اور جنت جیسے اعلی مقام کو اس کا عقد بیع بتلایا جو مبیع تک پہنچنے کا وسیلہ ہے۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں وہ نعمتیں ہوں گی جن کو نہ آنکھوں نے دیکھا اور کسی بشر کے قلب پر ان کی کیفیات کا خطور رہوا۔ اب خیال کرو کہ جان و مال جو برائے نام ہمارے کہلاتے ہیں انہیں جنت کا ثمن نہیں بتایا نہ یہ کہ حق تعالی بائع اور ہم مشتری ہوئے تعطف اور نوازش کی حد ہوگئی کہ اس حقیر سی چیز کے (حالانکہ وہ بھی فی الحقیقت اسی کی ہے) معاوضہ میں جنت جیسی لازوال اور قیمتی چیز کو ہمارے لیے مخصوص کردیا جیساکہ بالجنہ کی جگہ بان لھم الجنہ فرمانے سے ظاہر ہوتا ہے۔

نیم جان بستاند و صد جان دہد　　　انچہ در وہمت بناید آں دہد

پھر یہ نہیں کہ ہمارے جان و مال خرید لیے گئے تو فوراً ہمارے قبضہ سے نکال لیے جائیں صرف اس قدر مطلوب ہے کہ جب موقع پیش آئے جان و مال اللہ سبحانہ کے راستے میں پیش کرنے کے لیے تیار رہیں دینے سے بخل نہ کریں خواہ وہ لیں یا نہ لیں اسی کے پاس چھوڑے رکھیں [1]

اس ارشاد میں حب ایمانی کی حقیقت واضح کی ہے فرمایا جو لوگ اللہ پر ایمان لائے تو ایمان کا معاملہ یوں سمجھو کہ انہوں نے سب کچھ اللہ کے ہاتھ بیچ ڈالا جان بھی اور مال و متاع بھی۔ اب ان کی کوئی چیز ان کی نہیں رہی۔ اللہ اور اس کی سچائی ہوگئی۔

بندگان تو کہ در عشق خداوندانند
دوجہاں را بہ تمنائے تو بفروختہ اند

اور پھر اللہ کی طرف سے اس کے معاوضہ میں کیا ہوا یہ ہوا کہ نعیم ابدی کی کامرانیاں انہیں عطا فرمائیں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یہ گویا خرید و فروخت کا ایک معاملہ تھا جو اللہ سبحانہ اور عشاق حق میں طے پا گیا۔ اب نہ بیچنے والا اپنی متاع واپس لے سکتا ہے نہ خریدنے والا قیمت لوٹائے گا۔

اثامن بالنفس النفیسہ ربہا؟
فلیس لہا فی الخلق کلہم ثمن
اذا ذہبت نفسی بدنیا اصبتہا
فقد ذہبت منی وقد ذہب الثمن

اور چونکہ مقصود اللہ سبحانہ کے لطف و کرم کا اظہار تھا۔ اس لیے معاملہ کو اپنی طرف سے شروع کیا نہ کہ بیچنے والوں کی طرف سے یعنی یہ نہیں کہا کہ مومنوں نے بیچ ڈالی بلکہ کہا کہ اللہ نے مومنوں سے خرید لی۔ گویا معاملہ کے طالب اللہ سبحانہ ہیں حالانکہ وہ ہر طرح کی احتیاج سے منزہ ہیں اور جو متاع اس نے قبول کی وہ بھی اسی کی تھی اور جو کچھ معاوضہ میں بخشا وہ بھی اس کے سوا کس کا ہو سکتا ہے؟[1]

دراصل یہ بیع اس معنے میں نہیں ہے کہ جو چیز انسان کی ہے اللہ سبحانہ اسے خریدنا چاہتا ہے بلکہ اس معاملہ کی صحیح نوعیت یہ ہے کہ جو چیز اللہ سبحانہ کی ہے اور جسے اس نے امانت کے طور پر انسان کے حوالے کیا ہے اور جس میں امین رہنے یا خائن بن جانے کی آزادی اس نے ذمے رکھی ہے اس کے بارے میں وہ انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ برضا و رغبت میری چیز کو میری مان لے اور زندگی بھر اس میں خود مختار رمالک کی حیثیت سے نہیں بلکہ امین ہونے کی حیثیت سے تصرف کرنا قبول کرے اور خیانت کی جو آزادی میں نے تجھے دی ہے اس سے خود بخود دست بردار ہو جا اس طرح اگر تو دنیا کی موجودہ زندگی میں اپنی خود مختاری کو میرے ہاتھ فروخت کر دے گا تو میں پھر اس زندگی کے بعد جاودانی زندگی میں اس کی قیمت بصورت جنت ادا کروں گا۔ جو انسان اللہ سبحانہ کے ساتھ بیعت کا یہ معاملہ کرے وہ وفادار مومن ہے اور ایمان اسی بیع کا دوسرا نام ہے۔ اور جو شخص اقرار کرنے کے باوجود ایسا رویہ اختیار کرے جو بیع نہ کرنے کی صورت ہی میں اختیار کیا جا سکتا ہے وہ وفادار نہیں ہے۔

آیت قرآنی میں بیع ایمان کی زندگی میں عہد وفاداری کا دوسرا نام ہے امام الحسن البصری سے حافظ ابن تیمیہ نقل کرتے ہیں کہ

[1] ترجمان قرآن

"ایمان صرف ظاہری ٹیپ ٹاپ اور آرزؤں کا نام نہیں ہے ایمان تو اسے کہتے ہیں جو دل میں سرایت کر جائے اور اعمال اس کی تصدیق کریں"

اسی عہد وفاداری اور التزام طاعت کے لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں سے بیعت لیتے تھے۔ آیت میں ایمان ہونے اور نہ ہونے کا ذکر نہیں ہے بلکہ ایمان لانے کے بعد اسلام سے وفاداری کرنے اور نہ کرنے کا پیمانہ بتایا جا رہا ہے اور بس۔ قرآن کا سیاق بھی اسی کا مقتضی ہے اس سے پہلے ان لوگوں کا ذکر ہو رہا تھا جن سے غزوہ تبوک کے موقعہ پر ایمان کا تقاضا پورا کرنے کی کوتاہی ہوئی۔ جن کو اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا۔ ان کو سمجھایا جارہا ہے کہ ایمان کے درخت پر پھول اور پھل اس وقت تک نہیں آتے جب تک وفاداری کا بھرپور مظاہرہ نہ ہو۔ کیونکہ انقیاد باطن، التزام طاعت عہد وفاداری یہ وہ اوصاف ہیں جن کے بغیر تصدیق علم ہی کا ایک مرتبہ رہتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایمان صرف تصدیق نہیں ہے بلکہ انقیاد قلبی اور التزام طاعت بھی اس کا اہم حصہ ہے۔ اگر ایک شخص صرف تصدیق رکھتا ہے مگر عہد وفاداری نہیں کرتا تو وہ مومن نہیں کہلا سکتا۔ اسی طرح اگر فرمان برداری کے لیے تو آمادہ ہے مگر قلب و زبان سے تصدیق کے لیے آمادہ نہیں ہے وہ بھی مومن نہیں ہے۔ ایمان صرف اس صورت کا نام ہے کہ قلب و زبان تصدیق سے مزین ہوں اور قانون پر عمل پیرا ہونے کا عزم مصمم بھی ہو

ایمان میں وفاداری کا اہم تقاضا

۱۱۵ وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ پس وہ قتل کرتے ہیں اور ان کو قتل بھی کیا جاتا ہے یہ اللہ کا وعدہ ہے پکا اس کے ذمہ ہے تورات انجیل اور قرآن میں یعنی مقصود اللہ سبحانہ کی راہ میں جان و مال حاضر کر دیتا ہے بعد ازیں ماریں یا مارے جائیں دونوں صورتوں میں عقد بیع پورا ہو گیا۔ اور یقینی طور پر ثمن کے مستحق ہو گئے ممکن ہے کہ کسی کو وسوسہ گذرتا کہ معاملہ تو بے شک بہت سود مند اور فائدہ بخش ہے لیکن ثمن نقد نہیں ملتا اس کا جواب دیا وعدا علیہ حقا فی التوراۃ والانجیل والقرآن یعنی زر ثمن کے مارے جانے کا کوئی خطرہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بہت تاکید و اہتمام سے پختہ دستاویز لکھ دی ہے جس کے خلاف ممکن نہیں کیا اللہ سبحانہ سے زیادہ صادق القول راستباز اور وعدہ کا پکا کوئی ہو سکتا ہے ہرگز نہیں لہذا اس کا ادھار بھی دوسروں کے نقد سے ہزار دل

درجہ پختہ اور بہتر ہو گا[1]

یقاتلون فی سبیل اللہ یہ استیناف بیانی ہے یعنی اٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے سوال کیا ہے؟ کچھ کہتے ہیں کہ اللہ سبحانہ نے جب خبر دی کہ ان اللہ اشتری اللہ سبحانہ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور مالوں کو خرید لیا ہے سوال پیدا ہوا کہ کیوں خریدا ہے جواب دیا کہ اس لیے خریدا ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔ جانیں لڑائیں اور کھپائیں کچھ کہتے ہیں کہ سوال یہ ہے کہ جن سے خریدی گئی ہے وہ کیسے بچیں گے؟ جواب میں ارشاد ہوا کہ وہ اللہ کی راہ میں جنگ کریں گے بہر حال سوال کچھ ہو۔ بتایا جا رہا ہے کہ اس بیع و شرا کے بعد کوئی راستباز مسلمان اپنی جان کو اللہ سبحانہ کی راہ میں خرچ کرنے میں کوتاہی نہ کرے گا۔

صحابہ کی زندگی اس کے مظاہرے سے درخشاں ہے۔ اس بیعنامے نے ان کی اسلامی زندگی کو وفادارانہ زندگی کا نمونہ بنا دیا تھا۔ گویا یہ معاہدہ اسلام سے وفادارانہ رویہ اور بے وفائی کے انداز میں ایک حد فاصل تھا۔ مسلمان جو صحیح معنے میں ایمان کے تقاضوں کو جانتا ہوا اپنی زندگی کے ہر گوشہ میں رضائے الہٰی کا جویا ہو کر کام کرتا ہے اور اس کی زندگی میں کہیں بھی بیوفائی کا نام نہیں ہوتا ہاں یہ کہ عارضی طور پر کسی وقت اس پر غفلت طاری ہو جائے اور وہ اللہ سبحانہ کے ساتھ اس معاہدے کو بھول کر وفاداری کے خلاف کوئی حرکت کرے۔ اسی طرح مسلمان اس معاہدے کی رو سے اپنی اجتماعی زندگی میں کوئی پالیسی کوئی سیاست کوئی طرز تمدن و تہذیب کوئی طریق معیشت اور کوئی بین الاقوامی معاملہ اللہ سبحانہ کی مرضی اور اس کے قانون شرعی کی پابندی سے آزاد ہو کر اختیار نہیں کر سکتا اور اگر کسی عارضی غفلت کی بنا پر اختیار کر بھی جائے تو جس وقت اسے تنبہ ہو گا اسی وقت وہ بے وفائی کا رویہ چھوڑ کر وفاداری کے رویے کی طرف پلٹ آئے گا۔

یہ اس معاہدے کے ناگزیر تقاضے ہیں۔ ان کو سمجھ لینے کے بعد یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس معاملہ میں قیمت یعنی جنت کو موجودہ زندگی کے خاتمہ پر کیوں موخر کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جنت صرف اقرار کا معاوضہ نہیں ہے بلکہ وہ اس عمل کا معاوضہ ہے کہ بائع اپنی اس زندگی میں غیر وفادارانہ رویہ چھوڑ دے اور اللہ سبحانہ کا امین بن کر اس کی مرضی کے مطابق کرے لہذا یہ بیع

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مکمل بھی اس وقت ہو گی جب بائع کی زندگی ختم ہو جائے گی۔
یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اس سلسلہ بیان میں یہ مضمون کس مناسبت سے آیا ہے۔
علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ تبوک میں رہ جانے والوں کا ذکر کرنے کے بعد مومنین کو جہاد کی ترغیب کے لیے یہ لطیف انداز اختیار کیا ہے۔ علامہ خفاجی فرماتے ہیں کہ جہاد کی ترغیب کے موضوع پر رغبت دلانے کے لیے اس سے زیادہ حسین اور بلیغ انداز کوئی نہیں۔
علامہ بقاعی نے اس سے زیادہ لطیف نکتہ آفرینی کی ہے فرماتے ہیں:
تبوک میں جو نہیں گئے تھے ان کو تہدیدی انداز میں کہا تھا مالکم اذا قیل لکم انفروا پھر اہل ایمان کو جہاد کا حکم دیا انفروا خفافا وثقالا۔ صادق الایمان مسلمان کے لیے اتنا ہی کہنا کافی تھا۔ لیکن پھر کچھ لوگوں نے اس وقت تکاسل کا مظاہرہ کیا۔ ان کو اللہ سبحانہ نے اہل ایمان میں بے نقاب کیا اور حضور اقدس کو حکم دیا یاایھا النبی جاھد الکفار والمنافقین اس کے نتیجے میں ان کی بنی ہوئی مسجد کو گرا یا گیا۔ ان کے جنازے کی نماز سے روکا گیا۔ اس طویل داستان کے بعد یہ سوال خود بخود ذہن میں چٹکیاں لینے لگا کہ اللہ سبحانہ کی ذات گرامی تو ستار العیوب ہے۔ پھر رسوائیوں اور برائیوں کے اعلان اور بے ابروئی اور بے عزتی کے لیے یہ انداز کیوں اختیار کیا ہے جواب میں ارشاد ہوا ان اللہ اشتری من المومنین مطلب یہ ہے کہ شروع سے جو بات چل رہی تھی اس میں ان لوگوں کا تذکرہ ہو رہا تھا جو مسلمان تھے مگر امتحان کے موقع پر ان میں سے کچھ نے تساہل کی بنا پر کچھ نے اخلاص کی وجہ سے اور کچھ نے نفاق کی وجہ سے اسلام کی خاطر اپنے وقت اپنے مال اپنے مفاد اور اپنی جان کو قربان کرنے میں دریغ کیا۔ لہٰذا ان مختلف اشخاص اور طبقوں کے رویہ پر تنقید کرنے کے بعد اب ان کو صاف صاف بتایا جا رہا ہے کہ وہ ایمان جسے قبول کرنے کا تم نے اقرار کیا ہے یہ محض جاننے کی چیز نہیں ہے کہ اللہ ہے اور وہ ایک ہے بلکہ وہ دراصل اس امر کا یقین اور زبان سے اقرار کا نام ہے کہ اللہ سبحانہ تمہاری جان اور مال کا مالک ہے لہٰذا اگر اس اقرار یقین کے بعد اگر مال و جان کو اللہ سبحانہ کے حکم پر قربان کرنے سے جی چراتے ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تم اپنے اقرار میں جھوٹے ہو سچے اہل ایمان صرف وہ لوگ ہیں۔ جو واقعی اپنے جان و مال کو خدا کے ہاتھ میں بیچ چکے ہیں۔ یہی وفاداری کا پیمانہ ہے۔
آیت کی تشریح میں ایک بات باقی رہ گئی ہے کہ اس معاہدے کی تاریخی حیثیت قرآن

نے بتاتے ہوئے تورات و انجیل کا نام لیا ہے ۔لوگ کہتے ہیں کہ جس وعدے کا یہاں ذکر ہے وہ تورات و انجیل میں موجود نہیں ہے ۔اس سلسلے میں مولانا عبد الماجد دریاآبادی، مولانا امین احسن اصلاحی نے وضاحت کی ہے وہ قابل قدر ہے لیکن مولانا مودودی نے تفہیم القرآن میں پوری وضاحت سے سمجھایا ہے وہ فرماتے ہیں :

اس بات پر بہت اعتراضات کیے گئے ہیں کہ جس وعدے کا یہاں ذکر ہے وہ تورات و انجیل میں موجود نہیں ہے مگر جہاں تک انجیل کا تعلق ہے یہ اعتراضات بے بنیاد ہیں جو اناجیل اس وقت موجود ہیں ان میں حضرت مسیح علیہ السلام کے متعدد اقوال ہم کو ایسے ملتے ہیں جو اس آیت کے ہم معنے ہیں مثلاً

مبارک ہیں وہ جو راستبازی کے سبب ستائے گئے ہیں کیونکہ آسمان کی بادشاہت انہیں کی ہے ۔متی ۵ - ۱۰

جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے اسے کھوئے گا اور جو کوئی میرے سبب اپنی جان کھوتا ہے اسے بچائے گا ۔متی ۱۰ ؛ ۳۹

جس کسی نے گھروں یا بھائیوں یا بہنوں یا باپ یا ماں یا بچوں یا کھیتوں کو میری خاطر چھوڑ دیا ہے اس کو سوگنا ملے گا اور ہمیشہ کی زندگی کا وارث ہوگا ۔ متی ؛ ۱۹ ؛ ۲۹

البتہ تورات جس صورت میں اس وقت موجود ہے اس میں بلاشبہ یہ مضمون نہیں پایا جاتا ۔اور یہی مضمون کیا وہ تو حیات بعد الموت اور یوم الحساب اور اخروی جزا و سزا کے تصور ہی سے خالی ہے ۔حالانکہ یہ عقیدہ ہمیشہ سے دین حق کا جزو لاینفک رہا ہے لیکن موجودہ تورات میں اس مضمون کے نہ پائے جانے سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ واقعی تورات اس سے خالی تھی حقیقت یہ ہے کہ یہود اپنے زمانہ تنزل میں کچھ ایسے مادہ پرست اور دنیا کی خوشحالی کے بھوکے ہوگئے تھے کہ ان کے نزدیک نعمت اور انعام کے کوئی معنی اس کے سوا نہ رہے تھے کہ وہ اسی دنیا میں حاصل ہو ۔اسی لیے کتاب الٰہی میں بندگی و طاعت کے بدلے جن جن انعامات کے وعدے ان سے کیے گئے تھے ان سب کو وہ دنیا ہی میں اتار لائے اور جنت کی ہر تعریف کو انہوں نے فلسطین کی سرزمین پر چسپاں کر دیا جس کے وہ امیدوار تھے ۔مثال کے طور پر تورات میں متعدد مقامات پر ہم کو یہ مضمون ملتا ہے ۔

"سن لے اسرائیل خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے تو اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری طاقت سے خداوند اپنے خدا سے محبت کر۔"
استثنا ۶ : ۴، ۵

اور یہ کہ
"کیا وہ تمہارا باپ نہیں جس نے تم کو خریدا ہے اسی نے تم کو بنایا اور بخشا"
استثنا ۳۲ ، ۶

لیکن اس تعلق باللہ کی جو جزا بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ تم اس ملک کے مالک ہو جاؤ گے جس میں دودھ اور شہد بہتا ہے یعنی فلسطین ۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ تورات جس صورت میں اس وقت پائی جاتی ہے اول تو وہ پوری نہیں ہے اور پھر وہ خالص کلام الٰہی پر ہی مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں بہت سا تفسیری کلام اللہ سبحانہ کے کلام کے ساتھ ساتھ شامل کر دیا گیا ہے ۔ اس کے اندر یہودیوں کی قومی روایات ان کے نسلی تعصبات ان کے اوہام ان کی آرزوؤں اور تمناؤں ، ان کی غلط فہمیوں اور ان کے فقہی اجتہادات کا ایک معتدبہ حصہ ایک ہی سلسلہ عبارت میں کلام الٰہی کے ساتھ کچھ اس طرح رل مل گیا ہے ۔ کہ اکثر مقامات پر اصل کلام کو ان زوائد سے ممیز کرنا قطعاً ناممکن ہو جاتا ہے لے

ایمان کے امتیازی تقاضے

۱۱۶ اور اللہ سبحانہ سے زیادہ اپنا عہد پورا کرنے والا کون ہے لہٰذا مسلمانو! تم اس سودے پر جو تم نے اللہ سبحانہ سے کیا ہے خوشیاں مناؤ اور یاد رکھو یہی بڑی کامیابی ہے مومنوں کے خوش ہونے اور اپنی قسمت پر نازاں ہونے کا اس سے بہتر کون سا موقع ہو گا کہ خود رب العزت ان کا خریدار ہے اور اس شان سے ہے ۔ سچ فرمایا عبداللہ نے کہ یہ وہ بیع ہے جس کے بعد اقالہ کی کوئی صورت ہم باقی رکھنا نہیں چاہتے حق تعالیٰ اپنے فضل سے ہم ناتوانوں کو ان مومنین کے زمرے میں محشور فرمائے ۲ے

دو چیزیں ہیں اور دونوں مزاج کے اعتبار سے الگ الگ ہیں ایک مسلمان ہونا ہے اور دوسرے مسلمان ہونے کے بعد دین کی برتری کے لیے محنت کرنا ، جان کھپانا مال خرچ کرنا قربانیاں

لے تفہیم ۲ے افادات شیخ الاسلام

دینا ایمان کا اولین تقاضا ہے اس کے بغیر ہر مسلمان کی اسلامی زندگی نامکمل ادھوری اور ناقص ہے۔ اس آیت میں اہل ایمان کو اسی کے لیے ابھارا گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں یعنی اللہ کے دین کو برتر کرنے کے لیے بے خوف وخطر جان ومال کی قربانیاں پیش کرو۔ اسی کا نام اسلام کی نصرت ہے۔ یہ ایمان کی اولین کسوٹی ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جب شرف نبوت سے مشرف ہونے کے بعد ورقہ ابن نوفل کو غار حرا کی روداد سنائی ورقہ نے نبوت کی پہلے ان لفظوں میں تصدیق کی ھذا ھو الناموس الذی نزل علی موسیٰ یہی وہ ناموس ہے جو حضرت عیسیٰ پر نازل ہوا تھا اور پھر جو بات کہی وہ ہی بات ہر مسلمان کے سننے کی ہے فرمایا۔ کاش میں اس وقت طاقتور ہوں کاش میں بقید حیات ہوں جس وقت تمہاری قوم تمہیں گھر سے بے گھر کرے گی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حیرت سے دریافت کیا کیا لوگ مجھے گھر سے بے گھر کر دیں گے۔ ورقہ نے جواب دیا جی ہاں اس میدان کے ہر راہ رو کے ساتھ یہی سلوک ہوا ہے۔ آگے جو بات فرمائی ہے وہ اس لائق ہے کہ ہر مسلمان گوش ہوش سے سنے اور یاد رکھے کہ ایمان کا پہلا تقاضا کیا ہے فرمایا۔ وان یدرکنی یومك انصرك نصرا موزرا اگر میں بقید حیات رہا تو میں تمہاری پامردی مدد کروں گا اس کا مطلب یہی ہے کہ ایمان لانے کے بعد اولین تقاضا اللہ کے دین کی مدد کرنا ہے۔ اسی لیے نبوت کے ابتدائی دور میں جب ہجرت سے ۲ سال پہلے ستر شرفاء مدینہ نے مکہ میں آکر اسلام قبول کیا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بیعت لی اس بیعت کا نام بیعت عقبہ ثانیہ ہے اور ان کے ایک لیڈر عبداللہ بن رواحہ نے عرض کیا کہ آپ نے اور اپنے رب کی جانب سے شرطیں بیان فرمائی۔ آپ نے فرمایا کہ میرے رب کی طرف سے تو یہ ہے کہ اس کی عبادت کرو کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ اور میری طرف سے شرط یہ ہے کہ جس طرح اپنے جان ومال کی حفاظت کرتے ہو میری بھی حفاظت کرو وہ بولے کہ اس پر ہمیں کیا ملے گا؟ فرمایا "جنت" وہ لوگ بول پڑے ربح البیع لا نقیل ولا نستقیل یہ سودا تو بڑے نفع کا ہوا ہم نہ اس سودے کو توڑیں گے اور نہ توڑنے کی درخواست کریں گے۔

یہ آیت پکار پکار کر بتا رہی ہے کہ ضرورت پڑنے پر مسلح جہاد کرنا ایمان کا ناگزیر تقاضا ہے۔ اور ساتھ یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ سبحانہ کے راستہ میں لڑنے کا جذبہ اور عزم وارادہ رکھنا ایمان کی ایک کبھی نہ الگ ہونے والی صفت ہے۔ یہ ایک الگ سوال ہے کہ اس کا موقع کب آتا ہے اور اس کی ضروری شرطیں کب پوری ہوتی ہیں۔ مومن کا عمل تو اس موقع کا اور شرائط کا

ضرور انتظار کرے گا مگر اس کا جذبہ ایمان ایسا کوئی انتظار ہرگز نہیں کر سکتا وہ تو اس کام کے لیے ہر وقت چلتا ہی رہے گا۔ مومن اگر مومن ہے تو اس کی ذہنی کیفیت فطری طور پر ہمیشہ یہی رہے گی۔ جہاں ضرورت نے اسے پکارا اور ضروری شرطوں نے ہری جھنڈی دکھائی وہ اپنی جگہ بیٹھا نہیں رہ سکتا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ایمان اور جہاد کے فطری تعلق کو پوری طرح بے نقاب کرتا ہے۔

من مات ولم یغز به ولم یحدث به نفسه مات
علی شعبة من النفاق.

جو شخص اس حال میں مرا ہو کہ اس نے نہ تو دین کی خاطر جنگ کی نہ اپنے جی
میں اس جنگ کا خیال لایا ہو وہ کسی نہ کسی حد تک نفاق کی حالت میں
مرا۔

اور وجہ اس کی بالکل ظاہر ہے مسلمان نام کا گروہ اس لیے پیدا ہی نہیں ہوا کہ دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی اپنی مرضی کی زندگی گذارے بلکہ وہ ایک خاص کام کیلئے پیدا کیا گیا ہے۔ یہ کام اتنا بڑا اور اتنا اہم ہے کہ ٹھیک طور سے انجام پانے کے لیے مسلمان کا سب کچھ مانگتا ہے اس لیے اس فرض سے سبکدوش صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جو اس کے مقابلے میں دنیا کی کسی چیز کو عزیز نہ رکھتا ہو۔ اور حقیقی امت مسلمہ ایسے ہی افراد کے مجموعہ کا نام ہے جن کے اندر قربانی کا یہ جذبہ موجود ہو۔

اللہ تعالیٰ کو اپنے دین کے لیے جس قسم کے افراد مطلوب ہیں ان میں جہاد فی سبیل اللہ کی صفت ضروری ہے جو لوگ اس صفت سے خالی ہوں وہ دین کی خدمت دعوت شہادت کا فریضہ انجام دے ہی نہیں سکتے ہیں اور جو مسلمان یہ کام نہیں کر سکتا وہ گویا

کذالك جعلناکم امة وسطا لتکونوا شهداء علی
الناس۔

کے منصب شہادت کا اہل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاد سے فرار کی راہ اختیار کرنے کو کچھ آیات قرآنی میں دین کی راہ سے پھر جانا قرار دیا ہے۔ یہی بات ہے سورہ توبہ کی اس آیت میں غزوہ تبوک کا ذکر کا آغاز کرتے ہوئے فرمائی گئی تھی۔

مالکم اذا قیل لکم انفروا فی سبیل الله اثاقلتم

فی الارض۔
اور بتایا گیا تھا۔

ان لا تنفروا یعذبکم عذابا الیما و یستبدل قوما غیرکم۔

ظاہر ہے کہ کسی شخص یا گروہ کو اس کی جگہ سے اسی وقت ہٹایا جاتا ہے جب اس میں اس کی اہلیت نہ رہی ہو اور وہ کام انجام نہ دے رہا ہو جس کے لیے اسے یہ مقام دیا گیا تھا۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ
السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ
النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ
الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾

(ان کے اوصاف یہ ہیں) توبہ کرنے والے ہیں، عبادت کرنے والے، اللہ سبحانہ کی حمد کرنے والے، سیاحت کرنے والے، جناب الٰہی میں رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے نیکی کا حکم کرنے والے اور برائی کو روکنے والے اور اللہ کے حدود کی حفاظت کرنے والے اور اے پیغمبر آپ ان اہل ایمان کو خوشخبری دے دیجئے۔

مفردات کے معانی

سائحون اس کا مصدر سیاحت ہے ساح یسیح اس کے معنے لغت گھومنے پھرنے کے لئے ہیں ان ہی معنی ہیں اس صورت کے آغاز میں اس سے فعل آیا ہے فسیحوا فی الارض الخ چونکہ زمین میں گھومنے والا اقربا سے دور رہتا ہے اس لیے اس کے مجازی معنے تعلق نہ رہنے کے کیئے جانے میں اور پھر چونکہ حالت سیاحت میں سیاحت کرنیوالا کھانے پینے سے بے تعلق ہو جاتا ہے اس لیے اس کے معنی روزہ دار کے کرتے ہیں، ہجرت میں آدمی گھر سے بے گھر ہوتا ہے اس لحاظ سے ہجرت جہاد اور طلب علم بھی اس کے مجازی معنے ہو گئے۔ اصل معنے لغت میں گھومنے اور پھرنے کے ہیں۔

علامہ زمخشری کہتے ہیں سائح کے معنے صائم کئے گئے کیونکہ اس کے پاس توشہ نہیں ہوتا اس لیے جب تک کھانے کو نہیں ملے گا رکا رہتا ہے لہٰذا روزہ دار کو افطار کا وقت آجانے تک رک جانے میں اس سے تشبیہ دی گئی ہے۔

صحابہ کرام کا انفرادی چہرہ

ان اولین مسلمانوں کی جن کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اللہ سبحانہ نے ان کی جانوں اور مالوں کو جنت کے بدلے میں خرید لیا ہے یہاں ان کی ایمانی تربیت کی ان منزلوں کو بے نقاب کیا جا رہا ہے۔ ان کی منزلوں سے گذر کر ان کے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔ اسی سے اسلام کا روحانی نظام کا چہرہ مہکتا اور چمکتا ہے۔ روحانی نظام سے مقصد یہ ہے کہ انسانی روح نفس کی غلامی سے آزاد اور دنیا پرستی کی آلودگی سے پاک ہو اور ان چیزوں سے آزاد اور بے رخ ہو کر اللہ سبحانہ کی طاعت اس کی محبت اور اس کی رضا کی طرف جذبات سے سرشار ہو جائے۔ اس پاکیزگی کا انفرادی معیار یہ ہے کہ انسان وہی کچھ پسند کرنے لگے جو اس کے اللہ کو پسند ہے اور ہر اس چیز کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے جو اس کے اللہ کو ناپسند ہے۔ اپنے حقیقی آقا کے حکموں پر اس طرح عمل کرنے لگے گویا وہ اسے سر کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اس کی رضا کی طرف لپکتا رہے جیسے پیاسا ٹھنڈے پانی کی طرف لپکتا ہے اس کے اشارے پر اپنی جان و مال قربان کر دینے کے لیے اس طرح تیار رہے جیسے ان چیزوں کی اس کی نگاہ میں کوئی قیمت نہیں ہے روحانیت کے اس سب سے اونچے مقام کا نام اسلام کی زبان میں احسان ہے اور اصطلاح میں اسے تصوف کہتے ہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت مقدسہ میں صحابہ کی روحانی تربیت کا سلسلہ جاری رہا۔ قرآن برابر ان کو طاقت اور گرمی بخشتا رہا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس سے ان کو استحکام خلوص نفس پر قابو رضائے الٰہی کی سچی طلب اور اس کی راہ میں اپنے کو مٹا دینے کی عادت جنت سے عشق، علم کی حرص دین کی سمجھ اور احتساب نفس کی ساری کروٹوں کی اللہ سبحانہ نگرانی فرما رہے تھے اسی نگرانی کا نتیجہ ہے کہ ان کی نفسیات میں عجیب و غریب تبدیلی آگئی جب بھی کوئی لا الہ الا اللہ پر ایمان لاتا اس کی زندگی میں عظیم الشان انقلاب رونما ہو جاتا۔ ایمان اس میں پیوست ہو جاتا ہے یاد الٰہی میں اس کا جی لگتا اسی کو نشاط ایمان کہتے ہیں اور اللہ کی راہ میں قتل ہونے میں اسے لذت آتی اسی کو حلاوت ایمان کہتے ہیں۔ اگر کسی وقت بھول چوک ہو جاتی تو ایمان سراپا سوال بن کر دربار نبوت میں حاضر ہو جاتا دل کی پیاس چین نہ لیتی، پریشان کن خیالات کا سیلاب امنڈ آتا۔ مورخین نے اسلامی

تاریخ کے ایسے محیر العقول واقعات پیش کیے ہیں جن کی نظیر اسلامی تاریخ کے علاوہ کہیں نہیں ملتی ہے۔
۱۱۲ توبہ کرنے والے ہیں عبادت کرنے والے، اللہ سبحانہ کی حمد کرنے والے سیاحت کرنے والے۔
پھر نے سیاحت کرنے والوں سے روزے دار مراد لئے ہیں کیونکہ روزہ دار کھانے پینے لذائذ سے بے تعلق ہو کر روحانی مدارج ملکوتی مقامات کی سیر کرتا ہے بعض کے نزدیک اس لفظ کا مصداق مہاجرین جو گھر بار سے بے تعلق ہو کر دارالاسلام میں سکونت رکھتے ہیں بعض نے مجاہدین کا ارادہ کیا ہے کہ مجاہد اپنی جان تک سے بے تعلق خدا کے راستہ میں قربان ہونے کے لیے نکلتا ہے۔ اور بعض کی رائے میں یہ لفظ طلبہ علم کے لیے ہے جو وطن" کنبہ راحت و آسائش کو خیر باد کہہ کر طلب علم کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ بہر حال مترجم محقق نے جو ترجمہ کیا اس میں سب اقوال کی گنجائش ہے مگر اکثر سلف کے نزدیک پہلی تفسیر مختار ہے واللہ اعلم حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ شاید بے تعلق رہنے سے مراد یہ ہو کہ دنیا میں دل نہ لگائے۔[1]

اس آیت میں ایمانی تربیت کی منزلیں بتائی گئی ہیں ان میں پہلی منزل توبہ ہے۔

توبہ ایمانی تربیت کی منزل

توبہ روحانی تربیت میں سب سے پہلے منزل ہے۔ یہی ساری روحانی ترقیوں کی واقعی اور حقیقی اساس ہے۔ اسی پر روحانی زندگی کی پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ تصوف میں بھی ساری ترقیاتی منزلوں میں پہلی منزل ہے حافظ ابن القیم منازل اساکین کی شرح میں لکھتے ہیں۔

فالتوبة هي بداية العبد ونهايته

توبہ بندے کی ابتدا بھی اور انتہا بھی۔ کیونکہ انسان میں اصل چیز دل ہے دل پاک ہے تو انسان پاک ہے، دل ناپاک ہے تو آدمی ناپاک ہے۔ انسان کا دل اگر خلوص سے کسی وقت اللہ سبحانہ کی طرف رجوع کرے اور اپنی تقصیروں اور فردگذاشتوں پر اس کی بارگاہ میں شرمندہ ہو کر اپنی بدکرداری و بدعنوانی سے بیزار ہو کر آئندہ کے لیے نیکوکاری کا اللہ سبحانہ سے مستحکم وعدہ کرے اسی کا نام توبہ ہے یہ توبہ گنہ گار سے گنہ گار انسان کو بھی اللہ سبحانہ کی محبت کی آغوش میں لا کر ڈال دیتی ہے آدم علیہ السلام کا تصور اور پھر ان کی توبہ اور رحمت الٰہی کا رجوع واقعہ کے علاوہ اس بات کی ایک مثالی صورت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آغوش

[1] افادات شیخ اسلام

رحمت کس طرح گنہ گار انسان کو واپس لینے کے لیے ہمیشہ وا رہتی ہے۔ رحمتِ الٰہی کے اس پرجوش نظارے کی جو کیفیت قرآن میں نظر آتی ہے وہ کہیں نہیں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی کیفیات اور اصول و شرائط جس شرح وبسط کے ساتھ بیان فرمائے وہ آپ کا خاص حصہ تھا۔

گناہ اگر بندے کی طبیعت ہے تو پھر توبہ ضرور اس کی صفت ہونی چاہیئے لہٰذا اگر وہ غلط علم غلط افتاد طبع اور غلط ماحول سے طرح طرح کے فتنوں کا شکار ہو جاتا ہے مگر کبھی اپنی توبہ کی صفت کو فراموش نہیں کرتا تو وہ ارحم الرحمٰن کی نظر میں کیوں نہ پیارا ہو۔ یہاں بحث بندے کی صفت توبہ پر ہے۔ آیت میں یہاں صحابہ کے لیے توبہ کا فعل نہیں بلکہ اسم فاعل تائبون لایا گیا ہے اور وہ بھی الف لام کے ساتھ جملہ اسمیہ کی صورت میں لایا گیا ہے صرف یہ بتانے کے لیے کہ وہ ایک ہی بار توبہ نہیں کرتے ہیں بلکہ توبہ کرنا ان کی صفت ہے اور وہ ہمیشہ توبہ کرتے رہتے ہیں۔ اسم فاعل نے اگر توبہ کو ان کی صفت بنایا ہے تو جملہ اسمیہ نے توبہ کے دوام اور ہمیشگی کو بتایا ہے اصل میں بمندا ے محذوف کی خبر ہے۔

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ ایسا کیوں کہا گیا ہے:

اس لیے کہ مومن اگرچہ اپنے پورے شعور اور ارادے کے ساتھ اللہ سبحانہ سے اپنی جان و مال کا معاملہ کرتا ہے لیکن ظاہر حال کے لحاظ سے محسوس یہی ہوتا ہے کہ جان اس کی اپنی ہے اور مال اس کا اپنا ہے اور یہ بات کہ اس کی جان اور مال کا اصلی مالک اللہ سبحانہ ہے محسوسات میں سے نہیں بلکہ معقولات میں سے ہے۔ اس لیے مومن کی زندگی میں بارہا ایسے مواقع پیش آتے رہتے ہیں جب کہ وہ عارضی طور پر اللہ کے ساتھ اپنے معاملہ بیع کو بھول جاتا ہے اور اس سے غافل ہو کر کوئی معاہدے کے خلاف طرز عمل اختیار کر لیتا ہے مگر ایک حقیقی مومن کی صفت یہ ہے کہ جب بھی اس کی یہ عارضی بھول دور ہوتی ہے اور وہ اپنی غفلت سے چونکتا ہے اور اس کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ غیر شعوری طور پر وہ اپنے عہد کی خلاف ورزی کر بیٹھا ہے تو اسے ندامت لاحق ہوتی ہے شرمندگی کے ساتھ وہ جناب الٰہی میں ہاتھ اٹھاتا ہے معافی مانگتا ہے اور اپنے عہد کو پھر سے تازہ کر لیتا ہے۔ یہ بار بار کی توبہ اور رہ رہ کر اللہ سبحانہ کی طرف پلٹنا اور ہر لغزش کے بعد وفاداری کی راہ پر واپس آنا توبہ کا دوام و ثبات ہے۔

یہ تو ہے نسبت کی تشریح مگر یہاں شارحین قرآن کی تشریحات میں دو باتیں اور بھی پیش کی جاتی ہیں۔

اوّل یہ کہ آیت میں تائبون سے کون لوگ مراد ہیں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ مجاہدین کی صفات ہیں اللہ کے راستہ میں شہید وہ شخص کہلائے گا جس میں یہ نو صفات ہوں اس نو

میں مبتدا محذوف ہوگا یعنی ھم التائبون قاضی بیضاوی نے اسی کو ترجیح دی ہے اور امام حسن اور قتادہ کہتے ہیں کہ تائبین سے مراد وہ لوگ ہیں جو شرک سے توبہ کر چکے ہوں اور ان کے دامن پر نفاق کا داغ نہ ہو اور ضحاک کی رائے ہے کہ اس سے مقصود وہ لوگ ہیں جو شرک اور گناہوں سے توبہ کریں۔ لیکن کافر، منافق، عاصی ہر ایک کی توبہ الگ الگ ہے کافر کی توبہ یہ ہے کہ کفر و شرک سے توبہ کرے منافق کی توبہ یہ ہے کہ نفاق سے توبہ کرے اور عاصی کی توبہ یہ ہے کہ معاصی سے توبہ کرے۔ کیئے پر پشیمان ہو اور آئندہ پھر نہ کرنے کا پختہ عزم کرے۔

عبادت روحانی تربیت کی منزل

دوسرا اہم بنیادی اور جامع وصف روحانی تربیت کے سلسلے میں عبادت کو پیش کیا ہے۔ علامہ بقاعی فرماتے ہیں کہ عبادت کی آغوش میں دین کی ساری انواع سمٹی ہوتی ہیں۔ عبادت کے معنی اہل لغت نے یہ بتائے ہیں العبادۃ غایۃ التذلل کسی کے حضور میں پوری پستی (مفردات) العبادۃ فی اللغۃ الطاعۃ مع الخضوع عبادت کے معنی اس طاعت و فرمانبرداری کے جس میں خضوع ہو (لسان العرب) حافظ ابن القیم الجوزی نے مدارج السالکین میں سب سے زیادہ خوبصورت بات لکھی ہے۔

عبادت دو چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے بہت زیادہ محبت بہت زیادہ پستی اور ادر جھکاؤ کے ساتھ عرب والے پامال راستہ کو طریق معبد بولتے ہیں۔ ان تصریحات سے جو بات حقیقت بن کر نمودار ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ عبادت اللہ کے حضور ظاہر اور باطن ہر حیثیت سے پوری طرح جھک جانے اور اللہ سبحانہ کی بارگاہ میں اپنی بندگی اور عبودیت کا نذرانہ پیش کرنا اور اس کے احکام کو بجالانے کا نام ہے۔ اسی لیے قرآن میں عبادت کا مقابل استکبار آیا ہے۔

اس آیت نے وضاحت کی ہے کہ صحابہ کی زندگی کے تمام احوال، معاملات خالصاً عابدانہ تھے اور عبادت ان کی وقتی اور ہنگامی نہ تھی بلکہ عبادت ان کا ایک دائمی وصف تھا اسی سے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

"یہ ان لوگوں کا چہرہ ہے جو اپنے سارے اوقات میں اللہ کی عبادت کرتے تھے یہ مہینہ دو مہینہ سال دو سال کی بات نہ تھی۔"

معاہدہ بیع کے بعد العابدون کہنے کا مطلب بھی یہ ہے کہ ایک مومن اللہ سبحانہ کا ایسا عبد ہے جس کی

صرف قوت کارکردگی ہی نہیں بلکہ اس کا سب اللہ ہی کا ہے وہ اللہ کا پیدا کیا ہوا ہے اور اس کا خریدا ہوا ہے اور خرید و فروخت کا معاملہ اس کی آزاد مرضی سے ہوا ہے۔ ایسا پیدائشی غلام اور اپنے وجود کو بیچ چکنے والا ایسا عبد کامل اپنے آقا کی تابعداری میں جو کچھ بھی کریگا اس کا کوئی جزو بھی اس کی غلامانہ حیثیت سے الگ اور بے تعلق نہیں ہو سکتا۔ جب غلامی اور عبدیت کے سوا اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے تو لازماً اس کا ایک ایک فعل عبدیت اور عبادت ہی کا فعل ہو گا حتیٰ کہ اگر وہ کھانے اور پینے سونے اور جاگنے کے کام بھی اپنے آقا کے حکموں کے تحت کرتا ہے تو یہ سارے کام بھی قطعاً عبادت ہی کے کام ہوں گے۔

حمد الٰہی روحانی تربیت کی منزل

روحانی تربیت کی منازل میں ایک منزل حمد الٰہی ہے۔ حمد الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ حسن و جمال کی ساری خوبیوں کو اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت کیا جائے اوصاف جلال اور نعوت کمال کا حقدار اسی کو قرار دیا جائے۔

حمد کے دو معنے ہیں ایک معنے تو یہی ہیں کہ حسن و جمال اور اللہ سبحانہ کے کمالات کا ہر حال میں اعتراف کرنا اور اس کے گن گانا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم حمد الٰہی میں بہترین نمونہ ہیں۔ دوسرے معنے حمد کے اللہ کی نعمتوں پر اللہ سبحانہ کا شکر ادا کرنا۔ ارشاد نبوت ہے راس الشکر الحمد للہ مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ سبحانہ کی نعمتوں پر اللہ کا شکر کرتے ہیں۔ پہلے معنے زیادہ اچھے ہیں اور بزرگوں سے منقول ہیں۔

اللہ کی معرفت کا ذریعہ بزرگوں نے حمد الٰہی کو تسبیح کی پیوندکاری کے ساتھ بتایا ہے تسبیح یہ ہے کہ اللہ سبحانہ سے ساری عیوب ساری کمیوں سارے نقصانوں اور ساری کمزوریوں کی نفی کی جائے اور تحمید یہ ہے کہ اس کے لیے حسن و جمال کے سارے کمالات کا اقرار کیا ہے اس لیے زبان نبوت میں یہ دونوں ملے چلے آتے ہیں۔ فرشتوں کے قرب الٰہی کے بارے میں ہے نحن نسبح بحمدك نمازی نماز کا آغاز کرتا ہے سبحانك اللهم و بحمدك کہہ کر۔ ایمان جس کی دعوت نبوت لے کر آئی اس میں معرفت الٰہی کی اساس تسبیح و تحمید ہے اسی لیے احادیث میں سبحان اللہ وبحمدہ کی اذکار میں زیادہ فضیلت آتی ہے۔

روحانی تربیت کی ایک اور منزل

السائحون یعنی سیاحت کرنے والے عام شارحین قرآن نے السائحون سے صائمون روزہ دار مراد لیا ہے اور اس کی بنیاد روایات پر ہے روایات بھی موقوف ہیں اور مرفوع روایات کی روایتی حیثیت ناپائدار ہے اور موقوف روایات میں صحت کی پوری ضمانت کسی روایت کی نہیں ہے۔

دوسری رائے سائحون کی تفسیر میں یہ ہے کہ اس سے مجاہدین مراد ہیں یہ حضرت عطار ابن ابی رباح کی رائے ہے تیسری رائے مشہور مفسر عکرمہ کی ہے کہ اس سے مراد طلبہ علم ہیں، چوتھی رائے اس موضوع عبدالرحمٰن بن زید ابن اسلم کی ہے کہ اس سے مراد مہاجرین ہیں ان تمام تشریحات کا مطلب میں یہ سمجھا ہوں کہ سیاحت سے مراد ایسے مقاصد کے لیے زمین میں چلنا ہے جو اللہ کے دین کی برتری کے لیے ہوں اور جن میں اللہ سبحانہ کی رضا مطلوب ہو۔ مثلاً دین کو بلند کرنے کے لیے جہاد، کفر زدہ علاقوں سے ہجرت، دعوت دین اصلاح خلق علم دین کی طلب وغیرہ وغیرہ اور جن لوگوں نے سیاحت کے مفہوم میں روزے کو داخل کیا ہے اس کی معنویت یہ ہے کہ سیاحت قدیم زمانے سے مذاہب کی ایک خاص اصطلاح ہے جس کا مطلب علامہ منظور افریقی نے یوں پیش کیا ہے۔

عبادت و ریاضت کے لیے زمین میں جانا۔

ظاہر ہے کہ سفر بھی ہو اور روزہ بھی ہو تو اس سے بڑی ریاضت کیا ہو گی آپ غور کریں کہ جہاد میں جا رہے ہیں یا آپ سفر ہجرت کر رہے ہیں یا آپ طلب علم کی خاطر گھر سے نکلے ہیں اور روزہ رکھے ہوئے ہیں تو اس سیاحت سے مقدس اور کونسی سیاحت ہو سکتی ہے۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہو گئی کہ نیک مقصد سے سیر و سیاحت کرنا سچے اہل ایمان کا بہترین عمل ہے۔ اور ان اعمال میں سے ہے جن کے ذریعے وہ ایمان کے مدارج طے کرنے اور خصائص ایمانی میں کامل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس تیزی سے صدر اول کے مسلمان تمام دنیا میں پھیلے اس کی کوئی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی ہے اور جب تک اسلام کی عملی روح ان کے اندر رہی ان سے بڑھ کر زمین کی مسافتیں قطع کرنے والی کوئی قوم نہ تھی وہ سیاحت کو سیاحت سمجھ کر نہیں کرتے بلکہ اللہ کی عبادت سمجھتے تھے اور فی الواقع سیاحت نہ صرف ایک تنہا عبادت ہے بلکہ کتنی ہی عبادتوں کا مجموعہ ہے گھر بار چھوڑنا، عزیز و اقارب کی جدائی برداشت کرنی۔ سفر کی مشقتوں میں پڑنا قدم قدم پر مال خرچ کرنا، آب و ہوا کی ناموافقت، اجنبیوں سے صحبت اور پھر ان تمام موانع

و مشکلات میں عزم و عمل کا استوار رہنا، ایثار و تحمل کے کتنے مرحلے طے کرنے پڑتے ہیں تب کہیں جا کر یہ عمل انجام پاتا ہے۔

سورہ تحریم میں یہی وصف مسلمان عورتوں کے لیے بھی فرمایا مومنات تائبات عابدات سائحات اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف صحابہ کرام کی بیبیاں بلکہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات بھی جنگ میں جاتی تھیں اور مجاہدین کی خدمت کرتی تھیں بعد کو اس بارے میں جو حال رہا وہ معنی سے مستغنی ہے۔

کچھ شارحین قرآن کو اس پر تعجب ہوا کہ سیر و سیاحت کا شمار بھی ایمانی خصائص میں ہو اس لیے السائحون کے لغوی اور اصطلاحی معنے سے گریز کرنے لگے لیکن فی الواقع ان کا تعجب خود محل تعجب ہے قرآن نے ہجرت کو ایمان کا بہترین عمل قرار دیا ہے جو گھر بار چھوڑ کر نکلنا ہے اور جہاد فی سبیل اللہ کیلئے نفر کا حکم دیا انفروا خفافا وثقالا اور حج ہر مستطیع مسلمان پر مرد ہو یا عورت فرض کر دیا جو باشندگان مکہ کے علاوہ سب کے لیے بڑی سے بڑی سیاحت ہے نیز جا بجا درز دیا کہ ملکوں کی سیر کرو۔ پہلی قوموں کے آثار و باقیات سے عبرت حاصل کرو۔ ان کے عروج و زوال کے حالات و بواعث کا کھوج لگاؤ۔

بہر حال سیاحت اسلام میں صرف سیاحت نہیں بلکہ عبادات کا ایک جامع پیمانہ ہے۔ اسی سورۃ کے آخر میں ہم سیاحت علمی پر تبصرہ کریں گے انشاء اللہ

نماز ایمانی تربیت کی منزل

نماز ایمانی تربیت کے لیے ایک تریاق مجرب ہے اس کے لیے قرآن میں رکوع و سجود کی تعبیر اختیار فرمائی ہے۔ یہ دونوں نماز کے فرائض میں داخل ہیں۔ اسلام میں جو نماز کا مقام ہے وہ کسی بھی دوسرے عمل کا نہیں ہے۔ مومن کا ہر کام اللہ کی بندگی کا کام ہوتا ہے مگر نماز جیسی بندگی کی شان کسی کام کی نہیں ہوتی ان کا باطن ہی نہیں ظاہر بھی سراپا بندگی ہوتا ہے۔ نماز کی قراءتوں کو دیکھو اور اس کی دعاؤں تسبیحوں اور قراءتوں پر غور کرو۔ عاجزی اور سرافگندگی کے اظہار کی کوئی ممکن شکل نہیں جو نماز کے ظاہر اور اس کے باطن میں موجود نہ ہو یہ سینے کے نیچے ہاتھ باندھے اور آنکھیں جھکائے ادب سے کھڑا ہونا۔ یہ کمر کا خم کرنا یہ زمین پر اپنی پیشانی کا ڈال دینا اور زبان پر اللہ سبحانہ کی حمد کے، تسبیح کے تکبیر کے توحید کے کلمات کا مسلسل جاری رہنا اور یہ دل کا اللہ سبحانہ کی خشیت عظمت اور محبت

سے معمور رہنا۔ آخر بندگی کی کونسی ادا ہے جس سے یہ نماز خالی ہے۔

قرآن و حدیث کا مطالعہ کیجئے تو نماز کی اہمیت اور فضیلت سے ان کے صفحات بھرے نظر آئیں گے نماز ہی ایمان کا سب سے پہلا مظہر ہے۔ احادیث میں شہادتین کے بعد سب سے پہلے نماز کا ذکر ہے۔ یہ گویا اس بات کا اشارہ ہے کہ اگر انسان کے اندر ایمان موجود ہے اور اللہ کی معبودیت اور اپنی عبدیت پر اسے یقین ہو تو یہ یقین سب سے پہلے نماز کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے قرآن کی آیات اور ارشادات نبوت آپ پڑھیں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ ایمان کے بعد سب سے اولیت نماز کو ہے اس انداز بیان سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ دل میں اگر ایمان کا بیج پڑ گیا ہو تو اس سے عمل کا جو پہلا پودا نکلے گا وہ نماز کا پودا ہوگا۔

یہاں یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ جب قرآن نے دوسرے مقامات پر نماز کے لیے اقامت صلوٰۃ کی تعبیر اختیار کی ہے تو یہاں اقامت کی تعبیر کو چھوڑ کر رکوع و سجود کی تعبیر کیوں اختیار کی ہے۔ اور دل کا پتہ نہیں مگر میرا اپنا خیال یہ ہے کہ یہاں صرف فرض نماز ہی مراد نہیں بلکہ نوافل اور خصوصاً تہجد کی خلوت میں نماز مراد ہے۔ روحانی تربیت کا آغاز اسی نماز سے ہوا ہے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

روحانی تربیت کی منازل میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی اہم ترین منزلیں ہیں۔ اب تک جن باتوں کا ذکر ہوا ہے ان کا بیشتر تعلق اپنی ذاتی اصلاح سے ہے اب یہ ان کا تعلق قوم اور جماعت سے ہے یعنی وہ دوسروں کے خیر و شر سے بے تعلق رہ کر زندگی نہیں گذارتے بلکہ دوسروں کی اصلاح کے لیے بھی اپنے اندر تڑپ رکھتے ہیں اور اپنی طاقت و صلاحیت کے مطابق اصلاح منکر کا فرض انجام دیتے ہیں۔

دنیا درحقیقت کش مکش اور جد و جہد کا ایک میدان ہے جس میں تمام انسان باہمی معاونت سے اپنا اپنا راستہ طے کر رہے ہیں۔ راستہ میں سب لوگوں کے ساتھ چلتے ہیں یقیناً بہت کچھ تکلیفیں ہیں ہر ایک کو دوسرے کی تکلیف و آرام کا لحاظ اور خیال کرنا پڑتا ہے اسی لیے وہ شخص جو ان جماعتی مشکلات سے گھبرا کر الگ ہو جاتا ہے اور صرف اپنا بوجھ اپنے کندھے پر رکھ کر چل کھڑا ہوتا ہے دنیا کے معرکہ کا نامرد سپاہی ہے گوشہ نشینی اور جماعت سے علیحدگی کی اجازت اسلام نے صرف ایک ہی موقع پر دی ہے کہ جماعتی قوام اتنا بگڑ جائے کہ مرکز نظام باقی نہ رہے اور فتنہ فساد کے شعلے

اتنے بھڑک چکے ہوں کہ ان کا بجھانا قابو سے باہر ہو جائے۔ اسی لیے جماعت کے افراد پر انکی طاقت کے مطابق جماعت کے دوسرے افراد کی نگرانی فرض ہے۔ اسی اخلاقی فریضہ کا نام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ لیکن یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر ان پڑھ کا کام نہیں ہے کیونکہ اگر ایسا ہو تو وہ اس کے بہانہ سے فتنہ و فساد پیدا کریں گے۔ سب سے پہلے یہ اس شخص کا کام ہے جو دین کا صحیح علم رکھتا ہو اور جو نصیحت و فہمائش خوش اسلوبی نرمی اور مصلحت کے ساتھ کر سکے یہ تمام احتیاطیں اور تاکیدیں اس لیے کہ لوگوں میں کد اور ضد نہ ہونے پائے اور نیکی کی بجائے برائی کا اندیشہ نہ پیدا ہو جائے۔

اس سے یہ نکتہ بھی خود بخود معلوم ہو رہا ہے کہ جب الآمرون بالمعروف والناھون عن المنکر ہر مسلمان کا ایمانی تقاضا ہے تو اسلام کا علم حاصل کرنا بھی ہر مسلمان کی ایمانی ذمہ داری ہے یہی معنے ہیں کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ان موصوفین کی جس قدر صفات کے ذریعے ان کا چہرہ پیش کیا گیا ہے ان میں توبہ، عبادت، حمد، سیاحت، رکوع و سجود، امر بالمعروف کو بغیر کسی رابطہ اور عطف کے پیش کیا ہے لیکن الناھون عن المنکر کو بذریعہ عطف ذکر کیا گیا ہے؟ شارحین قرآن نے اس پر مختلف گوشوں سے بحث کی ہے۔

قاضی بیضاوی اور قاضی ثناء اللہ فرماتے ہیں کہ واؤ یہ بتانے کے لیے لائے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دونوں کا مجموعہ اصل میں ایک ہی چیز کے دو عنوان ہیں۔ علامہ خفاجی نے قاضی صاحب موصوف کے ارشاد کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ امر بالمعروف جو کرتا ہے وہ ساتھ ہی نہی عن المنکر بھی کرتا ہے اور جو نہی عن المنکر کرتا ہے وہ ساتھ ہی امر بالمعروف بھی کرتا ہے مثلاً نماز پڑھنا ایک معروف ہے تو نماز نہ پڑھنا منکر ہے جب آپ کسی کو نماز کے لیے کہتے ہیں تو یہ اگر ایک طرف امر بالمعروف ہے تو ساتھ ہی یہ نہی عن المنکر بھی ہے۔ کچھ علماء نے بتایا ہے کہ عام زبان سے متعلق ہے اس میں کوئی حکمت و علت نہیں ہے عربی زبان میں جب ایک سے زیادہ پیش کرتے ہیں تو ان میں سے کچھ کو عطف کے ذریعے اور کچھ کو بغیر عطف پیش کرتے ہیں جیسے تنزیل الکتاب من اللہ العزیز العلیم غافر الذنب و قابل التوب یہ بات علامہ قرطبی نے بتائی ہے۔

اس موضوع پر سب سے اچھی بات علامہ بقاعی کی تحقیق ہے اس کا تعلق مضمون کی اہمیت

سے ہے وہ فرماتے ہیں :

وہ تمام اوصاف جو بغیر عطف کے پیش کئے گئے ہیں ان میں منشا الہی صرف یہ ہے کہ جس قدر کر سکتے ہو کرو۔ اور جن اوصاف کو عطف کے ذریعے پیش کیا ہے ان میں مقصود یہ امر بالمعروف نہی عن المنکر حفظ حدود ہے کہ ان کو بھرپور طریقے پر پوری لگن سے انجام دیا جائے ان میں کوتاہی کرنے والا عمارت اسلام کو گرانے پر راضی ہے۔ کیونکہ نہی عن المنکر عبادت کی ساری قسموں میں سے دشوار ترین عبادت ہے کیونکہ اس کا تعلق اپنے سے کم اور دوسروں سے زیادہ ہے

روحانی تربیت کی آخری منزل

روحانی تربیت کے سلسلے میں آخری منزل یہ ہے والحافظون لحدود اللہ۔ حدود حد کی جمع ہے اس کے معنی لغت میں روک کے آتے ہیں اس سے مراد اللہ سبحانہ کے قوانین ضوابط اور احکام ہیں۔ علامہ آلوسی نے بعض محققین کی طرف نسبت کرکے لکھا ہے کہ حفظ حدود سے مراد یہاں فوجداری قوانین کو نافذ کرنا ہے اور علامہ بقاعی نے اس فقرے کی تشریح اس طرح کی ہے۔

"وہ قوانین جن کو شہنشاہ اعظم نے اس کتاب و شریعت میں بیان کیا ہے"۔

اصل یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو دین اللہ سبحانہ کی جانب سے لے کر آئے ہیں وہ ایک ایسا مکمل نظام ہے جو انسانی زندگی کے اعتقادی فکری اخلاقی اور عمل تمام پہلوؤں کو پوری طرح گھیرے ہوئے ہے کچھ اسی طرح جیسے ہوا کا کرہ اس زمین کو چاروں طرف سے اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ اسلام صرف چند رسوم کا نام نہیں ہے اور انسان کی انفرادی زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اس میں روحانی نظام کے ساتھ ساتھ اخلاقی نظام، عائلی نظام، معاشرتی نظام، معاشی نظام سیاسی نظام اور قانونی نظام بھی موجود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی کے سارے گوشوں میں اللہ کے قوانین کی حفاظت کرنے والے ہیں ان کی زندگی کا کوئی پہلو بھی قانون الہی کی گرفت سے خالی نہیں ہے وہ اول و آخر۔ خلوت و جلوت، اخلاق، معاشرت معاش، خاندان، قانون، حکومت اور سیاست میں اللہ کے احکام و قوانین کے پابند رہتے ہیں، ان کی معاملات اخلاق کاروبار رہن سہن، نظام حکومت قوانین عدالت سب میں اللہ کے قوانین کی بھرپور نگہداشت ہوتی ہے۔

ایمان کامل کا چہرہ

یہ اوصاف جن کے ذریعے ایک مومن کا چہرہ قرآن نے پیش کیا ہے علامہ بقاعی نے ان اوصاف میں ایک خاص طبعی ترتیب کی نشان دہی کی ہے سنیے آپ بھی پڑھ لیجئے۔

توبہ کی صفت یہ بتانے کیلئے ہے کہ شرک جیسی معصیت کے داغ سے ان کا دامن ایمان آلودہ نہیں ہے اور عبادت کا وصف یہ بتا رہا ہے کہ یہ ایمان کی زندگی میں رسوم و رواج سے آزاد ہو کر اللہ سے مخلصانہ عابدانہ تعلقات رکھتے ہیں اور حمد یہ بتانے کے لیے ہے کہ ان کا قالب بھی قلب کے ساتھ اللہ کے گن گا کر شائستگی حاصل کر چکا ہے اور السائحون لاکر اشارہ کیا ہے کہ ان کی ایمانی زندگی میں وسعت اور فراخی ہے الراکعون الساجدون سے یہ ظاہر کیا ہے کہ ان میں ظاہر و باطن کے کمالات جمع ہو گئے ہیں الامرون بالمعروف والناھون عن المنکر میں بتایا جا رہا ہے کہ ان کا نیکیوں کا کردار اور برائیوں سے اجتناب صرف ان کی ذات تک محدود نہیں ہے بلکہ ان کی جانب سے اس کا فیضان سوسائٹی میں بھی پہنچ رہا ہے الحافظون لحدود اللہ سے اشارا ہے کہ ان کے اعمال و افکار ہنگامی نہیں بلکہ دائمی ہیں۔ اسی طرح اس آیت کا مقصود انسان کو جسمانی پستی سے اٹھا کر روحانی بلندی کی طرف لے جانا ہے۔

آخر میں وبشر المومنین ہے اس کے معنی ہیں اور اہل ایمان کو خوشخبری دیجیے اور اس سے پہلے جملہ محذوف ہے وبشر المومنین کے بعد بشر بہ محذوف ہے۔ آلوسی، رازی، قرطبی، ابوحیان اور بیضاوی پہلی بات کو نظر انداز کر گئے لیکن علامہ بقاعی نے خوبصورتی سے معطوف علیہ کی نشاندہی کی ہے فرماتے ہیں کہ پوری بات اس طرح ہے کہ

آپ ان لوگوں کو جو ان اوصاف سے خالی دامن ہوں ڈرائیے اور جو ان اوصاف سے آراستہ ہوں ان کو خوشخبری دیجئے۔

بشر فعل ہے یہ دو مفعول چاہتا ہے ایک بشارت دوسرے جسے بشارت دی جائے یہاں دوسرا مفعول مومنین کی صورت موجود ہے مگر پہلا مفعول مذکور نہیں ہے شارحین قرآن نے اپنے اپنے انداز میں پیش کیا ہے آلوسی فرماتے ہیں کہ بشر بہ کو اس لیے حذف کر دیا گیا ہے کہ اس کے بیان کرنے کی الفاظ میں تاب نہیں ہے یعنی جلالتِ قدر اور عظمت شان کی وجہ سے قاضی بیضاوی نے بھی آلوسی

سے پہلے ہی بات بتائی تھی اور کچھ نے جنت محذوف مانا ہے۔

یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ تعبیر میں مومنین کی صراحت فرمائی ہے حالانکہ تقاضائے تعبیر یہ ہے کہ مومنین کی جگہ اسم ضمیر لائی جائے اور بات اس طرح ہو کہ ان کو بشارت دے دیجئے۔ اس صراحت میں کیا راز ہے؟

شارحین قرآن بتاتے ہیں کہ بتانا یہ ہے کہ ان اوصاف کی قیمت اس وقت ہے جب ایمان کی زمین پر ہوں۔ ان سے ایمان میں حسن و جمال اور کمال اس وقت ہوتا ہے جب اس میں یہ اوصاف ہوں۔ اور مزہ یہ ہے کہ آیت گرامی کا ایمان سے آغاز کر کے ایمان پر خاتمہ کر دیا ہے تاکہ پتہ لگ جائے کہ ایمان میں رسوخ ان اوصاف سے حاصل ہوتا ہے البقاعی لکھتے ہیں کہ اشارہ ہے کہ یہ وہ دستر خوان ہے جس میں طفیلی بھی محروم نہیں جاتا ہے۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ روئے سخن راسخین کی طرف ہے جن کو ایمان میں رسوخ نہیں ہے وہ قابل خطاب نہیں ہیں یہ میٹھی سی ان لوگوں پر طنز ہے جو نفاق کی آغوش میں ہیں۔

آیئے آیت کے آخر میں حضرت مولانا اشرف علی رحمہ اللہ کا ایک اچھوتا افادہ بھی پڑھ لیجئے وہ اس پوری آیت پر نوٹ لکھتے ہیں۔

ان صفات کی قید لگانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کے بغیر جہاد کا ثواب نہیں ملتا کیونکہ نصوص کثیرہ میں صرف جہاد پر بشارات وارد ہیں البتہ ایمان ایک ضروری شرط ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان سب کے اجتماع پر ثواب اور فضیلت میں اور کثرت اور قوت زیادہ ہو جاتی ہے تاکہ صرف جہاد پر نہ بیٹھ جاویں بلکہ ان عبادات کو بھی ہمیشہ بجا لاویں اور چونکہ جہاد میں اکثر مال بھی خرچ ہوتا ہے اور جان کا خرچ کرنا زیادہ اہم ہے اس لیے شروع آیت میں تو انفس و اموال دونوں کا ذکر فرمایا اور اس کی تفصیل میں صرف جانوں کے خرچ یعنی قتال پر اکتفا فرمایا۔ اور جان خرچ کرنے سے مراد قتال ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ مقتول بھی ہو۔ اس سے یہ شبہ جاتا رہا کہ جان تو مرنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے پھر اس کو خرچ کرنے کے کیا معنے ہیں[1]

بات ادھوری رہ جائے گی اگر اس موقعہ پر حضرت مولانا ابو الکلام کے تشریحی نوٹ کو نظر انداز کر دیا جائے۔ یہ تشریح اس لائق ہے کہ اسے بار بار پڑھا جائے۔

---

[1] بیان القرآن

یہ بحث اس سورت کے مہمات معارف میں سے ہے فرمایا سچے مومنوں کے اوصاف و مدارج یہ ہیں۔

(ا) التائبون یعنی وہ جو اپنی توبہ میں سچے اور پکے ہوتے ہیں اور بہرحال اللہ کی طرف رجوع کرتے اور اپنی غفلتوں اور لغزشوں پر نادم ہوتے ہیں۔

(ب) العابدون یعنی وہ جو اللہ کی عبادت میں سرگرم رہتے ہیں اور ان کی ساری بندگیاں اور نیاز مندیاں صرف اسی کے لیے ہوتی ہیں۔ عبادت سے مقصود عبادت خاص بھی ہے اور عام بھی خاص یہ کہ خاص وقتوں اور خاص شکلوں میں یہ عبادت جو دین حق نے قرار دیدی ہے اسے پورے اخلاص اور خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرے۔ عام یہ کہ انسان کی فکری حالت عبادت گذارانہ ہو جائے۔ اور پھر وہ جو کچھ سنے جو کچھ بھی کہے جو کچھ بھی کرے سب میں ایک عابدانہ روح کام کر رہی ہو۔

(ج) الحامدون یعنی وہ جو اپنے فکر سے اور اپنے قول سے اللہ کی حمد و ستائش کرنے والے ہیں فکر سے حمد و ستائش یہ ہوئی کہ بحکم ویتفکرون فی خلق السماوات والارض۔ آسمان و زمین کی تخلیق میں غور و فکر کرنا اور ان تمام کارفرمائیوں کی معرفت حاصل کرنا جو اس کی محمودیت و جمال پر دلالت کرتی ہیں۔ قول سے حمد و ستائش اس فکری حالت کا قدرتی نتیجہ ہے کیونکہ جس ہستی کی محمودیت دل و دماغ میں بس جائے گی ضروری ہے کہ زبان سے بھی بے اختیار اس کی حمد و ثنا کے ترانے نکلنے لگیں

(د) السائحون وہ جو راہ حق میں سیر و سیاحت کرتے ہیں یعنی بحکم قد خلت من قبلکم سنن فسیروا فی الارض زمین میں عبرت و نظر کے لیے گردش کرتے ہیں۔ علم کی ڈھونڈھ میں نکلتے ہیں۔ راہ حق میں جد و جہد کرتے ہوئے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ کا رخ کرتے ہیں حج کے لیے خشکی و تری کی مسافتیں طے کرتے ہیں۔

(ہ) الراکعون الساجدون جو اللہ کے آگے جھک جاتے ہیں اور رکوع و سجود سے کبھی نہیں تھکتے۔ یہ رکوع و سجود کی حالت جسم پر بھی طاری ہوتی ہے۔ قلب پر بھی طاری ہوتی ہے زبان پر بھی طاری ہوتی ہے۔

(و) الآمرون بالمعروف والناھون عن المنکر وہ جو نیکی کا حکم اور برائیوں سے روکتے ہیں یعنی صرف اپنے ہی نفس کی اصلاح پر قانع نہیں ہو جاتے بلکہ دوسروں کو بھی اصلاح کرنے اور دنیا میں حق و عدالت کے نشر و قیام کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

(ز) الحافظون لحدود اللہ یہ آخری وصف اور آخری مقام ہے یعنی وہ ان تمام حدود کی حفاظت کرتے ہیں جو اللہ نے انسان کے لیے ٹھہرا دی ہیں۔ قرآن کی اصطلاح یہ ہے کہ تمام واجبات وحقوق کو خواہ افراد کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں یا جماعت سے وہ حدود اللہ سے تعبیر کرتا ہے یعنی یہ حدیں ہیں جو مقرر کر دی گئی ہیں ان کے ٹوٹنے میں انسانی امن وسعادت کی بنیادوں کا ٹوٹ جانا ہے۔

یہ کل سات وصف ہوئے اور جس ترتیب سے بیان کئے گئے ہیں وہ قابل غور ہے یہ گویا نفس انسانی کے تزکیہ وترقی کے سات درجے ہیں یا سات طبقے۔ جو یکے بعد دیگرے ٹھیک اسی ترتیب سے سلوک ایمانی میں پیش آتے ہیں۔

جب کوئی شخص معاصی وہدایت کی راہ میں قدم اٹھائے گا تو قدرتی طور پر پہلا مقام توبہ وانابت ہی کا ہوگا یعنی پچھلی غفلتوں اور گمراہیوں سے خواہ وہ کفر کی ہوں خواہ نفاق کی خواہ معاصی وزلات کی باز آئے گا اور آئندہ کے لیے ان سے بچنے کا عہد کرے گا اور اپنے سارے دل اور ساری روح سے اللہ کی طرف رجوع کرے گا اور یہی توبہ کی حقیقت ہے پھر اگر توبہ سچی ہوگی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ اللہ کی بندگی ونیازمندی کی سرگرمی پیدا ہو جائے بس یہ دوسری منزل ہوئی یا سلوک ایمانی کا دوسرا درجہ۔ پھر چونکہ عبادت گذاری کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ فکر اور ذکر کا مقام حاصل ہو جائے اور ملکوت السماوات والارض کے مشاہدہ ومعرفت کا دروازہ کھل جائے اس لیے تیسری منزل تسبیح وتحمید کی منزل ہوئی یعنی اللہ کی حمد وثنا کے جوش سے معمور ہو جانے کی منزل ربنا ما خلقت ھذا باطلا۔ پھر اگر توبہ وانابت کا تنبہ عبادت کا ذوق اور تحمید وتسبیح کا عرفانی درجہ کمال کا ہے تو یہ ممکن نہیں کہ وطن ومکان کی الفت کی زنجیریں ٹوٹیں اور سیر وسیاحت میں قدم سرگرم نہ ہو جائیں یہ چوتھی منزل ہوئی۔ اور السائحون کا طبقہ چوتھا ہوا۔

ان چار منزلوں سے جو کارواں گذر جائے گا اس نے اصلاح نفس کی مسافت طے کر لی۔

بس اب پانچویں منزل الراکعون الساجدون کی ہوئی یعنی بندگی ونیازمندی میں پورے ہو گئے اور اللہ کے آگے سر نیاز ہمیشہ کے لیے جھک گیا اب الآمرون بالمعروف اور الناھون عن المنکر کا ان کو مقام حاصل ہو گیا ہے یعنی اپنی تعلیم وتربیت کا کورس پورا کر کے دوسروں کے لیے معلم ومربی ہو جائیں گے چنانچہ چھٹی منزل یہی ہوئی اور

اسی سے آخری منزل کے ڈانڈے مل گئے کہ الحافظون لحدود اللہ کا مقام ہے یہاں پہنچ کر ان کے تمام اعمال حدود الٰہی کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں وہ خود اپنے اعمال میں بھی حدود اللہ کی کامل نگہداشت رکھتے ہیں اور اپنے وجود سے باہر بھی ان کے نفاذ و قیام کی نگہبانی کرتے ہیں [1]

---

[1] ترجمان قرآن

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا
لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ
اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۳﴾ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ
لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ
اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾
وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًاۢ بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ
مَّا يَتَّقُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ
اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۱۶﴾

اللہ کے پیغمبر اور اہلِ ایمان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ مشرکین کے لیے مغفرت کی دعا کریں چاہے وہ ان کے رشتہ دار ہوں۔ باوجودیکہ ان پر واضح ہوگیا ہے کہ یہ دوزخ والے ہیں لہ اور حضرت ابراہیم کی اپنے باپ کے لیے دعائے مغفرت صرف اس لیے تھی کہ ابراہیم نے باپ سے دعائے مغفرت کا وعدہ کرلیا تھا

جب حضرت ابراہیمؑ کے سامنے یہ بات کھل کر آگئی کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس سے حضرت ابراہیمؑ نے بیزاری کا اعلان کر دیا۔ حضرت ابراہیمؑ بڑے ہی دردمند اور بردبار تھے ۲ے اور اللہ کی یہ شان نہیں ہے کہ کسی گروہ کو ہدایت دے کر پھر اسے بے راہ کر دے تا آنکہ ان کے سامنے ان سب باتوں کو کھول دے جن سے ان کو بچنا ہے۔ بلاشبہ اللہ سب کچھ جانتا ہے ۳ے یقیناً آسمان و زمین کی بادشاہت اللہ کی ہے وہ ہی مارتا ہے وہ ہی جلاتا ہے۔ مسلمانو! اللہ کے سوا تمہارا کوئی کارساز اور کوئی مددگار نہیں ہے ۴ے

مفردات کے معانی

اواہ اوہ ہے جس کے معنی آہیں بھرنے کے ہیں مبالغہ کا صیغہ بروزن فعال بہت زیادہ آہیں بھرنے والا۔ ابوحیان اندلسی نے البحر المحیط میں اس کے ایک سے زیادہ مرادی معنے لکھے ہیں مثلاً بہت زیادہ دعا کرنے والا، مومن، رحمدل، فقیہ تسبیح میں مشغول رہنے والا، اللہ کو زیادہ یاد کرنے والا، کتاب اللہ کی بہت زیادہ تلاوت کرنے والا۔ اللہ کے ڈر سے زیادہ آہ آہ کرنے والا بارگاہ الٰہی میں زیادہ گڑگڑانے والا۔ حبشی زبان میں مومن یعلم خیر، وعدہ کو پورا کرنے والا۔ گناہوں کو یاد کرتے وقت استغفار کرنے والا۔ مہربان، ہر بری بات سے پلٹ جانے والا۔ شوکانی لکھتے ہیں

لغت کے اعتبار سے اداہ کے زیادہ مناسب معنے اپنے گناہوں پر بہت زیادہ آہ آہ کرنے کے ہیں فراء کی بھی یہی رائے ہے حلیم بردبار، تحمل کرنے والا۔ باد فار حلم سے جس کے معنے جوش غضب سے نفس اور طبیعت کو روکنے یعنی بردباری اور تحمل کرنے کے ہیں بروزن فعیل صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔

مشرکین کے لیے دعائے مغفرت نہیں

زمانہ نبوت کے مسلمانوں نے اللہ کے دین کی خاطر دنیا کے سارے مفادات قربان کر دیئے انہیں اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے لڑنے میں لمحہ کے لیے بھی تامل نہیں ہوا۔ جنہوں نے اسلام کے خلاف تلوار اٹھائی تھی۔ اور اس وقت حالت ہی ایسی ہو گئی تھی کہ کلمہ حق کا ساتھ دینا۔ دنیا کے تمام رشتوں علاقوں کو خیر باد کہہ دینا تھا لیکن اسلام کے جو دشمن لڑتے ہوئے قتل ہو گئے یا اپنی موت مر گئے۔ ان کی حالت زندوں سے مختلف ہو گئی۔ کیونکہ اب وہ زندہ نہ تھے کہ مسلمانوں پر ظلم وستم کرتے یا ان کے خلاف لڑتے۔ کچھ لوگوں کو خیال ہوا کہ جب اللہ کے رسول کی دعا مقبول ہے تو کیوں نہ ہم اپنے ان عزیزوں کے لیے دعا مغفرت کی التجا کریں جو مر چکے ہیں۔ قرآن میں حضرت ابراہیم کے متعلق ہے کہ انہوں نے اپنے باپ کے لیے دعا مغفرت کی تھی حالانکہ وہ مشرک تھا واغفر لابی انہ کان من الضالین۔

کسی شخص کے لیے دعائے مغفرت کے معنی یہ ہیں کہ اول تو ہم اس کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں دوسرے یہ کہ ہم اس کے قصور کو قابل معافی سمجھتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں اس شخص کے معاملہ میں تو درست ہیں جو وفاداروں کے زمرے میں شامل ہو اور صرف گنہ گار ہو۔ لیکن جو شخص کھلا ہوا باغی ہو، اس کے ساتھ ہمدردی رکھنا اور اس کے جرم کو قابل معافی سمجھنا نہ صرف یہ کہ اصولاً غلط ہے بلکہ اس سے خود ہماری وفاداری بھی مشتبہ ہو جاتی ہے۔ اور اگر ہم محض اس بنا پر کہ وہ ہمارا رشتہ دار ہے یہ چاہیں کہ اسے معاف کر دیا جائے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ہمارے نزدیک رشتہ داری کا تعلق اللہ سبحانہ کی وفاداری سے زیادہ قیمتی ہے اور یہ کہ اسلام کے ساتھ ہماری محبت بے لاگ نہیں ہے یہ تمام باتیں غلط ہیں اخلاص و وفاداری کے خلاف ہیں اور اس ایمان کے منافی ہیں۔

۱۱۸ اللہ کے پیغمبر اور اہل ایمان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ مشرکین کے لیے دعا مغفرت کریں چاہے وہ ان کے رشتہ دار ہوں باوجودیکہ ان پر واضح ہو چکا ہے کہ یہ لوگ دوزخ والے ہیں مومنین جب جان و مال سے اللہ سبحانہ کے ہاتھ بیع ہو چکے تو ضروری ہے کہ تنہا اسی کے ہو کر رہیں۔ اعداء اللہ سے جن کا

دشمن خدا اور جہنمی ہونا معلوم ہو چکا ہو محبت و مہربانی کا واسطہ نہ رکھیں خواہ یہ دشمنان خدا ان کے ماں باپ چچا تایا اور خاص بھائی بند کیوں نہ ہوں جو خدا کا باغی اور دشمن ہے وہ ان کا دوست کیسے ہو سکتا ہے پس جس شخص کی بابت پتہ چل جائے کہ بالیقین دوزخی ہے خواہ وحی الٰہی کے ذریعے سے یا اس طرح کہ علانیہ کفر و شرک پر اس کی موت ہو چکی ہو اس کے حق میں استغفار کرنا اور بخشش مانگنا ممنوع ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ یہ آیت آنحضرت کی والدہ حضرت آمنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ کچھ حدیثوں میں ہے کہ آپ کے چچا ابوطالب کے حق میں اتری اور بعض نے نقل کیا ہے کہ مسلمانوں نے چاہا اپنے آبا مشرکین کے لیے جو مر چکے تھے مغفرت کی دعا کریں اس آیت ان کو منع کیا گیا۔ بہرحال شان نزول کچھ ہو حکم یہ ہے کہ کفار و مشرکین کے حق میں جن کا خاتمہ کفر پر ہو چکا ہے استغفار جائز نہیں ہے[1]

استغفار کی ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کے باغیوں کے لیے مغفرت کی دعا کرنا اس ایمان کے منافی ہے کہ اللہ سبحانہ اور ان کے دین کے ساتھ ہماری محبت بالکل بے لاگ ہو۔ اللہ کا دوست ہمارا دوست ہو اور اللہ کا دشمن ہمارا دشمن۔ اسی لیے اللہ سبحانہ نے یہ نہیں فرمایا کہ مشرکین کے لیے دعائے مغفرت نہ کرو بلکہ یوں فرمایا کہ تمہارے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ تم ان کے لیے مغفرت کی دعا کرو یعنی ہمارے منع کرنے سے اگر تم باز رہے تو کچھ بات نہیں تم میں تو خود وفاداری کی حس اتنی تیز ہونی چاہیے کہ جو ہمارا باغی ہے اس کے ساتھ ہمدردی رکھنا اور اس کے جرم کو قابل معافی سمجھنا تم کو اپنے لیے نازیبا محسوس ہو۔

یہ آیت بتا رہی ہے مرنے کے بعد مرنے والے کے حق میں دعا کرنا ایک بڑا حق ہے جو مرنے والے کا زندوں پر رہ جاتا ہے۔ پوری سورت میں کافروں سے ترک تعلقات کے احکام ہیں۔ اب حکم یہ ہو رہا ہے کہ کافروں کی حد تک اس بڑے حق سے دست بردار ہو جائیں جرم شرک ان کے اس حق کو بالکل مٹا دیتا ہے ولو کانوا اولی قربی اس سے معلوم ہوا کہ کفر کی موجودگی میں نجات کے لیے قرابت شرعی سبب نہیں۔ اور تو اور نبی کی قرابت بھی مفید نہیں۔ بیٹا نبی ہو باپ کافر ہو باپ نبی ہو بیٹا کافر ہو چچا کافر ہو بھتیجا نبی ہو بیوی کافرہ ہو شوہر نبی ہو یہ تمام قرابتیں کفر کی موجودگی میں سامان نجات نہیں اگرچہ نبی سے ہوں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

علامہ بقاعی اور علامہ قرطبی نے من بعد ما تبین سے یہ نکتہ خوب معلوم کیا ہے کہ کافر زندہ کی ہدایت و مغفرت کے لیے دعا کرنی جائز ہے کیونکہ جہنمی ہونا ہمیں معلوم نہیں ہے ہاں وہ کافر جو مرچکا ہے اور کفر ہی پر جس کی موت ہوئی ہے اس کے لیے مغفرت کی دعا جائز نہیں ہے۔

آیت کا سبب نزول

شارحین قرآن نے اس آیت کا پس منظر متعین کرنے میں ایک سے زیادہ واقعات لکھ دیے ہیں۔ سب سے پہلے صحیح بخاری کے حوالہ سے بتایا ہے کہ یہ آیت ابو طالب کی وفات کے وقت اس موقع پر نازل ہوئی جب وہ دم والپسیں میں تھے اور حضور ان کو دعوت اسلام دے رہے تھے انہوں نے آپ کی دعوت قبول نہیں کی تو یہ آیت گرامی نازل ہوئی۔ آلوسی لکھتے ہیں والآیۃ علی الصحیح نزلت فی ابی طالب مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ ابو طالب کا انتقال ہجرت سے تین سال پہلے ہوا ہے اور سورہ برارت کا نزول ۹ھ میں ہوا ہے یہ امت کے نام ایک دواعی پیام ہے۔ حافظ عسقلانی نے فرمایا ہے کہ حضور اقدس ابو طالب کی وفات سے ۹ھ تک یعنی پورے بارہ سال تک استغفار کرتے رہے ہوں گے مدت کے بعد مدینہ میں ممانعت کی بات بتائی ہے مگر بات بنی نہیں ہے۔ آلوسی نے اعتراض کی گرفت سے بچنے کے لیے یہ بات بنائی ہے کہ آیت کا نزول دوبار ہوا ہے۔ قرطبی الحسین الفضل کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ یہ کہانی بعید از عقل ہے کیونکہ سورہ برارت نزول میں آخری سورت ہے جب کہ ابو طالب کا انتقال آغاز اسلام میں مکہ میں ہو چکا تھا۔ اور اس کا قرطبی نے کوئی جواب نہیں دیا ہے۔ اس موضوع پر یہ سب سے زیادہ صحیح روایت کا حال ہے۔ باقی روایات وہ ہیں جن کی محدثین نے تضعیف کی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ استیناف بیانی ہے چونکہ پوری سورت میں اس پر زور دیا گیا ہے کہ دشمنوں سے اعانت و رفاقت کے تعلقات نہ رکھو اگرچہ وہ تمہارے قرابت دار ہی کیوں نہ ہوں یہاں یہ سوال خود بخود چٹکیاں لینے لگا کہ زندوں سے تعلقات تو منقطع ہیں کیا مرنے کے بعد بھی ایسے لوگوں کے لیے اللہ سے مغفرت کی دعا نہ کرنی چاہیئے۔ فرمایا کہ جب تمہیں پتہ ہے کہ ان کی زندگیوں کا خاتمہ کن اعمال پر ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ بیس برس تک داعی حق اور دعوت حق کے جانی دشمن رہے اور کفر و جحود اور ظلم و جور کی کوئی شرارت بھی ایسی نہیں ہے جو انسان کر سکتا ہو اور انہوں نے نہ کی ہو پھر ان کی زندگی کا خاتمہ بھی اسی عالم میں ہوا اور اپنے اعمال پر ایک منٹ بھی شرمندہ نہیں ہوئے۔

جن لوگوں کی حالت ایسی ہو چکی ہو ان کے دوزخی ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے مغفرت مانگنا ایمان سے وفاداری کے خلاف ہے اور ایسا کرنا نہ پیغمبر کی شان ہے اور نہ تمہیں زیب دیتا ہے

حضرت ابراہیم کی دُعا باپ کیلئے

۹ؔ۱۱۵ اور حضرت ابراہیم کی اپنے باپ کے لیے دعائے مغفرت صرف اس لیے تھی کہ ابراہیم نے اپنے باپ سے دعائے مغفرت کا وعدہ کر لیا تھا جب حضرت ابراہیم کے سامنے یہ بات کھل کر آگئی کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس سے حضرت ابراہیم نے بیزاری کا اعلان کر دیا حضرت ابراہیم بڑے ہی دردمند اور بردبار تھے۔ سورہ مریم میں ہے کہ جب ابراہیم کے باپ نے قبول حق سے اعراض کیا۔ اور ضد وعناد سے حضرت ابراہیم کو قتل کی دھمکیاں دینے لگا تو آپ نے والدین کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے فرمایا سلام علیک ساستغفر لک ربی انہ کان بی حفیا میں اللہ سے تیرے لیے استغفار کروں گا۔ اس وعدہ کے مطابق آپ برابر استغفار کرتے رہے چنانچہ دوسری جگہ فرمایا اغفر لابی اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ابراہیم علیہ السلام ایک مشرک کی حالت شرک پر قائم رہتے ہوئے مغفرت چاہتے تھے۔ نہیں غرض یہ تھی کہ اس کو توفیق دے کہ حالت شرک سے نکل کر آغوش اسلام میں آجائے اور قبول اسلام اس کی خطاؤں کے معاف ہونے کا سبب بنے ان الاسلام یھدم ما کان قبلہ ابراہیم علیہ السلام کے استغفار کو قرآن میں پڑھ کر بعض صحابہ کے دلوں میں خیال آیا کہ ہم بھی اپنے مشرک والدین کے حق میں استغفار کریں اس کا جواب حق تعالیٰ شانہ نے دیا کہ ابراہیم نے وعدہ کی بنا پر صرف اس وقت تک اپنے باپ کے لیے استغفار کیا جب تک یقینی طور پر یہ واضح نہیں ہوا تھا کہ اسے کفر و شرک اور خدا کی دشمنی پر مرنا ہے کیونکہ مرنے سے پہلے احتمال تھا کہ توبہ کر کے مسلمان ہو جائے اور بخشا جائے پھر جب کفر و شرک پر خاتمہ ہونے سے صاف کھل گیا کہ وہ حق کی دشمنی سے باز آنے والا نہ تھا تو ابراہیم اس سے بالکلیہ بیزار ہو گئے اور دعا استغفار وغیرہ ترک کر دیا پہلے نرم دلی اور شفقت سے دعا کرتے تھے جب توبہ رجوع کے احتمالات ختم ہو گئے تو آپ نے اس کی خیر خواہی سے ہاتھ اٹھا لیے اور اس حادثہ کو پیغمبرانہ صبر و تحمل سے برداشت کیا۔

حدیث میں ہے کہ میدان حشر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام عرض کریں گے کہ خداوندا تیرا وعدہ ہے کہ مجھے رسوا نہ کرے گا اور اس سے زیادہ کیا رسوائی ہو گی کہ آج میرا باپ سب کے سامنے دوزخ میں

پھینکا جائے۔ اسی وقت ان کے باپ کی صورت مسخ ہو کر ضبع کفتار کی سی ہو جائے گی اور فرشتے گھسیٹ کر دوزخ میں پھینک دیں گے۔ شاید یہ اس لیے ہو کہ لوگ اسے پہچان نہ سکیں کیونکہ رسوائی کا دار و مدار شناخت پر ہے جب شناخت نہ رہے گی کیا چیز دوزخ میں پھینکی گئی ہے۔ پھر بیٹے کی رسوائی کا کچھ مطلب نہیں ہے[1]

یہاں علامہ بقاعی نے یہ بلیغ نکتہ لکھا ہے کہ وما کان استغفار کا معطوف علیہ محذوف ہے پوری عبارت یوں تھی فما استغفر لھم بعد العلم احد من المومنین وما کان استغفار ابراھیم الخ یعنی اللہ کی جانب سے استغفار کی ممانعت معلوم ہو جانے کے بعد اہل ایمان میں سے کسی نے مغفرت کی دعا نہیں کی اور حضرت ابراہیم کی استغفار تو وعدہ کی وجہ سے تھی۔ وما کان استغفار سے اس شبہ کا ازالہ کر دیا جو بعض طبیعتوں کو ہوا تھا فرمایا اور حضرت ابراہیم نے جو اپنے باپ کے لیے مغفرت کی دعائیں کی تھیں تو صرف اس لیے کہ جب تک آدمی میں زندگی کے انفاس جاری ہیں اسکی ہدایت و اصلاح سے قطعی مایوسی نہیں ہوتی اگرچہ کتنا ہی گمراہی و شقاوت میں ڈوبا ہوا ہو کیونکہ ہو سکتا ہے کہ مرنے سے پہلے باز آجائے کیونکہ جب تک ان کا باپ زندہ رہا وہ مایوس نہ ہوئے اور برابر دعائیں کرتے رہے۔ یہ بات انہوں نے اپنے باپ سے کہہ دی تھی جب اس سے الگ ہوئے تھے اور وہ اپنی بات کے پکے تھے لیکن جب وہ کفر و جحود کی حالت میں مر گیا تو ان پر واضح ہو گیا کہ وہ اپنی روش سے باز آنے والا نہ تھا لہذا وہ اپنی دعا سے دست بردار ہو گئے۔

چنانچہ قرآن نے سورہ مریم اور ممتحنہ میں ان کے اس وعدے کا ذکر کیا ہے سورہ مریم میں ہے کہ جب ان کے باپ نے غصہ میں آکر انہیں نکال دیا اور کہا کہ اگر تو اپنی روش سے باز نہ آیا تو سنگسار کر دوں گا تو انہوں نے کہا سلام علیک ساستغفر لک ربی انہ کان بی حفیا اچھا میں جاتا ہوں۔ تجھ پر سلامتی ہو۔ اب میں اپنے پروردگار سے تیری بخشش کی دعا کروں گا وہ مجھ پر بہت مہربان ہے۔ اور سورہ ممتحنہ میں ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے خاندان سے تمام تعلقات منقطع کر لیے تھے مگر صرف اتنا واسطہ اپنے باپ سے رکھا کہ لاستغفرن لک وما املک لک من اللہ من شیء میں ضرور تیری بخشش کا طلب گار رہوں گا اس سے زیادہ تیرے لیے میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی حال رہا کہ دشمنان حق کے لیے ان کی زندگی میں برابر طلبگار

[1] افادات شیخ الاسلام

بخشش رہے کہ ابھی منقطع نہیں ہوئی تھی جنگ احد میں جب آپ کا چہرہ مبارک زخمی ہو گیا تھا تو زبان مقدس پر یہی دعا طاری تھی رب اغفر لقومی فانھم لا یعلمون۔

آخر میں حضرت ابراہیم کا چہرہ پیش کرتے ہوئے فرمایا ان ابراھیم لاواہ حلیم یہ حضرت ابراہیم کی تعریف اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اللہ سبحانہ کو حضرت ابراہیم کی باپ کے معاملے میں دردمندی اور بردباری بہت پسند آئی۔ ادھر سورہ مریم کی آیت کا جو حوالہ ہم نے دیا ہے اس کے سیاق و سباق کو قرآن میں پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ آذر نے اس موقع پر حضرت ابراہیم کے ساتھ نہایت سنگدلی کا برتاؤ کیا تھا مگر سعادتمند بیٹے نے حلم و بردباری سے نہ صرف باپ کی جھڑکی اور دھمکی برداشت کی بلکہ بہت زیادہ دردمندی اور دلسوزی کے ساتھ اس کے لیے دعا و استغفار کا بھی وعدہ کیا۔ غور فرمایئے کہ ایسے دردمند بیٹے نے جب باپ سے اعلان برارت کیا ہو گا تو جگر پر کتنا بھاری پتھر رکھ کر کیا ہو گا لیکن چونکہ حضرت ابراہیم کے قلب میں اللہ کی محبت تھی اس لیے اپنے قرابت پدری کو قرب خداوندی پر قربان کر دیا۔ اللہ کو یہ پسند ہے کہ بندہ اس کی محبت میں موم بھی ہے اور پتھر بھی اس لیے حضرت ابراہیم نے یہ دونوں پہلو نمایاں کر دیئے۔

یہاں حضرت مولانا اشرف علیؒ کا یہ افادہ بہت ہی خوبصورت ہے اس سے معلوم ہوا کہ قرآن میں جو ابراہیم کی دعا آئی ہے واغفر لابی اس کے معنی یہ ہیں واھد ابی (میرے باپ کو ہدایت دے) اور انہ کان من الضالین اس کے بہت ہی مناسب ہے اور ایک آیت میں جو والدین کے لیے مغفرت کی دعا ہے یوم یقوم الحساب فرمایا ہے وہاں یہ مطلب ہے اھدھما لتغفرلھما یوم یقوم الحساب اور حدیث بخاری میں جو آیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام قیامت کے دن فرمائیں گے انک وعدتنی ان لا تخزنی یوم یبعثون اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہو گا انی حرمت الجنۃ علی الکافرین اور پھر ارشاد ہو گا ما تحت رجلیک اور ان کو وہ بشکل کفتار نظر آئے گا پھر دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ قیامت کی رسوائی سے بچا دوں گا اور اس میں ایک طرح کی رسوائی ہے کہ میرا باپ اس حالت میں ہو تو اس سے مجھ کو بچایئے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا حاصل یہ ہو گا کہ رسوائی سے بچانے کا ایک ہی طریق تو نہیں ہو سکتا کہ اس کی مغفرت کر دی جائے ہم دوسری صورت تجویز کرتے ہیں کہ اس کو مسخ کرتے ہیں کہ کوئی اسے پہنچانتے نہیں۔ اور تم کو شرمندگی نہ ہو۔ خوب سمجھ لو اور یہ بھی یاد رکھو کہ حضرت ابراہیم کا استغفار کرنا جس طرح پر واقع ہے اس طرح اوروں کے لیے بھی جائز ہے[1]

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سعادت وشقاوت کا قانون

۱۱۵ اور اللہ کی یہ شان نہیں ہے کہ کسی گروہ کو ہدایت دے کر پھر اسے بے راہ کر دے تا آنکہ ان کے سامنے ان سب باتوں کو کھول دے جن سے ان کو بچنا ہے بلا شبہ اللہ سب کچھ جانتا ہے یعنی اتمام حجت اور اظہار حق سے پہلے خدا کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔ گمراہی یہ ہے کہ جب اللہ سبحانہ اپنے احکام صاف کھول کر بیان کر چکا ہو پھر امتثال نہ کیا جائے گویا اشارہ کر دیا کہ جو لوگ ممانعت سے پہلے مشرکین کے لیے استغفار کر چکے ہیں ان پر مواخذہ نہیں لیکن اب اطلاع پانے کے بعد ایسا کرنا گمراہی ہے[ا] یعنی اللہ پہلے یہ بتا دیتا ہے کہ کن لوگوں کو کن خیالات کن اعمال اور کن طریقوں سے بچنا چاہیے پھر جب وہ باز نہیں آتے اور غلط فکری و غلط کاری پر اصرار کیے چلے جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی ان کی ہدایت و رہنمائی سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور اسی غلط راہ پر انہیں دھکیل دیتا ہے جس پر وہ خود جانا چاہتے ہیں۔ جس سے یہ ارشاد ایک قاعدہ کلیہ بیان کرتا ہے جس سے قرآن حکیم کے وہ تمام مقامات اچھی طرح سمجھ میں آسکتے ہیں جہاں ہدایت دینے گمراہ کرنے کو اللہ تعالیٰ نے اپنا فعل بتایا ہے۔ اللہ سبحانہ کا گمراہی میں ڈالنا یہ ہے کہ جو صحیح طریق فکر و عمل اس نے بتا دیا ہے اگر اس کے خلاف چلنے ہی پر اصرار کرے اور سیدھا نہ چلنا چاہے تو اللہ سبحانہ اس کو زبردستی سیدھے راستہ پر نہیں چلاتا بلکہ جدھر وہ خود جانا چاہتا ہے اسی طرف اس کو جانے کا سامان فراہم کر دیتا ہے۔

اصل میں تو یہ آیت قانون سعادت و شقاوت بتا رہی ہے لیکن اس آیت میں بعد از ھ ۱۸ھ جس لطیف انداز میں آیا ہے اس میں اہل ایمان کو ایک بلیغ تنبیہ بھی ہے کہ اللہ سبحانہ نے تمہیں ہدایت دینے کے بعد ان خطرات سے بھی آگاہ کر دیا ہے جن سے صراط مستقیم کے مسافر کو دو چار ہونا پڑتا ہے اب یہ تمہارا فرض ہے کہ صراط مستقیم پر چلتے ہوئے دامن ایمان کو ان خطرات سے بچا کر رکھو۔ اگر تم نے دامن ایمان کو نہ بچایا یا تو راہ حق سے بھٹکنے کی ذمہ داری تم پر ہو گی۔ آخر میں فرمایا ان اللہ بکل شی علیم یہ بھی اس کی علت ہے کیونکہ اللہ سبحانہ ظاہر و باطن ہر چیز سے آگاہ ہے۔[۲]

(پہلے صفحہ کا حاشیہ) [ا] بیان القرآن پارہ نمبر ۱۱

[۲] افادات شیخ الاسلام

کائنات میں بادشاہت اللہ کی ہے

۱۲۱ لے یقیناً آسمان وزمین کی بادشاہت اللہ کی ہے وہ ہی مارتا ہے وہ ہی جلاتا ہے مسلمانو! اللہ کے سوا تمہارا کوئی کارساز اور کوئی مددگار نہیں ہے جب اس کی سلطنت ہے تو اسی کا حکم چلنا چاہیے وہ علم محیط اور قدرت کاملہ ہے جو احکام نافذ کرے بندوں کا کام ہے کہ بلا خوف و خطر اس کی تعمیل کریں کسی کی رو رعایت کو دخل نہ دیں کیونکہ اللہ کے سوا کوئی کام آنے والا نہیں ہے لے

علامہ بقاعی نے نظم الدرر میں آیت کی تشریح میں بڑا ہی لطیف انداز اختیار کیا ہے۔

اللہ سبحانہ اس کائنات کا ملک اعظم ہے۔ کائنات پر اقتدار اسی کا ہے اس پر سب کچھ ظاہر ہے وہ ہی جانتا ہے نہیں نقصان وہ بانفع رساں کیا ہے۔ وہ ہی زندگی اور موت دیتا ہے جسمانی زندگی بھی اور ایمانی زندگی بھی اللہ کے سوا تمہارا کوئی کارساز اور مددگار نہیں ہے۔ یہاں جسمانی موت و حیات کا ذکر نہیں۔ مقصود یہ ہے کہ نجات و بخشش کا رشتہ اسی کے ہاتھ میں ہے اور جس طرح اجسام کی موت و حیات اس کے حکم سے ہے اسی طرح روح کی ہدایت و ضلالت کا معاملہ بھی اسی کے حکم پر موقوف ہے اور اس کے حکم سے مقصود اس کے ٹھہرائے ہوئے قوانین ہیں۔

لے افادات شیخ الاسلام

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَ
الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ
مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ
اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۙ ﴿١١٧﴾ وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ
حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ
عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ
تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿١١٨﴾ ع

ع ۸ ۱۴ ۳

بلاشبہ اللہ سبحانہ اپنی رحمت سے اپنے نبی پر متوجہ ہو گیا اور نبی کے ان مہاجرین وانصار ساتھیوں پر جنہوں نے نبی کی تنگی کے وقت میں پیروی کی باوجودیکہ حالت ایسی ہو چکی تھی کہ قریب تھا کہ ان میں سے کچھ کے دل ڈگمگا جائیں وہ اپنی رحمت سے سب پر متوجہ ہو گیا[1] بلاشبہ وہ ان پر بڑا ہی شفقت کرنے والا مہربان ہے[2] اور ان تین پر بھی اللہ کی رحمت متوجہ ہوئی جو انتظار میں پیچھے چھوڑ دیے گئے تھے[3] اور اس وقت

متوجہ ہوئی) جب کہ زمین اپنی ساری کشائشوں کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی تھی اور وہ خود بھی اپنے سے تنگ آگئے تھے اور ان کو پتہ لگ گیا تھا کہ اللہ سے بھاگ کر ان کے لیے کہیں کوئی پناہ نہیں ہے اللہ ان پر اپنی رحمت سے لوٹ آیا تاکہ وہ رجوع کریں بلاشبہ اللہ بڑا ہی توبہ قبول کرنیوالا بڑا ہی مہربان ہے[۱۱۸]

مفردات کے معانی

تاب توب سے ہے مصدر توبہ بھی آتا ہے توبہ کرنا۔ گناہ سے باز آنا توبہ کی توفیق دینا۔ توبہ قبول کرنا۔ لازم اور متعدی دونوں آتا ہے۔ بغیر صلہ کے بھی آتا ہے اور صلہ علی اور الی بھی آتا ہے علی صلہ آئے تو یہ قبول کرنا اور بندے کو توبہ کی توفیق دینا ہوتے ہیں "تاب اللہ علیہ اور بغیر صلہ کے آئے جیسے تاب العبد تو توبہ قبول کرنے کے معنی آتے ہیں اور اگر صلہ الی آئے تو اس کے معنے بھی توبہ کرنا اللہ کی طرف توجہ کرنا ہوتے ہیں توبوا الی اللہ جمیعاً غرض جب علی کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو متعدی ہوتا ہے اور توبہ کی توفیق دینے کے معنی میں آتا ہے اور بغیر علی کے آتا ہے تو لوٹنے اور تائب ہونے کے معنی میں آتا ہے۔ امام خطابی فرماتے ہیں کہ توبہ کے معنے گناہ کے بعد طاعت کی طرف لوٹنے کے ہیں۔

یزیغ یہ زیغ سے زاغ۔ یزیغ ہے امام راغب فرماتے ہیں کہ اس کے معنی اعتدال سے ہٹنے کے ہیں فی قلوبھم زیغ میں یہی معنے ہیں۔

عسرۃ تنگی، تنگدستی، مفلسی اسم ہے قاضی محمد بن الشوکانی لکھتے ہیں کہ عسرۃ مال نہ

ہونے کے سبب حالت کی تنگی کو کہتے ہیں ساعۃ العسرۃ مشکل کی گھڑی اس سے مراد غزوہ تبوک کی سختی کا زمانہ ہے۔ کیونکہ اس وقت سخت قحط اور شدت کی گرمیاں تھیں۔ پھر کھجور کا موسم اور سفر بہت لمبا ہے بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ ایک ایک کھجور پر دو دو سپاہیوں نے گذر کیا بلکہ بہت سے مجاہدین نے تو صرف ایک ہی کھجور کو باری باری چوس کر اوپر سے پانی پی لیا اور اللہ کا شکر کیا۔ پانی کی قلت بھی ہوگئی تھی ادھر سواری کی کمی کا حال یہ تھا کہ دس دس آدمی ایک ایک اونٹ پر باری باری سوار ہوتے تھے۔ ان مشکلات کی وجہ سے اس غزوہ کو غزوۃ العسرہ اور جیش العسرہ کہتے ہیں یہ غزوہ ماہ رجب ۹ھ ہجری میں پیش آیا تھا۔

ایمان کی اصلی کسوٹی

آغاز اسلام میں جن لوگوں نے اسلام کی دعوت کو شرف پذیرائی دیا تھا اور انہوں نے اپنی زندگی کی راہیں جس دعوت پر استوار کی تھیں وہ ایک جاندار انقلاب انگیز اور متحرک نظام فکر و عمل تھا جس کا ضمیر جہاد و صبر کی ولولہ انگیزیوں سے تیار ہوا تھا جس میں ایثار و قربانی کی ایک دنیا آباد تھی اور جس میں افراد کی شخصی نجات کا ہی نہیں بلکہ پوری انسانیت کی نجات کا تصور اور جذبہ کارفرما تھا جہاد فی سبیل اللہ ان کے اخلاص و انقیاد کا پیمانہ تھا۔ اسلامی نصب العین کی ترقی اور اسلامی نظام تمدن اور طرز فکر کی تبلیغ ان کی زندگی کا اتنا عظیم سرمایہ تھا کہ اگر کبھی ان سے اس کام میں کوتاہی ہو جاتی تو ساری ریاضتیں اور محنتیں ان کی نگاہ میں ہیچ ہو جاتیں۔

ذرا غور فرمایئے یہ مخاطبت کن لوگوں سے ہو رہی ہے ان سے جن کی نمازیں اور عبادتیں یکسر خلوص و للہیت سے معمور تھیں جن کے اعمال صالحہ اور فضائل اخلاق دنیا کی ساری تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے جن کے درجات اور علو مرتبت پر خود قرآن گواہی دے رہا ہے اس کے باوجود ان سے کہا جا رہا تھا اخرون مرجون من امر اللہ اما ان یعذبھم واما ان یتوب علیھم۔ اب ان کی توبہ کو نقل تاب اللہ کے ذریعے شرف قبول عطا ہونے کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ آج جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں ہمارا دعوی ایمان اسلامی نام کافی ہے غور کرنا چاہیے کہ جب صحابہ کرام کا اس میدان میں مقام یہ ہے تو ہم کس شمار و قطار میں ہیں جب کہ اللہ کے دین کو بلند کرنے اور اسلام کو دنیا میں غالب کرنے کے لیے ادنیٰ ترین قربانی دینے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں یہاں تک کہ ہمارے دل بھی اس کی تمنا سے خالی ہو چکے ہیں۔

۱۱۲ ؎ بلاشبہ اللہ سبحانہ اپنی رحمت سے اپنے نبی پر متوجہ ہو گیا اور نبی کے ان مہاجرین و انصار ساتھیوں پر جنہوں نے نبی کی پیروی کی تنگی کے وقت میں باوجودیکہ حالت ایسی ہو گئی تھی کہ قریب تھا کہ ان میں سے کچھ کے دل ڈگمگا جائیں وہ رحمت سے ان سب پر متوجہ ہو گیا۔ عسکل کی گھڑی سے مراد غزوۂ تبوک کا زمانہ ہے جس میں کئی مشکلات جمع تھیں سخت گرمی طویل مسافت، کھجور کا موسم۔ اس وقت کی عظیم الشان سلطنت کے مقابلہ پر فوج کشی پھر ظاہری بے سروسامانی ایسی کہ ایک کھجور دو سپاہیوں پر تقسیم ہوتی تھی۔ آخر میں یہ نوبت آگئی کہ بہت سے مجاہدین ایک کھجور کو چوس کر پانی پی لیتے تھے۔ پھر پانی کے نہ ہونے کی وجہ سے اونٹوں کی آلائش نچوڑ کر پینے کی نوبت آگئی، سواری کا اتنا قحط تھا کہ دس دس آدمی ایک ایک اونٹ پر اترتے چڑھتے جارہے تھے وہ جذبہ ایثار و فداکاری تھا جس نے مٹھی بھر جماعت کو تمام دنیا کی قوموں پر غالب کر دیا ؎

اب قبولیت توبہ کی عام بشارت کا اعلان ہے یہ پیچھے پڑھ آئے ہو کہ سورہ برات امت کے نام ایک وداعی پیام ہے اس نے اسلامی معاشرے کو خس و خاشاک سے غزوہ تبوک کے ذریعے بالکل پاک کر دیا اس تنقید کے بعد تمام عناصر الگ ہو گئے صرف وہ لوگ بچ رہے جن کی حیثیت خالص سونے کی ہے۔ ان میں سے اگر کسی کے دل پر وقتی طور پر کوئی غبار آیا تو اس کو لقد تاب اللہ منادی نے بالکل صاف کر دیا ہے۔ جو طبقہ اس غزوہ کے بعد اسلامی معاشرہ میں نکھر کر سامنے آیا ہے وہ قرآن کے لفظوں میں بلا استثناء مہاجرین و انصار کا ہے اور ان کو نکھارنے والے اور زرِ خالص بنانے والی کسوٹی قرآن نے یہ بتائی ہے الذین اتبعوہ فی ساعۃ العسرۃ یعنی وہ مہاجرین و انصار جنہوں نے ساعۃ العسرۃ یعنی پر آشوب حالات میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی ہے۔

اس نکھار میں مہاجرین و انصار کی تشریف اور قدر افزائی کی خاطر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا ہے۔ اور اس لیے بھی یہاں حضور اقدس کا شروع میں ذکر آیا ہے کہ آپ کی ذات گرامی توبہ کی صورت میں مہاجرین و انصار پر رحمت کی بارش بن کر آنے کا ذریعہ ہے۔ علامہ خفاعی کی یہ بات بے حد لطیف ہے۔

اس طریق سے اللہ سبحانہ نے حضور اقدس کے مرتبہ کی برتری اور مراتب کمالات میں بے نہایت ترقی کا اعلان کیا ہے۔ کمالات میں یہ برتری ہی اہل ایمان میں توبہ

؎ افادات شیخ الاسلام

کی انگیخت کا واسطہ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اس انداز بیان میں آپ کے ذکر کی وجہ یہ نہیں ہے کہ آپ سے کوئی غلطی ہوئی تھی جیسا کہ کچھ شارحین قرآن نے سمجھا ہے۔

دوسرے درجہ میں اس موقعہ پر مہاجرین والانصار کا ذکر ہے اس سے اگر یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ اسلامی معاشرے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے اونچا درجہ مہاجرین کا ہے اس کے بعد انصار کا ہے تو یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ اسلامی معاشرے میں بزرگی اور برتری کی بنیاد خاندان، نسب نامہ یا مال و جاہ نہیں بلکہ نبوت کی اتباع اور اسلام کی خاطر قربانی ہے یہ بات مہاجرین والانصار کے لیے الذین اتبعوہ فی ساعۃ العسرۃ کی صفت سے معلوم ہو رہی ہے۔

یہاں الجصاص نے یہ بات بڑی اچھی لکھی ہے یہ آیت قرانی صحابہ کے مناقب و فضائل میں بالکل شافی اور کافی ہے۔

آیت سے یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ نسبی تعلق اور قرابت نبیوں سے نجات کے لیے بغیر ایمان کے کافی نہیں ہے ما کان للنبی والذین آمنوا ایسے نبیوں اور بزرگوں سے نسبی نسبت اور قرابت ایمان کی موجودگی میں بغیر اتباع کے مقبولیت کی سند اور بزرگی کی ضمانت نہیں ہے ولایت اور بزرگی کی لازمی شرط اتباع ہے۔ جو لوگ اتباع نبوت کے وصف سے مالا مال ہوئے وہ معاشرہ اسلامی میں سب سے اونچے اور برتر ہوئے۔

ہجوم خواطر میں اللہ کی مدد

۲۲ من بعد ما کاد یزیغ قلوب فریق منھم ثم تاب علیھم باوجودیکہ حالت ایسی ہو چکی تھی کہ قریب تھا کہ کچھ کے دل ڈگمگا جائیں لیکن پھر اللہ نے ان پر رحمت کے ساتھ رجوع فرمالیا۔ اس سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ مہاجرین والانصار کی اکثریت ہر قسم کے مصائب اور ہجوم شدائد میں حق پر ثابت قدم رہی ہے۔ ان میں سے صرف ایک مختصر سی ٹولی سے تبوک کے موقعہ پر کچھ کمزوری ظاہر ہوئی لیکن تنبیہ کے بعد وہ بھی متنبہ ہو گئے اور انہوں نے اللہ کی طرف رجوع کر لیا۔ اور اللہ سبحانہ نے ان کی توبہ قبول فرمالی۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی مہربانیاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر بے شمار ہیں اور آپ کی برکت سے مہاجرین والانصار پر بھی مخصوص توجہ اور مہربانی ہو رہی ہے کہ ان کو ایمان و عرفان سے مشرف فرمایا۔ اتباع نبی جہاد فی سبیل اللہ اور عزائم امور کے

سرانجام دینے کی ہمت و توفیق بخشی پھر ایسے مشکل وقت میں جب کچھ مومنین کے قلوب بھی مشکلات اور صعوبتوں کا ہجوم دیکھ کر ڈگمگانے لگے تھے اور قریب تھا کہ رہ جائیں حق تعالیٰ نے دوبارہ مہربانی فرمائی کہ ان کو اس قسم کے خطرات و وساوس پر عمل کرنے سے محفوظ رکھا اور مومنین کی ہمتوں کو بلند کیا[1]

شرح وعلى الثلاثة الذين خلفوا

[2] اور ان تین پر بھی اللہ کی رحمت متوجہ ہوئی جو پیچھے چھوڑ دیئے گئے تھے۔ یہ تین شخص کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ ابن الربیع ہیں جو باوجود مومن مخلص ہونے کے محض تن آسانی اور سہل انگاری کی بنا پر بدون عذر شرعی کے تبوک کی شرکت سے محروم رہے جب حضور اقدس سے واپس تشریف لائے تو انہوں نے منافقین کی طرح جھوٹے عذر پیش کیے اور نہ بعض صحابہ کی طرح اپنے کو ستونوں سے باندھا جو واقعہ تھا صاف صاف عرض کر دیا اور اپنی کوتاہی اور تقصیر کا علانیہ اعتراف کر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ منافقین کی طرف سے بظاہر اغماض کر کے انکے بواطن کو اللہ کے سپرد کر دیا گیا اصحاب سواری کی یعنی جو مسجد کے ستونوں سے بندھے ہوئے تھے توبہ قبول کر لی گئی اور ان تینوں کا فیصلہ تا دیبًا کچھ مدت کیلئے ملتوی رکھا گیا پچاس دن گذرنے کے بعد ان کی توبہ قبول ہوئی پیچھے رکھے گئے کا مطلب یہی ہے جیسا کہ خود کعب بن مالک کی زبانی بخاری میں ہے[2]

بتانا یہ چاہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب تبوک سے واپس مدینہ تشریف لائے تو وہ لوگ معذرت کرنے کے لیے حاضر ہوئے جو پیچھے رہ گئے ان میں ۸۰ سے کچھ زیادہ منافق تھے اور تین سچے مومن بھی تھے۔ منافقین جھوٹے عذرات پیش کرتے گئے اور حضور ان کی معذرت قبول کرتے گئے۔ جب ان تینوں کی باری آئی اور انہوں نے صاف صاف اپنے اپنے قصور کا اعتراف کر لیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تینوں کے معاملہ میں فیصلے کو ملتوی کر دیا۔ اور عام مسلمانوں کو حکم دے دیا کہ جب تک خدا کا حکم نہ آئے ان سے کسی قسم کا معاشرتی تعلق نہ رکھا جائے۔

دراصل اس آیت میں جن لوگوں کو توبہ کی قبولیت کی بشارت دی گئی ہے یہ وہ لوگ ہیں جن

---

[1] افادات شیخ الاسلام

[2] افادات شیخ الاسلام

کے بارے میں ارشاد ہوا ہے واخرون مرجون لامر اللہ کچھ اور بھی ہیں جن کا معاملہ اس انتظار میں کہ اللہ کا کیا حکم ہوتا ہے موخر کر دیا ہے باقی کا فیصلہ کر دیا گیا تھا اور ان کو پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا۔

چونکہ قبولیت کا تقاضا یہ تھا کہ دلوں کے زخم دھوئے جائیں اور رحمت و اکرام کے مرہموں سے تسکین پائیں۔ اس لیے پیرایہ بیان ایسا اختیار کیا گیا کہ ان کے سارے دکھوں کا مداوا ہو گیا۔ انہوں نے لغزش کی وجہ سے اپنی جگہ کھو دی تھی یعنی جن مقبولین کے ساتھ ان کا شمار تھا ان کی صف سے باہر ہو گئے تھے قبولیت توبہ کا جب مژدہ سنایا گیا تو اس طرح پہلے خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیا پھر مہاجرین و انصار کا اور پھر اسی کے ضمن میں ان لوگوں کا بھی ذکر کر دیا گیا اور رحمت الٰہی کی توجہ سب کے لیے یکساں کہی گئی تاکہ اب کوئی رحمت کے حلقہ سے باہر نہ رہے جن سے قصور ہوا تھا وہ بھی محسوس کر لے سکیں کہ رحمت و قبولیت کی ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے۔

عبرت خیز اور درد انگیز واقعہ کی قرآنی تعبیر

۱۲۵ اور اس وقت رحمت متوجہ ہوئی جب کہ زمین اپنی ساری کشائشوں کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی تھی اور وہ خود ہی اپنے سے تنگ آگئے تھے اور ان کو پتہ لگ گیا تھا کہ اللہ سے بھاگ کر ان کے لیے کہیں پناہ نہیں ہے اللہ ان پر اپنی رحمت سے لوٹ آیا تاکہ وہ رجوع کریں بلاشبہ اللہ ان پر بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا بڑا ہی مہربان ہے۔

اس آیت کی تشریح سے پہلے ان تین صحابہ کرام کی واقعاتی داستان خود حضرت کعب بن مالک کی زبانی سن لیجیے۔ اردو زبان میں شارحین قرآن نے حضرت مولانا اشرف علی حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا ابوالکلام آزاد، حضرت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اس پر تاریخی طور پر بڑی تفصیل سے لکھا ہے آیئے پہلے مولانا عثمانی کا بیان پڑھیے۔

ان تین میں سے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے اپنا واقعہ نہایت شرح و بسط کے ساتھ عجیب مؤثر طرز میں بیان فرمایا ہے صحیح بخاری وغیرہ میں دیکھا جائے۔ یہاں اس کے بعض اجزا نقل کئے جاتے ہیں۔ کعب بن مالک فرماتے ہیں کہ

تبوک کی مہم چونکہ سخت اور دشوار گذار تھی۔ حضور اقدس نے صحابہ کرام کو عام تیاری کا حکم دیا۔ لوگ مقدور و استطاعت کے مطابق سامان سفر درست کرنے میں مشغول تھے۔ مگر میں بے فکر تھا کہ جب چاہوں گا خود تیار ہو کر ساتھ چلا جاؤں گا کیونکہ بفضل ایزدی اس وقت ہر طرح کا سامان مجھ کو میسر تھا۔

ایک چھوڑ دو سواریاں میرے پاس موجود تھیں۔ میں اسی غفلت کے نشہ میں رہا ادھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیس ہزار مجاہدین اسلام کو کوچ کا حکم دے دیا۔ مجھے اب بھی یہی خیال تھا کہ حضور روانہ ہو گئے تو کیا بات ہے۔ اگلی منزل پر آپ سے جا ملوں گا آج چلوں کل چلوں۔ اسی امروز و فردا میں گذر گیا۔ حضور نے تبوک پہنچ کر فرمایا مافعل کعب؟ کعب کو کیا ہوا۔ بنی سلمہ کا ایک شخص بولا کہ یا رسول اللہ اس کی عیش پسندی اور اعجاب وغرور نے نکلنے کی اجازت نہیں دی۔ معاذ بن جبل نے کہا کہ تو نے بہت بری بات کہی۔ خدا کی قسم ہم نے اس میں بھلائی کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ حضور یہ سن کر خاموش رہے۔ کعب کہتے ہیں کہ آپ کی تشریف بری کے بعد بہت زیادہ وحشت اس سے ہوتی تھی کہ سارے مدینے میں پکے منافق یا معذور مسلمانوں کے سوا مجھے کوئی نظر نہ پڑتا تھا۔ بہر حال اب دل میں طرح طرح کے منصوبے گانٹھنے شروع کئے کہ آپ کی واپسی پر فلاں عذر کر کے جان بچا لوں گا۔ مگر جس وقت معلوم ہوا کہ حضور اقدس بخیر وعافیت واپس تشریف لے آئے۔ دل سے سارے جھوٹ فریب محو ہو گئے اور طے کر لیا کہ سچ کے سوا کوئی چیز اس بارگاہ میں بچانے والی نہیں ہے۔ حضور مسجد میں رونق افروز تھے۔ اصحاب کا مجمع تھا منافقین جھوٹے حیلے بہانے بنا کر ظاہری گرفت سے چھوٹ رہے تھے کہ میں حضور کے سامنے آیا۔ میرے سلام کرنے پر آپ نے غضب آمیز تبسم فرمایا اور غیر حاضری کی وجہ دریافت کی۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اگر میں اس وقت کسی دنیا داروں میں سے کسی کے سامنے ہوتا تو آپ دیکھتے کہ کس طرح زبان آوری اور چرب زبانی سے جھوٹے حیلے حوالے کر کے اپنے کو صاف بچا لیتا۔ مگر یہاں تو معاملہ ایک ایسی ذات مقدس سے ہے جسے جھوٹ بول کر اگر میں راضی بھی کر لوں تو تھوڑی دیر کے بعد اللہ سبحانہ اس کو سچی بات پر مطلع کر کے مجھ سے ناراض کر دے گا۔ برخلاف اس کے سچ بولنے میں گو تھوڑی دیر کے لیے آپ کی خفگی برداشت کرنی پڑے گی لیکن امید کرتا ہوں کہ خدا کی طرف سے اس کا انجام بہتر ہوگا اور آخر کار سچ بولنا ہی مجھے خدا و رسول کے غصہ سے نجات دلائے گا۔ یا رسول اللہ واقعہ یہ ہے کہ میرے پاس اس غیر حاضری کا کوئی سبب نہیں جس وقت حضور کی ہم رکابی کے شرف سے محروم ہوا اس وقت سے زیادہ فراخی اور مقدرت مجھے کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ بس مجرم ہوں آپ کو اختیار ہے جو فیصلہ چاہیں میرے حق میں کریں آپ نے فرمایا یہ شخص ہے جس نے سچی بات کہی اچھا جاؤ اور خدائی فیصلہ کا انتظار کرو میں اٹھا اور تحقیق سے معلوم ہوا کہ ہلال بن امیہ اور مرارہ ابن الربیع بھی میرے جیسے ہیں۔ ہم تینوں کے متعلق آپ نے حکم دے دیا کہ کوئی ہم سے بات نہ کرے سب علیحدہ رہیں۔ چنانچہ کوئی مسلمان ہم سے بات

نہ کرتا تھا نہ سلام کا جواب دیتا تھا۔ وہ دونوں تو گھر میں بیٹھ گئے دن رات گھر میں روتے رہتے میں ذرا سخت اور طاقتور تھا مسجد میں نماز کے لیے حاضر ہوتا حضور اقدس کو سلام کرکے دیکھتا تھا کہ جواب میں لب مبارک کو حرکت ہوئی یا نہیں۔ میں جب حضور کی طرف دیکھتا آپ میری طرف سے منہ پھیر لیتے۔ خاص رشتہ دار اور محبوب ترین عزیز بھی مجھ سے بیگانہ ہو گئے۔ اسی عرصہ میں ایک شخص نے بادشاہ غسان کا خط مجھے دیا جس میں میری مصیبت پر اظہار ہمدردی کرنے کے بعد دعوت دی تھی کہ میں اس کے ملک میں آجاؤں وہاں میری بہت آؤ بھگت ہو گی میں نے پڑھ کر کہا کہ یہ بھی ایک مستقل امتحان ہے۔ آخر وہ خط میں نے نذر آتش کر دیا۔

چالیس دن گزر نے کے بعد بارگاہ رسالت سے جدید حکم پہنچا کہ میں اپنی عورت سے بھی علیحدہ رہوں چنانچہ اپنی بیوی کو کہہ دیا کہ اپنے میکے چلی جائے اور جب تک اللہ سبحانہ کے یہاں سے میرا کوئی فیصلہ نہ ہو وہیں ٹھہری رہے۔ سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ اگر اسی حالت میں موت آگئی تو حضور میرا جنازہ نہ پڑھیں گے اور فرض کیجیے کہ اگر ان دنوں میں آپ کی وفات آگئی تو مسلمان ہمیشہ یہی معاملہ مجھ سے رکھیں گے میری میت کے قریب بھی کوئی نہ آئے گا۔ غرض پچاس دن اسی حالت میں گذرے کہ خدا کی زمین مجھ پر باوجود فراخی کے تنگ ہو گئی بلکہ عرصہ حیات تنگ ہو گیا تھا۔ زندگی موت سے زیادہ سخت معلوم ہوتی تھی کہ یکایک جبل سلع سے آواز آئی یا کعب بن مالک البشر میں سنتے ہی سجدہ میں گر پڑا معلوم ہوا کہ آخر شب میں حق تعالیٰ شانہ کی جانب سے پیغمبر علیہ السلام کو خبر دی گئی کہ ہماری توبہ مقبول ہے آپ نے بعد نماز فجر صحابہ کو بتایا کہ ایک سوار میری طرف دوڑا کہ بشارت سنائے مگر دوسرے شخص نے پہاڑ پر زور سے للکارا اس کی آواز سوار سے پہلے پہنچی بیٹے اپنے کپڑے اتار کر آواز لگانے والے کو دیے پھر حضور کی جناب میں حاضر ہوا۔ لوگ جوق جوق آتے اور مجھے مبارک باد دیتے۔ مہاجرین میں سے حضرت طلحہ نے کھڑے ہو کر مصافحہ کیا۔ حضور کا چہرہ انور اقدس چاند کی طرح خوشی سے چمک رہا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ سبحانہ نے تیری توبہ قبول فرمائی۔ میں نے عرض کیا کہ اس توبہ کا نتیجہ یہ ہے کہ میں کل مال و جائیداد اللہ کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا سب نہیں کچھ اپنے لیے رکھنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے خیبر کا حصہ الگ کر لیا باقی مال صدقہ کر دیا۔ چونکہ مجھے صرف سچ بولنے سے نجات ملی تھی اس لیے عہد کیا کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو آئندہ کبھی جھوٹ نہ بولوں گا۔ اس کے بعد بڑے سخت امتحانات آئے مگر الحمد للہ میں سچ سے کبھی نہ ہٹا۔ اور نہ انشاء اللہ تا زیست ہٹوں گا۔ یہ واقعہ ہے جس کی طرف ان آیات میں اشارہ ہوا ہے۔ گویا ان تینوں پر پہلی مہربانی یہ ہوئی کہ ان کو ایمان و اخلاص بخشا نفاق

سے بچایا اب نئی مہربانی یہ ہوئی کہ توبہ نصوح کی توفیق دے کر پھر اپنی طرف کھینچ لیا اور کوتاہیوں کو معاف کر دیا[1]

کعب بن مالک یہ بھی فرماتے ہیں کہ

ایک دن شہر سے باہر نکلا تو قتادہ کے باغ تک پہنچ گیا یہ میرا چچازاد بھائی تھا اور اپنے تمام عزیزوں میں اسے زیادہ محبوب رکھتا۔ میں نے سلام کیا مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا میں نے کہا ابو قتادہ! کیا تم نہیں جانتے کہ میں مسلمان ہوں اللہ اور اس کے رسول کی دل میں محبت رکھتا ہوں اس پر بھی اس نے میری طرف رخ نہیں کیا لیکن جب میں نے بھی بات بار بار دہرائی تو صرف یہ کہا اللہ ورسولہ اعلم تب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور بے اختیار آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔

یہ واقعہ بڑا عبرت آموز ہے امام احمد کے متعلق آتا ہے کہ قرآن کی کوئی آیت انہیں نہیں رلاتی تھی جس قدر یہ آیت اور کعب بن مالک کی روایت

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ

(الف) کفر واسلام کی کش مکش کا معاملہ کس قدر اہم اور اس میں کتنی نزاکت ہے کہ کفر واسلام میں مقابلہ ہو تو کفر کا ساتھ دینا تو درکنار جو شخص اسلام کا ساتھ دینے میں کسی ایک موقع پر بھی کوتاہی کرتا ہے اس کی زندگی بھر کی عبادتیں اور دینداری کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے، آپ یہ دیکھیں یہ خطاب کن سے ہو رہا ہے۔ وہ جو بدر اور احد کے سخت معرکوں میں جانبازیوں کے جوہر دکھا چکے ہیں اور جن کا ایمانی اخلاص ہر قسم کے شبہ سے بالاتر تھا۔

(ب) یہ واقعہ یہ بھی بتا رہا ہے کہ ادائے فرض میں تساہل کوئی معمولی بات نہیں بسا اوقات تساہل ہی تساہل میں کسی ایسے قصور کا مرتکب ہو جاتا ہے جس کا شمار بڑے گناہوں میں ہوتا ہے۔ سزا کے وقت یہ نہیں دیکھا جاتا ہے کہ جرم نیک نیتی سے کیا ہے یا بدنیتی سے۔ نیت خواہ کیسی اچھی اور خوبصورت ہو مگر جرم کے وزن کو ہلکا نہیں کرتی۔ اور مجرم کا ماضی چاہے کیسا ہی شاندار پاکبازی اور پارسائی کا ہو جرم بہرحال جرم ہے۔

(ج) اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دور میں اسلامی معاشرہ میں طاعت و فرمانبرداری کیسی تھی کہ جوں ہی انقطاع تعلقات کا اعلان ہوا سارے مسلمانوں نے ایک دم منہ موڑ لیا چوری چھپے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بھی کسی نے اس کے خلاف نہیں کہا تا آنکہ ان کے محبوب سے محبوب عزیزوں کو یہ خیال نہ آیا کہ ایک لمحہ کے لیے اس پر عمل نہ کریں۔ ابو قتادہ کا حال خود حضرت کعب کی زبانی سن چکے ہو۔ یہ اس زمانہ کے مسلمانوں کی ذہنیت کی پوری تصویر بول رہی ہے۔ پھر اس طاعت کے لیے نہ تو کوئی مادی قوت کام میں لائی گئی نہ عمال حکومت کا ڈر نہ قانون وعدالت کا اندیشہ صرف ذات نبوت کے مبارک لبوں کی حرکت تھی اور یہ بات سب کو معلوم تھی کہ آپ کی مرضی یہی ہے۔ بس اتنی بات کا معلوم ہوجانا اس کے لیے کافی ہوگیا کہ سب سراپا اطاعت وامتثال ہوگئے۔

(د) یہ واقعہ صرف اطاعت وامتثال کو نہیں بلکہ یہ بھی بتا رہا ہے کہ اس دور کے مسلمانوں کی باہمی اخوت ومحبت کا کیا حال تھا۔ اس سختی کے ساتھ حکم کی تعمیل تو سب نے کی لیکن ساتھ ہی ان کی مصیبت کے غم سے کوئی دل خالی نہ تھا۔ سب کے دلوں کو لگی تھی کہ ان کی توبہ قبول ہوجائے جونہی قبولیت کا اعلان ہوا ایک پر ایک دوڑنے لگا کہ ان سختی کشان عشق کو سب سے پہلے میری زبانی مژدہ قبولیت ملے۔ کوہ سلع پر سب سے پہلے جس نے پکار کر سب سے پہلے بشارت سنائی تھی۔ حدیث بخاری میں حضرت کعب نے گو کسی کا نام نہیں لیا مگر حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں واقدی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ یہ آواز دینے والے حضرت ابو بکر تھے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَكُونُوا۟ مَعَ ٱلصَّٰدِقِينَ ﴿١١٩﴾
مَا كَانَ لِأَهْلِ ٱلْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُم مِّنَ ٱلْأَعْرَابِ أَن
يَتَخَلَّفُوا۟ عَن رَّسُولِ ٱللَّهِ وَلَا يَرْغَبُوا۟ بِأَنفُسِهِمْ عَن نَّفْسِهِۦ ۚ
ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَلَا نَصَبٌ وَلَا مَخْمَصَةٌ
فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ وَلَا يَطَـُٔونَ مَوْطِئًا يَغِيظُ ٱلْكُفَّارَ وَ
لَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا إِلَّا كُتِبَ لَهُم بِهِۦ عَمَلٌ صَٰلِحٌ ۚ
إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ ٱلْمُحْسِنِينَ ﴿١٢٠﴾ وَلَا يُنفِقُونَ
نَفَقَةً صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً وَلَا يَقْطَعُونَ وَادِيًا إِلَّا
كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ ٱللَّهُ أَحْسَنَ مَا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ ﴿١٢١﴾

اہلِ ایمان اللہ کی نافرمانی سے بچو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ[1]
مدینے کے باشندوں اور ان کے ارد گرد رہنے والے دیہاتیوں کو
یہ لائق نہ تھا کہ دفاع کے موقعہ پر اللہ کے رسول سے پیچھے رہ جائیں
اور نہ یہ بات ان کے لائق تھی کہ حضور اقدس کی ذات گرامی کو نظر
انداز کر کے اپنی جانوں کی فکر میں پڑ جائیں[2] اس لیے کہ اللہ کے راستہ

میں آئی ہوئی ہر پیاس محنت اور ہر بھوک اور ہر وہ چلنا جو کافروں کے غیظ وغضب کا باعث ہو اور دشمن کی جانب سے آئی ہوئی ہر چیز ان کے نامہ اعمال میں عمل صالح بنا کر لکھ دی گئی ہے۔ بلاشبہ اللہ سبحانہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا[۳] اسی طرح اللہ کی راہ میں خرچ کرنا چھوٹا ہو یا بڑا اور وادی کا قطع کرنا ان کے لیے نیکی بنا کر لکھا گیا ہے تاکہ اللہ ان کو ان کے کاموں کا بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائے[۴]

مفردات کے معانی

ظمئ پیاس تشنگی، یہ اصل میں ظمئ یظمآن کا مصدر ہے جس کے معنی پیاس لگنے کے ہیں اسی سے یظمأ فعلان کے وزن پر پیاسے کے معنے میں آتا ہے۔

نصب: محنت، مشقت اور تھکاوٹ کو کہتے ہیں اذا فرغت فانصب اسی معنی میں ہے۔

المخمصة: اس کے معنی بھوک کے آتے ہیں۔

راستبازوں کی معیت

راستی اور سچائی کے معنے صرف سچ بولنے کے سمجھے جاتے ہیں مگر قرآن کی نگاہ میں اس کے بڑے وسیع معنی ہیں اس لحاظ سے اس کے اندر اکیلے قول ہی نہیں بلکہ عمل کی بھی ہر سچائی داخل ہے۔ امام غزالی

نے احیاء العلوم میں بڑی باریک بینی سے اس کی چھ قسمیں کی ہیں اور قرآن وحدیث سے ہر ایک کے معنی بتائے ہیں۔ بات میں سچائی۔ ارادہ اور نیت میں سچائی، عزم میں سچائی، عزم کو پورا کرنے میں سچائی۔ عمل میں سچائی لیکن ذرا غور کیجئے تو اس کی تین ہی قسمیں ہیں زبان کی سچائی، دل کی سچائی اور عمل کی سچائی۔

زبان کی سچائی یعنی زبان سے جو کچھ بولا جائے سچ ہو اور منہ سے کوئی بول صداقت کے خلاف نہ ہو۔ یہ ایمان واسلام کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ اس کے برعکس ہر قسم کا جھوٹ دل کے نفاق کے ہم معنے ہے سورہ احزاب کی ایک آیت میں صادق کا مقابل منافق اور صدق کا نفاق قرار دیا ہے

لیجزی الصادقین بصدقھم ویعذب المنافقین ان شاء

اس سے معلوم ہوا کہ صدق ایمان کا اور جھوٹ نفاق کا سرمایہ ہے۔ اسی لئے صدق اور اخلاص دونوں ایک چیز ہیں کیونکہ بعض موقعوں پر زبان سے سچ کا اظہار اس لیے جھوٹ ہو جاتا کہ وہ نہائے قلب سے نہیں نکلتا ہے۔ منافق حضور اقدس کی جناب میں حاضر ہو کر آپ کی رسالت کا زبانی اقرار کرتا ہے اور آپ کی رسالت ایک حقیقت ہے لیکن چونکہ ان کا یہ اقرار ان کے ضمیر کے خلاف تھا اس لیے قرآن کا فتویٰ ہے۔

واللہ یشھد ان المنافقین لکاذبون

اس سے معلوم ہوا کہ سچائی اس کا نام ہے کہ زبان سے دل کی صحیح ترجمانی کی جائے اگر ایسا نہ ہو تو اس کا نام نفاق ہے۔ اسی لیے صداقت فی الحقیقت ایمان کی صداقت ہے جس کے ایمان میں صداقت نہیں ہے وہ نفاق کی آماجگاہ ہے اور یہی اصلی نفاق ہے قرآن نے یہاں صحابہ کرام کے ایمان کی صداقت کا اعلان کیا ہے۔ ایمان میں صداقت ہی طمانیت وسکون کی ضمانت ہے اور ایمان کی ہی صداقت جب اعمال میں رونما ہوتی ہے تو اس کا نام حلاوۃ ایمان ہے حدیث میں ہے۔

ثلث من کن فیہ وجد حلاوۃ الایمان ان یکون اللہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما وان یحب المرأ لایحبہ الا للہ وان یکرہ ان یقذف الکفر کمایکرہ ان یقذف فی النار۔

جس شخص میں یہ تین باتیں ہوں گی اسے ایمان کی حلاوت محسوس ہو گی ایک یہ کہ اللہ اور اس کا رسول اس کو سب سے زیادہ محبوب ہو دوسرے یہ کہ جس سے محبت کرے اللہ کے لیے کرے تیسرے یہ کہ کفر میں واپسی کو ایسا برا سمجھے جیسے آگ

میں گرائے جانے کو۔

۱۲۵ لے اہل ایمان اللہ کی نافرمانی سے بچو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ یعنی سچوں کی صحبت اختیار کرو اور انہی جیسے کام کرو دیکھ لو یہ تین شخص سچ کی بدولت بخشے گئے اور مقبول ٹھہرے۔ منافقین نے جھوٹ بولا اور خدا کا ڈر دل سے نکال دیا تو درک اسفل کے مستحق ہے لے

آیت میں صادقین منافقین کے مقابلہ پر آیا ہے۔ جیسے اخلاص کی اساس صدق و صداقت ہے ایسے ہی نفاق کی پوری عمارت جھوٹ پر اٹھتی ہے۔ ان لوگوں کے مقابلے میں جن میں نفاق اور جھوٹ ہو ان کی صحبت اختیار کرنے کا حکم ہو رہا ہے جن کے ایمان میں سرتا سر اخلاص و راستی ہے یہ نفاق کے مقابلے میں صحابہ کے ایمان میں صداقت کا اعلان ہے دوسری جگہ اسی بات کو حصر کے ساتھ کہا گیا ہے۔

انما المومنون الذین آمنوا ثم لم یرتابوا وجاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللہ اولئک ھم الصادقون

اہل ایمان تو فی الواقع وہی ہیں جو ایمان لائے اور ان کے ایمان میں شک کا کوئی کانٹا نہیں چبھا اور انہوں نے اپنی جانوں اور مالوں کو راہ خدا میں تج کر دیا۔ یہی لوگ اپنے ایمان میں سچے ہیں۔

انہوں نے ایمان پر اپنی زندگی کی بنیادیں استوار کی تھیں۔ ان کے ایمان کا ضمیر عشق کی ولولہ انگیزیوں اور جنوں نوازیوں سے تیار ہوا تھا جس میں ایثار قربانی اور سر فروشیوں کی دنیا آباد تھی۔ ان کے اعمال کی حدود اسی نسبت سے متعین کی جاتی تھی جس نسبت سے وہ ایمان کی تقویت کا باعث بنتے تھے جہاد فی سبیل اللہ ان کے اخلاص ایمانی اور ان کے اتقا کا پیمانہ تھا اور اللہ کے یہاں ان کی مقبولیت کا مدار یہی پیمانہ تھا۔ قرآن نے اسی پیمانہ کی طرف کھل کر اشارا کیا ہے۔

یہاں انصار و مہاجرین دونوں کو صادقین کا سرٹیفیکیٹ ملا ہے اور اس کی بنیاد الذین اتبعوہ کو بنایا ہے۔

اسی لیے قرآن نے صحابہ کرام کو نبوت کی دلیل بنا کر پیش کیا ہے اور پوری دنیا سے کہا ہے:

لے افادات شیخ الاسلام

ما آمنتم فان آمنوا بمثل ما آمنتم بہ فقد اہتدوا

یعنی ایمان میں صحابہ کی مماثلت ہی سے پوری دنیا کو ہدایت کی ضمانت دی جاسکتی ہے۔ اس آیت کا منطوق تو یہی ہے کہ الصادقین سے مراد صحابہ کرام ہیں مگر آیت کے مدلول میں یہ بات بھی ہے کہ مسلمانوں کو حکم دیا جارہا ہے کہ ایمان میں کمال پیدا کرنا چاہتے ہو تو ان لوگوں کی محبت اور صحبت اختیار کرو جن کے کردار اور گفتار میں ہم آہنگی ہو یا جن کا ظاہر و باطن یکساں ہو یا جن میں علم و ذکر کی ہم آہنگی ہو۔ صحبت و محبت کو آدمی کے بناؤ اور بگاڑ میں بڑا دخل ہے۔ اللہ سبحانہ کا خوف دل کا پاسبان ہوتا ہے وہ اندر سے انسان کی حفاظت کرتا ہے اور صادقین کی صحبت باہر سے اس کی شیطان سے حفاظت کرتی ہے۔ کیونکہ صادقین وہ ہوتے ہیں جن کے قول اور عمل میں مطابقت ہو۔

کچھ علما نے اس آیت سے اجماع کی قانون اسلامی میں حجیت پر ہی استدلال کیا ہے۔

ایمان کا تقاضا پورا کرنا ضروری ہے

۲ ۱۲۰ مدینے کے باشندوں اور انکے ارد گرد رہنے والے دیہاتیوں کو یہ لائق نہ تھا کہ دفاع کے موقعہ پر اللہ کے رسول سے پیچھے رہ جاتے اور نہ یہ بات انکے لائق تھی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو نظر انداز کرکے اپنی جانوں کی فکر میں پڑ جائیں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو تکلیفیں اٹھائیں اور ہم آرام سے بیٹھے رہیں ایسا نہیں چاہیے۔ حدیث میں ہے کہ ابوخیثمہ رضی اللہ عنہ بھی غزوہ تبوک میں پیچھے رہ گئے تھے۔ حضور کی روانگی کے بعد باغ میں گئے وہاں خوشگوار سایہ تھا حسین و جمیل بیوی سامنے تھی اس نے پانی چھڑک کر زمین کو خوب ٹھنڈا کیا تھا۔ چٹائی کا فرش تھا۔ تازہ کھجور کے خوشے سامنے رکھے تھے اور سرد و شیریں پانی پیش کیا۔ یہ سامان عیش دیکھ کر ابوخیثمہ کے دل میں بجلی سی دوڑ گئی۔ بولے تف ہے اس زندگی پر کہ میں تو خوشگوار سائے ٹھنڈے پانی اور باغ و بہار کے مزے لوٹ رہا ہوں۔ اور خدا کا محبوب پیغمبر ایسی سخت لو اور گرمی و تشنگی کے عالم میں کوہ بیاباں طے کر رہا ہے یہ خیال آتے ہی سواری منگائی، تلوار حمائل کی، نیزہ سنبھالا اور حضور کے نقش قدم پر چل پڑے۔ اونٹنی تیز جارہی تھی۔ آخر لشکر کو جا پکڑا حضور نے دور سے دیکھ کر کوئی اونٹنی سوار ریت کے ٹیلے طے کرتا آرہا ہے فرمایا کن اباخیثمہ ہو جا ابوخیثمہ) تھوڑی دیر میں سب نے دیکھا کہ وہ ابوخیثمہ تھے۔

لہ افادات شیخ الاسلام

اس میں ان لوگوں پر عتاب ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تبوک نہیں گئے۔ بظاہر جملہ خبریہ ہے لیکن حقیقت میں نہی ہے۔ چونکہ غزوہ تبوک میں مدینہ اور حوالی مدینہ کو دعوت دی گئی تھی دور کے رہنے والے مسلمانوں کو دعوت نامے نہیں پہنچے گئے تھے اس لیے خصوصیت کے ساتھ مدینہ اور اطراف مدینہ کا ذکر کیا ہے مطلب یہ ہے کہ مدینہ والوں اور اطراف مدینہ والوں کے لیے کسی طرح جائز نہ تھا کہ اپنی جانیں بچا کر لیٹے رہیں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نہ دیں یعنی اپنی جان کو بھاری سمجھنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ دینا کیسے روا ہو سکتا ہے جب کہ حضور اقدس بنفس نفیس جہاد کے لیے جا رہے ہیں اور راہ خدا میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر رہے ہیں تو پھر کسی اور کی جان کب اتنی گراں پایہ ہو سکتی ہے ؟

کچھ علما نے آیت کے انداز بیان سے یہ استدلال کیا ہے کہ حضور کے زمانے میں جہاد فرض عین تھا۔ علامہ آلوسی لکھتے ہیں ؛

> آیت کا ظاہر ہی بتا رہا ہے کہ جہاد کے لیے جب حضور تشریف لے جائیں تو جہاد میں جانا فرض ہے۔

جو لوگ سفر تبوک میں ساتھ نہیں گئے اور پیچھے رہ جانے کی وجہ سے متخلفین کہلائے۔ ان کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ منافقین جو بے بنیاد عذر خراش کر گھروں میں بیٹھے رہے۔
۲۔ وہ مخلص اور جان نثار مساکین جن کے پاس سواری کا انتظام نہ تھا۔
۳۔ کچھ مخلصین سے بھی سہل انگاری ہوئی یعنی وہ آج جاتے ہیں کل جاتے ہیں کے منصوبے بناتے رہے جیسے ابولبابہ اور ان کے چھ ساتھی۔ کعب بن مالک بلال ابن امیہ اور مرارہ ابن الربیع۔

ان پیچھے رہ جانے والوں میں وہ مخلص بھی جن کے اخلاص کے ایمان افروز نمونے بھی اس وقت سامنے آئے حضرت ابوذر غفاری کا راستہ میں اونٹ سست ہو گیا اور وہ پیچھے رہ گئے ان کا اونٹ بیٹھ گیا اور وہ رک گئے۔ اونٹ کی قوت رفتار سے مایوسی ہو گئی۔ تو سامان خود اٹھا لیا اور لشکر کے نقش قدم پر چل دیئے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایک منزل پر قیام پذیر ہوئے تو کسی نے دیکھا کہ کوئی شخص پیدل چلا آ رہا ہے۔ حضور اقدس سے عرض کیا گیا۔ فرمایا ابوذر ہوں گے۔ چنانچہ وہی نکلے۔

حضرت ابوخیثمہ کا واقعہ اس سے بھی زیادہ عجب ہے جیسا کہ آپ شیخ الاسلام کے افادات میں پڑھ چکے ہیں۔

جہاد میں ہر تکلیف عمل صالح ہے

۱۲۰ یہ اس لیے کہ اللہ کے راستہ میں آئی ہوئی ہر پیاس، ہر محنت اور ہر بھوک اور ہر وہ چلنا جو کافروں کے غیظ و غضب کا باعث ہو اور دشمن کی جانب سے ملی ہوئی ہر چیز ان کے نامہ اعمال میں عمل صالح بنا کر لکھ دی گئی ہو بلاشبہ اللہ سبحانہ نیکو کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا ہے یعنی باوجودیکہ ان میں سے اکثر چیزیں مثلاً بھوک پیاس لگنا یا تکلیف پہنچنا اختیاری کام نہیں ہیں۔ تاہم نیت جہاد کی برکت سے ان غیر اختیاری چیزوں کے مقابلے میں اعمال صالحہ ان کے فرد حسنات میں درج کر دیئے جائیں گے جن پر خدا نیک اجر عطا فرمائے گا[1]

علامہ بقاعی کی رائے میں یہ علت ہے اس ممانعت کی ہو۔ پہلی آیت میں جہاد میں رہ جانے سے منع کیا تھا اب اسکی وجہ بتائی جا رہی ہے کہ اس راہ میں کوئی تکلیف تکلیف نہیں بلکہ عمل صالح ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ پیاس، محنت اور بھوک میں ایک ترتیب ہے اس ترتیب سے یہاں تینوں کا ذکر کیا ہے۔ جو اللہ کی راہ میں نکلتا ہے حرکت سے حرارت اٹھتی ہے، حرارت سے پیاس بھڑکتی ہے اور اس تسلسل سے تھکاوٹ رونما ہوتی ہے اور تھکاوٹ کے احساس کو بھوک اجاگر کرتی ہے۔

اس آیت میں دراصل کمزور مسلمانوں کی حوصلہ افزائی ہے کہ ہرچند جہاد فی سبیل اللہ میں آزمائشیں مشکلات اور خطرات ہیں لیکن جہاد میں جس خطرے اور مشکل سے بندہ گذرتا ہے جو چوٹ بھی بندہ کھاتا ہے جو وہ دشمن کو لگاتا ہے یا دشمن اسے لگاتا ہے ہر ایک کے بدلے میں اس کے کھاتے میں عمل صالح درج ہوتا ہے اور جزا کے دن ہر شخص اپنے ہر عمل کا بہتر سے بہتر بدلہ پائے گا۔

آخر میں ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین فرما کر ایک طرف یہ اشارہ کر دیا کہ اس غزوہ میں شرکت کرنے والے صرف جہاد کرنے والے نہیں بلکہ جہاد میں حسن کاری کرنے والے ہیں دوسری طرف یہ بھی بتا دیا کہ اللہ کے ہاں اعمال کی مقبولیت کے لیے ضروری شرط یہ ہے کہ یہ اعمال پوری خوبی کے ساتھ صرف اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے انجام دیئے جائیں کسی اور غرض کا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

شائبہ اس میں شامل نہ ہو اور خالصۃ اللہ کی رضا کے لیے کیئے جائیں۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرنا

۱۲۸ اسی طرح اللہ کی راہ میں خرچ کرنا چھوٹا ہو یا بڑا اور وادی کا قطع کرنا ان کے لیے نیکی بنا کر لکھ دیا گیا ہے تاکہ اللہ سبحانہ ان کو ان کے کاموں کی بہترین جزا دے۔ خرچ کرنا اور میدان طے کرنا خود عمل صالح اور اختیاری اعمال ہیں اس لیے یہاں الا کتب لھم فرمایا گذشتہ کی طرح الا کتب لھم بہ عمل صالح نہیں فرمایا نہ علیہ ابن کثیر[۱] چھوٹا اور بڑا یعنی کم اور زیادہ کی تعبیر پیش پا افتادہ حالات کی نشان دہی کے لیے ہے۔

مختلف اصحاب نے انفاق میں جہاں بڑی فراخ حوصلگی کا مظاہرہ کیا وہاں وہ بھی تھے جنہوں نے دن بھر کی کمائی سے تھوڑا سا دیا حضرت عقیل انصاری نے رات بھر کنوئیں سے پانی نکال کر ایک کھیت سیراب کیا۔ اور مزدوری میں چار سیر کھجوریں پائیں۔ دو سیر اہل وعیال کو دیں اور دو سیر بارگاہ رسالت میں لا کر پیش کر دیں۔ حضور نے حکم دیا کہ ان کو پورے مال پر بکھیر دیا جائے۔ شائد صغیرہ کو اول لانے میں ایسے حضرات کی حوصلہ افزائی ہے اور ممکن ہے ان کی تعداد زیادہ ہو۔ کیونکہ سوء انفاق سے اس وقت خشک سالی کے باعث قحط کی سی حالت نمودار تھی۔ پھل پکنے والے تھے۔ لفظ کبیرہ والے خاص خاص حضرات تھے مثلاً

حضرت ابوبکرؓ نے پورا مال بارگاہ رسالت میں پیش کر دیا یہاں تک کرتہ کے بٹن بھی پیش کر دیے۔

حضرت عمرؓ نے پورے مال کے دو حصے کیئے اور ایک حصہ حضور کی خدمت میں پیش کر دیا۔

حضرت عثمانؓ نے تین سو اونٹ سازو سامان کے ساتھ حاضر کر دیے اور ایک ہزار دینار نقد دیئے اور مجہز جیش العسرۃ کا بارگاہ رسالت سے لقب پایا۔

حضرت عبدالرحمن بن عوف نے چالیس ہزار درہم دیئے۔

آیت میں لطیف بلاغت

اس آیت میں جب پیاس مشقت اور بھوک کا ذکر کیا تو فرمایا الا کتب لھم بہ

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

عمل صالح خرچ کرنے اور مسافت طے کرنے کا ذکر کرکے صرف الا کتب لھم فرمایا۔ اس کی ایک وجہ تو وہ ہے جو شیخ الاسلام نے حافظ ابن کثیر کے حوالہ سے بتائی ہے کہ خرچ کرنا اور مسافت طے کرنا ارادی اور اختیاری کام ہیں اس لیے وہ تو خود عمل صالح ہیں اور قابل جزا ہیں لیکن چونکہ بھوک پیاس اور مشقت غیر ارادی اور غیر اختیاری ہیں اس لیے ان کے عمل صالح ہونے اور قابل جزا ہونے کی تصریح فرمائی ہے اور علامہ بقاعی نے ابو حیان اندلسی کے حوالہ سے وجہ یہ بتائی ہے کہ بھوک پیاس میں چونکہ مشقت اور نفع زیادہ ہوتا ہے اس لیے وہاں کھول کر بتا دیا کہ یہ اعمال صالحہ ہیں۔

آخر میں فرمایا لیجزیھم اللہ احسن ما کانوا یعملون اس کے شارحین قرآن نے دو معنے بتائے ہیں ایک معنی تو یہ ہیں کہ ان کو بہترین کاموں کی اللہ جزا دے گا۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ اللہ سبحانہ ان کے کاموں کی ان کو بہترین جزا دے گا اور دونوں ہی معنی صحیح ہیں۔ مولانا اشرف علی نے دوسرے معنی لیے ہیں فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہ ان کو ان کے کاموں کا اچھے سے اچھا بدلہ دے گا۔ مولانا آزاد نے بھی ان کی ہمنوائی کی ہے۔ لیکن مولانا مودودی نے پہلے معنے لیے ہیں فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے اس اچھے کارنامے کا صلہ انہیں عطا کرے گا۔ علامہ خفاجی نے عنایۃ القاضی میں لطیف بحث کی ہے اور امام رازی نے بھی اس موقعہ پر خوب داد تحقیق دی ہے۔ باتیں دو ہیں ایک یہ کہ ان کو جزا جو ملے گی وہ اچھی ہوگی دوسرے یہ کہ ان کو ان کے اچھے اعمال کی جزا ملے گی۔ میری رائے میں اعمال کا یہاں ذکر موضوع بحث نہیں ہے کیونکہ جن اعمال کا ذکر ہوا ہے وہ تو اچھے ہی ہیں۔ سوال تو صرف جزا کا ہے کہ وہ کیسے ہوگی جواب میں ارشاد ہوا ہے کہ جزا بہترین ہوگی اور خوبصورت ہوگی۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ
كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا
قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ﴿۱۲۲﴾

ع ۱۵ / ۴ / ۳

الربع

اہلِ ایمان کو یہ زیب نہیں دیتا ہے کہ سب ہی نکل جائیں [۱]
لہٰذا ایسا کیوں نہیں ہوا ہر گروہ میں سے کچھ لوگ نکلیں تاکہ دین میں
سوجھ بوجھ پیدا کریں [۲] اور تاکہ واپسی پر اپنی قوم کو ڈرائیں تاکہ
لوگ خلافِ دین سے بچ کر رہیں [۳]

مفردات کے معانی

فرقۃ فرق سے فعلۃ کے وزن پر بنا ہے بڑی جماعت میں سے ٹولی کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع فرق آتی ہے اسی سے افتراق۔ مفارقہ، تفریق اور تفرق ابواب آتے ہیں۔ فرقہ چھوٹا اور فرق ذرا بڑا ہوتا ہے۔

طائفۃ گروہ، جماعت، کچھ، ایک اور ایک سے زیادہ سب کے لیے طائفہ بولا جاتا ہے طوف سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث۔ علامہ عینی رقم طراز ہیں لغت میں طائفہ کے معنے کسی ایک ٹکڑے کے ہیں۔ عباب میں ہے الطائفۃ من الشئی القطعۃ۔ علامہ فیروز آبادی کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں۔ ایک اور ایک سے زیادہ کو طائفہ کہتے ہیں الواحد فما فوقہ۔ امام مجاہد فرماتے ہیں کہ ایک سے لے کر ہزار تک کو طائفہ

کہتے ہیں۔ عطا کہتے ہیں کہ طائفہ کم سے کم دو آدمی ہیں لیتفقھوا۔ اس کا مادہ فقہ ہے اس کے معنی سمجھنے اور دریافت کرنے کے ہیں۔ راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ علم شاہد کے ذریعے علم غائب تک پہنچنے کا نام فقہ ہے اس اعتبار سے علم سے خاص ہے فقہ کے اصطلاحی معنی اور ہیں تفقہ اسی سے باب تفعل ہے اس کے معنی میں مبالغہ ہے۔ یہ دو بابوں سے سمع اور کرم سے آتا ہے

اسلام کا نظام تعلیم وتربیت

سورۃ توبہ کا اصل موضوع جہاد ہے۔ اور جہاد یہ ہے کہ اللہ کے دین کو برتر کرنے دوسروں تک پہنچانے اور اپنوں کو جانے کے لیے ذاتی اغراض سے بالا ہو کر خوب محنت کی جائے جان کھپائی جائے وقت قربان کیا جائے مال لگایا جائے۔ اور اس راہ میں اگر رکاوٹ ہو خواہ کوئی ہو اسے ہٹانے کی کوشش کی جائے جہاد کے لفظی معنی یہ ہیں کہ کسی کام کے لیے اپنی کوششیں صرف کر ڈالی جائیں اور مقصد تک پہنچنے کے لیے اپنی ساری طاقت نچوڑ دی جائے۔ اس لیے جہاد فی سبیل اللہ کا مفہوم یہ ہوا کہ صرف اللہ کی رضا کی خاطر اس کے دین کی پیروی کا حق ادا کر دینے کے لیے وہ سب کچھ کر ڈالا جائے جو بس میں ہو۔

ظاہر ہے کہ کسی مقصد کی خاطر جو محنت کی جاتی ہے اس کا حالات سے گہرا تعلق ہوتا ہے جیسے حالات ہوتے ہیں ان ہی کی مناسبت سے جدوجہد کی شکلیں بھی اختیار کی جاتی ہیں یہ موقع پرستی نہیں ہے بلکہ عین اصول پسندی ہے کیونکہ جدوجہد محض جدوجہد کی خاطر نہیں ہوتی ہے بلکہ کسی مقصد کی خاطر ہوتی ہے اور کسی کی واقعی خدمت اسی وقت ہو سکتی ہے جب اس کے لیے جدوجہد کا طریقہ وقت اور ماحول کو سامنے رکھ کر مقرر کیا گیا ہو۔ اس لیے جہاد فی سبیل اللہ کی شکل کب کیا ہو اس کا تعین حالات ہی کرتے ہیں۔ اسلام نے اصولی طور پر مختلف حالات کے لیے اس کی جو مختلف شکلیں اور قسمیں مقرر کر دی ہیں وہ دو ہیں۔

(۱) تعلیمی جہاد (۲) مسلح جہاد

اب تک دوسری قسم کو بیان کیا ہے۔ اس آیت میں پہلی قسم کو بتایا جا رہا ہے۔ المراغی نے صحیح لکھا ہے۔ تعلیم وتربیت ہی ایمان کی دعوت میں اصلی اور بنیادی اہمیت کی چیز ہے۔ دین کو جاننا اور جانتے ہوئے دین کی پوری انسانیت کو دعوت دینا ہی اصل کام ہے اس کام میں اگر کوئی رکاوٹ ہو تو اس کو دور کر لے کا نام مسلح جہاد ہے۔

ایک نہایت اہم بات ہے جو اسلامی دعوت کو مضبوط و طاقتور بنانے کی خاطر بیان کی گئی ہے۔ آغاز میں جب کہ اسلام عرب میں بالکل نئی دعوت تھی اور مخالفتوں کے طوفان میں آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ اس ہدایت کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ اس وقت تو دعوت اسلامی کو قبول ہی وہ کرتا تھا جو اس کو پوری طرح سمجھ لیتا تھا مگر جب دعوت اسلامی جوان ہو گئی اور اس کا زمین کے ایک گوشہ میں اقتدار قائم ہو گیا تو آبادیاں جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگیں۔ نومسلم آبادی کی یہ تیز رفتاری اس کو مقتضی تھی کہ ان کی اسلام آشنائی کا مستحکم انتظام کیا جائے۔ اس لیے بر وقت اللہ سبحانہ نے یہ ہدایت دی کہ دعوت اسلامی جس انداز سے وسیع سے وسیع تر ہو رہی ہے اس کے مطابق اس کے استحکام کی تدبیر یہ ہے کہ ہر حصہ آبادی میں سے کچھ لوگوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کریں تا آنکہ مسلمانوں کی پوری آبادی میں اسلام کا شعور اور اسلام کا علم عام ہو جائے۔

ل اہل ایمان کو یہ زیب نہیں دیتا ہے کہ سب ہی نکل جائیں۔ گذشتہ رکوعات میں جہاد میں نکلنے کی فضیلت اور نہ نکلنے پر ملامت تھی ممکن تھا کہ کوئی سمجھ بیٹھے کہ ہمیشہ ہر جہاد میں تمام مسلمانوں پر نکلنا فرض عین ہے اس میں بتا دیا کہ نہ ہمیشہ یہ ضروری ہے نہ مصلحت ہے کہ سب مسلمان جہاد کے لیے نکل کھڑے ہوں۔ مناسب یہ ہے کہ ہر قوم اور ہر قبیلہ سے ایک جماعت نکلے باقی لوگ دوسری ضروریات میں مشغول ہوں [1]

اس آیت نے یہ بات سب سے پہلے کھول دی کہ اجتماعی فرائض کی دو قسمیں ہیں فرض کفایہ اور فرض عین۔ یہ وہی انسانی اعمال کی دو قسمیں ہیں جن کو ہم جماعتی فرائض اور شخصی فرائض کہتے ہیں۔
فرض کفایہ سے مقصود وہ احکام ہیں جو بحیثیت جماعت و اجتماع قوم پر فرض ہیں نہ کہ بحیثیت فرد و انفراد یعنی ایسے فرائض جو مسلمان جماعتوں اور آبادیوں کے ذمے لگا دیے گئے ہیں کہ ان کا انتظام کریں۔ اس کا انتظام ہونا چاہیے یہ ضروری نہیں کہ ہر فرد بذات خاص اس میں حصہ لے۔
اگر ایک گروہ نے ایک وقت انجام دے دیا تو باقی مسلمانوں سے اس وقت کی ذمہ داری ختم ہو گئی جیسے تجہیز و تکفین میت اور نماز جنازہ۔ البتہ ایک مسلمان کے لیے غربت اسی میں ہے کہ ادائے فرض کفایہ میں شخصاً حصہ لے۔
فرض کفایہ کے مخاطب افراد و اشخاص نہیں بلکہ جماعت ہوتی ہے اس لیے ہر مسلمان

---

[1] افادات شیخ الاسلام

جماعت اور آبادی کو اس کی پابجائی کا انتظام کرنا چاہیے۔

دوسری قسم فرض عین کی ہے یعنی وہ فرائض جن کی پابجائی جماعت پر نہیں بلکہ فرداً فرداً ہر مسلمان سے مطلوب ہے اور ایک کے کرنے سے دوسرا بری الذمہ نہیں ہوتا ہے جیسے پانچ وقت کی نماز روزہ حج اور زکوٰۃ۔

شرعاً مسلح جہاد یعنی قتال کی صورت اس آیت کی روشنی میں فرض کفایہ ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہر مسلمان بیک وقت اس میں حصہ لے۔ ہر عہد اور ہر زمانہ میں مسلمانوں کی ایک جماعت ضرور ایسی ہونی چاہیے جو یہ فرض انجام دیتی رہے۔ اگر ایک جماعت انجام دے رہی ہے تو کافی ہے جو مسلمان شریک ہوگا اس کے لیے بڑا اجر ہے اور جو شریک نہ ہوگا۔ اس پر کوئی گناہ نہیں۔ ہدایہ میں ہے جہاد فرض کفایہ ہے جب مسلمانوں کی کوئی جماعت اس فرض کو انجام دے دے تو باقی مسلمان ذمہ داری سے سبکدوش ہوجاتے ہیں۔ اگر کوئی بھی فرض انجام نہ دے تو ترک فرض کی وجہ سے سب گنہ گار ہوں گے کیونکہ فرض سب پر ہے۔

یاد رہے کہ جماعت سے مقصود تمام دنیا کے مسلمانوں کی مجموعی جماعت نہیں بلکہ ہر ملک کے مسلمانوں کی جماعت ہے۔ سعدی چلپی نے عنایہ میں یہ بات کھولکر سمجھائی ہے۔

ہدایہ کی عبارت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر ایک ملک کے مسلمانوں نے یہ فرض ادا کردیا تو دوسرے ملک کے مسلمانوں سے فرض کی ذمہ داری کا بوجھ ختم ہوگیا مثلاً اگر روم کے ترکوں نے جہاد قائم رکھا تو ہندوستان کے مسلمانوں سے ساقط ہو گیا۔ کیونکہ قیام جہاد کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں سے دشمن کے حملوں اور شر کو ہٹایا جائے۔ ظاہر ہے کہ رومی مسلمانوں کے جہاد کرنے سے ہندوستان کے مسلمان محفوظ نہیں ہوسکتے وہ تو اسی وقت ہوں گے جب خود اپنے ملک میں انتظام کریں۔

مطلب یہ ہے کہ ہر ملک کے مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے اگر اس ملک کے مسلمانوں میں سے ایک جماعت یہ فرض انجام دیتی رہی تو وہاں کے بقیہ مسلمانوں سے یہ فرض ساقط ہوجائے گا لیکن دوسرے ملکوں کے مسلمانوں پر فرضیت باقی رہے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس فرض میں خطاب تمام مسلمانان عالم سے نہیں ہے بلکہ ہر جماعت اور ہر ملک کے مسلمانوں سے ہے۔ اور فرض کفایہ ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں سے اتنے مسلمانوں کو انجام دینا چاہیے

جو حصول مقصد کے لیے کافی ہو۔ لہٰذا ایک ملک میں سلسلہ جہاد کے بقا سے دوسرے ملک کے مسلمان بری الذمہ نہیں ہو سکتے ان پر بدستور اس کا وجوب باقی رہے گا۔

فرض کفایہ کی صورت اس قتال کی ہے جس کی صورت حملہ و ہجوم کی ہو

دوسری قسم دفاع ہے یعنی جب کوئی غیر مسلم جماعت مسلمانوں کی آبادیوں اور حکومتوں پر حملہ کر دے تو اس حملہ کو ہر طرح سے مقابلہ کر کے روکنا اور اسلامی ملک کی حفاظت کرنا۔ یہ فرض کفایہ نہیں بلکہ بالاتفاق نماز روزہ کی طرح ہر مسلمان پر فرض عین ہے ہدایہ میں ہے۔

"نفیر عام کی صورت میں جہاد فرض عین ہو جاتا ہے۔"

شیخ ابن الہمام نے نفیر عام کی صورت یہ بتائی ہے کہ

اسلامی ملک پر غیر مسلم حملہ کر دے تو اس صورت میں جہاد فرض عین ہو جاتا ہے خواہ سربراہ مملکت نیک ہو یا بد۔

دین میں فقاہت فرض کفایہ ہے

۱۲۹ لہٰذا ایسا کیوں نہیں ہوا کہ ہر گروہ میں سے کچھ لوگ نکلیں تاکہ دین میں سمجھ بوجھ پیدا کریں۔ اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس جہاد کے لیے تشریف لے جا رہے ہوں تو ہر قوم میں سے جو جماعت آپ کے ہمراہ نکلے گی وہ حضور کی صحبت میں رہ کر اور سینکڑوں حوادث و واقعات سے گذر کر دین اور احکام دینیہ کی سمجھ حاصل کریں اور واپس آ کر اپنی باقی قوم کو مزید علم و تجربہ کی بنا پر بھلے برے سے آگاہ کرے گی اور فرض کیجیے کہ اگر حضور خود مدینہ میں رونق افروز ہیں تو باقی ماندہ لوگ جو جہاد میں نہیں گئے حضور اقدس کی خدمت سے مستفید ہو کر دین کی باتیں سکیں گے اور مجاہدین کی غیبت میں جو وحی معرفت کی باتیں سنیں گے ان سے واپسی کے بعد مجاہدین کو خبردار کریں گے آیت کے الفاظ میں عربی ترکیب کے اعتبار سے دونوں احتمال ہیں۔ کمافی روح المعانی وغیرہ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ ہر قوم میں سے چاہیے بعضے لوگ پیغمبر کی صحبت میں رہیں تاکہ علم دین سیکھیں اور پچھلوں کو سکھائیں[1]

اس آیت کی دو طرح سے تشریح کی گئی ہے اور دونوں اپنی جگہ درست ہیں حضرت مولانا اشرف علی

[1] افادات شیخ الاسلام

نے لکھا ہے کہ :

کہ ان کی ہر ہر بڑی جماعت میں سے ایک ایک چھوٹی جماعت جہاد میں جایا کرے اور کچھ اپنے وطن میں رہ جائیں تاکہ یہ باقی ماندہ لوگ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرتے رہیں۔

حضرت مولانا ابوالکلام نے یہ مطلب بتایا ہے :

ایسا کیوں نہ کیا گیا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکل آئی ہوتی کہ دین میں دانش و فہم پیدا کرے۔

مولانا اشرف علی کا رجحان یہ ہے کہ آیت قرآن کا اصل موضوع مسلح جہاد ہے جب کہ مولانا آزاد کا میلان یہ بتلا رہا ہے کہ آیت کا اصل موضوع اللہ کے دین میں فقاہت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دونوں جہاد ہیں اور دونوں ہی امت کی ضرورت ہیں۔ زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ آیت کا موضوع دین میں فقاہت ہے۔ اسلام کے عام لوگوں میں پھیل جانے کے بعد اللہ سبحانہ نے اسلام کے استحکام کی تدبیر یہ بتائی ہے کہ ہر حصہ آبادی سے کچھ لوگ لے کر تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جائے تاکہ مسلمانوں میں اسلام کا شعور عام ہو جائے۔ منشا یہ ہے کہ ایسا انتظام ہونا چاہیے کہ آبادی کا ایک حصہ دین سے واقفیت کے لیے وقف ہو جائے۔ فقہاء نے لیتفقھوا فی الدین سے دینی تعلیم کا وجوب نکالا ہے۔

دراصل اس سے پہلے آیت

الاعراب اشد کفرا و نفاقا واجدر ان لا یعلموا حدود ما انزل اللہ علی رسولہ۔

میں یہ بات بتائی تھی کہ احکام دین سے بے خبری دیہاتی زندگی میں زیادہ ہے کیونکہ وہ شہری زندگی سے دور ہونے کی وجہ سے تعلیم و تربیت سے محروم رہتے ہیں اب یہاں بتایا جا رہا ہے کہ تعلیم کا عمومی نظم قائم ہونا چاہیے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ تمام مسلمان گھر بار چھوڑ کر علم حاصل کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوں۔ لہذا ایسا کرنا چاہیے کہ ہر بستی اور ہر گروہ میں سے کچھ لوگ اس کام کے لیے وقف ہو جائیں وہ تعلیم و تربیت کے مرکز میں رہ کر دین میں بصیرت حاصل کریں۔

قرآن سے اشارۃً معلوم ہو رہا ہے کہ مدینہ میں اس کام کے لیے باقاعدہ درسگاہ موجود تھی۔ اسی تعلیم گاہ کا نام صفہ تھا جس میں طلبہ کی تعداد ایک ایک وقت میں اسی تک ہوتی تھی۔ اگر

انتظام نہ ہوتا تو اس کے لیے نفر کا حکم نہ ہوتا۔ یہ مدرسہ نبوت کی سرپرستی میں قائم تھا۔ اس مدرسہ میں تعلیم دینے کا کام حضرت ابو ہریرہ، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابی بن کعب انجام دیتے تھے۔

نصاب تعلیم

آیت میں لیتفقھوا فی الدین سے مدرسہ میں نصاب تعلیم کی طرف اشارہ ملتا ہے تفقہ فی الدین کیلئے جن باتوں کی ضرورت ہے انکی باضابطہ تعلیم دی جاتی تھی۔ احادیث میں اس کا تفصیلی ذکر ہے۔ فردہ ابن ملیک جو یمن سے مدینہ منورہ آئے تھے۔ ان کے ذکر میں ہے۔

یمن سے آئے قرآن، فرائض اور قوانین اسلام کی تعلیم انہوں نے حاصل کی۔ (ابن سعد)
قرآن کے ساتھ شرائع الاسلام یعنی قرآنی احکام کی عملی شکلیں جو صحابہ کو حضور اقدس خود بتاتے تھے یہی مستقل علم تھا اور یہی ان کا نصاب تعلیم تھا۔

قرآن کی اسی پکار نے مسلمانوں میں اول دن سے تحصیل علم کا ولولہ پیدا کر دیا تھا۔ اور قرآن کے نفر کے مطالبہ نے مسلمانوں کو تحصیل علم کی طرف اس قدر مائل کر دیا تھا کہ لفظ رحلت اس مقدس سفر کا نام پڑ گیا جو تحصیل علم کے لیے کیا جائے۔ فرائض اور قوانین اسلام کے سیکھنے کے لیے گھر بار چھوڑنا اور دور دراز ممالک کا سفر کرنا مسلمانوں کا خصوصی شعار تھا۔ علمائے سلف کو اس خصوصی سفر کے ساتھ جو غیر معمولی شغف تھا آج اس کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔ محدثین کے حالات پڑھنے سے لفظ رحلت کے تقدس کا اندازہ ہوتا ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ کی زبانی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مبارک ارشاد منقول ہے۔

جو شخص علم کی تلاش میں کسی راستہ پر چلتا ہے اللہ سبحانہ اس کے صلہ میں اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہے۔

اور جامع ترمذی، سنن دارمی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد آیا ہے۔

جو شخص علم کی تلاش میں نکلا وہ جب تک لوٹ کر نہ آئے اللہ کے راستہ میں ہے۔

محدثین نے اس عنوان پر اپنی تصانیف میں مستقل ابواب قائم کیے ہیں چنانچہ امام بخاری نے اپنی

صحیح میں کتاب العلم میں دو باب باندھے ہیں پہلا باب ہے باب الخروج فی طلب العلم اور ترجمۃ الباب میں لکھا ہے کہ

حضرت جابر بن عبد اللہ نے حضرت عبد اللہ ابن انیس سے ایک حدیث سننے کی خاطر ایک ماہ کا سفر کیا تھا۔

اور دوسرے باب کا عنوان ہے باب الرحلۃ فی المسئلۃ النازلۃ یعنی جو مسئلہ پیش آئے اسے دریافت کرنے کے لیے سفر کرنا۔ اور امام دارمی نے اپنی سنن میں باب باندھا ہے باب الرحلۃ فی طلب العلم والعناد فیہ یعنی طلب علم کی خاطر سفر کرنا اور مشقت اٹھانا۔

دینی تعلیم کا مقصد

ف۳لہ اور تاکہ واپسی پر اپنی قوم کو ڈرائیں تاکہ لوگ خلاف دین سے بچ کر رہیں طلب علم فرض کفایہ ہے اور جہاد بھی فرض کفایہ ہے۔ البتہ اگر کسی وقت امام کی طرف سے نفیر عام ہو جاتا ہے۔ تبوک میں یہی صورت تھی اس لیے پیچھے رہنے والوں سے باز پرس ہوئی۔ واللہ اعلم ابو حیان اندلسی کے نزدیک یہ آیت جہاد کے لیے نہیں طلب علم کے بارہ میں ہے۔ جہاد اور طلب علم کی آیات میں مناسبت یہ ہے کہ دونوں میں خروج فی سبیل اللہ ہے اور دونوں کی غرض احیائے واعلائے دین ہے ایک میں تلوار سے دوسرے میں زبان وغیرہ سے لہ

اس میں اسلامی تعلیم کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ لوگ علم سیکھیں اور سیکھنے کے بعد جا کر دوسروں کو سکھائیں۔ خود مستفید ہو کر دوسروں کو بھی مستفید کریں۔ اس طرح دیہات کے لوگ اپنے مال اور مویشی کی بھی دیکھ بھال کر سکیں گے اور اسلامی تعلیمات سے بھی استفادہ کر سکیں گے۔ صحابہ نے اس مقصد کی خاطر باریاں مقرر کر رکھی تھیں۔ آیت میں طلب علم کے لیے تفقہ کا لفظ آیا ہے جس کے معنے ہیں دین میں بصیرت حاصل کرنا اور تعلیم دینے کے لیے انذار کا لفظ آیا ہے جس کے معنے ڈرانے کے ہیں اور خاص طور پر آخرت کی زندگی کی تیاری کی خاطر آگاہ کرنے کے ہیں۔ یہ دو لفظ اسلام میں جو تعلیم کا بنیادی مقصد ہے اس کے لیے استعمال ہوئے ہیں اسلام میں تعلیم کا بنیادی مقصد دین میں بصیرت حاصل کرنا اور آخرت کی کامیابی کے لیے اپنی اور دوسروں کی تربیت کرنا ہے

لہ افادات شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ تعلیم عمومی کے جس انتظام کا اس میں حکم دیا گیا ہے اس کا اصل اور بنیادی مقصد مسلمانوں کو محض ناخواندہ سے خواندہ بنانا نہیں بلکہ واضح طور پر اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں میں دینی شعوری ہو اور ان کو اس حد تک دین سے آگاہی حاصل ہو جائے کہ وہ غیر مسلمانہ انداز زندگی اور مسلمانہ زندگی میں امتیاز کر سکیں اور غیر مسلمانہ زندگی سے بچ کر رہ سکیں یہ اسلامی تعلیم کا وہ مقصد ہے جو خود اللہ سبحانہ نے مقرر کر دیا ہے تعلیم و تعلم ہی کے موضوع پر یہاں اگر قرآن کی یہ آیت بھی پیش نظر رہے جس میں حصول کمال کا تیر بہدف نسخہ اسی تعلیم و تعلم کو بنایا ہے۔

کونوا ربانیین بما کنتم تعلمون الکتاب و بما کنتم تدرسون

ربانی بن جاؤ کتاب الٰہی کے پڑھانے اور پڑھنے کے ذریعے

ربانی اسم نسبت ہے رب کی طرف جیسے لحیانی، رقبانی وغیرہ یعنی بہت زیادہ با خدا، بہت زیادہ خدا رسیدہ۔ آیت میں صرف یہ نہیں بتایا کہ ربانی بن جاؤ بلکہ ربانی بننے کا طریقہ بھی بتا دیا ہے اور وہ یہ ہے بما کنتم تعلمون الکتاب و تدرسون یعنی تم کتاب الٰہی کے تعلیم و تعلم کے ذریعے ربانی بن سکتے ہو۔ جو بات زیر تشریح آیت میں تفقہ اور انذار کے عنوان سے پیش کی ہے اسی کو اس آیت میں درس تعلیم سے تعبیر کیا ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ قرآن کی نظر میں ربانی وہ ہے جو تعلیم و تعلم کا مشغلہ رکھتا ہو۔ گویا قرآن نے امت کو قیامت تک کے لیے حصول کمال کا یہ تیر بہدف نسخہ بتا دیا ہے کہ اگر کمال چاہتے ہو تو درس و تعلیم یا تفقہ و انذار کو اپناؤ۔

یہاں تفقہ اور انذار پہ سرسری نگاہ ڈال کر نہ گذر جایئے ذرا اس کی معنویت پر غور کیجیے، تفقہ کے معنے صرف سمجھنے کے نہیں بلکہ اس میں زیادتی اور محنت کا مفہوم بھی داخل ہے، ایسے ہی انذار کے معنے صرف آگاہ کرنا نہیں بلکہ وہ آگاہی جس میں رحم، ہمدردی کی آمیزش ہو۔ اسلام آشنائی میں معرفت حاصل کرنے کے لیے خوب محنت مشقت اٹھا کر اور پورا فن کار بن کر شفقت اور محبت کے جذبات سے سرشار ہو کر اسلامی علوم کی سوغات پیش کرنا قرآن کا مطالبہ ہے۔

مسلم کے کمال کی ایک شرط یہ ہے کہ اس کی تعلیم میں یہ تاثر ہو کہ وہ دوسروں کو اپنے فیض سے بہرہ ور کر سکے یعنی وہ خود کامل ہو اور دوسرے ناقصوں کو بھی کامل بناتا ہو۔ وہ خود پاک ہو دوسرے ناپاکوں کو پاک و صاف کر دیتا ہو۔ وہ علم جو انسان میں ابھار پیدا نہیں کرتا وہ علم صحیح نہیں ہے علم کی صحت کا دارومدار اس پر ہے کہ علم عالم میں صفت اور ملکہ کا درجہ حاصل

کرے۔ عمل صفت اور ملکہ ہی کے نتیجے کو کہتے ہیں۔ اگر کسی شخص کو صرف کتاب الٰہی کے نقوش ذہن میں مستحضر ہیں اور اس کا کوئی اثر اس کے عمل میں نہیں ہے وہ علمی فیضان کا دوسروں کے لیے کبھی ذریعہ نہیں بن سکتا۔ چونکہ تفقہ کا لازمہ عمل ہے اس لیے آیت میں عمل کی تصریح نہیں ہے جیسے جزا کے موقعہ پر صرف عمل کا ذکر کیا جاتا ہے کیونکہ عمل کے لیے علم لازم ہے۔ علم و عمل میں لازم و ملزوم کی نسبت ہے کہیں لازم کا ذکر کر دیا جاتا ہے اور کہیں صرف ملزوم کو۔

غِلْظَةً ۚ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿١٢٣﴾ وَاِذَا مَآ
اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا ۚ
فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿١٢٤﴾
وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى
رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿١٢٥﴾ اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ
فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ
يَذَّكَّرُوْنَ ﴿١٢٦﴾ وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى
بَعْضٍ ۭ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ۭ صَرَفَ اللّٰهُ
قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿١٢٧﴾

اے اہلِ ایمان ان کافروں سے جنگ کرو جو تمہارے آس پاس ہیں[1] اور ان کو تمہارے اندر سختی محسوس ہونی چاہیئے[2] اور خوب جان لو کہ اللہ سبحانہ متقیوں کے ساتھ ہے[3] اور جب قرآن کی کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو ان میں سے کچھ کہتے ہیں اس سورت کے ذریعے تم میں سے کس کے ایمان میں

زیادتی ہوئی ہے ؟ سو سُن لو اہلِ ایمان کے ایمانوں میں یہ
سورت زیادتی کرتی ہے اور وہ اس پر خوشیاں منا رہے
ہیں اور لیکن وہ لوگ جن کے دل روگی ہیں تو بلاشبہ ان میں
اس سورت کے ذریعے گندگی پر گندگی کا اضافہ ہوتا ہے
اور وہ دنیا سے ایسی حالت میں گئے کہ ایمان سے محروم تھے۴
کیا ان لوگوں کو نظر نہیں آتا ہے کہ کوئی سال اس سے خالی نہیں
مانا ہے کہ وہ ایک بار یا دو بار آزمائش کی بھٹی میں نہ پڑے
ہوں۔ پھر بھی ان کو توبہ کی توفیق نہیں ہوتی ہے اور نصیحت
یاب نہیں ہوتے ہیں۵ اور جب ان کے بارے میں کوئی
سورت نازل ہوتی ہے تو وہ اس میں ایک دوسرے
کو دیکھنے لگتے ہیں کیا تم پر کسی کی نگاہ تو نہیں پھر منہ پھیر کر
چل دیتے ہیں۶ اللہ ہی نے ان کے دلوں کو پھیر دیا ہے
کیونکہ وہ سمجھ ہی نہیں رکھتے ہیں۷

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ
آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ

مفردات کے معانی

یلون ولی سے مضارع کا جمع مذکر غائب باب حسب یحسب ولی یلی آتا ہے اس کے دو مصدر آتے ہیں ولی اور ولایۃ۔ ولی کے معنی لگنا اور قریب ہونا اور ولایۃ کے معنی ریاست اور سیاست کے ہیں۔ ولی سے اولیٰ اسم تفضیل کا مذکر ہے بمعنے اقرب آتا ہے یاد رہے کہ اُولیٰ ہمزہ کے پیش کے ساتھ ہی اسم تفضیل ہے مگر یہ ولی سے نہیں بلکہ اول سے اسم تفضیل کا واحد مونث ہے جو اُخریٰ کے مقابلہ پر آتا ہے اس کا مذکر اول ہے۔ ولی سے مولیٰ آتا ہے اور ایک سے زیادہ معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

غلظۃ اس کے معنی سختی اور ترشی کے ہیں غلظ یغلظ باب نصر سے آتا ہے۔ زمخشری نے لکھا ہے کہ یہ لفظ جرأت سے جنگ میں ڈٹنا اور دشمن پر قید اور قتل میں سختی کا جامع لفظ ہے۔ حجازی اسے بکسر الغین پڑھتے ہیں جب کہ بنو تمیم بضم الغین غلظہ اور مشہور قاری عاصم غلظہ بفتح الغین پڑھتے ہیں۔

رجس ناپاک، پلید، گندہ۔ عقوبت عذاب بلا جمع ارجاس آتی ہے۔ رجس چار طرح سے ہوتا ہے طبعی، عقلی شرعی اور تینوں کا مجموعہ رجس شرعی جوا اور شراب رجس عقلی شرک لحم خنزیر تینوں کا مجموعہ مردار قرآن میں سب کے لیے رجس بولا گیا ہے۔

جنگ کی ترتیب

میدان جنگ میں بھی دعوت ہی کی ترتیب قائم رکھی دعوت میں ترتیب یہ بتائی تھی کہ انذر عشیرتک الاقربین پہلے قریب ترین لوگوں کو دعوت دو پھر عمومی دعوت دو جنگ میں بھی ترتیب بتائی کہ پہلے آس پاس کے لوگوں کی جانب سے راہ دعوت میں جو رکاوٹ اسے ہٹاؤ پھر دور کی طرف توجہ کرو۔ اور اس ہدایت کی وجہ یہ ہے کہ پہلے عمومی حکم دیا تھا کہ قاتلوا المشرکین کافۃ کما یقاتلونکم کافۃ۔ اب خصوصی حکم کے ذریعے ترتیب بتائی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے اسی پر عمل کیا ہے پہلے اپنی قوم کو دعوت دی وہ دعوت میں رکاوٹ بنے جنگ کے ذریعے رکاوٹ کو دور کیا پھر اہل عرب کو دعوت دی ان کی جانب سے رکاوٹ ہوئی اسے جنگ کر کے دور کیا۔ پھر اہل شام کو دعوت

کو دعوت دی اور آپ کے بعد صحابہ کرام نے بھی اسی ترتیب کو قائم رکھا۔

ہر دعوت کی راہ میں رکاوٹیں آتی رہی ہیں کیونکہ یہ دنیا خیر و شر کا مسکن ہے جہاں خیر کی بھی طاقت ہے اور شر کی بھی۔ اور دونوں کو اپنے اپنے طور پر کام کرنے کی پوری پوری آزادی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ دونوں باہم ٹکراتی رہتی ہیں اور ایک دوسرے کو نیچا کرنے کے لیے زور لگاتی رہتی ہیں اس لیے یہ ایک فطری سی بات ہے کہ نبوت کی دعوت کی راہ بھی روکی جائے اور نہ صرف یہ کہ دعوت کو قبول نہ کیا جائے بلکہ سرے سے دعوت کو برداشت بھی نہ کی جائے۔ اس لئے قدرتی طور پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان رکاوٹوں کے بارے میں نبوت کا رویہ کیا ہونا چاہیے۔ قرآن اس سوال کے جواب میں ہدایت دیتا ہے کہ رکاوٹ خواہ کوئی ہو اسے ہٹانے کی جان توڑ کوشش کرنی چاہیے مسلسل کرنی چاہیے اور آخر تک کرنی چاہیے لیکن اس دفاع میں ترتیب ہونی چاہیے۔ ترتیب یہی ہے کہ پہلے پاس کی رکاوٹ کو دور کیا جائے۔

لہ اے اہل ایمان ان کافروں سے جنگ کرو جو تمہارے آس پاس ہیں۔ جہاد فرض کفایہ ہے جو ترتیب طبعی کے مطابق اول ان کفار سے ہونا چاہیے جو مسلمانوں سے قریب تر ہوں۔ بعدہ ان کے قریب رہنے والوں سے۔ اسی طرح درجہ بدرجہ حلقہ جہاد کو وسیع کرنا چاہیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے جہاد اسی ترتیب سے ہوئے ہیں دفاعی جہاد میں بھی فقہاء نے یہی ترتیب رکھی ہے کہ جس اسلامی ملک پر کفار حملہ آور ہوں سو وہاں کے مسلمانوں پر دفاع واجب ہے اگر وہ کافی نہ ہوں یا سستی کریں تو ان کے متصل رہنے والوں پر اور کافی نہ ہوں تو پھر جو ان سے اقربا ہوں۔ اسی طرح اگر ضرورت پڑے تو درجہ بدرجہ مشرق سے مغرب تک جہاد فرض ہوتا چلا جائے گا لہ

اسلام نے اپنے پورے نظام اس قرب کو خاص اہمیت دی ہے دین کی دعوت سے لے کر کھانے کی دعوت تک میں قرب کو ملحوظ رکھا ہے دین کی دعوت کا آغاز اقربا سے ہوا۔ انذر عشیرتك الاقربین نفقات میں والدین، اولاد اور بیوی کے اخراجات میں قرابت ہی کو اولیت حاصل ہے میراث میں بھی قرب ہی کو مدار بنایا ہے۔ صدقات میں بھی اول خویش بعد درویش کو قائم رکھا۔ اداب مجلس میں بھی قرب ہی کی رعایت رکھی کھانا پکاتے وقت

لہ افادات شیخ افادات

قرب ہی کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔

کل ما یلیک ولنا کل ما یلیک

نماز میں قریب قریب کھڑے ہونے کی ہدایت اور امام سے قریب ہونے کی ترغیب ہے غرض اسلام کے پورے نظام حیات میں قرب ہی کی روح کار فرما ہے۔ جنگ میں قریب والوں کی رکاوٹ کو ہٹانے میں اخراجات کی کمی، حمل ونقل کے وسائل کی کم ضرورت، نزدیک دشمن کی قوت کا صحیح اندازہ ممکن ہے، بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کی جانب سے اطمینان ہوتا ہے۔ جہاد تو دراصل اچھائی کے راستہ سے رکاوٹوں کے ہٹانے کا نام ہے۔ اسی لیے جہاد کو سب سے بڑی نیکی بتایا گیا ہے اور نیکیوں کے زیادہ حقدار وہ ہی ہوتے ہیں جو قریب ہوں۔ بقاعی نے لکھا ہے کہ جہاد میں یہ ترتیب اگر قائم کرو گے تو تم دوگونہ فائدوں سے دوچار ہو گے ایک یہ کہ تمہیں پیچھے سے کسی سازش کا کوئی اندیشہ نہ رہے دوسرے یہ کہ تم دو جہادوں کے علمبردار ہو جاؤ گے ایک دین میں تفقہ کا جہاد دوسرے تلوار کا جہاد۔

اس میں ایک لطیف نکتہ بھی ہے کہ یہ ایک کسوٹی ہے جس کے ذریعے کھرے کھوٹے کا پتہ لگ جائے گا۔ منافقین کے آس پاس والے کفار ومشرکین سے عزیزانہ روابط اور دوسرے کاروباری مفادات وابستہ تھے۔ وہ اس کے لیے تیار نہ تھے کہ ان سے جنگ کریں اس سے منافقت کا بھانڈا چوراہے میں پھوٹنے کا اندیشہ تھا یہ دین کا اصل مطالبہ ان کے سامنے رکھ دیا خطاب اگرچہ عام ہے لیکن قرینہ بتا رہا ہے روئے سخن ان کی ہی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گردوپیش کے کفار جس طرح تمہاری دعوت ایمان و ہدایت کے سب سے زیادہ حقدار تھے اسی طرح اب اللہ ورسول کی جانب سے اتمام حجت اور اعلان جنگ کے بعد تمہاری تلواروں کے بھی سب سے زیادہ سزاوار یہی ہیں۔ جو لوگ قرابت داری دوستی اور اپنے دنیوی مفاد کی خاطر ان کے معاملے میں مداہنت برتیں گے ان کا ایمان مشکوک ہے۔ اہل ایمان کو پہلے ہدایت کی گئی تھی کہ منافقین کا استیصال کرنے کے لیے باقاعدہ جہاد کیا جائے وہی بات زوردار طریقے پر پھر دہرائی گئی ہے یہاں کھول کر کہا گیا ہے۔ قاتلوا تاکہ اہل ایمان اس کی اہمیت محسوس کریں اور ان منافقوں کے معاملے میں ان نسلی ونسبی اور معاشرتی تعلقات کا لحاظ نہ کریں جو ان کے اور ان کے درمیان وابستگی کا موجب بنے ہوئے تھے۔

ایمان کو کفر کے مقابلے میں سخت ہونا چاہیئے

۲۳ اور ان کو تمہارے اندر سختی محسوس ہونی چاہیے مومن کی شان یہ ہے کہ اپنے بھائی کے حق میں نرم اور دشمنان خدا و رسول کے معاملہ میں سخت و شدید ہو تاکہ اس کی نرمی اور ڈھیلا پن دیکھ کر دشمن جری نہ ہو جائے اذلۃ علی المومنین اعزۃ علی الکافرین والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم اور جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیھم وفی الحدیث انہ صلی اللہ علیہ وسلم قال انا الضحوک القتال ؎ علامہ آلوسی لکھتے ہیں دراصل اس میں مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ ایسے بن کر رہیں کہ کفار ان کو اپنے حق میں سخت گیر سمجھیں شریعت کا قانون جس سختی کا مطالبہ کرتا ہے اس کا موقعہ یہی ہے کہ جب کوئی فرد یا جماعت حدود الٰہی کو توڑے اور اسلامی زندگی کو نقصان پہنچائے یا پہنچانے کے درپے ہو جیسے منافقین و کفار جب سمجھانے پر نہ سمجھیں اور اپنی ضد پر اڑے رہیں بلکہ مسلمانوں کو آزار پہنچانے کے درپے ہوں تو ان کے شر کو روکنے اور ان کی سازشوں کا قلع قمع کرنے کے لیے ان پر پوری سختی کرنا قرآن کا مسلمانوں سے مطالبہ ہے مطلب یہ ہے کہ اب ان منافقین سے نرم سلوک ختم ہو جانا چاہیئے اور ان پر سختی کرنی چاہیے۔ بہرحال ولیجدوا فیکم غلظۃ کا مطالبہ یہ ہے کہ اب وہ تمہارے طرز عمل سے یہ محسوس کریں کہ تمہارے اندر ان کے لیے موالات دوستی اور محبت کی کوئی جگہ باقی نہیں ہے بلکہ وہ جس طرح من حیث القوم تمہارے اور تمہارے دین کے دشمن ہیں۔ اسی طرح تم بھی من حیث الجماعۃ ان کے اور ان کے دین کے دشمن ہو اب تک وہ تمہارے دل میں اپنے لیے نرم گوشہ پاتے تھے اس وجہ سے ان کو توقع تھی کہ وہ اپنے مقاصد کے لیے تمہیں برابر استعمال کرتے رہیں گے اب یہ حالت بالکل ختم ہونی چاہیے۔

اللہ کی معیت کے لیے تقویٰ شرط ہے

۲۳ اور خوب جان لو کہ اللہ سبحانہ متقیوں کے ساتھ ہے یعنی اللہ سبحانہ سے ڈرنے والے کو کسی کافر قوم سے ڈرنے اور دبنے کی کوئی وجہ نہیں۔ جب تک اور جس قدر مسلمان اللہ سے

؎ افادات شیخ اسلام

ڈرتے رہے اسی وقت اور اسی قدر ان کو کفار پر غلبہ حاصل ہوتا رہا حق تعالیٰ ہمارے دلوں میں اپنا ڈر پیدا کر دے آمین[1] یعنی جہاد اور قتال کی بنیاد ہی تقویٰ اور صرف تقویٰ ہونا چاہیئے یہاں اگر ایک طرف تقویٰ بول کر جہاد میں اخلاص کی تعلیم دی ہے اور مال کی طمع شہرت کی آرزو کا راستہ بند کر دیا ہے تو دوسری طرف اہل ایمان کا علاقہ معیت اللہ سبحانہ سے جوڑ کر یہ بتلا دیا کہ اب تمہیں خوف وہراس کی ضرورت نہیں ہے تمہاری نصرت واعانت کے لیے اللہ سبحانہ موجود ہے۔ حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ جن مسلمان سلاطین نے بہ تقویٰ کی یہ شرط پوری کی ان کے زمانے میں فتوحات بھی ہوتی رہیں اور جس قدر وہ تقویٰ سے ہٹتے رہے فتوحات بھی ان سے کنارہ کرتی گئی ہیں۔ اس ایک فقرے میں اگر ایک طرف مسلمانوں کی حوصلہ افزائی ہے کہ تم ان سے جنگ کرنے میں کوئی کمزوری نہ دکھاؤ اللہ کی معیت ونصرت تمہارے ساتھ ہے اگر تم متقی ہو دوسری طرف اہل ایمان کو تنبیہ بھی کر دی کہ تمہیں ان سے جو جنگ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے تو اس میں بھی تم اللہ کے قوانین کی پوری پابندی کرنا کسی مرحلہ پر بھی حدود الٰہی سے تجاوز نہ کرنا۔ اللہ صرف ان لوگوں کا ساتھ دیتا ہے جو اللہ سے ڈرتے اور اس کی نافرمانی نہیں کرتے ہیں۔

دراصل تقویٰ پوری اسلامی زندگی کی روح ہے یا یوں کہہ دیجیئے کہ اسلام کی ہر تعلیم کا بنیادی مقصد ہر عمل کے قالب میں تقویٰ کی روح کو پیدا کرنا ہے۔ اسلام کی ساری عبادتوں کا مرکز اسی تقویٰ کا حصول ہے نماز ہو یا روزہ حج ہو یا زکوٰۃ قربانی ہو یا مساجد کی تاسیس ازدواجی زندگی ہو یا معاملات اخلاقی نظام ہو یا سیاسی سب کا مقصد تقویٰ ہے آخرت میں ہر قسم کی نعمتوں کے مستحق بھی اہل تقویٰ ہیں اور دنیا میں زندگی کے ہر گوشہ میں کامیاب اہل تقویٰ ہیں اہل تقویٰ ہی اللہ سبحانہ کے محبوب ہیں۔ قرآن نے تقویٰ والوں کا نہ صرف حلیہ عام بلکہ ایک ایک خط وخال نمایاں کر کے پیش کیا ہے اور بتایا ہے۔

عربی زبان میں اس کے معنی بچنے کے ہیں لیکن اصطلاح میں دل کی اس کیفیت کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر وناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیر وشر کی تمیز کی خلش اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کر دیتی ہے دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ تقویٰ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے جس کی وجہ سے ہر کام میں اللہ سبحانہ کے حکم کے مطابق

---

[1] افادات شیخ الاسلام

زندگی بسر کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہو جائے۔

آیئے اب پوری آیت کا ایک بار پھر مطالعہ کر لیجئے اس پوری آیت میں غالباً اس طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ تبوک میں رومیوں سے مقابلہ نہیں ہوا کیونکہ انہوں نے حملہ کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا لیکن وہ پھر تیاریاں کرنے والے ہیں اور ضروری ہے کہ مسلمان جنگ کے لیے مستعد رہیں۔ اس صورت میں الذین یلونکم کا مطلب یہ ہوگا کہ جو دشمن تمہاری سرحد سے متصل ہیں یعنی شام کے رومی اور عرب کے عیسائی قبائل۔ چنانچہ چند سالوں کے بعد ایسا ہی ہوا اور یرموک کا معرکہ پیش آیا۔ چونکہ رومیوں کا مقابلہ اس عہد کی سب سے زیادہ طاقتور اور متمدن شہنشاہی کا مقابلہ تھا اس لیے فرمایا کہ اس قوت سے لڑو کہ وہ تمہاری سختی محسوس کریں۔ مسلمانوں نے اس حکم کی جس طرح تعمیل کی اس کا اندازہ صرف اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ہرقل کی فوج بالاتفاق دو لاکھ سے زیادہ تھی اور مسلمان زیادہ سے زیادہ چوبیس ہزار تھے لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ ہمیشہ کے لیے رومی حکومت کا شام میں خاتمہ ہو گیا۔

قرآن پر طنز نفاق

۱۲۴-۱۲۵ اور جب قرآن کی کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو ان میں سے کچھ کہتے ہیں اس سورت کے ذریعے تم میں سے کس کے ایمان میں زیادتی ہوتی ہے سو سن لو کہ اہل ایمان کے ایمانوں میں یہ سورت زیادتی کرتی ہے اور وہ اس پر خوشیاں مناتے ہیں۔ اور لیکن وہ لوگ جن کے دل روگی ہیں تو بلاشبہ ان میں اس سورت کے ذریعے گندگی پر گندگی کا اضافہ ہوتا ہے اور وہ دنیا سے ایسی حالت میں گئے کہ ایمان سے محروم تھے جب کوئی قرآنی سورت نازل ہوتی تو منافقین باہم کہتے یا سادہ دل مسلمانوں سے ازراہ تمسخر و استہزاء کہتے۔ کہ کیوں صاحب تم میں سے کس کس کا ایمان اس سورت نے زیادہ کیا ہے مطلب یہ تھا کہ معاذ اللہ اس سورت میں رکھا ہی کیا ہے۔ کون سے حقائق و معارف ہیں جو ایمان و یقین کی ترقی کا باعث ہوں۔ حق تعالیٰ شانہ نے جواب دیا ہے کہ بے شک کلام الٰہی سن کر مومنین کے ایمان میں تازگی و ترقی ہوتی ہے اور قلوب مسرور و شاداں ہوتے ہیں۔ ہاں جن کے دلوں میں کفر و نفاق کی بیماری ہو ان کی بیماری اور گندگی میں اضافہ ہو جاتا ہے حتیٰ کہ یہ بیماری ان کی جان لے کر چھوڑتی ہے۔

ے باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

حضرت شاہ صاحب نے دوسرے انداز میں اس آیت کی تشریح کی ہے یعنی کلام الٰہی جس مسلمان کے دل کے خطرے کے موافق پڑتا وہ خوش ہو کر بول پڑتا کہ سبحان اللہ اس آیت نے میرا ایمان و یقین اور زیادہ کر دیا۔ اسی طرح جب کسی سورت میں منافقین کے پوشیدہ عیوب ظاہر کئے جاتے تو وہ بھی شرمندگی سے کھسیانے ہو کر کہتے کہ بے شک اس کلام نے ہمارے یقین و ایمان کو بڑھا دیا۔ لیکن یہ کہنا چونکہ خوشی اور انشراح سے نہ تھا محض رفع خجالت کے لیے کہہ دیتے تھے اس لیے یہ توفیق نہ ہوتی کہ آئندہ توبہ کر کے سچے دل سے حق کی پیروی کریں بلکہ پہلے سے زیادہ اپنے عیب چھپانے کی فکر و تدبیر کرتے تھے۔ یہ ہی ہے گندی پر گندگی۔ عیب دار کو لازم ہے کہ نصیحت سن کر اپنی اصلاح کرے نہ یہ کہ الٹا ناصح سے چھپانے لگے[1]

اہل ایمان کے ایمان میں درجہ بدرجہ زیادتی محض استعادہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے قرآن کا ہر حکم اہل ایمان کے لیے میدان مسابقت کھولتا ہے اور جب وہ اس میدان کی بازی جیت لیتے ہیں تو ان کی قوت ایمانی میں مزید دوسرے میدان جیتنے کے لیے عزم و حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے یہاں تک درجہ بدرجہ سعادت کی آخری منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ بالکل یہی حال کفر و نفاق کا بھی ہوتا ہے وہ ایک محرومی کے بعد دوسری محرومی کی اذیتیں سہتے سہتے ایمان کی آخری رمق سے بھی بالکل خالی ہو جاتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کوئی ساکن و جامد چیز نہیں ہے اور تصدیق و عدم تصدیق کا ایک ہی مرتبہ نہیں ہے۔ نہیں بلکہ تصدیق اور انکار دونوں میں انحطاط اور نشو و نما کی صلاحیت ہے ہر انکار کی کیفیت گھٹ بھی سکتی ہے اور بڑھ بھی سکتی ہے اور اس طرح ہر اقرار و تصدیق میں ارتقا بھی ہو سکتا ہے اور تنزل بھی۔ ہاں قانونی احکام کے اعتبار سے نظام تمدن میں حقوق اور حیثیات کا جب تعین کیا جائے گا تو تصدیق اور عدم تصدیق دونوں کے ایک ہی مرتبے کا اعتبار ہوگا۔ اسلامی معاشرے میں تمام ماننے والوں کے قانونی حقوق برابر ہوں گے خواہ ان

[1] افادات شیخ الاسلام

کے درمیان ماننے کے مراتب کتنا ہی تفاوت ہو اور سب نہ ماننے والے ایک ہی مرتبے میں
ذمی، حربی، معاہد اور مسالم قرار دیئے جائیں گے خواہ کفر کے اعتبار سے مراتب کا کتنا ہی فرق ہو۔
ایمان جب ترقی کرتا ہے کبھی آیات قرآنی کا تدبر و غور ایمان کی ترو تازگی کا باعث بن جاتا
ہے کبھی محض موہبت الٰہی کشاں کشاں ایمان حقیقی تک لے آتی ہے۔ اچانک وہ دیکھتا ہے کہ
پہلے جو قلب ظلمت کدہ تھا اب نور ایمانی سے وادی ایمن بن گیا ہے۔ حقائق ایمانیہ آناً فاناً
منکشف ہونے لگتی ہیں۔ راہ اسلام میں ہر ضرب ایک نئی تازگی بخشتی ہے، طبل جنگ کی آواز
صدائے سرود سے زیادہ سہانی اور مستانی معلوم ہوتی ہے۔ آیات قرانیہ کی تلاوت وہ کام کرتی
ہے جو کھیتوں پر باران رحمت کے قطرے گرتے ہیں۔

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس زیادتی سے مراد صرف تصدیق ہے ہرگز نہیں بلکہ جب کوئی مومن
گوش انقیاد و طاعت سے کلام پاک سنتا ہے تو ہر بار معانی پر غور و تفکر اس کے قلب میں جنت
کی نئی رغبت اور آخرت کا نیا خوف اللہ سبحانہ کی ایک نئی محبت اور اس کی طاعت کا ایک
نیا جذبہ پیدا کرتا ہے اسی کا نام قرآن کی زبان میں ایمان کی زیادتی ہے۔

آیت میں انداز تعبیر بتا رہا ہے کہ صحابہ کرام کا دن رات کا یہی مشغلہ تھا کہ وہ ایمان کا
جائزہ لیتے رہتے تھے جب کوئی آیت اترتی تو اپنی روح میں ایک نئی ایمانی تازگی محسوس کرتے
اس کے برعکس کفار کا مشغلہ یہ تھا کہ وہ اس جذبہ کا تمسخر اڑاتے اور مذاق کرتے۔

معنوی سعادت وشقادت کا قانون

۱۲۶ کیا ان لوگوں کو نظر نہیں آتا ہے کہ کوئی سال اس سے خالی نہیں جاتا ہے کہ وہ ایک
یا دو بار آزمائش کی بھٹی میں نہ پڑتے ہوں، پھر ان کو توبہ کی توفیق نہیں ہوتی ہے اور نصیحت
یاب نہیں ہوتے ہیں یعنی ہر سال کم از کم ایک دو مرتبہ ان منافقین کو فتنہ و آزمائش میں ڈالا
جاتا ہے مثلاً قحط، بیماری وغیرہ کسی آفت ارض و سماوی میں مبتلا ہوتے ہیں یا پیغمبر علیہ السلام
کی زبانی ان کا نفاق علانیہ ظاہر کر کے رسوا کیا جاتا ہے یا جنگ و جہاد ان کی بزدلی اور بد
باطنی بے نقاب کر دی جاتی ہے مگر وہ ایسے بے حیا اور بد باطن واقع ہوئے ہیں کہ تازیانے
کھا کر بھی ٹس سے مس نہیں ہوتے نہ پچھلی غلطاؤں سے توبہ کرتے ہیں نہ آئندہ کو نصیحت پکڑتے ہیں۔[۱]

[۱] افادات شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ غور نہیں کرتے کہ ان کی بیماری اس حد کو پہنچ گئی کہ ان کے لیے توبہ کے دروازہ بند ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ چونکہ اپنے ہر بندے پر رحمت کرنا چاہتا ہے اس وجہ سے اس نے اس دنیا کا انتظام اس طرح رکھا ہے کہ ہر شخص خواہ چھوٹا ہو یا بڑا سال میں ایک دو بار کسی نہ کسی ایسی آزمائش میں ڈالا جاتا ہے جو اس کو توبہ اور اصلاح حال کی طرف متوجہ کر دے جو صاحب توفیق ہیں وہ ان آزمائشوں سے سبق حاصل کرتے ہیں لیکن جو لوگ اپنے اعمال کی پاداش میں توفیق سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ اسی حالت کو پہنچ گئے ہیں۔ اب کوئی تنبیہ بھی ان کو کام نہیں دیتی ہے۔ ان کے دل قساوت کا اور ان کی عقل غباوت کا نشانہ بن چکی ہے۔ اور یہ نتیجہ ہے ان کے اعمال کا۔

آپ اس بات کو اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان پر کوئی سال ایسا نہیں گذرتا ہے جب کہ ایک دو مرتبہ ایسے حالات سے دوچار نہ ہوتے ہوں جن میں ان کا دعویٰ ایمان آزمائش کی کسوٹی پر نہ کسا جاتا ہو اور اس کا کھوٹا پن ظاہر نہ ہو جاتا ہو۔ کبھی قرآن میں کوئی ایسا حکم آجاتا ہے جس سے ان کی خواہشات نفس پر کوئی نئی پابندی عائد ہو جاتی ہے۔ کبھی دین کا کوئی ایسا مطالبہ سامنے آجاتا ہے جس سے ان کے مفاد پر ضرب پڑتی ہے کبھی کوئی اندرونی قضیہ ایسا رونما ہو جاتا ہے جس میں یہ امتحان مضمر ہوتا ہے کہ ان کو اپنے دنیوی تعلقات اور اپنے شخصی و خاندانی مفادات کی بہ نسبت خدا اور اس کا رسول اور اس کا دین کس قدر عزیز ہے ہر موقعہ پر جب یہ لوگ ایمان کے تقاضوں سے منہ موڑتے ہیں ان کے اندر کی گندگی پہلے سے زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔

شارحین قرآن نے یفتنون کا خارجی مصداق مقرر کرنے میں ایک سے زیادہ مصداق بتائے ہیں مجاہد کہتے ہیں کہ وہ قحط سالی کا شکار ہوتے ہیں قتادہ کہتے ہیں غزوات اور جہاد کی سرگرمیاں ان کے لیے پرچہ امتحان بنتی ہیں مقاتل کہتے ہیں کہ ان کا نفاق ظاہر کرکے ان کی رسوائی کا سال میں ایک بار دو بار سامان ہو جاتا ہے۔ عطیہ کہتے ہیں بیماریوں اور تکلیفوں کے ذریعے ان کو آزمایا جاتا ہے۔ علامہ آلوسی نے مطلب یہ بتایا ہے کہ۔

> کیا ان کو نظر نہیں آتا کہ حضور اقدس کے ساتھ جہاد کی سرگرمیوں کے ذریعہ ان کا امتحان لیا جاتا ہے اور اپنے بارے میں نازل شدہ کھلے بند دل وہ دیکھتے ہیں پھر بھی وہ توبہ نہیں کرتے ہیں۔

دراصل آیت میں افراد کی معنوی سعادت اور شقاوت کا قانون بتایا ہے ۔کہ افراد کی زندگی ہو یا جماعتوں کی لیکن ہر ہلاکت اور بربادی کے تم جستجو کرو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ ان کی ہلاکت اچانک نہیں ہوئی ۔بلکہ وہ مدتوں تک ان پر منڈلاتی رہی ہے لیکن آئی نہیں ۔اس کی آمد کی علامات ظاہر ہوتی رہی ہیں ۔ان کی زندگی کا کوئی برس کوئی مہینہ بلکہ کوئی دن ان سے خالی نہیں گیا لیکن جب یہ ساری تنبیہیں بیکار ہوگئیں اور وہ غفلت وگمراہی سے باز نہ آئے تو پھر تباہی آئی ۔

اللہ سبحانہ کے روحانی قوانین بھی ان کے جسمانی قوانین کی طرح ہیں آپ بدپرہیزی کرتے ہیں فوراً نہیں مرجاتے ۔البتہ موت کا پیام آنا شروع ہو جاتا ہے ۔موت کا پیام کیا ہے ؟ یہ بیماریاں ہیں جو موت کا پیام بن کر رونما ہوتی ہیں تاکہ تمہیں ہر وقت ہوشیار کر دیں ۔اگر تم ہوشیار ہوگئے تو وہ رک جائے گی نہ ہوئے تو پھر تمہارے سرہانے کھڑی ہو جائے گی بالکل اسی صورت حال سے جماعتوں اور قوموں کو دوچار ہونا پڑتا ہے ۔اور ایسا ہی معاملہ افراد کی معنوی سعادت و شقاوت کا بھی ہے جو نصیحت پکڑتے ہیں یعنی کہ دن اور باز آجاتے ہیں یتوبون وہ سنت الٰہی کے مطابق ہلاکت سے بچ جاتے ہیں جو اڑے رہتے ہیں ہلاک ہوتے ہیں اور بس یہی زبان قرآن میں تربص و امہال ہے ۔

مجلسِ نبوّت سے نفاق کا تنفر

۱۲۵ اور جب ان کے بارے میں کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو وہ آپس میں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں کہ کیا تم پر کسی کی نگاہ نہیں ہے پھر منہ پھیر کر چل دیتے ہیں یعنی جس وقت وحی نازل ہوتی ہے اور منافقین مجلس میں موجود ہوتے ہیں تو کلام الٰہی کا سننا ان پر بہت شاق گذرتا تھا خصوصاً وہ آیات جن میں ان کے عیوب کھولے جاتے تھے ،اس وقت ایک دوسرے کی طرف کن انکھیوں سے اشارے کرتے اور ادھر ادھر دیکھتے کہ مجلس میں کسی مسلمان نے ہم کو دیکھا نہ ہو پھر نظر بچا کر شتاب مجلس سے کھسک جاتے[1]

یہ ایسے وقت کا منظر ہے جب کہ منافقین مجلس نبوت میں حاضر ہیں اور اس موقعہ پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی سورت کی وحی اتری ہے اور وہ مجلس سے جانا چاہتے ہیں تو اٹھتے

[1] افادات شیخ الاسلام

وقت ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے ہیں کہ مومن تو انہیں اٹھتا ہوا نہیں دیکھ رہا ہے۔ گویا پہلے آیت میں ان کے تمسخر کا ذکر تھا اس آیت میں ان ہی کے تنفر کا ذکر ہے۔
دراصل اہم اجتماعی مواقع جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کی نئی مہم کی تیاری اور اس سے متعلق قرآن کی تازہ ہدایات سے آگاہ کرنے کے لیے بلاتے تو آنے کو تو منافقین بھی آ جاتے لیکن جب دیکھتے کہ کوئی مشکل مہم درپیش ہے بیٹھے رہے تو ذمہ داریوں میں ہاتھ بٹانا پڑے گا تو مجلس سے اٹھنے کے لیے آپس میں آنکھیں مارتے یعنی اگر مسلمانوں میں سے کوئی دیکھ نہ رہا ہو تو یہاں سے چل دو۔ پھر نظر بچا کر یکے بعد دیگرے اٹھ جاتے قاعدہ یہی تھا کہ جب کوئی سورت نازل ہوتی تھی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو اجتماع کی دعوت دیتے۔ پھر اجتماع عام میں نازل شدہ سورت کو سناتے۔ اس مجلس میں اہل ایمان کا حال تو یہ ہوتا کہ سراپا گوش ہو کر اس کو سنتے اور اسی میں محو ہو جاتے۔ لیکن منافقین کا رنگ کچھ اور ہی ہوتا وہ آنے کو اجتماع میں آجاتے مگر حضور اقدس کے اجتماع میں خطاب سے ان کو کوئی دلچسپی نہ ہوتی بڑی بددلی کے ساتھ اکتائے ہوئے بیٹھے رہتے مگر اس فکر میں رہتے کہ کسی طرح جلدی سے یہاں سے نکل جائیں ان کی اسی حالت کی تصویر اس آیت میں پیش کی گئی ہے۔

ایمان و عرفان سے محرومی

۱۲۶ سلہ اللہ ہی نے ان کے دلوں کو پھیر دیا ہے کیونکہ وہ سمجھ ہی نہیں رکھتے ہیں یعنی مجلس نبوت سے
اللہ سبحانہ نے ان کے دلوں کو پھیر ہے کیونکہ وہ اپنی جہل و حماقت سے ایمان و عرفان کی باتوں کو سمجھنا اور قبول کرنا نہیں چاہتے ہیں سلہ مطلب یہ ہے کہ یہ بیوقوف خود اپنے فائدے کو بھی نہیں سمجھتے ہیں۔ اپنی فلاح سے بے خبر اور اپنی اصلاح سے بے پرواہ ہیں ان کو یہ احساس نہیں ہے کہ کتنی بڑی نعمت ہے جو اسلام کے ذریعے ان کو مل رہی ہے۔ اس حقیر دنیا کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ عظیم نعمت کی قدر و قیمت ان کی سمجھ میں نہیں آتی ہے جس کے صدقے میں ان کو اس دنیا میں پوری انسانیت کی پیشوائی اور آخرت میں ہمیشہ ہمیشہ کی سرفرازی ملنے والی ہے۔
اس نادانی کا نتیجہ یہ ہے صرف اللہ قلوبھم کہ اللہ نے ان کو استفادے کی

سلہ افادات شیخ الاسلام

کی توفیق سے محروم کر دیا ہے۔

اس حالت کو پہنچ جانے کے بعد آدمی کے دل پر مہر لگ جاتی ہے اور یہ ہر آدمی کے خود اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ فلما زاغوا ازاغ اللہ۔ ان کی جانب سے انصراف ہوا تو اس کے نتیجہ صرف ہوا۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ
رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم
بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿١٢٨﴾ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ
اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴿١٢٩﴾

ع ۱۶ ۵

لوگو! تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک عظیم الشان رسول آ گیا ہے[1]

۱۔ تمہارا رنج و کلفت میں پڑنا اس پر بڑا ہی شاق ہے[2]

۲۔ وہ تمہاری بھلائی کا بڑا ہی خواہش مند ہے[3]

۳۔ وہ اہلِ ایمان سے نہایت شفقت والا اور بڑا ہی مہربان ہے[4]

اے اللہ کے رسول اگر اس کے باوجود آپ کے مخاطب سرتابی کریں تو آپ ان سے کہہ دیں میرے لیے اللہ کا آسرا کافی ہے، اس کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں میرا اسی پر بھروسہ ہے وہی عرشِ عظیم کا مالک ہے[5]

مفردات کے معانی

عزیز۔ عزت سے فعیل کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے راغب اصفہانی لکھتے ہیں عزیز وہ ہے جو غالب ہو مغلوب نہ ہو اور سید مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں رقم طراز ہیں۔ اللہ سبحانہ کو عزیز کہنے کا مطلب ہے اس کے قدیم ہونے کا اعتراف کرنا اس طرح کہ جس قدرت اور جس قوت کے ساتھ وہ ہمیشہ سے ہے اس میں ذرا تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے جس کا نتیجہ ہے اللہ سبحانہ کو پاک سمجھنا ان تمام باتوں سے جو مخلوق میں ہو سکتی ہیں۔

امام خطابی معالم السنن میں لکھتے ہیں عزیز ایسا غالب ہے جو مغلوب نہ ہو عز کے معنی کبھی تو غلبہ کے آتے ہیں باب نصر سے عز یعز اسی معنے میں آتا ہے اور باب فتح سے عز یعز کے معنے شدت اور قوت کے آتے ہیں اور باب ضرب سے عز یعِز کے معنے گرامی قدر ہونے کے ہیں لہذا عزیز کے معنے ہیں وہ ذات جس کا عدیل اور مثیل نہ ہو اور جب اس کا صلہ علیٰ آئے تو اس کے معنی شاق اور دشوار ہونے سے عز علی کذا کے معنی ہیں صَعُب یہاں یہی معنی ہیں۔

عنتم عنت سے ماضی کا صیغہ ہے ابن الاثیر نے اس کے حسب ذیل معانی لکھے ہیں مشقت، فساد ہلاکت، گناہ، غلطی، خطا، زنا، باب سمع سے عَنِت یعنَت آتا ہے ابوالسعود عمادی ارقام فرماتے ہیں کہ عنت اصل میں ہڈی کے جڑنے کے بعد ٹوٹ جانے کو کہتے ہیں مگر بعد کو ہر اس مشقت اور ضرر کے لیے جو حالت سنورنے کے بعد انسان کو لاحق ہو اس کا استعارہ کر لیا گیا عنتم کے معنے ہیں تمہیں مضرت پہنچی تم کو ایذا پہنچی۔

سورہ برات ایک وداعی پیام ہے

حضرت امام بخاری نے براء بن عازب سے روایت کی ہے کہ آخری سورت جو نازل ہوئی سورہ برات ہے۔ اور حاکم وغیرہ نے ابی بن کعب اور ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ سب سے آخری آیات برات کی آخری آیتیں ہیں لیکن تمام روایتوں کو جمع کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ برات سب سے آخری نہیں ہو سکتی ہے کم از کم واتقوا یوما ترجعون فیہ الی اللہ اور سورہ نصر کے بعد ضرور ہی نازل ہوئی ہے۔ بہر حال آخری کلام میں سے ضرور ہے۔ اسی لیے بہ حیثیت

مجموعی پوری سورت میں اور آخری دو آیتوں میں خصوصیت کے ساتھ اس طرح کا طرز خطاب پایا جاتا ہے جیسے امت کو آخری پیام دیا جا رہا ہے یا آخری موعظت کا پیام ہو۔ چنانچہ آخری ان دو آیتوں میں عرب کی اس نسل سے خطاب ہے جو اس وقت مخاطب تھی۔

یہ پیام موعظت یہاں کیوں ضروری ہوا اس کے سمجھنے کے لیے ضروری ہے دو باتیں سامنے رکھ لی جائیں۔ سورت کے نزول کا وقت اور سورت کے مطالب، یہ سورت اس وقت نازل ہوئی جب تمام عرب میں کلمہ حق سر بلند ہو چکا تھا اور گو قرآن نے دعوت حق کی فیروز مندیوں کی خبر دے دی تھی تاہم ان لوگوں کے لیے جو کل تک غربت و بے کسی کی انتہائی مصیبتوں میں رہ چکے تھے۔ تمام عرب کا مسلمان ہو جانا بڑی سے بڑی کامرانی تھی اور اس لیے ناگزیر تھا کہ ایک طرح کی فارغ البالی اور بے پروائی طبیعتوں میں پیدا ہو جائے۔ غزوہ تبوک کی تیاریوں میں جو بعضوں سے تساہل ہوا تو اس کی تہ میں اس حالت کی جھلک صاف دکھائی دے رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس سورت میں اس تفصیل اور شدت کے ساتھ استعداد کار اور عزم و ہمت کی تلقین کی گئی کہ اس کی نظیر کسی دوسری سورت میں نہیں ملتی۔

پس یہاں اس آخری موعظت کا مطلب یہ ہے کہ اہل عرب پر دو باتیں واضح کر دی جائیں۔

ایک یہ کہ جو کچھ ہو چکا ہے یہ معاملہ کی تکمیل نہیں ہے بلکہ محض ابتدا ہے اس لیے ادائے فرض کا مطالبہ بدستور باقی ہے۔

دوسری یہ کہ کلمہ حق اپنے عروج کے لیے تمہارا محتاج نہیں ہے اگر آئندہ تم نے کوتاہی کی تو نقصان اٹھاؤ گے دعوت حق کا کچھ نہیں بگڑے گا۔[1]

مندرجہ بالا سطور سے وہ تمام الجھاد دور ہو گئے جو ان دو آیتوں کے بارے میں پیدا ہو گئے تھے۔ چونکہ ان دو آیتوں میں اہل عرب سے خطاب ہے اور اعراض کی صورت میں توکل علی اللہ کی تلقین کی گئی ہے۔ اور یہ انداز بیان زیادہ تر مکی سورتوں میں ہے اس لیے مفسرین قرآن نے خیال کیا کہ یہ مدنی آیتیں نہیں ہو سکتی ہیں اور سورہ برات میں ان کا ہونا تعجب انگیز ہے۔

---

[1] ترجمان القرآن

رسول کی بشریت کا انعام

۱۲۸ ۔ تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک عظیم الشان پیغمبر آگیا ہے جس کے حسب ونسب اخلاق واطوار اور دیانت وامانت سے تم خوب واقف ہو۔[1]

یعنی اللہ کا رسول تم میں آگیا اور اس نے فرض رسالت ادا کر دیا۔ وہ کسی دوسری جگہ سے نہیں آیا سنت الہٰی کے مطابق خود تم ہی میں پیدا ہوا اور چونکہ وہ تم ہی میں سے ہے اس لیے اول سے آخر تک اس کی ساری باتیں تمہاری نگاہوں کے سامنے رہی ہیں۔ اس کا لڑکپن بھی تم میں گذرا۔ اس کی جوانی کے دن بھی تم میں بسر ہوئے۔ پھر اس نے نبوت کا اعلان کیا تو تم سے کہیں چھپ کر زندگی نہیں بسر کی۔ اس کی ساری باتیں تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے ہو پھر جو کچھ گذرنا تھا گذر گیا اور تم نے مظلومی و بے کسی کے اعلان بھی سن لیے فتح و کامرانی میں ان کی تصدیق بھی کر لی۔ تم میں کوئی نہیں جو اس کے بے داغ زندگی کا شاہد نہ ہو۔ اور کوئی نہیں جس نے اس کی ایک ایک بات کی سچائی نہ آزمائی ہو۔

حضرت عبداللہ بن عباس اور امام زہری نے انفسکم کو فا کے زبر سے بھی پڑھا ہے۔ اس صورت میں یہ نفاست سے اسم تفضیل ہے اس کے معنی ہیں تم میں زیادہ نفیس اور عمدہ یعنی تمام عرب میں خاندان کے اعتبار سے سب سے شریف۔

قیادت کیلئے سب سے ضروری صفت

۱۲۸ ۔ تمہارا رنج و کلفت میں پڑنا اس پر بڑا ہی شاق ہے یعنی جس چیز سے تم کو تکلیف یا سختی پہنچے وہ حضور اقدس پر بہت بھاری ہے۔ ہر ممکن طریقہ سے آپ یہی چاہتے ہیں کہ امت پر آسانی ہو اور دنیوی اور آخروی عذاب سے محفوظ رہے۔ اسی لیے جو دین آپ لائے وہ بھی سہل اور نرم ہے اور عمال کو آپ یہی نصیحت فرماتے تھے یسروا ولا تعسروا آسانی کرو سختی نہ کرو۔[2] مطلب یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو تم کو مصیبت اور ہلاکت میں ڈالنے والی ہو آپ کے دل پر بہت شاق

---

[1] افادات شیخ الاسلام

[2] افادات شیخ الاسلام

ہے وہ تمہیں دنیا و آخرت دونوں کی کلفتوں اور ہلاکتوں سے محفوظ اور دونوں کی سعادتوں سے ہمدوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور ان کی ساری بھاگ دوڑ اور تمام تعلیم و تبلیغ اسی مقصد کے لیے ہے۔

دراصل یہ آپ کے ایک ایسے وصف کی رونمائی گئی ہے جو منصب رسالت کے لیے اور ہر اس انسان کے لیے جو قوم کی رہنمائی و قیادت کا مقام رکھتا ہو سب سے زیادہ ضروری ہے یعنی ابنائے جنس کے لیے شفقت و رحمت۔ فرمایا کہ اس سے زیادہ تمہارے لیے کوئی بات یقینی نہیں ہو سکتی کہ وہ سرتا پا شفقت و رحمت ہے۔ وہ تمہارا دکھ برداشت نہیں کر سکتا۔ تمہاری ہر تکلیف خواہ جسم کے لیے ہو خواہ روح کے لیے ان کے دل کا درد و غم بن جاتی ہے۔

نبوت کی سب سے بڑی آرزو

۱۲۹ـلہ وہ تمہاری بھلائی کا بڑا ہی خواہش مند ہے یعنی تمہاری نفع رسانی اور خیر خواہی کی خاص تڑپ ان کے دل میں ہے۔ لوگ دوزخ کی طرف بھاگتے ہیں آپ ان کی کمریں پکڑ پکڑ کر ادھر سے ہٹاتے ہیں۔ آپ کی بڑی کوشش اور آرزو یہ ہے کہ خدا کے بندے اصلی بھلی اور حقیقی کامیابی سے ہمدوش ہوں۔ جہاد کا مقصد بھی خونریزی نہیں بلکہ بحالت مجبوری سخت اپریشن کے ذریعے بنی نوع انسان کے فاسد و مسموم اعضاء کو کاٹ کر اور خراب جراثیم کو ہٹا کر امت کے مزاج عمومی کو صحت و اعتدال پر رکھنا ہے یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب مبارک تمہاری بھلائی کی خواہش سے لبریز ہے وہ اس کے لیے ایسا قلب مضطرب رکھتے ہیں کہ اگر آپ کی بن پڑے تو ہدایت و سعادت کی ساری پالیاں پہلے ہی دن گھونٹ بنا کر پلا دیتے۔ جس طرح ایک شفیق باپ اپنی اولاد کے لیے ہر خیر کا متمنی اور حریص ہوتا ہے اور اس سے کبھی اس کا جی نہیں بھرتا اسی طرح اللہ کا رسول تمہارے لیے دنیا و آخرت دونوں میں ہر خیر کا حریص ہے۔

اہلِ ایمان کے لیے نبوت کے جذبات

۱۲۹ـلہ وہ اہل ایمان سے نہایت شفقت والا اور بڑا ہی مہربان ہے یعنی جب سارے جہان کے اس قدر خیر خواہ ہیں تو خاص اہل ایمان کے حال پر ظاہر ہے کہ کس قدر شفیق و مہربان ہوں گے۔[۲]

---

[۱] افادات شیخ الاسلام
[۲] افادات شیخ الاسلام

یعنی آپ کی یہ شفقت و رحمت صرف تمہارے ہی لیے نہیں بلکہ تمام مومنوں کے لیے ہے خواہ عرب کے ہوں یا عجم کے رائوف رافت سے ہے اور اس کا اطلاق ایسی رحمت پر ہوتا ہے جو کسی کی کمزوری و مصیبت پر جوش میں آئے۔ رافت رحمت کی ایک خاص صورت ہے اور رحمت عام ہے دونوں کے جمع کر دینے سے رحمت کے مفہوم میں زیادہ قوت آگئی۔ یہ دونوں اللہ سبحانہ کی صفتیں ہیں یہاں دونوں حضور اقدس کے لیے بولی گئی ہیں۔ یہ اس بات کی نشاندہی ہے کہ انسانوں کے ساتھ رافت و رحمت کے معاملہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی صفات کا مظہر ہیں۔

یہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے تین وصف بتائے گئے ہیں ایک عزیز یعنی انسانوں کی تکلیف کا آپ پر شاق ہونا۔ دوسرا انسانوں کی بھلائی اور سعادت کے لیے خواہش مند ہونا تیسرے اہل ایمان کے لیے سراپا رافت و رحمت ہونا۔ پہلا وصف کمال دوسرا وصف جمال اور تیسرا جود و سخا کی نشاندہی کر رہا ہے۔ ان تین اوصاف کا تقاضا آپ کی ذات سے محبت ہے۔ علامہ بدرالدین عینی لکھتے ہیں کہ محبت کے تین اسباب ہیں کمال جمال، جود و سخا یہ تینوں اوصاف حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے زیادہ کسی کی ذات میں موجود نہیں آپ کا کمال آپ کے پیش کئے ہوئے نظام حیات سے ظاہر ہے۔ آپ کا جمال احادیث شمائل میں موجود ہے آپ کی روحانی و جسمانی جود و سخا کا تو اندازہ ہی نہیں ہے اس لیے آپ کی محبت تمام مخلوقات سے زیادہ ہونی چاہیے۔ والدین کی محبت طبعی ہے اور حضور اقدس کی محبت محبت عقلی ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کمال ایمان یہ ہے کہ تقاضائے عقل تقاضائے طبیعت پر غالب آجائے۔ ایمان صرف عقیدہ و عمل کا نام نہیں ہے بلکہ ان کیفیات کا نام ہے جن سے مومن کا قلب مزین اور رنگین ہوتا ہے۔

اللہ پر اعتماد اور حالات سے بے نیازی

۱۲۹ اے اللہ کے رسول اگر اس کے باوجود آپ کے مخاطب سرتابی کریں تو آپ ان سے کہہ دیں کہ میرے لیے اللہ کا آسرا کافی ہے۔ اس کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں ہے۔ میرا اسی پر بھروسہ ہے وہی عرش عظیم کا مالک ہے اگر آپ کی عظیم الشان شفقت خیر خواہی اور دلسوزی کی لوگ قدر نہ کریں تو کچھ پروا نہیں۔ اگر فرض کیجئے کہ ساری دنیا آپ سے منہ موڑ لے تو

فقنا اللہ سبحانہ آپ کو کافی ہے جس کے سوا نہ کسی کی بندگی ہے نہ کسی پر بھروسہ ہو سکتا ہے کیونکہ زمین و آسمان کی سلطنت اور عرش عظیم کا مالک وہ ہی ہے۔ سب نفع وضرر ہدایت و ضلالت اسی کے ہاتھ میں ہے سنن ابو داؤد میں حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت ہے کہ جو شخص صبح و شام سات بار حسبی اللہ الخ پڑھا کرے اللہ سبحانہ اس کے تمام ہموم و غموم کو کافی ہو جائے گا۔ باقی عرش کی عظمت کے متعلق اگر تفصیل دیکھنا ہو تو روح المعانی میں زیر آیت ھاذہ ملاحظ کیجیے۔ تمت سورۃ التوبہ بفضل اللہ وحسن توفیقہ۔ اللھم تب علی واجعل لی براءۃ من النار انک انت التواب الرحیم[1]

اس سورت کے تمام مطالب اپنی اصلی حیثیت میں اس وقت تک واضح نہیں ہو سکتے جب تک یہ حقیقت پیش نظر نہ ہو کہ یہ تمام ترامت کیلئے ایک وداعی پیام ہے اور احکام مواعظ سے اصل مقصود مستقبل میں آنے والے واقعات تھے نہ کہ موجودہ۔ یہ اصل پیش نظر رکھ کر سورت کے تمام مواعظ و احکام پر دوبارہ نگاہ ڈالیے صاف ہو جائے گا کہ آئندہ مرحلوں کے لیے مخاطبوں کو تیار کیا جا رہا ہے۔

۱۔ اب چونکہ عرب کا نظم و نسق بالکل اہلِ ایمان کے ہاتھ میں آگیا تھا اور تمام مزاحم طاقتیں بے بس ہو چکی تھیں اس لیے وہ پالیسی واضح طور پر سامنے آجانی چاہیے تھی۔ جو عرب کو مکمل دارالاسلام بنانے کے لیے اختیار کرنی ضروری تھی۔ چنانچہ بتایا گیا کہ عرب سے شرک کا قطعاً نام و نشان مٹا دیا جائے اور قدیم مشرکانہ نظام کا کلی طور پر استیصال کیا جائے کعبہ کا انتظام و تولیت بالکلیہ اہل ایمان کے ہاتھ میں ہو۔ عرب کی تمدنی زندگی میں رسوم جاہلیت کے جو آثار ابھی تک باقی تھے ان کو جدید اسلامی دور میں بالکل ختم کر دیا جائے۔

۲۔ عرب میں اسلام کا مشن پایہ تکمیل کو پہنچ جانے کے بعد دوسرا اہم مرحلہ جو سامنے تھا وہ یہ تھا کہ عرب کے باہر اسلام کا دائرہ اثر پھیلایا جائے اس معاملہ میں روم و ایران کی سیاسی قوت سب سے بڑی سد راہ تھی۔ اور ناگزیر تھا کہ عرب کے کام سے فارغ ہوتے ہی اس سے تصادم ہو۔ نیز آگے چل کر دوسرے کافرانہ سیاسی و تمدنی نظاموں سے بھی سابقہ پیش آنا تھا اس لیے مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ عرب کے باہر جو لوگ دین حق کے پیرو نہیں ان کی خودمختارانہ

[1] افادات شیخ الاسلام

فرماں روائی کو بزور شمشیر ختم کردو تا آنکہ وہ اسلامی اقتدار کے تابع ہو کر رہنا قبول کرلیں جہاں تک دین پر ایمان لانے کا تعلق ہے ان کو اختیار ہے کہ ایمان لائیں یا نہ لائیں لیکن ان کو یہ حق نہیں ہے کہ خدا کی زمین پر اپنا حکم جاری کریں اور انسانی زندگی کی زمام کار اپنے ہاتھ میں رکھ کر اپنی گمراہیوں کو اللہ کے بندوں پر مسلط کریں۔

۳۔ تیسرا اہم مسئلہ منافقین کا تھا جن کے ساتھ اب تک وقتی مصالح کے تحت چشم پوشی و درگزر کا معاملہ کیا جارہا تھا۔اب چونکہ بیرونی خطرات کا دباؤ کم ہوگیا تھا اس لیے حکم دیا گیا کہ آئندہ ان کے ساتھ کوئی نرمی نہ کی جائے اور وہی سخت برتاؤ کیا جائے جو کھلے منکرین حق کے ساتھ ہوتا ہے۔

۴۔ مومنین صادقین میں اب تک جو تھوڑا ضعف عزم باقی تھا اس کا علاج بھی ضروری تھا کیونکہ اسلام عالمگیر جدوجہد کے مرحلے میں داخل ہونے والا تھا۔اور اس مرحلے میں جب کہ اکیلے مسلم عرب کو پوری غیر مسلم دنیا سے ٹکرانا تھا۔ضعف عزم سے بڑھ کر کوئی اندرونی خطرہ اسلام کے اجتماعی زندگی کے لیے نہ تھا۔اس لیے جن لوگوں نے تبوک کے موقعہ پر سستی وکمزوری دکھائی تھی ان کے ساتھ سخت برتاؤ کیا گیا۔پیچھے رہ جانے والوں کے اس فعل کو کہ وہ بلا عذر پیچھے رہ گئے تھے بجائے خود ایک سنگین جرم قرار دیا گیا اور آئندہ کے لیے پوری صفائی کے ساتھ یہ بات واضح کردی گئی کہ اعلائے کلمۃ اللہ کی جدوجہد اور کفرواسلام کی کشمکش ہی وہ اصلی کسوٹی ہے جس پر مومن کا دعویٰ ایمان پرکھا جائے گا جو اس آویزش میں اسلام کے لیے جان ومال اور وقت ومحنت صرف کرنے سے جی چرائے گا اس کا ایمان بھی معتبر نہ ہوگا اور اس کی کسر کسی دوسرے عمل سے پوری نہ ہوسکے گی۔

سورۃ یونس

۱۰

آیات ——— ۱۰۹

سورہ یونس

اس سورت کا نام سورہ یونس ہے کیونکہ اس میں حضرت یونس کا ذکر آیا ہے۔ اس میں کل ایک سو نو آیات ہیں۔

یہ سورت پوری کی پوری آیات ۴۰، ۹۴، ۹۵، ۹۶ کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر آپ کی مکی زندگی کے دور میں نازل ہوئی ہے۔

زمانہ نزول

یہ سورت سورہ بنی اسرائیل کے بعد نازل ہوئی اور بنی اسرائیل میں واقعہ اسرار کا ذکر ہے یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب حضور اقدس کی عمر ۵۱ برس نو مہینے کی ہو لی، قاضی سلیمان نے تاریخ ۲۷ رجب سلہ نبوت بتائی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سورہ یونس کا زمانہ نزول سلہ نبوت ہے یہ آپ کی زندگی کا بڑا ہی پر آشوب دور تھا۔ حوادث و مصائب کا ہر طرف سے ہجوم تھا اپنی صداقت بتانے کے لیے آپنے فرمایا فقد لبثت فیکم عمرا من قبلہ افلا تعقلون جو دعوت پیش کی جارہی ہے اس کا مصنف میں نہیں ہوں۔ بہرحال اسی تاریخی پس منظر میں یہ سورت نازل ہوئی۔ اس طرح سورت کا نزول ہجرت سے تین سال پہلے ہوا۔ کیونکہ آپ نے ہجرت ۲۷ صفر المظفر ۱۳ سلہ نبوت مطابق ۱۰ ستمبر ۶۲۲ء کو کی ہے۔

موضوع سورت

سورت کا موضوع خطاب مشرکین سے ہے اور مرکزی موضوع توحید، نبوت اور آخرت کی زندگی ہے۔ سلسلہ بیان منکرین نبوت. سے شروع ہوا ہے۔ منکرین نبوت، ایک طرف انکار نبوت کرتے تھے اور یہ بھی دیکھتے تھے کہ یہ شخص ان کی طرح نہیں ہے سوچتے کہ کوئی بات ضرور ہے جب کوئی بات بن نہ پڑتی تو کہتے کہ جادو ہے توحید ربوبیت سے توحید الوہیت پر استدلال کیا ہے۔ مشرکین نبوت آپ کی صداقت کا انکار نہیں کر سکتے تھے۔ صداقت نبوت کی واضح وجدانی دلیل پیش کی ہے۔ دینوی علائق کا سہارا انسان کے وجدان کی بیداری

ہیں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ قرآن کا چہرہ۔ نزول قرآن سے پہلے اقوام عالم کی عالمگیر گمراہی۔ نبوت کی صداقت کی بہت بڑی دلیل ان کا اللہ کا رسول ہونے کا یقین ہے۔ انسانی طبیعتوں کا اختلاف فطری ہے۔ دین و ایمان میں جبر و اکراہ نہیں ہے۔ جابجا نبوت کا مقام اس کی حیثیت اس کے فرائض اور اس کی عرق ریزیوں کو بتایا ہے۔ آخر میں نبوت کی زبان سے یہ اعلان کیا ہے کہ حق تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے آچکا ہے میں تم پر نگہبان نہیں ہوں۔

(آیاتہا ۱۰۹) سُوْرَۃُ یُوْنُسَ مَکِّیَّۃٌ (۵۱) (۱۰) (رکوعاتہا ۱۱)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِیْمِ ﴿۱﴾ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا
اَنْ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰی رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَ بَشِّرِ وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم
الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؔ قَالَ
الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۲﴾

الف لام را یہ کتاب حکیم کی آیتیں ہیں [۱] کیا لوگوں کو اس پر حیرت ہے کہ ان ہی میں سے ہم نے ایک ذات گرامی کو وحی کی نعمت سے اس مقصد کے لیے سرفراز کیا ہے [۲] کہ لوگوں کو خبردار اور اہلِ ایمان کو اس بات کی خوش خبری دے کہ اللہ سبحانہ کی بارگاہ عالی میں ان کا سچا مقام ہے۔ انکار کرنے والے کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا جادو ہے [۳]

مفردات کے معانی

قد مصدق ۔ یصدق کے معنی درستی، سچائی، کام نیک ۔ ثنا سچی بات صدق ۔ صدق کا مصدر ہے اس کے معنی لغت میں سچ کہنے اور سچ کر دکھانے کے ہیں اور چونکہ یہ ذکرِ خیر کا سبب ہوتا ہے اس لیے مجازاً نام نیک ثنا اور ذکر کے معنے میں بھی استعمال ہوتا ہے نیز ہر وہ فعل جس میں ظاہری یا باطنی فضیلت ہو اسے بھی صدق سے تعبیر کیا جاتا ہے چنانچہ جو فعل اس صفت سے موصوف ہوتا ہے اس کو اس کی طرف مضاف کر دیا جاتا ہے جیسے فی مقعد صدق سچی مجلس میں اور اسی طرح ان لھم قدم صدق عند ربھم ان کا سچا پایہ ہے ان کے رب کے پاس اور ارشاد ہے اخرجنی مدخل صدق و ادخلنی مخرج صدق اجعل لی لسان صدق فی الآخرین ۔

قرآن میں رسُول کا تصوّر

قرآن میں اللہ سبحانہ کے تصور کی طرح رسول کا تصور بھی تمام مذاہب کے تصورات سے جداگانہ ہے ۔ انسان کامل کی آخری سرحد اور لاہوت کے ابتدائی تصور میں کوئی لفظی اشتراک نہیں ہے ۔ ایک انسان اپنی فطری اور وہبی استعداد کا ہر کمال بالفعل حاصل کر لینے کے بعد بھی الوہیت کے کسی ادنی سے ادنی تصور کے بھی قابل نہیں ہو سکتا ۔ قرآن میں اللہ کا تصور اتنا بلند ہے کہ وہ حلول و اتحاد ولادت و قرابت اور اس طرح کی تمام نسبتوں میں سے کسی بھی نسبت کی صلاحیت نہیں رکھتا اور اسی معنے سے اس کی ذات اقدس احد اور صمد ہے ۔

اس لیے رسول نہ خدا کا اوتار ہو سکتا ہے اور نہ خود خدا ہو سکتا ہے کہ انسانی صورت میں رونما ہو ۔ رسول کے متعلق خدائی کا تصور عیسائیت ہے اور اللہ سبحانہ کے بارے میں یہ عقیدہ کہ وہ رسول کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے براہمہ کا عقیدہ ہے ۔ قرآن کی تعلیم ان دونوں سے علیحدہ ہے ۔ یہ دونوں تصور قرآنی نقطہ نظر سے بے مصداق ناممکن اور محال ہیں ۔

ذرا غور فرمایئے کہ قدرت نے حیوانات میں سے ہر ہر نوع کی خصوصیات اور صورتیں الگ الگ بنائی ہیں ۔ اور اس طرح ہر نوع کے درمیان ایک ایسا خط فاصل کھینچ دیا ہے کہ ہزار ترقی کرنے کے بعد بھی ایک نوع دوسری نوع کی سرحد میں قدم نہیں رکھ سکتی بلکہ ہر نوع

اپنے ان قدرتی حدود کے درمیان گردش کرتی رہتی ہے اور اسی حد بندی سے پورے عالم کا نظام قائم ہے۔

جب مخلوقات کے دائرے کی یہ سرحدیں اتنی مضبوط ہیں تو خالق کے متعلق یہ گمان کرنا کہ کوئی انسان اپنے دائرے سے ترقی کر کے اس کی سرحد میں قدم رکھ سکتا ہے۔ سفیہانہ خوش عقیدگی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ بلاشبہ رسول ایک انسان ہوتا ہے اور عام انسانوں پر اس کی برتری کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اللہ سبحانہ کا رسول ہے۔ اس کی جانب سے منصب اصلاح پر کھڑا کیا گیا ہے اس لیے رسول کا کمال ہی یہ ہے کہ وہ ایک انسان ہے کیونکہ اصلاح کے لیے صرف علم کافی نہیں احساس کی بھی ضرورت ہے جو غم نہیں کھا سکتا وہ ایک غمزدہ کی پوری تسلی بھی نہیں کر سکتا۔ جو بھوک سے آزاد ہے وہ ایک بھوکے کے ساتھ صحیح دلسوزی بھی نہیں کر سکتا۔ اور جو فطرت انسانی کی کمزوریوں سے آشنا نہیں وہ ان کمزوریوں پر اغماض بھی نہیں کر سکتا۔ اسی لیے قرآن حکیم نے جا بجا بعثت کے ساتھ رسولوں کا انسان ہونا ایک مستقل انعام قرار دیا ہے۔

لے: یہ کتاب حکیم کی آیتیں ہیں۔ آیتیں ایسی مضبوط و محکم کتاب کی ہیں جس کی ہر بات پکی ہے۔ الفاظ اس لیے کہ ہمیشہ تبدیل و تحریف سے محفوظ رہیں گے۔ علوم اس لیے کہ تمام تر عقل و حکمت کے موافق ہیں احکام اس وجہ سے کہ آئندہ کوئی ناسخ کتاب آنے والی نہیں۔ اخبار و قصص اس طرح کہ ٹھیک ٹھیک واقع کے مطابق ہیں اور ایسا کیوں نہ ہو جب کہ خدا نے علیم و حکیم نے اس کو اپنے علم کامل کے زور سے اتارا ہے [1]

آیت میں کتاب کی صفت حکیم آئی ہے حکیم اگر حکمت سے ہے تو حکیم کے معنی حکمت والی کتاب ہے حکمت عقل و فہم کی اس کامل ترین حقیقت کا نام ہے جس سے صحیح و غلط، صواب و خطا، حق و باطل اور خیر و شر کے درمیان تمیز و فیصلہ بذریعہ غور و فکر دلیل و برہان اور تجربہ و استقرار سے نہیں بلکہ منکشفانہ طور سے ہو جاتا ہے اور اسی کے مطابق صاحب حکمت کا قول بھی ہوتا ہے۔ دوسری ربانی بخششوں کی طرح حکمت کا حصہ انکو یکساں نہیں ملتا ہے بلکہ حسب استعداد و قابلیت یہ نعمت ملتی ہے مگر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جس طرح اس ربانی عطیہ، اسمائی فہم

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دینی عقل اور نورانی قوت پر حکمت کا اطلاق ہوتا ہے۔ اسی طرح حکمت کے آثار و نتائج اور اس کی تعلیمات پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ حکمت آثار و نتائج وہی باتیں ہوتی ہیں جن کی عالمگیر صداقت اور سچائی کو خود فطرت انسانی اور حسن اخلاقی تسلیم کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکمت کا اطلاق زبور اور انجیل پر بھی ہوا ہے۔ اور اس آیت میں قرآن کی یہی صفت حکمت والا قرآن نے بتائی ہے۔ یہ صفت اشارا کر رہی ہے کہ قرآن اپنے ہر دعویٰ پر دلیل و حجت سے اس طرح آراستہ ہے کہ اپنی صداقت کی کسوٹی خود ہی ہے اس کے لیے بیرونی شہادت کی ضرورت نہیں ہے اور اس میں یہ بھی اشارا ہے کہ قرآن کے نام سے جو کتاب آئی ہے وہ متکلم کی زبان کی جادوگری نہیں شاعرانہ پرواز تخیل نہیں یہ تو کتاب حکیم کی آیات ہیں ان پر غور نہ کروگے تو حکمت سے محرومی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا —— اور اگر حکیم محکم کے معنی میں ہو جیسے البدء مولہ کے معنی میں آتا ہے جیسا کہ ابن جریر نے سمجھا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی کتاب جو پختہ اور سچی اپنے الفاظ و معانی، علوم و احکام اخبار و قصص ہر لحاظ اور ہر اعتبار سے ہے اور ہر طرح کلام الٰہی مانے جانے کے لائق ہے اور حکیم اگر بمعنے حاکم ہو تو مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب اصول و فروع دستوری ضوابط، اور قوانین میں حق و باطل کے درمیان فیصلہ کن ہے اور ہر معاملہ میں عدل و انصاف کی علمبردار ہے۔

نبی کی بشریت پر استعجاب

سے کیا لوگوں کو اس پر حیرت ہے کہ ان ہی میں سے ہم نے ایک ذات گرامی کو وحی کی نعمت سے اس مقصد کی خاطر سرفراز کیا ہے یعنی اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ انسانوں کی اصلاح کے لیے حق تعالیٰ ایک انسان کو مامور فرما دے اور اس کی طرف وہ پیغام بھیجے جس کی دوسروں کو بلا واسطہ خبر نہ ہو۔ وہ تمام لوگوں کو اللہ سبحانہ کی نافرمانی کے مہلک نتائج و عواقب سے آگاہ کرے اور اللہ کی بات ماننے والوں کو بشارت دے کہ رب العزت کے یہاں اعمال صالحہ کی بدولت ان کا کتنا اونچا مقام ہے اور کیسا بلند پایہ ہے اور کیسی سعادت و فلاح ازل سے ان کے لیے لکھی جا چکی ہے [1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس آیت میں نبوت کی حقیقت، اور نبی کی بشریت پر اجمالی تبصرہ کیا گیا ہے بتایا ہے کہ نبی انسانوں میں سے وہ گرامی قدر شخصیت ہے جس کا علمی ذریعہ اللہ کی وحی ہو اور نبی کا کام یہ ہے کہ لوگوں کو انکار و بدعملی کے نتائج سے آگاہ کرے اور ایمان والوں کو ان کے عنداللہ مقام کی خوشخبری دے۔

سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ نبی کی بشریت کا ہے۔ یہ مسئلہ بھی ان مسائل میں سے ہے جن کی اصل حقیقت قرآن سے پہلے افراط و تفریط کی تاریکی میں گم تھی۔ قرآن سے پہلے یہودیوں کی طرح ایسے مذاہب موجود تھے جو نبی کو ایک پیشن گوئی کی صفت کے علاوہ ہر حیثیت سے معمولی انسان سمجھتے تھے۔ وہ ہر قسم کے گناہ بھی کرتے تھے۔ وہ بد اخلاقیوں کے مرتکب ہوتے تھے وہ کفر بھی کرتے تھے تاہم پیغمبر کہے جاتے تھے دوسری طرف عیسائی تھے جو اپنے نجات دہندہ کو انسانیت سے پاک خود خدا یا خدا کا یا ناسوت و لاہوت کا ایک مجموعہ سمجھتے تھے۔

قرآن نے ان دونوں کے درمیان راہ پیش کی۔ وہ ایک طرف رسولوں کو مخلوق صرف انسان اور پورا بندہ اور اللہ کے حکم کے سامنے عاجز و درماندہ بتاتا ہے لیکن دوسری طرف وہ ان کو اللہ سبحانہ کا برگزیدہ، معصوم نیک اور اللہ سبحانہ کی قدرت سے فیض پاکر برکتوں، سعادتوں اور ہدایتوں کا مرکز اور اللہ کے حکم سے عجیب و غریب امور صادر کرنے والا بتاتا ہے اور بے اعتدالی کے ان دونوں نظریوں کی علانیہ تردید کرتا ہے۔ اہل عرب یہ سمجھتے تھے کہ انساں کی رہنمائی کے لیے خود انسان نہیں بلکہ انسان سے مافوق ہستی ہونی چاہیے اور وہ ہستی صرف فرشتوں کی ہے قرآن نے ان کے اس خیال کی بار بار تکذیب کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انبیاء کے دو رخ ہوتے ہیں ایک طرف تو وہ بشریت کے جامہ میں ہوتے ہیں اور انسانوں کی طرح وہ کھاتے پیتے چلتے پھرتے سوتے جاگتے، شادی بیاہ کرتے اور پیدا ہوتے اور مرتے ہیں۔ دوسری طرف وہ اپنی روحانیت بے گناہی پاکدامنی اور اختصاص نبوت میں انسانوں سے بلند تر ہیں۔ وہ اپنے بشری اوصاف کے لحاظ سے بلاشبہ انسان ہوتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے مافوق بشری خصوصیات کی وجہ سے فوق البشر ہوتے ہیں۔ مشرکین کو نبی کے بارے میں بھی مغالطہ تھا۔ نبی جب ان کے سامنے اپنی نبوت اور اللہ سبحانہ کی جانب سے آنے کا دعویٰ پیش کرتا تو وہ اس کی بشری خصوصیتوں کو دیکھ کر کہتے کہ تم تو ہماری طرح کے آدمی ہو تم خدا کے رسول کیسے ہو سکتے۔ کفار نے بار بار

کہا کہ ابعث اللہ بشرا رسولاً کیا خدا نے انسان کو نبی بنا کر روانہ کیا ہے؟ وہ بشریت کو رسالت کے منافی سمجھتے تھے یہاں بھی ان کے اسی استعجاب کو قرآن نے نقل کیا ہے اکان للناس عجبا ان اوحینا الی رجل منہم۔

نبوت کی حقیقت اس آیت میں یہ بتائی گئی ہے کہ نبوت عطیہ خداوندی ہے نبی وہ عظیم المرتبت انسان ہے جس کے پاس اللہ کی وحی آئے۔ امام بخاری نے صحیح بخاری کے آغاز میں قرآنی آیت انا اوحینا الیہ تلاوت کر کے اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ نبی وہ انسان ہے جس کے پاس اللہ کی وحی آئے امام غزالی فرماتے ہیں۔

نبوت انسانیت کے مرتبہ سے بالاتر ہے جس طرح انسانیت حیوانیت سے بالاتر ہے وہ عطیہ الٰہی اور موہبت ربانی ہے سعی و محنت اور کسب و تلاش سے نہیں ملتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگرچہ نبی عام انسانوں کے ساتھ بشریت میں شریک ہوتا ہے مگر عقلیت و معنویت میں ان سے بالکل الگ ہوتا ہے کیونکہ اس میں وحی کے قبول کرنے کی جو صلاحیت ہوتی ہے وہ دوسرے انسانوں میں نہیں ہوتی اسی مفہوم کو قرآن نے یہاں ان اوحینا الی رجل منہم کے ذریعہ پیش کیا ہے۔

نبوت کی غرض و غایت کو اس آیت میں واضح طور پر پیش کیا گیا ہے ان انذر الناس وبشر الذین آمنوا وعملوا الصالحات ان لہم قدم صدق عند ربہم یعنی نبوت کی غرض انذار اور تبشیر ہے انذار برائیوں کے نتائج سے آگاہ کرنے اور تبشیر نیکیوں کے ثمرات سے مطلع کرنے کا نام ہے۔ یہاں انذار کو پہلے لاکر اشارہ کیا ہے کہ انسانی زندگی سے برائیوں کو ہٹانا مقدم ہے اور یہ بات اصولی اور فطری ہے کہ مفاسد کو پہلے دور کیا جائے پھر مصالح کے لیے محنت کی جائے اسی کو فقہاء کی زبان میں درأ المفاسد اولی من جلب المصالح کہتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ پہلے تخلیہ ہونا چاہیے پھر تحلیہ۔ یعنی پہلے گناہوں سے صفائی ہونی چاہیے بعد ازیں اچھائیوں اور خوبیوں کے ذریعے سجاوٹ ہونی چاہیے اسی انذار و تبشیر کے مجموعہ کا نام ہدایت ہے۔ انک تھدی الی صراط مستقیم اور اسی کو قرآن نے اخراج من الظلمات الی النور کہا ہے۔
لیخرجکم من الظلمات الی النور۔

پوری آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب یہ کتاب الٰہی بجائے خود حجت و برہان ہے تو صرف یہ بات اس کے نہ ماننے کی دلیل کیونکر ہو سکتی ہے کہ اس کتاب کی وحی ان ہی میں سے ایک شخص پر آئی ہے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ آخر انسانوں میں انذار و تبشیر کے کام کے لیے انسان نہ مقرر کیا جاتا تو اور کسے مقرر کیا جاتا۔ اس پر تعجب نہیں بلکہ ان کو خوش ہونا چاہیے کہ اللہ سبحانہ کا ان پر احسان عظیم ہے کہ اس نے ان پر ان ہی کے آدمی کے ذریعے یہ کتاب اتاری ہے جس کے ماضی و حاضر اور جس کے اخلاق و کردار سے وہ خوب واقف ہیں اور جس کی امانت و دیانت کا ان کو اعتراف ہے یہ اچھا ہوتا کہ کوئی غیر آتا اور یہ کام کرتا یا یہ اچھا ہے کہ اللہ نے ان ہی کے ایک شخص کو اس کام کو کرنے کے کا حکم دیا۔ یہ بات بھی کسی پہلو سے معقول نہ ہوتی کہ اس کام کے لیے کوئی فرشتہ یا جن منتخب کیا جاتا۔ انسانوں کے لیے منذر و مبشر انسان ہی ہو سکتا ہے۔

قرآن کا حیرت انگیز اثر

۳ کہ لوگوں کو خبردار کر اور اہل ایمان کو اس بات کی خوش خبری دے کہ اللہ سبحانہ کی بارگاہ عالی میں ان کا سچا مقام ہے انکار کرنے والے کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا جادو ہے یعنی وحی قرآنی کو فوق العادت مؤثر اور بلیغ ہونے کی وجہ سے جادو اور اس کے لانے والے کو جادوگر کہتے ہیں ۱ منکرین قرآن ایک طرف تو وحی و نبوت کا انکار کرتے ہیں دوسری طرف یہ بھی دیکھتے تھے کہ یہ آدمی اور آدمیوں کی طرح نہیں ہے کوئی نہ کوئی تو بات ضرور ہے۔ پھر جب اس کی کوئی توجیہ ان کی سمجھ میں نہ آئی تو کہتے ہو نہ ہو یہ جادوگری ہے۔ ان کی یہ بات قرآن کی حیرت انگیز تاثیر کی سب سے بڑی دلیل ہے یعنی اس کا اثر اس درجہ نمایاں اور قطعی تھا کہ باوجود انکار و جحود کے اس کا انکار نہیں کر سکتے اسے جادوگری سے تعبیر کرنے پر مجبور تھے۔

قرآن کی اس اثر انگیزی کو تاریخ و حدیث کی کتابوں میں پڑھئے۔ صحیح مسلم میں ہے۔ رئیس قبیلہ غفار کے شاعر تھے۔ انہوں نے جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا چرچا سنا تو چھپ کر مکہ آئے اور حضور اقدس کی زبان مبارک سے کلام ربانی کی کچھ آیتیں سنیں۔ سن کر واپس گئے

۱ افادات شیخ الاسلام

ان کے بھائی نے پوچھا کہ تم نے کیا پایا انہوں نے جواب دیا کہ قریش کہتے ہیں وہ شاعر ہیں ساحر ہیں کاہن ہیں ہم نے کاہنوں کا کلام سنا ہے پر ان کی بولی نہیں ہم نے شعر کے ایک ایک وزن کو دیکھا ہے وہ شعر بھی نہیں خدا کی قسم محمد سچے اور قریش جھوٹے ہیں۔

ضماد ازدی ایک صاحب تھے جو جھاڑ پھونک کا کام کرتے تھے وہ یہ سن کر کہ معاذ اللہ حضور اقدس دیوانے ہو گئے ہیں۔ علاج کے لیے آئے آپ نے مختصر سی حمد اور کلمہ شہادت پڑھا وہ سن کر حیران رہ گئے۔ تین بار پڑھوا کر سنا پھر بولے خدا کی قسم میں نے کاہنوں کی بولی جادو گروں کے منتر اور شاعروں کے قصیدے سنے لیکن تمہارا کلام کچھ اور ہی ہے۔ یہ تو سمندر تک میں اثر کر جائے گا[1]

ولید بن مغیرہ قریش میں سربرآوردہ اور صاحب اثر شخصیت کے مالک تھے وہ ایک بار خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ کچھ پڑھ کر سنائیے آپ نے قرآن کی کچھ آیتیں پڑھیں۔ اس نے مکرر کی درخواست کی اور آیات قرآنی سنیں۔ آخر از خود رفتہ ہو کر بولا خدا کی قسم اس میں کچھ عجیب شیرینی ہے۔ اس نخل کی شاخوں میں پھل اور اس کا تنا بھاری ہے یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے[2]

نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر نے جب سورہ مریم کی تلاوت کی تو اس پر رقت طاری ہو گئی اور اس کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ پھر کہا کہ خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں۔

اس قسم کے اور بھی بہت سے واقعات سیرۃ و رجال کی کتابوں میں موجود ہیں۔ کہ لوگ کیونکر آیات سن کر متاثر ہوتے تھے۔ قرآن کی اس شیرینی، نمکینی اور تاثیر کی جب کوئی توجیہ ان کی سمجھ میں نہ آتی تھی تو مبہوت ہو کر کہتے کہ یہ کلام جادو ہے اور کبھی کہتے کہ اس کا متکلم جادوگر ہے اور یہ اس کی جادوگری اور شعبدہ بازی ہے یعنی اس کتاب کے زور اس کے اثر اور اس کی فصاحت و بلاغت کا لوہا مانتے ہیں۔ گویا یہ قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی بیگانے شہادت دے رہے ہیں۔

---

[1] صحیح مسلم باب تخفیف الصلاۃ
[2] مصنف عبدالرزاق
[3] مسند احمد

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ
خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی
الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِیْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ
ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۳ اِلَیْهِ
مَرْجِعُكُمْ جَمِیْعًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ اِنَّهٗ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ
لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ وَالَّذِیْنَ
كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِیْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِیْمٌۢ بِمَا كَانُوْا
یَكْفُرُوْنَ ۝۴

لوگو! تمہارا مالک تو وہ اللہ ہے جس نے آسمان و زمین کو چھ یوم میں بنایا ہے [4] پھر اپنے تخت حکومت پر متمکن ہو گیا وہی ساری حکومت چلا رہا ہے [5] اس کی بارگاہ میں اس کے حکم کے بغیر کوئی سفارشی نہیں ہے [6] یہی اللہ تمہارا مالک و آقا ہے صرف اسی سے عابدانہ تعلقات قائم کرو کیا اتنی سی بات پر تم غور و فکر سے کام نہیں لیتے [7] اسی کی بارگاہ میں تم سب کو پیش ہونا ہے یہ اللہ کا پکا وعدہ ہے بلا شبہ وہی تو ہے جو آفرینش

کا نقطہ آغاز ہے اور وہی اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اعادہ اس لیے ہو گا کہ جو لوگ ایمان کی نعمت سے مالا مال ہوئے اور انہوں نے عمل صالح کیے انہیں انصاف کے ساتھ ان کی جزا دے۸ اور وہ لوگ جنہوں نے راہ کفر اختیار کی تو انہیں کفر کی وجہ سے کھولتی ہوئی پینے والی چیز ملے گی اور ان کو دردناک عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۹

مفردات کے معانی

استوی علی العرش استوٰی استوار سے ماضی کا صیغہ ہے استوار کے جب دو فاعل ہوں تو معنے دونوں کے برابر ہونے کے ہوتے ہیں جیسے لا یستوی الخبیث والطیب اور اگر فاعل دو نہ ہوں تو معنے سنبھلنے درست ہونے اور سیدھے رہنے کے ہوتے ہیں فاستوی وھو بالافق الاعلیٰ اس صورت میں استوار کے معنے ہیں کسی چیز کا اعتدال مراد ہوتا ہے اور جب استوا علی کے ساتھ آئے تو اس کے معنے چڑھنے، قرار پکڑنے اور قائم ہونے کے آتے ہیں واستوت علی الجودی اور جب استواء الی کے ساتھ آئے تو اس کے معنے قصد کرنے اور پہنچنے کے ہوتے ہیں الی السماء ثم استوی علی العرش اللہ سبحانہ کے بارے میں آیا ہے تو یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قرآن و سنت میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو اللہ سبحانہ کی صفات میں بیان کیے گئے ہیں اور مخلوق کے اوصاف میں بھی آئے ہیں جیسے حی، سمیع۔ بصیر کہ یہ الفاظ اللہ سبحانہ کے لیے بھی بولے گئے ہیں اور بندوں کے لیے بھی۔ لیکن ان دونوں جگہ ان کے استعمال کی حیثیت بالکل جداگانہ ہے

کسی مخلوق کو سمیع وبصیر کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اس کے پاس دیکھنے والی آنکھ اور سننے والا کان ہے۔ اب یہاں دو چیزیں ہیں ایک تو وہ آلہ جو سننے اور دیکھنے کا مبدا اور ذریعہ ہے یعنی آنکھ اور کان دوسرا اس کا نتیجہ اور غرض و غایت یعنی وہ خاص علم جو کان کے سننے اور آنکھ کے دیکھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ لہذا جب مخلوق کو سمیع وبصیر کہا جائے گا تو اس کے حق میں یہ مبدا اور غایت دونوں چیزیں مراد ہوں گی جن کیفیات کا ہمیں علم ہے لیکن یہی الفاظ جب اللہ سبحانہ کے لیے بولے جائیں گے تو ان سے یقیناً وہ مبادی اور کیفیات مراد نہیں ہوں گی جو مخلوق کے خواص میں داخل ہیں اور جن سے اللہ سبحانہ قطعاً پاک ہے۔ البتہ یہ عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ سمع وبصر اس ذات اقدس میں بدرجہ اتم موجود ہے اور اس کا نتیجہ یعنی وہ علم جو رویت وسماع سے حاصل ہوتا ہے اس کو بدرجہ کمال حاصل ہے رہی یہ بات کہ وہ مبدا کیا ہے اور دیکھنے اور سننے کی کیا کیفیت ہے تو ظاہر ہے کہ اس سوال کے جواب میں بجز اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس کا دیکھنا اور سننا مخلوق کی طرح نہیں ہے۔ اسی طرح اس کی ساری صفات کو سمجھنا چاہیے کہ صفت باعتبار اپنے اصل مبدا کے ثابت ہے مگر اس کی کوئی کیفیت نہیں بیان کی جا سکتی ہے اور نہ کسی آسمانی شریعت نے کبھی انسان کو اس پر مجبور کیا ہے کہ وہ خواہ مخواہ ان حقائق پر غور کر کے جو اس کی عقل وادراک کی دسترس سے باہر ہے اپنی عقل کو پریشان کرے دو صورتیں ہیں اور دونوں کا حکم الگ ہے ایک یہ کہ کوئی بات عقل کے خلاف ہو ایک یہ کہ کوئی عقل سے بالاتر ہو۔ بہت سی باتیں ایسی ہو سکتی ہیں جن کا عقل انسانی ادراک نہیں کر سکتی اسی قاعدے کی روشنی میں استوا علی العرش کو بھی سمجھ لیجیے۔

عرش کے معنے تخت اور بلند مقام کے ہیں اور استوا کا ترجمہ اکثر محققین نے تمکن واستقرار یعنی قرار پکڑنے اور قائم ہونے کے کئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تخت حکومت پر اس طرح قابض ہونا کہ کوئی حصہ اور کوئی گوشہ حیطہ اقتدار سے باہر نہ ہو اور نہ قبضہ وتسلط میں کسی قسم کی کوئی مزاحمت ہو غرض سب کام اور انتظام درست ہو۔ اب دنیا میں بادشاہوں کی تخت نشینی کا ایک تو مبدا اور ظاہری صورت ہوتی ہے اور ایک حقیقت یا غرض وغایت یعنی ملک پر پورا پورا تسلط اور نفوذ وتصرف کی قدرت حاصل ہونا لہذا اللہ سبحانہ کے استوا علی العرش میں یہ حقیقت اور غرض بدرجہ کمال موجود ہے کہ تمام مخلوقات اور ساری کائنات پر پورا پورا تسلط واقتدار اور مالکانہ اور شاہانہ تصرف ونفوذ بے روک ٹوک صرف اسی کو حاصل ہو۔

اس آیت ثم استوی علی العرش یدبر الامر سے بخوبی یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے۔ رہا استواء علی العرش کا مبدا اس کی ظاہری صورت و کیفیت دیگر صفات سمع و بصیر کی طرح یقیناً اس کی کوئی ایسی صورت نہیں ہو سکتی ہے کہ اس میں مخلوق کی صفت اور حدوث کا ذرا سا بھی شائبہ ہو پھر وہ کیونکر ہے اور کیسے ہے تو اس کی کوئی ایسی صورت نہیں ہو سکتی ہے کہ اس میں مخلوق کی صفت اور حادث کا ذرا سا بھی شائبہ ہو پھر وہ کیونکر ہے اور کیسے ہے تو اس کی کیفیت کے لیے اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے لیس کمثلہ شئ ہمارا کیا مایہ علما کہ اس کی کیفیت بیان کر سکیں لایحیطون بہ حضرت ام سلمہ فرماتی ہیں الاستواء غیر مجہول والکیف غیر معقول والاقرار بہ ایمان والجحود بہ کفر [1] استواء معلوم ہے اس کی کیفیت عقل سے بالا ہے اس کا اقرار ایمان ہے اس کا انکار کفر ہے۔ قاضی ابو العلاء صاعد بن محمد نے کتاب الاعتقاد میں امام ابو یوسف کی روایت سے حضرت امام اعظم ابو حنیفہ کا ارشاد نقل کیا ہے:

کسی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اللہ سبحانہ کے بارے میں اس کی ذات کے متعلق ذرا بھی زبان کھولے بلکہ اسی طرح بیان کرے جس طرح خود اللہ سبحانہ نے اپنے لیے بیان فرمایا ہے اپنی رائے سے کچھ نہ کہے تبارک اللہ تعالیٰ رب العالمین (روح المعانی)

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
وز ہر چہ گفتہ اند شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایان رسید عمر
ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

اللہ کی خالقیت سے الوہیت پر استدلال

قرآن حکیم میں لفظ عبادت مختلف صیغوں کی صورت میں بے شمار مواقع پر استعمال کیا گیا ہے ان میں سے کچھ آیات یہ ہیں۔

ما تعبدون من دونہ الا اسماء اسیتموھا انتم وآباءکم

[1] فتح البیان

تم لوگ تو اللہ سے ڈرے بس ایسے کچھ ناموں کی عبادت کرتے ہو جن کو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے ٹھہرایا ہے۔

قالوا نعبد اصناما فنظل لها عاکفین۔

انھوں نے کہا ہم اپنے بتوں کی عبادت کرتے ہیں اور دن بھر ان سے لگے بیٹھے رہتے ہیں۔

یہ آیتیں بتا رہی ہیں کہ کسی کے ساتھ پوجا پاٹ اور پرستش کا رویہ اختیار کرنا اس کی دہائی دینا۔ اس کے نام کے چڑھاوے چڑھانا۔ اس کی لودی رکھنا اس کے نام کے جانور چھوڑنا اس سے حاجات طلب کرنا اس کی عبادت ہے کیونکہ مشرکین اپنے بزرگوں کی مورتیوں کے ساتھ جو کچھ کیا کرتے تھے اسے ان آیتوں میں عبادت کہا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ مشرکین کا تعلق اپنے بتوں کے ساتھ پوجا پاٹ اور پرستش ہی کا ہوا کرتا تھا۔

آیئے تصویر کا ایک اور رخ بھی پڑھ لیجیے۔

والذین اجتنبوا الطاغوت ان یعبدوها وانابوا الی اللہ لهم البشری۔

جو لوگ طاغوت کی عبادت سے دور رہے اور اللہ کی طرف جھکے ان کے لیے خوش خبری ہے۔

لقد بعثنا فی کل امۃ رسولا ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت۔

بلاشبہ ہم نے روانہ کیا رسول ہر امت میں کہ عبادت کرو اللہ کی اور بچ کر رہو طاغوت سے۔

ایک اور آیت ہے۔

من لعنه اللہ وغضب علیه وجعل منهم القردة والخنازیر وعبد الطاغوت۔

وہ جن پر اللہ نے لعنت کی۔ اس کا غضب گرا اور ان میں سے کتنوں ہی کو اس نے بندر اور سور بنا دیا اور جنھوں نے طاغوت کی عبادت کی۔

شاہ عبد القادر فرماتے ہیں کہ طاغوت وہ جو ناحق سرداری کا دعوی کرے کچھ سند نہ رکھے۔ ان

آیتوں سے معلوم ہوا کہ کسی کو مطاع مطلق مان کر اپنے ارادے اور مرضی سے اس کے احکام پر چلنا اس کی عبادت کرنا ہے کیونکہ ان آیتوں میں اس طرز عمل کو عبادت کہا گیا ہے جو طاغوت کے ساتھ اس کی پیروی اختیار کرتے ہیں۔

بتوں والی عبادت کو پرستش اور طاغوت والی عبادت کو بندگی کہتے ہیں دونوں ہی شرک ہے آیئے دونوں کی وضاحت حضرت شاہ عبدالقادر کی زبانی سن لیجئے شاہ صاحب پرستش میں شرک کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

شرک یہ کہ اللہ کی صفت کسی اور میں جانے مثلاً کسی کو سمجھے کہ اس کو ہر بات معلوم ہے یا وہ جو چاہے کر سکتا ہے یا ہمارا بھلا کرنا اس کے اختیار میں ہے اور یہ کہ اللہ کی تعظیم کسی اور پر خرچ کرے مثلاً کسی کو سجدہ کرے اور اس سے حاجت مانگے مختار جان کر۔

اور بندگی میں شرک کی توضیح کرتے ہوئے سورہ نساء میں زیر آیت ان اللہ لا یغفر ان یشرك به تحریر فرماتے ہیں:

اوپر سے ذکر تھا منافقوں کا جو پیغمبر کے حکم پر راضی نہ ہوئے اور جُدی راہ چلے یہ آیت فرمائی کہ اللہ شرک نہیں بخشتا تو شرک فرمایا حکم میں شریک کرنے کو یعنی سوائے دین اسلام کے اور دین پسند رکھے اور اس پر چلے۔ بس جو دین ہے سوائے اسلام کے سب شرک ہے اگرچہ پوجنے میں شرک نہ کرتے ہوں۔

اور سورہ انعام میں زیر آیت وان اطعتموھم انکم لمشرکون فرماتے ہیں۔

شرک فقط یہی نہیں کہ کسی کو سوائے خدا کے پوجے بلکہ شرک کے حکم میں ہے کہ اور کا مطیع ہو جائے۔

پرستش اور بندگی دونوں عبادت ہیں۔ یہ بات کہ پرستش کی طرح کسی کی بندگی بھی عبادت ہے قرآن ہی سے معلوم ہوتی ہے۔

فقالوا انؤمن لبشرین مثلنا وقومهما لنا عابدون

تو فرعونیوں نے کہا کہ ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں کی بات مان لیں حالانکہ ان کی قوم ہماری عبادت کر رہی ہے۔

وتلك نعمة تمنها علی ان عبدت بنی اسرائیل

حضرت موسیٰ نے فرعون سے کہا اور یہ ہے تیرا وہ احسان جو تو مجھ پر دھر رہا ہے کہ تو نے نبی اسرائیل کو اپنا عابد بنا لیا ہے۔

یہ آیتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ صرف وہی اطاعت عبادت نہیں ہے جس کے پیچھے ارادہ دل کی آمادگی اور جس کی اطاعت کی جارہی ہو اس کے بارے میں بلے قید و شرط اطاعت کے مستحق ہونے کا خیال یہ تینوں چیزیں موجود ہوں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ اطاعت بھی عبادت ہی ہے جو اگرچہ اپنی مرضی کے خلاف کرنی پڑ رہی ہو مگر شعور اور ارادے کے ساتھ اور بلا چوں وچرا کی جاری ہو اور جس کی اطاعت کی جا رہی ہو وہ خود کو کسی بالاتر قانون کا پابند نہ سمجھتا ہو۔ بہرحال آیات میں پرستش اور بندگی دونوں معنے عبادت کا حکم ہو رہا ہے۔

اے لوگو! تمہارا مالک تو وہ اللہ ہے جس نے آسمان و زمین کو چھ یوم میں بنایا ہے یعنی اتنے وقت میں جو چھ دن کے برابر تھا اور ایک دن ابن عباس کی روایت کے مطابق ایک ہزار سال کا لیا جائے گا گویا چھ ہزار سال میں زمین و آسمان وغیرہ تیار ہوئے۔ بلا شبہ حق تعالیٰ قادر تھا کہ آن واحد میں ساری مخلوق کو پیدا کر دیتا۔ لیکن حکمت اسی کو مقتضی ہوئی کہ تدریجاً پیدا کیا جائے۔ تاکہ بندوں کو سبق دینا ہو کہ قدرت کے باوجود ہر کام سوچ سمجھ کر ثانی اور متانت سے کیا کریں نیز تدریجی تخلیق میں بہ نسبت دفعۃً پیدا کرنے کے اس بات کا زیادہ اظہار ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ فاعل بالاضطرار نہیں ہے بلکہ ہر چیز کا وجود بالکلیہ اس کی مشیت و اختیار سے وابستہ ہے جب چاہے جس طرح چاہے پیدا کرے[1]

چھ یوم میں کائنات کی تخلیق

فرمایا کہ ان ربکم اللہ الذی خلق السماوات والارض فی ستۃ ایام تمہارا مالک وہی اللہ ہے جس نے چھ یوم میں آسمان و زمین بنائے اسی قسم کی آیت سورہ اعراف میں گذر چکی ہے ان ربکم اللہ الذی خلق اسماوات والارض فی ستۃ ایام یغشی اللیل النہار الخ اور وہاں اس پر کچھ بحث آچکی ہے اور چھ ایام کا مطلب واضح کر دیا گیا ہے۔ یہاں وہ تمام اشارات ذہن میں محفوظ کر لیجئے جو قرآن میں

[1] افادات شیخ الاسلام

جا بجا زمین و آسمان کی پیدائش کے بارے میں کیے گئے ہیں۔

۱۔ آسمان و زمین کی پیدائش ایسے مادے سے ہوئی جسے قرآن نے دخان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے ثم استوی الی السماء وھی دخان۔ دخان کے معنے دھوئیں کے یا ایسی بھاپ کے جو اوپر چڑھی ہوئی ہو۔

۲۔ یہ مادہ دخانیہ ابتدا میں الگ الگ نہیں بلکہ ملا ہوا تھا پھر اس کے مختلف حصے جدا جدا کیے گئے۔ اور ان سے اجرام سماویہ کی پیدائش ظہور میں آئی۔ ان السماوات والارض کانتا رتقا ففتقنا ھما

۳۔ یہ تمام کائنات بیک بارگی ظہور میں نہیں بلکہ تخلیق کے چھ دور یکے بعد دیگرے ظہور میں آئے یہ دور چھ یوم تھے۔

۴۔ سارے سیاروں کی تکمیل دو دوروں میں ہوئی جن کو قرآن دو یوم کہتا ہے فقضاھن سبع سماوات فی یومین۔

۵۔ زمین کی پیدائش دو دوروں میں ہوئی خلق الارض فی یومین۔

۶۔ زمین کی سطح کی درستگی اور پہاڑوں کی نمود اور قوت نشو و نما کی تکمیل بھی دو یوم یعنی دو دو دون میں ہوئی اور اس طرح یہ چار دور ہوئے وجعل فیھا رواسی من فوقھا وبارك فیھا وقدر فیھا اقواتھا فی اربعة ایام۔

۷۔ تمام حیوانی اجسام کی پیدائش یعنی نباتات و حیوانات پانی سے ہوئی وجعلنا من الماء کل شئی حی۔

۸۔ انسان کے وجود پر بھی یکے بعد دیگرے مختلف حالتیں گذری ہیں وخلقکم اطوارا۔

ان تمام اشارات کا خلاصہ یہ ہے کہ ابتدا میں مادہ دخانی تھا پھر اس میں انقسام ہوا یعنی بہت سے ٹکڑے ہو گئے۔ ہر ٹکڑے نے ایک کرہ کی شکل اختیار کر لی اور اسی ایک ٹکڑے سے زمین بنی۔ پھر زمین میں کوئی ایسی تبدیلی آئی کہ دخانیت نے مائیت کی شکل اختیار کر لی۔ پھر خشکی کے قطعات درست ہو گئے۔ بعد ازیں پہاڑوں کے سلسلے نمودار ہوئے پھر زندگی نمایاں ہوئی اور نباتات ظہور میں آگئے۔

موجودہ زمانے میں اجرام سماوی کی ابتدائی تخلیق اور زمین کی ابتدائی نشو و نما کے جو نظریے تسلیم کر لیے ہیں۔ یہ اشارات بظاہر ان کی تائید کرتے ہیں۔ اور اگر ہم چاہیں تو ان اشارات

ہی پر تفصیلات کی بڑی عمارتیں اٹھا سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا کرنا صحیح نہ ہوگا یہ نظریے کتنے ہی مستند ہوں لیکن بہر حال نظریئے ہیں۔ اور نظریات جزم و یقین کے ساتھ حقیقت کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ پھر اس سے کیا فائدہ کہ ان کی روشنی میں قرآن کے مجمل اشارات کی تفسیر کی جائے

فرض کرو آج کل ہم نے دخان اور انفسام کا مطالب اسی روشنی میں لے لیا لیکن کل کو کیا کریں گے جب ان نظریوں کی جگہ دوسرے نظریے لے لیں گے صاف بات یہی ہے کہ یہ معاملہ سارا عالم غیب سے تعلق رکھتا ہے جس کی حقیقت ہم اپنے علم و ادراک کے ذریعے معلوم نہیں کر سکتے اور قرآن کا مقصود ان اشارات سے تخلیق عالم کی شرح و تحقیق نہیں ہے بلکہ اللہ سبحانہ کی قدرت وحکمت کی طرف توجہ دلانا ہے لہ

اللہ سبحانہ کی حکومت

۵ پھر اپنے تخت حکومت پر متمکن ہوگیا وہی ساری حکومت چلا رہا ہے یعنی مخلوق کے تمام کاموں کی تدبیر و انتظام اسی کے ہاتھ میں ہے یعنی پیدا کر کے وہ معطل نہیں ہوگیا بلکہ اپنی پیدا کی ہوئی کائنات کے تخت سلطنت پر وہ خود جلوہ فرما ہوا اور اب سارے جہاں کا انتظام عملاً اسی کے ہاتھ میں ہے۔ نادان سمجھتے ہیں اللہ سبحانہ نے کائنات کو پیدا کر کے یوں ہی چھوڑ دیا ہے کہ خود جس طرح چاہے چلتی رہے۔ یا دوسروں کے حوالہ کر دیا ہے کہ وہ اس میں جیسے چاہیں تصرف کریں۔ قرآن اس کے برعکس یہ حقیقت پیش کرتا ہے کہ اللہ سبحانہ اپنی تخلیق کی اس پوری کائنات پر بلا شرکت آپ ہی حکمرانی کر رہا ہے، تمام اختیارات اس کے اپنے ہاتھ میں ہیں۔ ساری زمام اقتدار پر وہ خود قابض ہے۔ کائنات کے گوشے گوشے میں ہر وقت ہر آن جو کچھ ہو رہا ہے براہ راست اس کے حکم سے ہو رہا ہے، اس جہان ہستی کے ساتھ اس کا تعلق صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ کبھی اسے وجود میں لایا تھا بلکہ ہمہ وقت وہی اس کا مدبر و منتظم ہے اسی کے قائم رکھنے سے یہ قائم ہے اسی کے چلانے سے یہ چل رہا ہے۔ یدبر الامر میں اس بات کی طرف اشارا ہے کہ اللہ سبحانہ صرف خالق ہی نہیں بلکہ آمر اور حاکم بھی ہے۔ اس نے اپنی خلق کو پیدا کر کے نہ تو دوسروں کے حوالہ کر دیا ہے کہ وہ اس میں حکم چلائیں اور نہ پوری خلق کو یا اس کے کسی حصے کو خود مختار بنا دیا ہے کہ جس طرح

لہ ترجمان القرآن

چاہے خود کام کرے بلکہ عملاً تمام کائنات کی تدبیر اللہ سبحانہ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اور یہ حقیقت بھی اس آیت نے پوری قوت سے واضح کر دی ہے کہ آسمان و زمین میں پادشاہت صرف اللہ سبحانہ کی ہے اور حاکمیت جس چیز کا نام ہے وہ اللہ سبحانہ کے لیے خاص ہے اور یہ نظام کائنات کامل ایک مرکزی نظام ہے جس میں تمام اختیارات کو وہی ایک ذات استعمال کر رہی ہے لہذا اس نظام میں جو شخص یا گروہ اپنی یا کسی اور کی جزئی یا کلی حاکمیت کا مدعی ہے وہ محض فریب میں مبتلا ہے۔ نیز یہ کہ اس نظام میں رہتے ہوئے انسان کے لیے اس کے سوا کوئی دوسرا رویہ صحیح نہیں ہو سکتا کہ اسی ایک ذات کو پرستش کے معنوں میں معبود جانے اور بندگی کے معنوں میں سیاسی تمدنی زندگی میں واحد سلطان بھی تسلیم کرے۔ قرطبی نے امام مجاہد سے یدبر الامر کی تشریح یہ نقل کی ہے یقضیہ ویقدرہ وحدہ خالق کل ہونے کے ساتھ وہ حاکم بھی ہے چھوٹے بڑے ہر کام کا فیصلہ بھی وہی کرتا ہے اور عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ اس تدبیر میں اس کا شریک نہیں ہے۔

بارگاہ حق میں شفاعت

یہ اسکی بارگاہ میں اس کے حکم کے بغیر کوئی سفارشی نہیں ہے یعنی شریک اور حصہ دار تو اس کی خدائی میں کیا ہوتا۔ سفارش کے لیے بھی اس کے اذن کے بغیر لب نہیں ہلا سکتا ؎ یعنی اللہ سبحانہ کے انتظام میں کسی دوسرے کا دخیل ہونا تو درکنار کوئی اتنا اختیار بھی نہیں رکھتا کہ اللہ سے سفارش کر کے اس کا فیصلہ بدلوا دے۔ زیادہ سے زیادہ کوئی جو کچھ کر سکتا ہے وہ بس اتنا ہے کہ دعا کرے مگر دعا کا قبول ہونا نہ ہونا بالکل اللہ سبحانہ کی مرضی پر منحصر ہے شفیع شفاعت سے بنا ہے سفارش کرنا اور شفاعت کرنا۔ مولانا اسماعیل الشہید نے شفاعت کے مسئلہ پر بڑی مبسوط اور سیر حاصل بحث کی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ بطور گلے از گلزار ناظرین معالم القرآن کی ضیافت طبع کے لیے یہ سوغات بھی پیش کی جائے مولانا نے شفاعت کی تین قسمیں بتائی ہیں شفاعت وجاہت شفاعت محبت اور شفاعت بالاذن۔ اس آیت میں پہلی دو کی نفی اور تیسری کا اثبات ہے۔

؎ افادات شیخ الاسلام

شفاعت وجاہت یہ ہے کہ بادشاہ کے دربار میں کسی چور کی چوری ثابت ہوگئی اور وہ آئین قانون کے اعتبار سے اسے سزا دینا چاہتا ہے لیکن کوئی امیر یا وزیر اس کی سفارش کرتا ہے بادشاہ کا جی تو آئین حکومت کی وجہ سے اسے سزا دینے کو چاہتا ہے مگر اس امیر سے دب کر سفارش مان لیتا ہے اور اس چور کا قصور معاف کر دیتا ہے۔ کیونکہ وہ امیر اس کی حکومت کی بڑی شخصیت ہے اور اس کی بات نہ ماننے سے حکومت میں گڑبڑی کا اندیشہ ہے۔ بادشاہ سمجھتا ہے کہ چور سے درگزر کر جانا اچھا ہے بمقابلہ اتنے بڑے امیر کے ناخوش ہو جانے کے چور کی سزا چور کی سزا ہے مگر امیر کی ناراضگی سے حکومت میں فساد اور بغاوت کا اندیشہ ہے اس کو شفاعت وجاہت کہتے ہیں یعنی دربار میں اس امیر کی وجاہت کی وجہ سے اس کی سفارش قبول کی جاتی ہے۔ اس قسم کی شفاعت اللہ کی جناب میں ہرگز نہیں ہے یہ مشرکین کا نظریہ شفاعت ہے اور یہ اللہ کی جناب سے جاہل ہونے کی علامت ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ چور کی سفارش بادشاہ سے کوئی شاہزادہ یا بادشاہ کا کوئی محبوب کرتا ہے بادشاہ اس کی محبت سے لاچار ہو کر اس چور کو سزا نہیں دیتا یہ شفاعت محبت ہے۔ بادشاہ کو اندیشہ ہے کہ اگر اس کی سفارش نہ مانی گئی تو وہ روٹھ جائے گا اور اس روٹھ جانے کا غم مجھ سے برداشت نہ ہوگا اس قسم کی شفاعت بھی جناب الٰہی میں ممکن نہیں ہے یہ عیسائیوں کا نظریہ شفاعت ہے۔

تیسری شفاعت کی صورت یہ ہے کہ چور پر چوری ثابت ہوگئی مگر وہ پیشہ ور چور نہیں۔ اتفاقیہ اس سے قصور ہوگیا۔ چور قصور پر شرمندہ ہو اس پر بادشاہ کو رحم آتا ہے مگر قانون حکومت کی وجہ سے بے سبب درگزر نہیں کرتا ہے۔ کوئی وزیر بادشاہ کی مرضی پاکر اس چور کی سفارش کرتا ہے بادشاہ وزیر کی عزت افزائی کے لیے ظاہر میں اس کی سفارش قبول کر کے چور کو معاف کر دیتا ہے۔ امیر چور کی سفارش اس لیے نہیں کر رہا ہے کہ اسے چور سے یا چور کے جرم سے کوئی ہمدردی ہے بلکہ محض بادشاہ کی مرضی تاڑ کر سفارش کر رہا ہے کیونکہ وہ چور کا حمایتی نہیں بلکہ بادشاہ کا امیر ہے اس کو شفاعت بالاذن کہتے ہیں یعنی یہ شفاعت خود مالک کے حکم اور اجازت سے ہوگی۔ اللہ کی جناب میں یہی شفاعت ہوگی یہی اسلام کا نظریہ شفاعت ہے۔ اس پر انشاء اللہ تفصیلی بحث آئندہ ہوگی۔

پرستش اور بندگی صرف اللہ کی کرو

۵ اللہ ہی تمہارا مالک و آقا ہے لہذا صرف اسی سے عابدانہ تعلقات قائم کرو کیا تم اتنی سی بات پر غور و فکر سے کام نہیں لیتے ہو یعنی دھیان کرو کہ ایسے رب کے سوا جس کی صفات اوپر بیان ہوئی ہیں دوسرا کون ہے جسکی بندگی اور پرستش کی جا سکے۔ پھر تم کو کیسے جرات ہوتی ہے کہ اس خالق و مالک شہنشاہ مطلق اور حکیم برحق کے پیغاموں اور پیغامبروں کو محض اوہام و ظنون کی بنا پر جھٹلانے لگو[له]

یہاں توحید الوہیت پر توحید ربوبیت سے استدلال کیا ہے یعنی جب تم مانتے ہو کہ اس کائنات کا بنانے والا اور چلانے والا اللہ ہے تو کیوں نہیں مانتے کہ تمہاری پرستش اور بندگی کا بھی مستحق اللہ ہے۔ پرستش اور بندگی کے مجموعہ کا نام عبادت ہے یہی عقل کا صریح تقاضا اور یہی قرآن کا واضح فیصلہ ہے شارحین قرآن نے فاعبدوہ کی شرح افردوہ بالعبادہ وحدہ تنہا صرف اسی کی عبادت کرو (ابن کثیر) وحدوہ واخلصوالہ العبادہ اکیلے کی عبادت اور عبادت میں ملاوٹ نہ کرو (قرطبی) عقل کا صریح تقاضا یہ اس لیے ہے کہ جو ذات گرامی انسان کی خالق اور مالک رازق محسن سبھی کچھ ہے اسے ہی سبھی طرح کی عبادتوں کا مستحق ہونا چاہیے۔ قرآنی فیصلہ یہ اس طرح ہے کہ اس کی آیتیں اپنے ماننے والوں سے اللہ سبحانہ کی پرستش اور بندگی دونوں ہی کا یکساں طور پر مطالبہ کرتی ہیں پرستش کی حد تک جہاں قرآن یہ کہتا ہے کہ اللہ ہی کو سجدہ کرو اسی کے نام کی پاکی بیان کرو اسی سے دعائیں مانگو اسی کی بڑائی کا اعلان کرو۔ اسی کو مدد کے لیے پکارو وہیں قرآن یہ بھی بندگی کی حد تک کہتا ہے اور بار بار کہتا ہے کہ اللہ ہی کو بلا قید اور بلا شرط اطاعت کا مستحق اور حقیقی فرماں روا مانو۔ اسی کو مستقل بالذات قانون ساز تسلیم کرو۔ اسی کے احکام کی اطاعت کرو۔ اسی کے قوانین کے مطابق فیصلے کرو۔ اسی کے ضابطوں کو زندگی کے ضابطے بناؤ اسی کے حلال کو حلال اور اسی کے حرام کو حرام جانو۔ اس لیے اس عبادت کا مفہوم پرستش بمعنے پوجا اور بندگی بمعنے طاعت دونوں کا مجموعہ ہے افلا تذکرون یعنی جب یہ حقیقت تمہارے سامنے کھل کر آگئی ہے اور تم کو صاف طور پر بتا دیا گیا ہے کہ

[له] افادات شیخ الاسلام

کہ اس حقیقت کی موجودگی میں تمہارے لیے صحیح طرزِ عمل کیا ہے کیا اب بھی تمہاری آنکھیں نہ کھلیں گی اور ان ہی غلط فہمیوں میں پڑے رہو گے جن کی بنا پر تمہاری زندگی کا پورا رویہ اب تک حقیقت سے دور رہا ہے۔

ایمان بالیوم الآخر

ف۵ اسی کی بارگاہ میں تمہیں پیش ہونا ہے یہ اللہ کا پکا وعدہ ہے بلا شبہ وہی تو ہے جو آفرینش کا نقطہ آغاز ہے اور وہی اس کا اعادہ کرے گا۔ اور یہ اعادہ اس لیے ہوگا کہ جو لوگ ایمان کی نعمت سے مالا مال ہوئے۔ اور انہوں نے عمل صالح کیے انہیں انصاف کے ساتھ ان کی جزا دے یعنی اسی سے سب کا آغاز ہوا اور اسی کی طرف انجام کار سب کو جانا ہے پھر اس کے احکام و سفرا سے سرتابی کیسے ادا ہو سکتی ہے۔

قرآن کی دعوت ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخر ہے اب تک اصلی طور پر ایمان باللہ کو بیان کیا ہے اور اس کے ضمن میں ایمان بالرسالت کا تمہید میں ذکر کیا اب یہاں سے ایمان بالیوم الآخر کا ذکر شروع ہے مبدا ذکر نے کے بعد معاد کا ذکر کیا ہے ایمان بالیوم الآخر اسلام کے بنیادی عقائد میں دوسرا عقیدہ ہے۔

ایمان بالیوم الآخر کا مطلب یہ ہے کہ حسب ذیل حقیقتوں کو سچے دل سے تسلیم کیا جائے۔

۱۔ انسان کی پیدائش ایک متعین مقصد کے لیے ہوئی ہے انسان ایک ذمہ دار اخلاقی ہستی ہے اسے پیدا کرنے والے نے اسے زندگی بسر کرنے کا ایک مکمل ہدایت نامہ دے کر پیدا کیا ہے اس کے مطابق عمل کرنا ہی حق اور نیکی ہے اور اسے چھوڑ کر من مانا طریقہ اختیار کرنا گمراہی اور برائی ہے۔

۲۔ انسان کی زندگی موت کی ساتھ ہی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے بعد مسلسل قائم رہنے والی ہے اور اس دنیا کی زندگی میں وہ جو کچھ کرتا ہے اپنے مادی نتائج کے اعتبار سے اگرچہ اسی جگہ ختم ہو جاتا ہے مگر اپنے اخلاقی نتائج کے اعتبار سے سب کا سب باقی رہتا ہے ایک دن ایسا آئے گا جب اللہ سبحانہ کی حکمت اور مشیت کے مطابق زمین و آسمان کا یہ سارا کارخانہ تہ و بالا کر دیا جائے گا اور اس زمین پر ایک جاندار بھی زندہ نہ رہ جائے گا سب موت کی نیند سلا دیئے جائیں گے قرآن کی اصطلاح میں اسے قیامت کہتے ہیں۔

۳- قیامت کے بعد وہ سارے جاندار جو دنیا کی ابتدار سے آج تک پیدا ہو کر مر چکے ہیں۔ اور ابھی اس دن کے آنے تک پیدا ہو کر مر جانے والے ہیں دوبارہ جسم و جان کے ساتھ زندہ کر کے اٹھا کر کھڑے کیے جائیں گے۔ ثم یعیدہ کا مطلب یہی ہے اسی کو حشر کہتے ہیں۔

۴- اعادہ حیات کے بعد زندگی کا دوسرا دور شروع ہوگا اس دور کی ابتدا اس بات سے ہوگی کہ سب کے سب اللہ سبحانہ کی عدالت میں پیش ہوں گے اور وہ ہم سے ہماری زندگی کے پہلے دور کا حساب لے گا اس وقت ہمارے ذرے ذرے کی نیکی اور بدی کا ریکارڈ ہمارے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ انصاف کی ترازو نصب ہوگی۔ ہر شخص کے عمل کانٹے کی تول تلیں گے جس خوش نصیب کا عمل یا وزن ثابت ہوگا اور اعمال نامہ نیکیوں کا اعمال نامہ نکلے گا اس کو زندگی کا یہ دور بسر کرنے کے لیے نعمتوں بھری جگہ عطا ہوگی۔ یہ نعمتیں بے حد و بے حساب ہوں گی کبھی ختم نہ ہوں گی اور ایسی ہوں گی جن کا اس دنیا میں رہتے ہوئے تصور بھی نہیں ہو سکتا اور جن کے بعد انسان کو کسی اور چیز کی آرزو نہ ہوگی یہ ہے مطلب لیجزی الذین امنو وعملوا الصالحات بالقسط کا اور اس جگہ کا نام جنت ہے۔

اعمال بد کی سزا

ف۹ اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تو انہیں کفر کی وجہ سے کھولتی ہوئی پینے کی چیز ملے گی۔ اور ان کو دردناک عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا یہ اولین سامان ضیافت کی حیثیت سے ہے یعنی ان کی اول تواضع ان کے اترتے ہی کھولتے پانی سے ہوگی۔ پھر ان کے لیے دردناک عذاب کے دروازے کھول دیئے جائینگے مطلب یہ ہے کہ جن بدنصیبوں کا معاملہ اس زندگی میں کافرانہ ہوگا جن کا اعمال نامہ برائیوں کا اعمال نامہ ہوگا جو اپنی زندگی کا پہلا دور غفلت اور کفر کے ساتھ گذار کر اللہ سبحانہ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔ ان کو یہ زندگی کا دوسرا دور بسر کرنے کے لیے ایک ایسی جگہ دی جائے گی جو ناقابل بیان تکلیفوں اور اذیتوں کی جگہ ہوگی جو ختم ہونے والی نہیں اسی جگہ کا نام جہنم ہے۔

یہ وہ ضرورت ہے جس کی خاطر اللہ سبحانہ انسان کو دوبارہ زندہ کرے گا۔ گویا یہ بتایا گیا ہے کہ یہ اعادہ خلق عقل و انصاف کی رو سے ضروری ہے۔ اور یہ ضرورت اعادہ خلق کے سوا

کسی دوسرے طریقے سے پوری نہیں ہوسکتی ہے۔ اللہ سبحانہ کو اپنا واحد رب مان کر جو لوگ اللہ سے عابدانہ تعلقات استوار کرینگے وہ اس کے مستحق ہیں کہ ان کو اپنے اس بجا طرز عمل کی بھر پور جزا ملے۔ اور جو لوگ حقیقت سے انکار کر کے اس کے خلاف زندگی بسر کریں گے وہ بھی اس کے مستحق ہیں کہ وہ اپنے اس بیجا طرز عمل کا خمیازہ بھگتیں۔ یہ ضرورت اگر موجودہ زندگی میں پوری نہیں ہو رہی ہے تو اسے پورا کرنے کے لیے یقیناً دوبارہ زندگی ناگزیر ہے۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ
نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ
مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ
یَّعْلَمُوْنَ ﴿۵﴾ اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ مَا خَلَقَ
اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ ﴿۶﴾
اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَ رَضُوْا بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ
اطْمَاَنُّوْا بِهَا وَ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ﴿۷﴾ اُولٰٓىِٕكَ
مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۸﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ
عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ یَهْدِیْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِیْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِیْ مِنْ
تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ﴿۹﴾ دَعْوٰىهُمْ فِیْهَا سُبْحٰنَكَ
اللّٰهُمَّ وَ تَحِیَّتُهُمْ فِیْهَا سَلٰمٌ ۚ وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ
ع ۱ ۶ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰﴾

اسی کی ذات گرامی ہے جس نے سورج میں چمک بنائی اور چاند
میں روشنی[1] اور چاند کی منزلوں کا ایک اندازہ قائم کیا[11] تاکہ
تمہیں اپنے حساب کا اور سالوں کی گنتی یعنی تاریخ کا علم ہو جائے[12]

اللہ سبحانہ نے یہ سب کچھ حق کے ساتھ پیدا کیا ہے وہ اہل علم کے لیے دلائل کھول کر بیان کرتا ہے ۵ بلاشبہ رات دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں اور ان تمام چیزوں میں جو اللہ سبحانہ نے آسمان و زمین میں پیدا فرمائی ہیں اہلِ تقویٰ کے لیے دلائل ہیں ۶ یقیناً جو لوگ ہمارے سے ملنے کی امید نہیں رکھتے ہیں اور صرف دنیا کی زندگی میں مگن ہیں اور اسی پر اطمینان کا سانس لے رہے ہیں اور جو لوگ ہمارے دلائل سے غافل ہیں ایسے ہی لوگوں کا ٹھکانا ان کے اعمال کی پاداش میں دوزخ ہے ۸ جو واقعی اس زندگی میں ایمان و عمل صالح کی نعمت سے ہمدوش ہوئے تو ان کی ان کا مالک ان کے ایمان کی وجہ سے رہنمائی فرمائے گا یعنی ایسے آرام کے باغات ان کو ملیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ۹ ان باغات میں ان کی پکار یہ ہو گی اے اللہ تیری ذات پاک ہے ان کی دعا یہ ہو گی کہ سلامتی ہو اور ان کی دعاؤں کا خاتمہ یہ ہو گا کہ ہر طرح کی ستائش اس اللہ کے لیے جو کائنات کا مالک ہے ۱۰

پارہ نمبر ۱۱

مفردات کے معانی

ضیاء چمک، روشنی یہ اجوف وادی اور مہموز اللام ہے مادہ ضوء ہے یہ اصل ضواء ہے واو کسرہ کے بعد ہونے کی وجہ سے ضیاء بن گیا۔ ابوعلی فارسی کا بیان ہے کہ ضیاء دو حال سے خالی نہیں ہے یا تو یہ ضوء کی جمع ہے جیسے سوط کی جمع سیاط اور حوض کی جمع حیاض آتی ہے اور یا مصدر ہے ضاء یضوء ضیاء جیسے صام یصوم صیاماً قام یقوم قیاماً ہے اور ابوعلی نے اس کے جمع ہونے ہی کو زیادہ قرین قیاس بتایا ہے لیکن قرآن کی یہ آیت ھوالذی جعل الشمس ضیاء والقمر نورا میں نور کے مقابلہ میں ضیاء کا آنا مصدر ہونے کی علامت ہے۔ نیز مصدر ہونے کی صورت میں ضیاء بمعنی اسم فاعل بمعنے مضیئۃ بھی ہو سکتا ہے اور زید عدل کے انداز پر مصدر مبالغہ کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔

توحید ربوبیت سے آخرت پر استدلال

توحید چار ہیں توحید وجود، توحید خالقیت توحید ربوبیت توحید الوہیت۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔

توحید وجود اور توحید خالقیت کے موضوع پر مشرکین، یہودی اور عیسائیوں کا نبوت سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ یہ بھی دعوی کیا ہے کہ قرآن کا اعلان ہے کہ توحید کے یہ دونوں درجے ان مقدمات میں سے ہیں جو ان سب کے مسلمات میں سے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن کے مخاطبوں کا قرآن سے توحید وجود اور توحید خالقیت کے موضوع پر کوئی اختلاف نہ تھا۔ ایسے ہی توحید ربوبیت کا بھی ان کو کھلا اعتراف تھا ان کا اگر انکار تھا تو صرف توحید عبادت سے یعنی یگانہ اللہ کی عبادت سے پہلی آیت میں توحید ربوبیت سے توحید عبادت پر استدلال کیا ہے۔ ربوبیت کے سلسلے میں سورج چاند دن رات کا ذکر کیا ہے۔ بتانا یہ ہے کہ جب تم مانتے ہو کہ اس کائنات کا بنانے والا اور بنالے کے بعد چلانے والا ایک اللہ ہے تو پھر یہ کیوں نہیں مانتے کہ تمہاری عابدانہ نیاز مندیوں ہونے کی حیثیت سے وفاداریوں کا بھی وہی مستحق ہے۔ اسی لیے ہر نبی کی دعوت کا شاہکار توحید عبادت ہے۔ عقیدہ توحید عبادت کی حیثیت صرف دعوے اور نعرے کی نہیں ہے بلکہ اس کے کچھ اہم اور بنیادی تقاضے بھی ہیں۔

۱۔ صرف اللہ ہی ہے جس کی رضا جوئی کی انسان کو فکر کرنی چاہیے یہی اسکے سارے اعمال کا اصلی محرک بھی ہونا چاہیے اور اصل مقصد بھی۔

۲۔ سارے اعمال و حرکات صرف اللہ ہی کے لیے مخصوص رکھنے چاہئیں جو اپنی حقیقت یا اپنی صورت کے اعتبار سے پرستش کی قسم کے ہوں سجدہ صرف اسی کو کیا جا سکتا ہے۔ نذر صرف اسی کے نام کی مانی جا سکتی ہے دعا صرف اسی سے کی جا سکتی ہے۔ نادیدہ پناہ صرف اسی کی ڈھونڈی جا سکتی ہے۔ غیبی امداد کے لیے صرف اسی کو پکارا جا سکتا ہے۔

۳۔ وہ جذبات واحساسات بھی اللہ کے لیے خاص کر دینے چاہئیں جن کے اندر بندگی کی روح پائی جاتی ہو توکل صرف اسی پر کیا جائے۔ امیدیں صرف اسی سے باندھی جائیں خوف اسی کا رکھا جائے حقیقی محبت صرف اس سے کی جائے۔

۴۔ اس پوری کائنات کا جس کا ہماری یہ دنیا بھی چھوٹا سا حصہ ہے مقتدر اعلیٰ اللہ سبحانہ ہے۔ حکم دینے منع کرنے اور اپنی مرضی پوری کرانے کا اصل مستحق صرف اللہ ہی ہے حقیقی شارع اور قانون ساز بھی وہی ہے۔

۵۔ اللہ سبحانہ کے سوا کوئی نہیں جو اپنے اندر شان معبودیت رکھتا ہو جو پوجے جانے کا مستحق ہو، جس کی رضا چاہی جائے۔ کوئی اور نہیں جو اس لائق ہو کہ اس کے آگے پیشانیاں جھکیں نذر پیش کی جائیں اعتراف نعمت کیا جائے۔ کوئی اور نہیں جسے ولی اور کارساز، حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے، جس سے دعائیں اور حاجتیں مانگی جائیں اور جسے غیبی مدد کے لیے پکارا جائے۔ کوئی اور نہیں جس پر توکل کیا جائے۔ دل میں جس کا خوف اور تقوی رکھا جائے، جس سے امیدیں وابستہ کی جائیں اور جس سے حقیقی محبت کی جائے۔ کوئی اور نہیں جس کے ہاتھ میں حقیقی اقتدار کا ذرہ بھی ہو۔ جو بال برابر بھی کسی کو نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہو جو کسی کے لیے قانون بنانے اور اپنا حکم چلانے کا ذاتی استحقاق رکھتا ہو اور جس کی بے قید اطاعت جائز ہو۔

توحید کے یہ بنیادی تقاضے اتنی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان میں سے ایک کا انکار بھی اللہ پر ایمان رکھنے کے دعوی کو بے معنی کر دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ساری باتیں عقیدہ توحید عبادت کے اصل مفہوم میں شامل ہیں اور کوئی شخص صحیح معنوں میں مسلمان نہیں ہو سکتا جب

تک کہ یہ عقیدہ اپنے اس پورے مفہوم کے ساتھ اس کے دل میں نہ اتر چکا ہو۔

۱۰ اسی کی ذات گرامی ہے جس نے سورج میں چمک بنائی اور چاند میں روشنی بعض کے نزدیک نور عام سے ضیا ہے۔ ضیا خاص اس نور کو کہتے ہیں جو زیادہ تیز اور چمکدار ہو۔ بعض نے کہا جس کی روشنی ذاتی ہو۔ وہ ضیا ہے اور جس کی دوسرے سے مستفاد ہو وہ نور ہے۔ سورج کی روشنی عالم اسباب میں کسی دوسرے کرے سے حاصل نہیں ہوئی چاند کی روشنی البتہ سورج سے مستفاد ہے اور بعض محققین نے دونوں میں یہ فرق بتلایا ہے کہ نور مطلق روشنی کو کہتے ہیں ضیا اور ضو اس کے انتشار اور پھیلاؤ کا نام ہے۔ سورج کی روشنی کا پھیلاؤ چونکہ زیادہ ہوتا ہے اس لیے ضیا سے تعبیر کیا واللہ اعلم بمرادہ[1]

یہ توحید عبادت کی بھی دلیل ہے اور نظریہ آخرت کی بھی۔ اور زیادہ زور دوسری بات پر ہے ماخلق اللہ ذالک الا بالحق اس کی دلیل ہے کہ انداز بیان آخرت کے لیے بطور دلیل اختیار کیا گیا ہے فرمایا ہے کہ اس کارگاہ ہستی میں جو کام ہر طرف نظر آرہے ہیں جن کے بڑے بڑے نشانات سورج چاند ہیں۔ ان سے ایک طرف اس بات کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ یہ کارخانہ جس کے ہر کام میں نظم ہے حکمت ہے اس کے ذرے کی پیدائش میں ایک گہری مقصدیت پائی جاتی ہے بلاشبہ جب وہ حکیم ہے اور اس کی علامتیں تمہارے سامنے موجود ہیں تو اس سے یہ کیسے توقع رکھتے ہو کہ وہ انسان کو دانا اور ذمہ دار اخلاقی وجود بنانے کے بعد اس کے کارنامہ زندگی کا حساب کبھی نہ لے گا اور عقلی واخلاقی ذمہ داری کی بنا پر جزاو سزا نہ ہوگی۔

دوسری طرف یہ توحید عبادت کی بھی دلیل ہے جس کی ربوبیت نے تمہاری اجسام کی پروردگاری کا بلاشرکت غیر اتنا اہتمام کیا ہے کیا اس کے علاوہ کوئی اور بھی تمہارے نیازمندانہ اعمال اور عبادتوں کا مستحق ہو سکتا ہے، نہیں ہرگز نہیں۔ لا الہ الا ھو سبحانہ عما یشرکون کیا تمہیں نظر نہیں آتا کہ سورج معین نظام الاوقات کے ساتھ نکلتا اور اپنی تابانیوں سے سارے جہاں کو روشن کرتا ہے۔ اس کے ذریعے تمہاری پروردگاری کی خاطر گرمی، سردی خزاں اور بہار کے مختلف موسم پیدا ہو جاتے ہیں جس میں سے ہر ایک دنیا کی زندگی اور اس کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ چاند اس سے نور کا استفادہ کر کے اپنی معین منزلیں طے کرتا اور تاریک راتوں میں مختلف زاویوں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پارہ نمبر ۱۱

شمع برداری کرتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ دنیا خیر و شر اور نیکی و بدی کے امتیاز کے بغیر یوں ہی چلتی رہے گی یا یوں ہی ختم ہو جائے گی۔

چاند کے لیے تقدیر منازل

لے اور چاند کی منزلوں کا ایک اندازہ قائم کیا یعنی روزانہ بتدریج گھٹتا اور بڑھتا ہے والقمر قدرناہ منازل حتی عاد کالعرجون القدیم علمائے ہیئت نے اس کے دورے کی تقسیم کر کے اٹھائیس منزلیں مقرر کی ہیں جو بارہ برجوں پر تقسیم ہیں۔ قرآن میں خاص ان کی مصطلحات مراد نہیں مطلق سیر و سیاحت کے مدارج مراد ہیں لے مطلب یہ ہے کہ نظام خلقت اس کی شہادت دے رہا ہے کہ یہاں کوئی بات بغیر حکمت و مصلحت نہیں ہے۔ سورج کو دیکھو جس کی درخشندگی سے تمام ستارے روشنی حاصل کرتے ہیں چاند کو دیکھو جس کی گردش ۲۸ منزلیں مقرر کر دی ہیں۔ یعنی چاند کے لیے یکے بعد دیگرے وارد ہونے کی منزلیں اندازہ کر کے ٹھہرا دی ہیں۔ سورہ یٰسین کی آیت ۳۹ ان منزلوں کی طرف اشارا ہے مختصر ان منازل کا مطلب سمجھ لینا چاہیے۔

چاند زمین کے گرد گردش میں رہتا ہے اور اپنی گردش کے فلک کو ۲۷ دن ۷ گھنٹوں اور ۴۳ منٹ میں پورا کرتا ہے۔ اس دور کو علمائے ہیئت چاند کے نجومی دور سے یا نجومی مہینہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیونکہ اس دور کے ختم ہونے پر چاند پھر اسی ستارہ کے قریب دکھائی دیتا ہے جس کے پاس سے اس کی گردش شروع ہوئی تھی۔ نیز اپنی گردش کی ہر رات میں وہ کسی نہ کسی ستارے یا ستاروں کے مجموعہ کے پاس ضرور پہنچ جاتا ہے۔ اور وہ گویا اس کی گردش کے لیے ہر روز کی ایک منزل بن گیا ہے۔ وہ ہمیشہ ایک خاص منزل سے سفر شروع کرتا ہے ہر روز کی مقررہ منزل میں نمایاں ہوتا ہے اور پھر وہیں پہنچ جاتا ہے جہاں زمین کا چکر شروع کیا تھا۔

اس طرح ۲۷ دن ۷ گھنٹے کی مدت نے ۲۸ منزلیں بنا دیں جب ہم ۳۶۰ کے درجوں کو جو کامل دور کی مقررہ مقدار ہے ۲۸ راتوں پر تقسیم کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ چاند ہر دن میں تقریباً ۱۳ درجہ مسافت اپنے فلک کی طے کرتا ہے۔ تقریباً اس لیے کہا گیا ہے کہ حساب میں کچھ دقیقے زیادہ ہوتے ہیں۔

لے افادات شیخ الاسلام

معلوم ہوتا ہے کہ مطالعہ اور ضرورت کی یکساں حالت نے مختلف قوموں کو اس نتیجے تک پہنچا دیا تھا۔ ہندوستان میں ان منازل کے لیے نچھتر کا لفظ اختیار کیا تھا اور ستائیس نچھتر قرار دیئے گئے تھے جو اسونی سے شروع ہوتے اور ریوتی پر ختم ہوتے ہیں۔ جنہوں نے اٹھائیس منزلیں بتائی تھیں اور اسے سیو کہتے تھے۔ بابل و آشور کے باشندوں نے شاید سب سے پہلے اس کا سراغ لگایا۔ اور مجوسیوں کی ایک مذہبی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی بھی اس سے بے خبر نہ تھے۔

یہ نہیں کہا جاسکتا کہ عرب جاہلیت نے مجاور قوموں سے یہ حساب معلوم کیا یا بطور خود اس نتیجہ تک پہنچے تھے۔ حکمار اسلام نے ان منزلوں کو بطلیموسی کے نقشہ مندرجہ مجسطی سے تطبیق دی تھی۔

ان منزلوں کے عربی نام یہ ہیں۔

الشرطان[۱] - البطین[۲] - الثریا[۳] - الدبران[۴] - الھقعہ[۵] - الھنعہ[۶] - الذراع[۷] - النثرہ[۸] - الطرف[۹] - الجبھہ[۱۰] - الزبرہ[۱۱] - الصرفہ[۱۲] - العواء[۱۳] - السماک الاعزل[۱۴] - الغفر[۱۵] - الزبانی[۱۶] - الاکلیل[۱۷] - القلب[۱۸] - الشولہ[۱۹] - النعائم[۲۰] - البلدہ[۲۱] - سعد الذابح[۲۲] - سعد بلع[۲۳] - سعد السعود[۲۴] - سعد الاخبیہ[۲۵] - الفرغ الاول[۲۶] - الفرغ الثانی - بطن الحوت[۲۷]۔

الفرغ الاول اور الثانی فرغ الدلو المقدم اور فرغ الدلو المؤخر کہتے ہیں اور بطن الحوت کو الرشا بھی کہتے ہیں[۱]

اوقات شناسی کا پیمانہ

[۲] تاکہ تمہیں اپنے حساب کا اور سالوں کی گنتی یعنی تاریخ کا علم ہو جائے۔ یعنی برسوں کی گنتی اور مہینوں اور دنوں کے چھوٹے موٹے حساب سب چاند سورج کی رفتار سے وابستہ کر دیئے ہیں۔ اگر چاند سورج نہ ہوں تو دن رات قمری اور شمسی مہینے اور سال وغیرہ کیسے متعین ہوں۔ حالانکہ علاوہ دنیوی زندگی اور معاشی کاروبار کے بہت سے احکام شرعیہ میں بھی تعین اوقات کی ضرورت ہے[۲] انسان کی نگاہ کے لیے آسمان کی کوئی چیز بھی اس درجہ نمایاں اور پرکشش نہیں جس قدر سورج

---

[۱] ترجمان قرآن

[۲] افادات شیخ الاسلام

اور چاند کا طلوع و غروب ہے۔ کیونکہ ان ہی ستاروں نے بغیر کسی کاوش و پیچیدگی کے اسے اوقات شماری کا راز بتلا دیا۔ اس نے سورج دیکھا کہ سورج نکلتا ہے اور پھر گھٹتے گھٹتے چھپ جاتا ہے بس اسے یہ اندازہ مقرر کر لیتے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ یہ ایک معین وقت ہے جس میں کبھی خلل واقع نہیں ہو سکتا اور اسے ایک دن ٹھہرا لینا چاہیے۔ پھر اس نے چاند دیکھا اور فوراً معلوم کر لیا کہ اس کے طلوع و غروب کا بھی ایک اندازہ مقرر ہے وہ ایک خاص زمانے تک دکھائی دیتا ہے پھر غائب ہو جاتا ہے۔ پھر نمایاں ہو کر بڑھنے گھٹنے لگتا ہے اس سے اوقات شماری کا دوسرا پیمانہ بھی اسے معلوم ہو گیا اور اس نے چاند کے چھپنے اور نکلنے کی مدت کو مہینہ ٹھہرا لیا۔ یہی مطالعہ جب آگے بڑھا تو معلوم ہوا ہر رات چاند آسمان کے کسی نہ کسی ستارے کے پاس دکھائی دیتا ہے اور یہ نظارہ ایسا ہے جس میں کبھی فرق نہیں پڑتا۔ ان ہی ستاروں سے اس کی روزانہ کی منزلیں بن گئیں۔

اس آیت کی پہلی آیت سے پیوندکاری یعنی لتعلموا عدد السنین کو قدرہ کے متعلق بنانے سے یہ نشاندہی ہوتی ہے کہ امت اسلامیہ اپنے معاملات اور احوال قمری مہینوں سے وابستہ رکھے۔ اور دن کا پتہ نہیں مگر میرا اپنا خیال یہی ہے کہ قرآن کے اسی اشارے سے دب کر حضرت عمر اور صحابہ کرام نے شمسی مہینوں کو نظر انداز کر کے قومی سنہ کی ضرورت کے موقعہ پر قمری حساب اختیار کیا تھا۔ حالانکہ ان کے سامنے رومی، ایرانی حساب تاریخ کا موجود تھا۔ علامہ مقریزی نے رومی اور ایرانی تاریخوں کو نظر انداز کرنے کی عجیب توجیہ کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

> حضرت عمر اور صحابہ کرام نے ایرانی اور رومی تاریخ پسند نہیں کی کیونکہ دونوں کے حساب میں کبیسہ تھا یعنی دورہ ارضی کی کسر پوری کرنے کے لیے چند سال کے بعد مہینوں کے دنوں میں کمی بیشی جس طرح کہ تقویم گریگوری میں ہر چوتھے سال ایک دن کی کمی بیشی کر دی گئی ہے۔ چونکہ اسلام نے نسی سے روکا تھا اور کبیسہ پر نسی کا شبہ ہو سکتا تھا اس لیے مناسب نہ تھا کہ ایسا طریقہ اختیار کیا جاتا۔

مورخ موصوف کو یہ دور از کار دقیقہ سنجی اس لیے کرنی پڑی کہ قومی تقویم کی ضرورت کے لیے ان کے ذہن میں کوئی جگہ نہ تھی اور قدرہ منازل لتعلموا کے اشارے کی طرف ان کا ذہن نہیں گیا۔ اگر ان کے ذہن میں قرآن کا یہ اشارا ہوتا تو وہ کہہ دیتے کہ رومی اور ایرانی تاریخ

کا تعلق شمسی مہینوں سے تھا اور قرآن کا اشارا قمری مہینوں کی طرف تھا اس لیے صحابہ نے رومی اور ایرانی تاریخ سے اجتناب کیا۔ علامہ مقریزی کا ذہن چونکہ اس تعلیل سے خالی تھا اس لیے ناچار نسی کی شرعی ممانعت کی وادی میں پہنچ گئے حالانکہ کسی اعتبار سے یہ تعلیل لائق اعتنا نہیں ہے کیونکہ نسی مصطلحہ جاہلیت اور کبیسہ مصطلحہ حساب قطعاً دو مختلف چیزیں ہیں۔

کبیسہ اور نسی میں فرق

جس نسی کو قرآن نے حرام قرار دیا اور کفر کی زیادتی سے تعبیر کیا وہ بلا شبہ قمری مہینوں کی طبعی ترتیب کو اس طرح درہم برہم کر دیتا تھا کہ کبھی شعبان محرم بن جاتا اور کبھی رمضان ذوالحجہ قرار دیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ فرائض و عبادات کے مقررہ اوقات الٹ پلٹ ہو جاتے اور ان کے تعین و تقرر کی اہمیت و مصلحت باقی نہیں رہتی تھی لیکن کبیسہ بالکل دوسری چیز ہے اس کا مقصد دوسرا ہے اس کے اجزا کے نتائج دوسرے ہیں۔ اس کا کوئی اثر اس طرح کا مرتب نہیں ہوتا وہ محض اس لیے ہے کہ سال بھر کے تین سو ساٹھ دن قرار دے دینے کے بعد جو کسر رہ جاتی ہے اسے کچھ عرصہ کے بعد پورا کر دیا جائے تاکہ زیادہ مدت گذر جانے کے بعد مہینوں اور برسوں کا فرق نہ پڑ جائے۔ لہٰذا کسی طرح بھی یہ بات تسلیم نہیں کی جا سکتی ہے کہ حضرت عمر اور صحابہ نسی کی حقیقت سے بے خبر ہوں کہ شمسی تقویم کے کبیسہ کو قمری تقویم کا نسی سمجھ لیں۔ حضرت عمر کے بارے میں تو امام شعبی نے صرف یہ بات بتائی تھی ولم یحب التاریخات القدیمۃ یعنی حضرت عمر ایک تاریخ کے تعین کی ضرورت محسوس کر رہے تھے مگر پسند نہیں کرتے تھے کہ قدیم تاریخیں اختیار کریں اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ ایرانی اور رومیوں کی شمسی تقویم کو پسند نہ کرتے تھے۔ اس ناپسندیدگی کی وجہ میرے خیال میں اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ انہوں نے قرآن کے اشارے سے قمری تقویم کا رجحان معلوم کر لیا تھا۔

بہرحال حضرت عمر نے تقویم شمسی کو چھوڑ کر تقویم قمری کو اختیار کیا اور تقویم قمری میں قومی تاریخ کی تعیین کے لیے واقعہ ہجرت کو مبدا بنایا واقعہ ہجرت کو قومی اور اسلامی تاریخ بنانے کی اہمیت پر معالم القرآن کی جلد عاشر میں تفصیلی تبصرہ آچکا ہے۔ اس موضوع پر باقی مباحث انشاءاللہ معالم القرآن کی جلد ۳۲ میں آئے گی۔

کائنات کی تخلیق بامقصد ہے

[1] اللہ سبحانہ نے یہ سب کچھ حق کے ساتھ پیدا کیا ہے وہ اہل علم کے لیے دلائل مفصل بیان کرتا ہے یعنی فلکیات کا سلسلہ یوں ہی کیف ما اتفق نہیں بلکہ عظیم الشان نظام و تدبیر کے ماتحت اور ہزار ہا فوائد و حکم پر مشتمل ہے اور سمجھ دار لوگ مصنوعات کے اس نظام کو دیکھ کر خداوند قادر و حکیم کی ہستی کا سراغ پا لیتے ہیں۔ اور مادیات کے انتظام سے روحانیات کے متعلق بھی اندازہ کر لیتے ہیں کہ وہاں کی دنیا میں کیسے کیسے چاند سورج اللہ نے پیدا کئے ہیں ان کو ہی انبیاء و مرسلین کہہ دیجیے مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ اس پوری کائنات کو بے مقصد نہیں پیدا کیا بلکہ بامقصد بنایا ہے۔ ہر کام میں نظم ہے حکمت ہے مصلحتیں ہیں۔ ذرے ذرے کی پیدائش میں ایک مقصدیت پائی جاتی ہے یہ صحیح انسانی فطرت کا اعتراف ہے کہ جو عاقل اس نظام کائنات پر غور کرتا ہے وہ پکار اٹھتا ہے ربنا ما خلقت ھذا باطلا کہ یہ کارخانہ بے مقصد اور باطل نہیں ہے بلکہ ایک عظیم غایت کے ساتھ وجود میں آیا ہے اور یہ غایت مقتضی ہے کہ یہ ایک ایسے انجام پر منتج ہو جو حق اور باطل کے درمیان پورے انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دے اور ہر ایک کو اس کے اعمال کے مطابق جزا یا سزا دے۔

خلق السماوات والارض بالحق کی تعبیر اس لیے اختیار کی گئی ہے کہ نزول قرآن سے پہلے تمام پیروان مذاہب نے دنیا کی پیدائش کا جو نقشہ کھینچا تھا وہ حکمت و مصالح کے تصور سے خالی تھا۔ لوگ خیال کرتے تھے کہ طاقت و اختیار کے ساتھ حکمتوں اور مصلحتوں سے ہم آہنگی نہیں ہو سکتی ہے حکمتوں اور مصلحتوں کی پابندی وہی کرے گا جو کسی کے آگے جوابدہ ہو گا اللہ سبحانہ جو سب سے بڑا اور سب پر حکمران ہے اس کے کام مصالح سے کیوں وابستہ ہوں؟ وہ مطلق العنان بادشاہوں کو دیکھتے تھے کہ جو جی میں آتا ہے کر گزرتے ہیں۔ اور ان کے کاموں میں چوں و چرا کی گنجائش نہیں ہوتی۔ ان کا خیال تھا کہ اللہ سبحانہ کے کاموں کا بھی یہی حال ہے۔ ہندوستان، مصر، بابل اور یونان کی تمام علم الاصنامی روایات اسی تخیل کا نتیجہ ہیں۔ دیوتاؤں نے عشق بازی میں رنگ رلیاں منائیں اور ستارے پیدا ہو گئے۔ کسی دیوتا نے شکار کھیلتے ہوئے تیر مارا پہاڑ پیدا ہو گیا ایک

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دیوتا نے اپنی جٹا کھول دی دریا وجود میں آگیا۔ اصنام پرست قوموں کے علاوہ یہودیوں اور عیسائیوں کے خیالات بھی ابتداء سے ہی عقلی تصورات سے خالی تھے۔ یہودیوں کا خیال تھا کہ ایک مطلق العنان اور مستبد بادشاہ کی طرح اللہ سبحانہ کے افعال بھی حکمتوں اور مصلحتوں کی جگہ محض جوش وہیجان کا نتیجہ ہیں۔ وہ غصہ میں آ کر قوموں کو ہلاک کر دیتا ہے اور جوش محبت میں آ کر کسی خاص قوم کو اپنی چہیتی بنا تا ہے۔ بلا شبہ عیسائی قوم کا مایہ ضمیر رحم ومحبت ہے لیکن حکمتوں اور مصلحتوں کے لیے اس میں جگہ نہ تھی کفارہ کے اعتقاد کے ساتھ حکمتوں اور مصلحتوں کا اعتقاد نشوونما نہیں پا سکتا۔

قرآن تاریخ مذاہب میں پہلی کتاب ہے جس نے اللہ سبحانہ کی صفات وافعال کے لیے عقلی تصور قائم کیا۔ اور یہ حقیقت واضح کی حکمتوں اور مصلحتوں کی رعایت منافی قدرت نہیں بلکہ محاسن قدرت میں سے ہے بلا شبہ اللہ سبحانہ جو چاہے کر سکتا ہے لیکن اس کی حکمت وعدالت کا تقاضا یہی ہے کہ جو کچھ کرتا ہے حکمت ومصلحت کے ساتھ کرتا ہے۔

اسی اصل کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ سبحانہ نے تخلیق کائنات کا جو نقشہ بنایا وہ سرتاسر عقلی نقشہ ہے یعنی حکمت وعلت اور نظم واتقان کا نقشہ ہے اور اسی لیے اللہ سبحانہ نے جابجا تخلیق بالباطل کے خیال کو کفر قرار دیا ہے۔

وما خلقنا السماء والارض وما بينهما باطلا ذالك ظن الذين كفروا۔

ہم نے آسمان وزمین کو اور جو کچھ اس کے درمیان ہے بغیر حکمت ومصلحت کے نہیں بنایا۔ یہ خیال کہ ہم نے بغیر حکمت پیدا کیا۔ ان لوگوں کا گمان ہے جنہوں نے راہ کفر کو اپنایا ہے۔

دن اور رات کے اختلاف کی رہنمائی

۶ بلا شبہ رات دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے میں اور ان تمام چیزوں میں جو اللہ سبحانہ نے آسمان وزمین میں بنائی ہے اہل تقویٰ کے لیے دلائل ہیں بلا شبہ دنیا کی ہر چیز چھوٹی یا بڑی میں خدا کی ہستی اور وحدانیت کے دلائل موجود ہیں۔

وفى كل شىء له اية تدل على انه واحد

سورۂ بقرہ میں سیقول کے ربع کے قریب ایک آیت گذر چکی جس میں زیادہ بسط کے ساتھ

ان نشانہائے قدرت کا بیان ہوا ہے۔
یہ آیت بھی جیسے توحید عبادت کے لیے دلیل ہے ایسے ہی عقیدہ آخرت کے لیے بھی دلیل ہے
توحید کی یہ آیت اس طرح دلیل ہے کہ یہ اللہ کی ذات ہے کہ جس نے رات دن کا نظام قائم کیا ہے۔ کبھی رات بڑی ہے دن چھوٹا ہے کبھی رات چھوٹی ہے اور دن بڑا ہے۔ گویا تاریکی اور روشنی ہی کا اختلاف نہیں بلکہ تاریکی اور روشنی کی کیمیت کا اختلاف اور اس اختلاف کے نتیجے میں موسمیاتی اختلاف بھی اسی کا قائم کردہ ہے اس اختلاف میں حکمت الٰہی کی کتنی ہی نشانیاں موجود ہیں یہ بات کہ شب و روز کی آمد و شد کی دو مختلف حالتیں ٹھہرا دی گئی ہیں اور وقت کی نوعیت ہر معین مقدار کے بعد بدلتی رہتی ہے زندگی کے لیے بڑی ہی تسکین و دل لگی کا ذریعہ ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور وقت ہمیشہ ایک ہی حالت پر رہتا۔ تو زندگی دشوار ہو جاتی قطبین کے اطراف میں جہاں شب و روز کے اختلاف کا کوئی نام و نشان نہیں وہاں اس اختلاف کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے الغرض دن رات کا یہ اختلاف منہ بولتی گواہی ہے اس بات کے لیے کہ اس کائنات میں اللہ کے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں ہے۔

عقیدہ آخرت کی یہ دلیل اس طرح ہے کہ کائنات میں اللہ سبحانہ کے جو ہر طرف نظر آ رہے ہیں جن میں لیل و نہار کی گردش بھی ہے۔ اس سے اس بات کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ دن رات کی یہ گردش بے غایت و بے مقصد نہیں ہے بلکہ ایک عظیم نتیجہ پر ختم ہونے والی ہے۔ اس طرح ان آیات میں عقیدہ آخرت پیش کرنے کے ساتھ تین دلیلیں منطقی ترتیب سے پیش کر دی گئی ہیں پہلی یہ کہ دوسری زندگی ممکن ہے کیونکہ پہلی زندگی واقعہ کی صورت میں موجود ہے۔ جیسے دن کے ساتھ رات ہے ایسے ہی پہلی زندگی کے ساتھ دوسری زندگی بھی ہے اسے قرآن نے تزویج سے تعبیر کیا ہے ہم اسے قانون تثنیہ بھی کہتے ہیں یعنی ہر چیز کے دو دو ہونے یا متقابل و متماثل ہونے کی حقیقت کام کر رہی ہے۔ یا یوں کہا جائے اپنا کوئی نہ کوئی مثنی رکھتی ہے رات کے لیے دن ہے صبح کیلئے شام ہے نر کے لیے مادہ ہے مرد کے لیے عورت ہے زندگی کے لیے موت ہے جب دنیا میں ہر چیز اپنا کوئی نہ کوئی مقابل رکھتی ہے ضروری ہے کہ دنیوی زندگی کے لیے بھی کوئی متقابل اور مثنی زندگی ہو۔ دنیا کی زندگی کے لیے متقابل زندگی آخرت کی زندگی ہے۔

منکرین آخرت کی چار حالتیں

۷ یقیناً جو لوگ ہمارے سے ملنے کی امید نہیں رکھتے ہیں اور صرف دنیا کی زندگی میں مگن ہیں اور

اسی پر اطمینان کا سانس لے رہے ہیں اور جو لوگ ہمارے دلائل سے غافل ہیں ایسے ہی لوگوں کا ٹھکانا ان کے اعمال کی پاداش میں دوزخ ہے یعنی دنیا کی زندگی میں ایسا دل لگایا کہ آخرت کی اور خدا کے پاس جانے کی کچھ خبر ہی نہیں رہی۔ اسی چند روزہ زندگی کو مقصود و معبود بنا لیا اور قدرت کی جو نشانیاں اوپر بیان ہوئیں۔ ان میں کبھی غور و تامل نہیں کیا کہ ایسا مضبوط اور حکیمانہ نظام یوں ہی بیکار نہیں بنایا گیا۔ ضرور اس سارے کارخانہ کا کوئی مقصد ہوگا پھر جس نے پہلی مرتبہ ایسی عجیب و غریب مخلوقات پیدا کر دی اس کو دوبارہ کرنا کیا مشکل ہے اب ان کو دل و دماغ سے زبان سے ہاتھ پاؤں سے جو کچھ انہوں نے کمائی کی اس کا بدلہ دوزخ کی آگ ہے[1]

اس آیت میں چند گنے چنے لفظوں میں حقیقت حال کی پوری تصویر آگئی ہے کوئی گوشہ بھی باقی نہیں رہا۔ ساتھ ہی وجود آخرت کے تمام دلائل بھی نمایاں ہو گئے۔ منکرین آخرت کی ذہنیت کی چار حالتیں ہیں۔ اول یہ اللہ سے ملنے کی کوئی توقع نہیں۔ یہ صرف دنیوی زندگی میں مگن ہیں۔ اسی اس حالت کے خلاف ان میں کوئی خلش نہیں ہوتی ہے اس پر مطمئن ہیں۔ ان کا ذہن اس درجہ ماؤف ہو گیا کہ اللہ سبحانہ کی قدرت کی جو نشانیاں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کو بیدار نہیں کر سکتی ہیں وہ یک قلم غافل ہو گئے ان میں سے ہر بات نہ صرف بیان حال ہے بلکہ بجائے خود ایک دلیل بھی ہے۔ یہی قرآن کی معجزانہ بلاغت ہے۔

یہ آیت بتا رہی ہے کہ انسان کا اس زندگی میں انفرادی انداز زندگی اور اجتماعی کبھی اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک یہ شعور اور یہ یقین انسانی سیرت کی بنیاد میں استوار نہ ہو کہ ہم اللہ سبحانہ کے سامنے اس زندگی میں کئے ہوئے اعمال کے لیے جواب دہ ہیں سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ کہ اس شعور و یقین کے غائب یا کمزور ہوتے ہی انسانی کردار برائی کی راہ پر چل پڑتا ہے۔ اگر عقیدہ آخرت واقعہ نہ ہوتا اور اس کا انکار حقیقت کے خلاف نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ اس اقرار و انکار کے یہ نتائج ایک لزدلی شان کے ساتھ مسلسل ہمارے تجربہ میں آتے۔ ایک ہی چیز سے بہم صحیح نتائج کا ظاہر ہونا اور اس کے نہ ہونے سے نتائج کا ہمیشہ غلط ہونا اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ عقیدہ آخرت بجائے خود صحیح ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ایمان بالیوم الآخر

قرآن میں ایمان باللہ کے بعد ایمان بالیوم الآخر ایک بنیادی عقیدہ ہے لیکن قرآن نے مذاہب کی عام شاہراہ سے ہٹ کر ایمان بالیوم الآخر کا تصور پیش کیا ہے۔ قرآن ایمان بالیوم الآخر کو اس کائنات کے عالمگیر قوانین سے الگ نہیں بلکہ اسی کے ماتحت کر کے پیش کرتا ہے۔

قرآن کا موقف ہے کہ جیسے دنیا میں ہر چیز کے خواص اور ہر حادثہ کے نتائج ہیں ایسے ہی انسانی اعمال کے بھی خواص و نتائج ہیں۔ اور مادیات کی طرح معنویات کے قوانین بھی کام کر رہے ہیں۔ دنیا اگر ایک مادی مقام ہے اور یہاں مادہ ہی ارتقا کی منزلیں طے کر رہا ہے تخلیق بر تخلیق ہو رہی ہے۔ دانہ گندم زمین میں ڈالا جاتا ہے گندم سے اجسام چل رہے بڑھ رہے ہیں۔ ضروری ہے کہ اعمال سے ہی اجسام کی تخلیق ہو۔ اعمال کی تخلیقات کا نام جنت و دوزخ ہے اچھے اعمال سے جنت کی اور بُرے اعمال سے جہنم کی۔ پھر دونوں طرح کی زندگیوں کے احوال و داردات ہیں جنہیں جابجا قرآن میں مختلف اسلوبوں سے بیان کیا گیا ہے۔

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ یہ کیونکر اور کیسے ہو گا؟

اس بارے میں ہم اپنی عقل سے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے کیونکہ عالم آخرت ہمارے ادراک کی سرحد سے باہر ہے جس مقام کا ہم ادراک ہی نہیں کر سکتے۔ وہاں کے حالات کے بارے میں حکم کیسے لگائیں۔

اب آپ کے ذہن میں یہ سوال خود بخود چٹکیاں لے گا کہ پھر اس پر ہم یقین کیوں کریں؟ اس لیے کہ ہم وجدانی طور پر محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے محسوسات کے دائرے سے باہر بھی ایک حقیقت موجود ہے۔ اگر اس حقیقت کا انکار کریں تو اس کائنات کے مسئلہ کا کوئی حل باقی نہیں رہتا اور خود ہماری عقل کہتی ہے کہ ایسا نہ ہونا چاہیے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زندگی کے لیے اگر اللہ سبحانہ کی ہستی کو مبدأ اور آخرت کی زندگی کو معاد تسلیم نہ کیا جائے تو اس زندگی کے سارے سوالات لاینحل ہو جاتے ہیں لیکن جونہی زندگی کے اسی کے دونوں سرے ہم مانتے ہیں تو سارے سوالات حل ہو جاتے ہیں۔ اور مجبولیت کی تاریکی کی جگہ عرفان و بصیرت کی روشنی ہر طرف نمایاں ہو جاتی ہے۔ لہذا ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ یہ نقطہ بنیادی نہیں حقیقی ہے۔

لطف و مسرت کی اعلیٰ ترین منزل

ف ۱ واقعی اس زندگی میں جو ایمان و عمل صالح کی نعمت سے ہمدوش ہوئے تو ان کی ان کا مالک ان کے ایمان کی وجہ سے رہنمائی فرمائے گا یعنی ایسے آرام کے باغات ان کو ملیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یعنی اللہ سبحانہ ان کے ایمان کی بدولت جنت تک اصل رہنمائی کرنے والی ایمان ہے نقطہ آغاز بھی ہے۔ اعمال صالحہ مراتب و مقامات کا ذریعہ ہیں اسی لیے یہاں یہدیھم کے ساتھ صرف ایمان کا ذکر کیا ہے دوسری آیتوں میں ایمان اور عمل صالح کے بالمقابل جنت اور اس کی نہروں کا ذکر پابندی سے آتا ہے اس سے خیال ادھر جاتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی تمثیلی تعلق ہے یہ ظاہر ہے کہ درخت میں اصلی چیز جڑ ہے جس کی ترقی اور نشوونما پانی سے ہوتی ہے بعینہ اسی طرح ایمان اصل ہے جس کی جڑوں کی سیرابی اعمال صالحہ کی آبیاری سے ہوتی ہے اگر ایمان ہو اور اعمال صالحہ نہ ہوں تو وہ ایک ایسا درخت ہوگا جس کی ترقی و نشوونما کی امید نہیں اور اگر صرف عمل صالح ہو اور ایمان نہ ہو تو دیگ میں پانی کی روانی ہے جس کا ہونا نہ ہونا دونوں برابر ہیں۔

آلوسی لکھتے ہیں کہ آیت میں ایمان سے مراد وہ ایمان ہے جس کی آغوش میں عمل صالح ہو الایمان الخاص المشفوع بالاعمال الصالحات لا المجرد عنہا۔ اور آگے فرماتے ہیں کہ اس موضوع پر دو رائیں نہیں ہیں۔ اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کا ابھی چہرہ پیش کیا جا چکا ہے یعنی لیجزی اللہ الذین امنوا وعملوا الصالحات بالقسط۔ یہی لوگ ہیں جن کی ان کا رب جنت کی طرف ان کے ایمان کی وجہ سے رہنمائی فرمائے گا۔ قاضی بیضاوی نے خواہ مخواہ زمخشری کے منہ سے نکلی ہوئی اس بات پر کہ آیت میں ایمان سے مراد وہی ایمان جو عمل صالح کی ہمرکابی میں ھو المقید بالعمل الصالح اعتزال کی پھبتی کس دی خدا بھلا کرے علامہ آلوسی اور علامہ خفاجی کا کہ انہوں نے قاضی صاحب کی پھبتی کو بے جان بنا دیا۔ بہرحال یہ نتائج جو اس آیت میں بیان ہوئے ہیں اس ایمان کے نہیں جو محض مان لینے کے معنی میں ہوتا ہے بلکہ اس ایمان کے جو سیرت و کردار کی روح بن جائے اور جس کی طاقت سے اخلاق و اعمال میں صلاح کا ظہور ہونے لگے۔ اپنی جسمانی زندگی میں آپ خود دیکھتے ہیں کہ بقائے حیات تندرستی قوت کار اور لذت زندگانی کا حصول صحیح قسم کی غذا پر موقوف ہوتا ہے لیکن یہ نتائج اس تغذیہ کے نہیں ہوتے جو محض کھا لینے کے معنی میں ہو بلکہ اس تغذیہ کے ہوتے ہیں جو ہضم ہو کر خون بنے اور رگ رگ میں پہنچ کر ہر

حصہ جسم کو وہ طاقت بخشے جس سے وہ اپنے حصے کا کام ٹھیک کرنے لگے۔ بالکل اسی طرح اخلاقی زندگی میں بھی ہدایت راستبازی راست روی اور بالآخر فلاح و کامیابی کا حصول صحیح ایمان پر موقوف ہے مگر یہ نتائج ان ایمان کے نہیں ہیں جو محض اقرار کے درجے میں ہو بلکہ اس ایمان کے ہیں جو نفس کے اندر جذب و پیوست ہو کر انداز فکر اور مذاق طبع اور افتاد مزاج بن جائے اور سیرۃ و کردار اور روبہ زندگی کی صورت میں نمایاں ہو۔ اللہ سبحانہ کے قانون طبیعی ہیں وہ شخص جو کھا کر نہ کھانے والے کی طرح رہے ان انعامات کا مستحق نہیں ہوتا جو کھا کر ہضم کرنے والے کے لیے رکھے گئے ہوں پھر کیوں توقع کی جائے کہ اس کے قانون اخلاقی میں وہ شخص جو مان کر نہ ماننے والوں کی طرح رہے ان انعامات کا مستحق ہو سکتا ہے جو مان کر صالح بننے والے کے لیے رکھی گئی ہیں۔

جنتیوں کی بے مثال زندگی

ان باغات میں اہل جنت کی پکار یہ ہو گی اے اللہ تیری ذات پاک ہے ان کی دعا بوقت ملاقات یہ ہو گی کہ سلامتی ہو اور ان کی دعاؤں کا خاتمہ یہ ہو گا کہ ہر طرح کی ستائش اس اللہ کے لیے جو کائنات کا مالک ہے یعنی جنت کی نعمتوں اور اللہ سبحانہ کے فضل واحسان کو دیکھ کر سبحان اللہ پکار اٹھیں گے اور جب اللہ سبحانہ سے کچھ مانگنے کی خواہش ہو گی مثلاً کوئی پرندہ یا پھل دیکھا اور ادھر رغبت ہوئی تو سبحانک اللھم کہیں گے۔ اتنا سنتے ہی فرشتے وہ چیز فوراً حاضر کر دیں گے۔ گویا یہی ایک لفظ تمام دعاؤں کے قائم مقام ہو گا۔ دنیا میں بھی بڑے آدمیوں کے یہاں دستور ہے کہ مہمان اگر کسی چیز کو پسند کر کے صرف تعریف کرے تو غیور میزبان کوشش کرتا ہے کہ وہ چیز مہمان کے لیے مہیا کر دے اور جنتی ملاقات کے وقت ایک دوسرے کو سلام کہیں گے جیسے دنیا میں مسلمانوں کا دستور ہے نیز فرشتوں کا جنتیوں کو سلام کرنا بلکہ خود اللہ سبحانہ کی طرف سے تحفہ سلام کا قرآن میں منصوص ہے سلام قولاً من رب رحیم اور والملائکۃ یدخلون علیہم من کل باب سلام علیکم بما صبرتم اور جب جنت میں پہنچ کر دنیوی تفکرات و کدورات کا خاتمہ ہو جائے اور محض سبحانک اللھم کہنے پر ہر چیز حسب خواہش ملتی رہے تو ان کی ہر دعا کا خاتمہ الحمد للہ رب العالمین پر ہو گا[1] حضرت مولانا اشرف علی فرماتے ہیں کہ سبحانک اللھم کا نعرہ بے اختیار اس وقت زبانوں پر آئے گا جب وہ

[1] افادات شیخ الاسلام

عجائبات جنت کا دفعۃ معائنہ کریں گے اور تحیت وسلام اس وقت ہوگا جب وہ ایک دوسرے کو دیکھیں گے اور ملیں گے اور باہم مخاطب ہوں گے اور الحمد للہ رب العالمین اس وقت کہیں گے جب وہ اطمینان سے بیٹھیں گے اور دنیا کی فانی لذتوں کا مقابلہ وہاں کے دائمی عیش و سرور سے کریں لفظ دعوی دونوں جگہ دعا یا پکار کے معنی میں ہے ۔

یہاں یہ بات ضرور سمجھ لینی چاہیے کہ جب جنت اور دوزخ کے شہریوں کے احوال و واردات سنتے ہیں تو قدرتی طور پر ان کی وہی شکل سامنے آتی ہے جو اس موجودہ زندگی کے محسوسات کے لحاظ سے ہوسکتی ہے لیکن خود قرآن وسنت کی تصریحات نے ہمیں بتا دیا ہے کہ جنت و دوزخ کے معاملات کو اس دنیا کی طرح نہ سمجھنا چاہیے سورہ سجدہ میں ہے ۔ فلا تعلم نفس من قرۃ اعین کوئی جان نہیں جانتی ہے کہ اس کی نیک عملیوں کی جزا میں نگاہ کا کیا سرور پردۂ غیب میں پوشیدہ ہے اس سے معلوم ہوا کہ جنت کی راحت و سرور کی حقیقت کا ہم اس دنیا میں تصور بھی نہیں کر سکتے ۔ ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی یہ حقیقت بتلائی ہے لاعین رات ولا اذن سمعت ولا خطر ببال بشر نہ تو کسی آنکھ نے دیکھی نہ کسی کان نے سنی نہ کسی فرد بشر کے خیال میں گذری ۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ جنت کی نعمتیں دنیا سے کوئی مشابہت نہیں رکھتیں بجز اس کے نام میں مشارکت ہے (ابن کثیر) رہی یہ بات کہ اگر عالم آخرت کے یہ معاملات دنیا کے معاملات کے مثل نہیں ہوں گے تو پھر ان کے حقیقت کیا ہوگی واقعیت اور حقیقت تو ضرور ہے مگر اس موضوع پر ہماری عقل کا دش کچھ نہیں کر سکتی ۔ اصل یہ ہے کہ اس مادی زندگی کے احساسات و مضبوطات کی زنجیروں میں کچھ اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ ان سے آزاد ہو کر جمال حقیقت کا تصور ہی نہیں کر سکتے ۔ پس اس کے سوا چارہ نہیں کہ جو کچھ بتلا دیا گیا ہے اس پر یقین کریں ۔ اور جو کچھ نہیں پا سکتے اس کے درپے نہ ہوں ۔ اگر درپے ہول گے تو تہ کو تو نہ پہنچیں گے البتہ نئے دھوں میں مبتلا ہو جائیں گے ۔

یہ ایک لطیف بھی ان آیات میں ہے کہ دنیا کے دارالامتحان سے کامیاب ہو کر نکلنے اور نعمت بھری جنت میں پہنچ جانے کے بعد یہ نہیں ہوگا کہ جنتی جنت میں پہنچنے کے بعد فوراً سامان عیش پر ٹوٹ پڑیں گے جیسا کہ بعض کج فہم حضرات کے ذہن میں اس کا نقشہ گھومنے لگتا ہے بلکہ صالح اہل ایمان دنیا میں افکار عالیہ اور اخلاق فاضلہ اختیار کر کے اپنے جذبات کو سنوار کر اپنی خواہشات کو سدھار کر اور اپنی سیرت و کردار کو پاکیزہ بنا کر جس قسم کی بلند ترین شخصیتوں میں اپنی ذات میں

ہم پہنچائیں گے وہی دنیا کے ماحول سے مختلف جنت کے پاکیزہ دین ماحول میں اور زیادہ نکھر کر ابھر آئیں گے اوران کے وہی اوصاف جو دنیا میں انہوں پرورش کئے تھے وہاں اپنی پوری شان کے ساتھ ان کی سیرۃ میں جلوہ گر ہوں گے ان کا محبوب ترین مشغلہ اللہ کی حمد و تقدیس ہو گا۔ ان کی سوسائٹی میں وہی ایک دوسرے کی سلامتی چاہنے کا جذبہ کارفرما ہو گا جسے دنیا میں انہوں نے اپنایا تھا۔

بتانا یہ ہے کہ موجودہ دنیا کی زندگی آلودگیوں اور نجاستوں سے بھری ہے لیکن جنت وہ مقام ہے جو پاکی ستھرائی لطافت اور نفاست کا مظہر ہے اس میں وہی داخل ہوں گے جو گناہوں سے پاک ہوں گے۔ جو زندگی وہاں ملے گی وہ بھی پاک وصاف اور ستھری اور ہر جسمانی و روحانی آلائش سے بری ہو گی غرض کہ ہر چیز وہاں پاک وصاف طیب و طاہر اور تمام روحانی و جسمانی آلودگی سے منزہ ہو گی۔ اہلِ جنت کی روحانی لذت اللہ سبحانہ کی حمد و ثنا اور تسبیح و تحمید ہو گی۔ یہ ان کی روحانی غذا ہو گی وہ عالم جہاں نورالہٰی کی بارش ہر طرف ہو گی۔ جہاں صفائی اور ستھرائی کے سوا کوئی منظر نہ ہو گا۔ جہاں و نزاہت کی ہر طرف صورتیں نظر آئیں گی۔ وہاں حمد و ثنا کے روح افزا ترانے ہر طرف ہوں گے وعواهم فيها سبحانك اللهم وتحيتهم فيها سلام واخر دعواهم ان الحمد لله رب العالمين۔

وَلَوْ یُعَجِّلُ اللّٰہُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَہُمْ
بِالْخَیْرِ لَقُضِیَ اِلَیْہِمْ اَجَلُہُمْ ؕ فَنَذَرُ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ
لِقَآءَنَا فِیْ طُغْیَانِہِمْ یَعْمَہُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ
الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِہٖۤ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا کَشَفْنَا
عَنْہُ ضُرَّہٗ مَرَّ کَاَنْ لَّمْ یَدْعُنَاۤ اِلٰی ضُرٍّ مَّسَّہٗ ؕ کَذٰلِکَ
زُیِّنَ لِلْمُسْرِفِیْنَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَقَدْ اَہْلَکْنَا
الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَجَآءَتْہُمْ رُسُلُہُمْ بِالْبَیِّنٰتِ
وَمَا کَانُوْا لِیُؤْمِنُوْا ؕ کَذٰلِکَ نَجْزِی الْقَوْمَ الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ
جَعَلْنٰکُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِہِمْ لِنَنْظُرَ کَیْفَ
تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

انسان جیسے خیر کے مانگنے میں جلد باز ہے اگر اللہ بھی انسانوں کو نقصان پہنچانے میں جلد باز ہوتا تو اس کا وقت کبھی کا پورا ہو چکا ہوتا۔ لہذا جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے ہیں ہم ان کو ان کی سرکشیوں میں سرگرداں چھوڑ دیتے ہیں ؁ اور جب کبھی انسان کو تکلیف لگتی ہے تو لیٹے بیٹھے اور کھڑے اللہ کو پکارنے لگتا ہے

پھر جب ہم اس سے تکلیف کو ہٹا دیتے ہیں تو اس طرح ہو جاتا ہے کہ گویا لگی ہوئی تکلیف کے لیے اس نے ہمیں پکارا ہی نہیں تھا۔ بے باک لوگوں کے لیے اسی طرح ان کے کام خوشنما بنا دیئے جاتے ہیں ۹ تم سے پہلے ہم بہت سی قوموں کو ظلم کی پاداش میں میں ہلاک کر چکے ہیں۔ ان کے پاس ان کے پیغمبر کھلی نشانیاں لے کر آئے تھے لیکن لوگ ایمان لانے کیلئے آمادہ نہ تھے۔ جرائم پیشہ لوگوں کو ہم جرموں کی سزا اسی طرح دیتے ہیں ۱۳ پھر ان امتوں کی جگہ اب تم نے لی ہے اور ہم نے تمہیں ان کے بعد ملک میں جانشین بنایا ہے تاکہ ہم دیکھیں کہ تمہارے کام کیسے ہیں ۱۴

مفردات کے معانی

طغیان ۔ سرکشی، شرارت نافرمانی، گمراہی اصل میں طغیان کے معنے نافرمانی اور معصیت کوشی میں حد سے بڑھ جانے کے ہیں یہ مصدر ہے اس کا فعل جب واوی ہو تو باب نصر سے طغا یطغو طغیانا آتا ہے اور جب یائی ہوتا ہے تو فتح اور سمع دونوں سے آتا ہے طغیٰ یطغیٰ طغیانا اور طغیٰ یطغیٰ طغیانا اور طغِی یطغی اور قرآن میں باب فتح سے آیا ہے۔

خلائف خلیفہ کی جمع ہے خلفاء بھی جمع آتی ہے۔ خلف یخلف باب نصر سے آتا ہے جانشین ہونا اور پیچھے آنا پہلے معنے کے اعتبار سے مصدر خلافۃ آتا ہے دوسرے معنے کے اعتبار

ہے مصدر خلف آتا ہے۔ لفظ خلف لام کے سکون کے ساتھ بترے جانشین امام بغوی لکھتے ہیں خلف اس نسل کو کہتے ہیں جو دوسرے قرن کے بعد آتی ہے۔ ابو حاتم کا بیان ہے کہ خلف بسکون لام معنی اولاد ہے واحد و جمع دونوں کے لیے آتا ہے اور خلف لام کے زبر سے بمعنی بدل چاہے اولاد یا کوئی اور ابن الاعرابی کہتے ہیں کہ خلف لام کے زبر کے ساتھ نیک کے لیے آتا ہے اور بسکون لام بد کے لیے آتا ہے مشہور محدث لغوی امام نضر بن شمیل کہتے ہیں کہ خلف لام کے فتحہ اور سکون کے ساتھ بری نسل کے آتا ہے لیکن اچھی نسل کے لیے بغیر لام کی حرکت کے نہیں آتا ہے۔ امام محمد بن جریر کی تصریح ہے کہ اکثر مدح میں تو لام کا زبر آیا ہے اور برائی میں لام کا سکون اور کبھی اس کا عکس ہوتا ہے۔

تاجیل و تدریج کا قانون

اللہ سبحانہ کے قوانین کا عمل کبھی فوری اور اچانک نہیں ہوتا وہ جو کچھ کرتا ہے آہستہ آہستہ بتدریج کرتا ہے، اسی تدریجی عمل لے مہلت اور ڈھیل کا قاعدہ بنایا ہے یعنی اس کا ہر قانون عفو و درگذر صنیں دیتا ہے اس کا ہر فعل عفو و درگذر کا دروازہ آخر تک کھلا رکھتا ہے۔ بلاشبہ اس کے قوانین اپنے نفاذ میں اٹل ہیں ان میں رد و بدل کا شائبہ نہیں ہے لیکن جو قوانین اپنے نفاذ میں اس درجہ قطعی اور اٹل ہیں وہی اپنی نوعیت میں کس درجہ عفو و درگذر اور مہلت بخشی و اصلاح کوشی کی روح رکھتے ہیں۔

اللہ سبحانہ اگر چاہتے تو ہر حالت بیک وقت ظہور میں آجاتی اور ان کے قوانین کا نفاذ فوری اور ناگہانی ہوتا لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ ہر حالت ہر تاثیر ہر انفعال کے ظہور کے لیے ایک خاص مدت مقرر کر دی گئی ہے اور ضروری ہے کہ بتدریج درجہ بدرجہ مختلف منزلیں پیش آئیں۔ پھر ہر منزل میں اس کے آثار ہوں جو آنے والے نتائج سے خبردار کریں۔ زندگی اور موت کے قوانین کو دیکھ لو۔ کس طرح زندگی بتدریج نشو و نما پاتی ہے اور درجہ بدرجہ مختلف منزلوں سے گذرتی ہے اور کس طرح کمزوری و فساد کا ایک طویل سلسلہ ہے جو اپنے ابتدائی نقطوں سے شروع ہوتا ہے اور یکے بعد دیگرے مختلف منزلیں طے کرتا ہوا آخری نقطہ بلوغ تک پہنچتا ہے بدپرہیزی ہوتی ہے مگر فوراً ہلاکت نہیں آتی ہے بلکہ بتدریج موت کی طرف بڑھنے لگتے ہیں اور بالآخر ایک خاص مدت کے اندر جو ہر صورت حال کیلئے یکساں نہیں ہوتی ہے درجہ بدرجہ اترتے ہوئے موت کی آغوش میں جا گرتے ہیں۔ نباتات کو دیکھو درخت اگر آبیاری سے محروم ہو جاتا ہے یا نقصان و فساد کا کوئی دوسرا سبب ہوتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ ایک ہی دفعہ مرجھا کر گر جائیں بلکہ بتدریج شادابی

کی جگہ پژمردگی کی حالت طاری ہوتی ہے ۔ یہی حال کائنات خلقت کا ہے کوئی تغیر ایسا نہیں ہے جو اپنا تدریجی دور نہ رکھتا ہو ہر چیز بتدریج بنتی ہے اور اسی طرح بتدریج بگڑتی ہے۔ بناؤ ہو یا بگاڑ ممکن نہیں کہ ایک خاص مدت گذرے بغیر کوئی حالت بھی اپنی کامل صورت میں ظاہر ہو سکے یہ مدت جو ہر حالت کے ظہور کے لیے اس کی "اجل" یعنی مقررہ وقت مختلف گوشوں اور مختلف حالتوں مختلف مقدار رکھتی ہے اور بعض حالتوں میں تو اس کی مقدار اتنی طویل ہوتی ہے کہ ہم اپنے نظام اوقات سے اس کا حساب بھی نہیں لگا سکتے ۔

اگر تدریج و تاجیل کی یہ فرصتیں نہ ہوتیں تو دنیا میں ایک وجود بھی فرصت حیات سے فائدہ نہ اٹھا سکتا۔

ؐلہ انسان جیسے خیر کے مانگنے میں جلد باز ہے اگر اللہ بھی انسانوں کو نقصان پہنچانے میں جلد باز ہوتا تو انسان کا وقت کبھی کا پورا ہو چکا ہوتا۔ لہٰذا جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے ہیں ہم ان کو ان کی سرکشیوں میں سرگرداں چھوڑ دیتے ہیں ۔ دو آیت پہلے فرمایا تھا کہ والذین ھم عن آیاتنا غافلون جو لوگ غفلت میں پڑے ہیں اور ہمارے ملنے کی امید نہیں رکھتے ہیں ان کا ٹھکانا دوزخ ہے ۔ یہاں یہ بتلانا ہے کہ اللہ سبحانہ ایسے مجرموں کو فوراً سزا نہیں دیتا بلکہ مہلت دیتا ہے۔ حالانکہ لوگوں کا حال یہ ہے کہ کبھی بیباک و بے حیا بنکر خود اپنے لیے جلد عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں مثلاً کہتے ہیں۔

اللھم ان کان ھذا ھو الحق من عندک فامطر علینا حجارۃ من السماء او ائتنا بعذاب الیم ۔

کبھی دنیوی حوادث سے تنگ آکر اپنی یا اپنی اولاد کے حق میں بد دعا کرتے ہیں جیسا کہ تجربہ سے ظاہر ہے اب اگر اللہ سبحانہ ان کی درخواست اور دعا کے موافق فوراً ہاتھوں ہاتھ کوئی عذاب یا برائی اس قدر جلد ان کو پہنچا دے جتنی جلد وہ بھلائی کے پہنچنے کی خواہش رکھتے ہیں تو بدی کے وبال سے ایک منٹ بھی فرصت نہ پائیں۔ اور رشتہ حیات ہی دفعتہً منقطع ہو جائے مگر اللہ سبحانہ کے یہاں نیکی و بدی دونوں میں حسب مصلحت تاخیر و تاجیل ہوتی ہے تاکہ نیک لوگ تربیت پائیں اور بدکار غفلت میں پڑے رہ کر پیمانہ شرارت لبریز کریں لہ

لہ افادات شیخ الاسلام

آیت میں یعجل کا مفعول مطلق استعجال کیوں آیا ہے۔ قاعدہ تو یہی ہے کہ فعل کا مصدر ہی مفعول مطلق ہوتا ہے مگر یہاں بجائے یعجل اللہ الشر تعجیلھم بالخیر کے لو یعجل اللہ للناس الشر استعجالھم بالخیر فرمایا یعنی فعل باب تفعیل سے آیا ہے اور مصدر باب استفعال سے ہے ہونا تو یہ چاہیے کہ فعل اگر باب تفعیل ہو تو مصدر بھی تفعیل ہو فعل باب استفعال ہو تو مصدر بھی باب استفعال ہو۔ قرآن میں اگر ایسا نہیں ہوا ہے تو اس میں گہری معنویت کی طرف اشارہ ہوتا ہے مثلاً واذکر اسم ربك وتبتل الیہ تبتیلا اس میں فعل باب تفعیل مبالغہ اور مصدر باب تفعیل ہے۔ اس میں معنویت یہ ہے کہ باب تفعیل مبالغہ کے لیے آتا ہے جب کہ باب تفعیل تدریج کے لیے آتا ہے یہ بتانا مقصود ہے کہ ذکر اسم رب بہت زیادہ ہو اور دیر تک ہو تو نتیجہ خیز ہوتا ہے ایسے ہی یہاں بھی یعجل فعل کا مفعول مطلق استعجال لانے میں کوئی معنویت ہونی چاہیے۔ اس موضوع پر علامہ زمخشری، علامہ طیبی اور علامہ خفاجی نے خوب جی کھول کر داد تحقیق دی ہے افسوس کہ تفصیل کا محل نہیں اور یہ باتیں ناظرین معالم القرآن کے لیے کچھ زیادہ مفید نہیں ہیں۔

یہاں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ جیسے مادیات میں تاجیل و تدریج کا قانون نافذ ہے۔ اور عالم مادیات ہو یا معنویات اللہ سبحانہ کا قانون ایک ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ دنیا میں کوئی انسانی جماعت اپنی بدعملیوں کے ساتھ مہلت حیات پا سکتی۔ اور پھر جس طرح معنویات میں ہر حالت بہ تدریج نشو و نما پاتی اور ہر نتیجہ کے ظہور کے لیے ایک خاص مقدار، ایک خاص مدت اور ایک خاص وقت مقرر کر دیا گیا ہے ٹھیک اسی طرح اعمال کے نتائج کے لیے بھی مقدار اوقات کے احکام مقرر ہیں۔ اور ضروری ہے کہ ہر نتیجہ ایک خاص مدت کے بعد اور ایک خاص مقدار کی نشو و نما کے بعد ظہور میں آئے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس تدریج و امہال سے عمل حق اور عمل باطل۔ دونوں کے لیے تاجیل کی حالت پیدا ہو گئی ہے یعنی دونوں کے نتائج فوراً ظاہر نہیں ہوتے اپنی مقررہ اجل یعنی وقت ہی پر ظاہر ہو سکتے ہیں۔ البتہ حق کے لیے تاجیل اس لیے ہوتی ہے تاکہ اس کی فاتحانہ قوت ظاہر ہو جائے اور باطل کے لیے اس لیے ہوتی ہے تاکہ اس کی فنا پذیر کمزوری تکمیل تک پہنچ جائے اس تاجیل کے لیے کوئی ایک ہی مقررہ مدت نہیں ہے۔

اس آیت میں فکر انسانی کی جس گمراہی کو استعجال بالعذاب سے تعبیر کیا گیا ہے وہ صرف انہی منکرین حق کی گمراہی نہ تھی جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر کمر بستہ تھے بلکہ ہر زمانے

میں انسان کی ایک عالمگیر کج اندیشی رہی ہے۔ وہ بسا اوقات اللہ سبحانہ کی اس مہلت بخشی سے فائدہ اٹھانے کی جگہ اور زیادہ شر و فساد میں نڈر اور جری ہو جاتا ہے۔

پوری آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ لوگوں پر رحم و کرم فرمانے میں جتنی جلدی کرتا ہے ان کو سزا دینے اور ان کے گناہوں پر پکڑ لینے میں اتنی جلدی نہیں کرتا تم چاہتے ہو جس طرح اس نے تمہاری دعائیں سن کر بلائیں دور کر دی ہیں اسی طرح وہ تمہارے چیلنج سن کر اور تمہاری سرکشیاں دیکھ کر عذاب بھی فوراً بھیج دے لیکن اللہ سبحانہ کا یہ قانون نہیں ہے۔ لوگ خواہ کتنی سرکشیاں کیے جائیں وہ ان کو پکڑنے سے پہلے کا موقعہ دیتا ہے۔ پیہم تنبیہات روانہ کرتا ہے اور رسی ڈھیلی چھوڑے رکھتا ہے یہاں تک کہ جب قانون کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے تب نتائج کا ظہور ہوتا ہے یہ ہے اللہ کا قانون۔

انسانی فطرت کا اندرونی ادراک

۱۹ اور جب کسی انسان کو تکلیف لگتی ہے تو لیٹے بیٹھے اور کھڑے اللہ کو پکارنے لگتا ہے۔ پھر جب اس سے تکلیف کو ہٹا دیتے ہیں تو اس طرح ہو جاتا ہے کہ گویا لگی ہوئی تکلیف کے لیے اس نے ہمیں پکارا ہی نہیں ہے بے باک لوگوں کے لیے اسی طرح ان کے کام خوشنما بنا دیے جاتے ہیں یعنی انسان اول بے باکی سے خود عذاب طلب کرتا ہے اور برائی اپنے منہ سے مانگتا ہے مگر کمزور اور بودا اتنا ہے کہ جہاں خدا کی جانب سے تکلیف پہنچی گھبرا کر ہمیں پکارنا شروع کر دیا۔ جب تک مصیبت رہی کھڑے بیٹھے اور لیٹے ہر حالت میں اللہ سبحانہ کو پکارتا رہا۔ پھر جہاں تکلیف ہٹالی گئی سب کہا سنا بھول گیا گویا اللہ سبحانہ سے کبھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہی غرور و غفلت کا نشہ وہی اکڑ فوں رہ گئی جس میں پہلے مبتلا تھا حدیث میں ہے تو اللہ سبحانہ کو اپنے عیش و آرام میں یاد رکھ اللہ سبحانہ تجھ کو تیری سختی میں یاد رکھے گا۔ مومن کی شان یہ ہے کہ کسی وقت اللہ سبحانہ کو نہ بھولے سختی پر صبر اور فراخی پر اللہ کا شکر ادا کرتا رہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کی توفیق مومن کے سوا کسی کو نہیں ملتی ہے[1]

اس آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارا کیا ہے کہ رنج و مصیبت کی حالت میں انسان

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کے اندر وجدانی طور پر یہ ولولہ اٹھتا ہے کہ ایک بالاتر ہستی موجود ہے جو میرا دکھ درد دور کر سکتی ہے اور اسی کو پکارنا چاہیے لیکن جب مصیبت دور ہو جاتی ہے تو پھر عیش و راحت کی سرشاریوں میں پڑ کر اسے بھول جاتا ہے گویا کبھی اس نے کسی کو پکارا ہی نہ تھا۔

قرآن نے جا بجا انسان کی اس فطری حالت سے استشہاد کیا ہے کیونکہ مصیبت اور بے بسی کی حالت میں بے اختیار اس ولولہ کا اٹھنا اس امر کا ثبوت ہے کہ انسانی فطرت اپنے اندرونی ادراک میں اللہ سبحانہ کی ہستی کا اعتقاد رکھتی ہے۔ اور اعراض و غفلت کی حالت وجدانی نہیں خارجی اثرات کا نتیجہ ہے۔

اس موقعہ پر حضرت مولانا اشرف علیؒ نے بڑی دقیق اور نازک بات ارشاد فرمائی ہے۔

اس آیت کا مضمون قرآن کی چند آیتوں میں مختلف عنوانوں سے آیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اچھی حالت میں انسان میں یہ باتیں ہوتی ہیں۔ اعراض، نسیان ترک دعا، فرح اور فخر یہ سب باتیں یک جا ہو سکتی ہیں۔ اور بری حالت میں یہ باتیں ہوتی ہیں۔ مایوسی۔ ناشکری۔ دعا۔ ان تینوں میں سے مایوسی اور ناشکری میں ہم آہنگی ہو سکتی ہے لیکن دعا اور مایوسی میں ہم آہنگی اور مفاہمت مشکل ہے۔ کیونکہ دعا تو امید ہی میں کی جاتی ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ زبان سے دعا کرتا ہے مگر دل میں مایوسی ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ اول تو دعا ہی کرتا ہے مگر پھر مایوس ہو کر چھوڑ دیتا ہے[1]

غور کرو کہ طبیعت انسانی کی اس آیت میں کیسی سچی تصویر ہے انسان جب اپنی کوششوں میں کامیاب ہوتا ہے تو خوش حالی کا گھمنڈ اسے غافل و سرشار بنا دیتا ہے وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اب میرے لیے کوئی کھٹکا نہیں ہے۔ حالانکہ نہیں جانتا کتنا ہی خوش حال ہو جائے اگر غفلت میں پڑ گیا ہے تو اس کے لیے کھٹکا ہی کھٹکا ہے۔ اس کی خوشحالیاں کبھی پائدار نہیں ہو سکتی ہیں۔ پھر جب ایسا ہوتا ہے کہ اس کی کوششیں کامیاب نہیں ہوتی ہیں تو بجائے اس کے کہ اس کی طلب و سعی میں اور زیادہ سرگرم ہو جائے یک قلم مایوس ہو جاتا ہے اور سمجھنے لگتا ہے کہ اب میرے لیے کوئی نہیں رہا اور کچھ نہیں رہا اس وقت اس کا اندر جاگتا ہے اور اٹھتے بیٹھتے ایک ان دیکھی طاقت کو پکارنے لگتا ہے یہ اس کے اندر کی پکار ہی اللہ کے بارے میں اعتقاد ہے

---

[1] بیان القرآن

حالانکہ نہیں جانتا کہ اس کے لیے سب کچھ ہے بشرطیکہ اللہ کے فضل وکرم سے بغاوت نہ کرے۔

قریش کو عذاب کی دھمکی

۲۰ تم سے پہلے ہم بہت سی قوموں کو ظلم کی پاداش میں ہلاک کر چکے ہیں۔ ان کے پاس ان کے پیغمبر کھلی نشانیاں لے کر آئے تھے لیکن ایمان لانے کے لیے آمادہ نہ تھے جرائم پیشہ لوگوں کو ہم جرائم کی سزا اسی طرح دیتے ہیں۔ یعنی اگر ان کی درخواست کے مواقف جلدی عذاب نہ آئے یا تکلیف ومصیبت اگر ٹل جائے تو بے فکر نہ ہونا چاہیے، ظلم وشرارت اور بے ایمانی کی سزا جلد یا دیر مل کر رہے گی۔ سنۃ اللہ قدیم سے یہی ہے کہ جب لوگ انبیاء ومرسلین کے کھلے نشان دیکھنے کے بعد بھی ظلم وتکذیب پر کمربستہ رہے اور کسی طرح ایمان وتسلیم کی طرف نہ جھکے تو آسمانی عذاب نے ان کو ہلاک کر ڈالا ہمیشہ مجرموں کو کسی نہ کسی رنگ میں سزا ملتی رہی لہ یہ پیچھے سن آئے ہو کر سورہ یونس مکی زندگی میں ہجرت سے پہلے نازل ہوئی۔ آپ نے مکہ میں تیرہ سال تک دعوت دی اور ان تیرہ سالوں کے اندر اس راہ میں ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف برداشت کی اور آیات ہدایت کے مختلف نمونے ان کو دکھائے بالآخر شق القمر کا معجزہ بھی ان کی نگاہوں کے سامنے سے گذرا اور آخر وہ وقت آیا جو اپنے پیغمبروں کے سامنے دوسری قوموں پر آچکا تھا۔ کفار قریش کو معجزہ عذاب دیکھنے کی جلدی کا ذکر اس سے پہلے آیت ہو چکا ہے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ پیشن گوئی سراسر جھوٹ ہے۔ اللہ سبحانہ نے فرمایا کہ جب تک پیغمبر کی مدت دعوت ختم نہ ہو جائے یعنی تمام افراد صالحہ الگ نہ ہو جائیں عذاب نہیں آئے گا۔ یہاں اللہ سبحانہ نے عذاب کے بارے میں قانون کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ قوموں کی ہلاکت سے پہلے ان کے اندر ایک ڈرسنانے والا آتا ہے قریش میں بھی ایک ڈر سنانے والا آچکا ہے اگر وہ اس کی نہ سنیں گے تو پچھلی قوموں کی طرح ان کو بھی نیست ونابود کر دیا جائے گا۔ تم بھی ظالمانہ روش اختیار کرتے ہو تم بھی رسول کی کھلی نشانیوں کو دیکھ کر ایمان نہیں لائے ہو تمہارے بھی جرائم آسمان سے باتیں کر رہے ہے اب تمہارا بھی دن موعود آچکا ہے۔

اصل میں لفظ قرن استعمال ہوا ہے جس سے مراد عموماً عربی زبان میں ایک دور ہوتا ہے

لہ افادات شیخ الاسلام

لیکن یہاں قرن سے وہ قوم مراد ہے جو اپنے زمانہ میں برسراقتدار تھی اور تہذیب و تمدن کی چابیوں پر قابض تھی۔ قوم کی ہلاکت کے لازماً یہ معنی نہیں کہ نسل ہی ختم کر دی ہے بلکہ اس کا اقتدار سے محروم کر دینا اس کی تہذیب و تمدن کا ملیا میٹ ہو جانا بھی اس کی ہلاکت ہے۔

علامہ بقاعی نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ قوموں کی ہلاکت کی خبر والی بات جب ختم ہوئی تو دماغ میں یہ سوال ابھرا کہ کیا یہ معاملہ ان کے ساتھ ہی خاص تھا فوراً ارشاد ہو کذلک نجزی القوم المجرمین سب جرائم پیشہ قوموں کے ساتھ ہمارے قانون جزا کا معاملہ یکساں ہے۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ ہم ہر مجرم کو بھی سزا دیں یا تمہیں بھی یہی سزا ملے گی یعنی جب تم بھی وہی جرم کرو گے تو پھر سزا سے کیسے بچ سکو گے۔ شر اور عذاب تو جرائم کا نتیجہ ہے جب علت موجود ہے تو معلول کیسے نہ ہو گا۔

خلافت کا قانون

۱۴ پھر ان امتوں کی جگہ اب تم نے لی ہے اور ہم نے تمہیں ان کے بعد ملک میں جانشین بنایا ہے تاکہ ہم دیکھیں کہ تمہارے کام کیسے ہیں یعنی پہلوں کی جگہ اب تم کو زمین پر بسایا تاکہ دیکھا جائے کہ تم کہاں تک خالق و مخلوق کے حقوق پہچانتے ہو اور اللہ کے پیغمبروں کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہو نیک و بد جیسے عمل کرو گے اسی کے مناسب تم سے برتاؤ کیا جائے گا آگے اس معاملہ کا ذکر ہے جو قرآن حضور اقدس اور سبحانہ کے ساتھ انہوں نے کیا[1]

اہل عرب سے خطاب ہو رہا ہے اور ان سے یہ کہا جا رہا ہے کہ پچھلی قوموں کو اپنے اپنے زمانے میں کام کرنے کا موقع دیا گیا تھا۔ مگر انہوں نے آخر کار ظلم و بغاوت کی روش اختیار کی اور جس قدر اللہ کے رسول ان کے پاس زندگی گذارنے کا ہدایت نامہ لے کر آئے ان کی بات انہوں نے نہ مانی۔ اس لیے وہ اللہ سبحانہ کے امتحان میں ناکام ہو گئیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو میدان سے ہٹا دیا۔ اب اے اہل عرب تمہاری باری آئی تمہیں ان کی جگہ کام کرنے کا موقعہ دیا جاتا ہے تم اس امتحان گاہ میں کھڑے ہو جس میں تمہارے پیشرو ناکام ہو کر نکالے جا چکے ہیں۔ اگر تم نہیں چاہتے ہو کہ تمہارا انجام بھی وہی ہو جو ان کا ہوا تو اس موقع سے جو تمہیں دیا جا رہا ہے صحیح فائدہ اٹھاؤ پچھلی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قوموں سے سبق لو اور ان غلطیوں کا اعادہ نہ کرو جن کی وجہ سے وہ تباہ ہوئے۔ دنیا کی اور قومیں اصلاح عالم کے منصب پر باری باری ممتاز ہو چکی تھیں۔ ایک زمانہ تھا جب بنی اسرائیل جیسی قوم اس کا تاج پہن چکی تھی لیکن اب تمام قوموں میں صلاحیت کا مادہ ناپید ہو چکا تھا۔ ایران تین ہزار برس تک ناز و نعمت میں پل کر ترقی کی روح فنا کر چکا تھا۔ رومیوں کے تمام قوائے عمل بوسیدہ ہو چکے تھے ہندوؤں کا دل و دماغ صرف وہم پرستی کا کام دینے کے قابل رہ گیا تھا۔ صرف ایک عرب تھے جو بن جوتی زمین کی طرح نشو و نما کی صلاحیت رکھتے تھے اللہ سبحانہ نے خلافت کے کام کے لیے ان کو بھی منتخب کیا ان ہی کو سمجھایا جا رہا ہے کہ اب خلافت تمہیں ملنے والی ہے۔ تمہارے ساتھ بھی وہی معاملہ ہو گا جو تم سے پہلوں کے ساتھ ہو چکا ہے ان کو ہٹا کر اللہ نے تمہیں ان کی جگہ اس لیے دی ہے کہ دیکھے تم کیسے کام کرتے ہو۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ ۙ قَالَ الَّذِينَ لَا
يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ ۚ قُلْ مَا يَكُونُ
لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۖ
إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿١٥﴾ قُلْ
لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ وَلَا أَدْرَاكُمْ بِهِ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ
فِيكُمْ عُمُرًا مِنْ قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٦﴾

اور جب ان کے سامنے ہماری واضح اور صاف آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں اس قرآن کے علاوہ کوئی اور قرآن لاؤ۔ یا اس کو تبدیل کر لو[۲۲] آپ فرما دیجیے کہ اس قرآن کو اپنی جانب سے بدلنا میرا مقدور نہیں ہے میرا کام تو صرف یہ ہے کہ اس حکم کا تابع بن کر رہوں جس کی مجھ پر وحی آتی ہے۔ اگر میں اپنے مالک کی نافرمانی کروں تو مجھے بہت بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے[۲۳] آپ فرما دیجیے کہ اگر اللہ چاہتا تو میں قرآن کی تمہارے سامنے

تلاوت ہی نہ کرتا اور نہ اللہ اس سے تم کو خبردار ہی کرتا کیونکہ میں اس سے پہلے تم میں رہ چکا ہوں کیا تمہیں اتنی بھی سمجھ نہیں ہے ۲۴

دعوت کی راہ میں مشکلات

ہر قوم کی اصلاح و ہدایت میں اول سخت اور متعدد مشکلات پیش آتی ہیں۔ لیکن انکی نوعیت ایک دوسرے زیادہ نہیں ہوتی ہے۔ مگر عرب کی اصلاح میں ہر نوع ہر حیثیت ہر قسم کی گوناگون اور لاعلاج مشکلات تھیں۔ اور ایسی تھیں جن میں سے ایک کا حل کرنا بھی قدرت انسانی سے بالاتر تھا۔ بنو اسرائیل ایک مدت سے مصر میں قبطیوں کی غلامی کر رہے تھے اور قبطیوں کے جور و ظلم کا طوفان ان کے سر سے گذر چکا تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان پر یہ احسان عظیم کیا کہ فرعون کے پنجۂ ستم سے ان کو چھڑا کر مصر سے نکال لائے لیکن غلامی میں رہتے رہتے ان کی طبیعت میں اس قدر ذلت پسندی آگئی تھی کہ جب ان سے کہا گیا کہ آگے کنعان کی زمین ہے اس کو لڑ کر لو اور اسی پر تخت بچھاؤ تو انہوں نے حضرت موسیٰ سے صاف کہہ دیا کہ تو اور تیرا رب دونوں جاکر لڑو ہم تو یہاں سے آگے قدم نہیں بڑھاتے یہ ایک امتداد معاشرت کا اثر تھا جو مرتے مرتے ان لوگوں کی طبیعت سے نہیں گیا اور جب تک یہ نسل پوری اپنی موت کی آغوش میں نہیں چلی گئی بنی اسرائیل کو کنعان کی زمین میں قدم رکھنا نصیب نہیں ہوا۔ یہ صرف ایک مشکل کی مثال تھی اب عرب کی مشکلات کا اندازہ کرو۔ عرب کی سب سے بڑی مشکل جہالت تھی۔ عرب کی قوم محض امی تھی، الوہیت رسالت معاد عبادت ان میں سے کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے ان کے کان آشنا ہوں اسلام کا ہر لفظ جو ان کے کان میں پڑتا تھا ان کو ایک تعجب انگیز اور بالکل بیگانہ آواز معلوم ہوتی تھی۔ قرآن عزیز نے ان کی اس جاہلانہ حیرت و استعجاب کا ایک سے زیادہ جگہ ذکر کیا ہے صفات الٰہی آثار نبوت احوال معاد ان میں سے ہر بات کو سن کر وہ اسی طرح سرتاپا حیرت بن جاتے تھے نبوت کے متعلق وہ سمجھتے تھے کہ انسان تو اس کے لائق نہیں کہ اس منصب

پر تو فرشتوں کو ہونا چاہیے۔ نبی کا تخیل اگر کبھی ان کے ذہن میں آتا تو بشریت سے ماوراصورت میں غرض ایک آسمانی پکار کی کیفیت سے بالکل بے خبر ہے۔ اس وجہ سے عرب کو ایک مدت تک صدائے نبوت سے آشنا ہونے کی ضرورت تھی اس میں کئی برس صرف ہونگے۔ ان آیات میں جو بات کہی گئی ہے ان میں بھی ان کے اسی جاہلانہ ذہن کی عکاسی ہو رہی ہے۔

۱۵ اور جب ان کے سامنے ہماری واضح اور صاف آیات پڑھی جاتی ہیں تو جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کے علاوہ کوئی اور قرآن لاؤ یا اس کو تبدیل کرلو۔ قرآن کی عام پند و نصیحت تو بہت سے پسند کرتے ہیں لیکن بت پرستی یا ان کے مخصوص عقائد و رسوم کا رد ہوتا ہے تو ان کو وحشت ہوتی ہے اور ناک بھوں چڑھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے ہیں کہ اپنے خدا سے کہہ کر یا تو دوسرا قرآن لاؤ جس میں یہ مضامین نہ ہوں اور اگر یہی قرآن رہے تو اتنے حصہ میں ترمیم کر دیجئے جو بت پرستی سے متعلق ہے۔ جن لوگوں نے پتھر کی مورتیوں پر اختیارات تقسیم کر رکھے تھے ان کی ذہنیت سے کچھ مستبعد نہیں کہ ایک پیغمبر کو اس طرح کے تصرفات و اختیارات کا مالک تصور کر لیں۔ یا یہ کہنا ہی محض الزام و استہزا کے طرز پر ہوگا بہرحال اس کا تحقیقی جواب آگے آرہا ہے [۱]

ہر نئی تحریک کو غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اس کے قبول کرنے میں جو چیز سب سے پہلے رکاوٹ بن کر کھڑی ہوتی ہے وہ قومی رسم و رواج اور آبائی دین و مذہب کی پابندی ہے۔ انسانیت کے پاؤں میں اس سے بھاری کوئی چیز نہیں ہے۔ دوست و آشنا چھوٹنا ماں باپ سے علیحدگی آل و اولاد سے کنارہ کشی، مال و جائداد سے دست برداری جماعت کی مخالفت قوم سے انقطاع وطن سے دوری ایسی چیزیں نہیں ہیں جن کو ہر انسان آسانی سے برداشت کر سکے ملکی رسم و رواج کی دیرینہ محبت اور آبائی کیش و آئین کی موروثی الفت حق و باطل کی تمیز اور نیک و بدکی پہچان کی حس مٹا دیتی ہے۔ عام دنیا کی فطری حالت کے علاوہ عرب کی قوم قدامت پرستی اور قدیم حالت پر بقاء و استحکام میں خاص شہرت رکھتی ہے۔ دنیا کہاں سے کہاں چلی گئی۔ پرانی سامی نسل کی ہر دیانہ خصوصیتیں جو تورات میں پڑھتے ہیں تمام سامی قوموں سے مٹ گئیں مگر عرب میں اس وقت بھی نمایاں نہیں۔ ان کا یہ کہنا اس قرآن کی جگہ اور کوئی قرآن لا دیا اس میں ترمیم

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

کر دو ان کے اسی ذہن کی عکاسی کر رہا ہے وہ یہ مطالبہ اس مفروضے پر کر رہے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے نام سے جو کچھ پیش کر رہے یہ اللہ سبحانہ کی جانب سے نہیں بلکہ حضور اقدس کا اپنا ساختہ پرداختہ ہے اور اس کو خدا کے نام سے صرف اس لیے پیش کر رہے ہیں کہ اس سے ان کی بات کا وزن بڑھ جائے۔ دوسرے ان کا یہ مطلب تھا کہ یہ تم نے توحید و آخرت کی بحث کیا چھیڑ دی ہے یہ تو ہمارے رسوم اور آبائی دین سے بغاوت ہے اگر تمہیں کچھ کرنا ہے تو ایسا کام کرو جس سے قوم کا بھلا ہو۔ اور اگر تم اپنی دعوت کو بالکل بدلنا نہیں چاہتے ہو تو کم از کم اس میں اتنی لچک تو پیدا کر لو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان مصالحت ہو سکے کچھ ہم تمہاری باتیں اور کچھ تم ہماری مان لو۔ تمہاری دعوت میں کچھ ہمارے آبائی ورثہ کے لیے گنجائش نکل آئے اس میں کچھ ہمارے رسم رواج کے لیے کچھ ہماری شخصی اور قومی اغراض کے لیے بھی جگہ ہونی چاہیے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ میں دین حق کی منادی شروع کی تو اس کی شدید مخالفت جس بنا پر سب سے زیادہ کی گئی وہ دین آبائی کو چھوڑنے کا مسئلہ تھا اور یہی دین جدید کے بطلان کی سب سے مستحکم دلیل ان کے پاس تھی۔ اس آیت میں جو مطالبہ کیا گیا ہے اس میں ان کا یہی ذہن جھلک رہا ہے قرآن کے علاوہ اور قرآن یا قرآن میں ایسی تبدیلی جو ان کی امنگوں سے ہم آہنگ ہو جائے یہ کہنے والے وہ لوگ ہیں جن کو اللہ سبحانہ سے ملنے کی کوئی توقع نہیں ہے۔ الذین لا یرجون لقاء نا قرآن آخرت کے معاملہ کو ہر جگہ لقاء الٰہی سے تعبیر کرتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی نظر میں مومن وہ ہے جو لقاء الٰہی کی طلب رکھتا ہے کافر وہ ہے جو دنیوی زندگی ہی پر قانع ہو اور لقاء الٰہی کی اس میں کوئی طلب نہ ہو۔ چنانچہ اس سے پہلے پڑھ چکے ہو۔

ان الذین لا یرجون لقاء نا ورضوا بالحیاۃ الدنیا واطمانوا بہا والذین ھم عن ایاتنا غافلون۔

جو لوگ ہماری ملاقات کے متوقع نہیں ہیں اور صرف دنیوی زندگی پر راضی ہو گئے ہیں اور اس کے خلاف ان کے دل میں کوئی خلش نہیں ہے اور جو ہماری آیات سے یک قلم غافل ہیں۔

نبی کا کام وحی بنانا نہیں اسکی پیروی کرنا ہے

۲۴ے آپ فرما دیجئے اس قرآن کو اپنی جانب سے بدلنا میرا مقدور نہیں ہے میرا کام تو صرف یہ ہے کہ اس حکم کا تابع بن کر رہوں جس کی وحی مجھ پر آتی ہے اگر میں اپنے مالک کی نافرمانی کروں تو مجھے بہت بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے یعنی کسی فرشتہ یا پیغمبر کا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی طرف سے کلام الٰہی میں ترمیم کر کے ایک شوشہ بھی تبدیل کر سکے۔ پیغمبر کا فرض یہ ہے کہ جو وحی اللہ سبحانہ کی طرف سے آئے بلا کم و کاست اس کے حکم کے موافق چلتا رہے۔ وہ اللہ سبحانہ کی وحی کا تابع ہوتا ہے۔ اللہ اس کا تابع نہیں ہوتا کہ جیسا کلام تم چاہو اللہ کے یہاں سے لے کر پیش کر دوں۔ وحی الٰہی میں ادنیٰ سے ادنیٰ تصرف اور قطع و بربد کرنا بڑی بھاری معصیت ہے۔ پھر جو معصوم بندے سب سے زیادہ اللہ سبحانہ کا ڈر رکھتے ہیں یعنی حضرات انبیاء علیہم السلام وہ ایسی معصیت و نافرمانی کے قریب کہاں جا سکتے ہیں انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم میں گویا ان بیہودہ فرمائش کرنے والوں پر تعریض ہو گئی کہ ایسی سخت نافرمانی کرتے ہوئے تمہیں بڑے دن کے عذاب سے ڈرنا چاہیے لہ

یہ اوپر کی دونوں باتوں کا جواب ہے اور اشاروں اشاروں میں یہ بھی بتا دیا کہ میں اس کتاب کا مصنف نہیں۔ یہ میری کتاب نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی کتاب ہے اور وحی کے ذریعے میرے پاس اللہ کی جانب سے آتی ہے۔ اس میں کوئی رد و بدل کرنا میرے اختیار سے باہر ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس موضوع پر مصالحت کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہے۔ قبول کرنا ہو تو اس پورے دین کو جوں کا توں قبول کر و ورنہ پورے کو رد کر دو۔ بالفاظ دیگر یہ میرے جی کی من گھڑت نہیں ہے کہ تمہاری فرمائش کے مطابق بنا دوں میں تو خود اللہ سبحانہ کی وحی کا تابع ہوں۔ جو کچھ مجھ پر وحی آتی ہے وہ تمہیں سنا دیتا ہوں۔ اگر میں اس کے حکم کی نافرمانی کروں تو اس کی پکڑ سے مجھے بچانے والا کون ہے؟ انی اخاف ان عصیت ربی فرما کر یہ بھی اشارا کر دیا ہے جیسا کہ قاضی بیضاوی نے لکھا ہے کہ اگر میرا یہ اقدام اللہ کے عذاب کو دعوت دیتا ہے جس سے میرا دامن پاک ہے تو پھر تمہارے اس مطالبہ کا کیا بنے گا بلاشبہ تمہارا یہ مطالبہ اللہ کے عذاب کو للکارنا ہے۔ اگر باز نہ آؤ گے تو

لہ افادات شیخ الاسلام

وہ اگر رہے گا۔

صداقت نبوت کی واضح دلیل

۱۶ آپ فرما دیجیے کہ اگر اللہ چاہتا تو میں قرآن کی تمہارے سامنے تلاوت ہی نہ کرتا اور نہ اللہ سبحانہ تم کو اس کی خبر دیتا۔ کیونکہ میں اس سے پہلے عمر کا ایک حصہ تم میں رہ چکا ہوں کیا تمہیں اتنی بھی عقل نہیں ہے یعنی جو اللہ سبحانہ جانتا ہے وہی تمہارے سامنے پڑھ دیتا ہوں اور جتنا چاہتا ہے میرے ذریعے سے تمہیں خبردار کر دیتا ہے۔ اگر وہ اس کے خلاف چاہتا تو میری کیا طاقت تھی کہ خود اپنی طرف سے ایک کلام بنا کر اس کی طرف منسوب کر دیتا آخر میری عمر کے چالیس سال تمہاری آنکھوں کے سامنے گذرے۔ اس قدر طویل مدت میں تم کو میرے حالات کے متعلق ہر قسم کا تجربہ ہو چکا میرا صدق وعفاف امانت و دیانت وغیرہ اخلاق حسنہ تم میں ضرب المثل ہے میرا امی ہونا اور کسی ظاہری معلم کے سامنے زانوئے تلمذ طے نہ کرنا ایک معروف و مسلم واقعہ ہے۔ پھر چالیس برس تک جس نے نہ کوئی قصیدہ لکھا ہو نہ شاعروں میں شریک ہوا ہو نہ کبھی کتاب کھولی ہو نہ قلم ہاتھ میں لیا ہو نہ کسی درسگاہ میں بیٹھا ہو دفعتہ ایسا کلام بنا لائے جو اپنی فصاحت و بلاغت شوکت و جزالت جدت اسلوب اور سلامت و روانی سے جن و انس کو عاجز کر دے اس کے علوم و حقائق کے سامنے تمام دنیا کے معارف و علوم ماند پڑ جائیں۔ ایسا مکمل اور عالمگیر قانون ہدایت نوع انسانی کے ہاتھوں میں پہنچا دے جس کے آگے سب پچھلے قانون ردی ہو جائیں۔ بڑی بڑی قوموں اور ملکوں کے مردہ قالب میں روح تازہ پھونک کر ابدی حیات اور نئی زندگی کا سامان بہم پہنچائے یہ بات کس کی سمجھ میں آسکتی ہے تم کو سوچنا چاہیے کہ جس پاک سرشت انسان نے چالیس برس تک کسی انسان پر جھوٹ نہ لگایا ہو کیا وہ ایک دم ایسی جسارت کر سکتا ہے کہ معاذ اللہ اللہ سبحانہ پھر جھوٹ باندھنے اور افترا کرنے لگے۔ ناچار ماننا پڑے گا کہ جو کلام تم کو سناتا ہوں اس کے بنانے اور پہنچانے میں مجھے اصلا اختیار نہیں ہے۔ اللہ سبحانہ جو کچھ جانتا ہے میری زبان تمہیں سناتی ہے ایک لفظ یا زبر زیر بدلنے کا کسی مخلوق کو حق حاصل نہیں ہے [۱]

ولا ادراکم میں لفظ ادریٰ باب افعال سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ہے

[۱] افادات شیخ الاسلام

اس کا مجرد درایۃ باب ضرب سے دری بدری جاننے کے معنے میں آتا ہے لا ادراکم کو شارحین قرآن نے لا اعلمکم کے معنی میں بنایا یعنی نہیں تبلایا تم کو اللہ نے۔ بعض مترجمین قرآن نے اس کے معنے واحد متکلم کے بسبقت قلم سے کر دیئے ہیں۔ صحیح معنے وہی ہیں جو ہم نے تبلا دیئے۔ قاضی بیضاوی، قرطبی، آلوسی نے یہی لکھا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں۔

اس آیت میں صداقت نبوت کی سب سے زیادہ واضح اور وجدانی دلیل بیان کی ہے جس کی حقیقت افسوس ہے مفسرین نے پوری طرح واضح نہیں کی ہے فرمایا۔ ساری باتیں چھوڑ دو۔ صرف اسی بات پر غور کرو کہ میں تم میں کوئی نیا آدمی نہیں ہوں جس کے خصائل و عادات کی تمہیں خبر نہ ہو۔ تم ہی میں سے ہوں اور اعلان وحی سے پہلے ایک پوری عمر تم میں بسر کر چکا ہوں یعنی چالیس برس تک کی عمر کہ انسانی عمر کی پختگی کی پوری مدت ہے۔ اس تمام مدت میں میری زندگی تمہاری آنکھوں کے سامنے رہی ہے۔ تبلاؤ اس تمام عرصہ میں کوئی بات بھی تم نے سچائی اور امانت کے خلاف مجھ میں دیکھی۔ پھر اگر اس تمام مدت میں مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ کسی انسانی معاملہ میں جھوٹ بولوں تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اب اللہ سبحانہ پر بہتان باندھنے کے لیے تیار ہو جاؤں اور جھوٹ موٹ کہنے لگوں کہ مجھ پر اس کا کلام نازل ہوا ہے کیا تم اتنی موٹی سی بات بھی پا نہیں سکتے۔ تمام علمائے اخلاق و نفسیات متفق ہیں کہ انسان کی عمر میں ابتدائی چالیس برس کا زمانہ اس کے اخلاق و خصائل کے ابھرنے اور بننے کا اصلی زمانہ ہے جو سانچہ اس عرصہ میں بن گیا پھر بقیہ زندگی میں بدل نہیں سکتا بس اگر ایک شخص چالیس برس کی عمر تک صادق و امین رہا ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ اکتالیسویں برس میں قدم رکھتے ہی ایسا کذاب و مفتری ہو گیا کہ انسانوں پر ہی نہیں بلکہ فاطر السماوات والارض پر افترا کرنے لگے۔

مولانا دریابادی فرماتے ہیں۔

روشن خیالان عرب کی اسی فرمائشی ترمیم کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ اپنی عمر ۴۰۔ ۴۵ سال تمہاری آنکھوں کے سامنے گذار چکا ہوں میرے تدین راست بازی صداقت شعاری پر تم سب گواہ ہو کبھی کسی خفیف معاملہ میں بھی کذب و افترا سے مجھ کام لیتے تم نے دیکھا ہے یا سنا ہے پھر جب یہ نہیں تو اتنے بڑے افترا کی اپنے کلام کو اللہ کا کلام

کہہ کر پکاروں آخر مجھے جرات ہی کیسے ہو سکتی ہے ؟ تمہاری عقلیں اس احتمال ہی کو کیسے تسلیم کر رہی ہیں۔

۲۔ تمہارے درمیان اپنی عمر کا بڑا حصہ گذار چکا ہوں میری ایک خو بو سے تم واقف ہو چکے ہو۔ میری بولی میرے انداز کلام کو تم خوب اچھی طرح جان چکے پہچان چکے۔ تمہیں قرآن اور میرے کلام میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ میں چاہوں بھی تو قرآن جیسی ممتنع النظیر کلام پر کب تک قادر ہو سکتا ہوں۔ اب تک میرا کوئی کلام اس طرح کا جب نہ ہوا تو آج کیسے ہو سکتا ہے قرآن کا یہ استدلال کلام الٰہی ہونے پر وزن دار اس وقت بھی تھا پھر جس وقت سے احادیث رسول مدون ہو گئیں اس وقت اسے اسکی دلیل میں اور زیادہ جان پڑ گئی ہے حدیثوں کے چھوٹے بڑے مجموعے ایک دو نہیں بیسیوں کی تعداد میں آج سے صدیوں سے شائع چلے آرہے ہیں۔ کیا عقل کے اندھوں کو اتنا نظر نہیں آتا کہ جو زبان بخاری مسلم ترمذی وغیرہ ہیں اور ارشادات نبوت کی ہے وہ قرآن کی ہے یا ہو سکتی ہے۔ زبان انداز بیان، اسلوب کلام نوعیت تراکیب کا اتنا نمایاں واضح فرق بھی کیا شام، مصر، فلسطین، عراق وغیرہ کے اہل زبان کو سجھائی نہیں دیتی۔

مولانا مودودی فرماتے ہیں۔

یہ ایک زبردست دلیل ہے ان کے اس خیال کی تردید میں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کو خود اپنے دل سے گھڑ کر اللہ سبحانہ کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دعوے کی تائید میں کہ وہ خود اس کے مصنف نہیں بلکہ یہ اللہ سبحانہ کی جانب سے بذریعہ وحی ان پر نازل ہو رہا ہے۔ دوسرے تمام دلائل تو پھر نسبتاً دور کی چیز تھے مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تو ان لوگوں کے سامنے کی چیز تھی۔ آپ نے نبوت سے پہلے پورے چالیس سال ان کے درمیان گذارے تھے ان کے شہر میں پیدا ہوئے تھے۔ ان آنکھوں کے سامنے بچپن گذرا۔ جوان ہوئے ادھیڑ عمر کو پہنچے، رہنا سہنا، ملنا جلنا، لین دین، شادی بیاہ غرض ہر قسم کا معاشرتی تعلق انہی کے ساتھ اور آپ کی زندگی کا کوئی پہلو ان سے چھپا ہوا نہ تھا۔ ایسی جانی بوجھی اور دیکھی بھالی چیز سے زیادہ کھلی شہادت اور کیا ہو سکتی تھی۔

آپ کی اس زندگی میں دو باتیں بالکل عیاں تھیں جنہیں مکہ کے لوگوں میں سے ایک ایک شخص جانتا تھا۔

ایک یہ کہ نبوت سے پہلے کی پوری چالیس سالہ زندگی میں آپنے ایسی کوئی تعلیم تربیت اور

محبت نہیں پائی جس سے آپ کو وہ معلومات حاصل ہوتیں جن کے چشمے یکایک دعویٰ نبوت کے ساتھ ہی آپ کی زبان سے پھوٹنے شروع ہو گئے۔ اس سے پہلے کبھی ان مسائل سے دلچسپی لیتے ہوئے۔ ان مباحث پر گفتگو کرتے ہوئے اور ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے نہیں دیکھے گئے جواب قرآن کی ان پے درپے سورتوں میں زیر بحث آ رہے تھے۔ حد یہ ہے کہ اس پورے چالیس کے دوران میں کبھی آپ کے کسی گہرے دوست اور کسی قریب ترین رشتہ دار نے بھی آپ کی باتوں اور آپ کی حرکات و سکنات میں کوئی ایسی چیز محسوس نہیں کی جسے اس عظیم الشان دعوت کی تمہید کہا جا سکتا ہو۔ جو آپ نے اچانک چالیسویں سال کو پہنچ کر دینی شروع کر دی یہ اس بات کا صریح ثبوت تھا کہ قرآن آپ کے اپنے دماغ کی پیداوار نہیں ہے بلکہ خارج سے آپ کے اندر آئی ہوئی چیز ہے اس لیے کہ انسانی دماغ اپنی عمر کے کسی مرحلے میں بھی ایسی کوئی چیز پیش نہیں کر سکتا جس کے نشوونما اور ارتقاء کے واضح نشانات اس سے پہلے کے مرحلوں میں نہ پائے جاتے ہوں یہی وجہ ہے کہ مکہ کے بعض چالاک لوگوں نے خود بھی جب محسوس کر لیا کہ قرآن کو آپ کے دماغ کی پیداوار قرار دینا صریح طور پر ایک لغو الزام ہے تو آخر کو انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ کوئی اور شخص ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ باتیں سکھا دیتا ہے لیکن یہ دوسری بات پہلی بات سے زیادہ لغو تھی کیونکہ مکہ تو درکنار پورے عرب میں بھی اس قابلیت کا آدمی نہ تھا جس پر انگلی رکھ کر کہہ دیا جاتا کہ یہ اس کلام مصنف سے یا ہو سکتا ہے۔ ایسی قابلیت کا آدمی کسی سوسائٹی میں چھپا کب رہ سکتا ہے۔

دوسری بات جو آپ کی سابق زندگی میں بالکل نمایاں تھی وہ یہ تھی کہ جھوٹ، فریب، جعل مکاری عیاری اور اس قبیل کے دوسرے رذائل میں سے کسی کا ادنیٰ شائبہ تک آپ کی سیرۃ میں نہ پایا جاتا تھا۔ پوری سوسائٹی میں کوئی ایسا نہ تھا جو یہ کہہ سکتا ہو کہ اس چالیس سال کی یکجائی معاشرت میں آپ سے کسی ایسی صفت کا تجربہ اسے ہوا ہے۔ برعکس اس کے کہ جن جن لوگوں کو بھی آپ سے سابقہ پڑا وہ آپ کو ایک نہایت سچے بے داغ اور قابل اعتماد امین انسان کی حیثیت ہی سے جانتے تھے۔ نبوت سے پانچ ہی سال پہلے تعمیر کعبہ کے سلسلے میں وہ مشہور واقعہ پیش آیا تھا جس میں قریش پکار اٹھے تھے ھذا الامین. رضینا. ھذا محمد یہ بالکل راستباز ہیں ہم ان پر راضی ہیں یہ محمد ہیں۔ اس طرح آپ کو نبی مقرر کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ پورے قبیلہ قریش سے بھرے مجمع میں آپ کے امین ہونے کی شہادت لے چکا تھا۔ اب یہ گمان کرنے کی کیا گنجائش تھی کہ جس شخص نے تمام عمر کبھی اپنی زندگی میں کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی جھوٹ اور فریب سے

کام نہیں لیا تھا وہ یکا یک اتنا بڑا جھوٹ اور ایسا عظیم الشان فریب لے کر اُٹھے کہ اپنے ذہن سے کچھ باتیں تصنیف کرے اور ان کو پورے زور اور تحدی سے اللہ سبحانہ کی طرف منسوب کرے اسی لیے اللہ تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے کہ ان کے اس بیہودہ الزام کے جواب میں ان سے کہہ دو کہ اے اللہ کے بندو کچھ تو عقل سے کام لو میں کوئی باہر سے آیا ہوں تمہارے درمیان اس سے پہلے عمر کا ایک حصہ گذار چکا ہوں، میری سابق زندگی کو دیکھتے ہوئے تم مجھ سے یہ کیسے توقع رکھتے ہو کہ میں اللہ سبحانہ کی تعلیم اور اس کے حکم کے بغیر قرآن تمہارے سامنے پیش کر سکتا تھا۔

اس آیت پاک میں درحقیقت وحی الٰہی نے خود اپنے رسول کی سوانح عمری اور سیرت اس کی نبوت کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔

قرآن نے اس آیت میں صرف آپ کی زندگی کے تاریخی پہلو ہی کو پیش نہیں کیا ہے بلکہ آپ کی لائی ہوئی ہدایت کی قابلیت اور جامعیت کے ساتھ ساتھ عملیت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ انسانیت کی تکمیل صرف محمد رسول اللہ کی سیرۃ سے ہو سکتی ہے کیونکہ نمونہ عمل صرف آپ کی زندگی ہے اس کی پشت پر بھرپور تاریخ کے ساتھ پورا پورا عمل ہے یہ جمال اور جلال دونوں کا مجموعہ ہے۔ جامعیت اور اجتماعیت اس زندگی کے دو امتیازی پہلو ہیں۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ
افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۷﴾
وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ
هٰۤؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّــُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ
فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۸﴾

پس اس سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے جو اللہ سبحانہ پر جھوٹ کا بہتان باندھے اور اس سے زیادہ ظالم کون ہو گا جو اللہ سبحانہ کی آیات کو جھٹلائے یقیناً جرائم پیشہ لوگ کبھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتے[۲۵] اور یہ لوگ تو اللہ سے ورے ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو نہ ان کو نقصان دیتی ہیں نہ فائدہ اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے حضور ہمارے سفارشی ہیں[۲۶] اے پیغمبر تم ان سے کہہ دو کیا تم اللہ کو ایسی بات بتلانا چاہتے ہو جو خود آسمانوں اور زمین میں معلوم نہیں ہے پاک ہے اس کی ذات اور برتر ہے ان اعمال شرکیہ سے جو وہ کر رہے ہیں[۲۷]

دوٹوک فیصلہ کے لیے دعوت

قرآن نے دعوت کا جو انداز اختیار کیا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ ایک استدلالی اور عقلی دعوت ہو کہ بغیر اس کے حکمت دانشمندی وعظ و نصیحت پروان نہیں چڑھ سکتی۔ اس بنا پر نبوت محمدیہ سب سے پہلی ربانی آواز ہے جس نے جابرانہ قانون کے بجائے عقل انسانی کو مخاطب کیا۔ غور و فکر کی دعوت دی، فہم و تدبر کا مطالبہ کیا۔ اس لیے ہر تعلیم کے ساتھ تعلیم کی خوبی اور حکمت ظاہر کی اللہ سبحانہ کی ہستی، توحید، رسالت، قیامت، جزاوسزا عبادت نماز، روزہ، زکوۃ، حج اخلاق وغیرہ ہر تعلیم کی تلقین کرتے وقت اس نے اس کی صداقت کی عقلی دلیلیں پیش کی ہیں اور ہر مسئلہ کی مصلحتیں اور حکمتیں علی الاعلان بتائی ہیں۔ اسی مقام میں قرآن نے نبوت کا دوٹوک فیصلہ کے لیے یہ ٹھیٹھ عقلی رہنمائی کی کہ دو باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے جو شخص اللہ پر افترا کرے اس سے بڑھ کر کوئی شریر نہیں اور شریر و مفتری کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ صورت حال نے دو فریق پیدا کر دیئے ہیں اگر میں مفتری علی اللہ ہوں تو مجھے ناکام و نامراد ہونا پڑے گا اور اگر تم سچائی کے مکذب ہو تو تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اس کا قانون ہے کہ مجرموں کو فلاح نہیں دیتا چنانچہ اللہ کا فیصلہ صادر ہو گیا جو مکذب تھے ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا جو صادق تھا اس کا کلمہ صدق آج تک قائم ہے اور قائم رہے گا۔

یہ وہ حقیقت ہے جس کی صدا ہر درو دیوار سے آرہی ہے اور قرآن یہاں اسی حقیقت کا اعلان کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو دعوت عقل و بصیرت اور فہم و تدبر کا ہر معاملہ میں مطالبہ کرتی ہو۔ ہر قوم پر عقلی استدلال ظاہر کرتی ہو وہ اپنے منوانے کے بارے میں جبر اور زبردستی کا طریقہ کیسے اختیار کر سکتی ہے۔

۲۵ پس اس سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے جو اللہ سبحانہ پر جھوٹ کا بہتان باندھے اور اس سے زیادہ ظالم کون ہو گا جو اللہ سبحانہ کی آیات کو جھٹلائے یقیناً جرائم پیشہ لوگ کامیابی سے ہمکنار نہیں ہونے یعنی گنہ گاروں اور مجرموں کو حقیقی کامیابی اور بھلائی حاصل نہیں ہو سکتی ہے اب تم خود فیصلہ کر لو کہ ظالم و مجرم کون ہے۔ اگر بفرض محال میں جھوٹ بنا کر اللہ سبحانہ کی طرف منسوب کر رہا ہوں تو مجھ سا ظالم کوئی نہیں ہو سکتا لیکن گذشتہ آیت میں جو دلیل بیان کی گئی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ احتمال بالکل باطل ہے پھر جب میرا سچا ہونا ثابت

ہو گیا اور تم جہل و عناد سے خدا کے کلام کو جھٹلا رہے ہو تو اب زمین کے پردہ پر تم سے بڑا ظالم کوئی نہیں [1] خلاصہ یہ کہ اگر یہ آیات اللہ سبحانہ کی نہیں ہیں اور میں انہیں خود تصنیف کر کے آیات الٰہی کی حیثیت سے پیش کر رہا ہوں تو مجھ سے بڑا ظالم کوئی نہیں۔ اور اگر یہ واقعی اللہ کی آیات ہیں اور تم ان کو جھٹلا رہے ہو تو پھر تم سے بڑا بھی کوئی ظالم نہیں۔

یہ جو فرمایا کہ انہ لا یفلح المجرمون تو اس کا مطلب یہ قانون بتانا ہے کہ جرائم پیشہ جب اہل حق کے مقابلے پر ہوں تو جرائم کو کامیابی فلاح نہیں ہوتی یہ مطلب نہیں کہ کفر ظلم اور جرم کامیاب نہیں ہوتے ان کو ناکامی اس وقت ہوتی ہے جب جرائم کے مقابلہ میں اعمال صالحہ ظلم کے مقابلے میں عدل کفر کے مقابلے میں ایمان ہو اور اس مقابلے میں ایمان عدل اور عمل صالح کامیابی کے وسائل اختیار کرے۔ یہ بات کہ ایمان، ایمان کے تقاضوں کے ساتھ کفر کے مقابلے پر نہ ہو اور کفر لازماً ناکام ہو اپنے میں کوئی معنویت نہیں رکھتی ہے۔

اس فقرے سے یہ نتیجہ نکالنا بھی صحیح نہیں ہے کہ جو شخص نبوت کا دعویٰ کر کے جیتا ہے یا دنیا میں پہلے یا اس کی دعوت کو فروغ نصیب ہو وہ یقیناً نبی ہے کیونکہ اس نے فلاح پائی ہے یہ احمقانہ استدلال صرف وہ شخص کر سکتا ہے جو نہ تو قرآنی اصطلاح فلاح کا مفہوم جانتا ہو نہ اس کے قانون امہال سے واقف ہو جو قرآن کے بیان کے مطابق اللہ سبحانہ نے مجرموں کیلئے مقرر فرمایا ہے یہاں یہ فقرہ انہ لا یفلح المجرمون جس سیاق میں بولا گیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ میں یقین کے ساتھ جانتا ہوں کہ مجرموں کو فلاح نصیب نہیں ہو سکتی اس لیے خود تو یہ جرم نہیں کر سکتا کہ نبوت کا جھوٹا دعویٰ کروں البتہ تمہارے متعلق مجھے یقین ہے کہ تم مجھے جھٹلانے کا جرم کر رہے ہو اس لیے تمہیں فلاح نصیب نہ ہو گی۔

مشرکین کی مجرمانہ زندگی کا حوالہ

[2] ۲۶ اور یہ لوگ تو اللہ سے ورے ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو نہ ان کو نقصان دیتی ہیں نہ فائدہ اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے حضور میں ہمارے سفارشی ہیں۔ وہ معاملہ تو اللہ کے پیغمبر کے ساتھ تھا اب ان کی خدا پرستی کا حال سنئے کہ اللہ سبحانہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

جن کے قبضہ قدرت میں نفع و ضرر کچھ بھی نہیں جب پوچھا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ بیشک بڑا خدا تو ایک ہے جس نے آسمان و زمین پیدا کیے مگر ان اصنام بتوں وغیرہ کو خوش رکھنا اس لیے ضروری ہے کہ یہ سفارش کر کے بڑے خدا سے دنیا میں ہمارے اہم کام درست کرا دیتے ہیں۔ اور اگر موت کے بعد دوسری زندگی ہوگی تو وہاں بھی ہماری سفارش کریں گے باقی چھوٹے موٹے کام جو خود ان کے حدود اختیار میں ہیں ان کا تعلق تو صرف ان ہی سے ہے بنار علیہ ہم کو ان کی عبادت کرنی چاہیئے۔[1]

اس آیت کی تشریح میں چند ضروری باتیں وضاحت طلب ہیں - (۱) یعبدون من دون الله مالا یضرهم وہ ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو ان کو نہ نقصان دیتی اور نہ نفع ان چیزوں کو قرآن نے اصنام، تماثیل اور اوثان کہا ہے۔ ان میں باہم فرق کیا ہے عام شارحین قرآن نے ان کا ترجمہ بتوں اور مورتیوں سے کیا ہے حضرت ابراہیم کے ایک سوال کے جواب میں قوم نے ان کو جواب دیا نعبد اصناما فنظل لها عاکفین ہم پوجتے ہیں مورتوں کو سارے دن ان ہی میں لگے رہتے ہیں اور جب حضرت ابراہیم نے یہ سوال کیا ما هذه التماثیل التی انتم لها عاکفون یہ مورتیں کیا ہیں جن پر تم مجاور بنے بیٹھے ہو اور حضرت ابراہیم ہی نے قوم کو مخاطب کر کے فرمایا انما اتخذتم من دون الله اوثانا تم نے اللہ کو چھوڑ کر بتوں کے تھان بنا لیئے۔ ان تینوں میں بہت بڑا معنوی فرق ہے۔ مرتضیٰ زبیدی نے تاج العروس میں ان میں فرق بتایا ہے مشہور امام لغت جوہری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وثن اور صنم دونوں مترادف ہیں۔ لیکن ہشام کلبی نے کتاب الاصنام میں یہ فرق بتایا ہے کہ تصویر لکڑی یا سونے چاندی کی ہو تو صنم ہے اور اگر پتھر سے تو وثن ہے۔ اور کچھ کی رائے ہے کہ جس کا ڈھانچہ سونے چاندی کا ہو وہ وثن ہے اور جس کی صورت بھی نمایاں ہو وہ صنم ہے، اور کچھ کے خیال میں صنم شمن کا معرب ہے بہر حال صنم ہو یا وثن ہو عرب ان کی پوجا کرتے تھے ان کو سجدہ کرنا ان کے نام پر جانوروں کا ذبح کرنا ان کا طواف کرنا ان کے نام کی نذر و نیاز چڑھاوے چڑھانا ان کے اعمال عبادت تھے۔

یہ مورتیاں اور یہ بت اشخاص تھے اور ان اشخاص کے باقاعدہ نام تھے، ان اشخاص کے ناموں کے پیچھے ان کی شخصیتیں تھیں۔ یہ شخصیتیں کچھ ملائکہ کی تھیں اور کچھ بزرگوں کی تھیں۔ اہل عرب اتنے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہرگز نہیں بلکہ دنیا کی مشرک قوموں کی طرح وہ اپنی عبادات کی ایک فلاسفی رکھتے تھے حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے ان کے مشرکانہ اعمال کا فلسفہ یہ بتایا ہے۔ پلید الذہن نہ تھے کہ صرف ہاتھوں کے تراشے ہوئے ڈھانچوں سے عابدانہ تعلقات رکھتے ہوں نہیں

ان کا موقف یہ تھا کہ اب سے پہلے کچھ نیکوکار اور بزرگ شخصیتیں ایسی ہوئی ہیں جنہوں نے اللہ سبحانہ کی بہت عبادت کی ہے اور عبادت گذاری کے ذریعے اللہ کا اتنا قرب حاصل کر لیا ہے کہ اللہ نے ان کو خلعت الوہیت عطا فرما دیا ہے، اس وجہ سے وہ ہماری عبادتوں اور نیازمندانہ اعمال کے حقدار ہو گئے ہیں یہ بالکل ایسا ہے جیسے کسی بادشاہ کی کوئی نوکر بہت خدمت گذاری کرے اور اپنی خدمت گذاری میں اتنا حسن پیدا کرے کہ بادشاہ خوش ہو کر اس کو خلعت شاہی عطا فرما دے اور ملک کے کچھ حصہ کا سارا کاروبار اس کے سپرد کر دے۔ جیسے شہر والوں کی اس نوکر کی اطاعت فرماں برداری بادشاہ کی مرضی و خوشنودی ہے ایسی ہی ان بزرگوں کی عبادت بھی رضائے الٰہی کا پیمانہ ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اللہ کی کسی عبادت کو شرف پذیرائی حاصل نہیں ہو سکتا جب تک اللہ کی عبادت میں ان بزرگوں کی عبادت کی ملاوٹ نہ ہو بلکہ اس پر بھی یہ اضافہ کرتے ہیں کہ اللہ سبحانہ کی ذات گرامی تو بالا و بالاتر ہے قرب کے لیے اس کی عبادت سودمند نہیں ہے ضروری ہے کہ ان بزرگوں کی عبادت کی جائے تاکہ ان کے ذریعے اللہ تک رسائی ہو جائے۔ ہر شخصیتیں سنتی ہیں دیکھتی ہیں اپنے پرستاروں کی سفارش کرتی ہیں۔ سارے کام بناتی اور چلاتی ہیں ان شخصیتوں کے ناموں پر پیشیروں کے اشخاص مورتیاں اور بت بناتے تھے۔

امام رازی نے تفسیر کبیر میں ان اشخاص کے پیچھے شخصیتوں کا ذکر کیا ہے۔

اہل عرب نے یہ اصنام اور اوثان اپنے نبیوں اور بزرگوں کی تصاویر کی صورت میں بنائے تھے اور ان کا تصور یہ تھا کہ جب ان تصویروں کی عبادت کی جائے گی تو وہ شخصیتیں جن کے یہ اشخاص ہیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کی سفارش کر دیں گے گے۔ تفسیر کبیر

اب بات کھل کر سامنے آگئی کہ یہ اشخاص جن کی مشرکین عبادت کرتے ہیں صرف اشخاص نہیں بلکہ

شخصیتوں کی جاتی ہے۔

قرآن نے شرک کی تردید میں جو انداز اختیار کیا ہے اس میں اس کے پیش نظر دونوں ہیں اشخاص بھی یعنی بت اور مورتیاں اور وہ شخصیتیں بھی جن کی یہ مورتیں ہیں حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔

اللہ سبحانہ کبھی شرک کی تردید یہ کہہ کر کرتا ہے کہ حکومت اور فرمان روائی صرف اللہ کی ہے اور کبھی یہ کہہ کر تردید کرتا ہے کہ یہ تو جمادات ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ کبھی شخصیتوں کو سامنے رکھ کر شرک کی تردید کی جاتی ہے اور کبھی اشخاص کو پیش نظر رکھ کر تردید کی جاتی ہے جب اشخاص پیش نظر ہوتے ہیں تو انداز تعبیر میں وہ الفاظ استعمال کرتا ہے جو غیر ذوی العقول کے لیے بولے جاتے ہیں جیسے پیش نظر آیت میں مایعبدون ہے اور جب شخصیتیں پیش نظر ہوتی ہیں تو اندازہ تعبیر وہ ہوتا ہے جو ذوی العقول کے لیے ہوتا ہے جیسے قل انی نھیت ان اعبد الذین تدعون من دون اللہ۔

شرک کی گوناں گوں صورتیں پرستش اور بندگی کی دنیا میں جو رائج تھیں وہ سب عرب میں موجود تھیں قرآن نے ان سب کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔

شرک کا اصلی نقصان یہ ہے کہ اللہ سبحانہ سے انسان کو جس درجہ کا تعلق جس قسم کا عجز و نیاز جس مرتبہ کی محبت جس درجہ کی التجا درکار ہے اس کا رخ دوسری جانب بدل جاتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں آدمی ہیں جو اچھی طرح جانتے ہیں کہ دیوتا کائنات اور زمین و آسمان کے خالق نہیں ہیں تاہم وہ ہر قسم کی حاجتیں اور مرادیں ان ہی دیوتاؤں اور معبودوں سے مانگتے ہیں ان ہی کو حاجت روا جانتے ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے ان ہی کا نام لیتے ہیں ان ہی کی نذر و نیاز چڑھاتے ہیں غرض براہ راست ان کو جو تعلق ہوتا ہے ان ہی معبودوں سے ہوتا ہے۔ خود مسلمانوں میں ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا طرز عمل انبیاء صلحاء اور اولیاء بلکہ مزارات کی نسبت اس کے قریب قریب ہے۔ اس لیے سب سے اہم اور بنیادی کام یہ ہے کہ معبودوں کی نسبت اس قسم کا خیال نہ پیدا ہونے پائے بلکہ صاف صاف جتا دیا جائے کہ اللہ سبحانہ کے سوا کسی کی نہیں چلتی اور اس کی مرضی میں کوئی دست اندازی نہیں کر سکتا۔ اللہ سبحانہ کے سوا کوئی نفع اور نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

خودساختہ شفاعت

۱۸؎ اے پیغمبر تم ان سے کہہ دو کیا تم اللہ کو ایسی بات بتانے ہو جو خود اللہ سبحانہ کو آسمان وزمین میں معلوم نہیں ہے پاک ہے اللہ کی ذات اور برتر ہے ان اعمال شرکیہ سے جو وہ کر رہے ہیں یعنی بتوں کا شفیع ہونا اور شفیع کا مستحق عبادت ہونا دونوں دعوے غلط اور بے بنیاد ہیں اور ظاہر ہے کہ اللہ کے علم میں وہ ہی چیز ہوگی جو واقعی ہو۔ لہذا تعلیم الٰہی کے خلاف ان غیر واقعی اور خود تراشیدہ اصول کو حق بجانب ثابت کرنا گویا اللہ تعالیٰ کو ایسی چیزوں کے واقعی ہونے کی خبر دینا ہے جن کا ہونا آسمان وزمین میں کہیں بھی اسے معلوم نہیں ہے یعنی کہیں بھی اس کا وجود نہیں ہے ہوتا تو اس کے علم میں ضرور ہوتا۔ پھر اس سے منع کیوں کرتا ۱؎ مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کا اللہ کے علم میں نہ ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ سرے سے موجود نہیں کیونکہ ہر چیز اپنے موجود ہونے کے لیے علم الٰہی کی محتاج ہے اور اللہ کی ذات اپنے علم کے چیز کے وجود کا محتاج نہیں ہے اس لیے سب کچھ جو موجود ہے اللہ کے علم میں ہے بس سفارشوں کے معدوم ہونے کے لیے یہ ایک نہایت لطیف انداز ہے کہ اللہ تعالیٰ تو جانتا نہیں کہ زمین وآسمان میں کوئی اسکی بارگاہ میں تمہاری سفارش کرنے والا ہے پھر یہ تم کن سفارشیوں کی اسے خبر دے رہے ہو۔

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے یہ بات کیونکر سمجھائی ہے کہ مشرک غیر اللہ کی پوجا کرتے ہیں لیکن ان کی پوجا کی اصلی علت ان کا یہ باطل نظریہ ہے کہ یہ اللہ سبحانہ کی بارگاہ میں ہمارے سفارشی ہیں۔ اور سفارش سے اسباب کی زنجیر سے باہر سفارش مراد ہے کہ دور دراز سے غائبین کو پکارا جائے اور سفارشی بنایا جائے کیونکہ ایسا کرنے سے شفیع میں علم غیب اور حاضر وناظر کی صفت ماننی پڑتی ہے اور یہ خالص شرک ہے۔ اب غور کرنا چاہیے کہ مشرک کن کن لوگوں کو سفارشات کی مدعی اپنا سفارشی جانتے تھے۔ سن رہے ہو کہ عرب مشرکین نے انبیاء اور اکابر کی تصابر کو اصنام داوثان کو شکل دے رکھے تھے ان کے خیال میں جیسا کہ امام رازی نے تفسیر میں بھی اکابر و اولیاان کے شفعاء تھے آگے امام رازی کی بات سننے کے لائق ہے۔

اس زمانہ میں اس کی نظیر یہ ہے کہ بہت سے لوگ اکابر کی قبور کی تعظیم میں مشغول

۱؎ افادات شیخ الاسلام

ہیں اس اعتقاد سے کہ وہ اکابر کی قبروں کی تعظیم کریں گے تو وہ ان کے لئے اللہ کی بارگاہ میں سفارش کریں گے۔

یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ اگر ان مشرکین کا یہ عقیدہ ہوتا کہ یہ اکابر ہی سب کچھ کرنے والے ہیں تو پھر بارگاہ الہی میں ان کی شفاعت میں کوئی معنویت نہیں ہے بت پرست عورتوں کا عقیدہ یہی تھا کہ یہ ہستیاں جن کی یہ مورتیاں ہیں اللہ کی طرف سے عالم میں مختار کل ہیں وہ سب کچھ جانتے ہیں اسی عقیدہ کا نام انہوں نے شفاعت رکھا تھا اور یہ اکابر ان کے شفیع تھے۔ قرآن نے اس آیت میں اس مشرکانہ شفاعت کی بھرپور تردید کی ہے اور بتا دیا کہ اس قسم کی شفاعت کا کوئی وجود نہیں ہے۔

شارحین قرآن اس گتھی کے سلجھانے میں پریشان ہیں کہ شفاعت سے یہاں کونسی شفاعت مراد ہے۔ آخرت میں ہونے والی شفاعت یا اس مادی دنیا میں معاشی مشکلات کے حل کے لیے شفاعت۔

ظاہر یہی ہے کہ مشرک کا شرکیہ اعمال میں پس منظر اس دنیا میں معاشی مشکلات ہوتی ہیں۔ عزت وجاہ کے لیے کاروبار میں فروغ کے لیے اور اولاد کے لیے مصائب وآفات سے بچنے کے لیے۔ امام حسن نے آیت قرآنی سے یہی بات سمجھی ہے کہ شفاعت سے مراد اس مادی دنیا میں شفاعت ہے۔ اور جن لوگوں نے آخرت میں شفاعت کو آیت قرآنی کا مدلول بنایا ہے ان کو بھی قیامت کے بارے میں مشرکین کی ذہنی افتاد کو دیکھتے ہوئے بات بنانی پڑی ہے کہ اگر بالفرض قیامت آتی ہے اور ہمارا حساب وکتاب ہوتا ہے تو یہ ہستیاں ہماری شفاعت کریں گی۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ
سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَ
يَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ
لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۲۰﴾ ع

ع ۱۰

پوری انسانیت تو ایک ہی امت تھی پھر وہ الگ الگ ہو گئے[۲۸] اور اگر تیرے رب کی جانب سے پہلے ہی ایک بات نہ ہوئی ہوتی تو ان کے باہمی کا اختلاف کا فیصلہ ہو چکا ہوتا[۲۹] اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ کیوں اس پیغمبر پر اس کے رب کی جانب سے کوئی نشانی نہیں اتاری گئی ہے تو اے پیغمبر کہدو کہ غیب کا علم تو صرف اللہ ہی کو ہے۔ بس انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں[۳۰]

مفردات کے معانی

امۃ جماعت، مدت طریقہ دین، ہر وہ جماعت جس میں کسی قسم کا رابطہ اشتراک ہوا سے

امت کیا جاتا ہے اخفش نے تصریح کی ہے کہ امت باعتبار لفظ کے واحد ہے اور باعتبار معنی کے جمع ہے۔ نیز حیوان کی ہر جنس ایک امت ہے ابن درستویہ کا بیان ہے جہاں بھی امت کے معنے مدت کے ہوں وہاں اس کا مضاف محذوف ہو گا اور مضاف الیہ مضاف کے قائمقام ہوگا امت کے مجازی معنی طریقہ اور دین کے بھی آتے ہیں عرب والے بولتے ہیں کہ فلان لا امۃ له فلانے کا کوئی دین اور طریقہ نہیں ہے۔

سبقت سبق سے ماضی کا واحد مؤنث غائب ہے اس کا باب ضرب ہے اسی سے مسابقۃ۔ استباق آتے ہیں پہلے ہونا۔ پہلے گذر جانا یعنی اللہ کی طرف سے بات پہلے ہو چکی ہے۔ اصلی معنے چلنے میں آگے ہونے کے ہیں۔

آیۃ نشانی۔ حکم خداوندی پیغام الہی، دلیل، اور معجزہ۔ آیت کے اصل معنی ظاہری نشانی کے ہیں۔ اور اسی معنی کے اعتبار سے قرآن عزیز کی آیت کو آیت کہتے ہیں کہ وہ گویا بات کے ختم ہونے کی نشانی ہے اور بعض اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ چونکہ آیت کے معنے جماعت کے ہیں اور آیت قرآنی میں حروف کا مجموعہ ہوتا ہے اس لیئے اس کو آیت کہتے ہیں۔ اور کچھ کہتے ہیں کہ چونکہ یہ اعجاز قرآنی کی نشانی ہے اس لیے آیت کہہ دیا گیا ہے۔

توحید کے لیے تاریخی شہادت

ابتدا میں انسانی جمعیت کا یہ حال تھا کہ لوگ قدرتی زندگی بسر کرتے تھے ان میں نہ تو کسی طرح کا باہمی اختلاف تھا نہ کسی طرح کی مخاصمت سب کی زندگی ایک ہی طرح کی تھی اور سب اپنی قدرتی سادگی پر قانع تھے پھر ایسا ہوا کہ نسل انسانی کی کثرت اور ضروریات معیشت کی وسعت سے طرح طرح کے اختلافات پیدا ہو گئے اور اختلافات نے تفرقہ و انقطاع اور ظلم و فساد کی صورت اختیار کر لی۔ ہر گروہ دوسرے گروہ سے نفرت کرنے لگا۔ اور ہر زبردست زیر دست کے حقوق پامال کرنے لگا۔ جب یہ صورت حال ہوئی تو ضروری ہوا کہ نوع انسانی کی ہدایت اور عدل و صداقت کے قیام کے لیے وحی الہی کی روشنی رونما ہو۔ چنانچہ روشنی نمودار ہوئی اور اللہ کے رسولوں کی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ شروع ہو گیا وہ تمام رہنما جن کے ذریعے اللہ کی جانب سے ہدایت آئی ہے ان کو اللہ کا رسول کہا گیا۔

یہ ہدایت کسی خاص ملک و قوم یا عہد کے لیے مخصوص نہ تھی بلکہ تمام نوع انسانی کے

بے حقی۔ اللہ سبحانہ کی وحی کی رہنمائی سب جگہ ایک ہی ہے وہ ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتی ایک ہی ہے اور ایک ہی طرح تمام انسانوں کو مخاطب کرتی ہے۔ اللہ سبحانہ کے جس قدر فرستادے آئے ہیں خواہ وہ کسی گوشے اور کسی زمانے میں سب کی راہ ایک تھی سب کی پکار ایک تھی اور سب اللہ سبحانہ کے ایک ہی عالمگیر قانون سعادت کی تعلیم دینے والے تھے۔ قانون صرف یہ بتانے آئے تھے کہ ایمان اور عمل صالح سے ہمدوش ہو اور ایک پروردگار عالم سے عابدانہ تعلقات پیدا کرو اس کے علاوہ اور اس کے خلاف جو کچھ بھی دین کے نام سے کہا جاتا ہے وہ دین حقیقی نہیں بناوٹی ہے

۲۸ پوری انسانیت تو ایک ہی امت تھی وہ الگ الگ ہو گئے ممکن تھا کہ مشرکین کہتے کہ اللہ نے تمہارے دین میں منع کیا ہوگا ہمارے دین میں منع نہیں کیا گیا۔ اس کا جواب دے دیا کہ اللہ کا دین ہمیشہ سے ایک ہے اعتقادات حقہ میں کوئی فرق نہیں۔ درمیان میں جب لوگ بہک گئے اور جدا جدا ہو گئے۔ اللہ سبحانہ نے ان کو سمجھانے اور دین حقیقی پر لانے کے لیے انبیاء روانہ کیے۔ کسی زمانہ اور کسی ملت میں اللہ نے شرک کو جائز نہیں رکھا[1] قرآن بتانا یہ چاہتا ہے کہ اللہ سبحانہ نے تمہیں ایک ہی جامہ انسانیت دیا تھا لیکن طرح طرح کے بھیس اور نام اختیار کر لیے اور رشتہ انسانیت کی وحدت سینکڑوں ٹکڑوں میں بکھر گئی۔ تمہاری نسلیں بہت سی ہیں اس لیے تم نسل کے نام پر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ تمہارے وطن بہت بن گئے ہیں اس لیے اختلاف وطن کے نام پر ایک دوسرے سے لڑ رہے ہو۔ تمہاری قومیتیں بے شمار ہیں اس لیے ہر قوم دوسری قوم سے دست و گریبان ہو رہے ہو۔ تمہارے رنگ یکساں نہیں یہ بھی باہمی نفرت و عناد کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ تمہاری بولیاں مختلف ہیں اور یہ بھی ایک دوسرے سے جدا ہونے کی بہت بڑی حجت بن گئی۔ ان بے شمار اختلافات کی دلدل میں تم پھنسے ہوئے ہو اور ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہو۔ ایسی حالت میں بتلاؤ وہ رشتہ کونسا رشتہ ہے جو اختلافات کے اس ہجوم میں انسانوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دے اور انسانیت کا بکھرا ہوا گھرانہ پھر از سر نو آباد ہو جائے۔ قرآن کہتا ہے کہ وہ صرف ایک رشتہ ہے وہ اللہ سے عابدانہ تعلقات کا رشتہ ہے آؤ سب اس ایک رشتہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

جو طرح جاؤ تم کتنے ہی الگ الگ ہو گئے ہو لیکن تمہارے لیے اللہ سبحانہ کی ذات الگ نہیں ہو سکتی تم سب ایک ہی رب کے بندے ہو تم سب کی پرستش اور بندگی کے لیے ایک ہی معبود کی چوکھٹ ہو قرآن نے یہی بات کہی ہے ذالکم اللہ ربکم فاعبدوہ اور یہودیوں اور عیسائیوں سے کہی ہے تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم ان لا نعبد الا اللہ۔ بے شمار اختلافات رکھنے پر بھی ایک ہی رشتہ عبودیت میں جکڑے ہوئے ہو تمہاری کوئی نسل ہو تمہاری کوئی قومیت ہو تمہارا کوئی وطن ہو اور تمہاری کوئی زبان ہو لیکن ایک اللہ کے آگے سر نیاز جھکا دو گے تو یہ آسمانی رشتہ تمہارے زمینی اختلافات مٹا دے گا۔ تم محسوس کرو گے کہ تمام دنیا تمہارا وطن ہے تمام نسل انسانی تمہارا گھرانا اور تم ایک رب العالمین کے بندے ہو۔ سب نبیوں کی یہی تعلیم تھی کہ اللہ سبحانہ سے عابدانہ رشتے پر قائم رہو اور اس میں ایک دوسرے سے الگ الگ نہ ہو جاؤ۔

ہجوم اختلافات میں آخری فیصلہ

۲۹ے اور اگر تیرے رب کی جانب سے پہلے ہی ایک بات نہ ہوئی ہوتی تو ان کے باہمی اختلاف کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ یعنی لوگوں کے باہمی اختلافات کا فیصلہ زبردستی اس لیے نہیں کیا کہ پہلے سے اللہ سبحانہ کے علم میں یہ بات طے شدہ تھی کہ یہ دنیا دار عمل موقع واردات ہے۔ قطعی اور آخری فیصلہ کی جگہ نہیں ہے یہاں انسانوں کو کسب واختیار دے کر قدرے آزاد چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ جو راہ عمل چاہیں اختیار کریں۔ اگر یہ بات پہلے طے نہ ہو چکی ہوتی تو سارے اختلافات کا فیصلہ مکدم کر دیا جاتا۔ لے حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ

> اگر اللہ سبحانہ کی جانب سے پہلے یہ بات طے شدہ نہ ہوتی کہ اللہ سبحانہ کسی کو قیام حجت کے بغیر اور ہر کام کے لیے تاجیل کا قانون نہ ہوتا تو ان کے اختلافات کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔

بتانا یہ ہے کہ اگر اللہ سبحانہ کا نظام قانونی نہ ہوتا بلکہ ہنگامی اور وقتی حالات کے تابع ہوتا تو ان کے اختلافات کو بزور مٹا دیا جاتا اس کا قانون ان کو فرصت پر فرصت دیتا ہے اور اس پر فضل و عفو

لے افادات شیخ الاسلام

درگذر کا دروازہ آخر تک کھلا رکھتا ہے بلاشبہ اس کے قوانین اپنے نفاذ میں اٹل ہیں ان میں رد و بدل کا امکان نہیں۔ اللہ سبحانہ کی اگر مشیت ہوتی تو ہر حالت بیک دفعہ ظہور میں آجاتی اور اس کے قوانین کا نفاذ فوری اور ناگہانی ہوتا لیکن اللہ سبحانہ نے ہر حالت ہر تاثیر کے ظہور کے لیے ایک خاص مدت مقرر کر دی ہے اور ضروری ہے کہ بتدریج درجہ بدرجہ مختلف منزلیں پیش آئیں اس کا قانون یہ ہے کہ وما کنا معذبین حتی نبعث رسولا۔

اہل ایمان معجزات طلب نہیں کرتے

۲۰ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ کیوں نہیں اس پیغمبر پر اس کے رب کی جانب سے کوئی نشانی نہیں اتاری گئی ہے تو اے پیغمبر کہہ دو کہ غیب کا علم تو صرف اللہ کو ہے بس انتظار کرو میں بھی تمہاری ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں یعنی جن نشانیوں کی وہ فرمائش کرتے تھے ان میں سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ صداقت کے نشان پہلے بہت دیکھ چکے ہو فرمائشی نشان دکھلانا ضروری نہیں ہے نہ چنداں مفید ہے آئندہ جو اللہ سبحانہ کی مصلحت ہوگی وہ نشان دکھلائے گا اس کا علم خدا ہی کو ہے کہ مستقبل میں کس شان اور نوعیت کا نشان ظاہر کرے گا سو تم منتظر رہو۔ ہم بھی انتظار کرتے ہیں موضح القرآن میں ہے یعنی اگر کہیں کہ ہم کاہے سے جانیں کہ تمہاری بات سچ ہے فرمایا کہ آگے دیکھو حق تعالیٰ اس دین کو روشن کرے گا اور مخالف ذلیل ہوں گے برباد ہو جائیں گے سو ایسا ہی ہوا سچ کی نشانی ایک بار کافی ہے اور ہر بار مخالف ذلیل ہوں تو فیصلہ ہو جائے حالانکہ فیصلہ کا دن دنیا میں نہیں ہے[1] دوسرے لفظوں میں اس کی وضاحت یہ ہے کہ اس بات کی نشانی کہ آپ واقعی نبی ہیں اور اللہ سبحانہ کی جانب سے جو کچھ پیش فرما رہے ہیں بالکل درست ہے حضور اقدس کے مخاطبوں کا یہ مطالبہ کچھ اس لیے نہ تھا کہ وہ سچے دل سے دعوت حق کو قبول کرنے اور اس کے تقاضوں کے مطابق اپنی پوری زندگی کو ڈھال لینے کے لیے تیار تھے بلکہ نشانی کا مطالبہ محض ایمان نہ لانے کے لیے ایک بہانہ کے طور پر پیش کر رہے تھے جو نشانی بھی پیش کی جاتی اس کے بعد یہی کہتے کہ کوئی نشانی تو پیش نہیں کی گئی۔ کیونکہ وہ ایمان ہی لانا نہیں چاہتے تھے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مادی آسائشوں کو چھوڑ کر وہ ایسی غیبی حقائق کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے جنہیں مان لینے کے بعد ان کو سارا نظام زندگی تبدیل کرنا پڑتا۔

آیات نبوت کی دو قسمیں

اصل یہ ہے کہ آیات نبوت دو قسم کی ہوتی ہیں ایک ظاہری اور مادی دوسری باطنی و روحانی۔ ظاہری تو وہ دلائل ہیں جنکو لوگ عام طور پر معجزات کہتے ہیں شلاً مردہ کا زندہ کرنا عصا کا سانپ بن جانا اور باطنی دلائل مدعی نبوت کی صداقت، معصومیت تزکیہ تاثیر، تعلیم، ہدایت ارشاد فلاح اور تائید ہے اہل نظر اور حقیقت شناسوں کے لیے یہی باطنی آثار و آیات نبوت کی حقیقی نشانیاں ہیں۔ باقی ظاہری نشانیاں صرف سطحی اور ظاہر بیں نگاہوں کے لیے ہیں جو ہر چیز کو ان ظاہری آنکھوں سے دیکھکر پہچانتی ہیں۔ امام بخاری نے اپنی صحیح کے دیباچہ میں نبی کی تعریف کرنے کے بعد جو نبی شناسی کے پیمانے بتائے ہیں وہ سب باطنی نشانیاں ہیں اور یہ بتایا ہے کہ حقیقت شناس صرف باطنی نشانیوں کے طلب گار ہوتے ہیں ان باطنی نشانیوں میں سب سے پہلے خدیجۃ الکبری کی یہ شہادت نقل کی ہے۔

آپؐ تو صلہ رحمی کرتے ہیں۔ آپؐ تو معاشرے میں گھرے ہوئے افراد کو اٹھاتے ہیں۔ آپ تو فقراء کے لیے کماتے ہیں آپ تو مہمان نوازی کرتے ہیں آپ تو حق پر آنے والے مصائب پر لوگوں کا ہاتھ بٹاتے ہیں یہ حضرت خدیجہ کا بتایا ہوا اخلاقی پیمانہ ہے۔ اس کے بعد حضرت خدیجہ حضور اقدس کو ورقہ ابن نوفل کے پاس لے گئیں، ورقہ نے غار حرا کی داستان سن کر کہا کہ هذا هو الناموس الذی نزل الله علی موسیٰ یہ تو وہی ناموس ہے جو حضرت موسیٰ پر وحی لے کر آتا تھا۔ یہ ورقہ کا بتایا ہوا نوعی پیمانہ ہے اس کے بعد امام بخاری نے بادشاہ روم کا پیش کیا ہوا پیمانہ پیش کیا ہے جس میں بادشاہ روم نے حضور کے شدید ترین مخالف سے سوالات کیے ہیں جس کے جوابات ابوسفیان نے دیئے ہیں مثلاً

قیصر:	مدعی نبوت کا خاندان کیسا ہے؟	ابوسفیان	شریف ہے
"	خاندان میں کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟	"	نہیں
"	خاندان میں کوئی بادشاہ ہوا ہے؟	"	نہیں
"	اس کے پیروکار کون لوگ ہیں؟	"	کمزور ہیں

تیصر: وہ بڑھ رہے ہیں گھٹ رہے ہیں ؟	ابوسفیان :	بڑھ رہے ہیں
" کبھی اس کے جھوٹ کا تجربہ کیا ہے ؟	"	نہیں
" عہد کی خلاف ورزی کبھی کی ہے ؟	"	ابھی تک تو نہیں
" کبھی اس سے جنگ کی ہے ؟	"	ہاں
" نتیجہ کیسا رہا ؟	"	کبھی وہ غالب اور کبھی ہم
" وہ کیا سکھاتا ہے	"	کہتا ہے کہ ایک اللہ کی عبادت کرو کسی کو شریک نہ بناؤ، نماز پڑھو پاکدامنی اختیار کرو، سچ بولو۔ صلہ رحمی کرو۔

یہ تمام سوالات صرف پیغبر کے حقیقی آثار سے متعلق ہیں اور یہ علمی وعقلی پیمانہ ہے۔ امام بخاری بتانا چاہتے ہیں یہ نبی شناسی کے اصلی پیمانے ہیں۔ الغرض نبوت کی حقیقت ظاہری اور مادی نشانی نہیں بلکہ باطنی اور روحانی خوبیاں نبوت کی نشانیاں ہیں۔

ظاہری اور مادی نشانیاں صرف وہ معاندین طلب کرتے ہیں جن کے دل کی آنکھیں اندھی ہوتی ہیں اور جو تعصب وعناد اور جہل کے باعث حق کے ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے اس دور کے اہل ایمان کے حالات پر غور کرو کہ معجزات کی طلب نیکو کاروں نے نہیں کی۔ حضور اقدس سے ابوبکر و عمر نے نہیں بلکہ ابوجہل و ابولہب نے معجزہ مانگا۔ قرآن عزیز نے اس حقیقت کو پوری طرح الم نشرح کیا ہے اور طلب معجزہ کے سوال کو ہمیشہ کفار کی طرف منسوب کیا ہے۔

ایک خلش اور اس کا ازالہ

کفار کا یہ مطالبہ لولا انزل علیه ایة من ربه پڑھ کر بعض نادان یہ سمجھتے ہیں کہ حضور اقدس نے ان کو کوئی معجزہ نہیں دکھایا اگر وہ کوئی معجزہ دیکھ لیتے تو بار بار معجزہ کے لیے اصرار کیوں کرتے ؟ لیکن یہ استدلال سرتاسر غلط ہے ان کو نفس معجزہ طلب کرنے پر نہیں بلکہ مادی اور ظاہری معجزہ طلب کرنے پر تنبیہ کی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ نشانیوں کے ظاہر ہونے پر بھی یہ عناد سے طلب معجزہ پر مصر ہیں۔ چنانچہ ان تمام مقامات پر جہاں کفار کے اس طلب معجزہ کا ذکر ہے یہ تصریح موجود ہے اور انہیں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ان کو چاہیے کہ نبوت کے اصلی آثار و

علامات کی طرف توجہ کریں کہ سعادت مند دلوں کی تسلی ان ہی سے ممکن ہے۔

معجزات مادی تو بہر حال کسی نہ کسی آنی زمانہ اور مخصوص وقت میں ظاہر ہوتے ہیں اور ہر دنیا کے دوسرے حوادث کی طرح فنا ہو جاتے ہیں اس بنا پر اگر ہر معاند کے سوال پر نبوت معجزہ ہی دکھاتی رہے تو یہ تسلسل شائد کبھی ختم نہ ہو۔ اور نبوت کی ساری زندگی ایک مداری کی حیثیت اختیار کرے۔ اس نے ظاہری معجزہ طلب کرنے والوں کو دائمی اور مسلسل معجزہ کی طرف ملتفت ہونے کی تاکید کی جاتی ہے۔

اولم یکفهم انا انزلنا علیك الكتاب یتلی علیهم

کیا ان کو یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے تجھ پر کتاب نازل کی جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔

نفسیات انسانی کا خاصہ ہے کہ جب کسی کی طرف سے اس کے جذبات مخالفانہ ہوتے ہیں تو وہ اس کی کسی بات کو حسن ظن پر محمول نہیں کرسکتا اور اس کو اس کی ہر چیز میں شر، خبث اور بدی نظر آتی ہے جلی سے جلی اور واضح سے واضح برہان بھی اس کے دل کے ریب اور قلب کے شک کو دور نہیں کرسکتے۔ معاندین جو انبیاء کے مکارم اخلاق حسن تعلیم اور دیگر علمی وعملی تلقینات کو باور نہیں کرتے اور ان کے کھلے اور بدیہی دعوؤں کو تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے اور ہر قسم کی دلیلوں کو سن لینے کے بعد بھی وہ اپنے لاعلاج مرض شک سے نجات نہیں پاتے تو آخر الحیل کے طور پر وہ نبی سے خارق عادت معجزے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور چونکہ ان کو بدگمانی سے یہ یقین ہوتا ہے کہ ہماری ہی طرح کا ایک مدعی انسان کبھی ایسی عجیب وغریب چیز پر قادر نہیں ہوتا اس لیئے وہ کبھی کوئی خارق عادت امر پیش نہ کرے گا اور اس طرح اس کی رسوائی ہو جائے گی لیکن اللہ سبحانہ آخری حجت کے طور پر ان کے سامنے معجزات اور خوارق بھی پیش کر دیتا ہے تاہم ان کو دیکھ کر یہی معاندانہ روح ان کے دلوں میں پیغمبر کی سچائی کا اعتبار نہیں پیدا ہونے دیتی اور بدگمانی ان کو بتاتی ہے کہ خدائی کارنامہ نہیں بلکہ یہ سحر اور جادو ہے۔

عقیدہ معجزات کی اصلاح

اس آیت کا بنظر غور مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح اور نمایاں ہو جاتی ہے کہ اللہ سبحانہ کے یہاں ان ظاہری معجزات کی چنداں وقعت نہیں وہ لوگوں کو ہمیشہ اصل روح نبوت کی طرف متوجہ کرنا ہے ان ظاہری معجزات نے گزشتہ قوموں میں بہت سے فاسد عقیدے پیدا کر

دیئے تھے جن انبیاء سے بکثرت معجزات صادر ہوئے ان میں الوہیت اور کارسازی کا تصور قائم کر لیا گیا اور اس طرح توحید و نبوت کی اصلی حقیقت آنکھوں سے اوجھل ہو گئی قرآن عزیز نے نہایت وضاحت اور پوری قوت سے ان غلطیوں کا پردہ چاک کیا اور دنیا میں توحید و نبوت کی اصل حقیقت اس استواری اور مضبوطی کے ساتھ قائم کر دی کہ آیندہ فساد اور سوء عقیدہ کے سیلاب سے اس کو گزند پہنچنے کا خطرہ باقی نہ رہے۔

سب سے پہلے اس نے یہ حقیقت واضح کی کہ نبوت اور ظاہری معجزات میں کوئی تلازم نہیں ہے اور یہ آثار و دلائل اصل نبوت سے خارج ہیں نبوت کے اصل لوازم وحی، مخاطبہ الٰہی تزکیہ، انذار، تبشیر تعلیم اور ہدایت ہیں جیسا کہ ان کی تفصیل اس سورت میں پہلے گذر چکی ہے اس بنا پر معاندین نے معجزہ طلب کیا تو قرآن حکیم نے اس کے جواب میں نبوت کی اصل حقیقت کی طرف ان کو متوجہ کیا ہے کہیں فرمایا انما الآیات عند اللہ وانما انا نذیر مبین اور ارشاد ہوا انما انت منذر۔ قرآن عزیز نے نہایت وضاحت اور تکرار سے اس حقیقت کو کھول کر پیش کیا کہ اللہ کا نبی انسان اور خالص انسان ہوتا ہے اس میں الوہیت کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا ہے انما انا بشر مثلکم یوحی الی۔ یہاں بھی قرآن نے اسی حقیقت کی طرف متوجہ کیا ہے فقل انما الغیب للہ میں غیب داں نہیں ہوں۔ غیب دانی اور قدرت کاملہ خاصہ الوہیت ہیں۔ اسی فقرے میں نبوت کے بارے میں اس غلط عقیدے کی بھی اصلاح کر دی کہ نبی براہ راست عالم کائنات میں تصرف پر قادر ہے۔ موجودہ اناجیل کے مصنفین نے حضرت عیسیٰ کے معجزات کو جس انداز میں پیش کیا ہے اس نے عیسائیوں کے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا ہے کہ یہ ساری کائنات حضرت عیسیٰ کے قبضہ و قدرت میں ہے جو چاہیں وہ کر سکتے ہیں یہی بنیادی چیز ہے جس پر ان کے سارے دین کی عمارت کھڑی ہے قرآن نے انما الغیب للہ کہہ کر نہایت شدت اور نہایت اصرار سے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ معجزات اور نشانات پیغمبر کی قوت اور ارادے سے نہیں بلکہ اللہ سبحانہ کی قدرت اور مشیت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ انجیل میں حضرت عیسیٰ کے معجزات جس انداز میں پیش کئے گئے ہیں ان کا صاف منشا یہ ہے کہ گویا حضرت عیسیٰ کو ساری کائنات کی بادشاہی سپرد ہے لیکن قرآن نے یہاں انما الغیب للہ کہہ کر اس عقیدہ کی تردید کی ہے۔ قرآن عزیز کی اس تصریح اور اظہار حقیقت کا اثر ہے کہ اسلام میں توحید اور نبوت کی حقیقتیں کھلی اور واضح ہیں اور حضور اقدس صلی اللہ

علیہ وسلم میں الوہیت کا کوئی ادنیٰ سا شائبہ بھی مسلمانوں نے کبھی تسلیم نہیں کیا۔

ٹھہر جائیے مخاطبوں کے معجزے کے مطالبہ کے جواب میں انما لغیب للّٰہ کی گہرائی پر غور کیجئے۔

یہ آیت بتا رہی ہے کہ غیب کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے اس میں لفظ انما جملہ کی پیشانی پر لگا ہوا ہے اس کا کام قصر ہے یعنی یہ صفت اس موصوف کے سوا کہیں نہیں پائی جاتی ہے جیسے انما اللّٰہ الٰہ یعنی الوہیت کی صفت صرف اللہ میں ہے اللہ کے سوا کسی میں نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ غیب کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے، جیسے انما کے ذریعے عربی زبان میں قصر ہوتا ہے ایسے ہی لا اور الا کے ذریعے بھی قصر ہوتا ہے جیسے لا الٰہ الا اللّٰہ یعنی الوہیت کی صفت اس کائنات میں اللہ کے سوا کسی میں نہیں ہے یہ انداز تعبیر بھی غیب کی نفی میں قرآن میں موجود ہے لا یعلم من فی السماوات والارض الغیب الا اللّٰہ یعنی اللہ کے سوا دانائے غیب کوئی نہیں ہے مخلوق تو صرف اس قدر جانتی ہے جتنا اللہ سبحانہ اپنے علم غیب سے جس قدر دینا ناپسند کرتا ہے اور مصلحت سمجھتا ہے اور پس لا یحیطون بشیئ من علمہ الا بما شاء وہ ان کو بذریعہ وحی واقف کرتا ہے عقل کا تقاضا بھی یہی ہے غیب نام ہے اس علم کا جو دلائل وسائل اور قرائن سے نہیں بلکہ خود بخود ہو ظاہر ہے کہ خود بخود علم اسی کا ہو گا جس کی ذات خود بخود ہو۔ اللہ سبحانہ کی ذات خود بخود ہے اس کا علم خود بخود ہے۔ انسانی علم کے طبعی ذرائع وجدان، حواس عقل اور استدلال وغیرہ ہیں ان طبعی ذریعوں سے جو علم حاصل نہیں ہوتا ہے وہی علم غیب ہے غیب کا مقابل شہادت ہے جس کے معنے حاضر ہونے کے ہیں یعنی وہ اشیاء جو ہر انسان کے حواس اور قوائے دماغی کے سامنے ہیں اسی لئے اللہ سبحانہ نے اپنے آپ کو بار بار عالم الغیب والشہادۃ کہا ہے یعنی انسانوں کے طبعی ذرائع علم کیلئے جو کچھ حاضر ہے اور جو کچھ غائب ہے ان سب کا عالم اور واقف کل ہے۔ الغرض اجمالاً علم غیب اسی غیبی طریقہ علم کا نام ہے جو عام انسانوں کی دسترس سے بالا ہے۔

قرآن میں غیب چار چیزوں کے لیے بولا گیا ہے۔

اولاً ماضی کے واقعات جیسے حضرت نوح کا واقعہ بیان کرنے کے بعد فرمایا تلک من انباء الغیب نوحیھا الیک یہ غیب کی خبریں ہیں جن کی ہم آپ کو بذریعہ وحی اطلاع

دے رہے ہیں۔ حضرت مریم کا واقعہ بیان کرنے کے بعد فرمایا ذالك من انباء الغیب نوحیه الیك یہ غیب کی خبریں ہیں جو بذریعہ وحی ہم آپ کو بتا رہے ہیں۔

ثانیاً مستقبل میں ہونے والے واقعات کی اطلاع کو بھی غیب کہا گیا ہے جیسے زیر تشریح آیت میں ہونے والے معجزات کے بارے میں فرمایا فقل انما الغیب لله مستقبل کے منتظرہ واقعات کو اس آیت میں غیب کہا ہے۔

ثالثاً ان چیزوں پر بھی غیب بولا گیا ہے جو اگرچہ ماضی اور مستقبل نہیں بلکہ زمانہ حال میں موجود ہیں تاہم انسان کو حواس خمسہ اور عقل کی محدود طاقت سے ان کا علم نہیں ہو سکتا حاملہ عورت سامنے موجود ہے مگر پیٹ میں کیا ہے مذکر یا مونث۔

رابعاً عالم غیب کی آخری چیز وہ امور ہیں جو غیر مادی ہونے کی وجہ سے ہمارے حواس اور عقل کے دائرہ عمل سے باہر ہیں۔ ہم فرشتوں کو نہیں دیکھتے اللہ سبحانہ کے دیدار کی ہم صلاحیت نہیں رکھتے جنت، دوزخ ہم کو نظر نہیں آسکتی۔ یہ تمام امور غیب ہیں۔

نبوت کو اللہ سبحانہ غیب کی جن باتوں سے آگاہ کرتا ہے وہ ان چاروں قسموں سے متعلق ہوتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبوں کو بتایا ہے کہ آپ ان سے فرما دیجئے کہ معجزہ لانا میرا کام نہیں ہے بس تو خبردار کرنے والا ہوں رہی یہ بات کہ نشانی کب اور کس شکل میں آئے گی تو یہ امور غیب ہیں ان کا علم صرف اللہ سبحانہ کو ہے فانتظروا انی معکم من المنتظرین اگر تم اس کے طلب گار ہو تو انتظار کرو میں بھی انتظار میں ہوں میں بھی انتظار میں ہوں کا مطلب یہ ہے کہ میں بھی دیکھوں گا کہ تمہاری یہ ضد پوری کی جاتی ہے یا نہیں۔ جو کچھ اللہ سبحانہ نے نازل کیا ہے وہ تو میں پیش کر چکا ہوں اور جو نہیں اتارا وہ میرے اور تمہارے لیے غیب ہے جس پر اللہ سبحانہ کے سوا کسی کا اختیار نہیں ہے وہ چاہے تو اتارے نہ چاہے تو نہ اتارے اب اگر تمہارا مجھے نبی ماننا اسی پر موقوف ہے کہ جو کچھ اللہ سبحانہ نے نہیں اتارا ہے وہ اترے تو اس کا انتظار کرو۔ میں اس میں تمہارا مخالف نہیں ہوں اگر کوئی نشانی ایسی ظاہر ہو جائے جو تمہاری ہدایت کا ذریعہ بنے تو میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ اور کچھ محققین سے علامہ آلوسی نے یہ بات لطیف نقل کی ہے کہ

نشانی پر تمہارا اصرار اور یہ خیال کہ آیت و نشانی لوازم نبوت سے ہے اور اس کے ہونے پر تمہارا اپنے ایمان کو موقوف کرنا اس کا مجھے تو کوئی پتہ نہیں ہے تم تو نشانی کے اترنے کا انتظار کرو میں تمہاری اس بے باکی اور جرأت پر اللہ کی جانب سے تم سے ہونے والے سلوک کا انتظار کرتا ہوں۔

وَإِذَآ أَذَقْنَا
النَّاسَ رَحْمَةً مِّنۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ إِذَا لَهُم مَّكْرٌ فِىٓ
ءَايَاتِنَا ۚ قُلِ اللَّهُ أَسْرَعُ مَكْرًا ۚ إِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُونَ مَا تَمْكُرُونَ ﴿٢١﴾
هُوَ الَّذِى يُسَيِّرُكُمْ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۖ حَتَّىٰٓ إِذَا كُنتُمْ فِى الْفُلْكِ ۚ
وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا جَآءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ
وَجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوٓا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ ۙ
دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ لَئِنْ أَنجَيْتَنَا مِنْ هَٰذِهِۦ
لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّٰكِرِينَ ﴿٢٢﴾ فَلَمَّآ أَنجَاهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغُونَ
فِى الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ يَٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلَىٰٓ أَنفُسِكُم ۖ
مَّتَٰعَ الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا ۖ ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ
تَعْمَلُونَ ﴿٢٣﴾

اور جب ہم لوگوں کو تکلیف کے بعد اپنی رحمت کا مزہ چکھا دیتے ہیں تو فوراً ہماری قدرت کی نشانیوں میں اپنی دقیقہ سنجیوں سے کام لینے لگتے ہیں آپ فرما دیجئے اللہ سبحانہ ان

دقیقہ سنجیوں میں سب سے زیادہ تیز ہے۔ ہمارے فرشتے تمہاری
دقیقہ سنجیوں کو قلم بند کر رہے ہیں [۳۱] وہی تو ہے جس نے
خشکی اور تری میں تمہارے چلنے کا سامان کر دیا ہے تا آنکہ جب
تم سمندر میں جہازوں میں سفر کرتے ہو اور جہاز ان کو موافق
ہوائیں لے کر جا رہے ہوتے ہیں، جانے والے ہوائیں
شاداں ہوتے ہیں کہ پچھ تیز و تند ہوا کے جھونکے نمودار
ہو جاتے ہیں اور ہر طرف سے موجیں ہجوم کرنے لگتی ہیں
اور مسافر خیال کرتے ہیں کہ وہ گھیرے میں آگئے ہیں تو اس
وقت پورے طاعت کیے اخلاص کے ساتھ اللہ سبحانہ کو پکارنے
لگتے ہیں۔ کہ یا اللہ اگر تو نے ہمیں اس سے بچا لیا تو ہم ضرور
تیرے شکر گذار ہوں گے پھر جب اللہ سبحانہ ان کو بچا
دیتا ہے تو وہ ملک میں ناحق سرکشی و بغاوت کرنے
لگتے ہیں [۳۲] اے لوگو! تمہاری سرکشی اور باغیانہ روش کا
نقصان تمہیں ہی ہو گا۔ دنیا کی زندگی سے خوب فائدہ اٹھا
لو پھر تمہیں ہمارے حضور میں پیش ہونا ہے ہم تمہیں تمہارے

کرتوت بتائیں گے ۲۳

معانی مفردات

الدین اس کے متعدد معنے آتے ہیں اصلی معنے طاعت اور جزا کے آتے ہیں ملت کو بھی دین اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی طاعت کی جاتی ہے ومن احسن دینا میں لفظ دین طاعت ہی کے معنے میں ہے اور مالک یوم الدین میں لفظ دین جزا کے معنی میں ہے بغی زیادتی، سرکشی مصدر ہے جہاں میانہ روی چاہیے وہاں میانہ روی سے بڑھنے کی خواہش کو بغی کہتے ہیں خواہ میانہ روی سے تجاوز عمل میں آیا ہو یا نہ آیا ہو بغی کیفیت اور کمیت یعنی مقدار و وصف دونوں سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی دو طرح کا ہوتا ہے ایک محمود جیسے عدل سے بڑھ کر احسان کرنا مزدور کو مزدوری دیتے رہے ہو تو اصل اجرت سے بڑھ کر اور زیادہ دو اور عبادات میں فرض کے مطالبہ سے بڑھ کر نوافل ادا کرنا دوسرا مذموم جیسے حق سے تجاوز کر کے باطل اختیار کرو۔ مزدور کو مزدوری کی جگہ گالیاں دینا یا فرائض عبادت میں بدعات کا اضافہ کرنا۔ قرآن میں لفظ بغی پانچ معنے میں آتا ہے ظلم۔ گناہ۔ حسد۔ زنا اور طلب و تلاش

زندگی کی کشتی آس اور یاس ہے

جب تک دنیوی زندگی میں اسباب وعلائق کا کوئی ادنی سا اسرا بھی باقی رہتا ہے انسان کا وجدان بیدار نہیں ہوتا اسی حقیقت کو ایک عامۃ الورود واقعہ سے مثال دے کر سمجھایا ہے کہ جس طرح ایک کشتی کے مسافر سفر پہ روانہ ہوتے ہیں جب ہوا موافق ہوتی ہے اور کشتی نہایت سکون سے اپنی منزل کیطرف رواں دواں ہوتی تو سب کو آس ہوتی ہے اور سب سمجھتے ہیں کہ اب ان کی خوشی میں کوئی رخنہ اندازی نہیں کر سکتا۔ لیکن جونہی کسی گوشہ سے طوفانی ہوا اٹھتی ہے اور موجوں کے تھپیڑوں سے کشتی درخت میں لٹکا ہوا جھولا بن جاتی ہے اور آس یاس بن کر رہ جاتی ہے اور ہر ایک کا خیال ہو جاتا ہے کہ کشتی اب ڈوبی آس یاس کے وقت میں اللہ سبحانہ یاد آتا ہے اور سارے مشرکانہ اعمال سے الگ ہو کر سب اللہ سبحانہ سے دعا و فریاد کرتے ہیں اور یہ

عہد کرتے ہیں کہ اگر موت کے اس چکر سے نکل گئے تو ہم اللہ ہی کے ہو کر رہیں گے اور اس کے شکر گذار اور فرماں بردار رہیں گے لیکن جونہی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے اور گرداب کے چکر سے بچتے ہیں تو پھر زندگی کو سرمستیوں اور شرارتوں کا محور بنا لیتے ہیں۔

معجزوں کے مطالبہ کرنے والوں کا اب یہی حال ہے اس وقت ان کی زندگی کی کشتی نہایت سکوں سے چل رہی ہے حالات میں سازگاری ہے اس لیے شرارتوں میں مگن ہونے کی وجہ سے نشانیاں مانگ رہے ہیں۔

اللہ کا رسول ان کو اللہ سبحانہ کی گرفت سے ڈراتا ہے تو یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ اللہ سبحانہ کی گرفت کیسے آئے گی۔ بڑی دلیری سے نبوت کے منہ آرہے ہیں اور کہہ رہے ہیں لولا انزل علیہ ایۃ من ربہ لیکن جب اللہ کی گرفت آجائے گی تو ہم تو بہ توبہ کی چیخ و پکار سے فضا گونج اٹھے گی اور گرفت کی ڈوری ڈھیلی ہوتے ہی پھر وہی حالت ہو جائے گی۔

۲۱ اور جب ہم لوگوں کو تکلیف کے بعد اپنی رحمت کا مزہ چکھا دیتے ہیں تو فوراً ہماری قدرت کی نشانیوں میں اپنی دقیقہ سنجیوں سے کام لینے لگتے ہیں آپ فرما دیجیے کہ اللہ ان دقیقہ سنجیوں میں سب سے زیادہ بہتر ہے ہمارے فرشتے تمہاری دقیقہ سنجیوں کو قلم بند کر رہے ہیں۔ اہل مکہ پر حق تعالیٰ شانہ نے سات سال کا قحط مسلط کیا سب ہلاکت کے قریب پہنچ گئے تو گھبرا کر حضور اقدس سے دعا کی درخواست کی اور وعدہ کیا کہ یہ عذاب اٹھ جائے تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ آپ کی دعا سے اللہ سبحانہ نے آسان کر دیا۔ قحط کی بلا دور ہوئی تو پھر وہی شرارتیں کرنے لگے۔ اللہ سبحانہ کی آیتوں کو جھٹلاتے۔ اس کی قدرت و رحمت پر نظر نہ رکھتے بلکہ انعامات الٰہیہ کو ظاہری اسباب و حیل اور محض بے اصل خیالات واوہام کی طرف منسوب کرتے اس کا جواب دیا کہ اچھا تم کو اچھا تم خوب فریب اور حیلہ سازی کر لو مگر یہ یاد رہے کہ تمہاری حیلہ بازیاں ایک ایک کر کے لکھی جارہی ہیں وہ سارا دفتر قیامت کے دن تمہارے سامنے ہوگا۔ پھر جب تمہاری کوئی حیلہ بازی فرشتوں سے مخفی نہیں ہے اللہ سبحانہ کے علم محیط سے کہاں باہر رہ سکتی ہے۔ تم اپنے مکر و حیلہ سازی پر مغرور رہو حالانکہ اللہ سبحانہ کا جوابی مکر خفی تدبیر تمہارے مکر و فریب سے کہیں زیادہ تیز ہے۔ وہ مجرم کی باگ اتنی ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے کہ مجرم کو نشہ غفلت میں چور ہو کر سزا کا تصور بھی نہیں آتا۔ جب پیمانہ شقاوت لبریز

ہو جاتا ہے تو دفعتہً پکڑ لیتا ہے، لہٰذا عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کی نرمی بردباری اور خوش کن حالات کو دیکھ کر مغرور نہ ہو نہ معلوم نرمی کے بعد کیسی سختی کے وقت آدمی کی نظر اسباب سے ہٹ کر صرف اللہ پر رہتی ہے جہاں سخت گھڑی گذری اور کام بن گیا پھر اللہ سبحانہ کو بھول کر اسباب پر آجاتا ہے ڈرتا نہیں کہ پھر اللہ سبحانہ ویسی ہی تکلیف اور سختی کا ایک سبب رونما کر دے گا۔ اسی کے قبضہ قدرت میں سب اسباب کی باگ ہے چنانچہ آگے دریائی سفر کی مثال میں اس کی ایک صورت بیان کی ہے لہ

جس واقعہ کا شیخ الاسلام نے ذکر کیا ہے کہ اہل مکہ پر حق تعالیٰ شانہ نے سات سال کا قحط مسلط کر دیا۔ یہ واقعہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم حضرت عبداللہ بن مسعود کی زبانی اس طرح آیا ہے کہ جب قریش کی مخالفت بھرپور طریقہ پر سامنے آگئی اور دعوت کی ساری منزلیں ختم ہو گئیں تو آپ نے قریش کو بددعا دی کہ اے اللہ قریش کو سات سال تک قحط میں مبتلا رکھ جیسے تو نے حضرت یوسف کے زمانے میں سات سال تک مستقل قحط کو قائم رکھا تھا چنانچہ ان پر ایسا سخت قحط پڑا کہ لوگوں نے بھوک کے مارے مردار اور چمڑے کھائے یہاں تک کہ جب لوگ آسمان کی طرف دیکھتے تھے تو وہ ان کو دھوئیں کی طرح لگتا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر ابو سفیان آپ کی خدمت میں آئے اور کہا کہ اے محمد تم اللہ سبحانہ کی اطاعت اور صلہ رحمی کا حکم دیتے ہو۔ حالانکہ تمہاری قوم تباہ ہو رہی ہے۔ اس کے لیے اللہ سبحانہ سے دعا کرو آپ نے دعا فرمائی اور بارش ہوئی جس نے قحط کی مصیبت کو دور کر دیا۔ اس کے بعد پھر قریش نے حسب دستور آپ کی مخالفت شروع کی تو قیام مکہ کے زمانے میں اللہ نے آپ کی زبان سے یہ پیش گوئی قریش کو سنائی کہ آئندہ اس کا انتقام ایک اور سخت گرفت سے لیا جائے گا وہ گرفت بدر کی لڑائی کی صورت میں نمودار ہوئی۔ سورۃ دخان کی آیات اس قحط والے واقعہ کی طرف اشارہ ہے فارتقب یوم تاتی السماء بدخان مبین الخ یہ واقعہ ہجرت سے پہلے کا ہے۔ اور یہ ہجرت کی تمہید ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے قحط سالی دور ہوئی مگر اس کے باوجود قریش کی سرگرانی کا وہی عالم ہو گیا تو ان کے لیے معجزہ عذاب کے سوا کوئی طریقہ علاج باقی نہیں رہا۔ چنانچہ ہجرت کے بعد بدر ان کے لیئے ہلاکت کی نشانی بن کر آیا۔ قرآن

لہ افادات شیخ الاسلام

نے ہجرت سے پہلے ہی مکہ میں یہ اعلان سنا دیا تھا ضرار قحط سالی زمانے کے بعد رحمۃ خوش حالی آئی۔ خدا کا شکر کرنے کی جگہ تم بلا کے آنے اور دور ہونے کی متعلق قسم قسم کی توجیہیں اور تاویلیں کرنے لگے تاکہ راہ ایمان سے گریز پائی کے لیے موقعہ مل جائے یہی مطلب ہے اذا لھم مکر فی آیاتنا وہ ہماری نشانیوں میں چالبازیاں دکھا رہے تھے اور آگے اللہ اسرع مکرا اللہ سبحانہ ان باریکیوں میں زیادہ تیز ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم حقیقت کو نہیں مانتے اور اس کے مطابق اپنا رویہ درست نہیں کرتے تو وہ تمہیں اسی باغیانہ روش کے نتیجے میں بہت جلدی اور بڑی تیزی سے ایسے عذاب سے دوچار کرے گا کہ تمہارا نشہ اقتدار ہرن ہو کر رہ جائے گا یہ رو سائے قریش کو بدر میں عذاب کی دھمکی دی ہے بدر روسائے قریش کے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے جو فرعون کے لیے غرق بحر کی حیثیت تھی جو کچھ اقتدار کے نشہ میں مستی کرتی ہے کر لو سب کچھ اللہ سبحانہ کے فرشتے خاموشی کے ساتھ بیٹھے لکھ رہے ہیں حتیٰ کہ وہ عذاب آجائے گا اور تم کرتوتوں کی پاداش میں دھر لیے جاؤ گے۔

جب غزوہ بدر کے لیے آپ مسلمانوں کے ساتھ اسوقت نکلے جیسا کہ سورہ انفال کی تفسیر میں پڑھ چکے ہو مسلمانوں کے سامنے قریش کی دو جماعتیں تھیں ایک قریش کا شامی قافلہ جو مدینہ کی راہ سے گذر کر مکہ جا رہا تھا دوسرا روسائے قریش کا جنگی لشکر جو مسلمانوں سے لڑنے کے لیے نکلا تھا۔ اللہ سبحانہ نے مسلمانوں سے وعدہ کیا تھا کہ دو جمعیتوں میں سے ایک ان کے ہاتھ لگے گی عام مسلمان یہی سمجھتے تھے کہ تجارتی قافلہ ان کے ہاتھ آئے گا لیکن حضور اقدس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ آج اللہ اسرع مکرا کی تفسیر کا دن ہے جس کا بارگاہ الٰہی میں مدت سے وعدہ تھا۔ اسی پڑاؤ پر جب رات کو مسلمان یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ قریش کا تجارتی قافلہ کہاں ہے تو اِدھر اُدھر مخبر روانہ کیے۔ کچھ مسلمان ایک چرواہے کو پکڑ کر لے آئے اور اس قریش کے قافلہ کا حال پوچھنے لگا۔ اس نے جواب دیا کہ قافلہ کا تو مجھے علم نہیں ہے البتہ قریش کے لشکر کا مجھے پتہ ہے وہ یہاں پڑا ہے یہ سن کر مسلمانوں نے اسے مارا کہ صحیح بات نہیں بتاتا مار کھانے پر اس نے کہا کہ اچھا چھوڑ دیتا ہوں۔ لوگ چھوڑتے تو پھر وہی کہتا کہ قافلہ کا بھی پتہ نہیں البتہ لشکر ادھر ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے سلام پھیر کر فرمایا کہ جب وہ جھوٹ کہتا ہے تو چھوڑ دیتے ہو سچ بولتا ہے تو مارتے ہو اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ یہ قریش کی تباہی کا دن ہے۔ یہ ابو جہل کا مقتل ہے یہ عتبہ کا ہے یہ ابولہب

کا ہے۔ راوی کہتا ہے کہ آپ نے جس کا مقتل جہاں متعین فرمایا تھا ایک میں بھی سرمو فرق نہ آیا غرض یہی
اللہ اسرع مکوا کی تفسیر ہے۔ اور ہجرت سے پہلے قریش کو ان لفظوں میں اسی عذاب سے
آگاہ کیا گیا تھا۔

عام شارحین قرآن نے قحط کی بات کی لیکن آیت کی تشریح واقعات کی روشنی میں نہ
کر سکے۔ اور کچھ شارحین قرآن نے واقعہ قحط کو بالکل نظر انداز کر دیا۔

آیت کے مطالب کا خلاصہ یہ ہے کہ ان نشانیاں مانگنے والوں سے کہا جا رہا ہے کہ
ہماری نشانیاں تو موجود ہیں مگر تم ہماری نشانیوں کی تاویلیں کر رہے ہو اور چالبازیوں سے
ان نشانیوں سے منہ موڑ رہے ہو۔ چالاکیاں یہ کہ وہ نبوت کا استہزاء کرتے تھے جیسا کہ دوسری
قومیں اپنے پیغمبروں کا استہزاء کرتی رہی ہیں۔ کفار قریش حضور اقدس سے کہتے تھے جس عذاب
کی دھمکی دی جاتی ہے وہ کیوں نہیں آتا اگر تم میں قدرت ہے تو وہ عذاب لاؤ اور اپنی صداقت
کی یہ آخری نشانی بھی دکھا دو قرآن نے بتایا کہ اے لوگو انما الغیب للہ غیب کی بات تو اللہ
کے پاس ہے فانتظروا تم اس کے ظہور کا انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔
کفار کو معجزہ عذاب کے دیکھنے کی جلدی تھی کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ جھوٹ ہے قرآن نے بتایا
کہ جب تک نبوت کی آمد کی برکات ختم نہ ہو جائیں یعنی تمام افراد صالحہ الگ نہ ہو جائیں گے
عذاب نہیں آئے گا۔

آخر میں قحط کے حوالہ سے فرمایا کہ نشانات تو تمہارے ارد گرد ہیں مگر تمہاری باغیانہ
زندگی ان نشانوں کے تحت نئے پس منظر گھڑ کر اپنے کو مطمئن کر رہی ہے تم چالاکیوں ؟
ہوشیاریوں سے کام لے رہے ہو تو اللہ کی ذات تدبیر میں تم سے زیادہ تیز ہے وہ دن قریب
آرہا ہے تمہاری ساری حرکتیں تمہاری عیاریاں اور چالبازیاں اور تمہارے اعمال
کے نتائج جلدی رونما ہو کر رہیں گے۔

ایک واقعاتی حقیقت

۲۲ وہی تو ہے جس نے خشکی اور تری میں تمہارے چلنے کا سامان کر دیا ہے تا آنکہ جب
تم سمندر میں جہازوں کے ذریعے سفر کرتے ہو اور جہاز ان کو موافق ہوا میں لے کر جا رہے
ہوتے ہیں کہ تیز و تند ہوا کے جھونکے نمودار ہو جاتے ہیں اور ہر طرف سے موجیں ہجوم کرنے

لگتی ہیں اور مسافر خیال کرتے ہیں کہ وہ گھیرے میں آگئے تو اس وقت پوری طاعت کے اخلاص کے ساتھ اللہ سبحانہ کو پکارنے لگتے ہیں کہ یا اللہ اگر تو نے ہمیں اس سے بچالیا تو ہم ضرور ہی تیرے شکر گزار ہونگے۔ پھر جب اللہ سبحانہ ان کو بچادیتا ہے تو وہ ملک میں ناحق سرکشی اور بغاوت کرنے لگتے ہیں یعنی ابتدا میں ہوا خوشگوار اور موافق تھی۔ مسافر ہنستے کھیلتے آرام سے چلے جارہے تھے کہ یکایک ایک زور کا طوفانی جھکڑ چلنے لگا اور چاروں طرف سے پانی کے پہاڑ اٹھ کر جہاز سے ٹکرانے لگے جب سمجھ لیا کہ ہر طرف سے موت کے منہ میں گھر ہوئے ہیں۔ بھاگنے اور نکلنے کی کوئی سبیل نہیں ہے تو سارے فرضی معبودوں کو چھوڑ کر اللہ سبحانہ واحد کو پکارنے لگے جو اصل فطرت انسانی کا تقاضا ہے۔ ہر چیز سے مایوس ہو کر خالص اللہ سبحانہ کی بندگی اختیار کی اور بڑے پکے عہدو پیماں باندھے کہ اگر اس مصیبت سے اللہ سبحانہ نے نجات دی تو ہمیشہ اس کے شکر گذار رہیں گے کوئی بات کفران نعمت کی نہ کریں گے لیکن جہاں ذرا امن نصیب ہوا ساحل پر قدم رکھتے ہی شرارتیں اور ملک میں اودھم مچانا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بھی عہد پر قائم نہ رہے۔

تنبیہ

اس آیت میں ان مدعیان اسلام کے لیے بڑی عبرت ہے جو جہاز کے طوفان میں گھر جانے کے وقت بھی اللہ سبحانہ کو چھوڑ کر غیر اللہ کو مدد کے لیے پکارتے ہیں۔ فتح مکہ کے بعد ابوجہل کا بیٹا عکرمہ مسلمان نہ ہوا تھا۔ مکہ سے بھاگ کر بحری سفر اختیار کیا۔ تھوڑی دور جا کر کشتی کو طوفانی ہواؤں نے گھیر لیا۔ ناخدا نے مسافروں سے کہا کہ ایک اللہ کو پکارو یہاں تمہارے معبود کچھ کام نہ آئیں گے عکرمہ نے کہا کہ یہی تو وہ اللہ ہے جس کی طرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو بلاتے ہیں۔ اگر سمندر میں رب محمد کے بغیر نجات نہیں مل سکتی تو خشکی میں بھی اس کی دستگیری اور اعانت کے بغیر نجات پانا محال ہے اے اللہ اگر تو نے اس مصیبت سے نکال لیا تو میں واپس ہو کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہاتھ دوں گا مجھے امید ہے کہ وہ اپنے اخلاق کریمہ سے میری تقصیرات معاف فرمادیں گے چنانچہ حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوئے[1] جو بات پہلی آیت میں بتائی گئی تھی اسی کو ایک عمومی واقعہ سے مثال دے کر سمجھایا ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

کہ جیسے ایک جہاز کے مسافر سفر پر روانہ ہوتے ہیں تو جب ہوا سازگار رہتی ہے اور جہاز امن و سکون سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوتا ہے تو سب مگن ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اب ان کی خوشی میں کوئی بدمزگی نہ ہو گی۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد ایک طوفانی جھکڑ اٹھ کر آتا ہے اور موجوں کے تھپیڑے جہاز کو زیر و زبر کرنے لگتے ہیں تو ہر مسافر خیال کرنے لگتا ہے کہ بس اب تو پھنس گئے ہیں نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن اس سخت ترین گھڑی میں سب کے ہاتھ دعا و طلبگاری کے لیے اللہ سبحانہ کی جناب میں اٹھ جاتے ہیں کہ بارالہا! کہ اب اگر اس ورطہ ہلاکت سے تو ہمیں بچا لے تو ہم آئندہ تیرے ہی ہو کر رہیں گے اور تیرے فرماں بردار بن کر رہیں گے لیکن جب اللہ سبحانہ ان کو اس بلائے بے درماں سے بچا لیتا ہے تو اپنے سارے عہد و پیمان بھول کر پھر وہی اٹھکیلیاں وہی سرمستیاں اور شرارتیں عود کر آتی ہیں مطلب یہ ہے کہ یہی حال اس وقت ان لوگوں کا ہے جو عذاب کی نشانی مانگ رہے ہیں۔ اس وقت زندگی کی کشتی سکون سے چل رہی ہے حالات سازگار ہیں۔ اس وجہ سے اپنی شرارتوں میں چھوٹ ہیں۔ ان حالات میں یہ بات ان کی سمجھ میں آتی نہیں ہے کہ ان کی کشتی حیات طوفان سے کیسے دوچار ہو سکتی ہے یعنی عذاب کیسے آ سکتا ہے۔

اس آیت میں گہری معنویت ہے یہ بتا رہی ہے کہ جب تک دنیوی علائق و اسباب کا ادنیٰ سا کوئی سہارا بھی باقی رہتا ہے۔ انسان کا وجدان بیدار نہیں ہوتا۔ اور ایک تنکے کا بھروسہ بھی اس کے لیے کافی ہوتا ہے کہ وہ اللہ سبحانہ کی طرف سے غافل ہو جائے لیکن جونہی اسباب و علائق کے رشتے ٹوٹے اور یاس و قنوط کی کامل حالت طاری ہوئی اور اس نے دیکھا کہ اب دنیا کا کوئی ہاتھ اسے بچا نہیں سکتا تو اچانک اس کا سویا ہوا وجدان بیدار ہو جاتا ہے اور اللہ سبحانہ کی پرستش کا جوش اپنے سارے اخلاص کے ساتھ اس کے اندر ابھر آتا ہے اس وقت وہ اللہ سبحانہ کے سوا کسی کو نہیں پکارتا۔ سارے رشتے سارے بھروسے، ساری ہستیاں یک قلم نابود ہو جاتی ہیں۔ وہ بے اختیار اللہ سبحانہ کو پکارنے لگتا ہے اور اس کی یہ پکار اس کے دل کی ایک ایک ریشہ کی پکار ہوتی ہے لیکن اس کے بعد پھر کیا ہوتا ہے۔ کیا یہ حالت قائم رہتی ہے۔ نہیں جونہی اس کی ڈوبتی کشتی اچھلی اور امید و مراد کی گم شدہ صورت واپس آگئی۔ پھر وہی اس کی غفلتیں ہوتی ہیں اور وہی سرکشیاں۔

اس حالت کی مثالیں خود ہماری زندگی کے ہر گوشہ میں موجود ہیں کیا کبھی ایسا ہوا ہے

کہ آپ بیمار ہوئے اور ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ یا کسی دوسری مصیبت میں پڑے اور دنیا کے سارے سہارے ہاتھ سے نکل گئے اگر ایسا ہوا ہے تو یاد کرو کہ ایسے موقع پر آپ کی خدا پرستی اور پرستش میں اخلاص کا کیا حال تھا۔

قرآن نے جا بجا اس حالت کے بیان کے لیے بحری سفر کی مثال دی ہے کیونکہ انسان کی بے بسی اور بے کسی اور مایوسی کے لیے اس سے بہتر مثال کوئی نہیں چنانچہ اس آیت میں اسی کی طرف اشارا اور سورہ عنکبوت اور سورہ لقمان بھی ان ہی مطالب پر مشتمل آیات اور بھی ہیں۔

دین اسلام کی تعلیم و تزکیہ کا مقصد یہی ہے کہ اس حالت سے انسان کو نجات دلا دے اور اس کا وجدان اس طرح بیدار کر دے کہ توحید عبادت کا جو اخلاص خاص خاص حالتوں میں ابھرتا ہے وہ اس کی پوری زندگی میں ایک دائم مستقر حالت ہو جائے یہی وجہ ہے کہ ایمان کی حالت یہ فرمائی کہ مصیبت کی گھڑی ہو یا راحت و سرور کا عالم لیکن اللہ سبحانہ کی یاد سے دل پر غفلت طاری نہ ہو۔ صوفیا کی زبان میں اسی دائمی حالت کا نام نسبت ہے حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں :

> نسبت کی حقیقت وہ کیفیت ہے جو نفس انسانی میں حلول کر جاتی ہے از قسم تشبیہ ملائکہ یا عالم جبروت کی طرف اطلاع۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ بندہ جب طاعت طہارت اور اذکار پر مداومت کرتا ہے تو اس میں ایک صفت نفس میں پیدا ہو جاتی ہے اور ایک دائمی ملکہ حاصل ہو جاتا ہے۔ (القول الجمیل)

اور مولانا اشرف علی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

> ولایت کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ صحت عقائد فرائض کی ادائیگی اور محرمات سے بچنے کے ساتھ ظاہر کو نفلی عبادتوں میں اور باطن کو اللہ تعالیٰ کی یاد میں ہمیشہ مشغول رکھے اسی کو نسبت کہتے ہیں (قصد السبیل)

منقول ہے کہ امام جعفر صادق کی خدمت میں کسی نے آکر عرض کیا کہ اللہ سبحانہ کے بارے میں مجھے کچھ بتائیے۔ آپ نے فرمایا کیا کرتے ہو؟ اس نے کہا کہ ایک بار عین دریا میں میری کشتی ٹوٹ گئی اور میں ایک تختہ پر بیٹھا ہوا بہا جا رہا تھا کہ تیز و تند ہوا کا تھپیڑا آیا آپ نے فرمایا اچھا یہ بتاؤ اس وقت تمہارے دل میں خشوع و خضوع کی کیفیت پیدا ہوئی تھی اس نے کہا ہاں آپ نے فرمایا جس کی طرف اس وقت تمہاری تضرع و شکستگی نے رخ کیا تھا وہ ہی تو

اللہ سبحانہ ہے۔ (تفسیر کبیر)
علامہ آلوسی نے اس مقام پر مسلمانوں کے حال زار پر نوحہ کیا ہے کہ مشرکین تک ایسے مواقع پر توحید عبادت کا مظاہرہ کرتے تھے اور نیاز مندانہ دعاؤں میں واحد و قدوس کو پکارتے لیکن مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ کوئی خضر والیاس کو پکار رہا ہے اور کوئی ابو خمیس اور عباس کی وہائی دے رہا ہے اور کوئی کسی امام سے استغاثہ کر رہا ہے اور کوئی مشائخ میں سے کسی سے استعانت کر رہا ہے۔ ان میں کوئی بھی اپنی دعا و تضرع میں اللہ سبحانہ کو نہیں پکارتا اور اس کا اسے خیال بھی نہیں آتا بتاؤ ان مسلمانوں اور ان مشرکین میں دعاؤں میں کون توحید عبادت کا علمبردار ہے۔ وہ مشرکین جو دعو اللہ مخلصین لہ الدین کا مصداق ہیں یا یہ مسلمان الی اللہ المشتکی اللہ ہی سے اس دور کی شکایت ہے جس میں جہالت کی ہوائیں چل رہی ہیں اور گمراہی کی موجیں ٹھاٹھیں مار رہی ہیں۔ ہمارے ملک میں یا علی یا غوث کا نعرہ لگانے والے ذرا اپنے انجام پر غور کریں۔

نشہ اقتدار میں اللہ سے باغیانہ تعلقات

۲۳ اے لوگو تمہاری سرکشی اور باغیانہ روش کا نقصان تمہیں ہی ہوگا دنیا کی زندگی سے خوب فائدہ اٹھا و پھر تمہیں ہمارے حضور میں پیش ہونا ہے ہم تمہیں تمہارے کرتوت بتائیں گے یعنی تمہاری شرارت کا وبال تمہیں پر پڑے گا اگر چند روز شرارتیں کر کے فرض کرو کہ دنیا کا نفع حاصل کر ہی لیا تو انجام کار پھر اللہ سبحانہ کی طرف لوٹنا ہے وہاں سب کیا دھرا سامنے آجائے گا اللہ رب العزت سزا دے کر بتلا دے گا کہ تمہارے کرتوت کیسے تھے [1]
بغی کے معنی سرکشی کے ہیں اور اس میں ہر طرح کی سرکشی داخل ہے لیکن جب فی الارض کے ساتھ آئے تو اس سے مقصود وہ لوگ ہوتے ہیں جو بر سر اقتدار ہوں اور طاقت کے نشہ میں اگر ظلم و فساد اور برائیوں کو شیوہ اور فیشن بنا لیتے ہیں قرآن نے رذائل کو تین میں منحصر کیا ہے فحشاء منکر اور بغی۔ صفات ذمیمہ فحشاء یعنی حد درجہ قبیح اور بے حیائی کے کام اور ایسی باتیں جن کو سارے انسان فطرۃً ناپسند کرتے ہیں اور ان کے جائز کرنے سے انسانی آبرو خطرہ میں

[1] افادات شیخ الاسلام

پڑجاتی ہے منکر جو کام ہر طبقہ میں ناپسند کیا جاتا ہے اور اس کا کرنے والا سب کی نگاہ سے گرجاتا ہے۔ بغی کے معنے لغت میں تجاوز کرجانے کے ہیں فحشار منکر میں آگے بڑھ جانا بغی ہے قرآن نے بغی کو رذائل میں آخری درجہ دیا ہے۔ رذائل کی اگر تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ بے حیائی اور برائی کے کام ہیں اور دین و شرافت کی نگاہ میں گناہ اور ناپسندیدہ ہیں اگر ان کو جائز قرار دیا جائے تو معاشرے کے افراد کے باہمی حقوق سے امن اٹھ جائے اور کسی کی جان و مال اور عزت و آبرو سلامت نہ رہے۔

ان رذائل کی ترتیب دو نظریوں کے مطابق دی جاسکتی ہے۔ ایک یہ کہ کسی برائی کے اثر کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ناپسندیدگی اور عدم رضا سے کس کو کتنا لگاؤ ہے قرآن میں ترتیب کے ساتھ رذائل کو تین بڑے عنوانوں میں تقسیم کردیا گیا ہے سب سے پہلے فحشار پھر منکر اور آخر میں بغی۔

فحشار میں برائی کی طرف اشارہ ہے وہ انسان میں ایک فرد کی ذات تک محدود رہتی ہے جیسے ننگے رہنا بدکاری میں مبتلا ہونا منکر ہے معاشرے کے تمام افراد کی معاشرتی زندگی متاثر ہوتی ہے جیسے شوہر کا ظلم باپ کی سنگدلی۔ اولاد کی نالائقی اور بغی کا تعلق چونکہ طاقت اور اقتدار سے ہے اس لیے جماعت سے بڑھ کر پورے ملک و ملت کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے جیسے چوری، ڈاکہ، قتل وغیرہ۔ یہ تو ایک نظریہ کے مطابق رذائل کی ترتیب ہوئی دوسرے نظریہ کی رو سے پہلے فحشا ہے جس سے اللہ کی رحمت چھن جاتی ہے پھر وہ منکر ہے جو اللہ سبحانہ کی محبت سے محروم کردیتی ہے اور پھر بغی جو رضائے الٰہی سے خالی ہے۔ قرآن میں تینوں کی ترتیب یہی ہے

ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ وینھی عن الفحشاء والمنکر والبغی۔

بلاشبہ اللہ حکم دیتا ہے کہ ہر معاملہ میں عدل و انصاف کرو سب کے ساتھ حسن کاری کرو اور قرابت داروں کے ساتھ سلوک کرو اور اللہ منع کرتا ہے بے حیائی کے کاموں سے اور ہر طرح کی بری بات سے اور ظلم و زیادتی کے کاموں سے شارحین قرآن نے اس آیت کو جوامع آیات میں شمار کیا ہے یہ گویا انسانی شرافت کا ربانی منشور ہے۔

آیت میں قریش کے ارباب اقتدار سے خطاب ہے اور اپنے اندر نہایت سخت وعید

اور تہدید رکھتا ہے کہ تمہاری اس سرکشانہ زندگی کے نتائج سے تمہیں بھی دوچار ہونا پڑے گا. تمہاری ہر سرکشی تم پر خدا کی حجت پوری کرے گی تم جتنے قدم اس راہ میں بڑھو گے۔ اتنے ہی اللہ سبحانہ کے فیصلہ کن عذاب سے قریب سے قریب تر ہو گے جس سامان دنیا کے نشہ میں مخمور ہو کر ظلم و فساد کر رہے ہو یہ وقتی ہے. اس سے فائدہ چند روزہ ہے۔ ببقضی اللہ امرا کان مفعولا یاد رکھو کہ تمہیں ہمارے ہی حضور پیش ہونا ہے. تمہاری زندگی کا سارا کچا چٹھا تمہارے سامنے ہو گا۔

اس دنیا میں باری باری قومیں وجود میں آتی رہی ہیں اور قوانین الٰہی کے مطابق انہوں نے جسمانی زور و طاقت مالی وسعت اجتماعی اور تمدنی عظمت اور سیاسی قوت حاصل کی. بڑی بڑی عمارتیں بنائیں عظیم الشان تمدن کی بنیاد ڈالی قوموں کو اپنا محکوم بنا کر حکومت قائم کی. پھر جب انہوں نے نخوت و غرور کے نشے میں بغی کی راہ اختیار کی تو ان کا کیا خود ان کے ہی سامنے آیا اور نتیجہ میں وہ فنا کر دی گئی اور ان کا نام و نشان ہی صفحہ ہستی سے مٹ گیا۔

الغرض جیسے افراد جی کر مر جاتے ہیں جماعتیں بھی وجود میں آکر مٹ جاتی ہیں قومیں پیدا ہو کر فنا ہو جاتی ہیں اسی طرح پوری دنیائے مخلوقات کا ایک دن آئے گا جب قانون الٰہی کے مطابق معدوم ہو جائے گی۔ قوموں کو بغیکم علی نفسکم ہی کے نتائج سے دوچار ہونا پڑا ہے دنیا اور اس کا سامان صرف ایک وقتی حادثہ ہے۔ اس میں کسی کے لیے دوام نہیں ہے متاع الحیاۃ الدنیا پھر ایک دن آئے گا جب پوری دنیا اپنے وجود کی صلاحیت سے معرا ہو کر فنا ہو جائے گی کائنات کا یہ نظام بدل جائے گا اس موجودہ عالم کا قانون مادی دوسری قانون سے منسوخ ہو جائے گا نئی زمین نئے آسمان کی موجود دنیا کے اعمال سے تخلیق ہو گی۔ نئی تخلیقات کی نمائش الینا مرجعکم اسی کا نام حشر ہے۔ زندگی یہاں بھی جسمانی ہے وہاں بھی جسمانی ہو گی مگر دونوں میں ایک جوہری فرق ہے یہاں جسمانی زندگی کی تخلیق عناصر کی رہین منت ہے وہاں کے جسمانی زندگی کی تخلیق افکار اعمال، اخلاق اور احوال کی رہن منت ہو گی۔ اللھم اعذنا من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا۔

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَاۤ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَاۤ ۙ اَتٰىهَاۤ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾

دنیوی زندگی تو صرف بارش کے اس پانی کی طرح ہے جسے ہم نے برسایا اس پانی سے رل مل کر زمین کی وہ پیداوار ہوئی جسے انسان اور چوپائے کھاتے ہیں[۳] جب زمین میں خوب رونق ہو گئی اور زمین پیداوار سے لہرانے لگی تو زمین کے مالکوں نے خیال کیا کہ زمین کی پیداوار پر ہمارا پورا قابو ہے[۳] تو رات یا دن میں اچانک ہمارا حکم آ گیا اور ہم نے زمین کی ساری پیداوار کو کاٹ کر رکھ دیا گویا کل گذشتہ یہاں کچھ بھی نہ تھا غور و فکر اور سوجھ والوں کے لیے ہم اسی طرح تو بات کو کھول کر پیش کرتے ہیں[۳۶]

زخرف رونق، چمک، سنگار، ملمع، سنہرا، آراستہ اور کسی چیز کے کمال حسن کو کہتے ہیں۔ اور اسی اعتبار سے سونے کو زخرف کہتے ہیں لیکن قول کے لیے جب اس کا استعمال ہو تو جھوٹ سے آراستہ کرنے اور ملمع کی باتیں کرنا ہوتے ہیں۔ زخرف القول اسی معنے میں ہے۔

حصید کٹی ہوئی کھیتی۔ جڑ سے کٹا ہوا حصاد سے بروزن فعیل جمع حصائد آتی حدیث میں ہے ما لنار الا حصائد السنتکم دوزخ نام ہی تمہاری زبانوں کی کٹی ہوئی کھیتوں کا ہے یعنی زبان کی غلط کاریوں کی سزا دوزخ ہے لم تغن غنی یغنیٰ باب سمع سے ناقص ہے آباد ہونا اسی سے مغنی مکان معنی میں ہے اسکی جمع مغانی آتی ہے دوسرے معنے بے پروا ہونا با در عن صلہ آئے شادی شدہ لڑکی کو غانیہ کہتے اغنیہ گانے کو کہتے ہیں اس میں لگ کر سب سے بے پروا ہو جاتا ہے جمع اغانی غنا بالکسر گانے کو کہتے ہیں اور غنی مقصود مالداری کو کہتے ہیں اور غناء ممدود بالفتح فائدہ کو کہتے ہیں اسی سے استغنا تغنی کہتے ہیں۔

دنیوی زندگی کی بے ثباتی

قرآن میں دنیا کی بے ثباتی کو مختلف عنوانوں سے بیان کیا ہے جن کا مقصد یہ بتایا ہے کہ دنیا ناپائیدار ہے وقتی اور ہنگامی ہے یہ آخرت کے لیے صرف تیاری کی جگہ ہے۔ آخرت کے مقابلہ میں ناقابل التفات ہے۔ اس میں مشغول ہو کر خدا فراموشی خود فراموشی ہے اس موضوع پر بچاس سے زیادہ آیات ہیں۔

اگر انسان عقل و بصیرت سے کام لے تو اس پر سب سے پہلے یہ حقیقت نمودار ہوگی کہ کائنات اور اس کی ہر چیز کی بناوٹ کچھ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ ہر چیز ضبط و ترتیب کے ساتھ ایک خاص نظام و قانون میں منسلک ہے اور کوئی چیز نہیں جو حکمت و مصلحت سے خالی ہو اور بقائے دوام لے آتی ہو۔ ایسا نہیں کہ ساری تخلیقات باطل ہوں یعنی کسی معین مقصد کے بغیر وجود میں آگئی ہوں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو یہ تخلیق بالحق نہیں بلکہ بالباطل ہوتی۔ اس میں نظم اور یکسانیت نہ ہوتی اور یہ کے بغیر ہوتا یعنی تخلیق کھیل کود کی طرح بغیر کسی معقول غرض و مدعا کے ہوتا۔ نزول قرآن سے پہلے بہت سے مذہب نے دنیا کی پیدائش کا جو نقشہ پیش کیا تھا وہ حکمت و مصالح کے تصور سے بالکل خالی تھا لوگ خیال کرتے تھے کہ طاقت و اختیار کے ساتھ حکمت اور مصلحت سے مفاہمت نہیں ہوسکتی۔

حکمت و مصلحت کی پابندی وہی کرے گا جو کسی کے آگے جوابدہ ہو۔ اللہ سبحانہ جو سب سے بڑا اور سب پر حکمران ہے۔ قرآن پہلی کتاب ہے جس نے اللہ سبحانہ کی صفات و افعال کیلئے عقلی تصور قائم کیا اور یہ حقیقت واضح کی کہ حکمت و مصلحت کی رعایت منافی قدرت نہیں بلکہ محاسن قدرت میں سے ہے بلاشبہ اللہ سبحانہ جو کچھ چاہے کرسکتا ہے لیکن اس کے حکیم اور عادل ہونے کا تقاضا یہی ہے کہ جو کچھ کرے حکمت کے ساتھ کرے۔

اس اصل کا نتیجہ ہے کہ اس نے تخلیق کا بھی جو نقشہ کھینچا وہ سرتاسر عقلی نقشہ ہے یعنی حکمت و علت اور نظم و اتقان کا نقشہ ہے اسی لیے قرآن نے تخلیق بالباطل کے خیال کو کفر کی طرف نسبت دی ہے ذالك ظن الذين كفروا اس تخلیق بالحق یا تقاضا قانون مجازات ہے ٹھیک اسی طرح اس کا تقاضا یہ بھی ہے کہ جب کائنات کی ہر چیز کوئی نہ کوئی مقصد اور رکھتی ہے تو ضروری ہے کہ انسانی وجود کے لیے بھی کوئی نہ کوئی مقصد اور منتہی ہو یہی منتہی آخرت کی زندگی ہے کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ کائنات ارضی کی یہ بہترین مخلوق صرف اس لیے پیدا کی گئی ہو کہ پیدا ہو اور چند دن جی کر مر جائے آخرت دار بقاء ہے اس کے مقابلے میں دنیا دار فنا ہے۔ آخرت کی ہر چیز میں دوام ہے دنیا کی ہر چیز فنا پذیر ہے۔

۲۴ سلہ دنیوی زندگی تو صرف بارش کے اس پانی کی طرح ہے جسے ہم نے برسایا اس پانی سے رل مل کر زمین کی وہ پیداوار ہوتی جیسے انسان اور چوپائے کھاتے ہیں۔ بعض نے فاختلط بہ نبات الارض کے معنے کثرت پیداوار کے لیئے ہیں کیونکہ جب زمین کی پیداوار زیادہ قوی ہوتی ہے تو گنجان ہو کر ایک جزو دوسرے جز سے مل جاتا اور لپٹ جاتا ہے بعض نے اسکی باکو مصاحبت کے لیے لے کر یہ معنی کئے ہیں کہ زمین کا سبزہ پانی کے ساتھ رل مل جاتا ہے کیونکہ نباتات اجزائے مائیہ کو جذب کرتے ہیں۔ جس طرح کھانا انسان کا جزو بدن بنتا ہے ایسے ہی پانی گویا نباتات کی غذا بنتا ہے۔ حضرت شیخ الہند کے ترجمہ سے ترشح ہوتا ہے کہ اختلاط سے یہ مراد لے رہے ہیں کہ زمین اور پانی کے ملنے سے جو سبزہ نکلتا ہے اس میں آدمی اور جانور کی خوراک مخلوط (رلی ملی) ہوتی ہے مثلاً گیہوں کے درخت میں دانہ انسان کی غذا اور بھوسہ جانور کی خوراک ہے اسی طرح درختوں میں پھل اور پتے لگتے ہیں جن میں سے ہر ایک کے کھانے والے الگ ہیں سلہ

سلہ افادات شیخ الاسلام

اس دنیوی زندگی کے لیے ایک تمثیل ہے جس کی طرف متاع الحیاۃ الدنیا میں اشارا ہوا ہے، جس سامان دنیا پر کفر پیشہ لوگ مست ہو رہے تھے اور اس کو اس قدر دائی اور محفوظ سمجھے ہوئے تھے کہ اس کے نہ ہونے اور ختم ہوجانے کے امکان کو بھی قبول نہ کرتے تھے۔ اختلاط کے معنی کسی چیز کے مل جانے کے ہیں یہ فصلوں اور نباتات کے خوب زیادہ ہونے کی تعبیر ہے کیونکہ سازگار بارش سے جب فصل نشوونما پاتی ہے تو وہ باہم مل کر خوب گھنی ہوجاتی ہے اور یہ انسانوں اور جانوروں دونوں کی خوراک بنتی ہے۔ علامہ بقاعی لکھتے ہیں کہ وہ دنیا جس پر تم ریجھ رہے ہو اور جس پر لٹو ہو رہے ہو جلدی ختم ہونے مٹ جانے اور فنا ہونے میں بارش سے اگ کر لہلہاتی اور شاداب کھیتی کی طرح ہے جس کی شادابی اور سرسبزی میں دوام نہیں ہوتی ابھی سوکھ کر کٹ جائے گی اور زمین ساری شادابیوں سے محروم ہو جائے گی۔ اور کچھ بھی باقی نہ رہے گا

زمین میں کھیتوں کی شادابی

۳۵ لے جب زمین میں خوب رونق ہوگئی اور زمین پیداوار سے لہلہانے لگی تو زمین کے مالکوں نے خیال کیا کہ زمین کی پیداوار پر ہمارا پورا پورا قابو ہے یعنی مختلف الوان و اشکال کے نباتات نے زمین کو پر رونق اور مزین کر دیا اور کھیتی وغیرہ ایسی تیار ہوگئی کہ مالکوں کو کامل بھروسہ ہوگیا کہ اب اس سے پورا فائدہ اٹھانے کا موقعہ آگیا ہے ۲ے یعنی اس کی خوشنمائی کمال کو پہنچ گئی ہر بالیاں اور کھیتیاں لہلہا اٹھتی ہیں اور ہر طرف شادابی کا منظر ہوتا ہے اور تمام نباتی نمائشوں سے کسان لذت گیر ہوتا ہے اور سمجھتا کہ بس اب ہمیں پوری قدرت ہے اب اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے۔ اسی کے بل بوتے میں مقابلہ کا بازار گرم ہوتا ہے عملی میدان میں اس زندگی میں دولت و ثروت کا مقابلہ کیا جاتا ہے اور پیداوار کی آمدنی کا موازنہ کر کے اندر ہی اندر ہر ایک دوسرے کے مقابلہ میں آگے بڑھ جانے کی فکر اور کوشش میں لگ جاتا ہے۔ اللہ اللہ یہ سارے معاشی جھگڑے معاشیاتی مقابلے جو افراد سے گذر کر اقوام تک کو میدان میں لے آئے اس کے نتیجہ میں اس قدر خدا فراموشی جنم لیتی ہے کہ زمین انسانی رگوں کے خون سے لالہ زار بنی ہوئی ہے۔ آسمان آگ برسا رہا ہے فتنہ و فساد سے کائنات کی ساری فضا بھر گئی ہے جیسے

لے افادات شیخ الاسلام

والے جیخ رہے ہیں ازالہ کی ساری کوششیں ختم ہو چکی ہیں نبوت اس کا حل بتاتی ہے کہ الدنیا کا الدین سے رشتہ جوڑ کر صرف یہ تدبیر کی جائے کہ مقابلے کے سارے جذبات کا سارا رخ الحیوٰۃ الدنیا سے ہٹا کر الحیاۃ الاخری کی بلند دوامی زندگی کی طرف پھیر دیا جائے، مگر جن کی نگاہوں میں بناتی نمائشیں رچی بسی ہوئی ہیں وہ اس سے دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں اور اسی پر ریجھ رہے ہیں۔

فکرو تدبر کی دعوت

۲۴ے تو رات یا دن میں اچانک ہمارا حکم آگیا اور ہم نے ساری زمین کی پیداوار کو کاٹ کر رکھ دیا گویا گذشتہ کل یہاں کچھ تھا ہی نہیں غور و فکر اور سوجھ بوجھ والوں کے لیے ہم اسی طرح آیات کو کھول کر پیش کرتے ہیں۔ یعنی ناگہاں اللہ سبحانہ کے حکم سے دن یا رات میں کوئی آفت آپہنچی مثلاً بگولا آگیا یا اولے پڑ گئے یا ٹڈی دل پہنچ گیا وعلی ہذا القیاس اس نے تمام زراعت کا صفایا کر ڈالا گویا کبھی یہاں ایک تنکا بھی نہ اگا تھا ٹھیک اسی طرح حیات دنیا کی مثال سمجھ لو کہ خواہ کتنی ہی حسین وجمیل اور تروتازہ نظر آئے حتیٰ کہ بے وقوف لوگ اس کی رونق و دلربائی پر مفتوں ہو کر اصل حقیقت کو فراموش کر دیں۔ لیکن اس کی یہ شادابی اور زینت و بہجت محض چند روزہ ہے جو بہت جلد زوال و فنا کے ہاتھوں نسیاً منسیا ہو جائے گی لیلاً او نہارا رات یا دن کو شاید اس لیے فرمایا کہ رات کا وقت غفلت کا ہے اور دن میں لوگ عموماً بیدار ہوتے ہیں مطلب یہ ہے کہ جب اللہ سبحانہ کا حکم پہنچے پھر سوتا ہو یا جاگتا غافل ہو یا بیدار کوئی شخص کسی حالت میں اس کو روک نہیں سکتا[1]

اس آیت دنیا کی بے ثباتی کو ایک مثال کی صورت میں یوں پیش کیا جیسے آسمان سے خوب زور کی بارش ہو ہر قسم کے نباتات کی روئیدگی خوب ہو آدمی کے کھانے کے قابل پھل پھلواری میوہ غلہ اور جانوروں کے کھانے کے قابل چارہ وغیرہ کی خوب پیداوار ہو، پھر جب ہر طرف خوب سرسبزی شادابی پھیل جائے لہلہاتا کھیت سرسبز درخت شاداب باغ ہر طرف پورے زیب و زینت کے ساتھ نظر آنے لگیں۔ اور انسان سمجھنے لگے کہ بس ہم ان تمام لذتوں اور نعمتوں سے

[1] افادات شیخ الاسلام

لطف اٹھانے کے پوری پوری طرح مالک و مختار ہیں کہ یک بیک حکم الٰہی سے کوئی ایسا آسمانی یا زمینی حادثہ پیش آجائے کہ سارا گل و گلزار تہس نہس ہو کر رہ جائے اور حالت یہ ہو جائے کہ گویا یہاں کل کچھ تھا ہی نہیں۔ یہ مرقع ہے انسانی زندگی کا کہ بڑے بڑے نامور با اقبال کا بھی خاتمہ دفعۃً موت پر ہو کر رہ جاتا ہے اور یہ حال ہے دنیا کا جس میں غافل انسان ہمہ تن معروف رہتا ہے دنیوی زندگی کی مثال تو بالکل ایسی ہے جیسے کاشتکاری کا معاملہ آسمان سے پانی برستا ہے اور تمہارے کھیت لہلہانے لگتے ہیں پھر جب وہ وقت آتا ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ اب فصل پک گئی اور ہماری محنت کی کمائی ہمارے قبضہ میں ہے تو اچانک کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے اور ساری فصل اس طرح تباہ ہو جاتی ہے گویا اس کا نام و نشان بھی نہ تھا یعنی دنیوی زندگی کی ساری کامرانیاں اور دلفریبیاں بے ثبات اور ہنگامی ہیں۔ تم یہاں کسی چیز پر اعتماد نہیں کر سکتے کہ یہ ضرور ایسی ہی رہے گی اول تو زندگی ہی چند روزہ ہے پھر اس کا بھی ٹھکانا نہیں ہے پھر زندگی کے عیش و تنعم کی جتنی دلفریبیاں ہیں سب کا حال یہ ہے کہ صبح ہیں تو شام نہیں شام کو نہیں تو صبح کو نہیں ایسی حالت میں اس سے بڑھ کر غفلت و گمراہی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ انسان حق و راستی کی راہ چھوڑ کر سرکشی پر اتر آئے اور کس چیز کے بھروسے پر اس زندگی کے سروسامان اور اقتدار کے بھروسہ پر جسے چند لمحوں کے لیے بھی قطعی اور برقرار نہیں کہہ سکتا لیکن انسانی غفلت کے عجائبات کا بھی حال ہے کوئی نہیں جو اس غرور باطل کی سرگرانیوں سے اپنی نگہداشت کر سکے۔ یہی غفلت ہے جسے قرآن دور کرنا چاہتا ہے وہ دنیا اور اس کی کامرانیوں سے نہیں روکتا مگر ان کے غرور باطل اور بے اعتدالانہ انہماک کی راہیں بند کر دینا چاہتا ہے کیونکہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے سارے فتنوں کا اصلی سرچشمہ یہی غرور باطل ہے۔[1]

شاہ عبدالقادر کی لطیف تشریح

شاہ صاحب نے اس مثال کو نہایت لطیف انداز میں خاص انسانی زندگی پر منطبق کیا ہے پانی کی طرح روح عالم بالا سے آئی۔ کالبد خاکی میں مل کر قوت پکڑی۔ دونوں کے ملنے سے آدمی بنا۔ پھر کام کیے۔ انسانی اور حیوانی دونوں طرح کے کام کیے جب پر سیر میں کامل اور

[1] ترجمان قرآن

ماہر ہو گیا اور اس کے متعلقین کو اس پر بھروسہ ہو گیا۔ ناگہان موت آپہنچی جس نے ایک دم میں سارا بنا بنایا کھیل بگاڑ کے رکھ دیا۔ پھر ایسا بے نام ونشان ہوا گویا کبھی زمین پر آبادہی نہ ہُوا تھا[1]
منشا یہ بتانا ہے کہ انفرادی زندگی ہو جیسا کہ شاہ صاحب کی رائے ہے یا پوری دنیا کی اجتماعی زندگی ہو انفرادی زندگی میں ہر شخص اپنی تندرستی صحت اور قوت پہ نازاں ہوتا ہے جب کہ اجتماعی زندگی میں اقتدار اور تمدن و تہذیب پر فخر کرتا ہے انفرادی زندگی کو موت آکر ختم کر دیتی ہے اور اجتماعی زندگی پر قہر الٰہی کا کوئی جھونکا آکر سب کچھ کو خس و خاشاک میں تبدیل کر دیتا ہے دونوں کی مثال لگی ہوئی سر سبز و شاداب کھیتی اور باغ کی ہے کھیتی ساری شادابیوں کے ساتھ یکبارگی ختم ہو جاتی ہے ایسے ہی شخصی زندگی ساری صحت مندیوں کے باوجود اور اجتماعی زندگی ساری ترقیوں کے باوجود قہر خداوندی کا نشانہ بن جاتی ہے۔ اجتماعی زندگی کی حد تک اس تمثیل سے یہ بات معلوم ہو رہی ہے کہ جن قوموں پر اللہ کی حجت پوری ہو جاتی ہے ان کو وہ عین دورِ عروج میں پکڑ لیتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ سبحانہ کے یہاں اہمیت عقائد و اعمال کی ہے نہ کہ مادی اسباب و رسائل کی۔ اگر ایک قوم اخلاقی اعتبار سے گر چکی ہے تو اسباب و وسائل کی فراوانی اس کو سہارا دینے کے بجائے اس کے زوال کی رفتار کو اور تیز کر دیتی ہے۔

---

[1] موضح القرآن

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ۭ وَيَهْدِيْ مَنْ
يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۲۵ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ
زِيَادَةٌ ۭ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَھُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ
الْجَنَّةِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۶ وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّـيِّاٰتِ
جَزَاۗءُ سَيِّئَةٍۢ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُھُمْ ذِلَّةٌ ۭ مَا لَھُمْ مِّنَ اللّٰهِ
مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُھُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ
مُظْلِمًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۷

اور اللہ سبحانہ سلامتی کے گھرانے کی طرف بلا رہا ہے اور اللہ ہی جسے چاہتا ہے صراط مستقیم کی راہ پر لگا دیتا ہے[۳۷] ان لوگوں کے لیے جو اپنی زندگی میں حسن کار بن کر رہے اچھی اور شاندار زندگی ہے اور کچھ زیادہ بھی ہے[۳۸] ان کے چہروں پر نہ تو مجرمانہ سیاہی ہوگی اور نہ ذلت یہی لوگ جنت کے باسی ہیں اور اس میں ان کا بسیرا ہمیشہ ہوگا[۳۹] اور جو لوگ زندگی میں برائیوں کی کمائیاں کرتے رہے ہیں ان کے لیے برائی کا بدلہ

برائی ہے ان پر ذلت چھائی ہوگی اللہ سبحانہ کی گرفت سے
بچانے والا کوئی نہیں ہے۔ ان کے چہرے ایسے کالے ہوں
گے گویا ان کے چہروں کو تاریک رات کے ٹکڑوں سے ڈھانپ
دیا گیا ہے یہی دوزخی ہیں ان کو دوزخ ہی میں رہنا ہے۔

مفردات کے معانی

دارالسلام یہ جنت کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ اس کے معنے ہیں سلامتی اور بچاؤ کا گھر۔ اس نام کی وجہ تسمیہ علامہ آلوسی نے یہ بتائی ہے کہ اس کے مکین کو ہر قسم کی تکلیف اور آفت سے سلامتی ہوگی۔

الحسنی واحد مؤنث اسم تفضیل حسن سے فعلی باب کرم سے اس کی ضد سوائی۔ ساء یسوء مؤنث باب نصر سے اجوف واوی۔ الحسنی صفت ہے موصوف محذوف ہے الحیاۃ الحسنی، الدرجۃ الحسنی المنزلۃ الحسنی۔

لا یرھق واحد مذکر غائب مضارع رَھِق یرھق اصل میں اس کے معنے ایک چیز کے دوسری چیز پر زبردستی چھا جانے کے ہیں اور چونکہ اس کا لازمی نتیجہ تباہی ہے اس لیے تباہ ہونے کے معنی میں اس کا استعمال ہوتا ہے مبرد نے تصریح کی ہے کہ جب کسی کے متعلق کہا جائے فیہ رھق تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں عقل کی کمی ہے جس کی بنا پر وہ شر میں گھرا ہوا ہے اور برائی ہر طرف سے اس پر چھا رہی ہے۔ اسی لیے اس کے معنے ڈھانپنے کے ہیں۔

قتر۔ جلن اور لکڑی کے دھوئیں کو کہتے ہیں، ہر غبار جس میں سیاہی ہو اسے قتر کہتے ہیں۔

سیئۃ یہ ساء یسوء سے صفت مشبہ کا فیعلۃ کے وزن پر صیغہ ہے اس کے معنے برائی کے ہیں۔

اغشیت یہ اغشار سے ماضی کا واحد مونث غائب ناقص یائی مجرد غشی یغشی باب سمع سے آتا ہے اوپر سے ڈھانکنا۔ اسی سے غشاوۃ ہے۔

آخرت پر ایمان لانے کی اہمیت

مومن ہونے کے لیے بالکل ناگزیر ہے کہ جس طرح اللہ سبحانہ پر ایمان لایا جائے اسی طرح آخرت پر بھی ایمان لایا جائے اس کے بغیر آدمی مومن اور مسلم نہیں ہو سکتا اور اس کی عدم موجودگی میں اللہ پر ایمان رکھنا بھی کوئی معنے اور کوئی فائدہ نہیں رکھتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آخرت کا آنا بھی دراصل اللہ تعالیٰ ہی کی بہت سی صفتوں کا تقاضا ہے مثلاً اس کی صفت عدل اس کی صفت رحمت کا اس کی صفت قدر شناسی کا اور اس کی صفت حاکیت کا۔ قیامت کے نہ آنے اور انسانی عمل کی جزا نہ ملنے کی شکل میں یہ بات محض ایک بے بنیاد دعویٰ بن کر رہ جاتی ہے کہ اس دنیا کا پیدا کرنے والا ایک عادل اور حکیم ہے رحیم اور شکور ہے مالک و فرماں روا ہے کیونکہ اعمال کے اخلاقی نتائج اس دنیا میں تو جیسے چاہئیں جاتے آتے دیکھے نہیں جاتے۔ ظالم پھلتا اور پھولتا ہے تو حق پسند مصیبتیں اٹھاتا رہتا ہے اس لیے اس زندگی کے بعد اگر اس کا موقع نہیں ملتا کہ ہر شخص اپنے کیے کا بدلہ پائے تو یہ ایک عجیب و غریب صورت حال ہو گی جو اللہ سبحانہ کے عدل و حکمت اور اس کی رحمت و حاکیت کی صریح نفی ہو گی اس لیے اللہ تعالیٰ پر یقین رکھنا اور جزا و سزا کا انکار کرنا دونوں باتیں الفاظ کی حد تک تو جمع ہو سکتی ہیں مگر حقیقت میں کبھی جمع نہیں ہو سکتی ہیں۔

جب قرآن لفظ الاخرہ بولا جاتا ہے تو اس سے الدار الاخرہ یا الحیاۃ الاخرہ مراد ہوتا ہے۔ الدار الاخرہ برزخ قیامت حشر، جزائے اعمال جنت اور دوزخ کے مجموعہ کا نام ہے، برزخ کے بھی مختلف نام ہیں قیامت کے ایک سے زیادہ نام ہیں جنت کو بھی مختلف ناموں سے پکارا گیا ہے اور دوزخ کے لیے مختلف تعبیرات ہیں جیسے قیام یا رکوع اور سجود بول کر ساری نماز مراد ہوتی ہے ایسے ہی آخرت سے متعلق کسی ایک نام کو بول کر آخرت کی پوری دنیا مراد ہوتی ہے۔

۲۵ اور اللہ سبحانہ سلامتی کے گھر آنے کی طرف بلا رہا ہے اور اللہ ہی جسے چاہتا ہے صراط مستقیم کی راہ پر لگا دیتا ہے یعنی دنیا کی زائل و فانی زندگی پر مت ریجھو دارالسلام جنت کی طرف آؤ اللہ تم کو سلامتی کے گھر کی طرف بلا رہا ہے اور وہاں تک پہنچنے کا راستہ بھی دکھلاتا

رہا ہے وہی گھر ہے جہاں کے رہنے والے ہر قسم کے رنج وغم پریشانی تکلیف نقصان وذقت اور فنا و زوال وغیرہ سے صحیح وسالم رہیں گے فرشتے ان کو سلام کریں گے۔ خود رب العزت کی طرف سے سلام کا تحفہ پہنچے گا[1]

اس مقام کا نام جو الدار الآخرہ میں نیکوکار انسانوں کو ملے گا اور ان کا دائمی گھر ہو گا قرآن پاک میں بالعموم الجنۃ آیا ہے اور کبھی اس کو مختلف اضافتوں سے بھی تعبیر کہا گیا ہے مثلاً جنۃ النعیم جنۃ الخلد، جنات عدن جنۃ الماوی، فردوس، روضۃ۔ دار الخلد، دار المقامہ دار السلام۔ اس آیت میں جنت کا نام یہی ہے اور اللہ کی وہ شریعت بھی یہی ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کے نام سے اللہ سبحانہ کی جانب سے لے کر آئے ہیں وہ فی الواقع امن وسلام کی نوید و بشارت ہے اور اسی کے مطابق اس دنیا میں زندگی گذار لے پر جنت یعنی دار السلام آخرت کی زندگی میں ملے گا۔ انسان امن وسلامتی کا بھوکا ہے لیکن وہ اس امن وسلامتی کو دنیا کے اسباب راحت کے انبار یعنی متاع الحیاۃ الدنیا میں تلاش کرتا ہے اور نہیں پاتا وہ دنیا میں امن کا گوشہ ڈھونڈتا ہے اور اسے نہیں ملتا ہے کیونکہ یہ دنیا فانی ہے اور اس کی مثال لگی ہوئی شاداب کھیتی کی ہے لیکن آخرت کی زندگی میں نہ صرف امن کا گوشہ بلکہ امن وسلامتی کی پوری دنیا ملے گی اہل جنت کے متعلق ارشاد ہے لھم دار السلام عند ربھم۔ اللہ سبحانہ نے جس اسلام کو دین وقانون بنا کر قرآن کے ذریعے پیش کیا ہے وہ بھی امن وسلامتی کی بشارت ہے اسی کی اس آیت میں دعوت دی گئی ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو سب سے پہلے اس امن وسلامتی کے گھر کی دعوت پیش فرمائی۔ عبد اللہ ابن سلام ایک یہودی عالم تھے حضور اقدس کی جس صدائے نبوت نے سب سے پہلے ان کے دل میں گھر کیا وہ یہ تھی لوگو سلامتی پھیلاؤ۔ بھوکوں کو کھانا کھلاؤ جب دنیا غفلت کی نیند سو رہی ہو تم اٹھ کر اللہ سبحانہ کی عبادت کرو امن وسلامتی کے گھر میں تمہیں رہنا نصیب ہو گا۔

واللہ یدعوا الی دار السلام کا مطلب ہے کہ اللہ سبحانہ تمہیں دنیا میں زندگی بسر کرنے کے اس طریقے کی دعوت دے رہا ہے جو آخرت کی زندگی میں تمہیں

[1] افادات شیخ الاسلام

دارالسلام کا مستحق بنادے قرطبی نے اس فقرے کا مطلب یہ بتایا ہے کہ اللہ سبحانہ تمہیں دینا سینٹے کی نہیں بلکہ اپنی طاعت وعبادت کی دعوت دیتا ہے تاکہ تم میں دارالسلام تک پہنچنے کی صلاحیت ہو جائے۔

واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم اللہ سبحانہ جسے چاہتا ہے صراط پر چلنے کی توفیق دیتا ہے یہاں دو باتیں سمجھنے کی ہیں ایک یہ کہ اللہ سبحانہ کی مشیت کیا ہے؟ دوسرے یہ کہ صراط مستقیم کیا مقصود ہے؟

اللہ سبحانہ کی مشیت کیا ہے۔ اکثر متکلمین کے نزدیک مشیئۃ اور ارادہ میں کوئی فرق نہیں دونوں ایک ہیں اور کچھ کی رائے میں مشیئۃ نام ہے کسی چیز کے ایجاد کرنے اور چاہنے کا اگرچہ عرف میں اس کا استعمال ارادہ ہی کی جگہ میں ہوتا ہے لہذا اللہ سبحانہ کی جانب سے مشیئۃ کے معنی ایجاد کرنے اور لوگوں کی جانب سے شیئۃ کے معنے چاہنے کے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کسی چیز کے متعلق اللہ سبحانہ کی مشیت ہونا اس امر کا مقتضی ہے کہ اس چیز کا وجود عمل میں آئے اور اللہ کے ارادہ ہونے کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ مراد یقیناً وجود میں آئے۔

یہ لوگ ان دونوں کے درمیان یہ فرق بتاتے ہیں کہ انسانی ارادہ کبھی بغیر ارادہ کے تقدم کے بھی حاصل ہو جاتا ہے چنانچہ انسان کا ارادہ ہوتا ہے کہ اسے موت نہ آئے اور اللہ تعالیٰ کا ارادہ نہیں ہوتا لیکن مشیت انسانی بغیر مشیت الٰہی کے وجود میں نہیں آتی کیونکہ ارشاد ہے وما تشاءون الا ان یشاء اللہ۔

دراصل یہاں دو چیزیں ہیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ درست ہیں ایک یہ کہ اللہ سبحانہ کو اپنی مخلوقات پر قدرت تامہ حاصل ہے اور اس کی مشیت ارادہ ہر جزو کل پر حاوی ہے اور دوسری یہ کہ انسان کو بھی اپنے عمل پر کوئی نہ کوئی ایسا اختیار حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے فعل کا ذمہ دار بنتا ہے نیکی کے کاموں کے کرنے پر وہ تعریف کا اور بدی کے کاموں پر ملامت کا سزاوار ٹھہرتا ہے اور اسی وجہ سے وہ آخرت کی زندگی میں اپنے کام کی جزا اور سزا کا مستحق ہوگا اور اسی کی خاطر اللہ سبحانہ کی طرف سے اس کے پاس کتاب ہدایت اور اللہ کے رسول آتے ہیں۔

قرآن پہلی اور آخری کتاب ہے جس نے ان دونوں صداقتوں کو پوری تفصیل اور وضاحت سے اپنی اپنی جگہ تسلیم کیا ہے اور ان کی تبلیغ کی ہے ایک طرف قرآن کہتا ہے

کہ اللہ سبحانہ کے علم کے بغیر ایک پتا بھی گر نہیں سکتا اور دوسری طرف وہ کہتا ہے کہ ہر جان اپنے کاموں کے ہاتھوں گرو ہے یعنی اللہ سبحانہ کی ہمہ گیر قدرت وسیع اختیار اور ناقابل رد مشیت کے باوجود اس نے خود اپنے اختیار خود اپنی مشیت اور خود اپنی حکمت سے انسان کو ارادہ اور ارادہ کے مطابق اپنے کام کرنے والے اعضا کو ہلانے کی چلانے کی مشروط طاقت بخشی ہے یہی ارادہ اور اعضا کو اس کے مطابق حرکت دیسکنے کی محدود طاقت اس کی ذمہ داری تکلیف باز پرس اور مواخذے کی بنیاد ہے اور اسی پر اس کے اعمال اخلاق معاملات کی پوری عمارت کھڑی ہے اس سے انسان اس کے کسی ایسے عمل کی ذمہ داری قانوناً اور شرعاً نہیں جو اس کے ارادے اور نیت سے صادر نہ ہوئی ہو بلکہ اسکو کرنے یا نہ کرنے میں وہ مجبور و بے اختیار ہو یہاں جسے چاہتا ہے صراط مستقیم کی رہنمائی کر دیتا ہے کا مطلب یہ کہ جو بھی صراط مستقیم پر چلنے کا ارادہ کرتا ہے اور اس کے لیے اللہ کے دیئے ہوئے اختیار کو استعمال کرتا ہے اللہ سبحانہ اس کی صراط مستقیم کے لیے رہنمائی فرما دیتا ہے۔ اللہ کی مشیت کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اصل چیز بندے کا ارادہ و اختیار ہے اب ارادہ نہ کریں اور اللہ کے دیئے ہوئے اختیار کو کام میں نہ لائیں تو اللہ سبحانہ زبردستی اور جبر سے کام نہیں کراتا۔ زبردستی کافر کو مومن بنانا اور بد کو نیک بنانا اللہ سبحانہ کے جاری قانون کے خلاف ہے۔

حضرت مولانا اشرف علیؒ ارادہ و اختیار کے موضوع پر اچھی اور لطیف تشریح پیش کی ہے۔ جن کو دیکھنے کا شوق ہو وہ مولانا کے مکتوب اسبیل لجابری السبیل کا مطالعہ کریں جو قصد السبیل کے ساتھ طبع ہوا ہے۔

صراط مستقیم کیا ہے

لغت میں صراط سیدھے اور آسان راستہ کو کہتے ہیں حافظ ابن القیم فرماتے ہیں: صراط اصل میں اس راستہ کو کہتے ہیں جس میں پانچ باتیں ہوں ایک سیدھا ہو دوسرے منزل تک جاتا ہو تیسرے سب سے قریب ہو چوتھے کشادہ ہو پانچویں مقصد تک پہنچنے کے لیے اس کے سوا راستہ کوئی نہ ہو۔

مستقیم استقامت سے بنا ہے اس کے معنے ٹھیک اور سیدھا ہونے کے ہیں سورۃ

فاتحہ میں صراط مستقیم ان انعام یافتہ بزرگوں کے راستہ کو کہا جن میں مغضوبیت اور علم میں ضلالت نہ ہو۔ قرآن نے علم وعمل کا عملی نمونہ انبیاء صدیقین شہدا اور صالحین کو قرار دیا ہے علم وعمل کا یہ مجموعہ ہی نعمت ہے اور اس نعمت کے حامل بزرگوں کا راستہ صراط مستقیم ہے۔ اگر یہ واقعہ ہے کہ قرآن تمام کی ہدایات کا مجموعہ ہے تو پھر یہ بھی بے غبار حقیقت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کمال علم اور کمال عمل لے کر تشریف لائے ہیں۔ آپ کے کمال علم اور آپ کے کمال عمل کا مجموعہ ہی صراط مستقیم ہے۔ اسی کا نام اسلام ہے اب آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ سبحانہ نے آخرت کی زندگی میں پہلے جنت کی دعوت دی اور ساتھ ہی جنت میں پہنچنے کا راستہ بھی بتا دیا یعنی جنت میں پہنچنے کے لیے تمہیں ارادے اختیار اور ہمت سے کام لینا ہو گا۔ کسی کو جنت میں نہیں پہنچایا جائے گا۔ جو ہمت اور اختیار ہے یہاں صراط مستقیم پر چلنے کا ارادہ کرے گا اللہ سبحانہ کی جانب سے اس کے لیے توفیق کی راہیں کھلی ہونگی جیسے پیاس کے لیے پانی پیٹ بھرنے کے لیے روٹی ناگزیر ہے ایسے ہی جنت کے لیے بھی ایمان وعمل ضروری شرط ہے۔

زندگی میں حسن کاری

۲۶ ان لوگوں کے لیے جو اپنی زندگی میں حسن کار بن کر رہے ہیں اچھی اور شاندار زندگی ہو گی اور کچھ زیادہ ہی ہو گا یعنی اچھے کام کرنے والوں کو وہاں اچھی جگہ ملے گی یعنی جنت اور اس سے زیادہ بھی کچھ ملے گا یعنی حق تعالیٰ کی رضا اور اس کا دیدار زیادہ کی تفسیر دیدار مبارک سے کئی احادیث صحیحہ میں آتی ہے اور بہت سے صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم سے منقول ہے حضرت صہیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی اور فرمایا جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں داخل ہو جائیں گے تو ایک پکارنے والا پکارے گا اے اہل جنت تمہارے لیے اللہ سبحانہ کا ایک وعدہ باقی ہے جسے اب پورا کرنا چاہتا ہے جنتی کہیں گے کہ وہ کیا ہے؟ کیا اللہ سبحانہ نے اپنے فضل سے ہمارے حسنات کا پلہ بھاری نہیں کر دیا کیا اس نے ہمارے چہروں کو سفید اور نورانی نہیں کر دیا کیا اس نے ہمیں دوزخ سے بچا کر جنت میں نہیں پہنچایا۔ یہ سب کچھ تو ہو چکا آگے کونسی چیز باقی ہے اس پر حجاب اٹھا دیا جائے گا اور جنتی حق تعالیٰ شانہ کی طرف نظر کریں گے بس اللہ سبحانہ کی قسم کوئی نعمت جو ان کو عطا ہوئی ہے دولت دیدار سے

سے زیادہ محبوب نہ ہوگی نہ اس سے بڑھ کر کوئی چیز ان کی آنکھیں ٹھنڈی کر سکے گی رزقنا اللہ سبحانہ وتعالی امنتہ وفضلہ [1]

اس آیت کی تشریح میں زیادہ اہمیت احسنوا کی ہے۔ یہ احسان سے ہے احسان کے معنے حسن کار بننے اور حسن کاری کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اپنے ایمان وعمل میں حسن کار واقع ہوئے یعنی ایمان وعمل کے ادنی درجے پر ہی قناعت نہیں کرتے بلکہ ان کے حسن کا جو درجہ ہے اس کے حصول میں کوشاں رہتے ہیں۔ گویا الذین احسنوا مسلمانوں کا طبقہ ہے جو زندگی کے تمام مطلوبہ شعبوں میں حسن کار ہو یعنی سر کا بوجھ اتارنے کے لیے جو کام کئے جاتے ہیں ان میں نہ زیادہ مشقت ہوتی ہے نہ زیادہ وقت لگتا ہے نہ زیادہ محنت ہوتی ہے لیکن جو کام پورے حسن وسلیقہ کے ساتھ کیا جائے گا اس کیلئے بھی سب کچھ اور بہت کچھ کرنا پڑے گا۔ پھر ان حسن کاروں کو جمال مطلق کی محبوبیت کا مقام اگر حاصل ہو جس کا اس آیت میں ذکر ہے تو اپنی محنت ومشقت کی بنیاد پر یقیناً وہ اس کے مستحق ہیں۔ یہاں الذین احسنوا سے مراد وہی لوگ ہیں جن کی زندگی خالق ومخلوق کے باہمی تعلقات کی تصحیح میں حسن کارانہ مجاہدوں کے ساتھ بسر ہوتی ہے خواہ اس کا تعلق اللہ کی پرستش سے یا اللہ سبحانہ کی بندگی سے ہو۔ حدیث جبریل میں احسان کی جو شرح ان الفاظ میں کی گئی ہے۔ ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک (اللہ سے عابدانہ تعلقات پیدا کرو اس طریقہ سے کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو بس اگر تم اسے دیکھ نہ پاؤ تو اتنی بات تو یقینی ہے کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے) اس سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے۔ بہر حال اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ حسن کاروں کو جو جزا اس حسن کاری کی ملے گی وہ بھی الحسنی شاندار خوبصورت ہوگی کیونکہ ھل جزاء الاحسان الا الاحسان اس جزاء کے سوا ان حسن کاروں کو کچھ اور بھی ملے گا۔ کچھ اور کے لیے قرآن کی تعبیر وزیادہ ہے اس کی تشریح میں شارحین قرآن نے دو راہیں اختیار کی ہیں۔ ایک وہ ہیں جن پر عقلیت غالب ہے ان میں زمخشری صف اول میں بیضاوی اسی کے ہمنوا ہیں قاضی صاحب زیادہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہ ان کو مزید

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ثواب اپنے فضل سے عطا کریں گے۔
دوسرے وہ ہیں جنہوں نے زیادہ کی تشریح ارشاد نبوت کی روشنی میں کی ہے علامہ آلوسی، علامہ قرطبی کی یہی رائے ہے کہ زیادہ سے مراد دیدار الٰہی ہے۔ یہ تفسیر صحیح مسلم میں حضرت صہیب صحابی کے حوالہ سے خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے جیسا کہ آپ شیخ الاسلام کی زبانی سن آئے امام بخاری نے صحیح میں اگرچہ صہیب کی روایت میں نہیں لی ہے لیکن ترجمۃ الباب میں قال غیرہ النظر الی وجھہ کہہ کر اس تشریح کو پیش کیا ہے اور اس سے پہلے مغفرہ رضوان سے بھی اس کی تشریح کی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ امام بخاری کے نزدیک دونوں تشریحیں یعنی رضوان اور نظر الی لوجہ صحیح ہیں۔ دراصل دونوں کا ذکر کر کے امام بخاری بتا رہے ہیں کہ جنت کے انعامات کی فہرست میں رضوان بھی ہے اور دیدار الٰہی بھی رضوان یہ ہے کہ اللہ سبحانہ اپنے بندے سے راضی ہو تاکہ کبھی وہ اپنے بندے پر عتاب نہ فرمائے نہ اس سے ناراض ہو سورہ توبہ میں اس کی تفصیل آچکی ہے اور جنت میں سب سے آخری نعمت اللہ سبحانہ کی تجلی کا نظارہ ہے کون ہے جو اس مطلع انوار کے دیدار کی تاب لا سکے قرآن کا اعلان ہے وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربھا ناظرۃ اور حضور اقدس کا اپنا ارشاد ہے فواللہ ما اعطاھم شیئًا احب الیھم النظر الی وجہ اللہ الکریم اس آیت کی تشریح میں حضرت جریر بن عبداللہ صحابی روایت کرتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم اپنے رب کو بالمشاہدہ دیکھو گے سو دوسری روایتوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جیسے تم چاند کو دیکھ رہے ہو ایسے ہی تم اپنے پروردگار کو دیکھو گے اس دیدار میں کوئی دوسرا مزاحم نہ ہوگا۔

ارشاد کا منشا یہ ہے کہ حسن کار اور حسن کردار والوں کو حسنیٰ اچھا خوبصورت اور شاندار مقام ملے گا حسن کار والوں کو صرف حسنیٰ ہی نہیں ملے گا بلکہ حسن کاروں سے اللہ سبحانہ محبت کرتا ہے احسنوا ان اللہ یحب المحسنین اور حسن کاروں کو اللہ سبحانہ کی محبت حاصل ہوگی یہ قانون الٰہی ہے کہ اللہ کی نصرت ان کا ساتھ دیتی ہے جو برائیوں سے بچتے ہیں اور جن کی زندگیوں میں حسن کاری ہو۔

یہ بات ذہن میں رکھ لیجئے کہ صحابہ کرام کی ساری جماعت مہاجرین ہوں یا انصار سب کے سب حسن کار تھے۔ ان کی حسن کاری میں قیامت تک جو ان کی پیروی کریں گے اللہ سبحانہ

نے ان کو رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کا شہادت نامہ دیا ہے۔

حسن کار لوگ کے چہروں کی چمک

۲۹ سلہ ان کے چہروں پر نہ تو مجرمانہ سیاہی اور نہ ذلت۔ یہی لوگ جنت کے باسی ہیں اور اس میں ہمیشہ ان کا بسیرا رہے گا یعنی میدان حشر میں جس طرح کفار فجار کے چہروں پر سخت ذلت و ظلمت چھائی ہو گی جنتیوں کے چہرے اس کے خلاف ہوں گے سیاہی اور رسوائی کیسی وہاں تو نور ہی نور، اور رونق ہی رونق ہو گی لہ مطلب یہ ہے کہ ان کے چہرے اپنی کامیابی پر بشاش و بشاش ہوں گے اور ہر قدم پر ان کے ساتھ اعزاز و اکرام کا معاملہ ہو رہا ہو گا یہاں قرآن نے منفی پہلو بتایا ہے کہ ان کے چہروں پر سیاہی نہ ہو گی اور ذلت نہ ہو گی دوسری جگہ قرآن نے مثبت پہلو پیش کیا ہے۔

واما الذین ابیضت وجوھھم ففی رحمة اللہ ھم فیھا خالدون

جن کے چہرے چمک رہے ہوں ہو گے وہ ہمیشہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے

یہ ان کے مقام رحمت میں ہونے کا اعلان ہو رہا ہے۔ اللہ سبحانہ کی رحمت کہاں نہیں اور کب نہیں لیکن وہ عالم وہ ہے جہاں اس کی رحمت کے سوا اس کے قہر و غضب کا نام و نشان نہ ہو گا۔ وہاں ہر طرف اس کی رحمت اور فیض و کرم کی بارش ہو گی اور اس کی رحمت کے سوا وہاں کوئی اور منظر کہیں اور کبھی دکھائی نہ دے گا۔ اہل جنت کو جن کے چہرے خوشی سے چمکتے ہوں گے ان کو بشارت کی آواز سنائی دے گی۔

لا یرھق وجوھھم کا مدلول یہ بھی ہے کہ ان کے چہرے نور سے چمک رہے ہوں گے اس میں بھی ان کے جنت میں مقام نور میں ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ جنت کا مقام نور وہ ہے جہاں ظلمت و تاریکی کا نام و نشان نہ ہو گا جنتیوں کے چہرے روشن ہوں گے کوئی ستاروں کی طرح چمکے گا کوئی چاند کی طرح ان کے ہر طرف انوار کی بارش ہو گی آگے پیچھے ہر طرف سے نور درخشاں ہو گا نورھم یسعی بین ایدیھم وبایمانھم۔

لہ افادات شیخ الاسلام

سزا اور جرم میں توازن

۲۷ اور جو لوگ زندگی برائیوں کی کمائیاں کرتے رہے ہیں ان کے لیے برائی کا بدلہ برائی ہے۔ان پر ذلت چھائی ہوگی۔ ان کو اللہ سبحانہ کی گرفت سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا۔ان کے چہرے ایسے کالے ہوں گے گویا ان کے چہروں کو تاریک رات کے ٹکڑوں سے ڈھانپ دیا گیا ہے یہی دوزخی ہیں ان کو دوزخ ہی میں رہنا ہے۔

اس آیت میں ضروری باتیں سمجھنے کی یہ ہیں۔

۱۔ برائیوں کو کمانے والے

۲۔ برائی کا بدلہ اسی جیسا

۳۔ ان کے چہروں کی کالک اور ان کی روسیاہی

قرآن یہاں احسان کے مقابلہ میں کسب لایا ہے ہونا یہ چاہیئے تھا والذین اساؤا وہ لوگ جنہوں نے حسن کاری جگہ بدکاری میں زندگی گذاری۔ علامہ آلوسی نے صرف یہ بات بتائی ہے کہ حسن کاروں اور بدکاروں میں بھرپور تباین کو ظاہر کرنے کے لیے انداز بیان میں فرق کیا ہے لیکن اساءوا کی جگہ کسبوا لاکر بتاتا یہ ہے کہ برائی انسان کی طبیعت نہیں نیکی اصل طبیعت ہے۔ بدکار جو کچھ کرتا ہے یہ اس کی طبیعت اور اللہ کی فطرت نہیں بلکہ یہ اس کی محنت اور کمائی ہے ورنہ اصل تو انسان میں نیکی ہے۔ برائی میں تکلف ہے نیکی بے تکلفی کا نام ہے راستی اور سچ اصل ہے اس کے لیے آپ کو محنت کی اور تکلف کی ضرورت نہیں جھوٹ بناوٹ ہے اس کے لیے آپ کو تکلف اور محنت کی ضرورت ہے اس لیے جھوٹ آپ کی کمائی ہے سچ کمائی نہیں وہ آپ کی فطرت ہے اس لیے اساؤا کی تعبیر چھوڑ کر کسبوا فرمایا اور نیکوکاروں کے بارے میں کسبوا کی تعبیر چھوڑ کر احسنوا فرمایا۔

دوسری بات برائی کا بدلہ اسی جیسا ہوگا یعنی بدی سے زیادہ نہ ہوگا کم سزا دیں یا برائیوں کو بالکل معاف کردیں ان کو اختیار ہے [۱]

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

برائی کا بدلہ برائی قرآن نے خالق و مخلوق دونوں کے لیے دُنیا و آخرت میں جیسے گناہ کی سزا گناہ جیسی ہے اس میں زیادتی اور اضافہ نہیں ایسے ہی دنیا میں ہی اسلام نے یہی قانون رکھا ہے کہ جرم اور سزا میں توازن رہنا چاہیے اللہ سبحانہ نے جیسے موجودہ عالم کو اپنے خاص نظام اور قانون کے تحت بنایا ہے جس کو فلاسفہ قانون قدرت اور اہل مذاہب تقدیر کہتے ہیں۔ اسی طرح اس نے ہر عالم کے لیے ایک نظام اور تقدیر قائم کی ہے جس کے مطابق اس عالم کا کاروبار چلتا ہے انسان غلطی سے یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ یہ اصول و قوانین صرف مادیات تک محدود ہیں۔ حالانکہ مادیات ہوں یا روحانیات ذہنیات ہوں یا عملیات ہر ایک میں یہ یکساں جاری و ساری ہیں۔

تیسری بات کہ ان کے چہرے ایسے کالے ہوں گے گویا ان کے چہروں کو تاریک رات کے ٹکڑوں سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔ یعنی ان کے چہرے اس قدر تاریک ہوں گے گویا اندھیری رات کی تہیں ان پر جما دی گئی ہیں۔

اس سے یہ بات صاف ہوگئی کہ سیاہی جرائم کی ہوگی اور چونکہ یہ ابدی مایوسی کی سیاہی ہوگی اس وجہ سے ایسا معلوم ہوگا کہ گویا ان کے چہروں پر شب تاریک کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر ڈال دیئے گئے ہیں۔ قرآن نے ہر جگہ ایمان کو روشنی سے اور کفر کو تاریکی سے تشبیہ دی ہے اللہ ولی الذین آمنوا یخرجھم من الظلمات الی النور۔ اور اہل ایمان کی پہچان یہ فرمائی ہے کہ ان کے لیے سرخروئی اور شادمانی ہوگی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربھا ناظرۃ، تعرف فی وجوھھم نضرۃ النعیم وجوہ یومئذ ناعمۃ اور کفر کے لیے سیاہی اور خواری ہے وجوہ یومئذ باسرۃ ـــ وجوہ یومئذ خاشعۃ عاملۃ ناصبۃ۔ آل عمران میں گذر چکا ہے یوم تسود وجوہ۔ ان آیات میں بھی بات بیان کی ہے خوشحالی و کامرانی سے چہروں کا چمک اٹھنا اور نامرادی و خواری سے سیاہ پڑ جانا ایک طبعی حالت ہے اس لیے فرمایا کہ اس روز حسن کاروں کے چہرے چمک اٹھیں گے اور بدکاروں کے چہرے سیاہ پڑ جائیں گے اور سیاہ چہروں کا حال یہ ہوگا، گویا پردہ شب نے ان کے چہرے ڈھانپ لیے ہیں۔

لہ افادات شیخ الاسلام

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ
أَنتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ ۖ وَقَالَ شُرَكَاؤُهُم مَّا كُنتُمْ
إِيَّانَا تَعْبُدُونَ ﴿٢٨﴾ فَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ إِن كُنَّا
عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغَافِلِينَ ﴿٢٩﴾ هُنَالِكَ تَبْلُو كُلُّ نَفْسٍ مَّا أَسْلَفَتْ ۚ
وَرُدُّوا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ ۖ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٣٠﴾

ع ۱۰

اور جس روز یک جا کرلیں گے ان سب کو پھر شرک سازیاں کرنے والوں سے کہیں گے کہ تم اور تمہارے شرکا ٹھہر جاؤ[۱] پھر ہم ان عابدوں اور ان کے معبودوں کے درمیان امتیاز قائم کر دیں گے تب وہ لوگ جن کو اللہ کی عبادت میں شریک کیا گیا تھا اپنے عابدوں سے کہیں گے تم ہماری عبادت ہی نہ کرتے تھے[۲] ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے کہ ہمیں تمہاری پرستاریوں کا کچھ بھی پتہ نہ تھا[۳] وہیں ہر آدمی جانچ لے گا کہ جو کچھ پہلے کر چکا ہے وہ کیا ہے اور سب کو بارگاہ الٰہی میں پیش کیا جائے گا جو واقعی ان کا مالک ہے

اور واقعہ کے خلاف جو کچھ وہ افترا پردازیاں کرتے رہے ہیں سب ان سے گم ہو جائیں گے ۳۲

مفردات کے معانی

نحشر حشر سے مضارع کا جمع متکلم ہے باب نصر اور ضرب سے آتا ہے اس کے معنی جماعت کے اکٹھا کرنے کے ہیں اور میدان جنگ میں لے جانے کے ہیں چونکہ قیامت آنے پر سب کو قبروں سے اٹھا کر اکٹھا کیا جائے گا اس لیے اس دن کو یوم الحشر اکٹھا کرلے جانے کی رعایت سے کہتے ہیں اس کے دوسرے نام بھی ہیں یوم معلوم، یوم عسیر یوم عظیم۔ یوم البعث، یوم التلاق، یوم الجمع، یوم الخروج اور بہت سے نام ہیں جن کی تفصیل کسی موقعہ پر انشاء اللہ آجائے گی۔

زیلنا تنزیل سے ماضی کا جمع متکلم ہے اس کے معنے متفرق اور پراگندہ کرنے کے ہیں اس کا مادہ زوال ہے اسی میں مبالغہ کے معنے پیدا کرنے کے بے مجرد میں ذلت بروزن بعت آتا ہے زیل، تزیل اسی سے آتے ہیں تبلو بلاء سے مضارع کا واحد مونث بلاء یبلو بلاء باب نصر سے آتا ہے آزمانا اسلفت اسلاف باب افعال سے ماضی کا واحد مونث غائب ہے اس کا مادہ ہے معنی وہ پہلے کر گذری وہ گذر گیا۔

مولی ولی ہے اس کے دو مصدر ہیں ولی اور ولایۃ ولی کے معنے قرب ہونا اسی سے نکاح اور جنازے میں ولی ہوتا ہے اور ولایت بمعنی ریاست آتا ہے اسی سے والی ہے اس کی جمع ولاۃ آتی ہے ولی بمعنی قریب ہوتا ہے ولاء آتا ہے ولار جگہ سے قرب ہونے کی وجہ سے لگاؤ کو بھی کہتے، نسبی قرب کو بھی کہتے دوستی اور بھائی چارے کے معنی میں آتا ہے ولایت بمعنی نصرہ آتا ہے اس سے ولی اور مولی دونوں استعمال ہوتے ہیں۔ اللہ سبحانہ کے لیے بھی ولی آتا ہے اللہ ولی الذین امنوا اور اہل ایمان کو بھی ولی اللہ بولا جاتا ہے۔ اسی معنے کی رعایت سے لفظ مولی وا معنے میں آتا ہے غلام آزاد کرنے والا۔ مالک

غلام ۔ساتھی ۔ مددگار ۔ رشتہ دار ۔ پڑوسی ۔ دوست ۔ بیٹا ۔ چچا ۔ مہمان ۔ ساجھی ۔ بھانجا ۔ قریبی رشتہ دار وارث ۔ احسان کنندہ، جس پر احسان کیا جائے، داماد ۔ یہ لفظ اب سب معانی کی رعایت سے بولا جاتا ہے اللہ سبحانہ کو اہل ایمان کا مولی مالک اور ناصر ہونے کی وجہ سے بولا جاتا ہے نکل جعلنا موالی میں مولی وارث کے معنے ہیں ہے فاخوانکم فی الدین و موالیکم میں لفظ ساتھی اور رفیق کے معنے میں ہے اور ان اللہ ھو مولاہ جبریل وصالح المومنین میں اللہ سبحانہ، جبریل نیکوکار اہل ایمان کو حضور کا رفیق بتایا گیا ہے اور مسلمان اسی معنی میں علماء کو مولانا کہہ کر پکارتے ہیں یہ تو لفظ مولی کی لغوی اور معنوی حد تک تحقیق ہے ورنہ لفظ مولانا کی پشت پر ایک تاریخی تجزیہ بھی ہے ۔اس کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے ۔

اعمال کے لوازم و نتائج

جس طرح دنیا میں ہر چیز کی ایک خاصیت ہے وہ جب یہاں لبادہ وجود پہنتی ہے تو اس کے ساتھ اس کے خواص و آثار بھی پیدا ہوتے ہیں ٹھیک اسی طرح انسان کی اندرونی کیفیات و اعمال کے بھی کچھ آثار و لوازم ہیں جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے، غرور و خاکساری بخل و فیاضی، انتقام و عفو، شجاعت و بزدلی تقوی و فسق ایمان و کفر توحید عبادت اور شرک ہر ایک کا الگ اثر و نتیجہ ہے اور ہر ایک کے کچھ نہ کچھ خصائص ہیں ۔جو اس سے اسی طرح جدا نہیں ہو سکتے جس طرح سنکھیا سے سمیت شکر سے میٹھاس اور آگ سے حرارت جدا نہیں ہو سکتی ۔اور ان معنوی روحانی اور نفسیاتی چیزوں میں علت و معلول کا وہی لزوم ہے جو جسمانی مادی طبعیاتی اشیاء میں ہے ۔افراد کی نیکی اور بدی، سعادت و شقاوت کے جو اصول ہیں وہی جماعتوں اور قوموں کی صلاح و فساد اور سعادت و شقاوت پر بھی حاوی ہیں ۔جس طرح ایک حکیم کا کام ان مادی فزیکل اصول کو جاننا اور بتانا ہے اور اس کی تعلیم کا نام ہماری زبان میں حکمت ہے اسی طرح ان روحانی اسباب و علل اور آثار و نتائج کو جاننا اور بتانا انبیاء کا کام ہے انبیاء کی تعلیم کے مطابق ہمیں اعمال کے روحانی آثار و نتائج کا وہی یقین ہونا چاہیے جو ایک حکیم کی تعلیم کے مطابق ہم کو جسمانی آثار و خواص کا ہوتا ہے ۔ الغرض یہ مادی و جسمانی دنیا علت و معلول عمل و رد عمل کے جس اصول پر مبنی ہے اس کی وسعت کے دائرے میں انسان کا ہر قول ہر عمل داخل ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ گناہ کے لازمی نتیجہ کا نام عقاب اور نیکی کے لازمی نتیجہ کا نام ثواب ہے ۔ اس

بات کو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو حشر و نشر اور جزاء و سزا کے اصول سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو۔
الیہ اور جس روز ہم ان کو یک جا کریں گے۔ پھر شرک سازیاں کرنے والوں سے کہیں
گے کہ تم اور تمہارے شرکاء ٹھہر جاؤ۔ یعنی تم نے اپنے خیال میں اللہ سبحانہ کی عبادت میں
شریک بنا رکھا تھا یا جن کو اللہ سبحانہ کی بیٹیاں اور بیٹے کہتے تھے مثلاً مسیح علیہ السلام جو نصاریٰ
کے نزدیک اللہ کے بیٹے تھے بلکہ عین اللہ تھے یا اللہ کے فرشتے مشائخ اور علماء کہ انہیں
بھی ایک حیثیت سے الوہیت کا مقام دے رکھا تھا یا اصنام و اوثان جن پر مشرکین مکہ
نے الوہیت کو تقسیم کر رکھا تھا سب کو حسب مراتب اپنی اپنی جگہ کھڑا ہونے کا حکم ہوگا۔
شرک ایک کلی ہے اس کی جزئیات ہر دور میں مختلف قالبوں میں رونما ہوتی رہتی
ہیں۔ دنیا کی مشہور قوموں میں یہودی، عیسائی اور مجوسی شرک کرتے تھے ہندو بھی اسی کے قریب
قریب تھے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے کہ لہ اشباح و قوالب شرک کی شکلیں
صورتیں اور مظاہر مختلف ہیں اور قانون نبوت کی ضرب ان مظاہر ہی پر ہوتی ہے شرک کا
ایک مظہر شخص پرستی ہے حضرت عیسیٰ، رام چندر کرشن کو اسی شخص پرستی نے معبود بنا دیا ہے
شرک کے عمومی قوالب کا تعلق اشخاص ہی سے ہے۔ اہل عرب بھی اسی بیماری کا شکار تھے۔
یہ لات، مناۃ، عزیٰ، سواع، یعوق۔ ود سب اشخاص تھے ان ہی اشخاص کے اصنام
اوثان تماثیل اور انصاب لکڑی کے سونے کے تانبے کے بنا رکھے تھے۔ یہ سب کے سب
اسماء رجال صالحین بزرگوں کے نام تھے۔ غرض کوئی نہیں خواہ تصویر بنا کر سامنے
رکھ لو یا قبر میں دفن کر کے قبر کے سامنے کھڑے ہو کر ان سے نیاز مندانہ اور عابدانہ تعلقات
پیدا کر لو عیسائی حضرت عیسیٰ کو پکارے یہودی حضرت عزیر کو پکارے ہندو رام چندر یا کرشن
کو پکارے سکھ گرونانک کو پکارے اور مسلمان حضرت علی اور شیخ جیلانی کو پکارے قالب
مختلف ہیں روح شرک سب میں ایک ہے سب کے بارے میں قرآن کا ناطق فیصلہ ہے
اموات غیر احیاء نے ناموں کی تبدیلی سے حقائق تبدیل نہیں ہوتے۔ جن جن سے دنیا
کی زندگی میں عابدانہ تعلقات قائم کئے جائیں گے یہ سب شرکاء ہیں ان کے اور ان سے
عابدانہ تعلق رکھنے والوں سے کہا جائے گا مکانکم انتم و شرکاءکم کہ تم سب

لہ افادات شیخ الاسلام

ٹھہر جاؤ۔ قرآن نے حضرت عیسیٰ جیسے عظیم المرتبت پیغمبر کا نام لے کر کہا ہے۔

اانت قلت للناس اتخذونی وامی الھین من دون اللہ۔

اے عیسیٰ کیا تو لوگوں سے کہہ کر آیا تھا کہ اللہ سبحانہ سے درے مجھ سے اور میری والدہ سے عابدانہ تعلقات قائم کر لینا۔

یہاں اصل تعبیر مکانکم انتم وشرکاءکم ہے اس کے معنے ہیں تم اور وہ سب جن کو تم دنیا میں شریک عبادت حق سبحانہ کرتے تھے ذرا ٹھہر جاؤ مکانکم سے فعل محذوف ہے الزموا قاضی بیضاوی فرماتے ہیں یعنی یہ ہیں کہ ٹھہر جاؤ تاکہ اپنے اعمال شرکیہ کے نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ لو شرکاء سے مراد یہاں ہر وہ شخصیت ہے جس سے اس دنیا میں اللہ کے سوا عابدانہ تعلقات قائم کیے گئے ہوں گے۔

شرکاء کا اعلان برارت

۲۸ پھر ہم ان عابدوں اور ان کے معبودوں کے درمیان امتیاز قائم کر دیں گے تب وہ لوگ جن کو اللہ کی عبادت میں شریک کیا تھا اپنے عابدوں سے کہیں گے تم ہماری عبادت ہی نہ کرتے تھے۔ یہ معبودوں کی جانب سے عابدوں کی عبادت کا انکار ہی نہیں بلکہ ان کے اس کردار پر اظہار بیزاری ہے زیلنا کے معنے لغت میں جدائی ڈالنے کے ہیں۔ یہاں جدائی کا مطلب یہ ہے کہ دونوں عابدوں اور ان کے معبودوں کو ممتاز کر کے ایک دوسرے کے آمنے سامنے کر دیں گے اور معبود اپنے عابدوں سے ان کی عبادت کا صاف اور کھلا انکار کر دیں گے یہ وہی اعلان برارت اور اظہار بیزاری ہے جو قرآن کے ایک سے زیادہ مقام پر مذکور ہے۔ ماکنتم ایانا تعبدون یہ اعلان برارت ہے۔ عابدوں کا تو شائد یہ خیال ہو کہ ساری زندگی جن کو شفیع سمجھ کر عبادت کی ہے آج وہ کام آئیں گے لیکن یہ دیکھ کر ان کو مایوسیوں کا شکار ہونا پڑے گا کہ وہ ان کی عبادتوں کا انکار کر رہے ہیں، ساری زندگی جن کی پرستش کی ہے اور جن کی نیازیں نذریں اور چڑھاوے چڑھاتے رہے جن کے انصاب کو مقدس سمجھتے ہوئے جن کی مورتیوں کو ثواب سمجھ کر غسل دیتے رہے جن اوثان کے سامنے ماتھا ٹیکتے رہے اور جن تماثیل کے سامنے دھرنے مار کر بیٹھے اور جن قبروں کا طواف کرتے رہے اور نت نئی چادریں چڑھاتے رہے وہ صاف اعلان

بیزاری کریں گے۔ قرآن میں دوسری جگہ اس انداز میں پیش کیا گیا ہے
اذ تبراء الذین اتبعوا من الذین اتبعوا ورا وا العذاب
وتقطعت بھم الاسباب
مطلب یہ ہے کہ مشاہدہ عذاب کا وقت وہ ہو گا جب کہ تمام ذی اثر اور صاحب اقتدار ہستیاں جن کی دنیا میں اوثان۔ اصنام اور تماثیل کی صورت میں عبادت کی جاتی تھی ان سب لوگوں سے بیزار ہو جائیں گے جو ان کی پیروی کرتے تھے اور ان کی پرستش کرتے تھے یہ سب عابد و معبود عذاب الہٰی کا مشاہدہ کریں گے اور ان کے عابدانہ رشتوں کا تمام سلسلہ ختم ہو جائے گا مطلب یہ ہے کہ تابع و متبوع، عابد و معبود راعی و رعیت زعیم اور شہری کے درمیان جو دنیا میں طاعت، عبادت، شفاعت کے من گھڑت روابط تھے وہ سب ختم ہو جائیں گے مطاع طاعت کا معبود عبادت کا انکار کر دیں گے آخرت میں جو حقائق کے مشاہدے کا وقت ہو گا سب ایک دوسرے سے بے تعلق ہو جائیں گے۔ شرکاءھم اضافت کے ساتھ فرمایا کیونکہ یہ لوگوں کے خود تراشے ہوئے عبادت میں شرکا تھے۔ ایسا کرنے کا ان حکم نہ ہوا تھا۔

بے حقیقت عبادت اور من گھڑت معبود

۲۹ ہمارے اور تمہارے درمیاں اللہ کی گواہی کافی ہے کہ ہمیں تمہاری پرستاریوں کا کوئی بھی پتہ نہ تھا یعنی اس وقت عجیب افراتفری اور نفسی نفسی کا عالم ہو گا۔ عابدین و معبودین میں جدائی ہو جائے گی اور دنیا میں اپنے اوہام و خیالات کے موافق جو رشتے جوڑ رکھے تھے سب توڑ دیئے جائیں گے۔ اس ہولناک وقت میں جب کہ مشرکین کو اپنے فرضی معبودوں سے بہت کچھ توقعات تھیں وہ صاف جواب دے دیں گے کہ تمہارا ہم سے کیا تعلق تم جھوٹ بکتے ہو کہ ہماری بندگی کرتے تھے تم اپنے عقیدے کے موافق جس چیز کو پوجتے تھے اس کے لیے وہ خدائی صفات تجویز کرتے تھے وہ فی الواقع اس میں موجود نہ تھیں تو حقیقت میں وہ عبادت واقعی مسیح یا ملائکہ کی نہیں اور وہ حقیقت میں بے جان مورتیوں کی پوجا تھی محض اپنے خیال اور وہم یا شیطان لعین کی پرستش کو فرشتے نبی یا نیک انسان یا کسی تصویر وغیرہ کے نامزد کرتے تھے اللہ گواہ ہے کہ ہمارے اذن سے تم نے یہ حرکت نہیں کی ہم کو کیا خبر تھی کہ انتہائی حماقت و سفاہت سے اللہ سبحانہ کے مقابلے میں ہمیں معبود بنا ڈالو

گئے لے مطلب یہ ہے کہ وہ تمام فرشتے جن کو دنیا میں دیوی اور دیوتا قرار دے کر پوجا گیا اور وہ تمام ارواح اسلاف اجداد انبیا اولیا شہدا جن کو دانائے غیب اور مختار کل بنا کر وہ حقوق انہیں دیئے گئے جن کا حقدار اللہ سبحانہ ہے جن کی نذریں نیازیں دی گئیں، جن کو دور دراز سے پکارا گیا جن کے ناموں پر بکرے قربان کئے گئے جن کے لیئے چوٹیاں رکھی گئیں جن پہ چڑھاوے پکائے گئے۔ جن سے دعائیں کی گئیں جن کے طواف کئے گئے وہ سب اپنے پرستاروں سے کہیں گے کہ ہمیں تو تمہارے کرتوتوں کی خبر تک نہیں تھی کہ تم ہماری عبادت کر رہے ہو۔ تمہاری کوئی دعا کوئی پکار کوئی التجا اور فریاد کوئی نذر و نیاز کوئی چڑھاوے کی چیز کوئی تعریف و مدح اور نام کا جپنا اور کوئی سجدہ ریزی و آستانہ بوسی و درگاہ گردی ہم تک نہیں پہنچی ہمیں اس کا کوئی پتہ نہیں۔

حقائق سب کے سامنے آجائیں گے

کلے وہیں ہر آدمی جانچ لے گا کہ جو کچھ پہلے کر چکا ہے وہ کیا ہے؟ اور سب کی بارگاہ الٰہی میں پیشی ہو گی جو واقعی ان کا حقیقی مالک ہے اور واقعہ کے خلاف جو کچھ وہ افترپردازیاں کرتے رہتے ہیں سب ان سے بیوفائی کر جائیں گی یعنی جھوٹے اور بے اصل توہمات سب رفوچکر ہو جائیں گے۔ ہر شخص برائی العین مشاہدہ کرے گا کہ اس سچے مالک کے سوا رجوع کرنے کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے ہر ایک انسان کو اپنے تمام بھلے برے اعمال کا اندازہ ہو جائے گا کہ کتنا وزن دیتے ہیں کلے

پہلی آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارا تھا کہ تم جن پیشواؤں کو اپنی حاجت روائی کیلئے پکارتے ہو ان تک نہ تو تمہاری پکار پہنچتی ہے اور نہ تمہاری پرستاریوں کی انہیں کچھ خبر ہے وہ تمہاری حاجت روائی کیا کریں گے۔ روز قیامت اللہ سبحانہ تابع و متبوع اور عابد و معبود کو ایک صف میں کھڑا کر دیں گے لیکن وہ مشرکوں کا ساتھی ہونا پسند نہ کریں گے اور صاف کہہ دیں گے ہمارا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ اگرچہ ہمارا نام لیتے ہیں لیکن فی الواقع ہمیں

لے افادات شیخ الاسلام

کلے افادات شیخ الاسلام

نہیں پوجتے بلکہ اپنی ہوائے نفس کے پجاری ہیں ہیں تو ان کی پوجا دپاٹ کا پتہ بھی نہیں ہے اب بتایا جارہا ہے کہ ان تابعوں اور عابدوں کے سامنے اپنے عابدانہ اعمال کی حقیقت کھلکر سامنے آجائیگی اور انکو پتہ لگ جائے گا کہ عبادت کے نام کو وہ جس قدر اعمال کرتے تھے اور جن کو انہوں نے اپنے عابدانہ اعمال کا حق دار بنا رکھا تھا یہ سب ان کے توہمات کی تخلیقات ہیں۔ ان کا واقعہ اور حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

قرآن کی یہ آیت بتا رہی ہے کہ مشرکین کی شرکی عبادتیں اور اعمال وافعال اور شرکین کے بنائے ہوئے شرکا ریہ سب مشرکین کی وہمی تخلیقات ہیں حقائق سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں ان کی پشت پر کوئی دلیل نہیں ہے شرک کرنے والوں کے سامنے اپنے علم وعمل کے تناقض کا یہ سوال ہمیشہ سے ہے کہ خود جانتے ہیں کہ پیدا کرنے کے عمل کا اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی یادگاروں تصویروں تھانوں اور فقیروں سے کوئی تعلق نہیں ہے اور سمجھتے ہیں کہ یہ سب ان کے ہی ہاتھوں کی بنائی ہوئی ہیں اور جن سے ان کی یادیں وابستہ ہیں وہ اللہ کے بنائے ہوئے ہیں مگر باوجود اس کے پھر بھی جو پیدا کر رہا ہے اس سے نہیں بلکہ ان ہی سے مانگ رہے ہیں نذریں مان رہے ہیں۔ پھول چڑھا رہے ہیں دہائیاں دے رہے ہیں چونکہ ایک غلطی دوسری غلطی کو جنم دیتی ہے کچھ اپنی قومی روایات کی پیچ رسم ورواج کا دباؤ ان کو مجبور کرتا ہے کہ علم وعمل کے اس تضاد میں مفاہمت پیدا کی جائے۔ تاویلوں اور توجیہات کا سہارا ڈھونڈھا جاتا ہے حد ہوگئی کہ مشرکین کو تمثیل کے مغالطہ میں بتلا کیا گیا اللہ سبحانہ کو انسانی بادشاہ فرض کرکے باور کرایا گیا کہ اگرچہ سارے حکم احکام بادشاہ کے چلتے ہیں لیکن بادشاہ سے کوئی چیز اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب ماتحتوں کو خوشامدوں سے راضی کرلیا جائے ان کے پاس کچھ تحائف کی ڈالیاں پیش کی جائیں۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ یہ سب من گھڑت افسانے ہیں یہ سب ان کی قوت واہمہ کی کارستانیاں ہیں۔ ان کا حقیقت سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ تو صرف منہ سے بولے ہوئے نام ہی نام ہیں اور نام بھی تمہارے اور تمہارے باپ دادوں کے رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی پشت پر کوئی دلیل نقلی اور عقلی نہیں ہے ما انزل اللہ بھا من سلطان ۔ یہ حقائق نہیں تمہارے افترارات ہیں جو تمہارے گمانوں اور خیالوں کے دیگران میں پک کر تیار ہوئے ان تتبعون الا الظن روز جزا میں یہ افترارات خس وخاشاک ہوجائیں گے بتانا یہ چاہتا ہوں کہ ان ہی توہمات کی وجہ سے قوموں اور امتوں غیر سلطانی

بلکہ افترائی قوانین کی جکڑ بندیوں میں پہننا پڑا ہے اور کتنے بن چوانی ہی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں آخر ان ہی انسانوں میں کتنے ہیں جنہیں قبر حلیہ پہننا چھڑی، تعزیہ علم شدہ امام قاسم کی اور شیخ عبد القادر کی گیارہویں اور شیخ نظام الدین کی سترہویں کے طوفان میں پڑے ہوئے ہیں، بے چارے شہید کے نام کا طاق نشان، توپ جس پر بکرا چڑھایا جاتا ہے اور سبتلا لی کا باوانی کا نیا کالی کلکتہ والی۔ کا یا کانکا کا چار ابروانی سلالدل میں پڑے ہیں یہ سب غیر سلطانی اور افترائی ضوابط توہمات ہی کی مخلوق ہیں۔ کوئی کسی کے نام کی سر پر چوٹی رکھتا ہے کوئی کسی کے نام پر ناک یا کان میں سوراخ کرتا ہے کوئی چار ابرو صاف ہے الی غیر ذالک من الخرافات والاوہام۔ انا للہ فالی اللہ المشتکی من ہذہ الرزیۃ التی رزی بہا المسلمون الیوم۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَ
الْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ
الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا
تَتَّقُوْنَ ﴿۳۱﴾ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ
اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿۳۲﴾ كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ
رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْۤا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾ قُلْ هَلْ
مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ قُلِ اللّٰهُ
يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۴﴾ قُلْ هَلْ
مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْۤ اِلَى الْحَقِّ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ
لِلْحَقِّ ؕ اَفَمَنْ يَّهْدِيْۤ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ
لَّا يَهِدِّيْۤ اِلَّاۤ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَ
مَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ
شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾

اے اللہ کے رسول ان سے دریافت کرو کہ کون ہے جو تمہیں

آسمان و زمین کی راہوں سے روزی دے رہا ہے؟ یا بتاؤ وہ
کون ہے جس کا تمہاری قوت شنوائی اور بینائی پر مالکانہ قبضہ ہے[۴۵]
وہ کون ہے جو زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو
زندہ سے؟ اور کون ہے جو تمام نظام حکومت چلا رہا ہے
سب ضرور جواب میں کہیں گے کہ یہ سب کچھ اللہ کر رہا ہے
آپ فرما دیجئے کہ اگر سب کچھ اللہ ہی کر رہا ہے تو پھر تم اس
سے ڈرتے کیوں نہیں ہو[۴۶] یاد رکھو یہی اللہ تمہارا فی الحقیقت
مالک و آقا ہے اب بتاؤ حقیقت ظاہر ہو جانے کے
بعد اسے نہ ماننا گمراہی نہیں تو اور کیا ہے؟ تم حقائق سے
منہ پھیر کر کدھر جا رہے ہو[۴۷] ایسے ہی تیرے رب کی
بات واقعہ بن کر سامنے آگئی کہ وہ لوگ ایمان لائیں گے
جو بدکردار ہو گئے ہیں یعنی ان کو بدکرداری ایمان سے روک
رہی ہے[۴۸] اے اللہ کے رسول ان سے پوچھو کہ تمہاری
من گھڑت اللہ کی عبادت میں شریک ہستیوں میں سے
کوئی ہے جو آفرینش کا آغاز کرے اور پھر اس کا اعادہ کرے

آپ اعلان کر دیجئے یہ تو صرف اللہ سبحانہ کی ذات گرامی ہے
جو آفرینش کا آغاز بھی کرتا ہے اور پھر اس کا اعادہ کرے گا
پھر کدھر غلط راہ پر چلے جا رہے ہو ۴۹ ان سے دریافت
کرو کہ تمہارے بنائے ہوئے شریکوں میں سے کوئی ایسا
ہے جو راہ حق کی رہنمائی کرتا ہے آپ بتا دیجئے کہ صرف
اللہ ہی حق کی رہنمائی کرتا ہے۔ لہذا بتاؤ جو ذات گرامی رہنمائے
حق ہے وہ اس کی حقدار ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جسے
خود ہی راہ کا بغیر دوسرے کی رہنمائی کے علم نہیں ہے تمہیں
کیا ہو گیا ہے افسوس تم کیسے فیصلے کر رہے ہو ۵۰ امر
واقعہ یہ ہے کہ لوگوں کی اکثریت صرف وہم گمان کی گود
میں پل رہی ہے اور معلوم ہے کہ وہم و گمان کا حقیقت
و واقعہ سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے وہ جو کچھ کر رہے
ہیں اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے ۵۱

مفردات کے معانی

یدبّر مضارع کا واحد مذکر تدبیر کرتا ہے باب تفعیل اصل دبر سے ہے دبر پچھاڑے کو اور پیٹھ کو کہتے ہیں جمع ادبار آتی ہے اسی سے پیچھا دکھانے کو ادبار کہتے ہیں باب افعال اسی سے تدابر ایک دوسرے سے پیٹھ پھیرنا اور منہ پھیرنا ہے حدیث میں ہے لا تباغضوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا ولا تقاطعوا وکونوا عباد اللہ اخوانا۔ باہم دشمنی نہ کرو۔ ایک دوسرے سے منہ نہ پھیرو، باہم تعلقات نہ کاٹو اے اللہ کے بندو بھائی بھائی ہو جاؤ۔

الظن خیال، تخمین، گمان، اٹکل امام راغب فرماتے ہیں الظن اسم لما یحصل عن امارۃ ومتی قویت ادت الی العلم ومتی ضعفت جدالم تجاوز حد الوھم۔ ظن اس خیال کو کہتے ہیں جو علامات دیکھ کر دماغ میں پیدا ہوتا ہے اب اگر قوی ہو گیا تو علم بن جاتا ہے اور اگر بہت کمزور رہا تو وہم کے مرتبہ میں رہ جاتا ہے اور یہ سب سے کمزور مرتبہ ہے۔ لغت کے لحاظ سے ظن یقین اور شک کے خلاف کسی حالت کا نام نہیں بلکہ انسان کے اپنے ہی ایک تخمینہ کا نام ہے۔ اس کے بعد واقعات کے لحاظ سے وہ یقین اور وہم دونوں حالتوں میں جمع ہو سکتا ہے۔ انسان میں یہ ایک ممتاز صفت ہے اور اس کی فطرت کی سلامتی اور کجی بہت بڑی دلیل ہے سلیم الفطرت انسان اکثر واقع کے مطابق ظن کیا کرتا ہے اور کج فطرت ہمیشہ اٹکل کے تیر لگاتا ہے قرآن میں ان دونوں قسموں کا ذکر ہے خاشعین کی صفت میں ہے الذین یظنون انھم ملاقوا ربھم۔ اور کفار کے حق میں ہے الا یظن اولئک انھم مبعوثون جن خاشعین کا ذکر ہے انہیں قیامت کا ظن نہیں بلکہ یقین حاصل تھا اور کفار کو قیامت کے متعلق ایک ذرہ برابر بھی یقین نہ تھا ان نظن الا ظنا وما نحن بمستیقنین چونکہ ظن یقین کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا تھا اس لیے کفار نے یہ تصریح کر دی کہ ہمارا یہ ظن وہ ظن نہیں جس کے بعد یقین پیدا ہو سکے بلکہ یہ اوہام میں سے ہے۔

اصل یہ ہے کہ آخرت ایک غیبی حقیقت ہے صرف نبوت کی رہنمائی میں اسے ماننا فرض ہے اور اللہ سے ملنا انسانی فطرت کی آواز ہے صرف ایک غیبی حقیقت نہیں

وہ از خود ہر انسان کے دل میں ہونی چاہیے امام بخاری نے کتاب الفرالفض میں عقبہ بن عامر کے قول کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے الظانین. یعنی الذین یتکلمون بالظن ظانین وہ لوگ ہیں جو صرف اپنے تخمینہ سے باتیں کرتے ہیں۔

مشرکین کے مسلمات سے توحید پر استدلال

مشرکین عرب شرک ضرور کرتے تھے، مگر اللہ سبحانہ کے وجود کے منکر نہ تھے اور مشرکین وجود باری میں شرک نہ کرتے تھے۔ مشرکین تو کیا کوئی بھی وجود باری میں شرک کا قائل نہیں ہے شاہ عبدالعزیز نے یہ بات پوری قوت سے لکھی ہے تفسیر عزیزی میں ہے۔

دریں جا باید دانست کہ ہیچ کس در عالم نیست کہ برائے خدا شریکے در وجود وجوب وجود و علم و قدرت و حکمت اعتقاد کند۔

اس کا مطلب تو واضح طور پر یہی ہے کہ اللہ کے وجود اللہ کے علم میں اللہ کی قدرت اور اللہ کی حکمت میں شرکت کا کوئی بھی معتقد نہ تھا اور امام رازی نے تفسیر کبیر میں یہ بات لکھی ہے۔

دنیا میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ایسا شریک ثابت کرتا ہو جو وجود قدرت علم اور حکمت میں اس کے برابر ہو۔

شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں توحید کے چار درجے بتائے ہیں ایک توحید وجود دوسرے توحید خالقیت اور لکھا ہے کہ

ان دونوں کو آسمانی کتابوں میں موضوع بحث نہیں بنایا ہے اور اس موضوع پر مشرکین عرب یہودیوں اور عیسائیوں کا ثبوت اور قرآن سے کوئی اختلاف نہیں بلکہ قرآن کی تصریح کہ یہ دونوں توحید ین ان کے یہاں مسلمات میں سے ہیں۔

توحید کا تیسرا درجہ توحید تدبیر ہے یعنی اس کائنات کے بتانے کے بعد اسے چلا کون رہا ہے۔

توحید کا چوتھا درجہ توحید عبادت ہے۔ اس میں نبوت کا مشرکین سے اختلاف ہے۔ مشرکین کچھ اشخاص کی تقرب کو بنیاد بنا کر عبادت کرتے ہیں اور نبوت عبادت کی ہر نوع کو اللہ کے

بے خاص کرتی ہے۔ مشرکین عرب کے یہی عقائد تھے کہ وہ اپنے معبودوں کو کائنات کا نظم و نسق کا اصل سرچشمہ نہیں سمجھتے تھے کہ جس طرح ایک بادشاہ اپنے مقربین کو کچھ اختیارات و وظائف سونپ دیتا ہے اسی طرح کے کچھ اختیارات خاص طور پر رزق و اولاد وغیرہ سے متعلق ان کے مزعومہ شرکا کو بھی حاصل ہیں۔

ان آیات میں ان کے مسلمات یعنی توحید وجود، توحید خالقیت توحید تدبیر سے توحید عبادت پر استدلال کیا ہے۔ توحید عبادت یہ ہے کہ نہ صرف اللہ سبحانہ کو مانا جائے بلکہ جو کچھ مانا جائے اس میں کسی دوسری ہستی کو شریک نہ کیا جائے، ہر طرح کی بندگی و نیاز کی مستحق صرف اسی کی ذات ہے، دعا، استعانت، رکوع، سجود، عجز و نیاز، اعتماد و توکل اور اسی طرح کے تمام عبادت گذارانہ اور نیازمندانہ اعمال جو اللہ سبحانہ اور اس کے بندوں کا رشتہ استوار کرتے ہیں صرف اللہ کے لیے ہیں اسی طرح عظمتوں کبریائیوں کارسازیوں اور بے نیازیوں کا جو تصور اللہ سبحانہ کا اعتقاد پیدا کرتا ہے وہ صرف اللہ سبحانہ کے لیے مخصوص ہونا چاہیے۔ بس یہی توحید عبادت ہے جس میں نبوت اور مشرکین کا اختلاف ہے۔

[۳۱] اے اللہ کے رسول ان سے دریافت کرو کہ کون ہے جو تمہیں آسمان و زمین کی راہوں سے روزی دیتا ہے یا بتاؤ وہ کون ہے جس کا تمہاری قوت شنوائی اور بینائی پر مالکانہ قبضہ ہے آسمان کی طرف سے بارش اور حرارت شمسی پہنچی ہے اور زمینی مواد اس کے ساتھ ملتے ہیں تب انسان کی روزی ملتی ہے اور ایسے محیر العقول اور عجیب و غریب طریقہ سے کس نے کان اور آنکھ پیدا کی پھر ان کی حفاظت کا سامان کیا۔ کون ہے جو ان تمام قوی انسانی کا حقیقی مالک ہے کہ جب چاہے عطا فرما دے اور جب چاہے چھین لے [۱] یہ بات پہلے بتائی جا چکی ہے کہ مشرکین عرب اس کائنات کا خالق مالک اور مدبر اصلاً اللہ سبحانہ کو مانتے تھے ان کا شرک یہ نہیں تھا کہ کائنات کا خالق اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی ہے یا اس کائنات کی حکومت کو اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی چلا رہا ہے۔ جن بتوں تماثیل اور اوثان سے ان کے عابدانہ تعلقات تھے ان کے بارے میں ان کا یہ عقیدہ نہیں تھا کہ یہ آسمان و زمین کے خالق ہیں یا ابر و ہوا اور سورج و چاند کے موجد ہیں یا زندگی اور موت پر متصرف ہیں یا نظام کائنات کا سررشتہ ان کے ہاتھ میں ہے بلکہ صرف یہ مانتے تھے کہ یہ جن کی تصویریں ہیں وہ اللہ سبحانہ کے چہیتے ہیں

[۱] افادات شیخ الاسلام

اللہ سبحانہ ان کی سنتا ہے جو کام اللہ سبحانہ سے کرانا چاہیں کرا سکتے ہیں ان کو اگر راضی رکھا جائے
تو اللہ سبحانہ ان کی سنتا ہے جو کام اللہ سبحانہ سے کرانا چاہیں کرا سکتے ہیں ان کو اگر راضی رکھا جائے
تو یہ اللہ سے سفارش کرا کے دنیا کی نعمتیں دلواتے ہیں۔ قرآن نے یہاں ان ہی اصولی مسلمات کو بنیاد قرار دے کر ان سے دریافت کیا ہے کہ اگر یہ سارے کام اللہ کے ہیں جیسا کہ تم خود مانتے ہو تو پھر تمہیں عبادت میں اللہ سبحانہ کا شریک ٹھہرانے کا پروانہ کہاں سے ملا ہے مطلب یہ ہے کہ عبادت میں تمہارا یہ کردار خود تمہارے مسلمات کے خلاف ہے۔

مشرکین کا فکری تضاد

اسکے اور وہ کون ہے جو زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے اور کون ہے جو تمام نظام حکومت چلا رہا ہے سب ضرور جواب میں کہیں گے کہ یہ سب کچھ اللہ سبحانہ کر رہا ہے تو پھر تم اس سے ڈرتے کیوں نہیں ہو مثلاً نطفہ اور بیضہ سے جاندار کو پھر جاندار سے نطفہ اور بیضہ کو نکالتا ہے یا روحانی اور معنوی طور پر جو قوم یا شخص مردہ ہو چکا اس میں زندہ افراد کو پیدا کرتا ہے اور زندہ قوموں کے اخلاف پر ان کی بدبختی سے موت طاری کر دیتا ہے اور دنیا کے تمام کاموں کی تدبیر و انتظام کرتا ہے [1]

یہ بھی مشرکین کے مسلمات ہیں وہ مانتے ہیں کہ احیاء اماتت اللہ سبحانہ کا کام ہے اور یہ بھی ان کے مسلمات میں سے ہے کہ کائنات کا انتظام و انصرام پر اللہ سبحانہ کا قبضہ ہے نجومی کہتے ہیں کہ تدبیر مملکت ستاروں کے ذریعے ہو رہی ہے اور نبوت کا دعویٰ ہے کہ ان کے ذریعے اللہ سبحانہ تدبیر کر رہا ہے یہی حیثیت ملائکہ کی بھی ہے کہ اللہ سبحانہ انکے ذریعے نظام مملکت چلا رہا ہے کہنا یہ ہے کہ آسمان و زمین کے نظام اور ان کے باہمی تعلقات سے رزق یا معاشی فوائد کو کون پیدا کر رہا ہے۔ یہ تو باہر کا سوال ہوا اس سے بھی آگے بڑھ کر خود یہ حیات اور زندگی جو ہماری تمام اندرونی قوتوں کا سرچشمہ ہے دونوں کو ملا کر من یدام کے سوال کا مطلب یہ ہے کہ اندرونی قوتوں سے یا باہر کی طاقتوں سے ہر چھوٹے بڑے کاروبار کو قرآن نے سوالنامے میں داخل کر کے یہ دریافت کیا ہے کہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یہ سب کس کے حکم اور کس کے ارادے سے ہو رہا ہے جواب میں جو بات بتائی ہے کہ فسیقولون
اللہ تو اس کا مطلب بالکل واضح ہے کہ یہ اقرار انسانی فطرت میں کس طرح گھر کئے ہوئے
ہے کہ کٹے سے کٹا مخالف بھی اس ایقان و ایمان پر مجبور ہوتا ہے صرف یہی نہیں بلکہ یہ
بھی حقیقت ہے کہ ہر فطرت میں اس اقرار کا علم اور یقین بھی پیوستہ سربستہ ہے آخر میں
ارشاد ہوا ہے افلا تتقون ؟ اگر صورت واقعہ یہی ہے تو پھر اس سے ڈرتے کیوں
نہیں ہو اس کی نافرمانیوں سے بچتے کیوں نہیں ہو اپنی استطاعت کے مطابق اسکے خلاف مرضی باتوں
سے کیوں نہیں بچتے ہو اس کی مرضی پر چلنے میں غلطی ہو جائے تو معافی کیوں نہیں مانگتے
پھر در بدر پھرنے کے بجائے اس کی مرضی کی طرف کیوں نہیں پلٹتے۔ ایمان عمل صالح تقویٰ
توبہ و استغفار دعا و الحاح کیوں نہیں اپناتے ہو مطلب یہ سب کچھ جانتے ہو پھر بھی اس
سے نہیں ڈرتے ہو یا یہ مطلب ہے کہ اس کو چھوڑ کر دوسروں کے دروازے پر جانے کے
عذاب سے نہیں ڈرتے ہو تمہیں اس ذات گرامی کے ساتھ اپنے معاملات پر شرم محسوس
نہیں ہوتی ہے البقاعی نے یہ بات بالکل برموقعہ لکھی ہے کہ ایک طرف ربوبیت میں
اس کی توحید کو مانتے ہو اور پھر الوہیت میں شرک سازی کرتے ہو اس جرم کے لیے تمہارے پاس
اپنے بچاؤ کا سامان کیا ہے؟

توحید عبادت پر استدلال

لے یاد رکھو یہی اللہ تمہارا فی الواقع مالک و آقا ہے اب بتاؤ حقیقت ظاہر ہو
جانے کے بعد اسے نہ ماننا گمراہی ہی نہیں تو اور کیا ہے تم حقائق سے منہ پھیر کر کدھر جا رہے ہو۔
مشرکین کو بھی اعتراف تھا کہ یہ امور کلیہ اور عظیم الشان کام اللہ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا
اس لیے فرمایا کہ جب اصلی خالق و مالک اور تمام عالم کا مدبر اسی کو مانتے ہو پھر ڈرتے
نہیں ہو کہ اس کے سوا دوسرے کو معبود بناؤ۔ معبود تو وہی ہو سکتا ہے جو خالق کل مالک
الملک رب مطلق اور متصرف علی الاطلاق ہو اس کا اقرار کر کے کہاں الٹے پاؤں واپس جا
رہے ہو جب سچا وہی ہے تو سچ کے بعد بجز جھوٹ کے کیا رہ گیا سچ کو چھوڑ کر جھوٹے
اوہام میں بھٹکنا عاقل کا کام نہیں ہو سکتا۔ لے

لے افادات شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ ان سوالات میں ہر سوال ایک مستقل دلیل ہے کیونکہ ان میں سے ہر سوال کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے اور وہ فطرت انسانی کا عالمگیر اور مسلمہ اذعان ہے ہمارے علم کلام کے طالب علموں کی نظر اس پہلو پر نہ تھی اس لیے قرآن کا انداز استدلال ان پر واضح نہیں ہو سکا۔ قرآن کا انداز بیان یہ نہیں ہے کہ نظری مقدمات اور ذہنی مسلمات کی تشکیلیں ترتیب دے اور پھر اس پر بحث و تقریر کر کے مخاطب کو رد و تسلیم پر مجبور کرے اس کا تمام تر خطاب انسان کے فطری وجدان و ذوق سے ہوتا ہے اللہ سبحانہ کی پرستش کا جذبہ انسانی فطرت کا خمیر ہے۔ اگر ایک انسان اس کا انکار کرتا ہے تو یہ اس کی غفلت ہے اور ضروری ہے کہ اسے غفلت سے چونکا دینے کے لیے دلائل پیش کیے جائیں لیکن یہ دلیل ایسی نہیں ہونی چاہیے جو محض اس کے ذہن و دماغ میں کاوش پیدا کرے بلکہ ایسی ہونی چاہیے جو اس کے نہاں خانہ دل پر دستک دے اور اس کا فطری وجدان بیدار کرے اگر وجدان بیدار ہو گیا تو پھر اثبات مدعا کے لیے بحث و تقریر کی ضرورت نہیں ہے خود اس کا وجدان ہی اسے مدعا تک پہنچا دے گا

ان آیات میں اس کے استدلال کی روح یہ ہے کہ جو تمہیں روزی دے رہا ہے اور تمہاری پروردگاری کر رہا ہے اور جس کی ربوبیت کا اعتراف تمہارے دل کے ایک ایک ریشہ میں موجود ہے اس کے سوا کون اس کا مستحق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اسی بات کو کیسے بلیغ اور انوکھے انداز میں پیش کیا ہے۔

یہ اللہ ہی تمہارا پروردگار برحق ہے اور جب یہ حق ہے تو حق کے ظہور کے بعد اسے نہ ماننا گمراہی نہیں تو اور کیا ہے افسوس تمہاری عقل پر تمہیں حقیقت سے کہاں پھیرا جا رہا ہے۔

آخر میں فرمایا فانی تصرفون یہ مجہول کا صیغہ ہے یہ بتا رہا ہے کہ جہاں تک عقل اور منطق کا تعلق ہے وہ تمہارا ساتھ نہیں دے رہی ہے اب تم خود سوچو کہ تمہاری قیادت کون کر رہا ہے۔ تصرفون کے معنی یہ نہیں کہ تم کدھر پھرے جاتے ہو بلکہ معنے یہ ہیں کہ تم کدھر پھرائے جا رہے ہو۔

علامہ آلوسی نے لکھا ہے کہ یہاں فاعل کو انتہائی شناخت اور برائی کی وجہ سے حذف کر دیا گیا فعل معروف نہیں مجہول لے کر آئے ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی گمراہ لیڈر یا پارٹی وہاں موجود ہے جو لوگوں کو صحیح رخ سے ہٹا کر غلط رخ پر پھیر رہا ہے۔ اسی لیے لوگوں سے کہا جا رہا ہے کہ تم اندھے بن کر غلط رہنماؤں کے پیچھے کیوں چل رہے ہو۔ اپنی عقل سے کام لے کر کیوں نہیں سوچتے ہو کہ جب حقیقت یہ ہے تو آخر تمہیں کدھر لے جایا جا رہا ہے یہ انداز سوال قرآن میں ایسے مواقع پر آیا ہے اور ہر جگہ لیڈروں اور رہنماؤں کا نام لیے بغیر ان کی طرف صیغہ مجہول سے اشارا کیا گیا تا کہ ان کے عقیدتمند اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور یہ نہ کہہ سکیں کہ دیکھو فلاں پر حملہ کیا گیا ہے۔ یہ دعوت کا خاص انداز ہے

ہدایت وضلالت کا قانون

۸۰ کلہ ایسے ہی تیرے رب کی بات واقعہ بن کر سامنے آگئی کہ وہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے جو بدکردار ہو گئے ہیں یعنی ان کی بدکرداری ان کو ایمان سے روک رہی ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ازل سے ان متمرد اور سرکشوں کی قسمت میں ایمان نہیں لکھا جس کا سبب علم الٰہی میں ان کی سرکشی اور نافرمانی ہے اس طرح اللہ کی لکھی ہوئی بات ان پر فسق و نافرمانی کی وجہ سے راست آئی [1]

آیت میں کلمۃ ربک سے مراد وہ قانون الٰہی ہے جو اللہ سبحانہ نے ہدایت وضلالت کے لیے مقرر کیا ہوا ہے یعنی اللہ سبحانہ ایمان وہدایت کی راہ صرف ان لوگوں کے لیے کھولتا ہے جو اللہ کی دی ہوئی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں جو لوگ اپنی خواہشوں کے پیچھے پڑ کر فاسقانہ رویہ اپناتے ہیں تو ان پر ہدایت نہیں بلکہ ضلالت ہی کی راہ کھول دی جاتی ہے اور وہ نعمت ایمان سے محروم رہتے ہیں وما یضل بہ الا الفاسقین یہی آغاز قرآن میں بھی قانون بتایا تھا۔ دنیا کی زندگی میں ہر گوشہ کی طرح ہدایت وضلالت کا بھی ایک قانون ہے ہر عہد ہر ملک میں ایک جیسے نتائج رکھتا ہے۔ اس کے احکام میں کبھی تبدیلی نہیں ہے۔ طالبین ضلالت کیلئے ضلالۃ کے دروازے اور ہدایت کے طلب گاروں کے لیے ہدایت کی راہیں کھولنا اللہ سبحانہ کا قانون ہے گمراہی، بے ایمانی صرف ان کے حصے میں آتی ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

جو خود گمراہی کو پسند کرتے ہیں۔ اللہ سبحانہ کسی پر گمراہی کو چپکاتا نہیں ہے بار بار کی نافرمانیوں اور عدول حکمیوں سے اندر کا نور بجھ جاتا ہے اور طبیعت میں حق کی طلب اور صداقت کی تلاش جاتی رہتی ہے۔

شیخ الاسلام کی اس تعبیر سے کہ

اللہ تعالیٰ نے ازل سے ان متمرد اور سرکشوں کی قسمت میں ایمان نہیں لکھا

یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ خود اللہ سبحانہ ہی ہے جو ان کافروں کو ہدایت سے روکے ہوئے ہے۔ حالانکہ آیت کا منشا یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کی عادت نہیں کہ وہ کسی کے ارادے اور کوشش کے بغیر از خود کسی کو ہدایت دے یہ بات ایک نہیں متعدد آیتوں میں بار بار بتائی گئی ہے۔ بلاشبہ اللہ سبحانہ کی جانب سے گمراہی اور ہدایت دونوں اللہ کی جانب سے ہیں مگر گمراہی کن کے لیے ہے صراحت کے ساتھ فرمایا ہے وما یضل بہ الا الفاسقین۔ فلما زاغوا ازاغ اللہ قلوبھم و اللہ لا یھدی القوم الفاسقین اور یطبع اللہ علیھا بکفرھم۔ انصرفوا صرف اللہ قلوبھم اور یطبع اللہ علی قلوب الکافرین ان آیات میں سے ہر ایک پر غور کرو ہر ایک سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہو رہی ہے کہ انسان کی بدعملی مقدم ہے اور اللہ تعالیٰ کا اس کے جوابی اثر کو اپنی طرف سے ضلالت اور گمراہی فرمانا موخر ہے جیسے یہاں الذین فسقوا مقدم ہے اور لا یومنون موخر ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ اللہ سبحانہ کی جانب سے ایمان نہ لانے کا حکم علت اور فسق و کفر معلول نہیں ہے بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے یعنی فسق و کفر انسان کی جانب سے پہلے ہوتا ہے اور اللہ سبحانہ کی جانب سے ایمان نہ لانے کی علت ہے اور یہی طبعی اصول ہے انسان جب گرتا ہے تو چوٹ لگتی ہے اور غمگین ہوتا ہے آنسو کے قطرے بہ پڑتے ہیں اگر کوئی اسے الٹ کر بیان کرے تو یہ کیسی سخت نادانی ہوگی۔ ہدایت و ضلالت کے اس الٰہی قانون کو تقدیر بھی کہہ سکتے ہیں۔ تقدیر کے معنے اندازہ ٹھہرا دینے کے ہیں یعنی کسی کے لیے ایک خاص طرح کی حالت ٹھہرا دینے خواہ یہ ٹھہراؤ کمیت میں ہو یا کیفیت میں و خلق کل شی فقدرہ تقدیرا مادیات کی طرح معنویات کی بھی تقدیر ہے جیسے دانہ گندم کے بولے کا ایک قانون ہے ایسے ہی ایمان و ہدایت کے پودہ اُگنے کا بھی ایک قانون ہے وہاں بھی زمین کی صلاحیت اور دانہ کی قابلیت

اور گرد وپیش کی سازگاری شرط ہے یہاں بھی صالح زمین کا ہونا ناگزیر ہے صرف فاعل کی قوت فاعلی کام نہیں کرتی ہے جب تک مفعول میں قوت انفعال نہ ہو۔ یہی راز ہے آیت میں دبلہ کی ضمیر خطاب کی تعبیر ہیں۔

مبدأ و معاد اللہ سے ہے

۳۴ۃ اے اللہ کے رسول ان سے پوچھو کہ تمہاری من گھڑت اللہ کی عبادت میں شریک ہستیوں میں سے کوئی ہے جو آفرینش کا آغاز کرے اور پھر اس کا اعادہ کرے آپ اعلان کر دیجئے کہ یہ تو صرف اللہ سبحانہ کی ذات گرامی ہے جو آفرینش کا آغاز کرتا ہے اور پھر اس کا اعادہ کرے گا پھر کدھر غلط راہ پر چلے جا رہے ہو لے یہاں یہ بات دھیان میں رکھنے کی ہے کہ پہلی آیات میں سوالات کے جواب میں یہ کہا گیا ہے۔ فسیقولون اللہ وہ ضرور کہیں گے کہ یہ کام اللہ سبحانہ کرتا ہے مگر اس جگہ اس جواب کو چھوڑ کر فرمایا کہ اس سوال کے جواب میں کہ مبدا اور معاد کس کے قبضہ و دسترس میں ہے فرمایا آپ فرما دیجئے کہ اللہ سبحانہ کے قبضہ و قدرت میں ہے کہ آغاز آفرینش کرے اور پھر اس کا اعادہ کرے کیونکہ تخلیق کی ابتداء کے متعلق تو مشرکین مانتے تھے کہ یہ صرف اللہ کا کام ہے ان کے شرکاء میں کسی کا اس کام میں کوئی حصہ نہیں ہے باقی تخلیق کا اعادہ تو یہ بات کھلی اور واضح ہے جو آفرینش کا آغاز کرنے والا ہے یہی اس کا اعادہ بھی کر سکتا ہے اور جو آغاز ہی میں پیدائش نہ کر سکے وہ اعادہ پر کیسے قدرت رکھ سکتا ہے۔ یہ بات بالکل بدیہی اور معقول ہے اور خود مشرکین بھی اندر سے مانتے تھے لیکن انہیں اس کے اقرار میں اس لیے پس وپیش تھا کہ اسے مان لینے کے بعد انکار آخرت مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اوپر کے سوالات کے جواب کا انداز بدل کر فرمایا کہ آپ اعلان کر دیجئے کہ ابتدائے خلق اور اعادہ خلق کا کام صرف اللہ کا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ آخر میں فرمایا فانی تؤفکون ؟ پھر تم کس الٹی راہ پر چلائے جا رہے ہو یعنی جب تمہاری ابتدا کا سرا بھی اللہ سبحانہ کے قبضہ میں ہے اور انتہا کا

لے افادات شیخ الاسلام

سرا بھی اسی کے ہاتھ میں ہے تو خود اپنے خیر خواہ بن کر غور کرو کہ آخر تمہیں یہ کیا باور کرایا جارہا ہے کہ ان دونوں سروں کے بیچ میں اللہ کے سوا کسی اور کو تمہاری پرستشوں اور نیاز مندیوں کا بھی حق ہے۔

قرآن میں آخرت میں دوبارہ زندگی کو اعادہ خلق سے تعبیر کیا ہے یعنی دوسری زندگی میں زندگی کی ابتدا نہیں ہوگی بلکہ زندگی کا اعادہ سوال یہ ہے کہ اگر آغاز میں زندگی عدم حقیقی سے وجود میں آسکتی ہے تو کیا ایک مرتبہ وجود میں آکر پھر دہرائی نہیں جاسکتی۔ اگر کمہار مٹی سے برتن بنا سکتا ہے تو یقیناً ٹوٹے ہوئے برتن کے ٹکڑوں کو دوبارہ جوڑ کر بنا سکتا ہے۔

آیت میں بدء خلق اور اعادہ خلق سے بھی توحید عبادت پر استدلال کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ زندگی کا پہلا اٹھان اور زندگی کا دوسرا اٹھان دونوں کس کے قبضے میں ہیں تم بھی مانتے ہو اور ہر عقل مند پہلے اٹھان کو دیکھ کر دوسرے کو سمجھ سکتا ہے۔ اس میں صرف اللہ سبحانہ کی کارسازی کام کر رہی ہے اگر اس میں کسی کی شرکت نہیں ہے تو تمہاری عبادتوں میں شرکت کا جواز کیوں ہے۔

۳۵ ان سے دریافت کرو کہ تمہارے بنائے ہوئے شریکوں میں سے کوئی ایسا ہے جو راہ حق کی رہنمائی کرتا ہو آپ بتا دیجئے کہ اللہ ہی حق کی رہنمائی کرتا ہے لہذا بتاؤ جو ذات گرامی رہنمائے حق ہے وہ اس کی حقدار ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جسے خود بھی راستہ کا دوسرے کی رہنمائی کے بغیر پتہ نہیں ہے تمہیں کیا ہو گیا ہے افسوس تم کیسے فیصلے کر رہے ہو مبدا و معاد کے بعد درمیانی وسائط کا ذکر کرتے ہیں۔ یعنی جس طرح اول پیدا کرنے والا اور دوبارہ چلانے والا وہ ہی خدا ہے ایسے ہی معاد کی صحیح راہ بتانے والا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اللہ سبحانہ ہی بندوں کی سچی اور صحیح رہنمائی کر سکتا ہے مخلوق میں کوئی بڑا ہو یا چھوٹا سب اسی کی رہنمائی کے محتاج ہیں سب کو اسی کی ہدایت و رہنمائی میں چلنا چاہیے۔ بت مسکین تو کس شمار میں ہیں جو کسی کی رہنمائی سے بھی چلنے کی قدرت نہیں رکھتے ہیں۔ بڑے بڑے مقربین انبیاء و ملائکہ بھی برابر یہ اقرار کرتے آئے ہیں کہ اللہ سبحانہ کی ہدایت و دستگیری کے بغیر ہم ایک قدم نہیں اٹھا سکتے ان کی رہنمائی اس لیے بندوں کے حق میں قابل قبول ہے کہ اللہ سبحانہ ان کی رہنمائی فرماتا ہے پھر یہ کس قدر

ناانصافی ہے کہ انسان اس ہادی مطلق کو چھوڑ کر باطل اور کمزور سہارے یا مثلاً احبار ور ہبان برہمنوں اور مہنتوں کی رہنمائی پر اندھا دھند چلنے لگے ؎

اس آیت کی تشریح شارحین قرآن نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق کی ہے آیئے آپ بھی اس گلزار سے اپنی جھولی میں کچھ گل ڈال لیجئے۔

شارحین قرآن میں سے ارباب تفسیر اور ارباب تاویل دونوں نے اس پر داد تحقیق دی ہے۔ حافظ ابن جریر فرماتے ہیں۔

اے اللہ کے رسول آپ ان مشرکین سے پوچھئے کہ جن شرکاء کے بارے میں تمہارا دعویٰ ہے کہ وہ عبادت میں اللہ کے شریک ہیں خواہ وہ تمہارے معبود ہیں یا معبودوں کے ستھان کیا ان میں کوئی کسی گم کردہ راہ کو راہ بتا سکتا ہے اور یہ ہدایت کے درماندے کو کسی درستگی کی طرف دعوت دے سکتا ہے اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر ان کو بتا دیجئے کہ اللہ کی ذات راہ حق سے بھٹکے ہوئے کو ہدایت کا سامان کرتی ہے اب فیصلہ کرو کہ کہنے پر اس کے چلنا چاہیے جو گمراہ کو ہدایت کرے یا اس کے کہے پر چلے جسے خود ہی راستہ کا پتہ نہیں ہے جب تک دوسرا اسے نہ بتائے۔

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں :

لوگو! تمہیں پتہ ہے کہ جن کو شرکاء کہتے ہیں ان میں سے کسی کے بس میں بے راہ کو راہ پر لگا دینا اور راہ بتا دینا نہیں ہے بے راہ کو راہ بتانا اور گمراہ کو گمراہی سے نکال کر صراط مستقیم بتانا صرف اللہ سبحانہ کا کام ہے اب فیصلہ کرو کہ ایک طرف وہ ہے جو راہ حق بتا رہا ہے اور دوسری طرف وہ ہے جو اندھے ہونے کی وجہ سے خود بھی راستہ نہیں جانتا ہے دونوں میں سے کس کے پیچھے چلو گے۔ کیا تمہاری عقلیں بالکل جواب دے چکی ہیں کہ تم خالق و مخلوق کے درمیان برابری کے فیصلے کر رہے ہو۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں :

؎ افادات شیخ الاسلام

کیا تمہارے شرکا میں سے کوئی ہے جو دین اسلام کے لیے رہنمائی کرے اس کا جواب وہ ضرور نفی میں دیں گے اب فرما دیجئے کہ اللہ سبحانہ دین اسلام کا رہنما ہے اب بتاؤ کہ راہ بتانے والے کی پیروی کی جائے یا اس کی جو خود ہی گم کردہ راہ ہے۔

امام رازی فرماتے ہیں:

یہ تیسرا استدلال ہے تخلیق و ہدایت سے وجود باری پر استدلال قرآن میں عام ہے حضرت ابراہیم نے الذی خلقنی فھو یھدین حضرت موسیٰ نے ربنا الذی اعطی کل شی خلقہ ثم ھدی اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم الذی خلق فسوی والذی قدر فھدی میں اسی استدلال کو اپنایا گیا ہے۔ یہ ایک شاندار استدلال ہے کیونکہ انسان دو چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے جسمانیت اور روحانیت پہلے انسان کی جسمانیت سے استدلال تھا اب ہدایت سے توحید پر استدلال ہے۔ انسان کی جسمانیت کا مقصد روحانی ہدایت ہے یہ اس بات کی تصریح ہے کہ اللہ نے جسم کی تخلیق فرمائی اور اسے سمع و بصر اور عقل نوازا ہے تاکہ ان کے ذریعے معارف و علوم حاصل کیے جائیں۔ روحانی کمالات جسمانی تقاضوں کے مقابلے میں دائمی ہیں اس سے معلوم ہوا کہ تخلیق ہدایت کے تابع ہے۔ مقصد اعلیٰ ہدایت ہے اب یہ بات صاف ہے کہ انسانی عقلیں اگر ایک طرف حق شناسی کے لیے اپنے اندر تڑپ رکھتی ہیں تو دوسری طرف حق ایک دشوار راہ ہے فکر انسانی غلطیوں کا شکار رہتا ہے ضرورت ہے کہ حق آشنائی ہو۔ اور یہ اللہ سبحانہ کی مدد کے بغیر ہو نہیں سکتی ہے۔

ابوحیان اندلسی بھی البحر المحیط میں امام رازی کے ہمنوا ہیں۔ قاضی بیضاوی علامہ زمخشری کے ہمزباں ہو کر فرماتے ہیں۔

کیا تمہارے شرکا میں سے کوئی ہے جو لوگوں کی دلائل کے ذریعے اور انبیاء روانہ کر کے اور فکر و غور کی توفیق دے کر راہ حق بتاتا ہو آپ فرما دیجئے کہ ہدایت تو بس اللہ ہی دیتا ہے۔ اب بتاؤ دونوں میں سے کون اس لائق

ہے کہ اس کی بات مانی جائے جو خود آشنائے راہ ہے اور دوسروں کو راہ بتاتا ہے یا وہ جسے خود بھی راہ کا پتہ نہیں اور دوسروں کا محتاج ہے۔

علامہ آلوسی بغدادی فرماتے ہیں :

مطلب یہ ہے کہ انسانوں کو عقل کی نعمت دے کر، انبیاء روانہ کر کے کتابیں نازل کر کے فکر و غور کی آفاق میں توفیق دے کر کون رہنمائی کر رہا ہے۔ اللہ سبحانہ یا تمہارے شرکاء۔ آپ بتا دیجئے کہ یہ کام صرف اللہ کر رہا ہے۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے بتاؤ کہ کس کی بات مانی جائے اس کی جو راہ پر بھی ہے اور راہ آشنا بھی یا اس کی جو راہبر تو کیا راہ آشنا ہی نہیں ہے اور دوسروں کا محتاج ہے۔

آیئے اب ذرا اردو شارحین قرآن کی تشریحات سے استفادہ فرمایئے حضرت شیخ الاسلام کی تشریح تو آپ ان کے افادات میں پڑھ چکے ہیں حضرت مولانا اشرف علیؒ فرماتے ہیں۔

ان سے کہہ دیجئے کہ کیا تمہارے تجویز کئے ہوئے ذوی العقول شرکاء میں کوئی ایسا ہے کہ امر حق کا راستہ بتلاتا ہو آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی امر حق کا راستہ بتاتا ہے چنانچہ اس نے عقل دی انبیاء روانہ کئے برخلاف شیاطین کے کہ اولاً وہ اس پر قادر نہیں اور محض تعلیم جس کی قدرت ان کو دی گئی ہے وہ اس کو اضلال و اغوا میں صرف کرتے ہیں تو پھر ان سے کہیئے کہ بتلاؤ کہ آیا جو شخص امر حق کا راستہ بتلاتا ہے وہ زیادہ اتباع کے لائق ہے یا وہ شخص جس کو بے بتلائے خود ہی راستہ نہ سوجھے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ سمجھانے پر بھی اس پر نہ چلے جیسے شیاطین تو پھر جب یہ اتباع کے بھی قابل نہ ہوں تو عبادت کے لائق کیونکر ہو سکتے ہیں۔

مفتی محمد شفیع نے بھی معارف میں مولانا موصوف ہی کی ترجمانی کی ہے اور مولانا محمد ادریس نے اپنے معارف میں قرطبی کی بات نقل کی ہے۔ مولانا پیر کرم شاہ نے قاضی صاحب کی تفسیر سے ہمنوائی کی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی تشریحی نوٹ میں کچھ جدت پیدا کی ہے فرماتے ہیں :

مشرکوں سے سوال ہے کہ جو خالق راستہ دکھا اور بتلا رہا ہے وہ پیروی

کیئے جانے کا اہل ہے یا وہ مخلوق جسے خود ہی راستہ معلوم نہیں ہے اور اپنی راہ یابی میں دوسروں کا محتاج ہے۔

تدبر قرآن کے مصنف نے اس کی تشریح اس طرح کی ہے۔

سوچو کہ اس دنیا میں تمہیں ان شرکار سے کیا فیض پہنچتا ہے مخلوق کی ایک بہت بڑی ضرورت خالق سے یہ وابستہ ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے معاملات میں رہنمائی فرماتا ہے کہ کیا حق ہے اور کیا باطل ؟ کیا تم کہہ سکتے ہو کہ تمہارے ان معبودوں سے تمہیں اس طرح کی کوئی رہنمائی ملی ہے کیا عقل جو تمہارے اندر رہنمائی کا چراغ ہے یہ ان کی بخشی ہوئی ہے کیا یہ تمہاری ہدایت کے لیے کوئی وحی بھیجتے ہیں کیا انہوں نے تمہاری تربیت و تزکیہ کے لیے کوئی کتاب اتاری ہے کوئی رسول بھیجا ہے کوئی شریعت نازل کی کوئی قانون اتارا اگر ان کاموں میں سے کوئی کام بھی انہوں نے نہیں کیا نہ کرتے ہیں نہ کریں گے تو آخر کس غرض سے ان کے پیچھے لگے ہو۔

صاحب تفہیم فرماتے ہیں :

دنیا میں ضروریات کا دائرہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ کھانے پینے اور پہننے وغیرہ کا سامان دستیاب ہو بلکہ انسان کی سب سے بڑی ضرورت یہ بھی ہے کہ دنیا میں بسر کرنے کا صحیح طریقہ معلوم ہو اور وہ جانے کہ اپنی ذات کے ساتھ اپنی قوتوں اور قابلیتوں کے ساتھ اجتماعی زندگی کی گاڑی میں وہ کیا اور کس طرح معاملہ کرے۔ اسی صحیح طریق کا نام حق ہے اور جو رہنمائی اس طریقہ کی طرف انسان کو لے جائے وہی ہدایت حق ہے قرآن تمام مشرکین سے یہ سوال کرتا ہے کہ تم خدا کے سوا جن سے عابدانہ تعلقات رکھتے ہو ان میں کوئی ہے جو تمہارے لیے ہدایت حق حاصل کرنے کا ذریعہ بنتا ہو یا بن سکتا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس لیے قرآن یہ سوال کرتا ہے کہ ان شرکا میں کوئی ایسا بھی ہے جو راہ راست کی طرف تمہاری رہنمائی کرتا ہو اس سوال نے یہ فیصلہ کر دیا کہ وہ صرف اللہ ہے اس کے بعد ضد اور ہٹ دھرمی کے سوا کچھ نہیں ہے جس کی وجہ

ہے انسان مشرکانہ طور طریقوں سے وابستہ رہے (ملخصا)

اور مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں:

تم نے جن ہستیوں کو اللہ کا شریک ٹھہرالیا ہے ان میں کوئی ہے جو زندگی و معیشت کے ٹھیک راستہ پر انسان کو چلاتا ہو یعنی جو دیکھنے سننے اور سمجھنے کی قوتیں بخشتا ہو۔ تم جانتے ہو کہ یہ کوئی نہیں کر سکتا یہ صرف اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کیونکہ مشرکا، کو اللہ کی ہستی اور اس کے خالق کل ہونے سے انکار نہیں تھا البتہ وہ سمجھتے تھے کہ ہمیں ان ہستیوں کی پرستش بھی کرنی چاہیے جو اللہ کے حضور مقرب ہیں اور جنہیں دنیا میں حکم و تصرف کی قوتیں حاصل ہو گئی ہیں۔

پھر جب یہ بات واضح ہو گئی تو فرمایا کہ جب تمہیں اس بات سے انکار نہیں ہے تو غور کرو انسان کو اس کی پیروی کرنی چاہیے جو ہدایت کرنے والا ہے یا اس کی جو خود کسی دوسرے کی ہدایت کا محتاج ہے تمہیں کیا ہو گیا ہے تم کیسے فیصلے کر رہے ہو۔

مولانا آزاد کی یہ تشریح قرآن کے سیاق و سباق کے بالکل مطابق ہے کیونکہ آیت قرآنی کا انداز کہہ رہا ہے کہ یہاں پہلے ایک بات بطور مسلمہ عقیدہ کے بیان کی گئی جس سے مخاطب انکار نہیں کرتا یا کر نہیں سکتا جب اس کا مسلم ہونا واضح ہو گیا تو اسی کو استدلال کی اساس بنا کر کہا گیا هل من شرکائکم من یهدی الی الحق ؟ تمہارے بنائے ہوئے مشرکوں میں کوئی ہے جو حق کی رہنمائی کرتا ہو پھر فرمایا گیا قل اللہ یهدی للحق یعنی تم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ وہ اللہ کی ہستی ہے پھر جب یہ مسلمہ واضح ہو گیا تو اس سے استدلال کیا گیا افمن یهدی الی الحق احق ان یتبع لہذا ضروری ہے کہ یہاں ہدایت سے مقصود کوئی ایسی ہدایت ہو جس سے مخاطبوں کو انکار کی مجال نہ تھی اب اگر ہدایت کا مطلب ہدایت وحی قرار دیا جاتا ہے تو سارا مطلب بگڑ جاتا ہے کیونکہ سب جانتے ہیں کہ مخاطبوں کے لیے یہ بات مسلمہ نہ تھی وہ سرے سے وحی کا انکار کرتے تھے۔

اگرچہ امام رازی، ابوحیان اندلسی، آلوسی نے بھی اسی کے قریب تشریح کی ہے مگر وہ بات کو پوری آخر تک اس طرح پیش نہیں کر سکے جیسے بات کا آغاز کیا تھا۔

وہم گمان کی بنیاد پر حقائق کا انکار

اللہ امر واقعہ یہ ہے کہ لوگوں کی اکثریت صرف وہم وگمان کی گود میں پل رہی ہے اور معلوم ہے کہ وہم وگمان کا حقیقت اور واقعہ سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے وہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ اس سے باخبر ہے۔ جب معلوم ہو چکا کہ مبدی، معید اور ہادی وہی اللہ ہے تو اس کے خلاف شرک کی راہ اختیار کرنے والوں کو سوچنا چاہیے کہ ان کے ہاتھ میں کون سی دلیل وبرہان ہے جس کی بنا پر توحید کے مسلک قدیم کو چھوڑ کر ضلالت کے گڑھے میں گرے جا رہے ہیں سچ تو یہ ہے کہ ان کے پاس سوائے ظنوں وا وہام اور اٹکل پچو باتوں کے کوئی چیز نہیں بھلا اٹکل کے تیر حق وصداقت کی بحث میں کیا کام دے سکتے ہیں [1] یعنی تمہارے ماننے اور تمہارے جھٹلانے کا مدار ظن وگمان پر ہے تم جو باتیں مان رہے ہو ان کے لیے بھی تمہارے پاس کوئی علم نہیں ہے اور جس بات کے جھٹلانے میں اس قدر جلدی کی ہے اس کے لیے تمہارے پاس یقین نہیں ہے حالانکہ سچائی کی راہ یہ ہے کہ جو کچھ کرو علم وبصیرت کے ساتھ کرو محض اٹکل پر نہ چلو۔ اگر ایک شخص علم ویقین اور اذعان وبصیرت کے ساتھ ایک بات پیش کر رہا ہے اور جتنی باتیں کسی بات کے درست ہونے اور معقولیت کی ہو سکتی ہیں سب اس کے ساتھ ہیں اور تمہارے پاس اس کے خلاف ظن وگمان کے سوا کچھ نہیں تو تمہارے لیے کب جائز ہو سکتا ہے کہ جھٹلانے پر آمادہ ہو جاؤ۔ تم ظن کی بنا پر یقین کی دعوت جھٹلانے ہو حالانکہ ظن کا بھروسہ انسان کو یقین سے بے نیاز نہیں کر سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ علم ثابت وصحیح اور حق واضح ومعروف کے بجائے محض اپنے گمان کے پیچھے چل رہے ہو۔ اور ظاہر ہے کہ محض اٹکل کے تیر حقیقت سے بے نیاز نہیں کر سکتے۔ حقیقت جب سامنے آئے گی تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ انہوں نے اپنی عمارت بالکل ریت پر بنائی تھی آخر میں ان کو دھمکی دی ہے ان اللہ علیم بما یفعلون اللہ سبحانہ ان کے کرتوت سے باخبر ہے اور وقت آ رہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ سب کچھ ان کے سامنے رکھ دے گا یہ تو مشرکین

[1] افادات شیخ الاسلام

عرب کا حال ہے اب بھی دنیا میں جن کو اللہ کی عبادت میں شریک بنایا جا رہا ہے
اور ان کے لیے عبادات کے جو جو انداز اور جو جو صورتیں رائج ہیں ان سب کی عمارت بھی وہم و
گمان کی بنیاد پر قائم ہے جن کے متعلق کہتے ہیں کہ فلاں آستانے کی نیاز تیر بہدف ہے اور
فلاں درگاہ پر چڑھاوا چڑھانے کی دیر ہے کہ مراد بر آتی ہے، فلاں حضرت کے مزار پر
جھاڑو دینے سے مسئلے چاہے کیسے ہوں مٹ جاتے ہیں۔ ان سب کی یعنی طالب اور مطلوب
دونوں کو گھروندہ وہم و گمان پر بنایا گیا ہے۔

وَمَا كَانَ هَٰذَا
الْقُرْآنُ أَنْ يُفْتَرَىٰ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ تَصْدِيقَ الَّذِي
بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِنْ رَبِّ
الْعَالَمِينَ ﴿٣٧﴾ أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِثْلِهِ
وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ
صَادِقِينَ ﴿٣٨﴾ بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا
يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ فَانْظُرْ
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ ﴿٣٩﴾ وَمِنْهُمْ مَنْ يُؤْمِنُ بِهِ
وَمِنْهُمْ مَنْ لَا يُؤْمِنُ بِهِ ۚ وَرَبُّكَ أَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِينَ ﴿٤٠﴾

اور دیکھو یہ قرآن کہ اللہ کے سوا کسی اور کا بناوٹی کلام نہیں ہے وہ تو ان سب کتابوں کی تصدیق ہے جو اس کے آگے ہیں اور ان تمام چیزوں کو کھول کر بیان کرتا ہے جو اللہ کی جانب سے تم پر لکھی گئی ہیں۔ اس کے رب العالمین کا کلام ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے ۵۲ کیا کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ اس

قرآن کو پیش کرنے والے نے خود بنا لیا ہے یعنی یہ کلام افترائی
ہے اے پیغمبر ان کہنے والوں سے کہہ دو کہ اگر ایسا ہی ہے تو تم
بھی اس جیسی ایک سورت لے کر آؤ۔ اگر تمہارے اس دعوے
میں کچھ صداقت ہے تو اللہ کے سوا جس کو اس کام میں مدد
کے لیے بلا سکتے بلا لو ۵۳ نہیں یہ کلام افترائی نہیں بلکہ امر واقعہ
یہ ہے کہ یہ لوگ قرآن کو ان باتوں کی وجہ سے جھٹلا رہے ہیں جو ان
کی علمی دسترس میں نہیں آسکتی ہیں۔ اور ابھی ان کی حقیقت سامنے
نہیں آئی ہے ۵۴ ایسے ہی ان لوگوں نے بھی تکذیب کی تھی
جو ان سے پہلے تھے۔ دیکھو ظلم کار لوگوں کا انجام کیا ہوا۔ اے
اللہ کے رسول کچھ آپ کے مخاطبوں میں سے وہ ہیں جو قرآن
کو اللہ کا کلام مانتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو قرآن کو اللہ کا کلام
نہیں مانتے۔ اور تیرا پروردگار شورش پسندوں کو خوب جانتا
ہے ۵۵

مفردات کے معانی

تادیل یہ باب تفعیل کا مصدر ہے اس کی لغوی حیثیت اور صرفی حقیقت پر حافظ ابن تیمیہ نے اکلیل میں مبسوط بحث کی ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ اس کا مادہ اول ہے اول سے باد اُل تفعیل سے اس کے معنے لوٹنے کے ہیں اسی سے اسم تفضیل اول آتا ہے جس کا مونث اُولیٰ ہے ہمزہ کے زبر کے ساتھ اولی اسم تفضیل کا واحد مذکر ہے اور اس کا مادہ ولی ہے چونکہ سارے اعداد کا مرکز ایک ہے اس لیے اس کو اول کہتے ہیں کسی بات کے نتیجہ اور مطلب کو تادیل کہتے ہیں اور چونکہ الفاظ کے معانی بھی ان کی دلالت کا مال ہوتے ہیں اس لیے مطالب و معانی کو بھی تادیل کہتے ہیں اور تادیل ایک سے زیادہ اصطلاحی معانی میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ علم اصول میں تفسیر کے مقابلے میں تادیل علم کلام میں تفویض کے مقابلے تادیل کی اصطلاح بولی جاتی ہے۔ قرآن میں لفظ تادیل لغوی معنے میں آیا ہے تشریح قرآنی کے لیے اصول تفسیر میں تادیل و تفسیر بولا جاتا ہے۔ کچھ شارحین قرآن ارباب تفسیر ہیں جیسے ابن کثیر، ابن جریر قرطبی اور کچھ ارباب تادیل ہیں جیسے رازی بیضاوی وغیرہ۔ قرآن میں یہ لفظ نہ اصطلاح اصولین کے معنے میں آیا ہے نہ اصطلاح متکلمین ہیں اور نہ اصطلاح مفسرین ہیں قرآن یہ لفظ لغوی معنے میں استعمال ہوا ہے۔

قرآن کا اعجاز نبوت ہونا

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ سبحانہ کی جانب سے جو معجزات عطا ہوئے ان میں سب سے بڑا معجزہ خود قرآن عظیم ہے۔ خود ہی حضور اقدس نے دوسرے نبیوں کے معجزات کے مقابلے میں قرآن ہی کو سب سے بڑا معجزہ قرار دیا ہے ارشاد ہے۔

انبیاء میں سے ہر نبی کو اللہ سبحانہ نے معجزات اس قدر عطا فرمائے جن کو دیکھ کر لوگ ایمان لائے لیکن جو معجزہ مجھے عطا ہوا ہے وہ قرآن ہے جس کی اللہ سبحانہ نے مجھ پر وحی فرمائی ہے مجھے امید ہے کہ روز قیامت میرے پیروؤں کی تعداد زیادہ ہوگی۔

لیکن دونوں میں ایک جوہری فرق ہے چونکہ آپ سے پہلے انبیاء کی نبوت وقتی تھی اس لیے

معجزات بھی وقتی اور عارضی تھے۔ ہوئے اور ہو کر مٹ گئے اور حضور اقدس کی نبوت دائمی اور تاقیام قیامت تھی اس لیے آپ کو قرآن عظیم کا ربانی معجزہ اعظم دیا گیا جو قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہے گا۔ چونکہ دوسرے انبیاء کے معجزات وقتی تھے اس لیے ان سے جو اثر پیدا ہوا وہ بھی وقتی تھا۔ برخلاف اعجاز قرآنی کے کہ یہ چونکہ ہمیشہ رہنے والا ہے اس لیے اس کا اثر بھی دائمی اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے اور قیامت تک لوگوں کو متاثر کرتا رہے گا۔ حضور اقدس کے سارے معجزات میں صرف قرآن ہی ایک ایسا معجزہ ہے جس کی اللہ سبحانہ نے تحدی کی ہے اور اعلان عام کیا ہے کہ کوئی اس کی مثال پیش کرے اور پھر خود ہی اس کی پیشین گوئی بھی کر دی کہ دنیا ہمیشہ اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز رہے گی۔

اس پر تو اتفاق ہے اور اس میں کبھی مسلمانوں کی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں لیکن اس میں اختلاف ہے کہ قرآن کس حیثیت سے معجزہ ہے؟ معتزلہ کے خیال میں قرآن کا نظم کلام معجزہ ہے معتزلہ ہی کی طرح جاحظ اور تمام اشاعرہ قرآن کو فصاحت و بلاغت کی حیثیت سے معجزہ بتاتے ہیں۔ نظام معتزلی اور ظاہریہ میں حافظ ابن حزم ظاہری کہتے ہیں کہ اعجاز یہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے اپنی قدرت کاملہ سے تمام بلغائے عرب کی زبانیں گنگ کر دی ہیں کہ وہ اس کا جواب ہی نہیں دے سکتے امام رازی بھی اسے بالکل درست تو نہیں مگر اس کے قریب قریب بتاتے ہیں۔ کچھ متکلمین کے خیال میں اظہار غیب اعجاز ہے اور کچھ کہتے ہیں شان اعجاز یہ ہے کہ دل کے پوشیدہ اسرار کو ظاہر کرتا ہے کسی نے وجہ اعجاز یہ بتائی ہے کہ انسانی کلام بلند و پست کامل و ناقص ہوتا ہے قرآن میں کمال ہی کمال ہے۔ اور کچھ کی رائے ہیں ایک امی کی زبان سے ایسا کلام بلاغت ہونا اعجاز ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ قرآن اعجاز اس کے احکام تعلیمات میں ہے، ایک رائے کے مطابق قرآن کی بے مثال تاثیر اعجاز ہے۔

سچ یہ ہے کہ ان تمام باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ قرآن عزیز کے وجوہ اعجاز اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں ہو سکتا ہے جیسے بصیرت متکلم کا ادراک نہیں کر سکتی ایسے ہی اس کے کلام کے وجود اعجاز کا احاطہ نہیں کر سکتی جس شخص کو جو بات اپنے مذاق کے مطابق نمایاں نظر آتی ہے اسی کو اس نے وجہ اعجاز قرار دے دیا ہے۔ کیونکہ قرآن نے خود کہیں تو اپنی تعلیم و ارشاد کی مدح کی ہے کہیں اپنی تاثیر اور قوت جذب کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کہیں اسی یکسانی اور عدم اختلاف کو خدا کی طرف سے ہونے کی نشانی بتایا

ہے۔ کہیں اس نے اپنی عربیت اور حسن کلام کو ظاہر کیا ہے کہیں ایک امی کا پیغام ہونا اپنا معجزہ بتایا ہے ایک موقع پر اپنی ہدایت و رہنمائی کو مخصوص ترین وصف قرار دیا ہے کہیں وہ خود کو نور۔ ھدیٰ۔ حکمۃ، بینہ اور دیگر مختلف اوصاف معنوی کا پیکر کہتا ہے۔

۳۷ اور دیکھو یہ قرآن کہ اللہ سبحانہ کے سوا کسی اور کا تراشیدہ کلام نہیں ہے وہ تو ان سب کتابوں کی تصدیق کرتا ہے جو اس کے آگے ہیں اور ان تمام باتوں کو کھول کر بیان کرتا ہے جو اللہ کی جانب سے لکھی گئی ہیں اس کے رب العالمین کا کلام ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے پچھلی آیات میں فرمایا تھا کہ مشرکین محض ظن وتخمین کی پیروی کرتے ہیں حالانکہ پیروی کے قابل صرف اس کی بات ہے جو صحیح راستہ بتلائے اسی مناسبت سے یہاں قرآن کریم کا ذکر شروع کیا کہ آج دنیا میں وہی ایک کتاب صحیح راستہ بتلانے والی اور ظنوں واوہام کے مقابلہ میں سچے حقائق پیش کرنے والی ہے اس کے علوم ومعارف احکام وقوانین اور معجزانہ فصاحت وجزالت پر نظر کر کے کہنا پڑتا ہے کہ یہ کتاب وہ نہیں جو خداوند قدوس کے سوا کوئی دوسرا شخص بنا کر پیش کر سکے۔ پورا قرآن تو بجائے خود رہا اس کی ایک سورت کا مثل لانے سے تمام جن وانس عاجز ہیں۔ اس کا کلام الٰہی ہونا اس سے ظاہر ہے کہ وہ تمام کتب سماویہ کی سچائی پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے ان کے اصل مضامین کی حفاظت کرتا اور ان کی پیشین گوئیوں کی صداقت کا علانیہ اظہار کرتا ہے اور ان حقائق ومعارف کو جو پچھلی کتابوں میں نہایت اجمالی طور پر مذکور تھیں تفصیل سے بیان کرتا ہے سچ تو یہ ہے کہ اس کتاب میں عاقل کے لیے شک وشبہ کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے ایسا جامع بلیغ پر حکمت اور نور صداقت سے بھرا ہوا کلام رب العالمین ہی کا ہو سکتا ہے ۱

اس آیت میں چار باتیں سمجھنے کی ہیں۔

اوّل یہ قرآن اپنی شان وشوکت کے اعتبار سے کبھی انسانی بناوٹ نہیں ہو سکتا۔

ان یفتری من دون اللہ

۱ افادات شیخ الاسلام

دوسرے یہ کہ یہ قرآن تمام اللہ کی جانب سے آئے ہوئے پیغاموں کا مصدق ہے تصدیق الذی بین یدیہ۔
تیسرے یہ کہ قرآن میں انسانی زندگی کے لیے احکام کی جامعیت ہے تفصیل الکتاب
چوتھے یہ قرآن بلاریب رب العالمین کی جانب سے ہے لا ریب فیہ من رب العالمین

قرآن انسانی بناوٹ نہیں ہے

اس کتاب کے پیش کرنے والے اللہ سبحانہ کی جانب سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ان کا دعوی ہے کہ یہ اللہ سبحانہ کی کتاب ہے آپ کے مخالف کہتے تھے کہ یہ اللہ کا کلام نہیں بلکہ خود ان کا تراشیدہ ہے اور یہ اللہ کے نام جھوٹ اور غلط لگا رہے ہیں اسی لیے مخالفین کا آپ سے یہ مطالبہ تھا ائت بقران غیر ھذا او بدلہ یہ اس قرآن کے علاوہ اور قرآن کی طلب اور قرآن کو تبدیل کرنے کا مطالبہ انکی ذہنی کیفیت کی پوری عکاسی کر رہا ہے۔حافظ ابن حجر کے حوالہ سے علامہ آلوسی نے نقل کیا ہے کہ یہ ایت ان لوگوں کے مطالبہ کے جواب میں ہے کہ یہ قران انسانی بناوٹ نہیں ہے اور سوچنے کی بات ہے کہ اس قرآن کے بنانے میں آپ کو دخل کیسے ممکن ہے ایک امی محض جو امیوں ہی گود میں پلا ہو اور پل کر جوان ہوا ہو۔ اس نے ہوش سنبھالا تو گرد و پیش میں تاریکیوں اور ظلمتوں کے سوا اسے کچھ نظر نہ آیا علوم و فنون اور تہذیب و تمدن سے ایک عاری ملک عاری شہر اور عاری خاندان کے اندر نشو و نما پائی جہاں اہل فکر اور ارباب علم کا وجود نہ تھا وہ خود اس کا خاندان اور اس کا وطن نوشت و خواند کے نقوش و حروف سے آشنا نہ تھا گذشتہ صحف انبیاء اور افکار عالیہ کا ایک حرف اس کے کان میں کبھی نہیں پہنچا۔علما اور دانشوروں کی صحبت اس نے کبھی نہیں اٹھائی۔اصول قانون مبادی اخلاق محاسن علم و عمل کی کوئی ظاہری تعلیم اس کو نہیں ملی بلکہ مدرسہ علم و حکمت کے سایہ دیوار تک کبھی اس کا گذر نہیں ہوا اور اسی طرح وہ اپنی زندگی کے چالیس دور پورے کرتا ہے کہ دفعۃً غار حرا کے ایک دہانے سے اجالا ہوتا ہے علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا سرچشمہ ابلتا ہے ظاہری نوشت و خواند کا سرچشمہ ابلتا ہے۔ظاہری نوشت و خواند کے نقوش و حروف کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔صحف انبیاء اور افکار عالیہ کے اوراق اس کی زبان پر جاری ہوتے ہیں اس کے

پر تو صحبت سے امی اور جاہل علمائے دہر اور دانشوران روزگار بن کر نکلتے ہیں اس سے زیادہ قرآن عزیز کے معجزہ نہ ہونے کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔ علامہ آلوسی کی یہ بات بالکل برمحل اور برموقعہ ہے۔

> یہ بات نہ درست ہے اور نہ ہی ٹھیک ہے کہ یہ قرآن جو ہدایات و رہنمائیوں کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے اللہ کے سوا کسی اور کا گھڑا ہوا ہو۔

اور علامہ بقاعی نظم الدرر میں فرماتے ہیں۔

> اس قرآن کے لیے انسانی بناوٹ ہونا ممکن ہی نہیں ہے جب کہ اس میں حکیمانہ انداز میں ہر خبر موجود ہے۔

قرآن تمام گذشتہ کتابوں کا مصدق ہے

قرآن کے مصدق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ از آدم تا محمد رسول اللہ جس قدر ربانی پیغام مختلف وقتوں مختلف نبیوں کے ذریعے آتے رہے وہ سب سچے ہیں پیغام اللہ کے پیغام ہیں اور پیغام لانے والے بھی اللہ کے پیغامبر ہیں قرآن اس بات کو بھی جیسے قرآن کے کلام الٰہی ہونے کے لیے بطور دلیل پیش کرتا ہے ایسے ہی وہ اس بات کو محمد رسول اللہ کی صداقت کی بھی دلیل بنا کر پیش کرتا ہے یعنی ان کی ہر تعلیم دوسری تعلیم کی تصدیق کرتی ہے اور جب ہر تعلیم دوسری تعلیم کی تصدیق کرتی ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ تمام تعلیمات کا سرچشمہ ایک ہی ذات گرامی ہے۔ کیونکہ اگر مختلف وقتوں مختلف گوشوں مختلف قوموں مختلف ناموں مختلف پیرایوں اور مختلف زبانوں میں کوئی بات کہی گئی ہے اور باوجود ان تمام اختلافات کے بات ہمیشہ سے ایک ہو اور ایک ہی مقصد پر زور دیتی ہو تو قدرتی پر ماننا پڑے گا کہ کہنے والا ایک ہے قرآن نے اپنا وصف تصدیق الذی بین یدیہ بنا کر دعویٰ کیا ہے کہ اس پر یقین کیا جائے کہ وحی کے آغاز سے آج تک ایک ہی پیغام تھا جو آ نا رہا ایک ہی دین تھا جو سکھایا جاتا رہا ہے اور ایک ہی حقیقت تھی جو دہرائی جاتی رہی ہے لیکن وہ بار بار انسانوں کے نسیان و تغافل اور تصرف و تحریف سے بدلتی رہی گم ہوتی رہی اور آخری بار دنیا کے

کمال بلوغ کے زمانہ میں قرآن پوری حفاظت کے وعدے کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے مفصل اور کامل ہو کر نازل ہوا ہے۔ اور اس تصدیق کا لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ قرآن کو قبول کرنا سب اللہ کے پیغاموں کو قبول کرنا ہے کیونکہ قرآن سب کا مصدق ہے اور سب کا محافظ ہے۔

قرآن میں شان جامعیت

اس بات کی تعبیر ابت قرآن میں تفصیل الکتاب کی ہے مطلب یہ ہے کہ قرآن ایک جامع کتاب ہے اس میں شان جامعیت پائی جاتی ہے جامعیت تین طرح کی ہوتی ہے جامعیت ہدایت، جامعیت احکام اور جامعیت ثمرات احکام۔

جامعیت ہدایت یعنی انسانی زندگی کے سارے لوازم، عوارض اور حوائج کے لیے قرآن ہدایت نامہ ہے۔ زندگی کی کوئی شاخ نہیں جو قرآن کی رہنمائی و ہدایت سے ہمدوش نہ ہو۔

جامعیت احکام یہ کہ تمام احکام خود اپنی ذات سے اتنے جامع ہیں کہ نہ ان میں ترمیم کی گنجائش ہے نہ تنسیخ کی جس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے ہر حکم میں سارے پہلوؤں کی رعایت موجود ہے۔

جامعیت ثمرات یہ کہ قرآنی احکام بلحاظ نوعیت اور بلحاظ آثار و نتائج اس قدر جامع ہیں کہ ان سے صرف روحانی و اخروی فوائد ہی حاصل نہیں ہوتے بلکہ جسمانی و مادی اور تمدنی ثمرات بھی حاصل ہوتے ہیں۔

قرآن میں ہدایت کی جامعیت

قرآن میں اولین جامعیت ہدایت کی ہے۔ غور کرو کہ زندگی کا گوشہ قرآنی ہدایت سے بیگانہ نہیں ہے۔ خلوت، جلوت، عادت، عبادت تمدن و تہذیب اور معاشرت دیانت و سیاست، صلح و جنگ، حب اور بغض احوال انسانی میں غربت و امارت، مرض و صحت عسرت و استغنا غم و مسرت خوف اور رغبت سب کے بارے میں ہدایات موجود ہیں بتانا یہ چاہتا ہوں کہ انسانی زندگی کے ہر کھلے اور چھپے گوشہ کے متعلق مفصل ہدایات کا ایک قانونی خاکہ قرآن کی خصوصیت ہے۔

انسانی زندگی میں اگر ہم تین پہلو دیکھتے ہیں اللہ سے تعلق۔ اللہ کے بندوں سے تعلق۔ خود اپنی ذات سے تعلق۔ قرآن ان تینوں کے متعلق جامع ہدایات دی ہیں۔
اللہ سے تعلق کے موضوع پر سب سے اہم اور بنیادی چیز یہ ہے کہ ہمارا مبدا کیا ہے اور بالآخر کہاں جاتا ہے یعنی ہماری ہدایت ونہایت اور ابتدا وانتہاء کا مرجع کون ہے قرآن بتاتا ہے کہ ابتدا وانتہاء کا مرکز اللہ سبحانہ کی ایک ذات ہے الٰہی وحدت سے یہ ساری کثرتیں نمایاں ہوئی ہیں۔ اسی تصور سے عبادت جنم لیتی ہے اور یہ انسانی زندگی کا کوئی لمحہ عبادت سے خالی نہ ہونا چاہیے اسی لیے مختلف مذاہب نے رہبانیت کو اپنایا لیکن قرآن نے انسانی قویٰ اور مصالح کے پیش نظر ترک رہبانیت کا اعلان کیا اور تمام تعلقات اور لذات کے ہجوم میں انسان کو چوبیس گھنٹے مصروف عبادت رہنے کا طریقہ سکھایا۔ عبادات کی کنجی تو فرائض کو قرار دیا۔ روز پانچ وقت نمازیں۔ سال بھر میں ایک ماہ روزے۔ عمر میں ایک بار حج سال میں بشرط غنا ایک بار زکوٰۃ۔ ارکان اسلام ہیں۔ ان کا جو بھی بنظر غائر مطالعہ کرے گا وہ محسوس کرے گا کہ یہ اعمال صرف چند نیکیاں اور عبادتیں نہیں ہیں بلکہ نیکی اور عبادت کے سرچشمے بھی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک انسان کے اندر بندگی کا احساس اور اسے مکمل کرنے میں بڑا اہم حصہ لیتا ہے اور ایسا حصہ لیتا ہے جو اسی کے لیے مخصوص ہے کوئی دوسرا عمل اس کی قائمقامی نہیں کرسکتا پھر یہ سب مل کر مومن کو ایسا ذہن عطا کردیتے ہیں جو اللہ سبحانہ کے بارے میں پوری طرح مطمئن ہوجاتا ہے۔ ایک ایسا دل عطا کرتے ہیں جو رضائے الٰہی کی طلب سے سرشار رہتا ہے اس طرح وہ جذبہ محبت کے تحت اللہ سبحانہ کی طاعت گذاری کے لیے ایسا تیار ہوجاتا ہے کہ اس کی جناب سے جو حکم بھی ملے اس کی تعمیل کے لیے دوڑ پڑے اس کے دل کی زمین محبت کی سرشاری سے اس طرح ہو جاتی ہے کہ اللہ سبحانہ کی ہدایات جو بھی اس کے سامنے آتی ہیں ان کو فوراً والہانہ انداز میں قبول کرلیتا ہے۔ اسی وجہ سے ان عبادات کو اسلامی زندگی کی قرآن نے اساس قرار دیا ہے یعنی پوری دین کے لیے مدار حیات قرار دیا گیا ہے۔ یہ تو ہوا اللہ سے تعلق آیئے اب اللہ کے بندوں سے تعلقات میں قرآنی ہدایات کی جامعیت پر غور کیجیے۔
سب جانتے ہیں کہ قرآن نے دین کا جو تصور پیش کیا ہے وہ صرف انفرادی زندگی تک محدود نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ رہبانیت ہوئی قرآن کا مزاج رہبانیت کو برداشت

نہیں کرتا۔ قرآن کی مسند ارشاد عبادت گاہ اور زندگی کے انفرادی دائرے ہی میں بچھی ہوئی نہیں ہے بلکہ وہ بازاروں کاروباری اداروں معاشی میدانوں، تمدن کے دائروں۔ سیاست اور حکومت کے ایوانوں غرض زندگی کے ایک ایک شعبے میں ہدایات دیتا ہے کچھ باتوں سے روکتا اور کچھ باتوں کا حکم کرتا ہے مثلاً قرآن حکم دیتا ہے کہ زانی کو سو کوڑے لگاؤ۔ اس کا یہ حکم صریح طور پر ایسا حکم ہے جس کا تعلق پولیس اور عدالت سے ہے، اس لیئے یہ ہدایت اجتماعی زندگی کا معاملہ ہے۔

قرآن نے پورے اجتماعی نظام کے لیے ہدایات دی ہیں وہ صرف روحانی اور اخلاقی نظام ہی کے موضوع پر ہدایات نہیں دیتا بلکہ اس کی ہدایات کا دائرہ زندگی کے سارے شعبوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اس کی ہدایات عائلی نظام، معاشرتی نظام کے ساتھ ساتھ معاشی نظام سیاسی نظام اور قانونی نظام تک پھیلی ہوئی ہیں۔

خود اپنی ذات سے تعلق کی حد تک قرآن تہذیب نفس و اخلاق اور ریاضت مجاہدات کی تعلیم دیتا ہے۔ فضائل اخلاق کا حکم دیتا ہے اور رذائل سے دور رہنے کی تلقین کرتا ہے تفریحات و مزاح کی اجازت دیتا ہے مگر تمسخر اور استہزا سے روکتا ہے۔ سکوت و تکلم کے آداب بتاتا ہے۔ سفر سے طبیعت میں نشاط پیدا ہوتا ہے، اس کی ترغیب دیتا ہے قرآن میں اس موضوع پر بھرپور ہدایات ہیں۔

قرآن میں احکام کی جامعیت

اس موضوع پر زیادہ کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے قرآنی احکام میں اسقدر جامعیت اور ہمہ گیری ہے کہ کوئی قانون اس کی ہمہ گیری کا ہم پلہ نہیں ہے۔

یہ قرآن کی جامعیت ہی ہے کہ قرآن کے سوا کسی اور آسمانی کتاب نے تکمیل دین کا اعلان نہیں کیا جامع ہے تو کامل بھی ہے۔ قرآن کا اعلان ہے کہ وہ مکمل ہے اور اس کے ذریعہ سے انسانی زندگی کی ساری ضرورتوں کے اصول و فروع پایۂ تکمیل کو پہنچ گئے۔ اسی تکمیل کا یہ اثر تھا کہ اس نے بعض سخت فقہی احکام کو جو ان کی سخت گیری کے لیئے ان پر عائد تھے اور اصل دین ابراہیم میں داخل نہ تھے یا انسانوں کے اضافے اور تصرفات تھے بدل کر ایسے مناسب اور آسان احکام دیئے جو ہر زمانے کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں۔ اسی لیے قرآن نے

کسی آنے والے پیغمبر کی خبر نہیں دی اور نہ کسی نئے کلام کے نزول کی پیشین گوئی کی کہ جامعیت اور کمال کے بعد کسی نئے آنے والے کسی نئے کلام اور کسی نئی شریعت کی ضرورت ہی کیا ہے۔

اس پر بھی غور فرمایئے کہ قرآن کی جامعیت اور کمال ہی کی وجہ سے جیسے قرآن نے علم کے اعتبار سے اپنے بارے میں لوگوں کو چیلنج دیا جیسا آگے آرہا ہے ایسے ہی قرآن نے عمل کے اعتبار سے اپنے پیغمبر کی زندگی کو تحدی اور اعلان کیساتھ اسکے ہمعصروں کے سامنے پیش کیا ہے لبثت فیکم عمرا من قبلہ۔ قرآن کی اثر انگیزی کے واقعات سے اگر تاریخ بھری ہوئی ہے تو خود ان کے پیش کرنے والے کے بارے میں قرآن نے بتایا ہے کہ اس کی قرآن پر مبنی تعلیم کی یہ تاثیر ہے کہ وہ دوسروں کو بھی اپنے فیض صحبت سے بہرہ مند کر سکتا ہے یعنی قرآن بھی کامل ہے اور قرآن کا پیش کرنے والا اللہ کا رسول بھی کامل ہے وہ خود پاک ہے دوسروں کو پاک صاف بنا دیتا ہے۔

الغرض قرآن میں ہر پہلو سے جامعیت ہے تورات قانون و شریعت ہے لیکن اخلاق و موعظت نہیں انجیل اخلاق و موعظت ہے لیکن قانون و شریعت نہیں ہے۔ زبور مخاطبات قلبی اور دعاؤں کا مجموعہ ہے لیکن دیگر صفات سے خالی۔ مسیح کے صحیفے میں خطابت کی ہنگامہ آرائیاں ہیں مگر استدلال اور فکر و نظر کی دعوت نہیں صحف بنی اسرائیل میں پیشین گوئیاں ہیں مگر وقائق حکمت اور اسرار ایمان و عمل سے خالی ہیں دنیا میں قرآن ایک ہی جامع کتاب ہے جو قانون و شریعت بھی ہے اور اخلاق موعظت بھی مخاطبات قلبی اور دعاؤں کا گنجینہ بھی ہے اور دیگر کتب الٰہی کی مجموعی صفتوں کی حامل بھی۔ خطابت بھی ہے اور استدلال و فکر بھی۔ اظہار غیب اور پیشین گوئیوں سے لبریز بھی ہے اور وقائق حکمت و اسرار ایمان و عمل سے معمور بھی اور ان سب کے ساتھ عین اس وقت جب اور کتب الٰہی تحریف و تغیر و تعبیر اپنی اصلی زبان اور تراجم و تعبیریں کھو چکی تھیں قرآن نازل ہوا۔

بہرحال قرآن عزیز میں جامعیت اور کاملیت کی دونوں شانیں بھرپور انداز میں موجود ہیں اور یہی تفصیل الکتاب ہے۔

قرآن بلاریب کلام الٰہی ہے

چوتھی بات لاریب فیہ من رب العالمین فرمائی ہے یعنی قرآن بلاریب کلام الٰہی ہے اور معانی کے ساتھ اپنے الفاظ، کلمات اور عبارت میں بلا شبہ اللہ سبحانہ کی جانب سے ہے اور اس کی فصاحت و بلاغت کے اعجازی کمال میں اللہ سبحانہ کی جانب سے ہونے میں کوئی دوسری کتاب اس کی حریف نہیں ہے کیونکہ دوسری آسمانی کتابیں اپنے الفاظ کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنے معنے کے اللہ کی جانب سے ہونے کا دعویٰ ہے چنانچہ قرآن کا حرف حرف لفظ لفظ وحی ہے اور وہی ہے جو محمد رسول کی زبان سے ادا ہوا وہ ہر قسم کی تحریف وتغیر سے محفوظ ہے اسلئے اس کے الفاظ کلمات اور عبارت اللہ سبحانہ کی جانب سے ہیں اور اس صفت میں دنیا کی کوئی آسمانی کتاب اس کتاب کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی ہے

اس تعبیر کا ایک مطلب تو یہی ہے کہ بے شک یہ اللہ کی کتاب ہے اور اس کے اللہ کی کتاب ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے دنیا میں جس قدر کتابیں امور مابعد الطبیعت اور حقائق ماورار ادراک سے بحث کرتی ہیں ان سب کا علمی سرمایہ انسانی گمان، خیال اور قیاس کی تخلیق ہے اس لیئے وہ شک سے پاک نہیں ہو سکتے لیکن قرآن ایسی کتاب ہے جو تا سر تا سر علم و حقیقت پر مبنی ہے اس کا مصنف رب العالمین ہے جو تمام حقائق کا علم رکھتا ہے اس لیئے فی الواقع اسمیں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

قرآن افترائی کلام نہیں

۳۸ کیا کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کے پیش کرنے والے نے خود بنا لیا ہے یعنی یہ کلام افترائی ہے اے پیغمبران کہنے والوں سے کہہ دو کہ اگر ایسا ہی ہے تو تم بھی اس جیسی ایک سورت لے کر آؤ۔ اگر تمہارے اس دعوے میں کچھ بھی صداقت ہے تو اللہ کے سوا جس کو اس کام میں مدد کے لیے بلا سکتے ہو بلا لو۔ یعنی اگر میں بنا لایا ہوں تو تم بھی میری طرح بشر ہو سب مل کر اس جیسی سورۃ بنا لاؤ۔ ساری مخلوق کو دعوت دو جن وانس کو جمع کر لو تمام جہان کے فصیح و بلیغ پڑھے لکھے اور ان پڑھ اکٹھے ہو کر ایک چھوٹا سا کلام قرآن کی مانند پیش کر دو تو سمجھ لیا جائے گا کہ قرآن بھی کسی بشر کا کلام ہے جس کا مثل دوسرے لوگ لا

سکتے ہیں مگر محال ہے کہ ابدالاباد تک کوئی مخلوق ایسا حوصلہ کر سکے۔ قرآن کریم ہی وہ کتاب ہے جس میں تہذیب اخلاق تمدن و معاشرت حکومت و سیاست معرفت و روحانیت تزکیہ نفوس تنویر قلوب غرضیکہ وصول الی اللہ اور تنظیم و رفاہیت خلائق کے وہ تمام قوانین و طرق موجود ہیں جن سے آفرینش عالم کی غرض پوری ہوتی ہے اور جن کی ترتیب و تدوین کی ایک امی قوم کے امی فرد سے کبھی امید نہیں ہو سکتی ہے۔ پھر ان علوم و ہدایات کا تکفل کرنے کے ساتھ اس کتاب کی ولولہ انگیز فصاحت و بلاغت جامع مؤثر دلربا طرز بیان دریا کا سا تموج سہل ممتنع سلاست و روانی اسالیب کلام کا تنوع اور اس کی لذت و حلاوت اور شہنشاہانہ شان و شکوہ یہ سب چیزیں ایسی ہیں جنہوں نے بڑے زور شور اور بلند آہنگی سے سارے جہاں کو مقابلہ کا چیلنج دے دیا ہے جس وقت سے قرآن کے جمال جہاں آراء نے غیب کی نقاب الٹی اور اولاد آدم کو اپنے سے روشناس کرایا اس کا برابر یہی دعویٰ رہا کہ میں اللہ سبحانہ کا کلام ہوں۔ اور جس طرح اللہ سبحانہ کے آسمان جیسا آسمان پیدا کرنے سے دنیا عاجز ہے ایسے ہی اللہ سبحانہ کے کلام جیسا کلام بنانے سے بھی دنیا عاجز رہے گی قرآن کے مٹانے کی لوگ سازشیں کریں گے مگر کانٹھیں گے۔ مقابلہ کے جوش میں کٹ مریں گے۔ اپنی مدد کے لیے دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کو دعوت دیں گے کوئی حیلہ، کوئی تدبیر کوئی داؤ پیچ اٹھا نہ رکھیں گے۔ اپنے کو اور دوسروں کو مصیبت میں ڈالیں گے۔ سارے مصائب اور دوا ہی کا تحمل ان کے لیے ممکن ہوگا مگر قرآن کی چھوٹی سی سورت کا مثل لانا ممکن نہ ہوگا۔

قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یاتوا بمثل ھذا القران
لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا۔

آپ اعلان کر دیں کہ اگر تمام انسان اور جن اکٹھے ہو جائیں اور چاہیں کہ اس قرآن کی مانند پیش کر دیں تو کبھی پیش نہ کر سکیں گے اگرچہ باہم ایک دوسرے کے مددگار ہو جائیں۔

اس مسئلہ پر ہم نے اعجاز القرآن کے نام سے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جسے شوق ہو ملاحظہ کرے [1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قرآن حضور اقدس کے معجزات میں ایک علمی معجزہ ہے جب کہ دوسرے معجزات عملی ہیں اسی معجزے کے بارے میں قرآن میں اللہ سبحانہ نے تحدی کی ہے اور اعلان عام کیا ہے کہ کوئی اس کی مثال پیش کرے اور پھر خود یہ بھی اعلان کردیا کہ پوری دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے ہمیشہ عاجز رہے گی اور سب سے پہلے مکہ میں سورہ الاسراء میں پورے قرآن کی مثال لانے کا مطالبہ کیا۔

قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یاتوا بمثل هذا القرآن لا یاتون بمثله ولو کان بعضهم لبعض ظهیرا

اے اللہ کے رسول اعلان کردو کہ اگر پورے انسان اور جن اس بات پر ایکا کریں کہ اس قرآن کی مثال پیش کریں تو اس جیسا قرآن نہیں لا سکتے اگرچہ وہ باہم ایک دوسرے کی مدد کریں۔

اس کے بعد سورۂ ہود میں قرآن نے اس اعلان کو یہ کہہ کر دہرایا کہ بجائے پورے قرآن کے دس ہی سورتیں لے آؤ۔

ام یقولون افتراه قل فاتوا بعشر سور مثله مفتریات

کیا وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اس کو اپنے جی سے بنا لیا ہے اب کہہ دیں کہ تم بھی ایسی بنائی ہوئی دس سورتیں لے آؤ۔

اس کے بعد مکہ ہی میں ایک سورت کا اعلان کیا سورہ یونس کی یہ آیت اسی اعلان کے بارے میں ہے جس کی تشریح ہو رہی ہے پھر اس کے بعد مکہ ہی میں اعلان ہوا کہ سورت نہیں لا سکتے تو ایک بات ہی لاؤ چنانچہ سورہ طور میں ہے۔ فلیاتوا بحدیث مثله۔

مدینہ پہنچ کر پھر مشرکین عرب سے ہٹ کر پوری کائنات انسانی کو چیلنج دیا چنانچہ البقرہ میں ہے۔

وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورة من مثله وادعوا شهداءکم من دون الله ان کنتم صادقین

اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ:

فان لم تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا النار التی وقودها الناس والحجارة اعدت للکافرین۔

اگر تم یہ نہ کر سکے اور ہرگز نہ کر سکو گے تو پھر اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔

اس آیت میں جو تحدی کی گئی ہے اس کے مخاطب یاایھا الناس کے ماتحت سارا عالم ہے صرف قریش یا اہل عرب نہیں ہیں۔

پہلے یہ بات بتائی تھی کہ قرآن اس شان کی کتاب ہے کہ کسی انسان کی ساختہ پر داختہ ہونا اس کا ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ اللہ کی وحی ہے اس کو کلام الٰہی جاننے کے لیے اللہ کی جانب سے آئی ہوئی کتابوں کی ترازو میں تول کر دیکھو۔ اگر دیکھو گے تو ورقہ ابن نوفل کی طرح بول پڑو گے ھذا ھو الناموس الذی نزل اللہ۔ یہ قرآن تمام وحیوں کی تصدیق کرتا ہے ہر شک سے بالاتر ہے اب یہ بتایا جارہا ہے کہ ان حقائق کو جان لینے کے بعد بھی اگر وہ اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں اور یہی کہے جارہے ہیں کہ یہ قرآن اللہ کی کتاب نہیں بلکہ محمد رسول اللہ کی من گھڑت ہے تو اے اللہ کے رسول آپ ان سے کہہ دیجیے کہ اگر یہ کتاب میں نے بنائی ہے اور اللہ کی کتاب نہیں ہے تو اس کا حل بہت ہی آسان ہے۔

اول اس طرح اگر میرا بنایا ہوا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے میں تو اُمی ہوں میری اُمیّت محتاج دلیل نہیں ہے۔ اس کے بنانے کے تین ہی ذریعے ممکن ہیں۔

ایک یہ کہ جو کچھ اللہ کی جانب سے پیش کر رہا ہوں اور انبیاء کے واقعات قرآن بیان کر رہا ہے اس وقت میں خود موجود ہوں۔

دوسرا یہ کہ ان کو میں نے کتابوں میں پڑھا ہو۔

تیسرا یہ کہ میں نے کسی سے یہ باتیں سنی ہوں۔

ظاہر ہے کہ اطلاع کے یہ تینوں ذرائع مجھ میں مفقود ہیں اول اس لیے کہ از آدم تا انیدم قرآن میں جو واقعات بیان ہوئے یہ واقعات میری پیدائش سے پہلے وقوع پذیر ہوئے ہیں اور میرے پاس ان کے علم کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

علم کا دوسرا ذریعہ یہ ہے کہ میں نے کتابوں سے پڑھ کر یہ سب کچھ بنا لیا ہو میں خود پڑھنے لکھنے سے عاری ہوں نہ خود پڑھ سکتا ہوں اور نہ لکھ سکتا ہوں یہ کیسے ممکن ہے۔

علم کا تیسرا ذریعہ یہ کہ دوسروں کے سامنے زانوے ادب طے کرکے میں نے علم حاصل کیا ہو تم سب جانتے ہو کہ نبوت سے پہلے میری ساری زندگی مکہ میں گذری ہے اور خود مکہ معظمہ میں نہ خود ان واقعات وحقائق کا کوئی عالم تھا اور نہ قریش کو ان سے آگاہی تھی۔

قریش نے بہت سے اعتراضات کیے مگر یہ اعتراض انہوں نے کبھی نہیں کیا کہ حضور اقدس نے چپکے سے پڑھنا سیکھ لیا ہے اور دوسری آسمانی کتابیں پڑھ کر یہ قرآن بنالیا ہے پس اس سے ثابت ہوا کہ حضور کی امیت پر ان کو یقین تھا اور امی ہونے کی حالت میں قرآن بنانا تو درکنار پڑھنا بھی ممکن نہیں۔

دوسرا اصل یہ ہے کہ اگر باوجود امی ہونے کے میں نے ہی یہ قرآن بنایا ہے تو ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ تو تم بھی قرآن جیسی ایک سورت بنا کر لاؤ اور اگر ایک انسانی دماغ کی قرآن محنت ہے تو بہت سے انسانی دماغ ملکر تو ضرور ایک سورۃ اس جیسی بنا سکتے ہیں۔ اگر تم اپنے اس دعوی میں سچے ہو کہ یہ انسانی دماغ کی محنت کا نتیجہ ہے تو تم بھی یہ کام کر کے دیکھ لو۔

یہ جو آیت میں کہا گیا ہے کہ اس جیسی ایک سورۃ مماثلت لاؤ اس مماثلت سے کیا مقصود ہے؟ کس بات میں مماثلت کا مطالبہ ہے۔

اس موضوع پر آپ پہلے مختلف خیالات سن چکے ہیں۔ ان کے تکرار کی ضرورت نہیں ہے

قرآن کے وجوہ اعجاز

قرآن حکیم کی ان آیتوں کو اگر یک جا کیا جائے جن میں قرآن کے وجوہ اعجاز کی طرف اشارہ ہے تو خود مختلف نظر آتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے وجوہ اعجاز اس قدر متعدد ہیں کہ ان کو کسی ایک میں محدود نہیں کیا جا سکتا ہے قرآن نے خود کہیں تو اپنی تعلیم و ہدایت کو سراہا ہے اور کہیں اپنی قوت تاثیر اور قوت جذب کی طرف اشارا کیا ہے۔ کہیں اپنی یکسانی اور عدم اختلاف کو اللہ سبحانہ کی طرف سے ہونے کی نشانی قرار دیا ہے کہیں اس نے اپنی عربیت اور حسن کلام کو ظاہر کیا ہے کہیں ایک امی کی زبان سے پیغام کا پیش ہونا اپنا معجزہ بتایا ہے۔ ایک موقعہ پر اپنی ہدایت و رہنمائی کو مخصوص وصف قرار دیا ہے کثرت سے شارحین قرآن کی رائے ہے کہ قرآن اپنی فصاحت و بلاغت اور اپنے انداز بیان کے مناظر میں بے مثال ہے اور یہی اس کا اعجاز ہے مگر یہ کہنا کہ یہی اعجاز ہے جیسا کہ امام رازی کی رائے ہے صحیح نہیں ہے ہاں یہ درست ہے کہ فصاحت و بلاغت بھی اعجاز قرآن کا ایک گوشہ ہے۔ ابو بکر الباقلانی الخطابی الرمانی، عبدالقاہر الجرجانی جیسے بزرگوں نے اعجاز قرآن پر جب قلم اٹھایا تو اس وقت کے رجحان اور عربوں کے ادبی ذوق کی وجہ سے

ان کے سامنے زیادہ تر اعجاز قرآن کا یہی گوشہ رہا اور یہ حقیقت بالکل بے غبار ہے کہ اس میدان میں ان بزرگوں نے جس نکتہ دانی اور حسن ذوق کا ثبوت دیا ہے بہت زیادہ قدر دانی کے لائق ہے۔

علامہ مجدالدین فیروز بادی نے بصائر ذوی التمیز میں اس موضوع پر اہل السنۃ کا مذہب یہ بتایا ہے۔

اہل السنۃ کا مذہب یہ ہے کہ قرآن ان سب میں معجزہ ہے نظم میں معنے میں الفاظ میں۔ کسی مخلوق کا کوئی کلام قرآن کے ہم پلہ نہیں ہو سکتا ہے۔ قرآن خطبا کی خطابت شاعروں کے اشعار سے بارہ وجوہ سے ممتاز ہے۔

ریحانہ تشبیہ، استفادہ، حروف کا تناسب کلمات کی ہم آہنگی، فواصل و قواطع کی یکسانی صیغوں اور الفاظ کا تجانس، احوال وقصص کی تعریف، حکم و اسرار کی فراوانی، امر ونہی میں ندرت بیان مقاصد میں دلربائی مصالح و اسباب کی رعایت ماضی اور مستقبل پر معلوماتی تبصرہ تنگنائی

اس کا دوسرے لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ قرآن کا اعجاز فی الواقع قرآن کی شان جامعیت ہے۔ کلام کی جامعیت میں اس وقت کمال ہوتا ہے جب اولاً وہ ماتحت افراد و انواع کو اتنا حاوی ہو کہ جب ان کی تفصیل کی جائے تو اس کا کوئی فرد اس سے باہر نہ رہے ثانیاً اس میں الفاظ کی ایسی شگنائی نہ ہو کہ مراد کے خلاف کوئی احتمال ہو سکے وہ کلام جس میں مراد متکلم کے خلاف احتمالات کی گنجائش ہو جامع نہیں ہوتا ثالثاً یہ کہ الفاظ اپنے مبہم نہ ہوں کہ مطلب ان کا بتایا جائے وہ ظاہر نہ ہو۔ جامعیت کا کمال یہ ہے کہ پورے اختصار کے باوجود اس کے الفاظ اتنے صاف ہوں کہ جب ان کی تفصیل کی جائے تو ہر ہر تفصیل پر وہ ایسا ہی صادق رہے گویا اسی کے لیے وضع کیے گئے تھے ان اوصاف کو پیش نظر رکھ کر کسی بھی بڑے بڑے مصنف کے کلام کا مطالعہ کریں تو ہر ایک کے کلام ایک خامی ضرور ہو گی کہ ابہام ضرور ہو گا اگر واضح اور صاف ہو گا تو جامعیت نہ ہو گی ان دو صفتوں کا اجتماع اب آیات قرآنیہ دیکھیں گے کہ واضح اور صاف بھی نہیں اور اغلاق وابہام کا بھی داغ نہیں شان جامعیت بھی اعجاز کا شعبہ ہے ہے خلاصہ یہ ہے کہ جامعیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کے بعد تفصیل کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ خداشناسی اور آداب عبدیت کے اصولوں پر حاوی ہے جیسے جہانبانی اور فرمانروائی کے ایک ایک نکتہ

اور ایک ایک شوشہ کے لیے مکمل آئین ہے ایسے ہی ایک بے کس نادار اس پر عمل کر کے عارف کامل ہو سکتا ہے اور ایک فقیر بے نوا اس کی اتباع کے صدقے تاج شاہی پہن سکتا ہے۔ شاہی اور گدائی کے عمیق و دقیق اصول قرآن نے ایسے جامع الفاظ میں پیش کئے ہیں کہ مختلف زمانوں کی مختلف ضروریات کی کفالت پورے اور بھرپور انداز میں کی ہے جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ دنیا میں امن وامان اور عدل وانصاف کے قیام اور فتنہ وفساد اور برائیوں کی انسداد کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ قانون اور اخلاق اگرچہ دونوں کی منزل ایک ہے مگر دونوں کے راستے مختلف ہیں اور تنہا ان میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ کمی ہے جس کی تلافی دوسرے سے ہوتی ہے۔ قانون برائیوں کو تو روکتا ہے مگر دل میں اس برائی کی طرف سے کراہت کا کوئی روحانی کیف پیدا نہیں کرتا جو انسانیت کی جان ہے اور اخلاق پر عمل پیرا ہونے کے لیے ہر شخص کو بزور مجبور نہیں کیا جا سکتا ہے اس لیے صرف اخلاق کے زور پر عدل وانصاف کا قیام اور برائیوں کا استیصال نہیں ہو سکتا۔ توراۃ محض قانون ہے اور انجیل محض اخلاق قرآن ایک جامع کتاب ہے جس میں عدل واحسان اور قانون واخلاق دونوں موجود ہیں۔

اس جامعیت کا اصول قرآن میں دو حیثیتوں سے پایا جاتا ہے ایک تو یہ کہ اس نے نہ تو یہودیت کی طرح اخلاق کو بھی قانون کی شکل دے دی اور نہ عیسائیت کی طرح قانون کو مذہب کی گرفت ہی سے خارج کر دیا بلکہ قرآن نے قانون واخلاق دونوں کے درمیان حد فاصل قائم کر کے ہر ایک کی حد مقرر کر دی اور قانون کو قانون اور اخلاق کو اخلاق کی جگہ رکھ کر انسانیت کو کمال تک پہنچا دیا بہر حال مجد الدین فیروز آبادی نے اعجاز قرآن کے سلسلے میں جس جامعیت کی طرف اشارا کیا ہے اس کا خلاصہ یہی ہے اور قاضی عیاض نے شفا میں لکھا ہے کہ

قرآن اپنی حکیمانہ ہدایت کے لحاظ سے بے مثال اور معجزہ ہے۔

یہ بات بھی جامعیت ہی کے ہم معنے ہے اور یہ قرآن کے اشارات سے لفظوں میں زیادہ ہم آہنگ ہے۔ قرآن نے جس قدر اپنے ہدایت ہونے پر روز دیا ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے کہیں فرمایا ہے ھدًی للمتقین یعنی یہ کتاب الہٰی سراپا ہدایت ہے۔ کہیں ارشاد ہے۔

ان ھذا القران یھدی للتی ھی اقوم

اس قرآن کی ہدایت و رہنمائی سب سے زیادہ پائدار ہے۔

قرآن نے اپنے جس قدر اوصاف بیان کئے ہیں ان سب میں جامع ترین وصف یہی ہے. زندگی اور سعادت کے لیے اس کی ہدایت سب سے زیادہ پائیدار سب سے زیادہ سیدھی ہے کسی طرح کی کجی کسی طرح کا پیچ وخم کسی طرح کا الجھاد کسی طرح کی افراط وتفریط اس کی ہدایت میں نہیں ہے۔ یعنی صلاح و فلاح دارین دینوی واخروی فوز و کامرانی کی راہیں اسی کتاب حقیقت ترجمان سے وابستہ ہیں جب کہ پہلی کتابوں کی بتائی ہوئی راہیں بھی اپنی اپنی جگہ سیدھی ہیں لیکن یہ قرآن والی ہدایت سب سے بڑھ کر اور سب سے جامع ہے۔ کہیں ہدایت کے ساتھ قرآن کو شفاء اور کہیں رحمت فرمایا ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ یہ کتاب الٰہی ہدایت میں اتنی جامع ہے کہ یہ دل کی تمام بیماریوں کے لیے نسخہ شفاء اور ظلم وفسادات اور بغض تنفر سے دنیا کو نجات دلانا اور رحم ومحبت اور امن وسلامتی کی روح سے معمور کرنا اس کی رہنمائی کا خاصہ ہے

یہاں اعجاز قرآن پر بحث مقصود نہیں ہے یہ مباحث مفصل آئندہ کسی جلد میں آئیں گے۔ یہاں محض اعجاز قرآن کا تذکرہ مقصود تھا۔

اعجاز قرآن اور اس کی وہ وجوہ جو شارحین قرآن نے پیش کی ہیں خود شارحین کی زبانی انشاء اللہ سورۂ الاسراء میں آرہی ہیں۔

ماورائے عقل اور خلاف عقل میں فرق ہے

۳۹ جھٹلایا

سے نہیں یہ کلام افترائی بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ قرآن کو ان باتوں کی وجہ سے جو ان کی علمی دسترس میں نہیں آسکتی ہیں اور ابھی ان کی حقیقت سامنے نہیں آئی ہے یعنی قرآن کو مفتری کہنا سمجھ کر نہیں محض جہل وسفاہت اور قلت تدبر سے ہے۔ تعصب وعناد انہیں اجازت نہیں دیتا کہ ٹھنڈے دل سے قرآن پاک کے دلائل وعجائب کو پوری طرح سمجھ سکیں تو جھٹلانا شروع کر دیا۔ بعض مفسرین نے تاویل کے معنی تفسیر کے لیے ہیں یعنی مطالب قرآن ان کے دماغ میں نہیں اترے اور بعض نے قرآنی پیشگوئیاں مراد لی ہیں یعنی تکذیب کی۔ ایک وجہ بعض سادہ لوگوں کے حق میں یہ بھی ہے کہ مستقبل کے متعلق قرآن نے جو خبریں دی ہیں ان کے وقوع کا ابھی وقت نہیں آیا لہذا وہ منتظر ہیں کہ ان کا ظہور کب ہوتا ہے مگر سوچنا چاہیے کہ یہ وجہ تکذیب کی کیسے ہوسکتی ہے زیادہ سے زیادہ توقف کی وجہ ہو تو ہو[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

اس آیت کی تشریح میں شارحین قرآن نے بھرپور محنت کی ہے اور بحث و نظر کے ایک سے زیادہ گوشوں میں نکل گئے ہیں۔ اس گلستان علم سے کچھ علمی شگوفے ہم ناظرین معالم کے لیے بھی پیش کرتے ہیں۔

پہلے اہل تفسیر کی زبانی سنئے حافظ ابن کثیر فرماتے اور بڑے سادہ انداز میں فرماتے ہیں:

بلکہ ان قرآن کے مخاطبوں نے قرآن کی تکذیب کی اور انہوں نے نہ اسے سمجھا اور نہ ان کو اس کی معرفت حاصل ہوئی ولما یاتھم تاویلہ یعنی ان کو قرآن سے کوئی ہدایت حاصل نہیں ہوئی ہے جہالت اور نادانی کی وجہ سے قرآن کی تکذیب کے وقت تک۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں:

انہوں نے قرآن کے معانی اور تفسیر سے بے خبر ہو کر قرآن کی تکذیب کی ان کی ذمہ داری تھی کہ مطالب کی تحقیق کریں اور اس کے متعلق پوچھیں تا حال ان کی تکذیب کا انجام ان کے سامنے نہیں آیا ہے یا مطلب یہ ہے کہ جنت و دوزخ اور قیامت کا قرآن میں ذکر سن کر وہ قرآن کی تکذیب کر رہے ہیں اور ابھی قرآن میں مذکور ان چیزوں کی واقعاتی حقیقت ان کے سامنے بے نقاب ہو کر نہیں آئی ہو۔

اور مشہور مفسر قرآن حافظ ابن جریر فرماتے ہیں:

اللہ سبحانہ فرماتے ہیں کہ اے اللہ کے رسول یہ مشرکین آپ کی تکذیب نہیں کر رہے ہیں بلکہ ان باتوں کی تکذیب کر رہے ہیں جو قرآن میں بیان شدہ ان کی علمی دسترس سے بالا ہیں جن کی واقعاتی حقیقت ابھی کھل کر سامنے نہیں آئی ہے۔

یہ تو نمونہ ہے ارباب تفسیر کا۔ باقی رہے ارباب تاویل ان میں علامہ زمخشری ابوحیان اندلسی قاضی بیضاوی، علامہ آلوسی بغدادی سب کی تشریحات مختلف ہیں۔ ان ہی کا خلاصہ شیخ الاسلام نے اپنے افادات میں سمیٹ دیا ہے۔ ان میں اچھی بات نظم الدرر میں علامہ بقاعی نے فرمائی ہے لکھتے ہیں:

چونکہ ان کا یہ کہنا کہ یہ قرآن انسانی بناوٹ ہے کسی دلیل سے نہیں بلکہ عناد

سے تھا اللہ سبحانہ نے اس آیت میں اس پر متنبہ کیا اور بتایا کہ دیل صرف ان کے عناد کو نمایاں کرنے کے لیے بیان ہو رہی ہے اس لیے نہیں کہ فی الواقع قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں ان کو کوئی شبہ ہے فرمایا کہ انہوں نے قرآن کو افترائی کلام کسی عقیدے اور یقین کی بنیاد پر نہیں کہا بلکہ انہوں نے اس قرآن کی تکذیب صرف اس لیے کی ہے کہ وہ قرآن کی گہرائی تک پہنچنے کی وجہ سے اپنے دین کے مخالف ہونے کے باعث جلد بازی سے کام لے رہے ہیں اور جو باتیں ان کے ادراک میں نہیں آئی ہیں ان کی واقعاتی حقیقت ابھی رونما نہیں ہوئی ہے تاکہ ان کو پتہ لگ جائے کہ قرآن حق ہے۔"

امام رازی نے تفسیر کبیر میں آیت کے مطالب و معانی کے لیے ایک سے زیادہ احتمالات بیان کئے ہیں۔ اور اب اردو شارحین قرآن کی تشریحات بھی پڑھ لیجئے۔

حضرت مولانا اشرف علی فرماتے ہیں:

"دلائل سے وہ مستفید ہوتا ہے جو سمجھنا بھی چاہے انہوں نے تو کبھی سمجھنا ہی نہیں چاہا بلکہ ایسی چیز کی تکذیب کرنے لگے جس کے صحیح وسقیم ہونے کو اپنے احاطہ علمی میں نہیں لائے اور اس کی حالت سمجھنے کا ارادہ نہیں کیا تو ایسوں سے سمجھنے کی کیا امید ہو سکتی ہے اور ان کی اس بے فکری اور بے پروائی کی وجہ یہ ہے کہ ہنوز ان کو اس قرآن کی تکذیب کا آخری نتیجہ نہیں ملا یعنی عذاب نہیں آیا۔"

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع نے بھی اسی کی ہم نوائی کی ہے اور تشریح میں یہ اضافہ کیا ہے:

"ولما یاتھم تاویلہ" تاویل سے مراد اس جگہ مآل اور انجام ہے مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی غفلت اور بے فکری سے قرآن میں غور نہیں کیا اور اس کی تکذیب کے انجام بد کو نہیں پہچانا اس لیے تکذیب میں لگے ہوئے ہیں"

مولانا محمد ادریس کاندھلوی فرماتے ہیں:

"ان لوگوں نے قرآن کی عظمت شان کو پہچانا نہیں ہے اور اس کی دلیل و برہان کو سمجھا نہیں ہے اور اس کے علم تک ان کی رسائی نہیں ہوتی ہے۔ قرآن کو سنتے ہی بجائے اس کے کہ اس کے علوم و معانی کو سمجھیں اس کو جھٹلانے لگے غرض یہ کہ انہوں نے قرآن کے علوم و دلائل و براہین میں غور و فکر سے کام

نہیں لیا اور بے سوچے سمجھے جلدی میں جھٹلا دیا۔"

پیر محمد کرم شاہ ایم۔ اے کا تشریحی نوٹ اس قابل ہے کہ اسے پڑھا جائے۔
"قرآن حکیم کے بارے میں ان کا معاندانہ رویہ اور اس کو کلام الٰہی ماننے سے انکار کسی تحقیق و تفحص اور غور و فکر کا نتیجہ نہیں کہ انہوں نے قرآن کو پڑھا ہو۔ اس پر غور و فکر کیا اس کو عقل سلیم کی ترازو میں تولا ہو اور پھر وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہوں کہ اس میں فلاں عیوب اور خامیاں موجود ہیں اس لیے یہ کلام الٰہی نہیں ہوسکتا ہے بلکہ اس انکار کی پہلی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے قرآن کے معارف پر آگاہی حاصل نہیں کی۔ انہوں نے علم و دانش کے اس بحر بیکراں میں غواصی ہی نہیں کی۔ اور اس میں غور و فکر کرتے اور اگر وہ قرآن کے آئینے میں منعکس ہونے والے حسن حقیقی کے ایک جلوہ ہی دیکھ لیتے تو ہزار جان سے اس پر قربان ہو جاتے انکار کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن نے نیکوں کے لیے جس اجر و ثواب اور نافرمانوں کو جس عذاب الیم کی دھمکی دی ہے اور مستقبل میں ہونے والے جن واقعات کی خبر دی ہے وہ ابھی تک پردہ غیب میں مستور ہیں۔ ابھی ان کا وقوع نہیں ہوا وہ ان وعدوں اور وعیدوں کو صرف دھمکیاں تصور کرتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ اللہ نے ہر چیز کے ظہور کے لیے وقت مقرر کیا ہوا ہے اس سے پہلے ان کو سوچنے سمجھنے اور حق کو قبول کرنے کی مہلت دی گئی ہے۔"

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی تفہیم میں اس آیت کی تشریح میں اور ہی وادی میں دور نکل گئے اس تشریح کے مطالب کا قرآن سے کوئی ربط نہیں اس لیے ان کی تشریح کو نقل کرنا بے محل ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی کی تشریح مطالب قرآنی کے قریب قریب ہے فرماتے ہیں:
"اصل وجہ تکذیب یہ ہے کہ قرآن ان کو تکذیب رسول کی صورت میں جس عذاب کی دھمکی دے رہا ہے وہ ان کے علم کی گرفت میں نہیں آرہی ہے اس لیے کہ اس کی حقیقت ان کے سامنے ابھی ظاہر نہیں ہوئی۔"

مولانا ابوالکلام آزاد ترجمان قرآن میں فرماتے ہیں:
"نہیں یہ بات نہیں ہے اصل حقیقت یہ ہے کہ جس بات پر یہ اپنے علم سے

احاطہ نہ کر سکے اور جس بات کا نتیجہ ابھی پیش نہیں آیا اس کے جھٹلانے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔"

مولانا موصوف نے یہاں مزید تشریح فرمائی ہے اب تک ارباب تفسیر اور اہل تاویل کی زبانی آپ نے جو کچھ سنا ہے اس کا تعلق حضور اقدس کے ان مخاطبوں سے ہے جو قرآن کی تکذیب کر رہے تھے اور مولانا کے تشریحی نوٹ سے آپ کو معلوم ہو گا کہ اس کا تعلق جیسے ماضی سے تھا ویسا ہی حال اور مستقبل سے بھی ہے فرماتے ہیں :

"قرآن نے بیک وقت دونوں باتوں کی مذمت کی ہے اس کی بھی کہ بغیر علم وبصیرت کے کوئی بات مان لی جائے۔"

اس کی بھی کہ محض عدم ادراک کی بنا پر کسی بات کو جھٹلا دیا جائے آیت قرآنی ان الظن لا یغنی من الحق شیئا میں بتایا گیا ہے کہ منکرین حق علم ولیقین کی روشنی سے محروم ہیں ان کا سرمایہ علم وعمل محض ظن وگمان ہے اب اس آیت بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ میں بتایا ہے کہ جس بات کا وہ علمی طور پر احاطہ نہ کر سکے اس کے جھٹلانے پر آمادہ ہو گئے اگرچہ بظاہر یہ دو باتیں الگ الگ معلوم ہوتی ہیں لیکن فی الحقیقت ایک ہی ہیں اور دونوں کی بنیاد اس اصل عظیم پر ہے کہ نہ تو ظن وگمان کی بنیاد پر تصدیق کرنی چاہیے اور نہ ظن وگمان کی بنا پر تکذیب کرنی چاہیے۔ جو کچھ کرنا چاہیے علم وبصیرت کی بنیاد پر کرنا چاہیے۔

منکرین قرآن نے کونسی بات جھٹلائی تھی۔ یہی کہ ان ہی میں سے ایک شخص پر اللہ کی وحی نازل ہوتی ہے۔ یہ بات ان کو عجیب معلوم ہوئی اس لیے تکذیب پر تیار ہو گئے۔ قرآن نے بتایا کہ تمہارے ماننے اور تمہارے جھٹلانے دونوں کا مدار ظن وگمان پر ہے تم جو باتیں مان رہے ہو کہ ھولاء شفعاؤنا عند اللہ کہ یہ بزرگ ہستیاں جن کی یہ تماثیل اصنام اور اوثان میں بارگاہ الٰہی میں ہمارے شفعاء ہیں اس لیے ہم ان کی عبادت کرتے ہیں اس کے لیے بھی تمہارے پاس کوئی علم نہیں ہے یہ باتیں محض وگمان کی بنا پر مان رہے ہو اور جس بات کے جھٹلانے میں اس قدر جلدی کی کہ یہ قرآن اللہ کی کتاب نہیں اس کے لیے بھی تمہارے پاس کوئی یقین نہیں ہے۔ حالانکہ درست راستہ یہ ہے کہ جو کچھ کرو علم و بصیرت کے ساتھ کرو محض اٹکل پر نہ چلو۔

جہل وکوری کی دو حالتیں

اگر ایک شخص علم ویقین کے ساتھ ایک بات پیش کر رہا ہے اور قسم کھاکر کہہ رہا ہے اور جتنی باتیں کسی بات کی درستگی اور معقولیت کی ہوسکتی ہیں سب اس کے ساتھ ہیں اور تمہارے پاس اس کے خلاف ظن وگمان کے سوا کچھ نہیں تو تمہارے لیے کیونکر جائز ہوسکتا ہے کہ فوراً تکذیب پر آمادہ ہوجاؤ اس سے پہلے ابت ان الظن لا یغنی من الحق شیئا میں بھی بات کہی جاچکی ہے کہ تم ظن کی بنا پر یقین کو جھٹلا نے لگے حالانکہ ظن وگمان کا بھروسہ انسان کو یقین سے بے نیاز نہیں کرسکتا ہے۔ اگر غور کروگے تو پتہ لگ جائے گا کہ انسان کی ساری فکری گمراہیوں کا اصلی سرچشمہ یہی بات ہے یا تو وہ عقل وبینش سے ہے اس قدر کورا ہوجاتا ہے کہ ہر بات بے سمجھے بوجھے مان لیتا ہے اور ہر راہ میں آنکھیں بند کرکے چل دیتا ہے یا پھر سمجھ بوجھ کا اس طرح غلط استعمال کرتا ہے کہ جہاں کوئی حقیقت اس کی شخصی سمجھ سے بالاتر ہوتی اسے فوراً جھٹلا دیا گویا حقیقت کے اثبات و وجود کا سارا دارومدار صرف اسی بات پر ہے کہ ایک خاص شخص کی سمجھ میں آتا ہے یا نہیں۔ یہ دونوں حالتیں علم وبصیرت کے خلاف ہیں اور دونوں کا نتیجہ عقل وبینش سے محرومی اور عقلی ترقی کا فقدان ہے جس عقل وبصیرت کا یہ تقاضا ہوا کہ حقیقت اور وہم میں امتیاز کریں وہی چاہتی ہے کہ کوئی بات محض اس لئے نہ جھٹلا دیں کہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ عقل کا پہلا تقاضا ہمیں وہم پرستی اور جہل سے روکتا ہے دوسرا شک والحاد سے قرآن دونوں حالتوں کو جہل وکوری کی حالتیں قرار دیتا ہے اور اہل علم وعرفان وہ ہیں جو نہ تو جہل وہم کی راہ چلتے ہیں نہ شک والحاد کی۔

خلافِ عقل اور ماورائے عقل

یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ دو صورتیں ہیں اور دونوں کا حکم مختلف ہے ایک یہ کہ کوئی بات عقل کے خلاف ہو اور دوسری یہ کہ کوئی بات عقل سے بالاتر ہو۔ بہت باتیں ایسی ہو سکتی ہیں جن کا تمہاری عقل ادراک نہیں کرسکتی لیکن تم یہ فیصلہ نہیں کرسکتے کہ وہ سرے سے خلاف عقل ہیں اولاً تو تمام افراد کی قوت عقل برابر نہیں ہے ایک آدمی موٹی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتا دوسرا باریک سے باریک نکتے حل کرلیتا ہے۔ ثانیاً عقل انسانی برابر نشوونما میں سے ایک ہے

دور کی عقل جن باتوں کا ادراک نہیں کر سکتی تھی دوسرے دور کے لیے وہ عقلی مسلمات بن گئے تاہم انسانی عقل کے ادراک کی سرحدیں مقرر ہیں اور یہ عقل ہی کا فیصلہ ہے کہ حقیقت اسی حد پر ختم نہیں ہوتی ہے مذہب کے میدان سے باہر اور غور کرو کہ قرآن نے ان چند لفظوں میں جو بات کہہ دی وہ انسانی علم و عقل کی ترقیوں کے لیے کس طرح اصل و اساس ثابت ہو رہی ہے۔ کون سی بات ہے جس نے علمی ترقی کی۔ غیر محدود دائرہ لا نہایتہ امکانات کا دروازہ نوع انسانی کے لیے کھول دیا اور علم و ادراک کی سینکڑوں ناممکن باتوں کو نہ صرف ممکن بلکہ واقعہ بنا دیا۔

کیا یہی بات نہیں ہے کہ کسی بات کے احاطہ نہ کر سکنے سے اس کا انکار لازم نہیں آتا؟ اگر اصحاب علم و انکشاف نے اس کا انکار کر دیا ہوتا تو کیا ممکن تھا کہ عقلی ترقیوں کے قدم یہاں تک پہنچ سکتے اور آئندہ کے لیے اس قدر ممکنات سامنے آجاتے۔ بلاشبہ علم و انکشاف کے ہر عہد میں ایسی جلد باز طبیعتیں بھی ہوتی ہیں جنہوں نے محض عدم ادراک کی بنا پر انکار کر دیا لیکن علم نے کچھ پروانہ کی اور اس کا نتیجہ ہے کہ اس کا سفر برابر جاری رہا اور کوئی نہیں کہہ سکتا کب تک جاری رہے گا۔

ایک اور بات بھی یہاں سمجھ لینی چاہیے کہ جہاں تک عقل اور ماورائے عقل کا تعلق ہے۔ قرآن کے بعد تین دور گذر چکے ہیں ایک دور حکمائے متکلمین اسلام کا جنہوں نے عقلی طریقہ پر اسلامی عقائد کا اثبات کیا۔ دوسرا یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا جب اسی طرح مسیحی علم کلام مدون ہوا تیسرا علوم عصریہ کا جس نے بحث و نظر کے تمام گوشوں میں ایک نئی روح پیدا کر دی۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ قرآن نے یہاں سیدھے سادھے لفظوں میں جو بات کہہ دی ہے اس پر کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔ بلاشبہ بحث و نظر کی کاوشیں دور دور تک گئیں لیکن ہمیشہ ناکامیاب ہوئیں اور ہمیشہ اصحاب عرفان و تحقیق کو اقرار کرنا پڑا کہ اس سے بہتر اور فیصلہ کن بات اور کوئی نہیں کہی جاسکتی۔

ف۵ ایسے ہی ان لوگوں نے بھی تکذیب کی تھی جو ان سے پہلے تھے دیکھو ظلم کار لوگوں کا انجام کیا ہوا اے اللہ کے رسول کچھ آپ کے مخاطبوں میں سے وہ ہیں جو قرآن کو اللہ کا کلام مانتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو قرآن کو اللہ کا کلام نہیں مانتے تیرا پروردگار شورش پسند دلوں کو خوب جانتے ہیں۔ یعنی آگے چل کر ان میں کچھ لوگ مسلمان ہونے والے ہیں انہیں چھوڑ کر جو باقی لوگ ہیں شرارت پر قائم رہیں گے اللہ سب کو خوب جانتا ہے موقع پر مناسب سزا دے گا۔[۱]

[۱] افادات شیخ الاسلام

اس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے فرمایا کہ آپ کے مخاطب جس انداز سے آپ کی تکذیب کر رہے ہیں یہ کوئی آپ کی ہی خصوصیت نہیں ہے آپ سے پہلے بھی رسولوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا رہا ہے تو جو انجام ان کا ہوا وہی انجام ان کا بھی ہوگا ان ہی میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو مستقبل میں نعمت ایمان سے مالا مال ہوں گے مطلب یہ ہے جب ان کے اندر سے ایسے لوگ نکل رہے ہیں جو قرآن پر ایمان لا رہے ہیں تو معلوم ہوا کہ ان میں کچھ میں ایمان قبول کرنے کی صلاحیت ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ ان پر اس حد تک کام کیا جائے محنت کی جائے کہ ان میں جو ہر قابل نمایاں ہو کر سامنے آجائے۔

ایمان نہ لانے والوں کے متعلق فرمایا وربك اعلم بالمفسدين اللہ سبحانہ ان شرارتیوں کو خوب جانتا ہے یعنی وہ دنیا کا منہ تو اپنی چرب زبانی سے بند کر سکتے ہیں کہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی اسلئے ہم نہیں مانتے۔ لیکن اللہ سبحانہ جو قلب و ضمیر کے ایک ایک وسوسہ سے بھی باخبر ہے وہ ان میں سے ایک ایک شخص کے متعلق خوب جانتا ہے کہ کس کس طرح اس نے اپنے دل و دماغ پر قفل لگا رکھے ہیں اپنے آپ کو غفلتوں کی آماجگاہ بنایا، اپنے دل کی آواز کو دبایا اپنے اندر کی حق کی شہادت کو ابھرنے سے روک لیا اپنے ذہن سے قبول حق کی صلاحیت کو پامال کیا سن کر نہ سننے والا بن گیا سمجھ کر نا سمجھ بنا اور حق کے مقابلے میں اپنے و بڑے کے تعصبات کو اپنے مفادات کو اپنی اغراض دنیوی کو اور اپنی خواہشوں کو ترجیح دی اسی لیے وہ بے گناہ نہیں بلکہ فی الواقع مفسد ہیں، معاند ہیں۔ ان کا عناد ایمان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ حافظ ابن کثیر نے یہ بات خوب لکھی ہے۔

"تیرا رب خوب جانتا ہے کہ ہدایت کا مستحق کون ہے جس کو ہدایت کی نعمت ملے اور گمراہی کا حقدار کون ہے گمراہی میں بھٹکتا رہے وہ دین میں عدل کی ترازو رکھتا ہے وہاں ظلم نہیں ہے بلکہ ہر ایک کو اس کے استحقاق کے مطابق دیتا ہے۔"

علامہ نظام الدین حسن بن محمد نیساپوری فرماتے ہیں :

"مفسدین کو جاننے کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو جزا تکذیب کے درجات کے مطابق دے گا تکذیب میں جس کا جو مقام ہوگا اس کو جزا بھی ویسے ہی ملے گی۔"

معلوم ہوا جیسے اعمال صالحہ اخلاق، اور انکار صحیحہ کے درجات و مراتب ہیں ایسے ہی گناہوں کے بھی درجات ہیں ایک شخص بات نہ سمجھنے کی وجہ سے تکذیب کر رہا ہے دوسرا سمجھ رہا ہے مگر عناد کی وجہ سے تکذیب کر رہا ہے۔ ایک شخص بات سن رہا ہے مگر گرد و پیش اور ماحول کے غلط ہونے کی وجہ سے تقلیداً تکذیب کر رہا ہے۔ ایک سمجھ رہا ہے مگر مفادات کی وجہ سے تکذیب کر رہا ہے دوسرا اپنی نفسانی رغبتوں اور خواہشوں سے دب کر تکذیب کر رہا ہے۔

قرآن نے کفر کا لفظ انکار کے معنے میں استعمال کیا ہے

اور انکار دو طرح کا ہوتا ہے ایک یہ کہ انکار محض سے ایک یہ کہ جارحانہ ہو۔ انکار محض سے مقصود یہ ہے کہ ایک شخص تمہاری تعلیم قبول نہیں کرتا اس لیے کہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی یا اس لیے کہ اس میں طلب صادق نہیں ہے یا اس لیے کہ جو راہ وہ چل رہا ہے اسی پر قانع ہے بہرحال کوئی وجہ ہو لیکن وہ تم سے متفق نہیں ہے جارحانہ انکار سے مقصود وہ حالت ہے جو صرف انتنے ہی پر قناعت نہیں کرتی بلکہ اس میں تمہارے خلاف ایک طرح کی کد اور ضد پیدا ہو جاتی ہے اور پھر یہ ضد بڑھتے بڑھتے بغض و عناد اور ظلم و شرارت کی سخت سے سخت صورتیں اختیار کر لیتی ہے اس طرح کا مخالف صرف یہی نہیں کرتا کہ تم سے اختلاف رکھتا ہے بلکہ اس کے اندر تمہارے لیے بغض و عناد کا ایک غیر محدود جوش پیدا ہو جاتا ہے وہ اپنی زندگی اور زندگی کی ساری قوتوں کے ساتھ تمہاری بربادی و ہلاکت کے درپے ہو جائے گا تم کتنی ہی اچھی بات کہو وہ تمہیں جھٹلائے گا۔ تم کتنا ہی اچھا سلوک کرو وہ تمہیں اذیت پہنچائے گا۔ تم اگر کہو کہ روشنی تاریکی سے بہتر ہے تو وہ کہے گا تاریکی سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔

بہرحال کفر و تکذیب کے بھی درجات مراتب ہیں ان کی سزا ان کے مراتب کے مطابق ملے گی۔

وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔـا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَھُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَيَوْمَ يَحْشُرُھُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ۭ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۴۵﴾

اور اگر یہ لوگ اس کے باوجود بھی آپ کی تکذیب کریں تو آپ کہہ دیجئے میرے لیے میرا عمل ہے اور تمہارے لیے تمہارا عمل ہے میرے عمل کے تم ذمہ دار نہیں اور تمہارے اعمال کا میں ذمہ دار نہیں ہوں ۵۶ اور اے اللہ کے رسول ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو تیری باتیں کان لگا کر سنتے ہیں (اور آپ سمجھتے ہیں کہ یہ سن رہے ہیں لیکن فی الواقع وہ سنتے نہیں ہیں) تو کیا آپ پھر ان کو

بات سنائیں گے خواہ وہ بات کچھ ہی نہ سمجھتے ہوں۔ اور ان میں کچھ ایسے ہیں جو آپ کی طرف دیکھتے ہیں (اور آپ سمجھتے ہیں کہ یہ آپ کو دیکھ رہے ہیں حالانکہ فی الواقع نہیں دیکھتے) تو کیا آپ نابینا لوگوں کو راہ بتائیں گے خواہ ان کو کچھ بھی نہ سوجھتا ہو^۵۷ بلاشبہ اللہ سبحانہ انسانوں پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا ہے لیکن وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں^۵۸ اور جس روز اللہ سبحانہ ان سب کو اپنے حضور کرے گا ان کو ایسا محسوس ہو گا کہ گو دنیا میں صرف ایک گھڑی ٹھہرے ہیں لوگ باہم ایک دوسرے سے متعارف ہوں گے۔ بلاشبہ وہ لوگ گھاٹے میں رہے جنہوں نے قیامت کے آنے کی تکذیب کی اور وہ کامیابی کے راستہ پر نہ تھے^۵۹

مفردات کے معانی

ساعۃ۔ گھڑی، وقت رات یا دن کا کوئی سا وقت ہو۔ ساعت کہلاتا ہے اہل عرب اس کا استعمال وقت ہی کے معنے میں کرتے ہیں چاہے ذرا دیری کے لیے ہو۔ قرآن میں الساعۃ کا لفظ جہاں کہیں بھی استعمال ہوا ہے اس سے کہیں تو قیامت مراد ہے کہیں ایک ایسے فیصلہ کن دن کے لیے جو دعوت حق اور اس کے مخالفوں کے درمیان فیصلہ کر دے امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں۔ زمانہ کے حصوں میں سے کوئی سا حصہ ہو ساعت کہلاتا ہے اور قیامت بھی اس سے

مراد لی جاتی ہے ارشاد ہے اقتربت الساعۃ وانشق القمر اور یسئلونک عن الساعۃ اور عندہ علم الساعۃ اب یا تو حق تعالیٰ شانہ کے جلد حساب لے لینے کی وجہ سے اس کو قیامت سے تشبیہ دی گئی ہے یا اس وجہ سے کہ جس پر یہاں متنبہ کیا ہے یوم یحشرھم کان لم یلبثوا الا ساعۃ من النہار یس ساعت اولی قیامت ہے اور ساعت ثانیہ زمانہ ہے اور کچھ کی رائے ہیں وہ ساعات جو قیامت کے معنی دیتی ہیں تین ہیں (۱) الساعۃ الکبریٰ یعنی لوگوں کا حساب دینے کے لیے اٹھنا اسی کی طرف حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے لا تقوم الساعۃ حتی یظھر الفحش والتفحش وحتی یعبد الدرھم والدینار قیامت اس وقت تک قائم نہ ہو گی کہ یہاں تک فحش اور بے حیائی کھلم کھلا ہونے لگے اور یہاں تک کہ روپے اور اشرفی کو معبود بنا لیا جائے۔ الساعۃ الوسطیٰ یہ ایک دورہ لوگوں کا ختم ہو جاتا ہے۔ حضور اقدس نے عبداللہ بن انیس کو دیکھ کر فرمایا ان یطل عمر ھذا الغلام لم یمت حتی تقوم الساعۃ (اگر اس لڑکے کی عمر دراز ہوئی تو اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک قیامت قائم نہ ہو) یہ صحابہ میں سب سے آخر مرنے والے ہیں۔ الساعۃ الصغریٰ ہر انسان کی ساعت اس کی موت ہے قرآن کی اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے قد خسر الذین کذبوا بلقاء اللہ حتی اذا جاءتھم الساعۃ بغتۃ اور اسی قسم کی دوسری آیات میں ساعت سے مراد خود آدمی کا مر جانا ہے۔

خسر نقصان میں ہوا خسر یخسر مصدر خُسر خسار اور خُسران آتا ہے تینوں کے معنی خسارہ کے ہیں یعنی پونجی گھٹ جانا اور سرمائے میں گھاٹا اور ٹوٹا پڑجانا۔ یہ بھی بات سمجھنے کی ہے کہ کبھی تو نقصان اور گھاٹا کی نسبت انسان کی طرف ہوتی ہے جیسے فلانے کو گھاٹا ہو گیا ہے اور کبھی فعل کی طرف جیسے بولتے ہیں کہ اس کی تجارت گھٹ گئی اور کبھی خارجی چیزوں کی طرف جیسے مال جاہ وغیرہ اور خسارہ کا استعمال بیشتر ان ہی خارجی اشیاء کے متعلق ہوتا ہے اور کبھی نفیس اور گراں قدر نعمتوں شلاً صحت عقل ایمان وجزا کی طرف خسارہ کی نسبت ہوتی ہے قرآن میں خسران مبین اسی کو کہا ہے۔

جہالت و تعصب کے نتائج

قرآن میں جا بجا یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ جہالت اور تعصب سے ایسی حالت پیدا

ہو جاتی ہے جس سے انسان کی عقل و بصیرت یک قلم معطل ہو جاتی ہے اور وہ اس قابل نہیں رہتا کہ سچائی اور حقیقت کا ادراک کر سکے۔ اللہ کا مقررہ قانون یہ ہے کہ اگر تم آنکھیں نہیں کھولو گے تو تمہارے سامنے ایک سیاہ پردہ حائل ہو جائے گا۔ اگر تم سننا نہیں چاہو گے تو کان بہروں کے کان ہو جائیں گے اگر سوچنے سے انکار کر دو گے تو عقل پر پردے پڑ جائیں گے اس کی روشنی کام نہ دے سکے گی قرآن نے انکار و اعراض کی یہ حالت بتکرار بتلائی اور ان آیات میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے۔ منکروں کی یہ حالت خود ان کی پسند کی ہوئی حالت ہے یہ قانون اللہ سبحانہ کا ہے کہ نہ دیکھنے والے کی آنکھوں پردہ پڑ جاتا ہے وہ بینا ہونے کے باوجود نابینا بن جاتا ہے لیکن پردہ اسی وقت پڑتا ہے جب دیکھنے والا دیکھنے سے انکار کر دیتا ہے۔

وہ شخص جو بینا ہو کر نابینا بن جاتا ہے اور شنوا ہو کر بہرا بن جاتا ہے اور حق کا پیغام نہ سنتا ہے اور نہ اس پر عمل کرتا ہے۔ اللہ سبحانہ اس کو اندھے اور بہرے ہونے کی حالت میں اس کو دیکھنے اور سننے کی تکلیف نہیں دیتا ہے اگر وہ ایسا کرتا تو یہ اس کا ظلم ہوتا اور ظلم کے ہر شائبہ سے اس کا ہر حکم اور ہر کام بری ہے۔

ﷺ اور اگر یہ لوگ اس کے باوجود آپ کی تکذیب کریں تو آپ کہہ دیجئے میرے لیے میرا عمل ہے اور تمہارے لیے تمہارا عمل ہے میرے عمل کے تم ذمہ دار نہیں ہو اور تمہارے عمل کا میں ذمہ دار نہیں ہوں یعنی اگر ایسے دلائل و براہین سننے کے باوجود بھی یہ لوگ آپ کی تکذیب کریں تو کہہ دیجئے کہ میں اپنا فرض ادا کر چکا ہوں تم سمجھانے پر بھی نہیں مانتے تو اب میرا اور تمہارا راستہ الگ ہے تم اپنے عمل کے ذمہ دار ہو اور میں اپنے عمل کا ہر ایک کو اس کے عمل کا ثمرہ ملے گا حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ معاذ اللہ اگر اللہ کا حکم میں غلط پہنچاؤں تو میں گنہ گار ہوں اور میں اگر سچ لاؤں تم نہ مانو تو گناہ تم پر ہے بہر حال ماننے میں کسی طرح تمہارا نقصان نہیں ہے ؎ پہلی بات سے ماضی میں ان کی تکذیب کا حال جب کھل کر سامنے آگیا تو ماضی پر حرف شرط لگا کر مستقبل میں تکذیب کے بارے میں بتایا جا رہا ہے یعنی اگر اسی تکذیب کے عمل کو تم نے مستقبل میں جاری رکھا تو سن لو کہ لی عملی ولکم عملکم میرے لیے میرا عمل اور تمہارے لیے تمہارا عمل ہے یہ اعلان متاطعہ ہے۔ مجھے میرے ہی عمل کا

ؔ افادات شیخ الاسلام

نتیجہ ملے گا اور تمہیں تمہارے ہی اعمال کا نتیجہ ملے گا۔ یہ تعبیر عربی زبان میں مشارکت کے موقع پر ضرب الامثال میں سے ہے یہ نہیں فرمایا کہ لی ما اعمل ولکم ما تعملون بلکہ دوام اور ہمیشگی کو ظاہر کرنے کے لیے فعلی تعبیر چھوڑ کر اسمی تعبیر اختیار کی ہے مطلب یہ ہے کہ تمہاری تکذیب کا کردار اس قدر گھناونا اور مکروہ ہو چکا ہے کہ چونکہ مستقبل میں تم سے اس موضوع پر خیر کی کوئی توقع نہیں ہے۔ اس لیے میری جانب سے اعلان مقاطعہ ہے اسی اعلان مشارکت کو زیادہ طاقتور بنانے کے لیے کنائی زبان میں دہرایا۔ انتم بریئون مما اعمل وانا بریئ مما تعملون یہ جملہ پہلے ہی بات کا بیان ہے۔ برأت کا اعلان نبوت کی جانب سے جھٹلانے والوں کے عذاب کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ رسول جب تک اپنی قوم کے اندر ہوتا ہے وہ اس کے لیے امان اور سپر ہوتا ہے اور جب وہ ان سے اعلان برأت کر دیتا ہے تو یہ امان اٹھ جاتی ہے اس منزل پر پہنچ کر رسول کو مومنین کو ساتھ لے کر ہجرت کا حکم ہوتا ہے۔ حضرت نوح کو مع رفقاء کے کشتی پر چڑھا کر کفار سے الگ کیا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم اسی اعلان برأت کے بعد اپنی ہجرت کا اعلان کرتے ہیں۔

ایمان سے محرومی کی وجہ

۴۲ اور اے اللہ کے رسول ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو آپ کی باتیں کان لگا کر سنتے ہیں اور آپ سمجھتے ہیں کہ یہ سن رہے ہیں لیکن فی الواقع یہ سنتے نہیں ہیں۔ تو کیا آپ ان کو بات سنائیں گے خواہ وہ بات کچھ بھی نہ سمجھتے ہوں اور ان میں کچھ ایسے ہیں جو آپ کی طرف دیکھتے ہیں اور آپ سمجھ رہے ہوں کہ یہ دیکھ رہے ہیں حالانکہ فی الواقع نہیں دیکھتے تو کیا آپ نابیناؤں کو راہ بتائیں گے خواہ ان کو کچھ بھی نہ سوجھتا ہو۔ یعنی لوگ بظاہر قرآن اور آپ کا کلام مبارک سنتے ہیں اور آپ کے معجزات وکمالات دیکھتے ہیں مگر دیکھنا سننا وہ نافع ہے جو دل کے کانوں اور دل کی آنکھوں سے ہو یہ آپ کے اختیار میں نہیں کہ آپ دل کے بہروں کو اپنی بات سنا دیں بحالیکہ وہ سخت بہرہ پن کی وجہ سے قطعاً کسی کلام کو نہ سمجھ سکتے ہوں یا دل کے اندھوں کو راہ حق دکھا دیں جب کہ انہیں کچھ بھی نہ سوجھتا ہو۔ موضح القرآن میں ہے یعنی کان رکھتے ہیں یا نگاہ کرتے ہیں اس توقع پر کہ آپ ہمارے دل پر تصرف کر دیں جب کہ بعضوں پر ہو گیا سو یہ بات اللہ سبحانہ کے ہاتھ ہے بعض مفسروں نے لا یعقلون سے مطلق عقل کی اور لا یبصرون سے بصیرت کی نفی مراد

لی ہے مطلب یہ ہے کہ ایسے اندھے بہرے جو علاوہ نہ سننے اور نہ دیکھنے کے ہر قسم کی سمجھ بوجھ سے محروم ہیں ان کو اب کس طرح سنا اور دکھا کر منور کر سکتے ہیں لہ

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں جیسے بہرے کو سنانا آپ کے بس میں نہیں ایسے ہی ان کو راہ حق پر لگا دینا بھی آپ کے قابو کی بات نہیں ہے۔ اور علامہ قرطبی لکھتے ہیں۔ اس میں مخاطبوں کی بے راہ روی پر حضور اقدس کو جو بے چینی ہو رہی ہے۔ اس پر اللہ سبحانہ آپ کو تسلی دے رہا ہے کہ معنویات میں بھی مادیات کی طرح قانون ہے ۔اگر آپ مادیات میں کسی بہرے کو سنانے پر قادر نہیں ہیں اور اندھے کو دکھا نہیں سکتے تو معنویات میں ایمان کی توفیق فراہم کر دینا بھی آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں ایک سننا تو وہ ہوتا ہے جو جانور سنتے ہیں دوسرا سننا وہ ہوتا ہے جس میں معنے کی طرف توجہ ہوا اور آمادگی بھی ہو کہ اگر بات معقول ہوئی تو مان لی جائے گی جو لوگ کسی تعصب میں مبتلا ہوں اور جنہوں نے پہلے سے فیصلہ کر لیا ہو کہ اپنے موروثی عقیدوں اور طریقوں کے خلاف اور اپنے نفس کی کی رغبتوں اور دلچسپیوں کے خلاف کوئی بات خواہ وہ کیسی ہی معقول ہو مان کر نہ دیں گے وہ سب کچھ سن کر نہیں سنتے ایسے وہ لوگ ہیں جن کی آنکھیں کھلی ہوں اور تک رہے ہوں کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے آنکھیں تو جانوروں کی بھی ہوتی ہیں اور وہ بھی آنکھوں سے دیکھنے ہی کا کام لیتے ہیں۔ اصل چیز تو دل کی آنکھوں کا کھلا ہونا ہے یہ چیز اگر کسی شخص کو حاصل نہ ہو تو وہ سب دیکھ کر بھی نہیں دیکھتا۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہو رہی ہے کہ قرآن کی دعوت سر تا سر تعقل و تفکر کی دعوت ہے جو شخص اپنے حواس و عقل سے کام نہیں لیتا وہ اس کے نزدیک انسان نہیں بدترین چارپایہ ہے۔ نیز قرآن فکر و عمل کی جس حالت کو کفر کی حالت قرار دیتا ہے اس کا سرچشمہ بھی یہی عقل و حواس کو معطل کر دینا ہے۔ جو لوگ خدا کی دی ہوئی عقل اور حواس سے کام نہیں لیتے نفس کی قوتیں اور خواہشوں سے اس درجہ مغلوب ہو جاتے ہیں کہ ذہن و ادراک معطل ہو کر رہ جائیں وہ کبھی ہدایت نہیں پا سکتے یہاں انسان کی دماغی نشقاوت کی اسی حالت کی طرف اشارہ کیا ہے جب بڑے بوڑھوں کی تقلیدی اثرات سے یا ہوائے نفس کے غلبہ سے یا ذاتی طمع و بغض سے وہ اس درجہ مغلوب ہو جاتا ہے کہ عقل و حواس کی ساری روشنیاں اس کے لیے بیکار ہو جائیں تو نبوت بھی ایسے لوگوں کے لیے سامان ہدایت بہم نہیں پہنچا سکتی۔ بظاہر ان دونوں میں مخاطب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہیں مگر روئے سخن ان لوگوں کی طرف ہے جن کی اصلاح کے آپ درپے تھے

اور اس روئے سخن کی غرض بھی محض ملامت کرنا نہیں ہے بلکہ ان کی سوئی ہوئی انسانیت کو بیدار کرنا ہے۔ یہ انداز بیان کچھ اس طرح کا ہے جیسے کوئی نیک آدمی بگڑے ہوئے لوگوں کو نصیحت کر رہا ہو۔ اس حالت میں عین اس وقت جب کہ وہ ان لوگوں کو سمجھانے میں مشغول ہو اس کا کوئی دوست اگر اس سے کہے کہ یہاں تم کن بہروں کو سنا رہے ہو اور کن اندھوں کو راستہ دکھا رہے ہو ان کے تو دلوں کے کان بند ہیں ان کے اندر کی آنکھیں اندھی ہیں۔ یہ بات کہنے سے دوست کا منشا یہ نہیں ہوتا کہ یہ نیک آدمی اصلاح کا کام چھوڑ دے بلکہ دراصل اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ شاید اس طنز اور ملامت ہی سے ان بے ہوشوں کو کچھ ہوش آجائے۔

اس موقعہ پر قاضی بیضاوی نے یہ بات بڑی پتے کی لکھی ہے کہ یہ آیات پہلی آیت میں آئے ہوئے اعلان برارت و مقاطعہ کے لیے بطور علت پیش کی گئی ہیں یعنی اعلان برارت کی وجہ یہ ہے کہ مخاطب عناد و کد میں اس قدر اندھا اور بہرا ہو چکا ہے کہ وہ ایمان لانا درکنار ایمان لانے کے وسائل کو بھی کام میں لانا گوارا نہیں کر رہا ہے۔

ایمان و کفر ارادی و اختیاری ہیں

۴۴ بلاشبہ اللہ سبحانہ انسانوں پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا ہے بلکہ لوگ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں یعنی جن کے دل میں اثر نہیں ہوتا ہے یہ ان ہی کی تقصیر ہے خود اپنی بے اعتدالیوں اور غلط کاریوں سے انہوں نے قوائے ادراک کو تباہ کیا ہے ورنہ اصل فطرت سے اللہ سبحانہ ہر آدمی کو سمجھنے اور قبول کرنے کی استعداد بخشی ہے [1] یعنی یہ حالت اس لیے پیش نہیں آئی کہ اللہ سبحانہ نے اس پر کسی کو مجبور کر دیا ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو یہ ظلم ہوتا اور اللہ سبحانہ کا یہ قانون نہیں ہے کہ کسی پر رائی برابر بھی ظلم ہو یہ تو خود انسان ہی ہے جو اللہ سبحانہ کی دی ہوئی روشنی ضائع کر کے اندھا بہرا بن جاتا ہے ورنہ اللہ نے تو سننے کے کان بھی دیے دیکھنے کے لیے آنکھیں بھی دی ہیں اور سمجھنے کے لیے دل بھی۔ اللہ نے ان نعمتوں کے دینے میں اپنی طرف کوئی بخل نہیں کیا ہے جو حق و باطل کا فرق دیکھنے اور سمجھنے کیلئے ضروری ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر اللہ سبحانہ نے ان کو استعمال کے لیے انسان کو ارادہ و اختیار بھی دیا ہے مگر لوگوں نے خواہشات کی بندگی اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دنیا کے عشق میں پڑ کر آپ ہی اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں اپنے کان بہرے کر لیے ہیں اور اپنے دل کو اس قدر مسخ کر لیا ہے کہ ارادہ و اختیار کی باگیں خواہشوں اور رغبتوں کے ہاتھ میں دے کر اچھے اور برے صحیح اور غلط کی تمیز سے محروم ہو گئے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے ایمان سے محروم ہونے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ نے ان پر ظلم کیا ہے۔ اللہ نے تو انسانوں کو بہترین صلاحیتوں سے مالا مال کیا ہے اگر وہ ان سے کام لے تو اللہ رسول کی بات اسے اپنے دل کی آواز معلوم ہو حاصل یہ ہے کہ ایمان کا معاملہ جبری نہیں بلکہ ارادی اور اختیاری ہے۔ اگر ایمان و کفر کا معاملہ اللہ کی جانب سے ارادی و اختیاری نہ ہوتا بلکہ جبری ہوتا تو یہ ظلم ہوتا۔ ایمان اور کفران دو میں سے کسی کو اختیار کرنے پر کوئی زبردستی نہیں ہے۔ عقل و تدبر اور فہم و بصیرت کا فیضان سب کے لیے ہے ایمان زبردستی کی چیز نہیں۔ یہ تو ارادی و اختیاری ہے۔ اگر یہ خدا کی جانب سے جبری ہوتا تو یہ عدل نہ ہوتا بلکہ ظلم ہوتا یعنی پھر ایمان و کفر قابل جزا اور سزا نہ ہوتے۔

تکذیب کرنے والوں کو دھمکی

۵۹ اور جس روز اللہ سبحانہ ان سب کو اپنے حضور میں جمع کرے گا ان کو ایسا محسوس ہوگا کہ گویا دنیا میں صرف ایک گھڑی ٹھہرے ہیں لوگ باہم ایک دوسرے سے متعارف ہوں گے بلاشبہ وہ لوگ گھاٹے میں رہے جنہوں نے قیامت کے آنے کی تکذیب کی اور کامیابی کے راستہ پر نہ چلے محشر میں ہولناک احوال و حوادث کو دیکھ کر عمر بھر کا عیش و آرام اس قدر حقیر و قلیل نظر آئے گا گویا دنیا میں ایک گھڑی سے زیادہ ٹھہرے ہی نہ تھے اور افسوس کریں گے کہ ساری عمر کیسی فضول اور بیکار گذری جیسے آدمی گھنٹہ دو گھنٹہ یوں ہی گپ شپ میں گذار دیتا ہے نیز وہاں کی زہر گداز مصائب کو دیکھ کر خیال کریں گے کہ گویا دنیا میں کچھ مدت قیام ہی نہ ہوا جو یہ وقت آگیا گھڑی دو گھڑی ٹھہرے اور یہاں آ پہنچے کاش کہ وہاں کی مدت قیام کچھ طویل ہوتی تو یہ دن اسقدر جلدی نہ دیکھنا پڑتا۔ بعض مفسرین نے کہا کہ برزخ و قبر میں ٹھہرنے کی مدت کو ایک گھڑی کے برابر سمجھیں گے واللہ اعلم وہاں پہچانیں گے تو مگر کچھ مدد نہ کر سکیں گے۔ نفسی نفسی پڑی ہوگی بھائی بھائی اور بیٹا باپ کے کام نہ آئے گا فلا انساب بینھم یومئذ ولا یتساء لون اور یوم یفر المرء من اخیہ و امہ و ابیہ و صاحبتہ و بنیہ۔ اس دن ناکام اور گھاٹے میں اللہ سے ملنے کی تکذیب کرنے والے ہوں گے باقی جنہوں نے اللہ کی تصدیق کی

اور سیدھی راہ پر چلے وہ سر تا سر فائدے ہیں ہیں [1]

آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ آخرت کی زندگی جب انسان پر طاری ہو گی تو وہ تمام مدت جو مرنے کے بعد سے لے کر نشأۃ ثانیہ تک گذرتی ہے اسے ایسی محسوس ہو گی جیسے ایک بہت ہی قلیل مدت کا درمیانی وقفہ گذرا ہو۔ اس حالت کی مثال یوں سمجھو جیسے کبھی دن میں سو کر تم اٹھتے ہو اور یوں سمجھتے ہو کہ ذرا سا سوئے ہیں۔ یہ حقیقت قرآن میں مختلف تعبیرات میں بیان کی ہے اور سب کا ماحصل یہ ہے کہ وہ عظیم مدت جو انسان پر مرنے کے بعد گذرے گی اس دن بہت ہی قلیل محسوس ہو گی سورہ روم میں ہے مالبثوا غیر ساعۃ اور سورۂ احقاف میں ہے لم یلبثوا الا ساعۃ من نہار اور سورہ نازعات دن کے اوقات کی بھی نشاندہی کی ہے لم یلبثوا الا عشیۃ او ضحاھا۔ سورہ روم کی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کا سب کہہ گا مگر اہل علم و ایماں کے دلوں میں یوم آخرت کا یقین تھا اسلئے اس احساس سے مغلوب نہ ہوں گے وہ جان لیں گے کہ یہ تمام مدت جو گذر چکی ہے دنیوی زندگی اور آخروی زندگی کی درمیانی مدت تھی اور اب قیامت کا دن سامنے ہے۔ شارحین قرآن کے دونوں خیال ہیں یہ بھی کہ اٹھنے کے بعد دنیا کی زندگی قلیل ہو گی اور یہ بھی کہ اٹھنے کے بعد قبر میں رہنے کی مدت قلیل محسوس نہیں ہو گی۔ ابن کثیر نے پہلی کو اور قرطبی نے دوسری کو بیضاوی نے دونوں کو اپنایا ہے۔ علامہ آلوسی نے یہاں مفید بحث کی ہے۔ اور علامہ ابو حیان نے جملہ کے اعرابی مقام پر طویل بحث کی ہے۔ اکثر شارحین قرآن کا میلان دنیا کی زندگی کی طرف ہے مطلب یہ ہے کہ جب ایک طرف آخرت کی ناپیدا کنار زندگی ان کے سامنے ہو گی اور دوسری طرف اپنی دنیا میں گذاری ہوئی زندگی کو دیکھیں گے تو ان کو مستقبل کے مقابلہ میں اپنا ماضی حقیر معلوم ہو گا۔ لیکن پہلا مطلب زیادہ واضح اور صاف ہے اور ساعۃ من نہار کے زیادہ مطابق ہے۔

حشر جسمانی ہو گا نہ کہ روحانی

قیامت کے متعلق ان آیات پر غور کرو۔
اذا متنا و کنا ترابا ذالک رجع بعید۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

"کیا ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے یہ لوٹنا تو بعید از عقل ہے"۔

"ءاذا کنا عظاما و رفاتا ءانا لمبعوثون خلقا جدیدا"۔

"کیا جب ہم ہڈی اور چورا ہو جائیں گے تو پھر نئے بنا کر اٹھائے جائیں گے"۔

"من یحیی العظام وھی رمیم"

بھربھری ہڈیوں میں جان کون ڈالے گا۔

یہ آیات بتاتی ہیں کہ حضور کے مخاطبوں کو حیرت اور تعجب ہے کہ کیا ہمارا یہ جسم مر کر پھر جیئے گا۔ کیا ان سڑی گلی ہڈیوں میں دوبارہ جان پڑے گی اور قبروں سے نکل کر پھر اٹھ کھڑے ہوں گے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جسمانی زندگی کے علاوہ زندگی کا کوئی دوسرا مفہوم ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہ تھا اس لیے جو بات ان کو بتائی جا رہی تھی اس کا تعلق ان کی جسمانی زندگی سے ہے۔

بات یہ ہے کہ ہم ان ہی باتوں کو سمجھ سکتے ہیں جن کی مثالیں اور نظیریں اس مادی دنیا میں ہماری نگاہوں سے گذرتی رہتی ہیں اور وہ عالم جو نگاہوں سے مستور ہے اس کی باتوں کو اس طرح سمجھنا کہ ہر سوال اور تکرار سوال سے ہم بے نیاز ہو جائیں تقریباً ناممکن ہے ان کے متعلق جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس دیدہ شہرستان وجود یعنی دنیا کے قیاس پر اس نادیدہ شہر بقا یعنی آخرت کا ہر نقشہ اور خاکہ بنایا اور سمجھایا جائے قرآن کی تعلیم نے بھی کام کیا ہے۔

وَ اِمَّا

نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ

ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ ﴿٤٦﴾ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ
فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا
يُظْلَمُوْنَ ﴿٤٧﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ﴿٤٨﴾ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا
شَآءَ اللّٰهُ ۭ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۭ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ
سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿٤٩﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ
عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٥٠﴾ اَثُمَّ
اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ۭ اٰۗلْئٰنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿٥١﴾
ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ
اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿٥٢﴾

اور اگر ہم آپ کو کچھ وہ باتیں جن کا ہم ان سے وعدہ کر رہے ہیں دکھلا دیں یا ان کے ظہور سے پہلے آپ کا وقت پورا کر دیں۔ خواہ کچھ ہو بہر حال ان کو ہمارے حضور پیش ہونا اور یہ جو کچھ کر رہے ہیں اس پر اللہ گواہ ہے۔ اور ہر امت کے

لیے ایک رسول ہے پھر جب کسی امت میں رسول آجاتا ہے
توان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور
ان پر ظلم نہیں کیا جاتا ہے [۶۱] اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے
ہو یہ عذاب کی دھمکی والی بات کب واقع ہو گی [۶۲] آپ فرما
دیجئے کہ اللہ سبحانہ کی مشیت سے الگ ہو کر مجھے تو اپنے
نفع ونقصان پر بھی قابو نہیں ہے وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہتا
ہے ہر امت کے لیے ایک وقت مقرر ہے جب وہ وقت
آجاتا ہے تو پھر نہ تو وہ ایک گھڑی پیچھے ہو سکتے ہیں اور نہ
آگے [۶۳] اے اللہ کے رسول آپ ان سے کہہ دیجئے بتاؤ
تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر وہ عذاب رات کو یا دن کو آ
جائے تو جرائم پیشہ لوگ جلدی میں کیا کرلیں گے [۶۴] کیا جب
عذاب آجائے گا تم مان جاؤ گے۔ اس وقت ماننا بے سود
ہو گا اس وقت کہا جائے گا اب تم نے ماننا ہے اور تم اسی
عذاب کی طلب کی جلد بازی کرتے تھے۔ ہر ظلم کار ون سے کہا
جائے گا اب دائمی عذاب کا مزہ چکھو صرف تمہیں تمہارے

اعمال کا بدلہ دیا جائے گا[۶۵]

مفردات کے معانی

نتوفینك۔ یہ توفی باب تفعل سے مضارع کا جمع متکلم ہے توفی کے معنے اصل میں کسی چیز کو پورا لینے کے ہیں۔ توفی باب تفعل ہے اور باب تفعل کی خاصیت باب تفعیل کی اثر پذیری اور مطاوعت ہے تکسرتہ فتکسر لیتے توڑ دیا وہ ٹوٹ گیا ارباب لغت نے تصریح کی ہے کہ وفا ثلاثی مجرد سے ثلاثی مزید توفی آیا ہے وہ اسی غرض کے لیے ہے اب دیکھنا چاہیے کہ مجرد میں اس کے حقیقی معنے کیا ہیں۔ کیونکہ علم صرف کا مسلمہ قانون یہ ہے کہ مجرد کو مزید کے کسی وزن پر بھی نقل کیا جائے اس میں مجرد کے اصلی معنی بہر نوع ملحوظ ہوں گے واضح رہے کہ مجرد ہو یا مزید سب کا مادہ اشتقاق وفار ہے جس کے معنی ہیں پورا ہونا اور پورا کرنا مجرد میں یہ اسی معنے میں باب ضرب سے آتا ہے۔ اور مصدر وفار اور وفی ہے۔ وعدہ کے متعلق وفا اور غدر بولے جاتے ہیں یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں۔ اب جتنے بھی وزن مزید کے اس سے آتے ہیں توفیۃ باب تفعیل۔ ایفاء باب افعال موافاۃ باب مفاعلہ توافی باب تفاعل اور توفی باب تفعل استیفار باب استفعال سب میں یہ معنی ملحوظ رہیں گے۔ امام راغب توفیۃ کے متعلق لکھتے ہیں توفیۃ الشی بذلہ وافیاً کسی چیز کا پورے طور پر صرف کرنا۔ قرآن عزیز میں جہاں بھی توفیہ آیا ہے پورا دینے اور پورا کرنے کے معنی میں ہے۔ اب غور کیجیے کہ باب تفعل کی خاصیت باب تفعیل کی مطاوعت ہے اور تمام اہل لغت کی تصریح کے مطابق یہاں مجرد کو باب تفعل میں اسی غرض کے لیے استعمال کیا گیا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ جس طرح تعلیم کے معنے سکھانا اور تعلم کے معنے ہیں سیکھنا یعنی اس کا اثر قبول کرنا۔ اسی طرح توفیۃ کے معنے پورا دینا اور توفی کے معنی اس کی اثر پذیری کے اعتبار سے پورا لینے اور پورا ہونے کے ہیں۔ اس لیے موت اور نیند کے لیے جو توفی کا لفظ آتا ہے وہ اسی اعتبار سے ہے کہ ان دونوں حالتوں میں اس کی روح قبض کی جاتی ہے ورنہ توفی کے معنی حقیقۃً "موت کے نہیں ہیں۔

امتوں کیلئے قانون تاجیل

ان آیات میں فکر انسانی کی جس گمراہی کو ماذا یستعجل منہ المجرمون سے تعبیر کیا گیا ہے وہ صرف ان ہی مکذبین کی گمراہی نہ تھی جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب تھے بلکہ ہر زمانے میں اور ہر نبوت کے مخاطبوں میں انسان کی ایک عالمگیر کج اندیشی رہی ہے وہ بسااوقات اللہ سبحانہ کی اس مہلت بخشی سے فائدہ اٹھانے کی جگہ اور زیادہ شر و فساد میں جری اور بے باک ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر فی الواقع حق و باطل کے عواقب و نتائج کا قانون ہے تو وہ کب ہے متی ھذا الوعد ان کنتم صادقین اور فوراً کیوں ظاہر نہیں ہوتے قرآن نے جابجا نبوت کے مخاطبوں کا یہ خیال نقل کیا ہے اور بتایا ہے کہ اگر یہاں امتوں کے لیے تاجیل اور مہلت بخشی کا قانون نہ ہوتا اور اس کا تقاضا یہی ہے کہ حق کی طرح باطل کو زندگی و معیشت کی مہلتیں ملیں اور توبہ و رجوع اور عفو و درگذر کا دروازہ ہر حال میں کھلا رہے۔

جس طرح اللہ سبحانہ نے کائنات کے تمام کاموں میں تدریج و امہال کا قانون نافذ کیا ہے اسی طرح امتوں اور جماعتوں کے معاملہ میں بھی قانون کام کر رہا ہے جو کچھ ہونا ہے بتدریج ہوتا ہے اور اصلاح و درستگی اور رجوع و انابت کا دروازہ آخر وقت تک کھلا رہتا ہے۔ دعوت حق کی فتح مندیوں اور منکروں کی نامرادیوں کا جو قانون بنایا گیا ہے اس کا رسول کی موجودگی اور عدم موجودگی سے کوئی تعلق نہیں ہے جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہیگا خواہ رسول کی زندگی میں یا رسول کے وصال کے بعد، مو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ قانون کا مدار رسول کی زندگی پر ہے آپ نہ ہوں گے تو کچھ نہ ہوگا آپ دنیا میں ہوں یا نہ ہوں قانون کو پورا ہو کر رہنا ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

نکتہ اور اگر ہم آپ کو کچھ وہ باتیں جن کا ہم ان سے وعدہ کر رہے ہیں دکھلا دیں یا ان کے ظہور سے پہلے آپ کو پورا پورا لے لیں خواہ کچھ ہو ان کو بہر حال ہمارے حضور پیش ہونا ہے اور وہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ اس پر گواہ ہے یعنی ہم نے کفار کو عذاب دینے اور اسلام کو غالب و منصور کرنے کے جو وعدے کئے ہیں خواہ ان میں سے بعض وعدے کسی حد تک آپ کی موجودگی میں پورا کر کے دکھلا دیں جیسے بدر وغیرہ میں دکھا دیا گیا یا آپ کی وفات ہو

جائے اس لیے آپ کے سامنے ان میں سے بعض کا ظہور نہ ہو۔ بہر صورت یہ یقینی ہے کہ وہ سب پورے ہو کر رہیں گے اگر کسی مصلحت سے دنیا میں ان کفار کو سزا نہ دی گئی تو آخرت میں ملے گی۔ ہم سے بچ کر کہاں بھاگ سکتے ہیں۔ سب کو ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے اور ان کے تمام اعمال ہمارے سامنے ہیں حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ غلبہ اسلام کچھ حضرت کے روبرو ہوا اور باقی آپ کی وفات کے بعد خلفا کے ہاتھوں سے گویا نتوفینک میں اس طرف اشارہ ہے [1]

آیت میں اصلاً تو مخالفوں کی نامرادی، ناکامی کی خبر دی گئی ہے اور ضمناً نبوت کی فتح مندی اور کامیابی کی بشارت سنائی گئی ہے۔ ایک آیت کا منطوق ہے اور دوسرا آیت کا مدلول ہے اور مدلول کی حیثیت بھی تضمن کی نہیں بلکہ لزوم کی ہے کیونکہ مخالفوں کی ناکامیوں اور نامرادیوں کا لازمی نتیجہ نبوت کی فتح مندی ہے۔

رسول کے مخاطبوں کی ہلاکت اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک آیات ہدایت سے قوم کے تمام صالح اجزا اس کے فاسد عنصر سے الگ نہیں ہو جاتے اور مومنین و کافرین ایک دوسرے سے پھٹ کر جدا نہیں ہو جاتے اور رسول کو بقیہ عناصر کے ایمان سے قطعی مایوسی نہیں ہو جاتی اسی علیحدگی کا پہلی آیت میں لی عملی و لکم عملکم انتم بریئون مما اعمل وانا بریئ مما تعملون میں اعلان ہوا ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں قریش کو ۱۳ سال تک دعوت دی اور ان تیرہ سالوں میں اس راہ میں ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف برداشت کی اور آخر وہ وقت آیا جو اپنے رسولوں کے سامنے دوسری قوموں پر آچکا تھا یعنی قبیلہ قریش میں سے وہ افراد صالحہ جو بے خوف و خطر حق کو قبول کر سکتے تھے انہوں نے حق کو قبول کر لیا اور صرف وہ رؤسائے قریش رہ گئے جو قبول حق کی بالکل صلاحیت نہ رکھتے تھے یا وہ ضعفا تھے جو ان رؤسا کی موجودگی میں حق کا ساتھ دینے کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور اس لیے ضرورت ہوئی کہ ان رؤسا کے وجود سے ارض حرم کو پاک کیا جائے۔ چنانچہ گذشتہ قوموں کے قانون کے پورے ہونے کے دن آگئے یعنی رسول اور مومنین کو گنہ گار اور مجرموں کی آبادی کے اندر سے نکل جانے کی اجازت ملی۔ جس طرح دوسری قوموں کے لیے مختلف معجزات ہلاکت رہے اسی طرح قریش کے لیے غزوہ بدر معجزہ عذاب تھا۔ قرآن نے بدر کو البطشۃ الکبری

[1]

کہا ہے اور یہ قریش کے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے فرعون کیلئے بحر کی حیثیت تھی جب غزوہ بدر کے لیے آپ مسلمانوں کو ساتھ لے کر نکلے تو اس وقت جیسا کہ آپ نویں اور دسویں جلد میں پڑھ چکے ہیں مسلمانوں کے سامنے قریش کی دو جمعیتیں تھیں نہیں ایک قریش کا شامی قافلہ جو مدینہ کی راہ سے گذر کر مکہ جارہا تھا دوسرا دوسا ئے قریش کا جنگی لشکر جو مسلمانوں سے لڑنے آیا تھا۔ اللہ سبحانہ نے مسلمانوں سے وعدہ کیا تھا کہ ان دو جمعیتوں میں سے ایک ان کے ہاتھ لگے گی۔ عام مسلمان یہی سمجھتے تھے کہ تجارتی قافلہ ان کے ہاتھ لگے گا لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ آج معمولی فتح و شکست کا دن نہیں بلکہ اس بطشہ کبریٰ کا دن ہے جس کا بارگاہ الٰہی سے مکہ ہی میں وعدہ تھا۔ سورۂ انفال میں بدر کے تمام واقعات کا ذکر ہے اس میں اللہ سبحانہ نے ظاہر کر دیا ہے کہ یہی وہ فیصلہ کا دن تھا جس کا مدت سے انتظار تھا بدر کا واقعہ بتا کر قرآن میں ہے۔

کذاب ال فرعون والذین من قبلھم کفروا بایات اللہ فاخذھم اللہ بذنوبھم۔

یہ تشبیہ یہی بتانے کے لیے کہ یہ بدر میں اللہ کی سنت کے مطابق ہوا ہے اور اس لیے ہوا ہے لیقضی اللہ امراً کان مفعولا۔ یہ قریش کی وہ ہلاکت ہے جو آپ کی زندگی میں ہوئی۔ رہی سہی کسر فتح مکہ نے پوری کر دی۔

محیر العقول معجزہ

آیئے تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھ لیجئے۔ تفصیل کا موقعہ نہیں صرف دو شہادتوں پر اکتفا کرتا ہوں۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ لکھتے ہیں:

چند محلوں پر مشتمل شہری حکومت سے جو آغاز ہوا ہے وہ روزانہ دو سو چوہتر سے بھی زیادہ مربع میل کے اوسط سے وسعت اختیار کرتی ہے اور دس سال میں جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال مبارک ہوا تو دس لاکھ سے بھی زیادہ مربع میل کا رقبہ آپ کے زیر اقتدار آچکا تھا۔ یہ ہندوستان کے برابر وسیع علاقہ جس میں یقیناً ملیتون آبادی تھی۔

ڈاکٹر فلپ ہٹی اپنی تاریخ عرب میں لکھتا ہے۔

اگر کوئی شخص ساتویں صدی عیسوی کے ثلث اول میں ایسی پیشین گوئی کی جسارت کرتا کہ دس سال کے اندر اندر عرب کی سراسر غیر متمدن اور غیر متعارف سرزمین سے ایک نادیدہ قوت کا ظہور ہونے والا ہے جو وقت کی دو عالمی طاقتوں سے ٹکرا جائے گی ایک طرف ساسانیوں کی پوری میراث سنبھال لے گی اور دوسری طرف بیز نطینیوں کے بہترین صوبوں پر قبضہ جما لے گی تو لاریب اسے پاگل قرار دیا جاتا۔ لیکن یہی صورت حال پیش آئی۔ رسول اللہ کی وفات کے بعد عرب کی بنجر اور بے آب زمین جادو کی چھڑی سے ایسے سورماؤں کی پرورش گاہ بن گئی جن کی مثال کمیت و کیفیت دونوں کے اعتبار سے کسی دوسری جگہ بہت مشکل ہے۔

یہ ایک مسیحی کے الفاظ ہیں جو اصلاً شامی ہے لیکن عرصہ دراز سے امریکہ میں متوطن ہے۔ عربی مصادر کے تحقیقی مطالعہ کے بعد اس نے جو رائے قائم کی۔ وہ بے کم و کاست پیش کر دی۔

پھر اس آیت میں آپ کی زندگی اور آپ کے وصال مبارک کے بعد غلبہ اسلام اور دشمنان اسلام کی ہلاکت کی اس میں انذار و تبشیر ملی گئی اس انذار و تبشیر کے دونوں پہلو ہیں۔ البقاعی نے خوب تشریح کی ہے کہ

> ہم آپ کو آپ کی وفات سے پہلے دنیا میں کچھ اپنے وعدوں کی وہ جھلک دکھائیں گے جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی اور آپ کی وفات کے بعد آخرت میں آپ کو آپ کے مخالفین کا وہ انجام دکھائیں گے جس سے آپ کا دل خوش ہو جائے گا۔

اس طرح بقول بقاعی آیت قرآنی میں صفت احتباک پیدا ہو گئی ہے۔

قضاء بالحق کا ضابطہ

۴۷ اور ہر امت کے لیے ایک رسول ہے پھر جب کسی امت میں رسول آجاتا ہے تو ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور ان کو ظلم کا نشانہ نہیں بنایا جاتا ہے پہلے اس امت اور اس کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر تھا اب عام اقوام و امم کا ضابطہ بتلاتے ہیں کہ ہر جماعت اور فرقہ کے پاس اللہ سبحانہ کے احکام پہنچانے والے بھیجے گئے ہیں جنکو رسول کہتے ہیں تاکہ حجت تمام ہو اتمام حجت سے پہلے کسی کو عذاب نہیں دیا جاتا۔ لوگ عمل پہلے سے کرتے ہیں مگر دنیا میں ان کو سزا رسول روانہ کرنے کے بعد دی جاتی ہے اللہ سبحانہ

کے یہاں یہ ظلم اور اندھیر نہیں ہے کہ بدوں پیشتر آگاہ کرنے اور ملزم ثابت ہونے کے مجرموں کو فیصلہ سنا دیا جائے۔ قیامت میں بھی باقاعدہ پیشی ہوگی فرد جرم لگائی جائے گی۔ گواہ پیش ہوں گے۔ ہر قوم کے ساتھ ان کے پیغمبر ہوں گے۔ ان کے بیانات کے بعد نہایت انصاف سے فیصلہ ہوگا۔ واشرقت الارض بنور ربها ووضع الكتاب وجيء بالنبيين والشهداء وقضي بينهم بالحق وهم لا يظلمون مجاہد وغیرہ نے آیت کو قیامت کے احوال پر محمول کیا ہے[1] حافظ ابن جریر، حافظ ابن کثیر اور علامہ قرطبی نے امام مجاہد کی رائے کو اپنا کر آیت کو احوال قیامت سے متعلق بتایا ہے علامہ آلوسی نے بھی اسی کو راجح قرار دیا ہے جب کہ ابوحیان اندلسی نے البحر المحیط میں قاضی بیضاوی نے انوار التنزیل میں اور امام رازی نے مفاتیح الغیب میں وہی مطلب بتایا ہے جو شیخ الاسلام نے افادات میں اختیار کیا ہے۔ اور واقع بھی یہ ہے کہ حال میں حضور اقدس کی قوم کا حال بیان کرنے کے بعد بتانا ضروری ہے کہ جو کچھ اب ہو رہا ہے وہ تمہارے ساتھ مخصوص نہیں ہے اللہ کا قانون ایک ہے ماضی میں بھی رسول آتے رہے ہیں ان کی امتیں بھی تکذیب کرتی رہی ہیں اور تکذیب کے نتائج سے اسی طرح دوچار ہوئی ہیں جس طرح حضور اقدس کے مخاطب دوچار ہوں گے۔ نہ ان پر ماضی میں ظلم ہوا ہے اور نہ تم پر ظلم ہوگا یعنی اللہ سبحانہ کا قانون یہ ہے کہ جب کسی قوم کی ہدایت کے لیے اس کا رسول ظاہر ہوا اور لوگوں نے چاہا کہ ظلم وتشدد کے ذریعے اس کی دعوت روک دیں تو اللہ سبحانہ نے ان دونوں فریقوں کے درمیان فیصلہ کر دیا ہے یعنی حق فتح مند ہوتا ہے باطل کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے اسی کا نام قانون قضا بالحق ہے۔ کیا قضا بالحق کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر باطل عمل فوراً نابود ہو جائے اور ہر عمل حق فوراً فتح مند ہو جائے نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ہے جیسے موجبات میں قانون تدریج وامہال کام کر رہا ہے ایسے ہی معنویات میں بھی تدریج وامہال کا قانون کام کر رہا ہے جس طرح اجسام کے ہر تغیر کے لیے اللہ سبحانہ نے اسباب وعلل کی ایک خاص مقدار اور مدت مقرر کر دی اسی طرح اقوام اور امتوں کی ہلاکت اور تباہی کے لیے بھی موجبات ہلاکت کی ایک خاص مقدار اور مدت مقرر ہے اور یہ انکی اجل ہے جب تک یہ اجل نہیں آجاتی قانون الٰہی انہیں تنبہ واعتبار کی مہلتیں دیتا رہتا ہے۔

---

[1] ے

اولا یرون انھم یفتنون فی کل عام مرۃ او مرتین ثم لا یتوبون ولا ھم یذکرون۔

کیا لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ ان پر کوئی برس ایسا نہیں گذرتا کہ ہم انہیں ایک بار یا دو بار آزمائشوں میں نہ ڈالتے ہوں پھر بھی یہ توبہ نہیں کرتے اور حالات سے نصیحت یاب نہیں ہوتے ہیں۔

لیکن اگر تنبیہ کی یہ تمام مہلتیں رائگاں گئیں اور ان سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا تو پھر فیصلہ امر کا آخری وقت نمودار ہو جاتا ہے اور جب وہ آجاتا ہے تو پھر یہ اللہ سبحانہ کا آخری اور اٹل فیصلہ ہوتا ہے نہ اس میں ایک لمحہ کی تاخیر ہو سکتی ہے اور نہ یہ اپنے وقت مقررہ سے ایک لمحہ پہلے ہوتا ہے۔

عذاب الٰہی کا مطالبہ

۴۸ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو یہ عذاب کی دھمکی والی بات کب واقع ہو گی یعنی عذاب آنے کی جو دھمکیاں دیتے ہو محض جھوٹ اور بے اصل ہے اگر تم واقعی سچے ہو تو لے کیوں نہیں آتے ہو آخر یہ وعدہ کب پورا ہو گا[1] اللہ سبحانہ کی اس مہلت بخشی سے فائدہ اٹھانے کی جگہ اور زیادہ شر و فساد میں نڈر اور جری ہو کر کہتے ہیں کہ اگر فی الحقیقت حق و باطل کے لیے ان کے نتائج و عواقب ہیں تو وہ نتائج کہاں ہیں اور کیوں فوراً ظاہر نہیں ہوتے قرآن نے جا بجا مکذبین کا یہ خیال نقل کیا ہے۔

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ اس قدر مہلت کیوں دی جاتی ہے جو بار بار مطالبہ کی نوبت آتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ جس طرح عالم اجسام میں اللہ سبحانہ نے ہر کمزوری و فساد کے لیے ایک لازمی نتیجہ ٹھہرا دیا ہے لیکن پھر اصلاح حال کا دروازہ کھلا رہتا ہے اور مہلتوں پر مہلتیں ملتی رہتی ہیں اگر بروقت اصلاح ظہور میں آجائے تو اسے قبول کر لیا جاتا ہے ٹھیک اسی طرح یہاں بھی اس نے توبہ و انابت کا دروازہ کھلا رکھا ہے کوئی بدعملی کوئی گناہ کوئی جرم کوئی فساد ہو اور اپنی نوعیت میں کتنا ہی سخت اور اپنی مقدار میں کتنا ہی عظیم ہو لیکن یوں ہی افراد میں توبہ

[1] افادات شیخ الاسلام

وانابت کا احساس جنبش میں آتا ہے رحمت حق قبولیت کا دروازہ کھول دیتی ہے اور اشک ندامت کا ایک قطرہ بدعملیوں گناہوں کے بے شمار داغ دھبے اس طرح دھو دیتا ہے گویا اس کے دامن عمل پر کوئی گناہ کا دھبہ ہی نہیں تھا۔ چنانچہ اس مطالبہ کا جواب اللہ سبحانہ نے زبان نبوت میں دیا ہے۔

عذاب کے مطالبہ کا جواب

۴۹ آپ فرما دیجیے کہ اللہ سبحانہ کی مشیت سے الگ ہو کر مجھے تو اپنے نفع اور نقصان پر بھی قابو نہیں ہے وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے ہر امت کے لیے ایک وقت مقرر ہے جب وہ وقت آجاتا ہے تو پھر نہ تو ایک گھڑی پیچھے رہ سکتے ہیں اور نہ آگے۔ یعنی عذاب وغیرہ پہنچانا اللہ سبحانہ کا کام میرے قبضہ و اختیار میں نہیں ہیں خود اپنے نفع ونقصان کا مرف اسقدر مالک ہوں جتنا اللہ چاہے پھر دوسروں پر بھلائی و برائی وارد کرنے کا مستقل اختیار مجھے کہاں سے ہو سکتا ہے۔ ہر قوم کی ایک مدت اور میعاد اللہ کے علم میں مقرر ہے جب میعاد پوری ہو کر اس کا وقت آپہنچے گا ایک سیکنڈ کا تخلف نہ ہو سکے گا۔ غرض عذاب کے لیے جلدی مچانے سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔ اللہ سبحانہ کے علم میں جو وقت طے شدہ ہے اس سے ایک منٹ آگے پیچھے نہیں سرک سکتے زمخشری کے نزدیک لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون اس سے کنایہ ہے کہ عذاب کا اپنے وقت پر آنا اٹل ہے۔ کنایہ میں حقیقت تقدیم وتاخیر کا نفیاً یا اثباتاً اٹھانا اعتبار نہیں[1]

یہاں متی ھذا الوعد کے دو جواب دیئے ہیں۔ ایک واقعاتی دوسرا اصولی واقعاتی جواب میں مخاطبوں کے اس غلط عقیدے کی اصلاح کی گئی ہے کہ نبی و رسول براہ راست عالم کائنات میں تصرف کر سکتا ہے وہ دانائے غیب اور مختار کل ہوتا ہے چنانچہ موجودہ انجیل کے مصنفوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جس طریقہ سے پیش کیا ہے اس نے عیسائیوں کے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا ہے کہ تمام کائنات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قبضہ قدرت میں تھی وہ اس میں جس طرح چاہتے تھے تصرف کر سکتے تھے۔ یہی وہ بنیادی بہتر ہے جس پر انجیل کے مصنفوں نے پورے دین کی دیوار کج کھڑی کی ہے اور اسی کے نتیجے میں تثلیث اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کفار جیسے عقائد پیدا ہو گئے۔
قرآن عزیز نے نہایت شدت اور اصرار سے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ سبحانہ کی مشیت اور ارادہ سے ہوتا ہے پیغمبر کے ارادے، تصرف اور مشیت کو اس میں ذرا بھی دخل نہیں ہوتا ہے اسی غلط عقیدے کی اصلاح یہ کہہ کر فرمائی کہ قل لا املک الخ آپ اعلان کر دیجئے کہ اللہ کی مشیت ہی کائنات میں کار فرما ہے اس کی مشیت سے الگ ہو کر تو میں خود اپنے نفع و نقصان کی بھی قدرت نہیں رکھتا ہوں یہ بات کہ یہ کب ہو گا کہ یہ اللہ سبحانہ کی بات تھی جو میں نے تمہیں سنا دی رہا یہ امر کہ یہ بات کب واقع ہو گی تو نہ تو میں غیب جانتا ہوں اور نہ خود اپنے معاملے میں کسی نقصان یا نفع پر اختیار رکھتا ہوں یعنی نہ میں دانائے غیب داں اور نہ مختار کل۔ یہ چیز اللہ سبحانہ کے قبضہ و اختیار میں ہے۔

انجیل میں حضرت عیسیٰ کے معجزات جس عبارت اور لب و لہجہ میں پیش کئے گئے ہیں ان کا صاف منشا یہ ہے کہ گویا حضرت عیسیٰ کو تمام کائنات کی بادشاہی سپرد کی گئی ہے اس لیے وہ خاص اپنے ارادہ و اختیار سے جو چاہتے تھے کرتے تھے لیکن قرآن عزیز فکر کی اس گمراہی کو تسلیم نہیں کرتا ہے اس نے حضرت عیسیٰ کے معجزات کو قرآن میں بیان کیا ہے مگر اس عقیدہ باطلہ کی تردید کی ہے۔ یہاں قرآن نے اپنی مخاطبوں کے فکر کی اسی گمراہی کی اصلاح کی ہے کہ اے پیغمبر اعلان کر دو لا املك لنفسى ضرا ولا نفعا۔ یعنی میں نے کب کہا تھا کہ یہ فیصلہ میں کروں گا اور نہ ماننے والوں کو میں عذاب دوں گا اس لیے مجھ سے کیوں پوچھتے ہو کہ یہ دھمکی کب پوری ہو گی۔ دھمکی تو اللہ نے دی ہے وہی فیصلہ کرے گا۔ اور اسی کے اختیار میں ہے کہ فیصلہ کب کرے اور کس صورت میں اس کو تمہارے سامنے لائے۔
قرآن عزیز کی اسی تعلیم کا اثر ہے کہ عیسائیت کی طرح اسلام میں توحید و نبوت کی حقیقتیں ہمیشہ ممتاز رہی ہیں۔ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں الوہیت کا ادنیٰ شائبہ بھی مسلمانوں نے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اہل تشیع اور مسلمانوں کو ان فرقوں کو چھوڑ کر جن کی تخلیق ہی جذباتی ہے مسلمانوں میں اس فکری گمراہی کو پہنچنے کا موقعہ نہیں ملا ہے۔

مخاطبوں کو نبوت کا اصولی جواب

اصولی جواب یہ دیا ہے کہ لکل امة اجل یعنی اللہ کا قانون یہ ہے کہ اپنا پیغام

پہنچانے کے بعد وہ گروہ اور قوم کو اس کی اجتماعی حیثیت کے مطابق سوچنے سمجھنے اور سنبھلنے کے لیے کافی مہلت دیتا ہے۔ اور اس بات کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ کہ کس کو کس قدر مہلت ملنی چاہیے جب وہ مہلت جو سراسر انصاف کے ساتھ اس کے لیے رکھی گئی تھی پوری ہو جاتی ہے اور وہ جماعت اپنی باغیانہ روش سے باز نہیں آتی تب اللہ تعالیٰ اس پر اپنا فیصلہ نافذ کر دیتا ہے یہ فیصلہ اللہ سبحانہ کا قانون مدت سے نہ ایک گھڑی پہلے آسکتا ہے اور نہ وقت آنے کے بعد ایک لمحہ ٹل سکتا ہے۔ یہی اللہ سبحانہ قانون تاجیل ہے یعنی جس طرح مادیات میں ہر حالت بتدریج نشو و نما پاتی ہے اور نتیجہ ظاہر ہونے کے لیے ایک خاص مقدار ایک خاص مدت اور ایک خاص وقت مقرر کر دیا گیا ہے ٹھیک اسی طرح اعمال کے نتائج کے لیے بھی مقدار و اوقات کے احکام مقرر ہیں اور ہر نتیجہ ایک خاص مدت اور ایک خاص مقدار کی نشو و نما کے بعد ظہور میں آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس تدریج سے حق اور باطل دونوں کے لیے ایک اجل مقرر ہوگئی۔ یعنی دونوں کے نتائج یکبارگی ظاہر نہیں ہوتے ہیں۔ اپنی مقررہ مدت پر ظاہر ہوتے ہیں۔ البتہ حق سے وابستہ جماعتوں کے لیے تاجیل اس لیے ہوتی ہے تاکہ اس کی فاتحانہ قوتیں نمودار ہوں اور باطل پسند جماعتوں کے تاجیل اس لیے ہوتی ہے تاکہ ان کی فنا پذیری درجہ کمال کو پہنچ جائے اس تاجیل کے لیے کوئی ایک ہی مدت مقرر نہیں ہے ہر حالت کا ایک خاصہ ہے اور ہر ماحول اپنا ایک خاص مزاج رکھتا ہے ممکن ہے کہ ایک خاص حالت کے لیے مقررہ مدت تھوڑی ہو اور ہو سکتا ہے کہ زیادہ ہو۔

ایمان کیلئے وقت کب ملے گا

۵۰ اے اللہ کے رسول آپ ان سے کہہ دیجئے کہ بتاؤ کہ تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر وہ عذاب رات کو یا دن کو جائے تو جرائم پیشہ جلدی میں کیا کر لیں گے یعنی رات کو سوتے ہوئے یا دن میں جب دنیا کے دھندوں میں مشغول ہو۔ اگر اچانک اللہ سبحانہ کا عذاب آجائے تو مجرم جلدی کر کے کیا بچاؤ کر سکیں گے جب بچاؤ نہیں کر سکتے پھر وقت پوچھنے سے کیا فائدہ مترجم رحمہ اللہ نے ماذا یستعجل منه المجرمون کا ترجمہ حضرت شاہ صاحب کے مذاق کے مطابق کیا ہے عموماً مفسرین نے یہ مطلب لیا ہے کہ عذاب الٰہی کے آنے میں

کون سی ایسی خوشی اور مزے کی بات ہے جس کی وجہ سے مجرمین جلدی طلب کر رہے ہیں یا یہ کہ تعجب کا مقام ہے کہ مجرمین کیسی خوفناک چیز کے لیے جلدی مچا رہے ہیں حالانکہ ایک مجرم کے لائق تو یہ تھا کہ وہ آنے والی سزا کے تصور سے کانپ اٹھتے اور ڈر کے مارے ہلاک ہو جاتے۔[1]

متیٰ هذا الوعد کا اصولی جواب دینے کے بعد ایک اور جواب دیا جا رہا ہے ان کا سوال اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ وعدہ کی نمائش ہو جائے تو پھر ہم ایمان لے آئیں گے جیسے قرآن میں ان ہی کی زبانی دوسرے موقعہ پر ہے۔

لن نؤمن لك حتى تفجر لنا من الارض ینبوعاً

ہم ہرگز ایمان نہ لائیں گے تا آنکہ تم ہمارے لیے زمین سے چشمہ نکال دو۔

جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر تمہارا یہ مطالبہ منظور بھی ہو جائے اور تمہارے لیے عذاب کا وقت موعود بتا بھی دیا جائے تو پھر عذاب آجانے کے وقت تمہیں فائدہ ہی کیا ہو گا اگر عذاب آنے پر ایمان لاؤ گے تو کیسے لاؤ گے عذاب کی لپیٹ میں آنے کے بعد تو ہلاکت یقینی ہے ایمان کیسے لاؤ گے یہ تو بالکل ایسا ہے جیسے کوئی کہے تو بہ کے بغیر مرنا نہیں چاہتے اور مریں گے تو توبہ کریں گے کیسی بے عقلی اور حماقت ہے مطلب یہ ہے کہ جب ظہور عذاب کے بعد ایمان کا موقعہ ہی نہ ہو گا تو پھر عذاب کے لیے اس جلد بازی سے تمہیں کیا ملے گا اور عذاب بھی اتنا ہولناک ہو گا کہ رات کی تنہائی اور تاریکی میں یا دن میں تمہاری مشغولیتوں میں آ جائے اور دونوں صورتوں میں تمہیں ایمان لانے کا موقعہ ہی کب ملے گا۔ یہ عذاب میں تاخیر اور دیری نہیں بلکہ ایمان لانے کیلئے اللہ سبحانہ کی جانب سے مہلت بخشی ہے اور یہ اس کی رحمت کا تقاضا ہے اس تاخیر سے دھوکہ نہ کھاؤ۔

جلد بازوں سے ایک سوال

۶۵ کیا جب عذاب آجائے گا تو مان جاؤ گے اس وقت ماننا بے سود ہو گا اس وقت کہا جائے گا کہ اب تم نے ماننا ہے حالانکہ تم اسی عذاب کی طلب میں جلد بازی مچا رہے تھے پھر ظالم کاروں سے کہا جائے گا اب دائمی عذاب کا مزہ چکھو اب صرف تمہیں تمہارے ہی

[1] افادات شیخ الاسلام

اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔ یعنی عذاب کی جلدی کرنا اس بنا پر ہے کہ آپ کو اس کے آنے کا یقین نہیں ہے اس وقت یقین ہوتا تو فائدہ ہو سکتا تھا کہ بچنے کی کوشش کرتے عذاب آنے کے بعد یقین آیا تو کیا فائدہ ہو گا اس وقت اللہ سبحانہ کی طرف سے کہہ دیا جائے گا کہ اچھا اب قائل ہوئے ہو اور پہلے جھٹلاتے رہے کیونکہ عذاب کا تقاضا کرنا بھی جھٹلانے اور مذاق اڑانے کی نیت سے تھا۔ اس وقت اقرار کرنے سے کوئی فائدہ نہیں جیسے سورۃ مومن میں ہے۔

فلما رأوا بأسنا قالوا آمنا بالله وحده وكفرنا بما كنا به مشركين فلم يك ينفعهم إيمانهم لما رأوا بأسنا سنة الله التي قد خلت في عباده وخسر هنالك الكافرون۔

اس سے پہلے کفر و شرک کرتے رہے اب ہمیشہ کے عذاب کا مزہ چکھتے رہو یہ قیامت میں کہا جائے گا[۱] مطلب یہ ہے کہ کیا اتنی دیر میں عذاب کے آنے پر تم نے مانا ہے جب کہ عذاب کے سارے مقدمات کی رونمائی پہلے ہو چکی۔ اب ہلاکت اور تباہی آنے پر اور عذاب کے پنجہ میں دب کر ایمان لائے ہو۔ اب یہ مشاہدہ کا ایمان ہے اور یہ ایمان معتبر نہیں ہے ایمان تو بالغیب معتبر ہے۔ اسی کے لیے جلد بازی کر رہے تھے۔ اگر عذاب کی علامات دیکھ کر پہلے مان لیتے تو عذاب سے بچ جاتے۔ پہلے اسے صرف دھمکی سمجھ کر مذاق اڑاتے رہے ہو اور اب سب کچھ آنکھوں سے دیکھ کر کانوں سے سن کر کہتے ہو یہ تو دنیا کی زندگی میں عذاب عاجل ہے جب آخرت کا مرحلہ آئے گا تو ان ظالموں سے کہا جائے گا کہ اب دائمی عذاب کا مزہ چکھو یہ تمہارے ہی اعمال کا نتیجہ ہے تمہارے ہی کرتوتوں کا مزہ ہے

یہ مادی و جسمانی دنیا علت و معلول اور عمل رد عمل کے جس اصول پر مبنی ہے اس کی وسعت کے دائرے میں انسان کا ہر عمل اور ہر قول داخل و شامل ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن میں گناہ کے لازمی نتیجہ کا نام عقاب ہے اور عمل صالح کے لازمی نتیجہ کا نام ثواب ہے قرآن نے ان دونوں اصطلاحوں کو بار بار استعمال کیا ہے عقاب کا لفظ عقب سے نکلا ہے جس کے معنی پیچھے کے ہیں اس لیے عقاب اس اثر کو کہتے ہیں جو کسی کام کرنے کے بعد لازم آتا ہے۔ عذاب اور عقاب میں فرق یہ ہے کہ عقاب سزا کے استحقاق کو بتلاتا ہے اور عذاب استحقاق اور بغیر استحقاق دونوں پر بولا جاتا ہے۔

[۱] افادات شیخ الاسلام

یہاں بما کنتم به تکسبون میں بار مقابلہ لاکر بتایا ہے کہ یہ عذاب استحقاق کی وجہ سے ہوگا۔ عقاب کا صحیح ترجمہ پاداش ہے جب کہ عذاب صرف سزا ہے اور ثواب کا لفظ ثوب سے نکلا ہے جس کے معنے لوٹنے کے ہیں اس لیے یہ کسی اچھے کام کے لوٹنے والے نتیجہ کے معنے میں ہے۔

اسی ایک مسئلہ کو سمجھ لیا جائے تو جزا و سزا کے قانونی اصول سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو قرآن میں یہ بات مختلف پیرایوں میں دہرائی گئی ہو یہاں هل تجزون الا بما کنتم تکسبون بار مقابلہ لاکر قصر کے ساتھ فرمایا ہے کہ یہ صرف تمہارے کمائے ہوئے اعمال کا بدلہ ہے اس میں یہ صاف تصریح ہے کہ یہ جزا تمہارے دنیوی اعمال کے آثار و لوازم ہیں غرض جزا اعمال کے نتائج کا دوسرا نام ہے۔

وَيَسْتَنْبِئُونَكَ أَحَقٌّ هُوَ ۖ قُلْ إِي وَ
رَبِّي إِنَّهُ لَحَقٌّ ۖ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ۝۵۳ وَلَوْ أَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ
ظَلَمَتْ مَا فِي الْأَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهِ ۗ وَأَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَأَوُا
الْعَذَابَ ۖ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ۚ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝۵۴ أَلَا
إِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ أَلَا إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ
وَقف النبی علیہ السلام ۵ ع ۱۳ ۱۰ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝۵۵ هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَإِلَيْهِ
تُرْجَعُونَ ۝۵۶

اورلوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کیا یہ بات واقعی سچی بات ہے آپ فرما دیجئے قسم ہے میرے رب کی یہ فی الواقع سچی بات ہے اور تم مجھے اس میں کبھی ہرا نہیں سکو گے[۴۶] اور دیکھو روز قیامت ہونے والا عذاب اس بات کی تکذیب کے نتیجے میں اس قدر ہولناک ہو گا) کہ اگر ہر ظالم شخص ساری روئے زمین پر قابض ہو جائے تو اس کو عذاب سے بچنے کے لیے فدیہ میں دے دے. اور جب وہ عذاب کو آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو[۴۷] اپنے کیئے پر چھپے چھپے پچھتائیں

گے اوران کے درمیان انصاف سے فیصلہ ہوگا اوران پرظلم
نہ ہوگا ۵۴ خوب یادرکھو آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ
اللہ کا ہے اس میں کسی کا ساجھا نہیں ہے۔ خوب سمجھ لو کہ
اللہ کا وعدہ برحق ہے لیکن اکثر کو پتہ نہیں ہے اللہ ہی جلاتا
اور مارتا ہے اور تم سب کو اسی کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے ۵۶

مفردات کے معانی

العذاب سخت سزا۔ دکھ کی مار علامہ فیومی المصباح المنیر میں لکھتے ہیں عذاب تعذیب سے حاصل مصدر ہے اصل میں اس کے معنے مارنے کے ہیں بعد میں ہر دردناک سزا کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ اور استعارے کے طور پر امور شاقہ کو بھی عذاب کہتے لگے چنانچہ محاورہ ہے السفر قطعة من العذاب (سفر تو عذاب کا ایک ٹکڑا ہے) اور امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں لکھتے ہیں۔ عذاب کے معنی دکھ دینے کے ہیں اور اس میں اختلاف ہے کہ اس کی اصل کیا ہے۔ بعض کہتے ہیں عذب الرجل فھو عاذب وعذوب سے ماخوذ ہے جس کا استعمال کھانا اور سونا چھوڑ دینے کے لیے ہوتا ہے لہذا تعذیب کے اصل میں معنی یہ ہوئے کہ انسان کو بھوکا رہنے اور جاگتے پر مجبور کیا جائے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس کی اصل عذاب بشر نھی اور گوارا کے ہیں۔ لہذا عذبتہ کے معنی ہیں اذلت عذب حیاتہ یعنی میں نے اس کی زندگی کی شیرینی کو زائل کر دیا جیسے مرضتہ میں نے اسکی بیماری دور کر دی۔ اور بعض یہ کہتے ہیں کہ تعذیب کے معنی اصل میں کثرت سے تعذیبہ السوط یعنی کوڑے کے پھندے سے مارنے کے ہیں اور بعض اہل لغت کا بیان ہے کہ تعذب کے معنی خود مارنے کے ہیں اور بعض

کا قول ہے کہ عرب کے قول ماء عذب سے ماخوذ ہے ماء عذب اس پانی کو کہتے ہیں جس میں کوڑا کرکٹ ہو اور گدلا ہو گیا ہو اس صورت میں عذبتہ کے معنی ہوں گے کدرت علیہ عیشہ میں نے اس کی زندگی مکدر کر دی۔ اور علامہ مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں لکھتے ہیں کہ ابوالطیب فاسی اہل اشتقاق سے ناقل ہیں کہ عذاب کلام عرب میں عذب سے ماخوذ ہے جس کے معنے روکنے کے ہیں۔ چنانچہ عذبتہ عنہ کے معنی ہیں میں نے اس کو اس سے روک دیا اور عذب عذوبا کے معنے ہیں وہ رک گیا اور آب شیریں کو عذاب اس لیے کہتے ہیں کہ وہ پیاس کو روک دیتا ہے اور عذاب کو بھی عذاب اس لیے کہتے ہیں کہ مجرم کو دوبارہ ارتکاب جرم سے روک دیتا ہے۔ علامہ زبیدی اس رائے کے بارے میں فرماتے ہیں وھو کلام حسن یہ عمدہ بات ہے۔ علامہ زمخشری نے بھی کشاف میں اس پر داد تحقیق دی فرماتے ہیں۔

"عذاب نکال کی طرح ہے وزن اور معنی دونوں میں جب کوئی شخص کسی چیز سے رک جائے تو بولتے ہیں اعذب عن الشئ اسی سے معنے پانی کے لیے عذب ہے کیونکہ وہ پیاس کو روکتا ہے آب شیریں کو نقاخ بھی بولتے ہیں کیونکہ وہ تشنگی کو توڑتا ہے اور فرات بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ دل سے پیاس مٹاتا ہے بعد میں لفظ عذاب میں وسعت پیدا ہو گئی اور سخت درد تکلیف کو عذاب کہنے لگے ورنہ اصل میں اس کے معنے اس سزا کے ہیں جو ارتکاب جرم سے باز رکھے لیکن بعد میں کثرت استعمال کی وجہ سے اس کے معنی سخت دکھ اور درد کے ہو گئے ہیں"۔

نبوت کی دعوت حق ہے

انسانوں کی عمدہ معاشرت، صحیح تمدن اور اعلیٰ مسرت کی تکمیل اور کائنات میں اس کو اشرف المخلوقات کا مرتبہ حاصل کرانے میں بلا شبہ تمام کارکن طبقات انسانی کا حصہ ہے۔ ہیئت دانوں نے ستاروں کی چالیں بتائیں حکمائ نے چیزوں کے خواص ظاہر کیے طبیبوں نے بیماریوں کے نسخے ترتیب دیئے۔ ہندسوں نے تعمیرات کا فن نکالا۔ صناعوں نے ہنر اور فن پیدا کیے۔ ان سب کوششوں سے مل کر یہ دنیا تکمیل کو پہنچی مگر ان کے تمام علوم فنون کی

بنیاد ان کے تجربے۔ ان کے خیالات، عقلی قیاسات ہیں۔ ان کے مقابلے میں وہ ہستیاں جنہوں نے انسانوں کی اندرونی دنیا آباد کی جنہوں نے حرص و ہوا کی چالیں درست کیں۔ روحانی بیماریوں کے نسخے ترتیب دیئے۔ جذبات، احساسات اور ارادوں کے نقشے درست کئے۔ نفوس و قلوب کے عروج و تنزل کا فن ترتیب دیا جس سے دنیا کے صحیح تمدن اور صحیح معاشرت کی تکمیل ہوئی، اخلاق و سیرت انسانیت کا جوہر قرار پایا۔ نیکی اور بھلائی، جوان عمل کے نقش و نگار قرار پائے خدا و بندہ کا باہم رشتہ مضبوط ہوا۔ سب نے اپنے نظریات، اپنے افکار کی بنیاد قیاس و گمان رائے اور خیال پر رکھی جب کہ ان ہستیوں نے اپنے نظریات کی اساس علم و بصیرت اور یقین و اذعان پر رکھی اور دعویٰ کیا ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ اور صرف یہی دعویٰ نہیں بلکہ اعلان کیا کہ یہی حق ہے اور جس کی طرف سے کہہ رہا ہوں اس کی ذات حق ہے۔ فذالکم اللہ ربکم الحق اور جو کچھ لے کر آیا ہوں وہ حق ہے یاایھا الناس قد جاء کم الحق من ربکم جو بات ثابت ہو اپنی جگہ اٹل ہو اٹمٹ ہو اسے حق کہیں گے یہاں نبوت کے نور کے لیے حق کا لفظ اختیار کر کے حقیقت ظاہر کر دی ہے کہ نبوت کی دعوت سرتاسر حق ہے اٹل ہے جمنے والی ہے اس کی اساس انسانی رائے پر نہیں علم الٰہی پر ہے۔ اسی لیے نبوت نے اس پر قسم کھائی ہے لیعنی اس کی صداقت کے لیے اللہ کی گواہی کافی ہے ای و ربی انہ لحق۔

لٰلہ اور لوگ آپ سے دریافت کرتے کیا یہ بات واقعی سچی بات ہے آپ فرما دیجیے قسم ہے میرے رب کی یہ فی الواقع سچی بات ہے اور تم مجھے اس میں ہرا نہ سکو گے یعنی غفلت کے نشہ میں چور ہو کر تعجب سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ سچ ہے کہ ہم موت کے بعد دوبارہ زندہ کئے جائیں گے اور دائمی عذاب کا مزہ چکھیں گے کیا واقعی ریزہ ریزہ ہو کر اور خاک میں مل کر پھر ہم کو از سر نو موجود کیا جائے گا۔ آپ فرما دیجیے کہ تعجب کی کیا بات ہے۔ یہ چیز تو یقیناً ہونے والی ہے تمہارا مٹی میں مل جانا اور پارہ پارہ ہو جانا خدا کو اس سے عاجز نہیں کر سکتا کہ پہلے کی طرح تمہیں دوبارہ پیدا کر دے اور شرارتوں کا مزہ چکھائے یہ ممکن نہیں کہ اس کے قبضہ سے نکل بھاگو اور فرار ہو کر معاذ اللہ اسے عاجز کر سکو۔ اس آیت کے مشابہ دو آیتیں قرآن کریم میں ہیں۔ ایک سورہ سبا میں ہے۔

قال الذین کفروا لا تاتینا الساعۃ قل بلیٰ و ربی لتاتینکم۔

دوسری سورۃ تغابن میں ہے

زعم الذین کفروا ان لن یبعثوا قل بلی وربی لتبعثن ثم لتنبؤن بما عملتم و ذالک علی اللہ بصیر۔

یہ دونوں قیامت اور معاد کے متعلق ہیں ان ہی کی مناسبت سے حافظ ابن کثیر نے اس آیت کو بھی معاد کے متعلق رکھا ہے [۱]

اس آیت کی تشریح ایک تو وہ ہی ہے جو شیخ الاسلام نے حافظ ابن کثیر کے حوالہ سے پیش کی ہے۔ اس صورت میں ضمیر کا احق ھو میں عذاب الخلد ہوگا اور سوال کا تعلق قیامت سے ہوگا۔ لیکن ابوحیان اندلسی نے بتایا ہے کہ آیت میں ضمیر مرجع عذاب بھی ہوسکتا ہے قرآن و شرع ہوسکتا ہے اور وعدہ بھی ہوسکتا ہے۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ ضمیر کا مرجع وعدہ بھی ہوسکتا ہے اور دعوت نبوت بھی ہوسکتا ہے۔ علامہ آلوسی نے وعدہ عذاب کو ترجیح دی ہے نیشاپوری نے بھی نظام القرآن میں اسی کو راجح قرار دیا ہے احق ھو میں حق خبر مقدم ہے اور ھو مبتدا ہے اور استفہام انکاری ہے زمخشری کی رائے ہے کہ استہزاء کے لیے تعریضی انداز ہے مطلب سوال کا یہ ہے کہ آپ جو عذاب کی بات کر رہے ہیں اس میں کوئی واقعیت ہے یا ویسے ہی گرمی مجلس کے لیے بات ہو رہی ہے اور ویسے شیخی بگھار رہے ہو۔ اس صورت میں جواب کا حاصل یہ ہوگا کہ قسم ہے میرے رب کی یہ حقیقت ہے اور جب یہ عذاب آئے گا تم اس کی گرفت سے نہ بچ سکو گے۔

اگر ضمیر کا مرجع قرآن اور دعوت ہو تو اس صورت میں حق حقیقت کے معنے میں نہیں اور انداز کلام استہزائی نہیں بلکہ واقعی ہے اور مطلب یہ کہ جو دعوت آپ نبوت کے نام پر پیش کر رہے ہیں حق ہے اور قسم کے ساتھ پوچھ رہے ہیں کہ یہی حق ہے اور اس کے سوا سب کچھ باطل ہے احق ھو میں زور کا تقاضا یہی ہے اس کے جواب میں آپ قسم کھا کر فرما رہے ہیں کہ جو کچھ کہہ رہا ہوں یہی اور صرف یہی حق ہے اور اس کے سوا سب باطل ہے۔ تم مجھے اس معاملہ میں اللہ کی جانب سے ہونے کی وجہ سے کبھی ہرا نہیں سکتے۔ تمام روئے زمین میں مجھے اس معاملہ میں کوئی ہرا نہیں سکتا۔ قرآن نے یہ بات بار بار مخاطبوں کے بارے میں دہرائی

[۱] افادات شیخ الاسلام

بے فرمایا کہ جو لوگ حق کی راہ میں روکاوٹیں ڈال رہے ہیں وہ تمام روئے زمین میں دعوت حق کو دنیا میں اقتدار ملنے کی بشارت دی گئی لیکن ساتھ ہی منکرین حق کے بارے میں حضور اقدس کو مخاطب کر کے فرمایا لا تحسبن الذین کفروا معجزین فی الارض آپ یہ خیال نہ کریں کہ یہ منکرین حق اس معاملہ میں ہرا دیں گے۔ کہیں ان منکرین حق کے بارے میں فرمایا کہ جو لوگ حق کے خلاف دعوت حق کو ہرانے کی کوشش کر رہے ہیں ان کو دردناک عذاب ہوگا والذین سعوا فی ایاتنا معاجزین اولئك لهم عذاب من رجز الیم اور کہیں فرمایا ہے جو لوگ ہماری آیات کو ہرانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ ضرور عذاب میں پڑیں گے والذین یسعون فی ایاتنا معاجزین اولئك فی العذاب محضرون یہ آیات بتا رہی ہیں کہ آیت قرآن کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ میں اسلام کے نام پر پیش کر رہا ہوں وہ ہی حق ہے اس کے سوا جو کچھ ہے وہ باطل ہے اس کی کامیابی بالکل حتمی اور یقینی ہے اور تم سب مل کر اس کی راہ روک نہیں سکتے اور مجھے ہرا نہیں سکتے چونکہ دعوت کی اساس علم قطعی اور یقینی ہے لا ریب فیه من رب العالمین اور وانه لكتاب عزيز لا ياتيه الباطل من بين يديه ولا من خلفه تنزيل من حكيم حميد اس لیے آپ قسم کھا کر فرما رہے ہیں ای وربی انه لحق کیونکہ اس دعوت کا سرچشمہ علم الٰہی ہے اور اس کے نزول کا ذریعہ وحی ہے۔ یہ سرچشمہ ہر قسم کے عیب و نقصان شک و اشتباہ، ظن و تخمین، تدریج و ترقی اور تعارض و اختلاف سے پاک ہے اس میں جو کچھ ہے وہ یقینی اور قطعی ہے شاہد اور مرئی سے یکساں اور آخری ہے۔ اللہ کا علم تدریجی اور ترقی پذیر نہیں ہے اس کا علم اس کی دوسری صفات کی طرح ابدی اور دائمی ہے اس لیے یہی حق ہے اس کے سوا جو کچھ ہے باطل ہے۔

تعبیر کا انداز بتا رہا ہے کہ یہ بات دریافت کرنے والے وہ لوگ ہیں جو منکر و حاسد نہ تھے مگر تصدیق میں متامل تھے وہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت و دیانت پر غور کرتے جو تمام لوگوں میں اول روز سے مسلم تھی تو ان کا دل کہتا سچے آدمی کی زبان سے جھوٹی بات نہیں نکل سکتی ہے لیکن پھر جب دیکھتے کہ ان کی دعوت ایسی باتوں کا یقین دلاتی ہے جن سے وہ اور ان کے آباء و اجداد یکسر ناآشنا تھے تو طبیعت کبھی نہیں۔ شک و حیرت کی حالت میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور پوچھنے لگتے ہیں کیا تم جو کہہ رہے ہو بس یہی حق ہے

فرمایا جب تمہیں آج تک میری سچائی میں شبہ نہیں ہوا تو آج کیوں ہو رہا ہے میں جو کچھ کہتا ہوں بھی حق ہے اور اس پر میرا پروردگار شاہد ہے۔

صحیح مسلم، صحیح بخاری اور مسند احمد میں حضرت انس کے حوالہ سے یہ واقعہ آیا ہے کہ ہم مسجد میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں بیٹھے تھے کہ ایک شخص ایک اونٹ پر سوار آیا۔ مسجد ہی میں اونٹ بٹھا دیا اور باندھ دیا پھر بولا تم میں محمد کون سے ہیں ہم نے جواب میں بتایا یہ ڈھاسنا لگائے سپید رنگ والے جو تشریف فرمائیں بولا میں عبدالمطلب کے صاحبزادے کا متلاشی ہوں حضور نے فرمایا جی ہاں میں ہی ہوں بولا میں آپ سے کچھ سوال کروں گا برا نہ مانیئے ذرا میں سوال میں لب و لہجہ سخت کرتا ہوں۔ فرمایا جو چاہے پوچھو بولا میں آپ کو آپ کے رب کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا واقعی اللہ نے آپ کو پوری انسانیت کے لیے رسول بنا کر روانہ کیا ہے فرمایا ہاں اللہ گواہ ہے۔ بولا میں آپ کو اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کیا واقعی اللہ نے آپ کو دن رات میں پانچ نمازوں کا حکم دیا ہے فرمایا اللہ گواہ ہے ہاں۔ بولا میں آپ کو اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کیا واقعی آپ کو اللہ نے رمضان کے روزے رکھنے کا حکم دیا ہے فرمایا اللہ گواہ ہے ہاں۔ بولا کہ میں آپ کو اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا واقعی اللہ نے حکم دیا ہے کہ آپ زکوٰۃ ہم سے وصول کر کے فقرا میں تقسیم کریں۔ آپ نے فرمایا اللہ گواہ ہے ہاں۔ بولا میں آپ کی دعوت کو مان لیا میں اپنی قوم کا نمائندہ ہوں میرا نام ضمام بن ثعلبہ ہے۔

مسند احمد میں یہ بھی اضافہ ہے کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ ہم کو حکم دیں کہ ہم اللہ کی عبادت کریں اس کی عبادت میں قطعاً شرک نہ کریں اور ان شرکا کو جن کی ہمارے باپ دادا اللہ کے ساتھ عبادت کرتے تھے چھوڑ دیں۔ آپ نے فرمایا ہاں آئے والا بالوں والا اور مینڈھیاں رکھے ہوئے تھا جب وہ واپس ہوا تو حضور نے فرمایا مینڈھیوں والا اگر سچ بولا تو جنت میں جائے گا۔ لکھا ہے یہی شخص جب اپنی قوم میں واپس آیا تو آتے ہی سب سے پہلی بات جو کی یہ تھی۔ لات و عزیٰ کا خانہ خراب ہو۔ لوگوں نے شور مچا دیا ضمام چپ چپ۔ تجھے برص کی بیماری ہو جائے گی۔ تو کوڑھی ہو جائے گا تو پاگل ہو جائے گا۔ ضمام بولا ارے کیا کہہ رہے ہو کچھ بھی نہ ہو گا بخدا یہ نفع دیتے ہیں اور نہ نقصان۔ اللہ سبحانہٗ نے پیغمبر روانہ کیا ہے اور اس پر ایک کتاب نازل کی ہے اس کے ذریعے تم کو ساری

برائیوں سے بچا لیا ہے۔ سُن لو میں اعلان کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں وہ یگانہ ہے عبادت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور میں اعلان کرتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں میں تمہارے پاس ان کی جانب سے اوامر اور نواہی کی سوغات لے کر آیا ہوں۔ خدا کی قسم اسی روز پوری آبادی میں ہر مرد اور عورت اسلام کی نعمت سے ہمدوش ہو گیا۔

نتائج کفر کی ہولناکی

۶۷ اور دیکھو روز قیامت ہونے والا عذاب اس بات کی تکذیب کے نتیجے میں اس قدر ہولناک ہوگا۔ کہ اگر ہر ظالم شخص ساری روئے زمین پر قابض ہو جائے تو اس عذاب سے بچنے کے لیے فدیہ میں پیش کر دے وہ سب عذاب کو آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو اپنے کیے پر چھپے چھپے پچھتائیں گے اور ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ ہوگا اور ان پر ظلم نہ ہوگا یعنی اگر روئے زمین کے خزانے فرض کرو اس کے قبضے میں ہوں تو کوشش کرے کہ یہ سب دے کر اپنے کو خدا کے عذاب سے بچائے تو بچ نہیں سکے گا بلکہ دل میں اپنی حرکتوں پر پشیمان ہوگا اور چاہیں گے کہ لوگوں پر پشیمانی کا اظہار نہ ہو مگر نا سمجھے کچھ دیر آثار ندامت ظاہر نہ ہونے دیں گے آخر بے اختیار ظاہر ہو کر رہیں گے اس وقت کہیں گے یاحسرتنا علی ما فرطت فی جنب اللہ اور یا ویلنا قد کنا فی غفلۃ من ھذا ۱؎ مطلب یہ ہے کہ جس چیز کو عمر بھر جھٹلاتے رہے جسے جھوٹ سمجھ کر ساری زندگی غلط کاموں میں لگے رہے اور جس کی خبر دینے والے انبیاء کا مذاق اڑاتے رہے وہی چیز جب ان کے سامنے توقعات کے خلاف اچانک سامنے آجائے گی تو ان کے ہوش اڑ جائیں گے اور پاؤں کے نیچے سے زمین نکل جائے گی ان کا اندر خود ان کو بتائے گا کہ جب یہ حقیقت تھی تو جو کچھ وہ دنیا میں کرتے رہے ہیں اس کا انجام اب کیا ہونا چاہیے زبانیں بند ہوں گی منظر کو دیکھ کر ہکے بکے رہ جائیں گے بیضاوی نے اسروا الندامۃ کی یہی تشریح کی ہے بھتوا بما عاینوا اور ندامت وحسرت سے دل اندر ہی اندر رہ گئے

۱؎ افادات شیخ الاسلام

رہے ہوں گے جن لوگوں نے قیاس دگمان کے سودے پر اپنی عمر کی ساری مایہ لگا دی ہو اور کسی خیر خواہ کی بات نہ سنی ہو اور نہ مانی ہو وہ دیوانہ نکلنے کے بعد خود اپنے سوا اور کس کی شکایت کر سکتا ہے۔ آخر میں فرمایا قضی بینھم الخ فیصلہ انصاف سے کیا جائے گا یعنی ہر ایک کے جیسے اعمال ہوں گے ویسے ہی نتائج سامنے آجائیں گے۔ یہ فیصلہ دو کے درمیان نہیں ہوگا بلکہ ہر ایک کو اپنے اعمال کے نتائج سے ہمدوش کا نام ہے یا یہ مطلب ہے کہ ان کے مرادوں اور مریدوں مطاعوں اور مطیعوں فرمان برداروں اور فرمان رواوں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا۔ کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا جو کچھ انہوں نے کمایا ہوگا وہی ان کے سامنے رہے گا ان پر کوئی زیادتی نہ ہوگی۔ اس میں اشارہ ہے کہ انہوں نے اپنے شفعا متبوعین اور مطاعون سے جو امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں وہ سب بے حقیقت ثابت ہوں گی۔ قرطبی نے لکھا ہے بین الرؤساء والسفل۔

پوری کائنات میں صرف اللہ کی حکومت ہے

۵۵ خوب یاد رکھو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ کا ہے اس میں کسی کا ساجھا نہیں ہے خوب سمجھ لو کہ اللہ کا وعدہ برحق ہے لیکن اکثر کو پتہ نہیں ہے اللہ ہی جلاتا ہے اور مارتا ہے اور تم سب کو اسی کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے یعنی سارے جہاں میں حکومت صرف اللہ کی ہے انصاف ہو کر رہے گا کوئی مجرم کہیں نہیں بھاگ سکتا ہے نہ رشوت دے کر چھوٹ سکتا ہے۔ اکثر لوگ سوء استعداد بدفہمی اور غفلت سے ان حقائق کو سمجھتے نہیں ہیں اسی لیے جو زبان پر آئے بک دیتے ہیں اور جو جی میں آئے کرتے ہیں سوچنا چاہیے کہ جب جلانا اور مارنا اسی کا کام ہے تو دوبارہ زندہ کرنا کیا مشکل ہے[۱] یہ اگرچہ پہلی بات ہی کی تاکید ضرور ہے، پیشانی پر الاحرف تنبیہ لگایا گیا ہے اور خبر کو زوردار بنانے کے لیے ان حرف تحقیق لگایا اور پھر قصر کی خاطر خبر کو پہلے لائے مطلب یہ ہے خبردار کان کھول کر سن لو آسمانوں اور زمین میں جو کچھ جتنا کچھ اور جیسا کچھ بھی ہے وہ صرف اور صرف اللہ ہی کا بلا شرکت غیر مالکانہ تعلق ہے اس سے کسی کا کوئی حصہ اور ساجھا

[۱] افادات شیخ الاسلام

نہیں ہے اگر کسی نے یہ خیال رکھا ہے کہ اس کے شرکاء اور شفعا کا بھی کوئی حصہ ہے اور وہ بھی کچھ کرتے ہیں تو یہ اس کی قوت واہمہ کی تخلیق ہے اسے اپنی اصلاح کرنی چاہیے۔

یہاں علامہ بقاعی نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ ظلم تو وہ کرتا ہے جس کی ملکیت میں کوئی کمی ہو اور جو سب کچھ کا مالک ہو اور سب کچھ اس کی ملکیت ہو تو اس کا ہر فیصلہ عین عدل و انصاف ہوگا کیونکہ تمام کائنات کا تعلق اللہ سبحانہ سے یکساں اور برابر ہے۔ وعدہ کی خلاف ورزی بھی نقصان قدرت کی وجہ سے ہوتی ہے جس کا ہر چیز سے مالکانہ تعلق ہو اور ہر چیز پر اسے پوری پوری دسترس ہو وہاں وعدہ کی خلاف ورزی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ آخر میں فرمایا ہے۔ ھو یحیی و یمیت یعنی اس دنیا میں احیاء و اماتت کا کام صرف اسی کی ذات قدوس کر رہی ہے۔ اس میں کسی کا کوئی دخل نہیں ہے۔

قرآن انسانوں کو اس ایمان و ایقان کی دعوت دیتا ہے کہ سب کچھ اللہ سبحانہ کر رہا ہے صرف یہی نہیں بلکہ ہر انسان کی فطرت میں اس کا یقین و علم بھی ہے۔ پھر جن راہوں اور قدرت کے جن قوانین کے تحت احیاء و اماتت کا سلسلہ جاری ہے جب یہ اقرار موجود ہے تو پھر خاص احیاء و اماتت کے لیے کسی اور کو سہارا بنانا نادانی اور جہل نہیں تو اور کیا ہے؟ اور اس سے بھی بڑی نادانی یہ ہے کہ جن راہوں سے چیزیں آرہی ہیں ان راہوں سے چیزیں حاصل کرنا تو عقل کا تقاضا ہے لیکن جو لانے والا ان راہوں سے چیزیں لا رہا ہے اس سے ان پیداوار کو حاصل کرنے کے لیے گڑگڑا کر اس سے نہ مانگنا خود اپنے خود ساختہ شرکاء سے مانگنا جہالت اور نادانی نہیں تو اور کیا ہے مانگنا اور صرف اسی سے مانگنا عقل کا تقاضا ہے فابتغوا عند اللہ الرزق اور واسئلوا اللہ من فضلہ کا بھی مطالبہ ہے۔

آخر میں فرمایا کہ والیہ ترجعون تمہیں اسی کے حضور میں پیش ہونا ہے یعنی تمہیں اپنے اعمال کا حساب دینے کے لیے صرف اللہ سبحانہ کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے کسی اور کے حضور میں تمہیں نہیں جانا ہے۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاۗءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ
رَّبِّكُمْ وَشِفَاۗءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ڏ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۵۷
قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ
مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۵۸ قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ
رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ۭ قُلْ اٰۗللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَي
اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ۵۹ وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَي النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَھُمْ ع ۶ ۱۱
لَا يَشْكُرُوْنَ ۶۰

اے انسانو! تمہارے مالک کی جانب سے ایک عظیم الشان
نصیحت اور دلوں کے روگ کے لیے نسخہ شفا اور اہلِ ایمان کے
لیے ہدایت و رحمت قرآن کی صورت میں آچکا ہے ۵۷ آپ
فرما دیجئے کہ اللہ ہی کے فضل اور اس کی رحمت پر بس ان کو
خوشی منانی چاہیے یہ ان ساری چیزوں سے اچھی ہے جن کو وہ ذخیرہ
کرتے رہتے ہیں ۵۸ اے اللہ کے رسول ان سے کہو لوگو کیا
تم نے اس پر غور کیا ہے کہ جو روزی اللہ نے تمہارے لیے

اتاری پھر تم نے اس میں حلال اور حرام بنا لیا ہے اے اللہ کے رسول ان سے دریافت کرو کہ ایسا کرنے کا اللہ نے تم کو حکم دیا ہے یا تم اللہ پر بہتان باندھ رہے ہو ۵۹ اور ان لوگوں کا کیا خیال ہے قیامت کے بارے میں جو اللہ پر جھوٹ بول کر افترا پردازی کرتے رہتے ہیں بلاشبہ اللہ سبحانہ لوگوں پر بڑا ہی مہربان ہے لیکن لوگوں کی اکثریت ناشکر گذار ہے ۶۰

معانی مفردات

رحمۃ بخشش مہربانی رحم یرحم کا مصدر ہے امام راغب لکھتے ہیں رحمت وہ رحم ہے جو مرحوم کی طرف احسان کی مقتضی ہو۔ اور کبھی اس کا استعمال محض رقت کے معنے میں ہوتا ہے اور کبھی صرف احسان کے معنے ہیں جو رقت سے خالی ہو جیسے رحم اللہ فلانا فعل کی صورت میں متعدی بنفسہ ہوتا ہے رحمہ اللہ لیکن مصدر کی صورت میں صلہ علی آتا ہے جیسے رحمۃ اللہ علیہ جب اس سے اللہ سبحانہ کو موصوف کیا جائے گا تو صرف احسان مراد ہوگا رقت مراد نہ ہوگی۔ رحمت کے دو معنے ہوئے رحمت اور احسان رقت کا مقام اگر انسانی طبیعت ہے تو احسان کا مرکز اللہ سبحانہ کی ذات گرامی ہے جس طرح لفظ رحم رحمت سے ہے اسی طرح اس کے جو معنے لوگوں میں ہیں وہ اس رحمت سے ہیں جو اللہ سبحانہ کے بیلے ہیں ان دونوں کے معنے میں بھی وہی تناسب ہے جو ان دونوں کے لفظوں میں ہے۔

رزق روزی راغب لکھتے ہیں کہ رزق کبھی تو عطاء جاری کو کہا جاتا ہے خواہ دنیوی

ہو یا اخروی اور کبھی حصہ کو اور کبھی جو پیٹ میں پہنچ کر غذا بن جاتی ہے اس کو دنیوی عطا کی مثال وفی السماء رزقکم اور عطاء اخروی کی مثال جیسے ولھم فیھا رزقھم اور حصہ کی مثال وتجعلون رزقکم انکم تکذبون اور غذا کی مثال فلیاتکم برزق منہ۔ جمع ارزاق ہے۔ اسی سے رزاق بروزن فعال مبالغہ کا صیغہ ہے امام حلیمی کہتے ہیں کہ رزق پر رزق کثرت سے اور وسعت کے ساتھ دینے والا رزاق ہے اور امام خطابی فرماتے ہیں کہ رزاق وہ ذات ہے جو رزق کی متکفل ہے اور ہر جان کے لیے جس قدر قوت کی ضرورت ہے اس کو بہم پہنچانے والی ہے۔ یاد رہے کہ اس لفظ کا اطلاق بجز ذات باری کے غیر پر جائز نہیں ہے۔

قرآن کا بنیادی تصوّر

ہر مجموعہ قانون کا بنیادی تصور ہوتا ہے جس پر اس مجموعہ کے ایک ایک چیز کی اساس ہوتی ہے۔ یہ بنیاد کہیں قومی برتری کہیں وطنی افادیت کہیں نسلی امتیاز کہیں تجارتی مفاد قرار پاتی ہے اس لیے اس مجموعہ قوانین میں اسی بنیادی نقطۂ نگاہ کی لکیریں ابھرتی نظر آتی ہیں۔ جہاں قانون کی بنیاد قومی برتری ہے وہاں کالے گورے یورپین اور نیٹو کے اصول برکار فرمائی ہے جہاں وطن قانون کی اساس ہے وہاں جغرافی انقطاع ارضی قانون کے اختلاف کا باعث ہوتے ہیں اور رومی غیر رومی یونانی اور غیر یونانی، مصری اور غیر مصری ملکی اور غیر ملکی نزاعات جنم لیتے ہیں اسی جذبہ سے صوبائی اختلاف کی تخلیق ہوتی ہے پاکستانی ہونے کے باوجود پنجابی سندھ میں بیگانہ ہے بہاری سندھ میں جگہ نہیں پا سکتا۔ اور بلوچستان والوں پر سرحد کی وسعت تنگ ہے۔

اللہ سبحانہ کے نازل کردہ قانون کی بنیاد صرف انسانوں کے لیے موعظت شفاء اور یقین کرنے والوں کے ہدایت و رحمت ہے یعنی سارے انسانوں کو رذائل سے بچا کو فضائل سے خوگر کرنا اور عدل و انصاف اور امن و امان کو قائم کرنا ہے اور اہل ایمان کے لیے پوری زندگی میں رہنما بن کر ظلم و فساد اور بغض و [illegible] سے نجات دلانا اور رحم و محبت اور امن و سلامتی کی روح سے معمور کرنا ہے۔ اس میں رنگ و نسل کا کوئی اختلاف زبان اور لغت اور تہذیب و تمدن کا کوئی فرق اور ملک و اقلیم کا کوئی امتیاز نہیں ہے یہ

قانون اللہ سبحانہ کا ہے اور اللہ سبحانہ کے سارے بندوں کے لیے آیا ہے وہ چاہے کالے ہوں یا گورے آریائی ہوں یا سامی۔ یورپی ہوں یا ایشیائی، پاکستانی ہوں یا ہندوستانی عربی ہوں یا عجمی سب کے لیے یکساں اور برابر ہے۔

بلاشبہ اللہ سبحانہ کے قانون میں ایک فرق رکھا گیا ہے کہ اس قانون کو چلانے والے قانون الٰہی کو ماننے والے ہوں ھدی و رحمۃ للمومنین لیکن جمہوری نظام کی طرح ملکی غیر ملکی، قوم اور غیر قوم، امیر غریب سرمایہ دار اور مزدور تجارت پیشہ اور زمیندار کی دیواریں حائل نہیں ہیں۔

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے قرآن کا قانون ہونے کی حیثیت میں یہی چہرہ پیش کیا ہے۔

۵۷ اے انسانو! تمہارے مالک کی جانب سے ایک عظیم الشان نصیحت اور نسخہ شفا اور اہل ایمان کے لیے سامان ہدایت و رحمت آچکا ہے۔ یہ سب صفات قرآن کریم کی ہیں۔ قرآن اول سے آخر تک نصیحت ہے جو لوگوں کو مہلک اور مضر باتوں سے روکتا ہے۔ دلوں کی بیماریوں کے لیے نسخہ شفا ہے۔ وصول الی اللہ اور رضائے الٰہی کا راستہ بتاتا ہے اور اپنے ماننے والوں کو دنیا و آخرت میں رحمت الٰہیہ کا مستحق ٹھہراتا ہے بعض محققین کے نزدیک اس آیت میں نفس انسانی کے مراتب کمال کی طرف اشارا کیا ہے یعنی جو شخص قرآن حکیم سے تمسک کرے ان تمام مراتب پر فائز ہوسکتا ہے۔

(۱) اپنے ظاہر کو نالائق افعال سے پاک کرنا لفظ موعظت میں اس طرف اشارہ ہے۔

(۲) باطن کو عقائد فاسدہ اور ملکات رویہ سے خالی کرنا جو شفاء لما فی الصدور سے مفہوم ہوتا ہے۔

(۳) نفس کو عقائد حسنہ اور اخلاق فاضلہ سے آراستہ کرنا جس کے لیے لفظ ہدیٰ زیادہ مناسب ہے۔

ظاہر و باطن کی درستگی کے بعد انوار رحمت الٰہیہ کا نفس پر فائض ہونا جو لفظ رحمت کا مدلول ہے۔ امام فخر الدین رازی نے جو تقریر کی ہے اس میں ان چار لفظوں سے شریعت طریقت حقیقت اور نبوت و خلافت کی طرف اشارا کیا ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقعہ نہیں اور نہ اس قسم کے مضامین خالص تفسیر کی مد میں آسکتے ہیں [1]

[1] افادات شیخ الاسلام

یہ آیت قرآن کے مہمات دلائل میں سے ہے۔ ضروری ہے کہ اسے اچھی طرح سمجھ لیا جائے چونکہ اس آیت میں موعظت، شفا، ہدایت اور رحمت کے الفاظ آئے ہیں اس لیے مفسرین نے اپنے مذاق کے مطابق تشریح کی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سیاق و سباق سے ہٹ کر استدلال کی ساری حقیقت گم ہو کر رہ گئی اور آیت کی جامعیت مفقود ہو گئی۔ اس قسم کے مقامات دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ نظر و تحقیق کا معیار اس قدر کیوں گر گیا تھا کہ قرآن کے صاف و صریح مطالب بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

یہ بات بالکل صاف اور ظاہر ہے کہ آیت کا آغاز یا ایھا الذین امنوا سے نہیں بلکہ یا ایھا الناس کہہ کر قرآن پوری انسانیت سے خطاب کر رہا ہے۔ سباق میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ مخالفین قرآن اور دعوت نبوت کی حقیقت کے بارے میں سوال کر رہے ہیں اور نبوت قرآن کی حقیقت ہونے کی قسم کھا کر بیان کر رہی ہے انہ لحق اور مخاطبوں کو چیلنج کر رہا ہے کہ و ما انتم بمعجزین یعنی قرآن اور دعوت بہر حال کامیابی سے ہمدوش ہو گی اور تمہاری کوئی ریشہ دوانی۔ کوئی سازش کوئی طاقت اسے ہرا نہیں سکتی اور سیاق یہ ہے کہ ہماری دی ہوئی نعمتوں میں اللہ سے بے نیاز ہو کر حلت و حرمت کی قانون سازی کر رہے ہو خود ہی اپنے لیے قوانین بنا رہے ہو۔ تم اللہ پر جھوٹ کی افترا پردازی کر رہے ہو۔ غور فرمائیے کہ اس سیاق و سباق میں اس قرآن کے بارے میں جس کے اللہ کی جانب ہونے پر ابھی چند قدم پہلے یہ چیلنج دیا فاتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شھداءکم اور جس کی حقیقت پر ابھی قسم کھائی تھی اسی قرآن کا جو چہرہ اس آیت میں پیش کیا جا رہا ہے اس کا صرف یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ یہ قرآن قانون ہونے کی حیثیت سے جامع ہے اور کامل بھی ہے اس کو سمجھنے کے لیے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ انسانیت کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں جو قرآن کے دائرے سے باہر ہو وہ ایک ایسا قانون ہے جو ہر جگہ انسان کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ جو بھی قدم اٹھاتا ہے اس کی ہدایت کو سامنے موجود پاتا ہے مختصر یہ کہ قرآن ایک ایسا جامع اور مکمل قانون ہے جو انسانی زندگی کے اعتقادی، فکری اخلاقی اور عملی تمام پہلوؤں کو پوری طرح گھیرے ہوئے ہے کچھ اسی طرح جس طرح کہ ہوا کا کرہ اس زمین کو چاروں طرف سے اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے۔

یہ میرا کوئی ذاتی خیال نہیں ہے بلکہ امام شاطبی نے الموافقات میں اسی آیت سے قرآن

کی ہمہ گیری اور جامعیت پر استدلال کیا ہے فرماتے ہیں ۔

"اگر قرآن قانون کی حیثیت میں کامل نہ ہوتا تو قرآن میں یہ دعویٰ نہ ہوتا ان هذا القرآن یهدی للتی هی اقوم - یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھی راہ ہے یعنی خالق و مخلوق کے معاملات میں کامل نظام ہے اور قرآن اپنے بارے میں هدی اور شفالما فی الصدور کا اعلان نہ کرتا قرآن کے شفاء لما فی الصدور کا مطلب یہی ہے کہ یہ کامل نظام حیات ہے (الموافقات)

اور یہ بھی علامہ شاطبی نے لکھا ہے کہ حافظ ابن حزم ظاہری کہتے ہیں کہ قرآن میں اس قدر جامعیت اور کمال ہے کہ سارے قانونی تقاضوں کا اس میں بھرپور جواب ہے ہاں قراض کے بارے میں کوئی اصل معلوم نہیں ہوئی ہے شاطبی کہتے ہیں کہ قراض کا تعلق اجارہ سے ہے اور اجارہ کی اصل قرآن میں موجود ہے ۔

قرآن کے بحیثیت قانون جامع اور کامل ہونے کے موضوع پر یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ قانون کے مختلف حصے اس میں مضبوطی سے جڑے ہوئے ہیں جس طرح مشین کے مختلف پرزے باہم جڑے ہوتے ہیں اس لیے نظری طور پر سمجھنے کے لیے تو انہیں الگ الگ قانون میں تقسیم کیا جا سکتا ہے مگر عملی طور پر ان کا الگ الگ وجود تقریباً ناممکن ہے ۔ اپنی کارکردگی کے اعتبار سے یہ سارے اجزا دراصل ایک وحدت ہیں ۔ ان میں کوئی بھی جز اپنا عملی جوہر اسی وقت دکھا سکتا ہے جب یہ پورا نظام کل کا کل حرکت میں ہو ، نہ صرف یہ بلکہ کسی جز کو ٹھیک ٹھیک سمجھا ہی اس وقت جا سکتا ہے جب کہ دوسرے سارے اجزا نظروں کے سامنے ہوں ۔

یہ بات بھی خوب یاد رکھنی چاہیئے کہ قرآن کی بطور قانون کارفرمائی ایسے معاشرے کے وجود پر موقوف ہے جو مسلم ہو جس کا اللہ سبحانہ اور اس کی صفات پر گہرا یقین ہو ، جو آخرت پر سچا یقین رکھتا ہو اور جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دل سے اللہ کا نبی اور آخری نبی مانتا ہو ۔ مختصر یہ کہ جو اسلام کا صحیح معنی میں پیرو کار ہو ۔ اس لیے قرآن کی قانونی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ایک ایسے ہی معاشرے کے ساتھ وابستہ کر کے دیکھا جائے ورنہ جس طرح ایک ماہر فن ہاتھ کے تصور کے بغیر کسی اچھی سے

اچھی تلوار کی کاٹ کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا اسی طرح ایک اچھے مسلم معاشرے کے تصور کے بغیر قرآنی قانون کی عملی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ بھی تقریباً ناممکن ہے۔

ان اصولی باتوں کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب آیئے آیت قرآنی کا مطالعہ کیجئے۔

آیت کا آغاز یا ایھا الناس سے ہوا ہے یہ اندازِ خطاب اول یہ بات بتا رہا ہے کہ قرآن پوری انسانیت کے لیے اللہ کا قانون ہے اور ثانیاً لفظ الناس بول کر سمجھا دیا ہے قرآن کی دعوت بلا امتیاز رنگ و نسل وطن قوم زبان اور طبقہ سب کے لیے یکساں ہے اور من ربکم کا اضافہ کر کے یہ بات عملہ دماغ میں اتار دی ہے کہ جیسے تمہارا پروردگار مالک اور آقا ایک ہے وہی تمہاری مادی پروردگاری کر رہا ہے اور اس پروردگاری میں ماں کے پیٹ سے لے کر قبر کے پیٹ تک اس کا کوئی شریک نہیں ہے ایسے ہی تمہاری معنوی پروردگاری بھی کرنا اسی کا کام ہے۔ یہ فرما کر قرآن کی قانون کی حیثیت سے ہمہ گیری اور جامعیت کا چہرہ پیش کیا ہے۔

قرآن میں عائلی معاشرتی اور اخلاقی نظام

سب سے پہلے قرآن کی قانونی حیثیت یہ ہے کہ قرآن موعظت یعنی قرآن دل میں اتر جانے والی دلیلوں اور روح کو متاثر کرنے والے طریقوں سے ان تمام باتوں کی ترغیب دیتا ہے جو خیر و حق کی باتیں ہیں اور ان تمام باتوں سے روکتا ہے جو شر و بطلان کی باتیں ہیں۔ ایک واعظ کی طرح وہ ترہیب بھی دیتا ہے اور ترغیب بھی۔ عربی میں وعظ کا مفہوم صرف نصیحت ہی نہیں ہے بلکہ ایسی مؤثر نصیحت جو مؤثر دلائل اور دلنشین اسلوبوں کے ساتھ کی جائے جس سے انسان کے اخلاق صحیح ہوں معاشرت درست ہو اور خانگی زندگی میں سکون و اطمینان اس طرح اس ایک لفظ کے ذریعے قرآن نے اپنے مخاطبوں کو سمجھا دیا کہ قرآن جو قانون نظام لے کر آیا ہے اس میں اخلاقی نظام عائلی نظام اور معاشرتی نظام پورا موجود ہے اخلاقی نظام معاشرت اور خانگی زندگی کے لیے بنیاد ہے۔ تورات محض سیاسی قانون ہے اور انجیل محض اخلاق ہے۔ قرآن عزیز اخلاق اور سیاسی قانون دونوں کا جامع ہے۔ اس جامعیت کا اصول قرآن میں دو حیثیتوں سے پایا جاتا ہے ایک تو یہ کہ اس نے نہ تو یہودیت کی طرح اخلاق کو قانون کی شکل دے دی اور نہ عیسائیت کی طرح سیاسی قانون کو دین کے ہر حصے

خارج کر دیا بلکہ قرآن نے سیاسی قانون اور اخلاق کے درمیان حد فاصل مقرر کر دی اور قانون سیاسی کو قانون کی جگہ اور اخلاق کو اخلاق کی جگہ رکھ کر انسانیت کو تکمیل تک پہنچا دیا۔ یہاں اس تقابلی مطالعہ کی تفصیلات کا محل نہیں۔ عائلی زندگی یا معاشرتی دونوں کا بنیادی تعلق اخلاق سے ہے،

عائلی نظام میں انسانی تمدن کی بنیاد ایک مرد اور ایک عورت کی باہمی رفاقت سے شروع ہوتی ہے اور ایک گھر کی محدود اجتماعیت سے باہر جو ایک وسیع اجتماعیت ہوتی ہے اسے معاشرہ کہا جاتا ہے اس کے بارے میں قرآن کی جو ہدایات ہیں ان کا سرچشمہ بھی قرآن کا نظام اخلاق ہے مثلاً یہ ہدایت یوثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ وہ تنگی کی حالت میں اپنے پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں یا یہ ہدایت لا یسخر قوم من قوم کوئی ایک دوسرے کا مذاق نہ اڑائے ولا تلمزوا انفسکم ایک دوسرے پر عیب نہ لگاؤ ولا تنابزوا بالالقاب ایک دوسرے کے نام نہ ڈالو۔

بہر حال موعظہ من ربکم نے قرآن نے اخلاقی نظام عائلی نظام اور معاشرتی نظام کی نشاندہی کی ہے۔

قرآن کا روحانی نظام

اس ارشاد میں شفاء لما فی الصدور سے قرآن نے روحانی نظام کی طرف رہنمائی کی ہے یعنی قرآن دل کی ساری بیماریوں کے لیے نسخہ شفا ہے۔ دل کا بیماریوں سے صحت یاب ہو جانا ہی روحانیت ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ نفس انسانی رذائل سے پاک اور فضائل سے آراستہ ہو جائے ما فی الصدور سے رذائل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ رذائل کا ذکر بنیاد ہے اور یہی تخلیہ ہے جب تک نفس انسانی رذائل سے آزاد اور پاک نہ ہوگا تو فضائل کی عمارت قائم نہ ہوگی یعنی تخلیہ نہ ہوگا۔

رذائل کیا ہیں مخش گوئی حسد خود بینی و خود نمائی۔ ریاکاری، فخر و غرور، بغض و کینہ۔ غیظ و غضب حرص و طمع بخل و خوشامد بدگمانی دغابازی۔ بہتان، غیبت۔ دور خاین خیانت و بد دیانتی ان سے آزاد ہو کر یہ فضائل پیدا کرے اللہ کی محبت اللہ کی طاعت اور اس کی رضا جوئی۔ زبان کی سچائی دل کی سچائی، عمل کی سچائی۔ سخاوت عفت و پاکبازی دیانتداری و امانت، شرم و حیا رحم عدل و انصاف عفو و درگذر احسان۔ حلم و بردباری رفق و لطف

خوش کلامی ایثار تواضع وخاکساری، اعتدال ومیانہ روی خود داری اور عزت نفس حق گوئی استقامت اور استغنا۔ رذائل سے پاک ہو کر فضائل سے آراستہ ہو جانا روحانیت ہے۔ اس روحانیت کا معیار مطلوب یہ ہے کہ انسان وہ ہی کچھ پسند کرنے لگے جو اللہ کو پسند ہے اور ہر اس چیز سے نفرت کرنے لگے جو اللہ سبحانہ کو ناپسند ہے اپنے حقیقی آقا اور محبوب کے حکموں پر اس طرح عمل کرنے لگے گویا وہ اسے اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اس کی ناراضگی سے اس طرح ڈرتا رہے گویا اس کے تخت جلال کے سامنے کھڑا ہے۔ اس کی رضا کے لیے اس طرح لپکتا رہے جیسے پیاسا ٹھنڈے پانی کی طرف لپکتا ہے۔

روح میں پاکیزگی اور شفاء لما فی الصدور کی یہ کیفیت پیدا کرنے کیلئے قرآن نے جو بنیادی اور راست تدبیریں مقرر فرمائی ہیں وہ وہی ہیں جن کو افکار و اعمال اور اخلاق کہا جاتا ہے اور جن کے تذکرہ سے قرآن کا کوئی صفحہ خالی نہیں ہے۔ دل کی شفا کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کی فکری، عملی اور اخلاقی حالت کے جس قدر رذائل ہیں ان سب کے لیے قرآن نسخہ شفا ہے۔ روحانی نظام قرآن کا سب سے اہم اور مرکزی حصہ ہے جس کا تعلق انسان کے اندرون سے اور جسے عرف عام میں طریقت، ولایت اور تصوف کہتے ہیں۔

قرآن میں سیاسی وقانونی نظام

اس آیت میں قرآن نے اپنے سیاسی اور قانونی نظام کی طرف ھدی و رحمة للمومنین کہہ کر اشارہ کیا ہے۔ یہاں قرآن نے اپنے سیاسی اور قانونی نظام کے لیے ایمان کی شرط لگائی ہے یعنی اس نظام کے چلانے والوں کے لیے ضروری ہے کہ مومنین ہوں جب کہ دوسری جگہ یہ شرط لگائی ہے کہ سیاسی نظام کو چلانے والے صرف مومن ہی نہیں بلکہ ارباب تقویٰ ہوں ھدی للمتقین یعنی قرآن نے دوسرے نظاموں کی طرح ملکی اور غیر ملکی، قوم اور غیر قوم امیر غریب سرمایہ دار اور مزدور تجارت پیشہ اور زمیندار طبقہ اور غیر طبقہ، پارٹی غیر پارٹی جیسے حجابات اور دیواریں ہٹا کر صرف یہ قید لگائی کہ اس کے چلانے والے اسے ماننے والے اتقیا ہوں۔ قرآن نے اپنے سیاسی نظام کے بنیادی خطوط یہ بتائے ہیں۔

(۱) اقتدار اعلیٰ اور حاکمیت صرف اللہ کے لیے ہے ۔
(۲) اللہ کا رسول دنیا میں اس کی مرضی کا نمائندہ اور اس کے احکام کا مبین اور شارح ہے ۔ قرآن کے سیاسی نظام کے بنیادی مقاصد یہ ہیں ۔
معاشرے میں انصاف قائم کرنا، معاشرے کو نماز قائم کرنے والا زکوٰۃ دینے والا معروف سے خود محبت رکھنے اور دوسروں کو اس کا حکم دینے والا ۔ منکر سے خود نہ کنے والا دوسروں کو روکنے والا بنایا جائے یہ وہ مقصد ہے جو اسلامی حکومت کا خاص اور امتیازی مقصد ہے جو کسی اور جگہ لفظوں کی حد تک بھی موجود نہیں ذرا غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ دراصل پورے دین کے قائم رکھنے اس کی برکتوں کے دائرے کو بڑھاتے رہنے اور معاشرے کو صحیح اسلامی معاشرہ بنائے رکھنے کی ایک بھاری ذمہ داری کا نام ہے ۔
قرآن نے اس آیت میں ھدی سے سیاسی نظام کی طرف اشارا کیا ہے اسی سیاسی نظام کو قرآن نے دوسرے سیاسی نظاموں کے مقابلے میں سب سے زیادہ ٹھیک سب سے زیادہ عادلانہ اور سب سے زیادہ مضبوط اور پائدار بتایا ہے ۔
ان ھذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم
یہ قرآن رہنمائی کرتا ہے ایسی جو سب سے زیادہ پائدار ہے ۔
اس کے بعد لفظ رحمت لاکر قرآن نے اپنے قانونی نظام کی طرف اشارا کیا ہے خود قرآن بھی اللہ کی رحمت ہے، نبی کا وجود بھی اللہ کی رحمت ہے ھذا البصائر من ربکم وھدی ورحمۃ اور وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین ۔ اور اس کے ساتھ قرآن وسنت سے قوانین کا استنباط بھی اللہ کی رحمت ہے لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم ولولا فضل اللہ علیکم ورحمتہ لاتبعتم الشیطان الا قلیلا ۔
قرآن خود کتاب الٰہی ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس کے مبین اور شارح ہیں اور اولی الامر ان دونوں کی مدد سے پیش افتادہ حالات کے لیے قانون کے تقاضے پورے کرتے ہیں یہ سب اللہ سبحانہ کی رحمت ہے ۔
قرآن پر عمل پیرا ہو کر کامیابیوں سے ہمدوش ہونا بھی رحمت ہے سید خلھم اللہ فی رحمۃ اور ادخلنا ھم فی رحمتنا ۔ اللہ سبحانہ کی رحمت بے پایاں ہے ۔ وہ تمام مقامات جن میں کائنات کے افادہ وفیضان زینت وجمال، موزونیت

واعتدال تسویہ قوام اور خوبی و اتقان کا ذکر ہے سب مظاہر رحمت ہیں جس چیز کو ہم جمال کہتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے؟ موزونیت اور تناسب، یہی موزونیت و تناسب سے جو بناؤ اور خوبی کے تمام مظاہر کی اصل ہے اور اس کا مرکز رحمت ہے۔

بہرحال قرآن نے اس آیت میں اپنی جامعیت اور کاملیت کا یہ کہہ کر اعلان کیا ہے کہ قرآن ایسا جامع قانون ہے کہ اس میں ایک طرف اگر روحانی و اخلاقی نظام ہے تو ساتھ ہی عائلی اور معاشرتی نظام بھی موجود ہے اور اس کے ساتھ قرآن سیاسی اور قانونی نظام بھی لے کر آیا ہے۔ دنیا کے تمام نظاموں سے اس کا مقابلہ کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ دنیا کے کسی نظام حیات میں یہ جامعیت نہیں ہے۔

یہ محض قرآن کا مدعیانہ اعلان نہ تھا بلکہ اس کی صداقت کی سب سے مؤثر دلیل بھی تھی اگر ایک شخص دعویٰ کرے کہ وہ طبیب ہے تو سب سے زیادہ اور آسان طریقہ اس کے دعوے کی جانچ کا یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ اس کے علاج سے بیماروں کو شفا ملتی ہے یا نہیں اگر تم دیکھو کہ موت کی آغوش میں پہنچے ہوئے بیمار اس کے ہسپتال میں داخل ہوئے اور تندرست ہو کر نکلے تو تم یقیناً تسلیم کرو گے کہ اپنے دعوے میں سچا ہے قرآن نے بھی جا بجا یہی جانچ منکروں کے سامنے پیش کی ہے اس نے کہا کہ میں جامع قانون ہوں اور ثبوت میں اہل ایمان کی جماعت پیش کر دی جن کو اس نے تیار کیا تھا کہ دیکھ لو یہ تندرست ہو گئے۔

آؤ قرآن کی جامعیت کا واقعاتی طور پر مطالعہ کرو دیکھو قرآن پڑھنے والوں میں قرآن کی تعلیم نے کیا کام کیا ہے۔ کیا تورات کی طرح صرف فوجی افسر اور قاضی بنائے ہیں یا انجیل کی طرح صرف چند ز ہد پیشہ فقرا کی سوغات دی ہے،

قرآن کی تعلیم نے سربراہان مملکت عقلائے زمانہ اسرار فطرت کے محرم۔ دنیا کے جہاں بان اور ملکوں کے سربراہ بنائے ابوبکر الصدیق، عمر فاروق، عثمان غنی، علی مرتضیٰ ہیں معاویہ ابن ابی سفیان ہیں جنہوں نے مشرق سے مغرب تک افریقہ سے ہندوستان کی سرحد تک فرمان روائی کی۔ اور ایسی فرمان روائی جو دنیا کے بڑے بڑے شہنشاہوں اور حکمرانوں کی سیاست و تدبیر اور نظم و نسق کے کارناموں کو منسوخ کر دیتی ہے۔

دوسری طرف قرآن کی تعلیم سے خالد بن الولید، سعد بن ابی وقاص ایسے ابوعبیدہ

ابن الجراح عمرو بن العاص جیسے فاتح اعظم اور سپہ سالار اکبر پیدا ہوتے ہیں جنہوں نے مشرق و مغرب کی دو وسیع حکومتوں کا نشان دنیا سے مٹا دیا۔ تیسری طرف صوبوں اور ضلعوں کے انتظامی سربراہ قرآن ہی کی تعلیم سے پیدا ہوئے جنہوں صوبوں اور شہروں میں کامیاب انتظام کیا۔ جیسے علاء ابن الحضرمی (بحرین) یزید ابن ابی سفیان تیماء میں عمرو بن حزم نجران میں زیاد بن بصد حضر موت میں۔ مہاجر بن امیر کندہ صنعاء میں خالد بن سعید صنعاء میں چوتھی طرف قرآن ہی کی تعلیم سے فقہاء علماء کی جماعت منصہ شہود پر آئی ہے جیسے عمر بن الخطاب علی ابن ابی طالب عبداللہ بن مسعود حضرت عائشہ معاذ بن جبل زید بن ثابت جنہوں قرآن کی روشنی میں فقہ و قانون کی بنیاد ڈالی۔ اور دنیا کے مقننین میں نام پایا پانچویں طرف قرآن ہی کی تعلیم نے مورخین اور ارباب روایت پیدا کیے جیسے ابوہریرہ۔ ابو سعید خدری۔ ابو موسیٰ اشعری عبادہ ابن الصامت جابر بن عبداللہ۔ چھٹی جماعت قرآن نے صوفیا اور دنیا سے بے رخ زہاد کی پیدا کی جن کے نزدیک آج کا کھانا کل کیلئے رکھنا شان توکل کے خلاف تھا۔ اسی پر بس نہیں قرآن کی تعلیم نے مدبرین کی جماعت پیدا کی ہے جیسے طلحہ، زبیر، مغیرہ، مقداد، عبدالرحمٰن بن عوف۔

اس پوری جماعت صحابہ پر غور کرو اور سوچ کر بتاؤ کہ انہوں نے قرآن کے سوا کیا پڑھا ہے یہ قرآن ہی کی جامعیت کی نیرنگیاں ہیں۔

کیا آپ قرآن کی جامعیت کی ان جلوہ آرائیوں کا انکار کر سکتے ہیں آیئے ذرا شارحین کی زبانی بھی آیت کی تشریح سن لیجیے۔

حافظ ابن جریر نے اس طرح داد تحقیق دی ہے۔

"اللہ سبحانہ لوگوں سے فرماتا ہے کہ لوگو تمہارے رب کی جانب سے تمہاری پاس نصیحت آچکی ہے یعنی یہ قرآن تمہیں اللہ کا عذاب یاد کرائے گا اور تمہیں تمہارے رب کی وعید سے ڈرائے گا اور یہ بتائے گا کہ یہ قرآن تمہارے رب کی جانب سے محمد رسول اللہ کا بنایا ہوا نہیں ہے یہی اللہ کی جانب سے موعظت ہے اور شفا لما فی الصدور کا مطلب یہ ہے کہ جاہلوں کی جہالت کو دور کرکے ان کو جہل کی بیماری سے شفا دے گا اور اس کے ذریعے اپنی مخلوق کو ہدایت دے گا اور ھدی کا مطلب

یہ ہے کہ حلال و حرام بتائے گا اللہ کی طاعت کے لیے رہنما ہوگا اور رحمت یہ ہے کہ اللہ سبحانہ اس کے ذریعے اپنی مخلوق پر رحم کرے گا ان کو گمراہی سے بچا کر ہدایت دے اور ہلاکت سے بچائے گا۔"

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں :

"موعظت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن برائیوں سے ہٹانے والا ہے شفا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ شکوک و شبہات کی بیماری سے شفا دینے والا ہے ھدی و رحمۃ کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ذریعے اللہ کی جانب سے ہدایت اور رحمت آئے گی"

علامہ قرطبی فرماتے ہیں :

"اے لوگو! یعنی قریش تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آ چکی ہے یعنی قرآن اس میں مواعظ اور حکمتیں ہیں اور اس میں شک نفاق شقاق اور خلاف سے شفا ہے اور جو اس کی پیروی کرے اس کے لیے راہنما ہے اور ایمان والوں کیلئے نعمت ہے مومنین کی تخصیص اس لیے ہے کہ وہ ہی ایمان کے ذریعے قرآن سے فائدہ حاصل کریں گے۔ یہ ساری قرآن کی صفتیں ہیں اور عطف تاکید مدح کے لیے ہے"۔

امام رازی نے تفسیر کبیر میں اپنی عادت کے مطابق کتاب کے پورے دو صفحوں میں تقریر کی ہے علامہ آلوسی نے روح المعانی میں اس کا خلاصہ نقل کیا ہے۔ لیجیے آپ بھی سن لیجئے۔

"موعظت سے لوگوں کے ظاہری اعمال کو درست کرنے کی طرف اشارہ ہے یہی شریعت ہے اور شفا سے عقائد فاسدہ اور اخلاق دنیہ سے پاک ہونے کی طرف اشارہ ہے یہی طریقت ہے اور ہدی سے صدیقین کے دلوں میں ظہور حق کی طرف اشارہ ہے یہی حقیقت ہے اور رحمت سے درجہ کمال تک پہنچ جانے کی طرف اشارہ ہے جس میں دوسروں میں بھی کمال پیدا کر دے یہی نبوت اور خلافت ہے"۔

آلوسی نے یہ نقل کرنے کے بعد یہ نوٹ بھی لکھ دیا ہے کہ

"یہ بالکل ظاہر آیت کے خلاف ہے۔ ظاہر کا تقاضا تو یہ ہے کہ یہ سب

ہونے کی وجہ سے قرآن کے اوصاف ہیں"۔

علامہ ابوحیان اندلسی نے رازی کی تشریح پر یہ نوٹ لکھا ہے کہ:

"امام رازی نے اس آیت کی تفسیر میں حکمت کے نام پر جو کچھ لکھا ہے ہمیں معلوم ہے کہ اہل عرب الفاظ قرآن سے یہ بات ہرگز نہیں سمجھتے ہیں"۔

علامہ زمخشری فرماتے ہیں:

"تمہارے پاس ایک کتاب نشان جامعیت لے کر آئی ہے اس میں توحید پر وعظ وتنبیہ ہے عقائد فاسدہ کی درستگی کا سامان ہے اور حق کی طرف دعوت اور بلاوا ہے اور اہل ایمان کے لیے سراپا رحمت ہے"۔

قاضی بیضاوی فرماتے ہیں۔

"تمہارے پاس حکمت علمی اور حکمت نظری پر مبنی وہ جامع کتاب آئی ہے جو اچھے برے اعمال کو کھول کر پیش کرتی ہے خوبیوں کی ترغیب دیتی ہے اور برائیوں سے روکتی ہے اور حکمت نظری یہ کہ شکوک اور برے اعتقاد کے لیے نسخہ شفا ہے حق ویقین کے لیے رہنمائی کا کام دیتی ہے اور باعتبار نتائج اہل ایمان کے لیے رحمت ہے۔

علامہ خفاجی نے حاشیہ بیضاوی میں لکھا ہے کہ۔

"یہ کتاب عملیات اور نظریات کا ایک جامع ہے کمال عمل اور کمال علم دونوں اس میں موجود ہیں"

علامہ آلوسی بغدادی فرماتے ہیں:

"مطلب یہ ہے کہ تمہارے پاس ایک فوائد اور منافع پر مشتمل جامع کتاب آئی ہے یہ اچھے اور برے اعمال کو کھول کر بتاتی ہے۔ اچھے اعمال کی ترغیب دیتی ہے برے اعمال سے روکتی ہے معارف حقہ کو بیان کرتی ہے اور راہ حق ویقین کے لیے رہنما ہے، اور نتائج کے اعتبار سے اہل ایمان کے لیے رحمت ہے کہ کفر سے بچا کر ایمان کی نعمت سے مالا مال کرتی ہے۔

یہ مشہور شارحین قرآن ہیں جن کی تشریحات ہدیہ ناظرین کی گئی ہیں دوسرے شارحین قرآن مثلاً علامہ نیشاپوری علامہ السیوطی۔ علامہ مراغی ان کی تشریحات کا خلاصہ بھی اس کے قریب

قریب ہے۔
آیئے اب اردو شارحین قرآن کی زبانی بھی اس آیت کی تشریح سے لطف اندوزی فرمایئے۔ حضرت مولانا اشرف علی قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے ہیں:۔

"اے لوگو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک ایسی چیز آئی ہے جو برے کاموں سے روکنے کے لیے نصیحت ہے اور اگر اس پر عمل کرکے برے کاموں سے بچیں تو دلوں میں جو برے کاموں سے روگ لگ جاتے ہیں ان کیلئے شفا ہے اور نیک کاموں کے کرنے کے لیے رہنمائی کرنے والی اور اگر اس پر عمل نیک کاموں کو اختیار کریں تو رحمت اور ذریعہ ثواب ہے اور یہ سب برکات اہل ایمان کے لیے ہیں"۔

حضرت مولانا محمد شفیع مفتی رحمہ اللہ نے بھی یہی تشریح کی ہے معارف و مسائل میں وہ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے تعویذات وغیرہ کی وادی میں چلے گئے ہیں۔

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کی تشریح اس طرح کی ہے فرماتے ہیں:
"اس آیت میں قرآن کے چار وصف بیان کئے۔

(ا) موعظت یعنی دل میں اتر جانے والی دلیلوں اور روح کو متاثر کرنے والے طریقوں سے ان تمام باتوں کی ترغیب دیتا ہے جو خیر و حق کی باتیں ہیں اور ان تمام باتوں سے روکتا ہے جو شر اور بطلان کی باتیں ہیں کیونکہ عربی میں وعظ کا مفہوم صرف نصیحت ہی نہیں بلکہ ایسی نصیحت جو موثر دلائل اور دل نشین اسلوبوں کے ساتھ کی جائے۔

(ب) شفاء لما فی الصدور دل کی تمام بیماریوں کے لیے نسخہ شفا ہے جو فرد اور جو گروہ بھی اس نسخہ پر عمل کرے گا ان کے قلوب ہر طرح کے مفاسد و رذائل سے پاک ہو جائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کی فکری اور اخلاقی حالت کے جس قدر امراض ہیں ان سب کے لیے یہ نسخہ شفا ہے۔

(ج) یقین کرنے والوں کے لیے ہدایت ہے۔

(د) یقین کرنے والوں کے لیے پیام رحمت ہے یعنی ظلم و غارت اور

بغض و تنفر سے دنیا کو نجات دلانا اور رحم و محبت اور امن و سلامتی کی روح سے معمور ہے"۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے تشریحی نوٹ امام رازی کا وہ اقتباس نقل کیا ہے جو علامہ الوسی نے روح المعانی میں پیش کیا ہے۔ اس کے بعد ایک عام سی تشریح کی ہے۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی معارف القرآن میں لکھتے ہیں

اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک نصیحت آچکی ہے یعنی قرآن حکیم جو تم کو برے کاموں سے روکتا ہے اور نفرت دلاتا ہے اور ان کے برے انجام سے تم کو ڈراتا ہے اور اچھے کاموں کی ترغیب دلاتا ہے اور ایک شفا اور دوا آئی ہے جو سینوں کی بیماریوں کو دور کرنے کے لیے بے حد مفید ہے یعنی قرآن دلوں کی مہلک بیماریوں جہالت ضلالت عقائد فاسدہ شکوک و شبہات اور اخلاق ازہر سے جو روح کے لیے مہلک ہیں شفا بخشتا ہے اور ایمان والوں کے لیے ہدایت و رحمت آچکی ہے یعنی یہ قرآن ایمان والوں کے لیے ہدایت ہے کہ ان کو خدا تک پہنچنے کا راستہ بتاتا ہے اور اپنے پیروؤں کو خدا کی رحمت اور عنایت کا مورد بناتا ہے"۔

حضرت مولانا پیر محمد کرم شاہ ایم اے ازہر لکھتے ہیں۔

اس آیت طیبہ میں قرآن کریم کے فیوض و برکات کا ذکر فرمایا جا رہا ہے موعظت بڑے اخلاص سے نہایت اثر انگیز پیرائے ہیں کسی کو نیکی اور بھلائی کی یاد دہانی کو موعظت کہتے ہیں وقال الخلیل ھو التذکیر بالخیر فیما یرق لہ القلب. اس مفہوم کو پیش نظر رکھتے ہوئے قرآن حکیم کی اس صفت کا جائزہ لیجئے۔ خیر خواہی اور خیر اندیشی کا بے لوث جذبہ ہر آیت میں آپ کو نظر آئے گا جس کی اثر انگیزی کا عالم یہ ہے کہ اس نے صدیوں سے آغوش میں مدہوش ہونے والی قوم کی بیدار کر دیا۔ قرآن کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ سینوں کی لاعلاج اور پرانی بیماریوں کا کامیاب علاج ہے بغض و عناد رشک اور نفاق حسد اور کینہ غرضیکہ ہر قسم کی مذموم صفات سے روح کو پاک کرتا ہے تیسری صفت یہ ہے کہ یہ سراپا ہدایت ہے حق و باطل کو

نکھار کر پیش کرتا ہے کسی قسم کا التباس نہیں رہتا اور حق کا متلاشی راہ ہدایت
کو اپنے سامنے منور پاتا ہے چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ پیکر رحمت ہے جس
کتاب مقدس کا لانیوالا رحمۃ للعالمین ہو اس کتاب کے رحمت مجسم ہونے
میں کیسے شبہ ہو سکتا ہے"۔

مولانا امین احسن اصلاحی تدبر قرآن میں فرماتے ہیں۔

یہاں قرآن کی چار صفتیں بیان ہوئی ہیں ایک یہ کہ یہ تمہارے رب کی
جانب سے موعظت ہے یعنی جن خطرات و مہالک سے لوگوں کو بچنا چاہیے
ان سے آگاہی اور جو لوگ آنکھ بند کئے ان کی طرف بڑھے چلے جا رہے
ہیں ان کو زجر و تنبیہ دوسری یہ شفاء لما فی الصدور ہے یعنی دلوں
کو جو روگ لگے ہیں۔ اور جن کے سبب سے تمام انسانی اوصاف کھو کر مختوم
القلب اور حیوانات سے بدترین بن جاتا ہے ان سب کا اس میں علاج
ہے۔ تیسری اور چوتھی صفت یہ کہ یہ ہدایت و رحمت ہے۔ اس دنیا میں
قرآن ہدایت ہے جو لوگ اس ہدایت کو قبول کریں گے ان کے لیے آخرت
میں ابدی رحمت کی ضمانت ہے۔

افسوس مولانا مودودی نے تفہیم القرآن میں اس آیت کی تشریح پر ایک حرف بھی نہیں ورنہ
ہم ناظرین معالم کی ضیافت طبع کے لیے ان کی تشریح کو بھی ضرور پیش کرتے۔

یہ قدیم اور جدید شارحین قرآن کی تشریحات ہیں۔ اب یہ آپ کے صوابدید پر موقوف
ہے کہ سیاق و سباق اور موضوع سخن کے اعتبار سے آپ کسے پسند کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ موضوع قرآن کی حقیت کو ثابت کرنا ہے اور شروع ہی سے یہ موضوع
چلا آرہا ہے اسی کی لاریبیت کا اعلان ہو رہا ہے اس میں نبوت کی جانب سے ردو
بدل کو ناممکن قرار دیا جا رہا ہے۔ اسی کے لیے یہ چیلنج دیا جا رہا ہے قالوا بسورۃ
من مثلہ اور اسکے حق ہونے پر اللہ کے پیغمبر کو قسم کھانے کا حکم رہا ہے۔ اب اس
آیت میں اسی کی جامعیت کا اعلان ہو رہا ہے اور پوری انسانیت کو پکار کر اعلان
ہو رہا ہے کہ اس قرآن میں موعظت ہے بیماریوں کی شفا ہے اہل ایمان کے لیے
زندگی میں رہنما ہے اور اس کی رہنمائی میں زندگی گذارنے والوں کے لیے سراپا رحمت ہے

جامع ہونے کے ساتھ کمال

۵۸ آپ فرما دیجئے کہ اللہ ہی کے فضل اور اس کی رحمت ہی پر بس ان کو خوشی منانی چاہیے
یہ ان ساری چیزوں سے اچھی ہے جن کو وہ ذخیرہ کرتے رہتے ہیں فرح خوش ہونا محمود بھی ہے
اور مذموم بھی۔ کسی نعمت پر اس حیثیت سے خوش ہونا کہ اللہ کے فضل و رحمت سے ملی ہے
محمود ہے جیسے یہاں فرمایا فبذلک فلیفرحوا اور حطام دنیا پر خوش ہونا اور اکڑنا
خصوصاً یہ خیال کر کے کہ ہم کو اپنی لیاقت سے حاصل ہوتی ہے سخت مذموم ہے۔ قارون
اپنے مال و دولت کی نسبت کہتا تھا انما اوتیتہ علی علم عندی اس کو فرمایا
لاتفرح ان اللہ لا یحب الفرحین وابتغ فیما اتاک اللہ الدار الاخرۃ
ولا تنس نصیبک من الدنیا۔ یعنی اصل چیز اللہ سبحانہ کا فضل و رحمت ہے انسان کو
اس کی تلاش کرنی چاہیے مال و دولت جاہ وحشم سب اس کے مقابلے میں ہیچ ہیں[1]
فرح کے معنے صرف خوش ہونے کے نہیں بلکہ اس پر فخر کرنا، اترانا اور گھمنڈ کرنے
کے ہیں حکم ہو رہا ہے کہ اے پیغمبر اعلان کر دو کہ لوگو تم اللہ کے فضل اور اللہ کی رحمت
سے مالا مال ہوئے ہو تمہیں اس پر پورے عالم میں فخر کرنا چاہیے، گھمنڈ کرنا چاہیے،
لوگ سونے اور چاندی کے ڈھیروں پر اتراتے ہیں، سامان زندگی پر فخر کرتے ہیں جو
دولت تمہیں اللہ سبحانہ کی جانب سے ملی ہے یہ اس دولت سے کہیں بہتر ہے جو لوگوں
کی تجوریوں میں جمع ہے۔ دو لفظ بولے ہیں ایک اللہ کا فضل دوسرے اللہ کی رحمت
فضل کہتے ہیں ان خوبیوں کو جو انسان کی ذات میں ایسا جلا پیدا کر دیں جس سے دوسرے
متاثر ہوں اور رحمت نام اس شرف کا جو آدمی کو بغیر محنت کے خود بخود حاصل ہو۔ نبوت
کا علم سر تا سر رحمت ہے کیونکہ وہبی ہے اور عمل اللہ کا فضل ہے کیونکہ محنت اور مشقت
کے ذریعے حاصل ہوا ہے قرآن نے خود قرآن کو رحمت اور قرآن پر اٹھے ہوئے عمل کو
فضل کہا ہے الا رحمۃ من ربک ان فضلہ کان علیک کبیراً گویا اگر علم
تھیوری اور نظریہ ہے تو فضل اسی علم کا پریکٹیکل اور عملی نمونہ ہے۔ اس آیت میں بتایا

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے کہ وحی کے ذریعے آیا ہو قرآن اگر اللہ سبحانہ کی رحمت ہے تو اسی کے نتیجے میں آپ کی محنتوں، مشقتوں کے نتیجے میں آپ کے دامن میں عمل کا ظہور صرف اللہ کا فضل نہیں بلکہ فضل کبیر ہے علم میں اگر شان اعجاز ہے تو عمل میں شان تعبد ہے علم اگر پڑھنے کی چیز قرآن ہے تو عمل برتنے کی چیز سنتہ ہے اقرآن ہی میں ہے۔

ولولا فضل الله عليكم ورحمته لاتبعتم الشيطان الا قليلاً۔

"دیکھو اگر تم پر اللہ کا فضل اور اللہ کی رحمت نہ ہوتی تو کچھ کے سوا سارے ہی شیطان کے پیچھے لگ جاتے"۔

یعنی ان دو کے ذریعے اللہ نے تمہیں ہدایت دی ہے اب کھلے لفظوں میں رحمت اگر نبوت ہی کا علم ہے جسے ہم قرآن کہتے ہیں تو فضل نبوت ہی پیش کردہ عمل ہے جسے ہم سنتہ کہتے ہیں۔

ان دونوں میں باہمی رشتہ

فضل ورحمت میں باہم ربط کیا ہے آیئے قرآن ہی کی روشنی میں اس علم وعمل میں باہم رشتہ بھی معلوم کریجیے۔ قرآن ہی نے بتایا ہے کہ نبوت کا لایا ہوا علم قرآن اگر ما انزل الله عليك ہے تو نبوت کا قرآن پر عمل اور علم کا پرتو اور نقش ما اراك الله ہے۔ گویا علم اگر آئیڈیا ہے تو آپ کی زندگی آئیڈیل روایت ہے۔ اس لیے ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ ان میں باہم اگر کچھ فرق ہے تو لائف نامہ اور پیام کا فرق ہے۔ قرآن اگر نامہ ہے تو آپ کی زندگی اللہ کا پیام ہے۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ نبوت محمد یہ اسلام کے نام پر جو سرمایہ لے کر آئی ہے وہ سب اللہ کی جانب سے اور دونوں امت کو بطریق تواتر ملے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ قرآن کا تواتر کتابی اور تلاوتی ہے اور عمل کا تواتر عملی ہے۔

پہلی آیت میں جامعیت کا اعلان ہوا ہے کہ قرآن ایک جامع قانون ہے کیونکہ یہ روحانی، اخلاقی عائلی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور قانونی نظاموں کا جامع ہے اس آیت میں بتایا جارہا ہے کہ صرف جامع نہیں بلکہ کامل بھی ہے کیونکہ یہ صرف آئیڈیا ہی نہیں

بلکہ اپنی ساتھ آئیڈیل لائف بھی لے کر آیا ہے۔ اگر صرف آئیڈیا ہوتا تو جامع تو ہوتا مگر کامل نہ ہوتا اب نبوت کی عملی زندگی لے کر قرآن جامع بھی ہے کامل بھی ہے چونکہ یہ جامع اور کامل نعمت تمہیں ملی ہے اس لیئے تمہیں اس پر اترانا چاہیے اور اقوام دنیا کے سامنے اکڑنا چاہیے۔

برہان فضل اور برہان رحمت

رحمت برہان علم کو انسانیت میں اجاگر کرنے کے لیے علم کا نزول حوادث دو قائع کے تحت بتدریج ۲۳ سال کے عرصہ میں ہوا۔ اگر یہ حقیقت ہے اور حقیقت نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جب کہ سینہ قرآن سے ابلی ہوئی صدا یہی ہے۔

لولا نزل علیہ القران جملۃ واحدہ کذالک لنثبت بہ

کیوں نہیں اتارا گیا اس پر قرآن یکبارگی۔ اسی طرح ہوا ہے تاکہ ہم جمائے رکھیں اس کے ذریعے تیرے دل کو۔

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ قرآن اس لیے آہستہ آہستہ نازل ہوا ہے کہ اعمال و مظاہر کی تشکیل ساتھ ساتھ ہو کر حقائق پوری طرح دل میں جم جائیں۔

جب علم کے ہر گوشہ کی پشت پر ایک مقررہ نظام عمل کے مظاہر موجود ہوں تو قدرتی طور پر ہر شخص کو متمتع ہونے کا موقعہ مل سکتا ہے اور ہر آنکھ دیکھ سکتی ہے کہ علم کے ساتھ عمل بار حمت کے ساتھ فضل کی کارفرمائیاں کام کر رہی ہیں چنانچہ وہ تمام اعمال نبوت جن میں مقام نبوت کے افادہ و فیضان اور زینت و جمال کا ذکر کیا گیا ہے۔ دراصل اسی استدلال پر مبنی ہیں اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ صرف نظریاتی طاقت سے دنیا میں اس وقت تک کوئی مؤثر تبدیلی نہیں آتی ہے جب تک نظریات کی پشت پر عمل د کردار کی قوت نہ ہو۔ اگر صرف نظریات میں افادی طاقت ہوتی تو کتاب کے ساتھ نبی کی شخصیت نہ ہوتی اور اگر محض عمل ہی میں اصلاح کی ضمانت ہوتی تو نبوت کے ساتھ علم نہ ہوتا امر واقعہ یہ ہے کہ علم بغیر عمل کے اور عمل بغیر علم کے یا نظریہ بغیر واقعہ کے اور واقعہ بغیر نظریہ کے اصلاح و تعمیر کی راہ میں ادھوری اور نامکمل ہدایت ہے۔ ہدایت کے کمال کے لیے ضروری ہے کہ علم و عمل کی دونوں قوتیں موجود ہوں۔

جیسے علم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں بھرپور صداقت ہو ایسے ہی عمل کی سب سے بڑی اچھائی یہ ہے کہ اس میں حسن ہی حسن ہو۔ اسی لیے قرآن میں علم نبوت کے لیے صداقت اور عمل نبوت کے لیے حسن کی تعبیر آئی ہے۔

گویا نبوت نے دنیا کو جو کچھ دیا ہے وہ سچے علمی حقائق اور حسین وخوبصورت عملی نظام کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور کیوں نہ ہو جب کہ یہ حقیقت ہے کہ نبوت اللہ سبحانہ کی نمائندگی کا نام ہے اللہ کی ذات اگر مجمع الکمالات ہے تو ضروری ہے کہ نبوت مجمع الکمالات ہو۔ علم کی حد تک اگر قرآن حکیم ایک جامع قانون ہے تو اس کے نقش کو بھی مجمع ہونا چاہیے تاکہ دونوں کی ہم آہنگی سے بھرپور تکمیل ہو۔

یہ اگر واقعہ ہے تو اس پر خوشی کیوں نہ منائی جائے اور اقوام دنیا کے سامنے کیوں نہ اس پر فخر کیا جائے۔ اوروں کا پتہ نہیں ہے مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اسلام میں دو عیدیں اسی فضل ورحمت پر خوشی منانے کے مطالبے کے لیے عملی شاہکار ہیں۔ میری مراد عید الفطر اور عید الاضحیٰ ہے۔

افترائی قانون سازی

۵۹؎ اے اللہ کے رسول ان سے کہو لوگو کیا کبھی تم نے اس پر غور کیا ہے کہ جو روزی اللہ نے تمہیں دی ہے پھر تم نے اس میں حرام وحلال بنا لیا ہے اے پیغمبر ان سے کہو کہ کیا تم کو ایسا کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے یا تم اللہ پر بہتان باندھ رہے ہو۔ یعنی قرآن جو نصیحت شفا اور ہدایت ورحمت بن کر آیا ہے وہی استناد وتمسک کے لائق ہے۔ احکام الٰہیہ کی معرفت اور حلال وحرام کی معرفت اسی سے ہو سکتی ہے۔ یہ کیا واہیات ہے کہ اللہ سبحانہ نے تو تمہارے انتفاع کیلئے ہر قسم کی روزی پیدا کی پھر تم نے محض اپنی آراء اور اہواء سے اس میں سے کسی چیز کو حلال کسی کو حرام ٹھہرا لیا۔ بھلا تحلیل وتحریم کا تم کو کیا حق ہے کیا تم یہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہو کہ اللہ نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے یا یوں ہی اللہ پر افترا کر رہے ہو۔ اگلی آیت میں صاف اشارہ کر دیا کہ بجز افترا علی اللہ کے اور کچھ نہیں جن چیزوں کو حلال وحرام کیا تھا ان کا مفصل تذکرہ سورہ مائدہ اور انعام میں گذر چکا ہے ۱؎

۱؎ افادات شیخ الاسلام

پہلی آیت میں قانون الٰہی کا چہرہ پیش کیا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ قانونی نظام کے سارے اجزا جس مرکز سے حرکت اور زندگی حاصل کرتے ہیں وہ صرف اللہ سبحانہ کی حاکمیت ہے معاشرے کے سارے اعتقادات اور سارے اعمال و افکار اللہ سبحانہ کے بارے میں تصور آمریت پر استوار ہیں۔ انسانیت کے تمام خارجی ادارے اور تمام نظامات اسی ایک مصدر سے مشتق ہیں۔ مملکت کا قانونی نظام، معاشرے کا اخلاقی ضابطہ اعمال و فرائض کی ساری شاخیں غرض کہ انسانی زندگی کا ہر معمولی سے معمولی جزو بھی بالواسطہ اور بلاواسطہ اسی مرکز سے ہے اور یہ بالکل ٹھیٹھ عقلی بات ہے جو خالق ہے وہی آمر ہے ما انزل اللہ لکم من رزق میں رزق صرف روزی کے معنے میں نہیں بلکہ دین کے معنے میں بھی ہے بر یہاں واقعہ بھی ہے اور اظہار حق بھی الا له الخلق والامر یعنی جس نے یہ کائنات بنائی ہے اس کے ہر گوشہ میں اسی کا امر ہے قرآن کا مخاطب ان سب باتوں کو مانتا ہے ان سے دریافت کیا جا رہا ہے کہ یہ جو تم نے ہماری دی ہوئی نعمتوں میں تحریم و تحلیل کی قانون سازی کر رکھی ہے اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ یہ تم نے خود کر رکھی ہے یا اللہ نے ایسا کرنے کی تمہیں اجازت دی ہے۔ اگر اللہ کی جانب سے ہے تو اس کا ذریعہ کیا ہے وحی و نبوت کا تم انکار کرتے ہو۔ اس کے سوا کچھ نہیں کہ تم اللہ کے نام پر جھوٹ کی دکان چلا رہے ہو تم نے اپنی رائے اور اپنے گمان سے یہ بے پر کی اڑا دی ہے کہ یہ حرام ہے اور یہ حلال ہے تمہیں کچھ پتہ بھی ہے کہ یہ کتنا سخت باغیانہ جرم ہے جو تم کر رہے ہیں جو کچھ نعمتیں ہیں وہ اللہ کی ہیں اور تم خود اللہ کے ہو یہ حق آخر تمہیں کس نے دیا ہے کہ اللہ کی املاک میں اتنے تصرف استعمال اور انتفاع کے لیے خود قانونی قدغنیں قائم کرو اگر کوئی مملوک یہ دعویٰ کرے کہ مالک کی املاک میں تصرف کی حدیں مقرر کر لینے کا اسے خود حق ہے تو اس کے متعلق تمہاری رائے کیا ہے تم خود مان رہے ہو کہ اللہ کی مخلوق ہو اور یہ بھی مانتے ہو کہ جو کچھ بھی ہے اللہ کا ہے اور پھر اس اللہ کی دی ہوئی نعمتوں میں تصرف کے حدود و قوانین بنانے ہو اور مالک سے پوچھنا ہی نہیں چاہتے ہو۔ تحلیل و تحریم کے بارے میں تمہارے خود ساختہ اس وقت صحیح ہو سکتے ہیں جب اللہ سبحانہ نے تمہیں ایسا کرنے کی اجازت دی ہو سوال یہ ہے کہ واقعی تمہارے پاس کوئی ایسی دستاویز ہے کہ اللہ نے تمہیں ایسا کرنے کی اجازت دی ہے اور ایسا یقیناً نہیں ہے کیونکہ تم وحی و نبوت کو مانتے ہی نہیں ہو اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ

تم ہماری بغاوت پر کر رہے ہو کہ خود تحلیل و تحریم کی حد بندیاں قائم کر رہے اور ہمارے نام پر کر رہے ہو یہ مزید جھوٹ اور افترا پردازی کر رہے ہو۔

آیت کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ انسانی زندگی کے لیے قانون سازی کا حق صرف اللہ کا ہے۔ کسی بھی انسان کو یہ حق نہیں کہ وہ انسانوں کے لیے شارع بن بیٹھے۔ ان کا سنگین جرم یہ ہے کہ تحریم و تحلیل کی قانون سازی کر کے انسانوں پر خدائی قائم کر رہے ہیں اور اللہ کی مخلوق ہیں یہ جرم بغاوت ہے اس جرم کی سزا کس قدر سنگین ہے؟ اس کا ذکر آگے آرہا ہے

باغیانہ فرد جرم کی سزا

۶۰ اور ان لوگوں کا کیا خیال ہے قیامت کے بارے میں جو اللہ پر جھوٹ بول کر افترا پردازی کرتے رہتے ہیں بلا شبہ اللہ سبحانہ لوگوں پر بڑا ہی مہربان ہے لیکن لوگوں کی اکثریت ناشکر گذار ہے یعنی یہ لوگ روز قیامت کے متعلق کیا خیال کر رہے ہیں کہ کیا معاملہ ان کے ساتھ ہو گا سخت پکڑے جائیں گے یا سستے چھوٹ جائیں گے۔ عذاب یقیناً بھگتنا پڑے گا یا نہیں کن خیالات میں پڑے ہیں۔ یاد رکھیں جو دردناک سزا ملنے والی ہے وہ ٹل نہیں سکتی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ سبحانہ دنیا میں بہت کچھ مہلت دیتا ہے بہت تقصیرات سے درگزر کرتا ہے لیکن بہت سے لوگ نرمی اور اغماض کو دیکھ کر بجائے شکر گذار ہونے کے اور زیادہ دلیر اور بے خوف ہو جاتے ہیں آخر سزا دینی پڑتی ہے۔

علم حق یا تو مواسا ہا کند چوں تو از حد گذری رسوا کند[1]

علامہ بقاعی نے اس کی تشریح اس طرح کی ہے کہ ان افترا کرنے والوں کی افترا پردازی کے لیے کوئی دستاویزی سہارا نہ تھا اس لیے فرمایا کہ قیامت جس کا آنا یقینی ہے اس کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے یہاں تو اپنے کردار پر تمہیں شرم نہیں آتی اور دنیوی سزا کا تمہیں کوئی اندیشہ نہیں ہے لیکن قیامت کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے کیا تمہارا اس دور کا محاسبہ نہ ہو گا کیا تمہارا رب و مالک تمہیں سزا نہ دے گا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دنیا اس کے معاملہ سے دھوکہ میں پڑ گئے اور اس کی یہاں شان حلیمی کو دیکھ کر سمجھ رہے ہو کہ تمہارے جرائم کی تم کو کوئی سزا نہ ملے گی۔ دنیا میں تو اللہ سبحانہ کے مخلوق پر انعامات ہی انعامات ہیں۔ یہاں اپنی رضا بتانے کے لیے وہ رہنمائی کرتا ہے رسول روانہ کرتا ہے وہ کتابیں نازل کرتا ہے۔ یہاں لوگوں کو مہلت پر مہلتیں ملتی رہتی ہیں۔ لیکن اکثر لوگ اللہ سبحانہ کے اس انعام کی کوئی قدر نہیں کرتے ہیں کتابیں اور رسولوں کی پیروی نہیں کرتے ہیں وہ کردار اختیار کرتے ہیں جو اللہ کی ناراضگی کا باعث بنتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آیت میں افترا علی اللہ کذبا کے جرم کی انتہائی شناعت کا اظہار ہے سوال کیا ہے کہ جو لوگ اللہ پر جھوٹ لگا رہے ہیں قیامت کے دن ان کا کیا گمان ہے؟ جواب دیئے بغیر بات ختم کر دی ہے جو متکلم کے انتہائی غضب کی دلیل ہے یعنی کیا یہ شامت زدہ لوگ اس جرم عظیم کو کوئی معمولی بات سمجھے بیٹھے ہیں۔ قیامت آئے گی تو پتہ چلے گا کہ اس جسارت کی کیا سزا ملتی ہے۔ اور ان اللہ لذو فضل کا مطلب یہ ہے کہ ان کا یہ باغیانہ جرم ایسا سنگین ہے کہ لوگوں کے بڑے بڑے جرائم کے باوجود ان کو مہلت بھی دیتا ہے اور ان کو اپنے رزق و فضل سے بھی محروم نہیں کرتا کہ اگر وہ اپنے جرم کی تلافی اور توبہ و اصلاح کرنا چاہیں تو کر لیں لیکن لوگوں کی اکثریت کا حال یہی ہے کہ وہ شکر گذار نہیں ہوتے بلکہ اس ڈھیل اور درگذر سے ان کی حماقت اور شرارت میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔

آیت قرآنی کا منطوق تو یہی ہے کہ اللہ کے بندوں کے لیے تحریم و تحلیل کی قانون سازی باغیانہ جرم ہی نہیں بلکہ ناقابل معافی مشرکانہ عمل ہے یہ خدا کے مقابلے میں خدائی کا دعویٰ ہے۔ کسی چیز کو قانونی طور پر حرام قرار دینے کا حق صرف اللہ سبحانہ کو ہے کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ محض وہم و گمان کی بنا پر کوئی چیز حرام قرار دے۔ انسان کے عقائد و اعمال کی بنیاد علم و یقین پر ہونی چاہیے نہ کہ وہم و گمان پر قرآن مشرکین کی بنیادی گمراہی یہی قرار دیتا ہے کہ علم و یقین کی کوئی روشنی اپنے سامنے نہیں رکھتے محض اوہام و ظنوں کے پرستار ہیں۔

اللہ سبحانہ کی جانب سے کسی چیز کو حرام صرف دو راہوں سے قرار دیا جا سکتا ہے یعنی قرآن کے نزدیک انسانی زندگی کے لیے قانون سازی کے دو ہی طریقے ہیں ایک استنباط دوسرے اجتہاد۔ ان دو کے علاوہ جو قانون سازی کی جائے گی اس کی بنیاد ظن و خیال اور اوہام و خرافات پر ہوگی حتیٰ کہ علما نے تصریح کی ہے کہ قانون کی اساس اولیا کا الہام بھی نہیں ہو سکتا ہے۔

وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَّمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِنْ
قُرْاٰنٍ وَّ لَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ
تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ
فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَ لَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ
اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿٦١﴾

اے اللہ کے رسول آپ کی کوئی حالت اور آپ کے قرآن کی تلاوت بھی اور لوگو تمہارے اعمال میں سے کوئی عمل بھی جب تم اس میں مصروف ہوتے ہو ایسا نہیں ہے کہ ہم سے اوجھل ہو۔ آسمان و زمین میں کوئی چیز بھی ذرہ کے برابر تیرے رب کے علم سے غائب نہیں ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی، اور بڑی سے بڑی چیز ایک واضح کتاب میں درج ہے[۴۷]

مفردات کے معانی

تفیضون افاضہ سے مضارع کا جمع مذکر حاضر ہے مادہ فیض ہے جو باب ضرب

سے خاص بفیض آتا ہے جس کے معنے بہنے اور جاری ہونے کے ہیں اسی سے افاضہ کے معنے گھسنے اور کسی کام میں لگنے کے ہیں۔ اس کا استعمال جب باتوں کے متعلق ہوتا ہے تو باتوں میں غوض کرنے اور مشغول ہونے کے ہوتے ہیں۔

یعزب باب نصر اور ضرب دونوں سے آتا ہے اس کے معنے دور ہونے اور غائب ہونے کے ہیں۔ جو شخص ملک سے دور نکل جاتا ہے اسے عزب کہتے۔ کنوارے کو بھی عزب کہتے ہیں اس کی جمع اعزاب آتی ہے۔

کتاب مبین کھلی اور واضح کتاب قرآن کی اصطلاح میں کسی بات کے ٹھہرا دینے اور قطعی طور پر نافذ کر دینے کو کتابت کہا جاتا ہے جیسے کتب علیکم الصیام۔

قرآن قطعی اور غیر مشتبہ علم ہے

دنیا کے دوسرے قوانین سے قرآن کی سب سے بڑی اور فوق البشر خصوصیت اس کا علم قطعی اور یقینی ہے۔ قرآن کی اس خصوصیت میں کوئی انسانی کلام اور کوئی انسانی قانون قرآن کے ساتھ شریک نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے اس لیے کہ قرآن کا سرچشمہ اور ماخذ علم الٰہی ہے، یہ سرچشمہ ہر قسم کے عیب و نقصان شک و اشتباہ، ظن و تخمین، تدریج و ترقی اور تعارض و اختلاف سے پاک ہے اس میں جو کچھ ہے وہ یقینی ہے۔ شاہد اور مرئی ہے یکساں اور آخری ہے اللہ کا علم تدریجی اور ترقی پذیر نہیں ہے اس کا علم اس کی دوسری صفات کی طرح ابدی اور دائمی ہے اس کا علم پورے طور پر حاوی اور محیط ہے۔ اس کو غیر محسوس اور غیر مادی چیزوں کا بھی علم ہے اور اس کے علم سے کائنات کا کوئی ذرہ خارج نہیں ہے قرآن اللہ کے علم سے ماخوذ ہے اس لیے وہ اس کی خصوصیات کی حامل اور اس کا مظہر ہے۔

اس کے مقابلے میں انسانی قوانین کو دیکھئے ان کا سرچشمہ بے عیب نہیں اس کا ماخذ اور ان کی بنیاد اکثر ظن و قیاس ہے۔ اس کے ذرائع علم بھی نہایت محدود ہونے کے باوجود کمزور ہوتے ہیں۔ انسان کے پاس علم کے لیے سب سے بہتر ذریعہ اس کے حواس خمسہ ہیں جو علم ان کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے وہ بدیہی ہے۔ عقلیات میں بھی انسان کے علم کی بنیاد دراصل محسوسات ہی ہیں ان ہی علوم و ادراکات کو انسان مقدمہ بنا کر ایسا نتیجہ نکالتا ہے جو اس کو حواس کے ذریعہ پہلے سے معلوم نہیں تھا۔ اور عقل کا حال یہ ہے کہ اس کے مدارج

میں بے انتہا تفاوت ہے پھر اس سب کے بعد بھی انسان کا علم اپنے محدود دائرے میں پورے طور پر حاوی اور کامل نہیں ہے۔ پھر اس کے علم میں تدریج اور اس کی معلومات میں ترقی ہے۔ اس طرح قانون سازی اور سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی نظام کی تشکیل میں وہ غلطی کرے گا۔ ایک ماخذ نہ ہونے کی وجہ سے مختلف نظاموں اور قوانین کا تصادم ہوگا۔ قانون قانون سے ٹکرائے گا۔

ان تمام خرابیوں کا سرچشمہ انسان کا علم ہے جو ناقص اور ظنی ہے اس کے مقابلے میں اللہ کا علم قطعی اور یقینی ہے اس کی پہنائیوں کی آخری حد نہیں۔ انسانوں کو ہی صرف نہیں جانتا ہے بلکہ انسانوں کے سارے اطوار، سارے اقوال اور انسانی زندگی کے سارے اس کی علمی گرفت میں ہیں بلکہ عالم زیریں اور عالم بالا کی کوئی ذرہ برابر چیز بھی ایسی نہیں جس پر اس کی علمی دسترس نہ ہو اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ہر چیز لبادہ وجود پہننے کے بعد چھوٹی ہو یا بڑی ضبط تحریر میں ہے۔

سوچنے کی بات ہے کہ انسانی زندگی کے لیے کونسا قانون پائدار ہو سکتا ہے وہ جس کی بنیاد ظن وتخمین پر ہے یا وہ جو علم ویقین کی اساس پر قائم ہے۔

لے اے اللہ کے رسول آپ کی کوئی حالت اور آپ کی تلاوت قرآن اور اے لوگو! تمہارے اعمال میں سے کوئی عمل بھی جب اس میں مصروف ہوتے ہو ایسا نہیں ہے کہ ہم سے اوجھل ہو۔ آسمان وزمین میں کوئی ایسی چیز بھی ذرے کے برابر تیرے رب کے علم سے غائب نہیں ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز ایک واضح کتاب میں ہے پہلے قرآن حکیم کے اوصاف بیان کئے تھے کہ وہ سراپا نور ہدایت، شفائے قلوب نعمت عظمیٰ اور رحمت کبریا ہے۔ پھر اشارہ کیا کہ ہدایت وبصیرت کی ایسی صاف روشنی کو چھوڑ کر لوگ اپنے خیالات واوہام کے اندھیرے میں بھٹکے پھرتے ہیں اور اللہ سبحانہ پر افترا کر کے اس کے فضل وانعام کی ناقدری کرتے ہیں۔ اس آیت میں متنبہ کیا کہ لوگ کس حال میں ہیں اور پیغمبر علیہ السلام کی کیا شان ہے آپ شب وروز مالک حقیقی کی وفاداری اور ہمدردی خلائق کی جن مشئون عظیمہ کے مظہر بنتے ہیں خصوصاً آپ کی جو امتیازی شان قرآن کریم کے پڑھنے اور پڑھانے کے وقت ظاہر ہوتی ہے یعنی قرآن کے ذریعے سے آپ جو جہاد کر رہے ہیں وہ سب اللہ سبحانہ کے حضور میں ہے۔ اور لوگ جو کچھ اچھا یا برا معاملہ کرتے ہیں وہ سب اللہ کی نظر کے سامنے ہے جس وقت مخلوق کوئی کام کرتی ہے اور اس میں

مشغول و منہمک ہوتی ہے خواہ اسے اللہ کا تصور نہ آئے لیکن اللہ سبحانہ اپنے برابر دیکھ رہا ہے فان لم تکن تراہ فانہ یراک۔ زمین و آسمان میں کہیں ایک ذرہ برابر یا اس سے چھوٹی بڑی چیز نہیں جو اللہ کے علم محیط سے غائب ہو بلکہ علم الٰہی سے نیچے اتر کر تمام ماکان دمایکون کا حال کتاب مبین لوح محفوظ میں ثبت ہے جسے عالم تدبیر میں صحیفۂ علم الٰہی کہنے ہیں جب حق تعالیٰ پر کوئی سے ادنیٰ سے ادنیٰ چیز بھی پوشیدہ نہیں تو ان مکذبین و معاندین کے معاملات و احوال کیسے مخفی رہ سکتے ہیں۔ پھر روز جزا کی کارروائی کے متعلق یہ کیا خیال کر رہے ہیں وہ خوب سمجھ لیں کہ ان کی ہر چھوٹی بڑی حرکت اللہ سبحانہ کے سامنے ہے وہاں کوئی خیانت اور چوری نہیں چل سکے گی۔ ہر عمل کی سزا مل کر رہے گی اور جس طرح دشمنوں کے معاملات اس کے سامنے ہیں۔ ان کے بالمقابل دوستوں کا ذرہ ذرہ حال بھی اس کے علم میں ہے لے

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے مخلوق کے مقابلے میں اپنے علم کی وسعتوں اور کو بتایا ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔

"اللہ سبحانہ بتا رہے ہیں کہ وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اور امت کے سارے احوال کو اور ساری مخلوقات کے سارے حالات کو ہر لمحہ، ہر گھڑی اور ہر آن جانتا ہے۔ اور اس کی علمی پہنائیوں سے ذرہ برابر چھوٹی بڑی چیز پوری کائنات میں غائب نہیں ہے"۔

آگے ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اللہ سبحانہ کے علم کی پہنائیوں کے موضوع پر یہ آیت بھی قرآن کی اس آیت کی طرح ہے۔

وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمھا الا ھو ویعلم ما فی البر والبحر وما تسقط من ورقۃ الا یعلمھا ولا حبۃ فی ظلمات الارض ولا رطب الا فی کتاب مبین۔

دونوں آیتیں ایک ہی مطلب کی حامل ہیں اور دونوں کا منطوق و مدلول ایک ہے یعنی اللہ کا سبحانہ کا علم محیط ہے اس کو ہر ہر ذرے کی خبر ہے کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کے

لے افادات شیخ الاسلام

دریائے علم سے باہر ہو۔ کائنات میں جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے اور یا ہوگا ازل ہی میں ان سب باتوں کا اسے علم تھا اور ہے اور وہ عالم کیوں نہ ہو جب وہی کائنات کا خالق ہے وہی اسے باقی رکھنے والا ہے اور وہی اس کی پروردگاری کر رہا ہے۔ علامہ بیاضی نے الفقۃ الاکبر کے حوالہ سے بتایا ہے کہ:

"اللہ سبحانہ ازل ہی میں اشیا کے وجود میں آنے سے پہلے ان کا عالم تھا یعنی ازل ہی میں اللہ سبحانہ کو کلیات وجزئیات معدومات ومحالات کا علم تھا"۔

قرآن میں ہے۔

"الا یعلم من خلق وھو اللطیف الخبیر"۔

یہاں اللہ سبحانہ کی شان علمی یہ بتانے کے لیے بیان کی گئی ہے کہ دنیا میں انسانوں کے بنائے ہوئے نظاموں کی بنیاد ظن وگمان اور تخمین وقیاس پر ہوتی ہے جب کہ قرآنی نظام کی اساس علم ویقین پر ہے قرآن ہی نے دوسرے نظاموں کا یہ چہرہ پیش کیا ہے۔

وما یتبع اکثرھم الا ظنا ان الظن لا یغنی من الحق شیئا۔

ان اللہ علیھم ما یفعلون۔

یہاں قرآن یہ بتا رہا ہے کہ جس قرآن کا قانون کی حیثیت سے پہلے یہ چہرہ بیان ہوا ہے کہ وہ موعظت ہے سینوں کی بیماریوں کے لیے شفا ہے اہل ایمان کے لیے زندگی کا رہنما ہے اور اس رہنمائی کے نتیجے میں ان کے لیے رحمت ہے اس قرآن کا سرچشمہ انسانوں کی رائے قیاس اور تجربہ نہیں بلکہ اس کی اساس علم الٰہی ہے اور جو قانون اس اساس پر قائم ہو اور جس کا قانونی نظام اور اخلاقی ضابطہ اللہ سبحانہ کے علم کامل سے مشتق نہ ہو وہ اپنے نصب العین کو کبھی نہ پا سکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک اچھی مملکت صرف علم ربانی کی اساس پر قائم ہو سکتی ہے کیونکہ اللہ سبحانہ کی ذات اور صفات کا تصور انسان کی عقلی قوتوں کے بس سے باہر ہے۔

قرآن کا سارا قانونی نظام علم الٰہی کی اساس پر قائم ہے۔ خدائی علم ہی وہ مرکز ہے جس پر قرآن ہی دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ ایک صحیح اساس پر قائم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کے علم کا تصور نہ صرف انسان کی انفرادی زندگی کے لیے ضروری ہے بلکہ

اجتماعی زندگی کے اعلیٰ ترین مقاصد کا حصول ہی علم الٰہی کی رہنمائی سے وابستہ ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ اجتماعیت ایک ایسا ادارہ ہے جو افراد کی تکمیل ذات اور ارتقائے شخصیت کے وسائل مہیا کرتا ہے اور یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ شخصیت کی تکمیل عبادت ہے قابو یافتہ ارادے سے ایسا ارادہ جس میں بے قیدی اور بے آئینی معدوم ہو چکی ہو اور اعلیٰ درجہ کا ضبط پایا جاتا ہو۔ ظاہر ہے کہ ارادہ وہی ہو سکتا ہے جو خارجی مؤثرات کی مدد سے بالکل بے نیاز ہو یعنی ارادے کا یہ ضبط خارجی قیود اور حدود سے نہ پیدا ہو بلکہ کسی اعلیٰ اصول پر مبنی ہو۔ جو انسان انسانوں کے بنائے ہوئے قانونی دباؤ یا رائے عامہ کے خوف سے اعمال و کردار کی راستی اختیار کرتا اور اپنے ارادے کو ضبط میں رکھتا ہے اس کی آئین پسندی اور ضابطہ شناسی ایک عارضی اور سطحی کیفیت ہے جو خارجی مؤثرات کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ زندگی اور عمل کے اس دائرے میں جو مملکت اور اس کے قانونی نظام کی رسائی سے خارج ہے ایسے افراد کی بے قیدی بدستور باقی رہتی ہے یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کی تکمیل ذات اور ارتقائے شخصیت کو ایک ایسے اعلیٰ مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اگر مملکت اس کے قوانین اس کی فوج اور پولیس اور معاشرے کی رائے عامہ غرض کہ ہر خارج کی ہر قوت اس کے سامنے سے ہٹائی جائے تب بھی اس کا تربیت یافتہ نفس اور قابو یافتہ ارادہ اسے راستی اور نیک عملی کی راہ پر ثابت قدم رکھتا ہے کیونکہ اللہ سبحانہ کے تصور اور اس کے قانون مکافات کے تصور سے انسان کہیں بچ نہیں سکتا ہے۔ وہ ہر حال ہر آن اور ہر مقام پر اس کے جذبہ خوف اور جذبہ الفت سے اپنا خراج وصول کرتا ہے۔

اس طرح قانون کی پشت پر اللہ سبحانہ کا اعتقاد اجتماعیت کے مقاصد کی تکمیل کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا حکومت کے وجود کے لیے فوج اور پولیس کا ہونا ضروری ہے اس لیے اجتماعی زندگی کا قانونی نظام بھی اللہ سبحانہ کے علم لامتناہی پر مبنی ہونا چاہیے کیونکہ اللہ سبحانہ کی پسند و ناپسند یدگی کا علم انسان کو صرف وحی و نبوت ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ یوں ہی اگر کسی قانون کے بارے میں یہ تصور کیا جائے کہ اسے ہمارے ہی جیسے انسانوں نے بنایا ہے تو اس کی حرمت و طاعت کا وہ طاقتور جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا جو اس احساس سے پیدا ہوتا ہے کہ قانون ہماری اور آپ کی مرضی کا نام نہیں ہے بلکہ علم الٰہی سے

براہ راست وجود پذیر ہوا ہے۔ اللہ سبحانہ کی ذات وصفات کا تصور صحیح انسان کی تکمیل ذات اور ارتقائے نفس کی سب سے پہلی اور ضروری شرط ہے کیونکہ کائنات میں شخصیت کے جس قدر مظاہر ہیں وہ سب اللہ سبحانہ سے ماخوذ ہیں اور تکمیل ذات اور ارتقائے نفس نام ہے اس مبدأ اول سے قرب حاصل کرنے اور اپنے اندر اس کی صفات پیدا کرنے کا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اتباع سنت کو لازم قرار دیا ہے کیونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ذات الٰہی کی صفات کا قریب ترین مظہر ہے اور تکمیل ذات کی جدوجہد اس نمونہ کامل کی اتباع کئے بغیر بے معنے ہے۔

قرآن کا سب سے بڑا شرف واعجاز ہی یہ ہے کہ اس کے تمام اجزا جس مرکز سے حرکت اور زندگی حاصل کرتے ہیں وہ علم الٰہی ہے۔ اس کے جملہ اعتقادات اور سارے اعمال وافکار اسی تصور کی بنیاد پر استوار ہیں۔ قرآن نے صفات الٰہی کی تصریح وتوضیح میں جس جامعیت سے کام لیا ہے وہ دنیا کے مذاہب میں مفقود ہے۔ قرآن کے تمام خارجی ادارے اور تمام نظامات اسی مصدر سے مشتق ہیں اجتماعیت کا تصور، قانونی نظام رسول کی شخصیت اور اس کا منصب معاشرے کا اخلاقی ضابطہ اعمال فرائض کی تمام شاخیں علم الٰہی اور وحی سے وابستہ ہیں علم الٰہی کے بنیادی تصور کو نکال دیجئے تو قرآن کا کوئی جزء اپنی اصلیت پر قائم نہیں رہ سکتا۔ اسی لیے قرآن نے اپنے مخاطبوں کو للکار کر کہا ہے:

"فان لم تستجيبوا لكم فاعلموا انما انزل بعلم الله وان لا اله الا هو۔ فهل انتم مسلمون"۔

"مسلمانو! اگر یہ لوگ تمہاری دعوت پر لبیک نہ کہیں تو سمجھ لو کہ قرآن اللہ ہی کے علم سے اتارا گیا ہے اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی حاکم نہیں۔ کیا تم فرماں برداری کرو گے"۔

یعنی قرآن اللہ کے علم سے ماخوذ ہے اس لیے وہ اس کی خصوصیات کا حامل اور اس کا مظہر ہے۔

بہرحال آیت قرآنی کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کسی انسان کی رائے گمان خیال ظن وتخمین کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس ذات گرامی جل شانہ کے علم کا شاہکار ہے جس کی علمی پہنائیوں سے نہ پیغمبر کے حالات اور نہ پیغمبر کی تمہارے سامنے تلاوت اور نہ تمہارے اعمال کا کوئی

گوشہ باہر ہے عالم بالا اور عالم زیریں میں کوئی ذرہ بھی اس کے علم کی گرفت سے باہر نہیں ہے اب تم خود سوچو ایک طرف تمہارے رائے قیاس وہم وخیال سے بنائے ہوئے حدود و قوانین اور ایک طرف اللہ سبحانہ کے علم کی اساس پر بنا ہوا قانون ؟ کیا دونوں کا مقام ایک ہو سکتا ہے۔

عام شارحین قرآن کے اس آیت کی تشریح کے مطابق نبوت کی تسلی اور مخالفوں کی تہدید سے زیادہ کوئی تعلق نہیں ہے۔ موضوع قرآن حکیم ہے۔ قرآن کا سب سے بڑا معجزہ قرآن کا علم الٰہی پر مشتمل ہونا ہے اور علم الٰہی قطعی اور غیر مشتبہ علم ہے۔ قرآن کی اس خصوصیت میں کوئی انسانی کلام اور کوئی انسانی کتاب قرآن کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہے کیونکہ قرآن کا ماخذ علم الٰہی ہے اور علم الٰہی لامحدود وسعتوں والا ہے اس کی وسعتوں سے کائنات کا کوئی ذرہ بھی خارج نہیں بلکہ کائنات میں کوئی چیز وجود کا لبادہ ہی نہیں پہن سکتی جب تک علم الٰہی میں موجود نہ ہو۔

آیئے اب کچھ شارحین قرآن کی زبانی بھی آیت کی تشریح سن لیجئے۔

اول تو شارحین قرآن موقعہ ومحل کے لحاظ سے آیت کے لیے ربط و مناسبت تلاش کرنے میں سرگرداں ہیں۔ صرف ابن کثیر نے سیاق وسباق کو پیش نظر رکھ کر آیت کی تشریح کی ہے باقی نے ربط کی تلاش بہت دور دور ہاتھ مارے ہیں۔ اور جن کی ربط و مناسبت تک رسائی نہیں ہوئی انہوں نے کہہ دیا کہ اس میں التفات ہے مقصد نبوت کے تبلیغی کردار پر اور اہل ایمان کے مسلمانہ کردار پر اجر و ثواب بتانا ہے یہ علامہ محمد طاہر کی التحریر والتنویر میں کی ہے۔ ابوحیان اندلسی کی رائے میں آیت کا ماقبل سے ربط یہ ہے کہ پہلے نبوت کے منکرین کے کچھ حالات بیان کیے اور ان سے حضور اقدس کی گفتگو نقل کی اب اللہ سبحانہ بتاتے ہیں کہ اللہ سبحانہ کو سب کچھ پتہ ہے منکروں کے حالات بھی اسے معلوم ہیں اور نبوت کی شان اور تلاوت قرآن بھی اس کی نگاہ میں ہے۔ علامہ مراغی نے آیت کی سیاق سے پیوندکاری اس طرح کی ہے کہ اللہ سبحانہ نے آیات سابقہ میں بتایا ہے کہ بندوں پر اللہ کے انعامات بے پایاں ہیں لیکن شکر گزار کم ہیں۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ اللہ ان کے احوال سے خوب واقف ہے کچھ بزرگوں نے آیت قرآنی میں نبوت کی تسلی والی بات کہی۔ یہ جدت علامہ زمخشری، علامہ بقاعی نے پیدا کی اور اسی کو اردو شارحین قرآن نے آیت قرآن کا منطوق بنا لیا ہے۔

صاحب تدبر قرآن کہتے ہیں۔

"یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے لیے بطور التفات تسلی اور بشارت ہے کہ مخالفوں کی ان غوغا آرائیوں کی ذرا پروانہ کرو تم جہاں کہیں بھی اور جس حال میں بھی ہو عبادت و طاعت اور تذکیر و دعوت کی جس مہم میں معروف ہو پورے انہماک اور یکسوئی سے لگے رہو۔ ہم ہر جگہ تمہارے ساتھ ہیں۔ تمہارے ساتھ ہیں۔ تمہارے ایک ایک عمل کو دیکھ رہے ہیں۔

اور مولانا مودودی تفہیم القرآن میں فرماتے ہیں:

"یہاں اس بات کے ذکر کرنے سے مقصود بھی تسکین اور نبی کے مخالفین کو تنبیہ کرنا ہے ایک طرف نبی سے ارشاد ہو رہا ہے کہ پیغام حق کی تبلیغ اور خلق اللہ کی اصلاح میں جس تن دہی اور جان فشانی اور جس صبر و تحمل سے تم کام کر رہے ہو وہ ہماری نظر میں ہے ایسا نہیں ہے کہ اس پرخطر کام پر مامور کر کے ہم نے تم کو تمہارے حال پر چھوڑ دیا ہو جو کچھ تم کر رہے ہو وہ بھی ہم دیکھ رہے ہیں اور جو کچھ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے اس سے بھی ہم بے خبر نہیں ہیں۔"

مولانا مفتی شفیع صاحب معارف القرآن میں فرماتے ہیں۔

"بظاہر اس جگہ علم الٰہی کی وسعت اور ہر چیز کے محیط ہونے کے بیان میں یہ حکمت ہے کہ اس کے ذریعے حضور اقدس کو تسلی دی جائے۔

ان تمام تشریحات میں موضوع سے ہم آہنگ وہ تشریح ہے جو مولانا عبدالدائم جلالی نے بیان السبحان میں کی ہے۔ فرماتے ہیں:

"اوپر کی آیات میں کفار کی خود ساختہ تحریم تحلیل کی مذمت کی تھی اس آیت میں اس مذمت کی علت بیان ہو رہی ہے۔ انسانی عقل کا دائرہ بلوغ بہت تنگ ہے۔ مابعد الموت اور دوسری غیر محسوس چیزوں کا تو ذکر ہی کیا ہے جو اشیاء محسوس بلکہ محسوس ہیں ان کی حقیقت اور ذاتی احوال و خصوصیات تک کامل طور پر انسانی عقل کی رسائی نہیں ہے۔ قیامت کے تمام احوال اللہ کے صفات فرشتوں کی ہستی اور ان کے اعمال کی طرف سے

عقل انسانی بالکل تاریکی میں ہے۔ محسوس کائنات کا حسن و قبح پورے طور پر معلوم کرنا بھی طاقت بشری سے خارج ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب واقعات اور اشیاء کا علم ہی نہیں تو پھر کسی چیز کو حرام قرار دینا اور کسی چیز کو حلال بتانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ تحریم و تحلیل تو اس کا کام ہے جو ہر چیز کے افعال و خواص ذات ماہیت اور دینوی و اخروی نتائج سے واقف ہو انسان کوتاہ فہم ناقص علم اور تنگ عقل ہے حلت و حرمت کا فیصلہ کرنا اس کے بس کی بات نہیں ہے بلکہ اس کا قطعی علم اللہ سبحانہ کو ہے۔ اللہ کا علم وسیع سے وسیع تر ہے اور اس کے علم کی شان یہ ہے ماتکون فی شان"۔

یہ بات سیاق قرآنی سے ہم آہنگ ہے۔ بات قرآن کی ہو رہی ہے قرآن اللہ کی کتاب ہے اور اللہ کے علم سے ماخوذ ہے۔ اس میں تعارض و اختلاف نہیں ہے کیونکہ تعارض و اختلاف جہل و ناواقفیت یا علم کی کمی بیشی یا اس کی تدریجی ترقی یا ظن و قیاس یا نسیان و غفلت یا کذب و افتراء کی وجہ سے اور علم حق سبحانہ ان تمام نقائص سے پاک ہے اس لیے اس کا کلام بھی ہر تعارض سے پاک ہے۔ اس کے مقابلے میں انسان کا علم خود اس کا خانہ زاد نہیں۔ اس میں جہل اصل ہے اور علم عارضی ہے۔ جہل اس کے اندر ہے اور علم باہر سے آتا ہے۔ اسی لیے انسانی علم کے سباق میں بھی جہل ہے اور لحاق میں بھی جہل ہے درمیان میں کچھ دھندلی سی علم کی روشنی آتی ہے جب علم انسانی عارضی ہے تو اس کا مطلب اور کیا ہو سکتا ہے کہ انسان کا جہل انسان کے علم سے زیادہ ہے اسی قلت علم کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے وما اوتیتم من العلم الا قلیلا پھر یہ عارضی اور قلیل علم جو ایک محدود زمانے تک انسان کو ملتا ہے اس میں صرف قلت ہی کا روگ نہیں بلکہ قلت کے ساتھ اس میں علت بھی ہے جس نے اس قلیل علم کو کمزور بنا دیا ہے۔ مشہور قاعدہ ہے لکل شئ آفۃ وللعلم آفات انسان کے اس قلیل علم پر کچھ ایسی آفتیں مسلط ہیں کہ وہ علی الاطلاق معتبر ہی نہیں ہو سکتا جب تک مقررہ کسوٹی پر نہ جانچا جائے۔ اسی لیے قرآن حکیم نے انسانی علم کو اس وقت تک قابل تسلیم شمار نہیں کیا جب تک اس کی پشت پر عقلی یا نقلی سند نہ ہو اسی لیے قرآن حکیم نے انسانی دعوی پر دلیل کا اصول

قائم کیا ہے تاکہ علم مستند ہو ورنہ عدم استناد کی صورت میں اس کے علم کو ظن تخمین اور توہم کہہ کر رد کر دیا ہے ان الظن لا یغنی من الحق شیئا۔ دلیل کے مطالبہ کی بنیاد یہی ہے کہ انسان کے پاس علم ذاتی نہیں ہے عطائے غیر ہے لہذا انسانی علم اس وقت تک قابل اعتبار نہیں جب تک اس کا منبع اور سرچشمہ معلوم نہ ہو انسان کا علم نہ بلا سند معتبر ہے اور نہ علی الاطلاق قابل قبول ہے۔ دعویٰ اگر عقلی ہو تو حجت معقول اور اگر نقلی ہو تو حجت منقول ہونی چاہئے۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ علم انسانی صرف قلیل ہی نہیں بلکہ علیل بھی ہے اور یہی علم کی قلت اور علت عموماً انسان کو دنیا کی زندگی میں مضار و مفاسد کا شکار بناتی ہے ورنہ اگر علم انسانی محیط ہوتا تو اسے کبھی بھی کوئی تکلیف نہ ہوتی۔ اور تو اور دنیا کے سب سے بڑے عالم اور اعلم الخلائق کی زبان مبارک سے قرآن نے یہ کہلایا لو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر وما مسنی السوء یعنی اگر علم انسانی جامع ہوتا اور قلت و علت سے پاک ہوتا تو یقیناً وہ کسی اختلاف کا شکار نہ ہوتا۔

اتنی بات معلوم ہو گئی کہ انسان کا علم ذاتی بھی نہیں اور محیط بھی نہیں اور کامل بھی نہیں، کثیر بھی نہیں، آفات کا نشانہ ہونے کی وجہ سے حتمی بھی نہیں ہے۔

اس کے برعکس اب علم الٰہی کو دیکھیں تو آپ محسوس کریں گے کہ اس کا علم خود اپنا اور خانہ زاد ہے عطاء غیر نہیں ذاتی ہے عارضی نہیں نہ جہل سابق پر وارد شدہ ہے اور نہ جہل لاحق سے شرمندہ۔ جہالت نہ اس کے اول میں ہے نہ آخر میں۔ اس لیے نہ وہ قلیل ہے اور نہ وہ محدود۔ پھر جیسے نفس علم ہر آفت سے پاک ہے ایسے ہی اس کی ہر کیفیت عیب اور کوتاہی سے مبرا ہے۔ نہ مناسبت اور بے مناسبتی کا سوال ہے کہ کوئی مضمون اعلیٰ ہو کوئی ادنیٰ ہو نہ اس پر حوادث مؤثر ہیں کہ کیفیت کلام میں کوئی خفیف سا تغیر ہی پیدا کر سکیں۔ نہ وہاں متضاد کیفیات اثر انداز ہو سکتی ہیں کہ کلام کے زور بیان اس کی فصاحت و بلاغت میں کوئی ادنیٰ تفاوت پیدا کر سکیں۔ ذاتی علم ہونے کی وجہ سے نہ اس کے خلاف کوئی باطنی آفت ہے نہ ظاہری۔ نہ وہاں غفلت ہے اور نہ نسیان نہ علم اکتسابی ہے کہ قوت حافظہ اور تفکر درکار ہو اور نہ علم تدریجی ہے کہ فکر و نظر کے لیے ترتیب کی حاجت ہو غرض جہل اور سند علم کی کوئی آفت اس کی علمی بارگاہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ اسی لیے قرآن نے جگہ جگہ

دعویٰ کیا ہے کہ اس کا علم محیط اور لامحدود بھی ہے اور اکمل تر اور خالص بھی ہے یعنی وہاں علم بحث اور ادراک محض ہے جس میں جہل کے کسی ادنیٰ ذرے کی بھی آمیزش نہیں ہو سکتی ہے۔
جب علم محیط اور لامحدود ہے تو اس میں قلت و کثرت کا سوال ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے علم حق سبحانہ علم بشر کی طرح نہ قلیل ہے نہ علیل ہے اور نہ ناقص ہے جیسے اس کی ذات لامحدود ہے ایسے اس کا علم بھی لامحدود ہے۔
قرآن کی اس آیت میں علم الٰہی کے محیط اور لامحدود ہونے کو بتایا جا رہا ہے اور دریافت کیا جا رہا ہے کہ محمد رسول اللہ جو قرآن لے کر آئے ہیں اس کا منبع تو اللہ سبحانہ کا محیط اور لامحدود علم ہے اور تم جو تحریم و تحلیل کے قوانین بنا رہے ہو بتاؤ اس کا منبع کیا ہے اللہ کا نام لوگے تو یہ اللہ پر جھوٹا بہتان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی کے لیے قانون بنانا صرف اللہ سبحانہ کا حق ہے تم نے اس حق پر کیسے قبضہ کیا۔ یہ مجرمانہ بغاوت ہے۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ لَهُمُ
الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ
اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۴﴾ وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ
اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ؕ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۵﴾ اَلَآ اِنَّ
لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ؕ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ
يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ
وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۶۶﴾ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ
لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
يَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۷﴾

یاد رکھو کہ اللہ سے تعلق اور لگاؤ رکھنے والوں کو نہ تو ڈر ہے اور نہ ان کو غم ہو گا[۴۵] یعنی وہ لوگ جو دولت ایمان سے مالا مال ہوئے اور زندگی اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہے[۴۶] ان کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی بشارت ہے اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ اللہ کے قوانین کو بدلنے والا کوئی نہیں ہے

اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے[۶۵] اور اے اللہ کے
رسول تمہیں مخالفین کی باتیں غمگین نہ کریں یقین کرو کہ سارا
دبدبہ اللہ کے لیے ہے وہ سب کچھ سن رہا ہے اور سب
کچھ جانتا ہے[۶۶] یاد رکھو کہ آسمانوں اور زمین میں سب
کے سب اللہ کے ہیں اور وہ لوگ جو اللہ کے سوا شریکوں کو
پکارتے ہیں ان کی جو کچھ بھی اتباع اور پیروی ہے وہ اس
کے سوا کچھ بھی نہیں کہ سرتاسر وہم وگمان کی پیروی اور وہ
ہر بات میں اٹکل اور تخمین سے کام لے رہے ہیں[۶۷] اللہ
ہی کی ذات گرامی نے تمہارے لیے رات بنائی ہے تاکہ
تم آرام کرو اور دن بنایا ہے روشنی والا تاکہ کام کاج کرو بلاشبہ
اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں جو کلام اللہ
سنتے ہیں[۶۸]

اہلِ حق کی دنیا و آخرت میں کامیابی

اس آیت میں اولیاء اللہ کے حوالہ سے دنیا اور آخرت میں کامیابی کی بشارت ہے

جس طرح سچا ایمان اور عمل صالح آخرت میں کامیابی کے لیے شرط ہے اسی طرح دنیا میں بھی شرط ہے یعنی دینوی برکتوں کے دروازے اہل ایمان پر اس وقت کھولے جاتے ہیں جب وہ ایمان اور عمل صالح کی شرط پوری کرتے ہیں۔ قرآن سے پہلے بھی جن سے فلاح دنیا کا وعدہ کیا گیا تھا ایمان وعمل کی شرط کے ساتھ کیا گیا تھا۔ مسلمانوں کو بھی جب کفار پر غلبہ کی بشارت دی گئی تو ان کنتم مومنین کی شرط کے ساتھ کہی گئی ہے اور جب اقتدار حکومت کا وعدہ کیا گیا تو اس وضاحت کے ساتھ کیا گیا کہ یہ وعدہ صرف ان لوگوں سے ہے جو ایمان وعمل صالح کی دولت سے مالا مال ہوں گے وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض۔ غرض جہاں اللہ سبحانہ کا یہ وعدہ ہے کہ وہ اپنے دین کے ماننے والوں کو دینوی کامیابیوں سے نوازتا ہے وہیں اس کا یہ عمومی ضابطہ بھی ہے کہ یہ ایمان وعمل کی لازمی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان وعمل صالح کے بغیر صرف آخرت ہی کی نہیں دنیا کی فلاح بھی ہاتھ نہیں آسکتی ہے۔ دین کے بغیر صحیح معنوں میں دنیا بھی نہیں مل سکتی یہ ضابطہ افراد ہوں یا جماعت سب کے لیے ہے کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ افراد کو بھی اپنی انفرادی زندگی میں دینوی فلاح مثلاً امن وسکون، عزت ومحبوبیت اور ضروریات زندگی وغیرہ اسی وقت ملے گی جب وہ اپنی حد تک ایسے خداشناس اور آخرت کے دلدادہ ہوں جیسا کہ ایک مسلمان کو ہونا چاہیے۔ حضور اقدس نے اسی حقیقت کو ایک ارشاد میں بے نقاب کیا ہے۔

> "جس نے اپنی ساری فکروں کو ایک ہی فکر یعنی آخرت کی فکر کو بنا لیا اللہ سبحانہ اس کی دنیا کا انتظام کر دینے کے لیے کافی ہے اور جس کے ذہن کو بے شمار افکار نے منتشر کر رکھا ہو اللہ سبحانہ کو اس کی کوئی پروا نہیں ہے کہ وہ اس دنیا کی کس گھاٹی میں ہلاک ہوتا ہے"۔

ایک اور ارشاد نبوت ہے:

> "جو شخص آخرت کو اپنا مقصود بنا لیتا ہے اللہ سبحانہ اس کے معاملات کو درست کر دیتا ہے اور اس کے دل کو غنی بنا دیتا ہے اور دنیا تابع فرمان ہو کر اس کے حضور میں آجاتی ہے"۔

پارہ نمبر ۱۱

اس طرح امت کو بھی اپنی اجتماعی زندگی کی فلاح اسی وقت میسر آسکتی ہے جب وہ اپنی اجتماعی حیثیت میں فی الواقع امت ہو یعنی اس کی ترکیب ایسے افراد سے ہو جو ایمان کے سچے اور عمل صالح کے مالک ہوں۔

لہ یاد رکھو اللہ سے تعلق اور لگاؤ رکھنے والوں کو نہ تو ڈر ہے اور نہ ان کو غم ہوگا۔ حافظ ابن کثیر نے روایات حدیثیہ کی بنا پر اس کا مطلب یہ بتایا ہے کہ اولیاء اللہ اللہ کے دوستوں کو آخرت میں اہوال محشر کا کوئی خوف نہ ہوگا اور نہ دنیا کے چھوٹ جانے پر غمگین ہوں گے۔ بعض مفسرین نے آیت کو کچھ عام رکھا ہے۔ یعنی ان پر اندیشناک حوادث کا وقوع نہ دنیا میں ہوگا نہ آخرت میں ہوگا۔ اور نہ کسی مطلوب کے فوت ہونے پر وہ مغموم ہوتے ہیں گویا خوف سے خوف حق یا غم سے غم آخرت کی نفی مراد نہیں ہے بلکہ دنیا میں دنیوی خوف وغم کی نفی مراد ہے جس کا احتمال خوف اعداء وغیرہ سے ہوسکتا ہے وہ مومنین کاملین کو نہیں ہوتا۔ ہر وقت ان کا اعتماد اللہ پر ہوتا ہے اور تمام واقعات تکوینیہ کے خالی از حکمت نہ ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ اس اعتقاد و اعتماد کے استحضار سے انہیں خوف وغم نہیں ستاتا میرے نزدیک لاخوف کا مطلب یہ لیا جائے کہ اولیاء اللہ پر کوئی خوفناک چیز ہلاکت یا معتد بہ نقصان دنیا و آخرت میں واقع ہونے والی نہیں۔ اگر فرض کیجئے دنیا میں صورۃً کوئی نقصان پیش بھی آئے تو چونکہ نتیجۃً وہ ان کے حق میں نفع عظیم کا ذریعہ بنتا ہے اس لیے اس کو معتد بہ نقصان نہیں کہا جاسکتا۔ رہا کسی سبب دنیوی یا اخروی کی وجہ سے ان کو کسی وقت خوف کا لاحق ہونا وہ آیت کی اس تقریر کے منافی نہ ہوگا کیونکہ آیت میں صرف یہ خبر دی گئی ہے کہ ان پر کوئی خوفناک چیز نہ پڑے گی یہ نہیں کہا ان کو کسی وقت خوف لاحق نہ ہوگا۔ شاید یحزنون کے مناسب لا یخافون نہ فرماتے اور لاخوف کی تعبیر اختیار کرنے میں یہ ہی نکتہ ہو۔ باقی لا یحزنون کا تعلق میرے خیال میں مستقبل سے ہے یعنی موت کے وقت اور موت کے بعد وہ غمگین نہ ہوں گے جیسا کہ فرمایا تتنزل علیھم الملئکۃ ان لا تخافوا ولا تحزنوا اور فرمایا لا یحزنھم الفزع الاکبر و تتلقاھم الملئکۃ واللہ اعلم۔

لہ افادات شیخ الاسلام

زیر نظر آیت کی تشریح میں عام مفسرین قرآن نے اجمالاً و تفصیلاً وہی کہا ہے جس کا خلاصہ حضرت شیخ الاسلام نے اپنے افادات میں پیش فرمادیا ہے۔ زیادہ تفصیل امام رازی نے مفاتیح الغیب میں آلوسی نے روح المعانی میں اور قاضی ثناء اللہ نے تفسیر مظہری میں پیش کی ہے۔ دراصل اولیاء اللہ کے معنے اللہ سبحانہ سے لگاؤ رکھنے والے تعلق رکھنے والے کے ہیں ولی کی جمع ہے جس کے معنے قرب کے ہیں ولی سے صفت کا صیغہ ہے۔ یہ کون ہیں اس کی خود قرآن نے تشریح کردی ہے الذین اٰمنوا وکانوا یتقون۔ قرآن نے یہ لفظ ان ہی معنے استعمال کیا ہے گویا لفظ کے لغوی معنے لگاؤ رکھنے والے کے ہیں اور قرآنی معنے ایمان و تقویٰ کے زیور سے آراستہ ہونے کے ہیں ایک شخص جب ایمان لاتا ہے تو وہ اس بات کا وعدہ کرتا ہے کہ اس کا ارادہ اس کی عقل اور اس کے جذبات و خواہشات قانون اور احکام خداوندی کی اطاعت میں حائل نہ ہوسکیں اور اللہ سبحانہ کے مقابلے میں وہ ان سب کی قربانی دینے پر آمادہ رہے گا اس اطاعت و سپردگی کی وجہ سے اسے اللہ کا ولی کہا جاتا ہے اور اس کے معاوضہ میں اسے رضائے الٰہی اور قرب خداوندی کی بشارت دی جاتی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے چہروں کو دیکھ کر یادِ الٰہی آجاتی ہے۔ اصلی معنے تو یہی ہیں لیکن بعد کو جب تصوف و طریقت کے مختلف مدارس پیدا ہوئے تو اولیا کا لفظ ایک خاص اصطلاحی معنے میں بولا جانے لگا التفہیمات میں حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں :

> "اللہ سبحانہ تک پہنچانے والے راستے دو قسم کے ہیں ایک قسم تو وہ ہے جس کی وحی الٰہی اور تعلیمات انبیاء نے تلقین فرمائی ہے اور دوسری وہ ہے جسے الہام اور معارف اولیاء نے متعین کیا ہے"۔

حضرت مولانا اشرف علیؒ مبادی تصوف میں لکھتے ہیں۔

> "سلوک دو قسم پر ہے سلوک نبوت اور سلوک ولایت اور ہر ایک کے آثار و خواص جدا جدا ہیں"۔

دونوں میں فرق ہے۔ صوفیا کی زبان میں ولی دوسرے معنے میں استعمال ہوتا ہے اسی کو ولایت خاصہ کہتے ہیں۔ حضرت مولانا اشرف علی نے ولایت خاصہ کی یہ تعریف کی ہے۔

"ان مذکورہ باتوں کے ساتھ ظاہر کو نفلی عبادتوں میں اور باطن یعنی دل کو اللہ کی یاد میں مشغول رکھے کسی دم غافل نہ ہو" (قصد السبیل)

مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی تفسیر مظہری میں فرماتے ہیں کہ :

"کم سے کم چیز جسے صوفیہ کی زبان میں ولایت کہا جاتا ہے اور یہی قرآن کی آیت میں اولیاء اللہ سے مراد ہے یہ ہے کہ دل یاد الٰہی میں مستغرق ہو، اللہ کی محبت سے لبریز ہو اس میں کسی اور کی گنجائش ہی نہ ہو۔ اس کی مخلوق سے محبت، بغض دینے اور نہ دینے کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہو"

اور امام غزالی کیمیائے سعادت میں فرماتے ہیں :

"سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ انسان اپنے پورے وجود کو اللہ سبحانہ کی یاد کے حوالہ کر دے۔ یہاں تک کہ ہر ماسوا سے بے خبر ہو جائے اور خود اپنے آپ سے بھی بے خبر ہو جائے اور نگاہ تصور میں اللہ کے سوا کچھ نہ رہے۔ یہ بات صرف تنہائی اور گوشہ گیری میں ہی حاصل ہو سکتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ کے سوا جو کچھ ہے وہ سب کا سب اس سے غافل کرنے والا ہے۔"

یہ ہے صوفیائے کرام کے یہاں وہ ولایت جسے ان کے الہام اور معارف نے متعین کیا ہے۔ نبوت کے معارف نے جس ولایت کا تصور پیش کیا ہے وہ اس سے بالکل جدا ہے جس کا ذکر الذین امنوا وکانوا یتقون یعنی ایمان و تقویٰ کی زندگی اختیار کرے۔ دونوں میں فرق ہے۔ راہِ نبوت کی اساس محبت الٰہی ہے اور اسپر ایمان تقویٰ یعنی افکار اعمال اور اخلاق کی پوری عمارت اٹھتی ہے جب کہ راہ ولایت کی اساس محبت نہیں عشق ہے راہ نبوت کا پیش نہاد رضائے الٰہی ہے جب کہ راہ ولایت کی منزل وصال الٰہی ہے۔ دونوں راہیں الگ الگ ہیں بلکہ راہ ولایت راہ نبوت کے متوازی بندگی اور خدارسیدگی کا ایک دوسرا طریقہ بھی تسلیم کیا جا چکا ہے۔ اور یہ بھی کہ راہ ولایت کی بنیاد وحی الٰہی اور تعلیمات قرآنی پر نہیں بلکہ حضرات اولیائے کرام کے کشف و الہام پر ہے۔

حضرت مولانا اشرف علی فرماتے ہیں :

"ان پر یعنی طریق ولایت پر جب عشق غالب ہوتی ہے" (شریعت اور طریقت)

مولانا اسماعیل الشہید کا ارشاد بھی یہی نوعیت رکھتا ہے فرماتے ہیں۔

"اس جگہ بڑا باریک نکتہ ملحوظ رکھنے کا ہے جس سے اکثر لوگ بے خبر ہیں اور اسے فراموش کر دیتے ہیں اور وہ یہ کہ جب نفسانی جسے عشق کہتے ہیں و حب ایمانی جسے حب عقلی کہتے ہیں دونوں میں جوہری فرق ہے پہلی محبت سلوک کے ابتدائی دور کی قلبی کیفیتوں میں سے ہے جب کہ دوسری محبت انبیائے کرام کے کمالات اور اولیائے عظام کے مقامات میں سے ہے لیکن اکثر عوام صوفیہ پہلی محبت کو دوسری کی جگہ رکھ کر یعنی دونوں کو ایک سمجھ کر اسی کو کتاب و سنۃ کے اشارات کا مقصود خیال کر کے حضرات انبیاء و اولیاء کی سیر باطن کو اہل عشق و وجد کے احوال کے مطابق قرار دینے کی لاحاصل زحمت برداشت کرتے ہیں"۔

راہ ولایت میں عبادت کا مقصود رضائے الٰہی نہیں بلکہ وصال الٰہی ہوتا ہے۔ قرآن و سنت کی تصریحات کے مطابق انسان کا مقصود عبادت اللہ سبحانہ رضا، آخرت کی فلاح اور جنت کی زندگی کا حصول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مطلوبیت کے ذکر سے اور ان کے بارے میں ترغیب و تحریص اور تاکید سے کتاب و سنت کے صفحات بھرے ہوئے ہیں جب کہ عشق پر مبنی تصور دین کا مطالبہ یہ ہے کہ عبادت کا مقصود یہ نہیں ہے بلکہ ذات باری کا وصال ہے۔

اور عشق پر مبنی ولایت کا ناگزیر نتیجہ ترک دنیا کی صورت میں ان بزرگوں کے سامنے آیا جب کہ قرآن و سنت سے یہ بات معلوم ہے کہ رہبانیت اور ترک دنیا کا اللہ سبحانہ کی نازل کردہ ہدایت سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ یہ چیز عشق کی ایجاد ہے ورنہ اللہ سبحانہ کی ہدایت تو یہ ہے کہ انسان اللہ کی بندگی کا فریضہ اس دنیا سے الگ ہو کر نہیں اس میں رہ کر انجام دے۔

نظریہ ترک دنیا کے بطن سے تین تقاضے پیدا ہوئے عزلت (تنہائی) تجرد ترک نکاح اور ترک لذات اور فاقہ۔

عزلت اور گوشہ گیری کے بارے میں حضرت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ آثار ولایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

طریق ولایت والے خلق سے نفرت کرتے ہیں اور اسباب ظاہری کو ترک کر دیتے ہیں (شریعت و طریقت)

تجرد اور نکاح کے بارے عشق پر مبنی ولایت کا نظریہ حضرت شیخ مخدوم علی ہجویری کے کشف المحجوب میں اس بیان سے واضح ہوتا ہے۔

"اس مسلک کے مشائخ کا اس پر اتفاق ہے کہ نکاح نہ کرنے والے سب سے بہتر اور افضل ہوتے ہیں۔"

گویا اصلاً صحیح بات تو یہی ہے کہ نکاح اور ازدواجی زندگی سے پرہیز کیا جائے۔

یہ ہے صوفیائے کرام کی اصطلاحی زبان میں اولیاء اللہ کا مفہوم ظاہر ہے کہ یہ نہ قرآن کا منطوق ہے نہ مدلول ہے اور نہ مفہوم۔

اس موضوع پر قاضی بیضاوی کی تشریح بہت اچھی ہے فرماتے ہیں کہ اولیاء اللہ وہ ہیں الذین یتولونہ بالطاعۃ ویتولاھم بالکرامۃ جن کا اللہ سبحانہ سے بندہ ہونے کی حیثیت میں طاعت کا لگاؤ ہو اللہ کا آقا ہونے کی حیثیت میں بندہ سے عزت افزائی کا لگاؤ لفظ ولی فعیل کے وزن پر ہے اگر فاعلی معنے میں ہے تو پہلی بات ہے اور اگر مفعولی معنی میں ہے تو دوسری بات ہے۔ اور دونوں صحیح ہیں۔

ان اولیا کے بارے میں قرآن کا انکشاف ہے لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ حافظ ابن کثیر نے یہ مطلب بتایا ہے کہ مستقبل میں اہوال روز حشر کے مناظر سے ان کو کوئی اندیشہ نہ ہوگا اور دنیا میں جو کچھ چھوڑ آئے ہیں اس پر ان کو کوئی غم نہ ہو گا۔ اور یہی معنے ابن جریر نے بتائے ہیں اردو شارحین قرآن میں اس فقرے کی تشریح جو مولانا ابوالکلام آزاد نے کی ہے وہ بہت اچھی ہے اور سیاق وسباق سے ہم آہنگ ہے فرماتے ہیں۔ قرآن نے ایمان اور اہل ایمان کی نسبت جو کچھ کہا ہے اس میں کوئی بات بھی اس قدر اہم نہیں ہے جس قدر یہ کہ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون خوف اور غم دونوں سے محفوظ ہو جائیں گے۔ غور کرنا چاہیے کہ قرآن نے اس وصف پر کیوں اس قدر زور دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کی سعادت کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی شقاوت کی ساری سرگذشت انہی دو لفظوں میں سمٹی ہوئی ہے خوف اور غم جونہی ان دو باتوں سے اسے رہائی مل گئی اس کی ساری سعادتیں اس کے قبضے میں آگئیں۔ زندگی

کے جتنے بھی کانٹے ہو سکتے ہیں سب کو ایک ایک کر کے چنو اور دیکھو خواہ جسم میں چبھتے ہوں خواہ دماغ میں خواہ موجودہ زندگی کی عافیت میں خلل ڈالتے ہوں۔ خواہ آخرت کی تم دیکھو گے کہ ان دو باتوں سے باہر نہیں ہیں یا خوف کا کانٹا ہے یا غم کا۔

قرآن کہتا ہے کہ ایمان کی راہ سعادت کی راہ ہے جس کے قدم اس راہ میں جم گئے اس کے لیے دونوں کانٹے بے اثر ہو جاتے ہیں اس کے لیے نہ تو کسی طرح کا اندیشہ ہوگا نہ کسی طرح کی غمگینی۔

اولیاء کا قرآنی چہرہ

لئے یعنی وہ لوگ جو دولت ایمان سے مالا مال ہوئے اور زندگی میں اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہے۔ یہ اولیاء اللہ کی تعریف ہوئی یعنی مومن متقی اللہ کا ولی ہوتا ہے پہلے کئی مواقع میں معلوم ہو چکا ہے کہ ایمان و تقویٰ کے بہت سے مدارج ہیں پس جس درجہ کا ایمان و تقویٰ کسی میں موجود ہوگا اسی درجہ میں ولایت کا ایک حصہ اس کے لیے ثابت ہوگا۔ پھر جس طرح مثلاً دس بیس روپیہ بھی مال ہے اور پچاس سو روپیہ ہزار دو ہزار لاکھ دو لاکھ روپیہ بھی مال ہے لیکن عرف عام میں دس بیس روپے کے مالک کو مالدار نہیں کہتے جب تک معتد بہ مال کی مقدار موجود نہ ہو اسی طرح سمجھ لیجئے کہ ایمان و تقویٰ کسی مرتبہ میں ہو وہ ولایت کا شعبہ ہے اور اس حیثیت سے سب مومنین فی الجملہ ولی کہلائے جا سکتے ہیں لیکن عرف میں ولی اسی کو کہتے ہیں جس میں ایک خاص اور ممتاز درجہ ایمان و تقویٰ کا پایا جاتا ہو۔ احادیث میں کچھ علامات و آثار اس ولایت کے ذکر کیے گئے مثلاً ان کو دیکھنے سے اللہ یاد آنے لگے یا مخلوق خدا سے ان کو بے لوث محبت ہو۔ عارفین نے اپنے اپنے مذاق کے موافق ولی کی تعریفیں کی ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں [1]

اگر قرآن کی ساری تعلیمات کا خلاصہ صرف دو لفظوں میں بیان کرنا چاہیں تو ہم ایمان و تقویٰ کے ذریعے بیان کر سکتے ہیں۔ قرآن کی ہر تعلیم کا مقصد اپنے ہر عمل کے قالب میں اسی تقویٰ کی روح کو پیدا کرنا ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تقویٰ اللہ کی ناراضگی سے بچنے کے اس گہرے احساس کا نام ہے جو آدمی کو ہر بھلے کام پر ابھارتا ہے اور ہر برے کام سے روکتا ہے یا یوں کہیئے کہ تقویٰ ایک خاص قلبی کیفیت ہے جس سے ایک خاص عملی رویہ وجود میں آتا ہے یہ عملی رویّہ اللہ کی طاعت اور رضاجوئی کا رویّہ ہوتا ہے۔ اس خاص کیفیت سے جو دل بہرہ ور ہوتا ہے کہ۔ میں کوئی ایسی حرکت نہ کر جاؤں جس کو وہ پسند نہیں کرتا اور کسی ایسے کام کے کر گذرنے سے رک نہ رہوں جسے وہ پسند کرتا ہے۔

اللہ کی ناراضی سے بچنے کی اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی یہ خواہش اور کوشش سوچیئے کہ عملاً کب پوری ہو سکتی ہے۔ کوئی شک نہیں کہ یہ خواہش اور یہ کوشش اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب کہ انسان اپنے آپ کو قابو میں رکھے اور اپنے نفس کو من مانی کرنے سے روکے۔ گویا تقویٰ کا مقام پالینے کا راستہ صرف یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو لگام دے اور خواہشوں میں اسے آزاد نہ چھوڑے جیسا کہ قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔

واما من خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھوی

جس شخص نے اپنے دل میں اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے کا ڈر کھا۔

اور اپنے نفس کو خواہشوں کی پیروی سے روکا۔

یہی متقی اللہ سبحانہ کی محبت اور دوستی کے سزاوار ہیں جب وہ کام ہیں اللہ سبحانہ کی مرضی اور پسندیدگی پر نظر رکھتے ہیں اور اپنے کسی کام کا بدلہ کسی انسان سے تعریف یا انعام یا ہر دلعزیزی کی صورت میں نہیں چاہتے تو اللہ سبحانہ ان کو اپنی طرف سے اپنے انعام اور محبت کا صلہ عطا فرماتا ہے اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بندوں میں ان کے ساتھ عقیدت و محبت اور ہر دل عزیزی پیدا ہو جاتی ہے ان اولیاء ہ الا المتقون۔ اور ان اللہ یحب المتقین۔

ایک اہم اور بنیادی بات

یہاں یہ اہم اور بنیادی بات ضرور یاد رکھنی چاہیے کہ سارے انبیاء کی دعوتوں کا خلاصہ دو لفظوں میں سمٹا ہوا ہے ایک عبادت دوسرا تقویٰ۔ سورہ انبیاء میں مختلف نبیوں کی دعوتوں کا ذکر کرنے کے بعد سب دعوتوں کا خلاصہ یہ بتایا ہے ان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ وانا ربکم فاعبدون تم سب کی امت ایک ہی امت ہے اور میں ہی تم سب کا رب ہوں لہذا میری عبادت کرو۔ اور سورۂ مومنون میں مختلف دعوتوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا

وان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ وانا ربکم فاتقون یہ تمہاری امت در اصل ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں لہذا میری نافرمانی سے بچو۔ یہ دو آیتیں بتا رہی ہیں کہ اللہ سبحانہ کے بندوں کے تعلقات دو قسم کے ہیں ایک محبوب ہونے کے یعنی اللہ سبحانہ بندوں کے محبوب ہیں دوسرے محکوم ہونے کے یعنی اللہ سبحانہ بندوں کے حاکم ہیں محبوب ہونے کی حیثیت میں بندے عابد اور اللہ معبود ہیں اور حاکم ہونے کی حیثیت میں اللہ حاکم اور بندے محکوم ہیں جب یہ بنیادی بات معلوم ہوگئی کہ اللہ سبحانہ کی فی الواقع حیثیت کیا ہے تو یہ بات بھی خود بخود معلوم ہوگئی کہ اللہ اور بندے کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ لازمی طور پر یہ نوعیت انتہائی محبوب آقا اور مکمل باوفا غلام حقیقی فرماں روا اور اطاعت گذار عبد ہی کی ہو سکتی ہے۔

اب ہمارے سامنے بحث و تحقیق کے وہ سارے زاویے پوری وضاحت سے سامنے آجاتے ہیں جو یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ قرآن کا تصور ولایت واضح اور متعین طور پر کیا ہے۔ اس لیے ولایت کے موضوع کو قرآن کی روشنی میں سمجھنے کے لیے ان حقائق پر غور کیجئے۔

اس موضوع پر سب سے پہلا نکتہ بحث اور زاویہ تحقیق صفات باری ہیں قرآن عزیز نے اللہ سبحانہ کی جو صفات بیان کی ہیں۔ ان میں دو حقیقتیں بالکل واضح اور نمایاں ہیں۔ ایک یہ کہ ان میں معشوقیت کا کہیں کوئی نام و نشان نہیں ہے۔ دوسری یہ کہ ان صفات میں جلالی اور جمالی دونوں صفتیں ہیں یعنی ان صفات کی رو سے اللہ سبحانہ اپنی صفات کی روشنی میں صرف خالقیت رزاقیت حکمت و رحمت رافت و محبت عطاء بخشش اور عفو و درگذر جیسے کمالات ہی کا موصوف نہیں بلکہ اس کے ساتھ وہ مدبر کائنات اور مالک الملک بھی ہے مقتدر اعلیٰ اور شہنشاہ کل بھی ہے ہادی اور قانون ساز بھی ہے۔ امر و حاکم بھی ہے عادل اور منتقم بھی ہے۔

ان دونوں حقیقتوں کو سامنے رکھ کر اللہ سبحانہ کی یہ حیثیت کہ وہ اس کائنات کا فی الواقع مالک ہے منفی اور مثبت دونوں طرح واضح اور متعین ہو جاتی ہے منفی یہ کہ یہ حیثیت معشوق کی نہیں ہے اور مثبت یہ کہ یہ حیثیت انتہائی محبوب آقا و فرماں روائے مطلق کی ہے۔ کیونکہ جب اللہ سبحانہ کی صفات میں معشوقیت موجود ہی نہیں تو اللہ سبحانہ کے معشوق ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ولایت عشق کی اساس پر خدا رسیدگی

کا نام نہیں ہو سکتا ہے بلکہ اللہ کی صفات جلال و جمال کا مجموعی تقاضا اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ اللہ سبحانہ محبوب کل اور فرماں روائے مطلق ہے اور جب اللہ سبحانہ کی حیثیت اور انسان سے اللہ سبحانہ کے تعلقات کی نوعیت معلوم ہو گئی تو قرآنی تصور ولایت کا مسئلہ بھی خود بخود حل ہو گیا۔ کیونکہ ان دو حقیقتوں کی موجودگی میں ولایت کا یہ تصور قرآنی تصور نہیں ہو سکتا جس کی بنیاد عشق الٰہی پر رکھی گئی ہے بلکہ واضح طور پر یہ وہی تصور ہو سکتا ہے جو اللہ سبحانہ کی مکمل اور والہانہ اطاعت کا تصور ہے۔

دوسری بات ولایت ہی کے موضوع پر یہ بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ قرآن حکیم نے انسان کا مقصد تخلیق اللہ سبحانہ کی عبادت بتایا ہے اور اللہ سبحانہ کی عبادت کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اللہ سبحانہ کے حضور ظاہر و باطن میں ہر طرح سے جھک جائے اور دل کے پورے جذبہ اخلاص و تذلل کے ساتھ اس کے احکام کی پابندی کرے اس حقیقت کی موجودگی میں یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ قرآن کا تصور ولایت عشق الٰہی والا تصور نہیں ہو سکتا بلکہ حق سبحانہ و تعالیٰ شانہ، کی والہانہ طاعت والا ہی تصور ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک سرتاسر غیر عقلی بات ہے کہ انسان کا مقصد تخلیق تو کچھ ہو اور ولایت کا تصور کسی اور نوعیت کا ہو۔ اللہ سبحانہ نے پیدا تو انسان کو اپنے احکام کی کامل شعوری طاعت کے لیے کیا اور اسے اپنے یہ احکام پوری تفصیل سے دے بھی دیے ہوں مگر ان احکام کے پس منظر میں جو ولایت مقصود ہو اس کا بنیادی تصور عشق کا حصول ہو۔

تیسری بات موضوع ولایت پر نوع انسانی کی مخصوص حیثیت کی ہے یہ واقعہ ہے کہ قرآن حکیم نے نوع انسانی کو ایک مخصوص اور امتیازی حیثیت کا مالک بتایا ہے اور وہ یہ کہ انسان اس زمین میں اللہ کا خلیفہ ہے اور خلافت کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کے عطا کیے ہوئے اختیارات سے کام لے کر اللہ کے احکام و ہدایات کو اپنی پوری زندگی میں نافذ کرے اور اس طرح اس کی مرضی پوری کرے۔ انسان کی مخصوص نوعی حیثیت اگر یہ ہے تو یہ سوال ہی خارج از بحث ہے کہ قرآنی تصور ولایت کی بنیاد عشق الٰہی پر رکھی جائے کیونکہ انسان کا منصب خلافت پر فائز ہونا خود اس بات کا اعلان ہے کہ اس کو عطا کی جانے والی ولایت کا بنیادی تصور احکام الٰہی کی رضا کارانہ اطاعت ہے۔

چوتھی بات یہ بھی ولایت کے موضوع سے متعلق سمجھنے کی ہے کہ قرآن نے انسان کے

فطری جذبات و مطالبات کے بارے میں کیا اختیار کی ہے یہ نقطہ نظر رد و انکار اور ازالہ کا نہیں بلکہ پوری طرح اعتبار و قبول اور ایثار کا ہے۔ قرآن نے انسان کے اندر پیدا کی جانے والی ایک ایک قوت ایک ایک خواہش اور ایک ایک جذبے کو اس کی شخصیت کی صحیح تعبیر کے لیے مطلوب و کارآمد قرار دیا ہے۔ حتیٰ کہ ان خواہشوں کی تکمیل کو مرابتہ دینی کام قرار دیا ہے۔

اس صورت واقعی کی روشنی میں سوچئے کہ کیا انسان کی طبعی قوتوں اور اس کے فطری جذبات کے بارے میں یہ نقطہ نظر ولایت کی کوئی ایسی تصویر پیش کر سکتا ہے جس کی بنیاد عشق الٰہی ہو ؟

پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ کوئی بھی صاحب نظر اس سوال کا جواب ہاں میں نہیں دے سکتا۔ آخر کون نہیں جانتا کہ عشق تو ان چیزوں کو اپنے راستہ کی رکاوٹ سمجھتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ولایت کی بنیاد اگر عشق الٰہی پر ہو تو پھر ولایت ان فطری جذبات و مطالبات کو قبولیت کی نگاہ سے نہ دیکھے گی اور یہ ولایت کے منافی ہوں گے۔ ولایت تو نچلے درجہ کی بات ہے قرآن کہتا ہے کہ یہ نبوت کے بھی منافی نہیں ہیں۔ بلکہ نبوت نے جس حد تک ان فطری جذبات و مطالبات کو قبول کیا ہے اس کی وسعتوں کا اندازہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ انسانی زندگی سے تعلق رکھنے والے بیشتر مسائل عائلی معاشی معاشرتی تمدنی اجتماعی اور سیاسی سارے کے سارے مسائل ان ہی فطری قوتوں خواہشوں ضرورتوں اور جذبات و مطالبات کے مظاہر ہیں قرآن نے ان سارے مسائل کے بارے میں ہدایات دی ہیں۔ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ قرآن کا پیش کردہ تصور ولایت اللہ سبحانہ کی کامل اطاعت ہی ہے اللہ کے عشق کی سرمستیوں میں کھو جانے کا نام ولایت نہیں ہے۔

ولایت کے موضوع پر یہ بات بھی دھیان میں رکھنے کی ہے کہ قرآنی احکام کی وسعت جامعیت اور ہمہ گیری کی ہے۔ قرآن نے بندگی اور پرستش سے عہدہ برا ہونے کے لیے جو احکام دیئے ہیں وہ پوری انسانی زندگی کو گھیرے ہوئے ہیں وہ انسان کی روح سے بھی تعلق رکھتے ہیں اور اس کے جسم کے مطالبات سے بھی۔ عقائد و ایمانیات سے لے کر اخلاق و اعمال تک اور نجی زندگی کے ابتدائی گوشوں سے لے کر اجتماعی زندگی کے آخری

گناروں تک کوئی ایک مسئلہ بھی ایسا نہیں جس کے بارے میں قرآن کی رہنمائی نہ ہو۔ احکام قرآنی اس نوعیت میں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں کہ قرآن کا تصور ولایت عشق پر مبنی ہو۔

بہرحال بتانا یہ چاہتا ہوں کہ قرآن میں ولایت کا تصور عشق پر مبنی نہیں بلکہ اللہ سبحانہ کی ایسی والہانہ طاعت پر مبنی ہے جس کے پیچھے قلب کی پوری آمادگی اور باطن کا سچا احساس تذلل کارفرما ہو۔ اور بس

قرآن ہی نے جو عباد الرحمٰن کا چہرہ پیش کیا ہے اس میں یہ بات خاص طور پر بتائی ہے:

"والذین اذا ذکروا بایات ربھم لم یخروا علیھا صما وعمیانا
اور جب ان کو ان کے آقا کے احکام سمجھائے جاتے ہیں تو وہ احکام الٰہی پر بہرے اور اندھے ہو کر نہیں پڑتے ہیں"۔

مطلب یہ ہے کہ عباد الرحمٰن وہ ہیں جو نہایت فکر و تدبر سے اللہ کے احکام سنتے ہیں اور متاثر ہوتے ہیں پورے فرزانے ہیں۔ دیوانے نہیں ہیں یہ ایک منہ بولتی گواہی ہے کہ ولایت کے بنیادی تصور میں عشق کا کوئی دخل نہیں ہے۔

بتانا یہ چاہتا ہے کہ قرآن کے پیش کردہ تصور ولایت کی بنیاد اللہ سبحانہ سے محبت ہے اللہ سے عشق نہیں ہے اس لیے یہاں ایت میں وہ اولیا مراد نہیں جہاں ولایت کی اساس عشق ہے بلکہ وہ اولیا مراد ہیں جہاں ولایت کی بنیاد اللہ کی محبت ہے۔

شائد یہاں پہنچ کر آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ عشق و محبت میں کیا فرق ہے اہلِ لُغت نے بلاشبہ عشق کے معنے فرط الحب کے لکھے ہیں یعنی حد سے زیادہ محبت۔ یہاں تفصیل کا موقعہ نہیں صرف اتنی بات ذہن میں رکھیے صوفیا میں سے حضرت ابن عطار نے محبت الٰہی کی حقیقت یہ بتائی ہے۔

اغصان تغرس فی القلب فتثمر علی قدر العقول۔

"محبت ایسی ڈالیوں کا نام ہے جو دل کی زمین میں لگائی جاتی ہیں اور بقدر العقول پھل دیتی ہیں"۔

امام غزالی نے احیاء میں عبدالوہاب الشعرانی نے الیواقیت میں حافظ ابن القیم نے زاد المحبین میں اور

مدارج السالکین میں علامہ مرتضیٰ زبیدی اتحاف میں محبت کے موضوع پر تفصیلی مباحث لکھے ہیں۔ لیکن ہم نے ابن عطار کے حوالہ سے جو بات لکھی ہے سب سے زیادہ جامع ہے۔ اس میں علیٰ قدر العقول کے الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ بتانے والے کے نزدیک محبت الٰہی کا اصلی سرچشمہ انسان کی عقل ہے نہ کہ اس کی طبیعت اور طبعی جذبات مولانا سید احمد بریلوی کے تاثرات مولانا اسماعیل الشہید نے بھی صراط مستقیم میں اسی طرح بیان کئے ہیں۔ فرماتے ہیں:

> "اس جگہ ایک بڑا ہی باریک نکتہ ملحوظ رکھنے کا ہے جس سے آج کل اکثر لوگ غافل ہیں اور اسے فراموش کر بیٹھے ہیں وہ یہ کہ حب نفسانی جسے عشق کہتے ہیں اور حب ایمانی جسے حب عقلی کہتے ہیں ان دونوں میں فرق ہے"۔

مولانا کے اس بیان سے صرف یہی معلوم نہیں ہوتا کہ محبت الٰہی کی دو الگ الگ قسمیں ہیں ایک حب نفسانی جسے عشق کہتے ہیں دوسری حب ایمانی بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مطلوب قرآن حب ایمانی ہے حب نفسانی نہیں اور یہ کہ نکتہ باریک ہونے کے باوجود ایک کھلا ہوا راز ہے یہ الگ بات ہے کہ اب یہ راز سربستہ ہوگیا اور اکثر لوگوں نے اتنے اہم نکتہ کو بھلا ڈالا۔

ایک اور ارشاد سنئے جو اس موضوع پر صراحت کی آخری حدوں کو پہنچا ہوا ہے حضرت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں۔

> "خدائے تعالیٰ سے جس محبت کا امر ہے وہ حب عقلی ہے نہ کہ طبعی اسی لیے نصوص میں حب طبعی عشق کا عنوان کہیں مذکور نہیں ہے بلکہ جابجا حب کا ذکر ہے۔ اس لیئے کہ حب طبعی مطلوب نہیں بلکہ حب عقلی مطلوب ہے (شریعت وطریقت)

پھر یہ بھی بات ذہن میں رہے کہ عشق ایک غیر ارادی اور غیر اختیاری کیفیت ہے قرآن میں افکار اعمال، اخلاق سب ارادی اور اختیاری ہیں۔ انسان غیر ارادی اور غیر اختیار اعمال کا از روئے قرآن مکلف ہی نہیں ہے۔

اسی لیے اس آیت میں اولیا کی تعریف بھی ارادی و اختیاری افکار و اعمال کے ذریعے کی گئی ہے الذین آمنوا وکانوا یتقون۔ ایمان و تقویٰ دونوں اختیاری اور ارادی ہیں جیسے ایمان کی ضد کفر و نفاق اور تقوی کی ضد فسق و فجور ارادی و اختیاری ہیں۔

اللہ سے محبت کی دس راہیں

اللہ سے محبت کے کچھ اسباب ہیں ان سے وابستگی اللہ سے محبت اور قرب کا ذریعہ ہے حافظ ابن القیم نے اللہ سے محبت کے لیے دس اسباب بتائے ہیں۔ اور ان کو اسباب جالبہ للمحبۃ کہا ہے۔

ا۔ تلاوت قرآن پوری توجہ تدبر سے اور معانی کو سمجھ کر ایسے جیسے آپ کے نام کوئی خط آیا ہو اور آپ اسے بر جاننے کے لیے پڑھتے ہیں کہ خط روانہ کرنے والے کا مقصد کیا ہے۔ جب آپ متکلم کی بات کی تہ تک نہ پہنچ جائیں اس وقت تک آپ کا پڑھنا پڑھنا نہیں۔

دوسرے فرائض کی ادائیگی کے بعد نوافل کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل کیا جائے۔ نماز فرض کے علاوہ تہجد، چاشت، تحیۃ المسجد، تحیۃ الوضو، اشراق بھی پڑھیئے۔ ہو سکے تو بعد مغرب چھ رکعت بھی پڑھ لیجئے۔

رمضان کے روزوں کے علاوہ محرم کا روزہ نصف شعبان کا روزہ ایام بیض کے روزے یعنی ہر چاند کے مہینے کی ۱۳-۱۴ روز ۱۵ کا روزہ۔

زکوٰۃ فرض کے علاوہ غریبوں۔ فقیروں مسکینوں اور مسافروں کی مالی مدد کرنا۔ مدارس اور مساجد کی تعمیر میں ہاتھ بٹانا نفلی صدقہ ہے۔

حج فرض کے علاوہ نفلی عمرے کرنا۔ زیادہ سے زیادہ طواف کرنا نوافل کا یہ ذخیرہ محبت الٰہی کا بہترین ذریعہ ہے۔

تیسری چیز دوام ذکر ہے یہ ذکر زبان سے بھی ہو۔ قلب سے بھی ہو عمل سے بھی اور حال سے۔ کسی دم غافل نہ ہو۔ اللہ کے ذکر میں ہمیشہ مشغول رہے اسی کا نام نسبت ہے۔ ذکر کی مقدار ہی محبت کی مقدار کا پیمانہ ہے۔

چوتھی اللہ سبحانہ کی محبوبات کو اپنی محبوبات پر ترجیح دے بالخصوص خواہشات کے ہجوم میں اس کا زیادہ خیال رکھے۔

پانچویں قلب کو اللہ سبحانہ کے اسماء و صفات کے مشاہد ہے اور معرفت میں لگا رکھے قلب جس قدر ان کی معرفت کی کیاریوں اور مبادی میں رہے گا اسی قدر اللہ کی محبت میں اضافہ ہو گا۔

چھٹے اللہ سے انعامات اور احسانات اور اس کی ظاہری و باطنی نعمتوں کا مطالبہ کرتا رہے
ساتویں اللہ سبحانہ کے سامنے دل سراپا نیاز رہے
آٹھویں یہ کہ اللہ سے با ادب ہو کر دعا و تلاوت کرے اور آخر میں استغفار کرے اور آخر میں
نویں یہ کہ محبین صادقین کی صحبت اختیار کرے ان کی اچھی باتوں سے ایسے ہی لطف اندوز ہو جیسے لطیف اور مزیدار پھل سے، صحبت میں بیٹھ کر خاموشی اپنائے۔
دسویں یہ کہ ہر اس راہ سے دور رہے جو اللہ اور اس کے قلب میں حائل بن کر نمودار ہو خواہ یہ اشخاص ہوں یا اشیاء، قال ہو یا حال، علم ہو یا عمل اسی بنا پر حضرت مولانا اشرف علی نے کامل کا یہ چہرہ بتایا ہے۔

کامل وہ ہے جس میں یہ باتیں ہوں۔

(۱) ضرورت کے موافق علم دین رکھتا ہو
(۲) عقیدہ عمل اور عادت شریعت کے موافق ہو
(۳) دنیا کی حرص نہ رکھتا ہو کمال کا دعویٰ نہ کرتا ہو
(۴) کسی کامل کا صحبت یافتہ ہو
(۵) اس کے زمانے میں جو عالم اور درویش منصف مزاج ہوں وہ اس کو اچھا سمجھتے ہوں۔
(۶) عام لوگوں کی بہ نسبت خاص لوگ اس کے زیادہ معتقد ہوں
(۷) اس کے صحبت یافتہ اور تربیت میں رہے ہوئے افراد میں اکثر پابند شریعت ہوں اور دنیا کے طامع نہ ہوں۔
(۸) وہ کامل اپنے طالبوں کی تربیت بھی کرتا ہو اور چاہتا ہو کہ یہ صالح ہو جاویں
(۹) اس کے پاس چند روز بیٹھنے سے دنیا کی محبت میں کمی اور اللہ کی محبت میں زیادتی محسوس ہو۔
(۱۰) وہ خود بھی صاحب ذکر و فکر ہو۔

جس شخص میں یہ نشانیاں ہوں پھر یہ نہ دیکھے کہ اس سے کوئی کرامت بھی ہوتی ہے یا نہیں وہ ولی ہے اس کے دم کو غنیمت سمجھے۔ یہی الذین امنوا وکانوا یتقون کی عملی تفسیر ہے۔

اولیاء اللہ کے لیے بشارتیں

ان کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی بشارت ہے اور آخرت کی زندگی میں اللہ کے قوانین کو بدلنے والا کوئی نہیں ہے اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے اولیاء کے لیے دنیا میں کئی طرح کی بشارتیں ہیں مثلاً حق تعالیٰ نے انبیاء کی زبانی جو لاخوف علیھم وغیرہ کی بشارت دی ہے یا فرشتے موت کے وقت انکو کہتے ہیں البشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون یا کثرت سے سچے خواب انہیں نظر آتے ہیں یا ان کی نسبت دوسرے بندگان خدا کو دکھائی دیتے ہیں جو حدیث صحیح کے مطابق نبوت کے چھیالیس اجزا میں سے ایک جزو ہے یا ان کے معاملات میں اللہ سبحانہ کی طرف سے خاص ہی قسم کی تائید ہوتی ہے یا خواص میں اور کبھی خواص سے گذر کر عوام میں بھی ان کو مقبولیت حاصل ہوتی ہے اور لوگ ان کی مدح وثنا اور ذکر خیر کرتے ہیں یہ سب چیزیں دنیوی بشارت کے تحت میں درجہ بدرجہ آسکتی ہیں مگر اکثر روایات میں لھم البشری کی تفسیر رویائے صالحہ سے کی گئی ہے واللہ اعلم رہی بشارت اُخروی وہ خود قرآن میں منصوص ہے بشراکم الیوم جنات تجری من تحتھا الانھار اور حدیث میں بھی یہی تفسیر منقول ہے۔ اور لا تبدیل لکلمات اللہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی باتیں اور اس کے وعدے سب اٹل ہیں، جو بشارتیں وہی ہیں ضرور پہنچ کر رہیں گی لہ

اس آیت کی تشریح میں شارحین قرآن کا انداز اچھا خاصا معذرت خواہی کی تصویر ہے مولانا عثمانی نے جو کچھ اپنے افادات میں لکھا ہے قرطبی بیضاوی، قنوجی، ابن کثیر، ابوحیان آلوسی، ابن جریر یہ سب نے بھی انداز اختیار کیا ہے۔ ان میں البتہ بقاعی، مراغی نے بات سیاق وسباق کے مطابق لکھی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ چونکہ ان بزرگوں نے آیت میں اولیاء اللہ سے آج کے اصطلاحی مشائخ مراد لئے ہیں اس لیے لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون کو مطالب کا دہ جامہ پہنانا پڑ گیا جو ان کے حال کے مطابق ہو اسی طرح لھم البشری فی الحیاۃ

لہ افادات شیخ الاسلام

الدنیا وفی الاخرہ کا منطوق بھی ان کے ہی حسب حال بنایا۔ حالانکہ ایت قرآنی میں یہ اصطلاحی اولیاء مراد نہیں ہیں۔

آیت قرآن کا مطلب بالکل واضح اور صاف ہے کہ وہ لوگ جو اللہ سبحانہ سے لگاؤ رکھتے ہیں جنہوں نے خدائی اطاعت کا عہد کیا اور اپنے نفس وارادہ کو بالکلیہ احکام الٰہی کے تابع کر دیا نتیجتہً وہ ان جملہ حقوق سے دستبردار ہو گئے جو زمانہ جاہلیت میں ان کو حاصل تھے اور اللہ سبحانہ سے اللہ کے دین کو دنیا میں قائم کرنے کے لیے انہوں نے جنت کے بدلے میں اس دنیا میں اپنی جانوں اور مالوں کا سودا کر لیا ہے اللہ سبحانہ نے ان کو بتایا ہے کہ ان کی زندگی بے خوف ہو گی یعنی ان کو ہر قسم کا امن اور چین پہلے دنیا کی زندگی میں ملے گا معاشی طور پر بھی اور سیاسی طور پر بھی ان کی زندگیاں خوف سے بالا ہوں گی اور وہ اپنی زندگی میں غمگین نہیں بلکہ شاداں اور مسرور رہوں گے۔ ان کا ہی یہ چہرہ بیان ہوا ہے کہ الذین امنوا وکانوا یتقون انہوں نے اللہ کی وحدانیت اور رسالت محمدی کا اقرار کیا ہے اور اس اقرار کے ساتھ اس اقرار کے لازمی نتائج کو بھی تسلیم کیا۔ لفظ اسلام خود اس حقیقت کا شاہد ہے کہ اسلامی زندگی اپنانا اپنے نفس کے جملہ حقوق سے دست بردار ہونا ہے کیونکہ اسلام کے معنے ہیں اپنے تئیں کسی کے حوالہ کر دینا اور اس کی پوری پوری طاعت بجا لانا۔ ایک شخص جب مسلمان ہوتا ہے تو وہ اس بات کا وعدہ کرتا ہے کہ اس کا ارادہ اس کی عقل اور اس کے جذبات وخواہشات قانون الٰہی اور احکام خدا کی اطاعت میں حائل نہ ہوں گے اور اللہ سبحانہ کے حکم کے مقابلے میں وہ ان سب کی قربانی کرے گا وکانوا یتقون کا یہی مدلول ہے اس اطاعت وسپردگی کے معاوضہ میں ان کو دنیا کی زندگی میں کامیابی کی دشمن کے مقابلہ میں نصرت اور غلبہ کی اور دنیا کی زندگی میں اس دین کا بول بالا ہو گا جسے انہوں نے اپنایا ہے اور آخرت میں ان کو رضائے الٰہی اور قرب خداوندی حاصل ہو گا۔ اور فرشتے ان سے ملیں گے تو کہیں گے بشرکم الیوم جنات تجری من تحتھا الدنیا۔

اس کے بعد فرمایا لا تبدیل لکلمات اللہ یہ اللہ کا اٹل قانون ہے اس میں رد وبدل نہیں ہو سکتا ہے قوموں اور زمانوں کی تبدیلی کا قانون الٰہی پر کوئی اثر نہیں ہوتا سب کے لیے ایک ہی قانون ہے۔

اس اصولی وعدہ بشارت کا حال اگر اس کی عملی شرح اور واقعاتی شہادت کے ساتھ

دیکھنا ہو تو بنی اسرائیل کی اس تاریخ پر نظر ڈالیے جو حضرت موسیٰ کی پیدائش سے کچھ پہلے شروع ہوتی ہے اس وقت سے لے کر حضرت موسیٰ کی بعثت تک کی ان کی زندگی انتہائی ذلیل درد ناک اور ٹھکرائی ہوئی زندگی تھی۔ ان کی یہ ذلت کی زندگی عزت کی زندگی سے اس وقت بدلی جب وہ اپنے رب کی طرف پلٹے اور اس کے دین کی پیروی میں انہوں نے ثابت قدمی دکھائی۔ قرآن کا بیان ہے۔

"وتمت کلمت ربک الحسنی علی بنی اسرائیل بما صبروا"

"تیرا رب کا وعدہ خیر بنی اسرائیل کے حق میں پورا ہو گیا کیونکہ انہوں نے راہ حق میں ثابت قدمی دکھائی"۔

اور نہ صرف یہ کہ اپنے رب کی طرف پلٹنے اور راہ حق میں ثابت قدمی دکھلانے پر انہیں عزت واقتدار کی زندگی مل گئی بلکہ ایک کلیہ کے طور پر ان کو یہ دائمی خوشخبری بھی سنا دی گئی کہ اللہ سبحانہ کی شکر گذاری اور احکام کی پیروی میں تم جتنا بھی آگے بڑھو گے اتنی ہی مزید نعمتوں سے نوازے جاؤ گے۔

واذ تاذن ربکم لئن شکرتم لازیدنکم

"تیرے رب نے اعلان کر دیا کہ اگر تم نے راہ شکر اختیار کی تو مزید انعامات سے نوازے جاؤ گے"۔

جب تک وہ شکر گذاری کی روش اختیار کیے رہے دنیا نے دیکھا کہ اللہ سبحانہ کا وعدہ بشارت پورا ہوتا رہا بلکہ اس شان سے پورا ہوا کہ وہ قومی عزت واقبال کی آخری بلندیوں پر پہنچا دیئے گئے۔ اور پھر جب انہوں نے شکر گذاری یعنی اللہ کی پرستش وبندگی کی یہ روش چھوڑ دی تو عزت واقبال کو ان سے چھین لیا گیا۔ سب قوموں کے لیے اللہ کا یہی قانون ہے۔

ولوان اھل القری امنوا واتقوا لفتحنا علیھم برکات من السماء والارض"۔

"اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور راہ تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر زمین و آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے"۔

یہی قانون یہاں الذین امنوا وکانوا یتقون میں بیان ہو رہا ہے اس کے نتیجے

میں بھی مسلمانوں اور دوسری امتوں میں بالکل برابری ہے۔ امتوں میں سے جنہوں نے ایمان و تقویٰ کی راہ اختیار کی ان کے بارے میں قرآن کا بیان ہے۔

فاتاهم الله ثواب الدنیا وحسن ثواب الاخرة

تو اللہ نے ان کو دنیا کا بھی اجر دیا اور آخرت کا بھی بہترین اجر

انبیائی امتوں کی یہ متفقہ شہادتیں ہمارے سامنے موجود ہیں ان سے اللہ سبحانہ کے جس نہ بدلنے والے ضابطہ اور قانون کا پتہ چلتا ہے وہ قطعی طور پر یہی ہے کہ اپنی طاعت اور بندگی کے عوض وہ آخرت کی فلاح کے ساتھ ساتھ اس دنیا کی بھی آسائش اور عزت واقتدار بخشے گا۔ پھر یہی متفقہ شہادتیں یہ بھی بتاتی ہیں کہ جب بھی کسی قوم نے اطاعت و بندگی کی یہ راہ اپنائی ہے اس کے حق میں یہ ضابطہ اور وعدہ لازماً پورا ہوا۔ اور وہ جن کی آخرت سنور تی تھی۔ ان کی دنیا بھی باغ و بہار ہی بنی رہی۔

کوئی وجہ نہیں کہ امت مسلمہ کے بارے میں اللہ سبحانہ کا یہ ضابطہ اور قانون بدل جائے۔ چنانچہ اس آیت میں امت مسلمہ کے بارے میں اسی قانون کو بتایا جارہا ہے کہ ایمان و تقویٰ کی شرطیں پورا کرنے کے نتیجے میں اہل ایمان کو دنیا کی زندگی ملے گی اور ان کو دشمنوں کے مقابلہ میں غلبہ اور برتری دی جائے گی ذلت کی جگہ عزت محکومی کی جگہ حاکمیت پستی کی جگہ بلندی اور زمین میں اقتدار ملے گا۔ یہ وعدے یہ بشارتیں یہ وعدے کیسے پورے ہوئے اس سے دنیا ناواقف نہیں ہے وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ قرآن نے مسلمانوں کو وہ سب کچھ دیا جو دنیا میں کسی قوم کو مطلوب ہو سکتا ہے۔ قرآن ہی میں ہے۔

وعد الله الذین امنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنهم فی الارض کما استخلف الذین من قبلهم ولیمکنن لهم دینهم الذی ارتضی لهم ولیبدلنهم من بعد خوفهم امنا۔

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور عمل صالح کی نعمت سے ہمدوش ہیں ان سے اللہ سبحانہ کا وعدہ ہے کہ وہ ضرور ان کو اقتدار عطا فرمائے گا جس طرح اس نے پہلے لوگوں کو اقتدار عطا فرمایا تھا اور ان کے لیے ان کے اس قانون کی جڑیں مضبوط سے جما دے گا جسے اللہ سبحانہ نے ان کے لیے پسند فرمایا ہے

اور ان کی موجودہ حالت خوف کو امن سے بدل دے گا۔"

ان تمام صراحتوں اور شہادتوں کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ جو بات آیت استخلاف میں کہی گئی ہے وہی بات یہاں آیت ولایت کہی ہے جو بات آیت استخلاف میں صراحت سے کہی گئی ہے وہی بات اس آیت میں کنائی زبان میں کہی گئی ہے ایک ہی بات ہے مگر تعبیرات جدا جدا ہیں۔

یہاں پہنچ کر شائد آپ کے ذہن میں یہ سوال ابھرے کہ صورت حال اگر یہ ہے تو شارحین نے اس آیت کے منطوق میں خواب کی بات کیوں رکھ دی ہے۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ شارحین قرآن نے اولیاء اللہ سے اپنے زمانہ کے تارک الدنیا عزلت گزین خانقاہوں اور زاویوں میں مجاہدات کرنے والے بزرگوں کو قرآن کا اولیاء اللہ سمجھ لیا ہے۔ یہ سمجھ لینے کے بعد جب ان کو اقتدار و دبدبہ سے محروم دیکھا تو آیت قرآنی کی تشریح کیلئے خواب کا سہارا لے لیا۔ اور سوء اتفاق سے اس موضوع پر ایک منقطع حدیث بھی ان کو دفتر حدیث میں مل گئی۔ لیجئے حدیث آپ بھی سن لیجئے۔

"حضرت ابوالدرداء فرماتے ہیں کہ انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے لھم البشریٰ فی الحیاۃ الدنیا کے متعلق دریافت کیا حضور نے فرمایا کہ جس وقت سے مجھ پر یہ آیت قرآنی نازل ہوئی ہے کسی نے میرے سے پوچھا۔ بشریٰ سے مراد مسلمان کا وہ اچھا خواب ہے جو وہ دیکھے یا اسے دکھایا جائے۔"

یہ ترمذی نے اپنی سنن میں روایت کی ہے۔ لیکن امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ابوصالح روایت کرتا ہے لیکن ابوصالح اور ابوالدرداء کے درمیان اس میں عطاء بن یسار نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کی سند میں اتصال نہیں بلکہ انقطاع ہے۔ امام ترمذی نے یہی حدیث دوسری دو سندوں سے بھی روایت کی ہے جن میں عطاء بن یسار موجود ہے لیکن ان میں عطاء بن یسار، مصر کے ایک مجہول شخص سے روایت کرتے ہیں اس لیے یہ روایت بھی منقطع ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عطاء نے خود ابوالدرداء سے نہیں سنا ہے۔ موطا میں اس موضوع پر حضرت عروہ ابن الزبیر کی یہ تشریح کہ اس آیت میں بشریٰ سے مراد رؤیائے صالحہ ہے یہ روایت موقوف ہے کہنا یہ چاہتا ہوں کہ حدیث کی روشنی میں بشریٰ کی خواب سے تشریح صحیح طریقہ سے ثابت نہیں ہے دو باتیں ہیں اور دونوں

الگ الگ ہیں۔

ایک یہ کہ اس آیت میں بشریٰ سے مراد رویائے صالحہ ہے۔ دوسری یہ کہ رویائے صالحہ بشریٰ اور مبشرات میں سے ہے۔ میں پہلی بات کو بتا رہا ہوں کہ وہ صحیح طریق سے ثابت نہیں ہے باقی دوسری بات کہ رویائے صالحہ مبشرات میں سے ہے یہ اپنی جگہ صحیح ہے اور احادیث سے ثابت ہے۔

اچھا خواب بھی مبشرات سے ہے

یہ حقیقت بالکل بے غبار ہے کہ احادیث میں اچھے خواب کو مبشرات میں سے ہی نہیں بلکہ نبوت کا چھیالیسواں حصہ بتایا ہے اور نبوت کے اجزا میں سے بھی ایک حصہ یعنی بشریٰ امت کو نبوت سے وراثت میں ملا ہے چنانچہ ایک سے زیادہ احادیث میں یہ بات کھول کر بتائی ہے۔ موطا امام مالک میں بحوالہ حضرت انس بن مالک ہے کہ

> حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نیک آدمی کا اچھا خواب نبوّت کے چھیالیس حصوں میں سے ایک ہے۔

اور امام بخاری نے حضرت ابوہریرہ کے حوالہ سے بتایا کہ

> حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ نبوت سے مبشرات کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔ صحابہ نے دریافت کیا یا رسول اللہ مبشرات کیا ہیں؟ فرمایا اچھا خواب

اچھے آدمی کے اچھے خواب کا نبوت کے اجزا میں سے ہونے کا کیا مطلب ہے حکیم الامت شاہ ولی اللہ المسوی میں لکھتے ہیں کہ

> اس کا مقصد خواب کے معاملہ کو بتانا ہے کہ خواب انبیاء کے حق میں نبوت کا ایک حصہ ہے خوب سمجھ لو کہ یہ حقیقت ہے اگر تم میں کوئی خواب دیکھے تو اس کو ناقابل التفات نہ سمجھو کیونکہ نبوت کے متعدد اجزا میں یہ جز امت میں باقی ہے۔

اگر خواب مبشرات میں سے ہے اور اس کی حیثیت نبوّت کے چھیالیسویں حصہ کی ہے تو پھر ایسے خوابوں کی قانونی حیثیت کیا ہے یہ تو سب جانتے ہیں کہ نبوّت کے سوا کسی کا نہ خواب

قانونی طور پر حجت اور نہ الہام۔ نبی کا خواب قطعی ہے جب کہ دوسروں کا خواب قطعی نہیں ظنی ہے لیکن ظنی ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ پایۂ اعتبار سے ساقط ہے ورنہ یوں تو قرآن کے سوا اخبارِ آحاد بھی ظنی ہیں۔ قیاس مجتہد بھی ظنی ہے خواب بھی ظنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ثبوت میں قطعیات سے کمتر ہے نہ یہ کہ اس میں حجیت کی شان ہی نہیں ہے۔ البتہ حجیت ہونے کی حیثیت الگ الگ ہے۔ خبرِ واحد ظنی ہے صرف وسائط کے درمیان میں آجانے کی وجہ سے چونکہ شبہ کی گنجائش آگئی ہے اس لیے ارشادِ نبوت ہونے کے باوجود وہ ثبوتاً ظنی ہوگئی اور ثمرہ کے اعتبار سے بھی ظنی شمار ہوگی لیکن اس کے باوجود حجت شرعیہ ہے اور موجب للعمل ہے۔ ایسے ہی اجتہادِ مجتہد بھی ظنی ہے مگر خبرِ واحد سے درجہ میں کمتر ہے کیونکہ وحی سے ماخوذ ہے اور چونکہ اس میں بندے کے فہم و عقل کو دخل ہے اس لیے بلحاظِ ثبوت خبرِ واحد سے کمتر ہوگا مگر پھر بھی نص سے ماخوذ ہونے کی وجہ سے مورثِ ظن ہی ہے اور اس میں حجت شرعیہ ہونے کی شان بھی باقی ہے اسی لئے اجتہاد کو مثبت احکام نہیں بلکہ مظہرِ احکام کہا جائے گا۔

رویائے صالحہ مؤید ہے

رویائے صالحہ یقیناً خبرِ واحد اور اجتہادِ مجتہد سے درجہ میں کمتر ہے کیونکہ وہ خود نہ وحی ہے اور نہ وحی سے ماخوذ ہے بلکہ غیر نبی پر گذرے ہوئے واقعات ہیں جس کی سند صرف یہ خواب دیکھنے والا ہے جس کا کوئی شاہد اور متابع نہیں اس لیے وہ اور الہام ولی نہ احکام کے لیے مثبت ہوگا اور نہ مظہر۔ البتہ ثابت شدہ احکام یا واقعات کے لیے مؤید ضرور ہوسکتا ہے اسی لیے سلف سے لے کر خلف تک اہل علم خوابوں سے اس قسم کی تائیدات کا اثبات کرتے آئے ہیں۔ آخر خواب کو نبوت کا $\frac{1}{46}$ حصہ فرمایا گیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس کا تعلق فرضیات سے نہیں واقعات سے ہے۔ نبوت کی ابتدا ہی سچے خوابوں سے ہوئی کہ آپ جو کچھ خواب میں دیکھتے وہی چیز واقعہ بن کر سامنے آجاتی۔ بتانے والوں نے سچے خوابوں کا عرصہ ۶ ماہ بتایا ہے اور وحی کا عرصہ نبی ہونے کے بعد ۲۳ سال ہے۔ ان ۲۳ سالوں کو ۱۲ سے ضرب دیجئے تو حاصل ضرب ۲۷۶ آتا ہے اس کو ۴۶ پر تقسیم کیجئے تو چھیالیسواں حصہ ۶ آتا ہے۔ نبوت کے بعد نبوت کے اس چھیالیسویں حصہ کے باقی رہنے کی خبر دی گئی۔

لم یبق من النبوۃ الا المبشرات، اس کا حاصل یہی ہے کہ سچے اور اچھے خواب نبوت کا ایک جزو ہونے کی وجہ سے تبشیر کا کام ضرور دے سکتے ہیں۔ اور اگر ان سے احکام اور علل احکام ثابت نہیں ہو سکتے تو ان احکام و علل کی تائید اور توضیح تو ہو سکتی ہے۔

رویائے صالحہ کی تاثیر

رویائے صالحہ کی تاثیر بھی نمایاں ہے۔ اچھا خواب اگر وہ از قسم مبشرات ہے تو قلوب کو تسلی ہوتی ہے اور اگر از قسم انذار ہو تو دل لرز کر محتاط ہو جاتے ہیں سوچنے کی بات ہے کہ اگر ایک واقعہ بیداری میں اثر ڈالے بغیر نہیں رہتا تو آخر خواب میں دیکھنے والے کے لیے بے اثر ہو کر کیسے رہ جائے گا صرف ظرف ہی تو بدلتا ہے واقعہ تو نہیں بدلتا مورد نگاہ ہی تو بدلتا ہے نگاہ تو نہیں بدلتی ہے۔

نیز یہ بھی ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ دنیا میں حقیقی نگاہ بھی قوت خیال ہے جو نفس انسانی کا ایک طبعی جوہر ہے اور خواب کی نگاہ بھی اسی نفس کی وہی قوت خیالیہ ہے صرف اس کے پیکر کی شکل بدل جاتی ہے۔ قوت نہیں بدلتی ہے۔ اس لیے جب نفس بھی ایک ہی ہے اور آلہ ابصار بھی ایک ہے اور واقعہ کی نوعیت بھی ایک ہی ہے اگر بدلا ہے تو صرف ظرف بدلا ہے تو ظرف کے بدلنے سے مظروف یا اس کی تاثیر کیسے بدل جا سکتی ہے زیادہ سے زیادہ کیفیت کی نوعیت میں فرق ہو سکتا ہے کیفیت کی تبدیلی سے عین نہیں بدل سکتا اس لیے بیداری کی آنکھ سے کسی واقعہ کو دیکھا جائے یا خواب میں دیکھا جائے دیکھنے والا نفس اور اس کی قوت خیال سمع و بصر اور ذوق و شم کی نوعیتوں میں بٹی ہوئی ہے ایک ہی رہے گی اور اثر بھی ایک ہی ظاہر ہوگا اس لیے سچا خواب یقیناً اپنا اثر دکھلائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر وہ ظنی ہے تو ہمارے ادراک کی وجہ سے ظنی ہے نہ کہ واقعات کے اعتبار سے اس لیے سچے خواب میں قبولیت کے علاوہ ایک گونہ حجیت کی شان بھی کچھ نہ کچھ ہو گی جب ایک سچے مومن کا خواب ایک سچا واقعہ ہے تو بوجہ واقعیت اپنے متعلقہ معاملہ کیلئے حجت ہو گا گو وہ اتنا ہی حجت ہو کہ قانون کی نظر میں نہ ہو۔

تواتر کی صورت میں سچا خواب

اگر ایک شخصیت یا ایک واقعہ کے بارے میں کئی سچے خواب جمع ہو جاویں تو ان میں حجیت کی شان کچھ زیادہ ہو جاتی ہے دور نبوت میں ایسے خوابوں کو حجت شرعیہ سمجھا گیا ہے

لیلۃ القدر کو جب متعدد صحابہ نے رمضان کے آخری عشرے ہی میں خواب میں دیکھا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کے عشرہ آخر میں ہونے کا حکم دے دیا اور اس کی علت یہ ارشاد فرمائی ۔

"میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے بہت سے خواب اس پر متفق ہو گئے کہ لیلۃ القدر عشرہ آخرہ رمضان میں ہوتی ہے۔"

اس سے پتہ چلتا ہے کہ خوابوں کی یکسانیت اور تواتر و تعدد جھوٹ پر محمول نہیں ہوتا۔ لہذا جیسے اہل ایمان کے خوابوں کی ہم آہنگی روایت کو واجب القبول اور مورث ظن غالب بنا دیتی ہے اور جس طرح رائے میں علما کی ہم آہنگی یعنی اجماع و استحسان کسی چیز کو واجب العمل قرار دیتی ہے ٹھیک اسی طرح سچے اہل ایمان کا سچے خواب پر اتفاق خواب کو واجب القبول بنا دے تو اس میں حیرت کی کونسی بات ہے اور اگر ایک حد تک زندگی میں قانونی طور پر حجت مان لیا گیا ہے تو اس میں کیا قباحت ہے بلکہ بعض اوقات زمانہ نبوت میں ایک ہی شخص کے خواب کو شرعی حکم کی بنا قرار دیا گیا ہے جیسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان کی مشروعیت کے لیے عبداللہ بن یزید بن عبد ربہ کے خواب کو شرف پذیرائی دیا اور فرمایا انہا لرؤیا حق قم یا بلال فاذن یہ سچا اور واقعی خواب ہے بلال کھڑے ہو اذان دو یہ الگ بات ہے کہ وہ دور نبوت تھا اور آپ کی توثیق ہے خواب حجت شرعی بن گیا لیکن توثیق تو بہر حال خواب ہی کی ہوئی جس سے اتنا واضح ہو گیا کہ مومن صالح کا سچا خواب کسی نہ کسی درجے میں حجیت کی شان ضرور لیے ہوئے ہے۔

یہاں پہنچ کر آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ بشری اگر خواب ہے ۔

کونسا خواب بشری ہے؟

تو کیا ہر خواب بشری ہے یا اس کا کوئی خاص پیمانہ ہے۔

اس موضوع پر بزرگوں نے کافی تحقیق اور دقیق سے کام لیا ہے سب سے پہلے اس موضوع پر حکیم الامت شاہ ولی اللہ کے علوم سے استفادہ کیجئے شاہ صاحب علوم شرعیہ اور علوم باطنیہ دونوں کے شناور ہیں شاہ صاحب نے مؤطا امام مالک کی دو شرحین لکھی ہیں ایک عربی میں اس کا نام المسوی ہے دوسری فارسی میں اس کا نام مصفی ہے۔ شاہ صاحب نے المسوی میں مؤطا کی اس حدیث

> ابو قتادہ بن ربعی کہتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد سنا ہے کہ اچھی خواب اللہ کی جانب سے اور حلم شیطان کی جانب سے ہے جب تم میں سے کوئی شخص خواب میں ناگوار چیز دیکھے تو اسے بائیں طرف تین بار ہو کر تھوک دینا چاہیے اور یوں کہنا چاہیے اعوذ باللہ من شرھا میں اللہ کی پناہ میں آتا ہوں اس کی برائی ہے انشاء اللہ ہر قسم کے نقصان سے محفوظ رہے گا۔ حدیث کے راوی ابو سلمہ کہتے ہیں میں بری خوابیں دیکھتا جو مجھ پر پہاڑ سے زیادہ گران ہوتیں۔ جب سے میں نے حضور اقدس کا یہ ارشاد سنا ہے تب سے میں ایسے خوابوں کی پروا نہیں کرتا۔

پر یہ نوٹ لکھا ہے:

> اس ارشاد کے ذریعے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ بتا رہے ہیں کہ انسان کے سارے خواب صحیح نہیں ہوتے ہیں صحیح تو صرف وہ خواب ہوتا ہے جو اللہ کی جانب سے خواب کا فرشتہ لے کر آئے اس کے علاوہ سب خیالات فاسدہ میں ان کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی۔ یہ خیالات فاسدہ میں خواب کئی قسم کے ہوتے ہیں کبھی خواب دیکھنے والے سے شیطان کھیلتا ہے یا اس کو غمناک مناظر دکھاتا ہے اسی کے بارے میں حضور کا حکم ہے کہ بیدار ہو کر بائیں جانب تھوک دے اور اعوذ باللہ من شرھا کہے۔ اور کبھی خواب کا پس منظر جی کی باتیں ہوتی ہیں مثلاً کسی کام میں اپنے کو ننگا ہوا دیکھتا

ہے اور کبھی خواب کا پس منظر خود انسانی طبیعت کا مزاج ہوتا ہے دموی مزاج کو خواب میں نکسیر سفید یا سرخ رنگ کی چیزیں نظر آتی ہیں صفرائی طبیعت والے آگ اور زرد رنگ کی چیزیں خواب میں دیکھتے ہیں سودائی طبیعت والے سیاہی تاریکی کالی چیزیں ہولناکیاں اور موت دیکھتے ہیں، بلغمی مزاج والوں کو خواب میں پانی۔ برف اور سپید چیزیں نظر آتی ہیں ان کی کوئی تعبیر نہیں ہے۔

تاویل الرؤیا یا تعبیر کے مقام پر انشاء اللہ تفصیلی بحث سورۂ یوسف میں آرہی ہے۔ یہاں تو صرف یہ بتانا ہے کہ احادیث کی روشنی میں اچھے آدمی کے اچھے خواب بھی بشری ہیں۔ لیکن آیت قرآنی لهم البشری فی الحیاۃ الدنیا میں بشری سے مقصود اچھا خواب نہیں ہے بلکہ دنیا کی زندگی میں خوشحال۔ امن وچین، خوشی وشادمانی ہے۔ لوگ اپنے کو پستیوں میں دیکھ کر چاہتے ہیں کہ قرآن کو اس کی بلندیوں سے ہٹا کر اپنی پستیوں کا ہمنوا بنالیں ہونا یہ چاہیے کہ ہم قرآن کی بلندیوں تک پہنچے تھے۔ اور آنِ واحد میں دنیا کی روحانی، اخلاقی، عائلی، معاشرتی معاشی، سیاسی اور قانونی نظام کی امامت پر قابض ہو گئے تھے واجعلنا للمتقین اماماً

عزت و دبدبہ پر اللہ کا قبضہ ہے

۶۵ اور اے اللہ کے رسول تمہیں مخالفین کی باتیں غمگین نہ کریں یقین کرو کہ سارا دبدبہ اللہ کے لیے ہے وہ سب کچھ سن رہا ہے اور سب کچھ جانتا ہے اوپر سے اعداء مکذبین کا ذکر چلا آرہا تھا ان کے بالمقابل دوستوں کا ذکر آیا اور ان کو دارین میں محفوظ رہنے کی بشارت دی۔ اسی سلسلہ میں حضور کو تسلی دی کہ آپ احمقوں اور شریروں کی باتوں سے رنجیدہ نہ ہوں غلبہ اور زور سب اللہ کے لیے ہے وہ اپنے زور و تائید سے حق کو غالب ومنصور اور مخالفین کو ذلیل و رسوا کر کے چھوڑے گا وہ ان کی سب باتیں سنتا اور سب حالات جانتا ہے[1] ان آیات کے نزول کے زمانے میں نبوت اور اہل ایمان پر آشوب حالات سے دوچار تھے ان حالات میں تمکن اور غلبہ کی بشارت مخالفین کے لیے استہزا و اعراض کا باعث ہو سکتی تھی۔ ان کا دعویٰ ضرور اپنے غلبہ کا ہوگا وہ کہہ سکتے تھے اور انہوں نے کہا بھی ہوگا کہ اس بے کسی اور بے بسی کی حالت میں لهم البشری فی الحیاۃ الدنیا کا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نعرہ کیسا عجیب ہے ان کو دو وقت کی روٹی کھانے کو اور بدن ڈھانکنے کو کپڑا نہیں ملتا اور اقتدار و غلبہ کا خواب دیکھ رہے ہیں فرمایا ان کی یہ بات آپ کو غمگین نہ بنائے آپ کے لیے جو بشارت ہے وہ یقینی ہے آگے اس کی علت بیان ہو رہی ہے ان العزۃ للہ جمیعاً اس لیے کہ غلبہ و اقتدار اور عزت کا مالک اللہ ہے وہ بلاریب ان کو ذلیل کرے گا اور آپ کو عزیز بنائے گا یہ نعمت جس کو ملتی ہے اللہ ہی کی دین سے ملتی ہے اب اگر اللہ نے یہ عزت تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو دینے کا ارادہ کر لیا تو اسے کون روک سکتا ہے یہ اللہ سبحانہ کا فیصلہ ہے دنیا کی کوئی طاقت اس میں رکاوٹ نہیں ہو سکتی علامہ بقاعی اور قاضی بیضاوی نے ان العزۃ للہ جمیعاً کو پہلے جملہ کی تعلیل قرار دیا ہے اور مطلب یہ بتایا ہے کہ ان کی بات پر غمگین نہ ہوجیئے اور ان کی پروا نہ کیجئے کیونکہ غلبہ و اقتدار اللہ کی ملکیت ہے۔ کوئی اس میں اللہ کا شریک نہیں ہے اللہ سبحانہ ضرور ان کو مغلوب کرے گا۔ اور آپ کو غلبہ عطا فرمائے گا۔

ایمان و تقویٰ اور فلاح دنیا

ان تمام صراحتوں اور شہادتوں کے بعد قرآن کے قاری کا ذہن اس پر تو بالکل مطمئن ہو جاتا ہے کہ قرآن ایمان و اتقا سے مالا مال ہونے والوں کو دنیا کی فلاح سے خوب نوازتا ہے۔ لیکن ذہن میں یہ خلش ضرور چٹکیاں لے گی کہ قرآن تو صرف آخرت کی طرف انسان کو متوجہ کرتا ہے اور اسے دنیا سے بے پروا بناتا ہے پھر اسے ایمان و اتقا کا دامن پکڑنے کے نتیجے میں دنیا کس طرح ملے گی۔

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لیے ہمیں پہلے کچھ اصولی حقائق سمجھ لینی چاہئیں ایک تو یہ کہ دولت و عزت و اقتدار جنہیں دنیا کی فلاح کہا جاتا ہے قرآن کی نظر میں بجائے خود مقصود نہیں بلکہ اللہ کی نعمتیں ہیں۔ خود قرآن نے اپنے مخاطبوں کے سامنے ان کو یہی حیثیت دی ہے۔

اذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ جعل فیکم انبیاء وجعلکم ملوکاً

دوسری یہ کہ انسان اس دنیا میں اللہ سبحانہ کا خلیفہ اور نائب ہے اس کا منصب یہ ہے کہ وہ اس زمین کا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھے اور اسے اپنے مالک کے احکام

مرضیات کے مطابق چلائے۔

یہ دونوں بنیادی حقیقتیں اگر سامنے ہوں تو زیر بحث سوال اس حد تک بالکل حل ہو جاتا ہے کہ دنیا کی عزت دولت اور اقتدار ہرگز ایسی چیزیں نہیں ہیں جن سے تعلق رکھنا اور فائدہ اٹھانا قرآن کی دعوت کے منافی ہے کیونکہ جو چیزیں اللہ کا فضل اللہ کی نعمت ہوں وہ اہل ایمان کے لیے ممنوع نہیں ہو سکتی ہیں۔ قرآن بتاتا ہے۔

قل ھی للذین امنوا فی الحیاۃ الدنیا خالصۃ یوم القیامۃ

یہ ساری چیزیں دنیا کی زندگی میں ایمان والوں کے لیے ہیں اور قیامت کے دن تو خالصۃ ان کے لیے ہی ہوں گی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں کے اصلی حقدار اہل ایمان ہیں اگر فی الواقع وہ حقدار ہیں تو وہ ان کے لیے ناپسندیدہ کسی طرح نہیں ہو سکتی ہیں اہل ایمان اللہ کی نعمتوں سے نہیں اس کی نعمتوں سے گریز کرتے ہیں۔

یہ بھی سوچئے کہ اگر اللہ سبحانہ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے اور چاہتا ہے کہ اس زمین پر وہ اس کے احکام کے مطابق اپنے اختیارات استعمال کرے تاکہ یہاں بھی اس کی مرضی پوری ہو جس طرح باقی کائنات میں ہو رہی ہے تو جب تک یہاں ایسے لوگ موجود ہوں جو اپنے فرض منصبی کا پورا احساس رکھتے ہوں اس وقت تک یہ بات اللہ سبحانہ کی حکمت کے منافی ہے کہ ان کو زمین کے اقتدار سے محروم رکھے اور ان کے ہوتے ہوئے اقتدار ان لوگوں کے سپرد کر دے جو اس فرض منصبی کے منکر ہوں۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ہے قرآن کے اوراق کھلے ہوئے ہر شخص پڑھ سکتا ہے۔

ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصالحون

ہم نے زبور میں یاد دہانی کے بعد لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث حاکم میرے صالح نیک بندے ہوں گے۔

صالحین سے مراد الذین آمنوا وکانوا یتقون ہیں۔ قرآن میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں یہ فرما کر کہ

وکذالک مکنا لیوسف فی الارض

اور اسی طرح ہم نے حضرت یوسف کو زمین میں حکومت دے دی ارشاد ہوا ہے۔
ولاجر الآخرۃ خیر للذین آمنوا وکانوا یتقون۔
اور آخرت کا اجر اس سے بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان و اتقاء کی نعمت سے مالا مال ہیں۔

اب اہل ایمان و اتقاء کے لیے یہ بات کسی طرح صحیح نہ ہوگی کہ وہ اس اقتدار کے حاصل کرنے سے بے نیازی برتیں جس کے بغیر وہ اپنے فرض خلافت سے کسی طرح عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ جس چیز سے ان کی زندگی کا اصل فریضہ وابستہ ہو وہ ان کے لیے صرف پسندیدہ نہیں بلکہ ضروری بھی ہے۔ ان ساری باتوں کو پیش نظر رکھ کر یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ مسلمان صرف اخروی فلاح ہی کا نہیں بلکہ دینوی فلاح کا بھی حقدار اور طلب گار ہے اور ایسا ہونا یہ مسلمان کی سچی دینداری کا تقاضا ہے یہی وجہ ہے کہ ایک سچے اور صحیح الفکر مسلمان کی دعا یہ ہوتی ہے۔

ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار

یہ دعا یقیناً قبول ہو کر رہتی ہے اگر وہ الذین آمنوا وکانو یتقون کا مصداق بنا دے۔

دنیا کے سارے قوانین وہم وگمان کی تخلیق ہیں

[1] یاد رکھو کہ آسمانوں اور زمین میں سب کے سب اللہ کے ہیں اور وہ لوگ جو اللہ کے سوا شریکوں کو پکارتے ہیں ان کی جو کچھ بھی اتباع اور پیروی ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ سرتاسر گمانوں کی پیروی کر رہے ہیں اور وہ ہر بات میں الکل اور تخمین سے کام لے رہے ہیں یعنی کل زمین و آسمان میں خدائے واحد کی سلطنت ہے۔ سب جن وانس اور فرشتے اسی کے مملوک مخلوق ہیں مشرکین کا غیر اللہ کو پکارنا اور انہیں خدائی کا حصہ دار بنانا محض اٹکل کے تیر اور واہی تباہی خیالات ہیں ان کے ہاتھ میں نہ کوئی حقیقت ہے نہ حجت و برہان خالی اوہام و ظنوں کی اندھیریوں میں پڑے ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔

[1] افادات شیخ الاسلام

روحانی نظام ہو یا اخلاقی عائلی نظام ہو یا معاشرتی، معاشی نظام ہو یا سیاسی اور قانونی الغرض انسانوں کا بنایا ہوا کوئی نظام وہ خود انسان ہی کے وہم گمان اور تخمین و اندازے کی تخلیق ہوتا ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو نظام کوئی ہو روحانی ہو یا کوئی اور اس میں بنیادی نظریات اور اساسی اصولوں کا ماخذ انسان کے وہ تصورات ہوتے ہیں جو وہ خود اپنی ذات اپنے آغاز و انجام اور لوگوں سے اپنے تعلق کی نسبت قائم کرتا ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر بالآخر دیگر نظریات و تصورات قائم ہوتے ہیں کیونکہ انسان اپنی نسبت اپنے مرتبہ اور کائنات سے اپنے تعلق کی بات جو تصور تعبیر کرے گا وہی اس کے جملہ افکار و اعمال کی تشکیل پر موثر ہوگا۔

قرآن نے اس آیت میں الا حرف تنبیہ کے ذریعے انسان اس کی ذات اور کائنات سے اس کے تعلق کا نظریہ بنایا ہے۔ قرآنی نقطہ نظر سے من فی السماوات و من فی الارض اللہ کی مملوک کی ہے اس لیے انسان کی حیثیت اس زمین میں مملوک کی ہے اور اللہ سبحانہ اس کے مالک ہیں مملوک ہونے کی حیثیت میں اسے مالک نے ایک مکمل قانون دے کر دنیا میں اس لیے روانہ کیا ہے کہ وہ اس قانون کو خود اپنی زندگی اور اس کے معاملات کے لیے چراغ راہ بنائے اور دوسروں کو بھی اسی قانون کے مطابق چلائے۔ اس کام کے لیے اسے کچھ تھوڑے بہت اختیار بھی دیے گئے۔ اور اسی مقصد کی خاطر کائنات خارجی اور اس کی لاتعداد قوتوں کو انسان کا خادم بنا دیا گیا ہے کہ وہ انہیں جس طرح چاہے کام میں لائے۔ انسان اس لیے نہیں ہے کہ وہ خارج کا بے بس غلام بن کر رہے۔ اس کا شرف و امتیاز یہ ہے کہ وہ خارج اور اس کی قوتوں پر اپنے ارادے کو مؤثر کرے اور جس مالک کی ملک ہے اس کی ذات و صفات سے قرب حاصل کرے۔

اللہ سے قرب کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ سبحانہ کی ذات انسانوں کی طرح جسمانیت اور اس کے لوازم سے الودہ ہے۔ قرب سے مراد اللہ کی رضا حاصل کرنا اس احکام کی پیروی کرنا۔ قرب عبارت ہے ایسے ارادہ سے جو خارج و باطن دونوں پر موثر ہو اللہ کی ذات سب سے زیادہ مکمل ہے کہ اس کا ارادہ کائنات پر غالب ہے۔ اللہ سبحانہ کی ذات گرامی الحاصل کر کے سب سے زیادہ مکمل ہے کہ وہ اپنے ارادے پہ پورا اختیار رکھتا ہے اور کائنات

پر غالب ہے۔ اللہ سبحانہ کی ذات گرامی ان معنی کرکے سب سے زیادہ مکمل ہے کہ وہ اپنے ارادے پر پورا اختیار رکھتا ہے اور کائنات خارجی اس کے ارادے کی محکوم ہے۔

چونکہ زمین پر خدا کی مملوک ہونے کی حیثیت سے انسان کا کمال مطلوب یہ ہے کہ وہ اللہ سبحانہ سے زیادہ سے زیادہ قرب حاصل کرے اس لیے اسلامی زندگی کا اصل اصول اللہ کا قرب ہے اور یہی اسلام اور کفر کے درمیان حد فاصل ہے۔ کفر غیر اللہ سے قرب بے قیدی اور بے راہ روی ہے وہ ایسی زندگی ہے جس میں وہ عجز و درماندگی کی آخری حد تک پہنچ جاتے ہیں اور بے جان اشیا تک کو عبادت میں اللہ کا شریک بنا لیتے ہیں اسی کا نام اوثان ہے اور کبھی اپنے ہی جیسے انسانوں کی چاکری کرنے لگتے ہیں ان کو ہی قرآن کی زبان انداد کہتے ہیں اور ان سب کا مجموعی نام شرکا ہے۔ اس آیت میں وما یتبع الذین یدعون من دون اللہ شرکاء۔ عام غلط فہمی یہ ہو گئی ہے کہ شرک کو صرف عبادت تک محدود کر دیا گیا ہے حالانکہ شرک عبادت ہی میں نہیں طاعت میں بھی ہوتا ہے۔ اللہ سبحانہ کروڑ کروڑ جنت نصیب کرے حضرت شاہ عبدالقادر کیسی عمدہ بات فرما گئے۔ موضح القرآن میں آیت لا تنکحوا المشرکات کے تحت فرماتے ہیں۔

> شرک یہ کہ اللہ سبحانہ کی صفت کسی اور میں جانے مثلاً کسی کو سمجھے کہ اس کو ہر بات معلوم ہے یا وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ یا ہمارا بھلا یا برا کرنا اس کے اختیار میں ہے اور یہ کہ اللہ کی تعظیم کسی اور پر خرچ کرے مثلاً کسی کو سجدہ کرے اس سے حاجت مانگے مختار جان کر۔

اور سورہ نساء میں ان اللہ لا یغفران یشرک بہ پر نوٹ لکھتے ہیں۔

> اوپر سے ذکر تھا منافقوں کا جو پیغمبر کے حکم پر راضی نہ ہوں اور جُدی راہ چلے یہ آیت فرمائی کہ اللہ شرک نہیں بخشتا تو شرک فرمایا حکم میں شریک کرنے کو یعنی سوائے دین اسلام کے اور دین پسند رکھے اور اس پر چلے بس جو دین ہے سوائے اسلام کے سب شرک ہے اگرچہ پوجنے میں شرک نہ کرتے ہوں۔

اس کا مطلب یہی ہے کہ عبادت میں شرک سے بچتے ہوئے اگر اسلامی قانون کے سوا کسی اور قانون کی اطاعت کر رہے ہوں یہ شرک طاعت میں ہے۔ اور سورۂ انعام میں

زیر آیت وان اطعتموھم انکم لمشرکون فرماتے ہیں :
"شرک فقط یہی نہیں کہ کسی کو سوائے خدا کے پوجئے بلکہ شرک کے حکم میں ہے
کہ اور کا مطیع ہو جائے۔"

حضرت شاہ عبدالقادر نے شرک کے موضوع پر جو کچھ فرمایا ہے اسی کی روشنی میں اس آیت میں عبادت والا شرک مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ جن شرکا کی وہ شرکا سمجھ کر اتباع کر رہے وہ ان کی اتباع نہیں ہے۔ معاً سوال پیدا ہوا کہ پھر وہ کیا ہے جواب میں فرمایا کہ یہ سب کچھ ان کے اپنے ہی وہموں اور گمانوں کی پیروی ہے اور شرکا ء شرکا ہونے کے بارے میں ان کا اندازہ اور تخمین کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ جن کی تم اللہ کی شریک بنا کر اتباع کر رہے ہو یہ تو تمہاری اپنے اوہام کی پیروی ہے۔ ان کی پیروی کرتے تو اللہ کی عبادت کرتے وہ اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ یہ ساری کارگذاری تخمین و اندازے دب کر ہو رہی ہے۔ اور اگر ما موصولہ ہو تو مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ کے سوا دوسروں سے مانگنے والے جو کچھ جتنی کچھ اپنی زندگی میں جن کی اتباع کر رہے ہیں اس کی اساس ان کے وہم و گمان کے سوا کچھ نہیں اس صورت میں یہ شرک فی الطاعۃ ہے۔ یہ وہی اتباع ہے جو قرآن کی اس آیت میں بتائی ہے۔

اذ تبرا الذین اتبعوا من الذین اتبعوا ورا العذاب وتقطعت
بھم الاسباب۔

جب متبوعین اپنے اتباع سے بیزاری کا اعلان کریں گے اور عذاب الٰہی
کا آنکھوں سے مشاہدہ کرلیں گے اور سارے وسائل ختم ہو جائیں۔

عبادت میں شرک کرنے والوں کے شرک کی بنیاد گمان پر ہے اور طاعت میں شرک کرنے والوں کے شرک کی بنیاد بھی وہم و گمان اور تخمین و انداز پر ہے۔ دنیا میں وہ سب لوگ جو روحانی نظام اخلاقی نظام اور سیاسی نظام میں وحی الٰہی سے براہ راست تعلق نہیں رکھتے ہیں ان سب کا حال یہی ہے کہ جو کچھ کر رہے ہے اور جس چیز کی دعوت دے رہے ہیں وہ سب کا ان خیالوں وہموں اور خیالوں کے پلندوں سے دو دو پی پی کر پلتے ہیں۔ عبادت میں اصنام، اوثان کی پرستش کرتے ہیں اور طاعت میں وہ اپنے ہی جیسے انسانوں کی بندگی کرتے ہیں قانون الٰہی کی طاعت اور اللہ کی بندگی اور پرستش سے انہیں بیر ہے۔

قرآن ضبط و طاعت کی زندگی چاہتا ہے ایسا ضبط اور ایسی طاعت جو کسی انسان اور انسانوں کسی جماعت کے ارادوں اور خواہشات پر نہیں بلکہ قانون خداوندی اور رضائے الٰہی پر مبنی ہو۔ ایسے ہی ضبط اور آئین شناسی سے انسان اپنے ارادے پر قابو حاصل کرسکتا ہے اور نفس و خواہشات کی غلامی سے نجات پاسکتا ہے یہی تسخیر نفس ہے دوسری طرف وہ تسخیر فطرت کا بھی مطالبہ کرتا ہے اور اس غرض سے ہمیں وہ غیر اللہ کے سامنے جھکنے سے سر جھکانے سے یا انہیں اپنا حاجت روا تصور کرنے سے روکتا ہے خواہ وہ انسان ہو یا کائنات کی بے جان اشیاء اس طرح تسخیر نفس اور تسخیر کائنات سے قرآن مسلمان کی شخصیت کی تکمیل کرتا ہے لیکن یہ دونوں کام نہ تنہا کسی ایک انسان کا کام نہیں ہے ایک شخص خواہ کتنی ہی اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک ہو ان مشکلات پر قابو نہیں پاسکتا جو کائنات اور اس کی لاتعداد قوتوں کو رام کرنے میں پیش آتی ہیں اس مقصد کے لیے اجتماعی زندگی کا قیام اور انسانوں کا ایک مربوط جماعت کی شکل میں زندگی بسر کرنا ضروری ہے یہ تفصیل کا محل نہیں ہے۔ آیت قرآن میں شرک فی الطاعت اور شرک فی الطاع دونوں داخل ہیں۔ عبادت اور طاعت دونوں کے اجتماع سے انسان کی تکمیل ذات ہوتی ہے۔

تحقیق کا صحیح علمی طریقہ

۶۸ ہے اللہ ہی کی ذات گرامی نے تمہارے لیے رات بنائی ہے تاکہ تم آرام کرو اور دن بنایا ہے روشنی والا تاکہ تم کام کاج کر بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں جو کلام اللہ سنتے ہیں دن رات اور اندھیرے اجالے کا پیدا کرنے والا ایک ہی خدا ہے اسی سے خیر و شر اور تمام متقابل اشیاء کی پیدائش کو سمجھ لو اس میں مجوس کے شرک رد ہوگیا اور ادھر یہی لطیف ارشاد ہوگیا کہ جس طرح رات کی تاریکی کے بعد خدا روز روشن کر لاتا ہے اور دن کے اجالے میں وہ چیزیں نظر آتی ہیں۔ جو شب کی ظلمت میں دکھائی نہ دیتی تھیں ایسے ہی مشرکین کے اوہام ظنوں کی اندھیروں کا پردہ چاک کرنے کے لیے اس نے قرآن کریم کا آفتاب چمکایا ہے جو لوگوں کو وصول الی اللہ کا ٹھیک راستہ دکھانے والا ہے [1]

[1] افادات شیخ الاسلام

اس آیت میں قرآن نے وہم و گمان اور ظن و تخمین کی بنیاد پر روحانی و سیاسی نظام بنانے والوں کو تحقیق کا صحیح علمی طریقہ یہ بتایا ہے کہ پہلے قرآن اور نبوت کی بات کھلے کانوں سے سنو جس کا دعویٰ ہے کہ میں جو نظام لے کر آیا ہوں اس کی بنیاد قیاس و گمان اور وہم و خیال پر نہیں بلکہ علم و یقین اور اذعان و بصیرت پر ہے۔ کائنات فطرت تمہارے سامنے ہے اس پر غور کرو اس کی شہادتوں کو مرتب کرو اور پھر سوچو تمہیں اس ظاہر کے پیچھے حقیقت کی نشانیاں ملیں گی۔ اس سے تم پر نبوت کے بیان کی حقیقت اور حقانیت کھل جائے گی

اس آیت میں مثال کے طور پر صرف دو نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے یعنی رات اور دن۔ یہ انقلاب لیل و نہار دراصل سورج اور زمین کی نسبتوں میں انتہائی باضابطہ تغیر کی وجہ سے رونما ہوتا ہے۔ یہ ایک عالمگیر ناظم اور ساری کائنات پر غالب اقتدار رکھنے والے حاکم کے وجود کی صریح علامت ہے اس میں صریح حکمت اور مقصدیت بھی نظر آتی ہے کیونکہ تمام موجودات زمین کی بے شمار مصلحتیں اسی گردش لیل و نہار سے وابستہ ہیں۔ اس میں صریح ربوبیت اور رحمت اور پروردگاری کی علامتیں بھی پائی جاتی ہیں کیونکہ اس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ جس نے زمین پر یہ موجودات پیدا کی ہیں وہ خود ہی ان کے وجود کی ضروریات فراہم کرتا ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انصرام و انتظام ایک ذات میں مرکوز ہے اور یہ بھی کہ وہ ذات گرامی حکیم ہے اور بامقصد کام کرتا ہے اور یہ بھی کہ وہی محسن و مربی ہونے کی حیثیت سے انسانوں کی عبادتوں اور طاعتوں کا مستحق ہے اور یہاں جو کچھ ہے وہ اس کا مربوب ہے، مملوک ہے غلام ہے۔ بندہ ہونے کی حیثیت میں بندہ کا کام مالک کی پرستش اور بندگی ہے۔ آقائی صرف اللہ کی ذات گرامی کو سجتی ہے۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا سُبْحٰنَہٗ ؕ ھُوَ الْغَنِیُّ ؕ لَہٗ
مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَکُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ
بِھٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾ قُلْ اِنَّ الَّذِیْنَ
یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾ ؕ مَتَاعٌ فِی الدُّنْیَا
ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُھُمْ ثُمَّ نُذِیْقُھُمُ الْعَذَابَ الشَّدِیْدَ بِمَا کَانُوْا
یَکْفُرُوْنَ ﴿۷۰﴾ ع

کہتے ہیں کہ اللہ نے بیٹا بنالیا ہے۔ اللہ کی ذات پاک ہے وہ بے نیاز اور بے پرواہ ہے اسی کا تو ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے۔ تمہارے پاس اس دعویٰ کی کوئی سند نہیں ہے کیا اللہ کے بارے میں ایسی بے پرکی باتیں کہتے ہو جن کا تمہیں کچھ بھی پتہ نہیں ہے ؁۶۸ اے اللہ کے رسول ان سے کہہ دو کہ یقیناً وہ لوگ جو اللہ پر جھوٹ کا افترا کرتے ہیں فلاح نہیں پاتے ہیں۔ دنیا کی زندگی وقتی فائدہ ہے پھر ہمارے حضور میں ان کو پیش ہونا ہے۔ پھر ہم ان کو کافرانہ کرتوتوں کی پاداش میں سنگین عذاب

کا مزہ چکھائیں گے ؀۸۲

معانی مفردات

سبحانہ ، السیوطی نے الاتقان میں لکھا ہے۔ سبحان مصدر ہے یہ منصوب ہوتا ہے اور مضاف بھی۔ مضاف الیہ مفرد اسم ظاہر ہوتا ہے یا اسم ضمیر جیسے سبحان اللہ اور سبحانہ ، سبحانک اور یہ ان مصادر میں سے ہے جن کا فعل استعمال نہیں ہوتا ہے۔ علامہ کرمانی نے زمخشری کی اس بات کو کہ اس کا فعل سَبَح ہے۔ عجیب اور غریب ہے علامہ زمخشری نے استشہاد میں یہ شعر پیش کیا ہے۔

قبح الالہ وجوہ تغلب کلما
سبح الحجیج وکبروا اھلالا

اللہ سبحانہ قبیلہ تغلب کے چہروں کو برا کرے جب بھی حج کرنے والے بلند آواز سے دعا کریں اور حالت احرام میں تکبیریں کہیں۔

علامہ مجدالدین فیروز آبادی نے قاموس اور بصائر ذوی التمیز میں سبحان کو معرفہ لکھا ہے وہ اس کو تسبیح کا علم جنس قرار دیتے ہیں یہی جمہور کا مذہب ہے قاضی بیضاوی زمخشری دمامینی اور بہت سے علماء نے یہ بات کھول کر بتائی ہے علامہ زجاج نے بھی سبحان الذی اسری کی تفسیر میں اسے مصدر ہونے کی بنا پر منصوب بتایا ہے یعنی یہ فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے۔ شیخ محمد ناسی لکھتے ہیں کہ سبحان فعل کے قائمقام ہو کر تنزیہ بلیغ کے معنے میں استعمال ہوتا ہے مجدالدین بصائر ذوی التمیز میں سبحان کے معنی اللہ کی طرف لپکنے اور اس کی طاعت میں ہلکا پھلکا ہونے کے بتائے ہیں۔
بہرحال سبحان مصدر ہے اس کا فعل سبح ہے۔ جیسے شکران شکر کا اور رجحان رجح کا اور غفران غفر کا۔ علامہ مرتضیٰ زبیدی نے تاج العروس میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔

شرک کے مظاہر میں سے ایک اور

یہ تو سُن آئے ہو کہ شرک پرستش میں ہو یا بندگی اس کی اساس کوئی عقلی اور منطقی دلیل کی قوت نہیں بلکہ محض وہم گمان خیال اور قیاس پر ہے عرب مشرکین بھی ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں کہتے یہودی بھی ابنیت کے قائل تھے ان سب سے بڑھ کر عیسائی تھے جن کا عقیدہ صرف حضرت عیسیٰ کی ابنیت ہی کا نہیں بلکہ الوہیت کا بھی عقیدہ رکھتے تھے۔ اس عقیدے کے نتیجے میں ان کے سارے افکار اللہ سبحانہ کی تسبیح اور تحمید سے بیگانہ ہو گئے وہ کمزوریوں سے منزہ اور نہ خوبیوں اور کمالات کا مرکز رہا۔ شرک یہی نہیں کہ کسی کو اللہ کے برابر اللہ جانے بلکہ شرک کے معنے یہ ہیں کہ اللہ سبحانہ کی تنزیہ میں جن افکار و اعمال سے بگاڑ آتا ہو وہ کرے اور اللہ کے خاص کمالات میں جہاں شرکت کا شائبہ بھی ہو وہ بھی شرک ہے مثلاً ہر جگہ حاضر ناظر ہونا اور ہر چیز کی ہر وقت خبر رکھنا دور ہو یا نزدیک چھپی ہو یا کسی اندھیرے میں ہو یا اجالے میں آسمانوں میں ہو یا زمینوں میں پہاڑوں کی چوٹی پر، سمندر کی تہ میں یہ اللہ ہی کی شان اور اس کا کمال ہے اور کسی میں یہ کمال نہیں ہو سکتا۔ یہی اس کی محمودیت ہے اور الحمد للہ کا بھی تقاضا ہے اس میں کسی شریک کرے تو یہ شرک ہے اور اس کو شرک فی العلم کہتے ہیں۔

ایسے ہی عالم میں ارادہ سے تصرف کرنا اور اپنا حکم جاری کرنا اور مارنا جلانا روزی دینا اس میں فراخی کرنا اور تنگی کرنا، تندرست اور بیمار کرنا، فتح و شکست دینا اقبال و ادبار دینا مرادیں پوری کرنا بلائیں ٹالنا مشکلات میں دست گیری کرنا یہ ہی اللہ کی شان ہے اور اللہ کے سوا کسی کی یہ شان نہیں ہے نہ حضرت عیسیٰ میں نہ حضرت عزیز میں یہ بھی اللہ کی شان محمودیت کا تقاضا ہے اس میں کسی کو شریک کرنا شرک ہے اور اسے شرک فی التصرف کہتے ہیں۔ بہرحال شرک کے بہت سے مظاہر ہیں ایک مشرکانہ شاہکار کا یہاں ذکر ہو رہا ہے۔

لے کہتے ہیں کہ اللہ نے بیٹا بنا لیا ہے۔ اللہ کی ذات پاک ہے وہ بے نیاز اور بے پروا ہے اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔ تمہارے پاس اس دعوے کی کوئی سند نہیں ہے کیا اللہ کے بارے میں ایسی بے پرکی باتیں کہتے ہو جن کا تمہیں کچھ بھی پتہ نہیں ہے اس میں عیسائیوں کے شرک کا رد ہے جو حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا کہتے تھے۔

سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اگر واقعی طور پر مسیح کو معاذ اللہ خدا کا صلبی بیٹا سمجھتے ہیں تو اس سے بڑھ کر کیا گستاخی ہوگی۔ خداوند قدوس بالبداہتہ بیوی بچوں سے پاک ہے اور اگر بیٹے سے مراد متبنیٰ ہے تو خدا کو اس کی ضرورت کیا پیش آئی کہ ایک مخلوق کو متبنیٰ بنائے کیا معاذ اللہ اسے اولاد کی حسرت اور بیٹا نہ ہونے کا غم تھا یا یہ فکر تھی کہ اس کے بعد مال و دولت کا وارث اور اس کا نام روشن کرنے والا کون ہوگا یا یہ کہ بڑھاپے اور ہرج مرج میں کس سے سہارا ملے گا العیاذ باللہ وہ تو سب سے بے نیاز ہے اور سب ہر وقت اس کے محتاج ہیں اسے بیٹے پوتے یا متبنیٰ وغیرہ کی احتیاج کہاں ہوسکتی ہے سب چیزیں اس کی مملوک و مخلوق ہیں پھر مالک و مملوک اور خالق و مخلوق کے درمیان ان نسبی رشتوں کی کہاں گنجائش ہے۔ یہ بڑی سخت بات ہے کہ خدا کی نسبت محض جہالت سے ایسی جھوٹی اور بے سند باتیں کہی جائیں [۱]

اس جگہ سب سے اہم بات قالوا اتخذ اللہ ولداً سے متعلق بتائی ہے۔ عام شارحین قرآن کا میلان یہ ہے کہ اس میں عیسائیوں کا رد ہے حالانکہ انداز بیان اس کی اجازت نہیں دیتا قالوا کی ضمیر کا مرجع الذین یدعون من دون اللہ ہے ولد سے واحد اور جمع دونوں مراد ہوتے ہیں اور ایسے ہی بیٹے اور بیٹی دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے علامہ مجد الدین نے بصائر ذوی التمیز میں تصریح کی ہے الولد یکون جمعاً و واحداً۔ ویطلق الولد علی الابن والابنۃ یعنی لفظ واحد جمع بیٹا اور بیٹی کے لیے عربی زبان میں استعمال ہوتا ہے۔ اور پھر سورت مکی ہے اور مکی سورتوں میں روئے سخن مشرکین کی طرف ہے۔ وہ فرشتوں کو اللہ سبحانہ کی اولاد سمجھ کر ان کی الوہیت کے قائل تھے یعنی مشرکین بھی عیسائیوں کی طرح عقیدہ تولید کے قائل تھے۔ لفظ ولداً لاکر ان کے عقیدہ تولید ہی پر ضرب لگانی مقصود ہے۔ مشرکین ہوں یا عیسائی وہ عقیدہ تولید رکھتے ہیں اسی کو بتانے کے لیے اتخذ اللہ ولداً کی تعبیر اختیار کی ہے۔

عقیدۂ توحید کی تعبیر

اتخذ اللہ ولدا میں زیادہ قابل توجہ لفظ ولد ہے۔ اردو میں عموماً لڑکا، بیٹا

[۱] افادات شیخ الاسلام

اور بچہ سے اس لفظ کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ غالباً یہ خیال ہے کہ عربی میں ابن کے لفظ اور ولد میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہے۔ یعنی دونوں ہم معنے اور مرادف ہیں۔ لیکن ذرا سے غور سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ولد ولادت سے بنا ہے ولادت کے معنے جننے کے ہیں گویا جب ہم کسی کو کسی کا ولد بتاتے ہیں تو ہمارا یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ ولد اس شخص سے جس کا وہ ولد ہے ولادت کا تعلق رکھتا ہے۔

اب سوچئے کہ ولادت کے اس لفظ کا اطلاق اللہ سبحانہ کی نسبت سے کیا جائے گا تو اس کا مطلب کیا ہوگا۔ یہی نا کہ جب ہم کہیں گے کہ رشید ولد ہے اور حمید رشید کا والد ہے۔ رشید بیٹے اور حمید والد کے باہمی تعلقات کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ کیا حمید والد اپنے بیٹے رشید کا خالق ہوتا ہے۔ بلاشبہ واقعہ کی یہ غلط تعبیر ہے۔ رشید نطفہ کی صورت میں والد کے اندر نمودار ہوتا ہے اور حمید والد اسی نطفہ کو رشید کی ماں کے رحم میں گراتا ہے۔ ولد یعنی رشید کی ذات اس کا وجود، وجود کے سارے لوازم وصفات صفات کے ثمرات ونتائج میں سے کسی چیز کو رشید اپنے والد حمید سے نہیں لیتا خلق کے معنے اگر نیست کو ہست کرنا ہیں تو اس معنی کے اعتبار سے قطعاً کوئی والد اپنے ولد کا خالق نہیں ہوتا اور اگر خلق کے معنے گھڑنا کیے جائیں جیسے سونا چاندی سے زیور گھڑتا اور بناتا ہے یا بت تراش پتھر کو تراش کر بت بناتا ہے تو اس معنے کے اعتبار سے بھی بیٹا اپنے باپ کی مخلوق نہیں ہوتا۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ اتخذ اللہ ولدا کا مطلب یہ ہے کہ جیسے اللہ نے ولد ٹھہرا لیا ہے وہ عقیدہ تولید کی رو سے اللہ سبحانہ کی مخلوق نہیں ہے کسی معنی اور کسی حیثیت سے بھی مخلوق نہیں ہے۔

آیئے اسی لفظ ولد سے جو دوسری بات سمجھ میں آرہی ہے وہ گوش گذار فرمالیجئے سب جانتے اور مانتے ہیں کہ قانون ولادت کے تحت آدمی سے جو چیز پیدا ہوگی وہ آدمی ہوگی اور جیسے آدمی سے گھوڑا نہیں آدمی ہی پیدا ہوتا ہے۔ یہ ایک عام قانون ہر اس چیز میں جس میں والد اور ولد ہونے کا تعلق ہو۔ جب یہ قانون عام ہے کہ لومڑی سے چوہا اور چوہے سے شیر نہیں پیدا ہوتا بلکہ لومڑی سے لومڑی اور چوہے سے چوہا ہی پیدا ہوتا ہے تو آپ ذرا ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سوچئے جنہوں نے اتخذ اللہ ولدا کو اپنا عقیدہ

بنا یا ہے انہوں نے فی الواقع کیا دعویٰ کیا ہے اور اپنے ایمان کی بنیاد کس چیز پر رکھی ہے یہی تا کہ اللہ سبحانہ کے سوا کوئی دوسری ہستی بھی ایسی ہے جو اللہ سبحانہ کی مخلوق نہیں یعنی ولد ولد کی ذات اس کے صفات و کمالات اللہ سبحانہ کے عمل تخلیق کے رہین منت نہیں ہیں اور قانون ولادت کی رُو سے ولادت کا تعلق رکھنے والا معاذ اللہ، بجز اللہ ہونے کے اور کیا ہو گا اللہ سے پیدا ہونے والا اللہ کے سوا اور کیا ہو گا۔ گھوڑے سے گھوڑا پیدا ہوتا ہے اس عقیدہ تولید کا یہی مطلب ہے کہ خدائی کے سارے کمالات کے بارے میں آپ جانتے ہیں کہ اللہ کے اس ولد میں بھی پائے جاتے ہیں۔

یہ ہے ان کے دعویٰ اتخذ اللہ ولدا کی وہ ہیبت اور خوفناک شکل جس پر مشرکین اور عیسائیوں کے مذہب کی بنیاد قائم ہے۔

کچھ بھی ہو آیت میں ولد کا لفظ بتا رہا ہے کہ درحقیقت عقیدہ تولید رکھنے والوں کا موقف یہ ہے کہ خالق عالم کے سوا ایک اور ہستی بھی ہے جو اللہ سبحانہ کی مخلوق بھی نہیں ہے اور سارے خدائی کمالات و صفات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ اگرچہ کہنے والے اس کو اللہ نہیں کہتے بلکہ ولد اللہ کہتے ہیں مگر ولد اللہ ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ بھی اللہ ہے لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

نظریہ ولدیت کی توضیح

شرک کے وہ سارے مظاہر جن میں خالق کے سوا ہر معبود کو مخلوق مان کر عبادت کی جاتی ہے۔ ان کا مسئلہ کچھ پیچیدہ نہیں ہے۔ اصل پیچیدگی تو اس عجیب و غریب شرک میں ہے جس کی بنیاد ولدیت کے عقیدے پر استوار کی گئی ہے کہ اس میں خالق کے سوا ایک ایسی ہستی کو معبود بنا لینے کی کوشش کی گئی ہے جو مخلوق نہیں بلکہ العیاذ باللہ اللہ کا مولود ہے اور ولدیت کا لازمی تقاضا یہی ہے کہ اللہ کا ولد بھی اللہ ہو بلکہ اس نظریہ ولدیت کو مان کر خود والد کی طرف بھی ناگفتہ امور کو منسوب کرنے پر اس نظریہ کا معتقد بے بس اور مجبور ہے۔

کھلی بات ہے ولد کا لفظ والد کے سامنے قدرتاً والدہ کا تصور سامنے لاتا ہے جس کے بعد اطوار کے ذکر سے زبان تو کیا خیال بھی کانپ اٹھتا ہے۔

یہاں تک تو قرآنی آیت قالوا اتخذ اللہ ولداً کا مطلب ہوا اب آگے چلیے ارشاد ہوتا ہے سبحانہ ھو الغنی الصمد کی ذات پاک ہے یعنی اللہ سبحانہ کی ذات گرامی ولدیت سے پاک ہے اس کی جناب میں یہ بات محال ناممکن اور ناقابل تصور ہے امر مستحیل لا یمکن ولا یتصور یہاں تو صرف اتنی بات فرمائی ہے دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے مالھم بہ من علم ولا لآباھم ان کو اس بارے میں کچھ بھی پتہ نہیں اور نہ ان کے باپ دادوں کو کسی چیز کے علم کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں خود بخود ہو یا کسی ذریعے سے ہو۔ نظریہ ولدیت کی حد تک دونوں منتفی ہیں اسی لیے یہاں فرمایا ہے ان عندکم من سلطان بھذا تمہارے پاس اپنے موقف کے لیے کوئی سند نہیں ہے۔ اب اس کے سوا اور کیا ہے کہ ان ہی سے جو نظریہ ولدیت کے تحت بجائے قرار دینے کے کسی شخص کو خالق عالم جل مجدہ کا مولود بنا رہے ہیں دریافت کیا جائے اتقولون علی اللہ مالا تعلمون کیا تم اللہ پر ایسی بے پر کی باتیں اڑا رہے ہو جن کا تمہیں کوئی پتہ نہیں ہے۔

ولدیت کا عقیدہ انسانیت کے اس متفقہ فیصلہ کے خلاف بغاوت ہے کہ اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے سب مخلوق ہے، اس کی جگہ یہ دعویٰ کہ ایک خاص ذات اللہ سبحانہ کی مخلوقیت سے خارج ہے وہ مخلوق نہیں مولود ہے یہ درحقیقت اللہ کے ساتھ ایک اور اللہ کو ماننا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ اللہ کو والد بنانے کے ساتھ والدہ بنانے کے لیے انسانی گھرانے کی ایک عورت کے متعلق یہ تسلیم کر لینا پڑتا ہے کہ والدہ ہونے کے فرائض اسی نے انجام دیئے اور اس راہ میں جن ناقابل بیان تصورات سے دل و دماغ کو گذرنا پڑتا ہے۔ خدا کی پناہ۔

قرآن کا سوال یہی ہے کہ ان سارے اعتقادی طوفانوں کے نیچے کسی حیثیت سے کسی جگہ کسی منزل میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ براہ راست اس کا علم اسے حاصل ہوا ان عندکم من سلطان بھذا کتنے گمنادنے کتنے دہشت ناک کتنے خوفناک نتائج پر یہ عقیدہ مشتمل ہے خدا کی مخلوقیت سے ایک شخص کو نکالنے کا دعویٰ اور اللہ کے ساتھ ایک اور اللہ کا دعویٰ کس قدر بے باکی ہے اتقولون علی اللہ مالا تعلمون کیا تم اس قدر بے باک ہو گئے کہ اللہ کے نام ایسا جھوٹ کا طوفان اٹھاتے ہو تم یہ بات کہنے کی جرأت کیسے کرتے ہو جس کا تمہیں خود پتہ نہیں ہے۔ قرآن نے ان لفظوں میں جو اس عقیدے پر تنقید کی ہے

کیا واقعہ کی صحیح تعبیر نہیں ہے اس سے بڑا دعویٰ اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک ایسی پاور ہوا بات جس کی قطعاً کسی قسم کی کوئی علمی بنیاد نہیں اور انسانیت کی تاریخ میں جو کبھی سوچی بھی نہیں گئی اسی کو پیش کر کے الٰہیات کے سارے نظام ہی کو درہم برہم کر دیا۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ سورہ مریم میں آرہی ہے۔

قرآن کی افترا کرنے والوں کو دھمکی

۴۲ اے اللہ کے رسول ان سے کہدو کہ یقیناً وہ لوگ جو اللہ پر جھوٹ کا افترا کرتے ہیں فلاح نہیں پاتے ہیں۔ دنیا کی زندگی وقتی فائدہ ہے پھر ہمارے ہی حضور میں پیش ہوتا ہے پھر ہم ان کو ان کے کافرانہ کرتوتوں کی وجہ سے سنگین عذاب کا مزہ چکھائیں گے یعنی اللہ پر جھوٹ باندھنے والے خواہ دنیا میں کیسی طاقت رکھتے ہوں اور اپنے سازوسامان پر مغرور ہوں لیکن انہیں حقیقی بھلائی اور کامیابی ہرگز نصیب نہ ہوگی۔ تھوڑے دن دنیا کی زندگی میں مزے اڑالیں انجام کار ان کا معاملہ اللہ کے حضور پیش ہوگا۔ جہاں سے اپنے جرائم کی پاداش میں نہایت سخت عذاب کا مزہ چکھیں گے [۱]

پہلے بتایا تھا کہ ان نظریہ ولدیت رکھنے والوں کے پاس دلیل کی کوئی قوت نہیں ہے ان عندکم من سلطان بھذا لفظ سلطان آیا ہے۔ اس دنیا کے کچھ قوانین تو ایسے ہیں جن میں اللہ سبحانہ نے سلطانیت کی صفت پیدا کی ہے یعنی اپنے آثار ونتائج کے اعتبار سے انسانی فطرت پر ان کا تسلط اور ان کی گرفت اتنی سخت اور مضبوط ہے کہ انکی واقفیت کا انکار انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ جیسے آگ جلاتی ہے آفتاب روشن ہے دو دونی چار ہوتے ہیں اللہ سبحانہ کے ان ہی قوانین کو سلطانی قوانین کہا جاتا ہے اور ان کے بالمقابل ایسی چیزیں جن کے ساتھ انسان کی فطرت کا یہ تعلق نہیں ہے وہ غیر سلطانی باتیں ہیں اب آپ باسانی سمجھ سکتے ہیں کہ پیدائش وتخلیق کی وہ واضح اور کھلی ہوئی راہیں جن کے آثار ونتائج کا کسی حال میں انکار ممکن نہیں سلطانی قوانین کہلائیں گے۔ قرآن میں شرک کے موضوع پر اس قسم کی آیتوں کا تکرار

---

[۱] املائے شیخ الاسلام

ان ھی الا اسماء سمیتموھا انتم وآباؤکم ما انزل اللہ بھا من سلطان۔ ان یتبعون الا الظن وما تھوی الانفس۔

نہیں ہے یعنی جن چیزوں کو لوگ پیدائش کا ذریعہ سمجھتے تھے لیکن صرف نام ہی نام الفاظ جن کو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے خود ہی رکھ لیا ہے اللہ نے ان کے لیے کوئی سلطان نہیں اتارا وہ صرف اٹکل کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور ان باتوں کے جن سے ان کا جی چاہتا ہے۔

یا اسی موضوع کی وہ آیت جو ابھی گذری ہے ان یتبعون الا الظن بھی بتا رہا ہے کہ سلطانیت کے قدرتی معیار سے ہٹ کر تحقیق و تلاش کے باب میں جہاں بھی یہ غیر منطقی راہ اپنائی گئی ہے لوگوں میں گمراہی کے سوا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ انہی غیر سلطانی دلائل کے دباؤ نے انسانوں کو افترائی قوانین پر مجبور کر دیا ہے۔ یہاں قرآن یہی بتا رہا ہے کہ جو لوگ غیر سلطانی دلائل سے ہٹ کر افترائی قوانین اپنا لیتے ہیں وہ کبھی فلاح و کامیابی سے ہمدوش نہیں ہوتے ہیں۔ افسوس کتنے ہیں جو ان ہی افترائی قوانین کی جکڑ بندیوں میں جکڑے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ حضرت مسیح ولد اللہ ہیں۔ دانائے غیب ہیں۔ مختار کل حاضر ناظر ہیں۔ آخر ان ہی انسانوں میں کتنے ہیں جنہیں کئی خانقاہوں میں مصائب کا طوفان نظر آیا بلکہ بعض بزرگوں کے مزاروں میں اتنی قوت لوگوں کو محسوس ہوئی کہ کسی سخت سے سخت حادثہ کو رفع کر دینے کے لیے وہ کافی ہے۔

یہ آیت اوپر کے مضامین کا خلاصہ ہے کہ افترائی قوانین والے کبھی کامیاب نہیں اور زندگی کے کسی شعبے میں کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

قرآن کے اس اعلان کو سن کر انسانی ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ ہمارا مشاہدہ تو یہ ہے کہ یہ افترا کرنے والے کامیاب ہیں۔ اسی کے جواب میں ارشاد ہوا ہے متاع فی الدنیا۔ قاضی بیضاوی لکھتے ہیں کہ یہ بتدا محذوف کی خبر ہے یا مبتدا ہے اور خبر محذوف ہے پہلی صورت میں مطلب یہ ہے کہ ان کے یہ افترائی قوانین جن کے بل بوتے پر کافرانہ نظام حکومت قائم کر رہے ہیں وقتی سامان ہے جیسے قرآن ہی میں ہے کلوا وتمتعوا

قلیلاً انکم مجرمون کھالو مزے اڑالو تھوڑے دن تم لوگ مجرم ہو یا جیسے قرآن ہی میں خبر دی گئی ہے۔

الذین کفروا یتمتعون یا کلون کما تا کل الانعام و النار مثوی لھم۔

جنہوں نے راہ کفر اختیار کی اور مزے اڑا رہے اور کھا رہے ہیں جیسے چوپائے کھاتے ہیں۔ اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

اور دوسری صورت میں مطلب یہ ہے کہ ان کے لیے دنیا کی زندگی میں وقتی سامان ہے۔ متاع میں تنکیر قلت کے لیے ہے۔ قلت آخرت کے مقابلے میں ہے۔ یہ فقرہ یہاں بطور استیناف بیانی مقام دلیل میں ہے کہ اس سے مراد اس وقت اہل کفر کا ملک کے حالات ومعاملات میں وہ آزادانہ وخود مختارانہ تصرف ہے جو مسلمانوں کے مقابلے میں ان کو حاصل تھا۔ اس وقت تک مسلمان کمزور تھے اور کفار اپنی سطوت کے گھمنڈ میں ہر جگہ دندناتے پھر رہے تھے اور کمزور مسلمانوں پر ظلم ڈھا رہے تھے ان ہی کمزور مسلمانوں کی تنگی زندگی میں اس آیت میں حوصلہ افزائی کی گئی ہے اور اطمینان دلایا ہے کہ اس وقت کفار کو جو ملک میں غلبہ اور زور حاصل ہے اس سے کوئی غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے یہ چمک دمک محض چند روزہ ہے اس کے بعد ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

آیت میں کفار کی دنیوی ترقیوں کو متاع قلیل کہا ہے۔ یہ بات اسی وقت کے کافروں کے لیے نہیں بلکہ ہر دور اور ہر عہد کے اور ہر زمانہ کے کافروں کے لیے ہے۔ کفر نام ہے پیروی نفس، انسان کی بے راہ روی فکری آوارگی اور غیر ذمہ داری کی دعوت کا اس دعوت کی قیادت دنیا کی مختلف قومیں کرتی رہی ہیں۔ اور اب تقریباً دو صدیوں سے تقدیر الٰہی نے اس کی اس دعوت کی قیادت اور امامت کا فیصلہ یورپ کی قوموں کی حق میں کیا ہے اس وقت یورپ کفر کی عالمگیر نمائندگی کر رہا ہے۔ آج بھی قرآن کی یہی پکار ہے کہ اہل ایمان اس طاقت کو اسی نظر سے دیکھیں کہ یہ متاع قلیل ہے اور آخرت کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

یہاں متاع دنیا کی قلت آخرت کے مقابلے میں ہے قرآن کی دوسری آیات سے اس کی تائید ہوتی ہے یہاں بھی ثم الینا مرجعھم قرینہ ہے۔

آخرت کے مقابلے میں دنیا کے قلیل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انسان ماں کے پیٹ سے لامحدود خواہشیں لے کر آیا ہے۔ اتنی لامحدود خواہشیں ہیں کہ ان کی پابجائی دنیا کا موجودہ سرمایہ نعمت ہائے گوناں گوں کر ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ گوناں گوں ہونے کے باوجود محدود ہے انسانی فطرت کے لامحدود تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے لامحدود سامانوں کی ضرورت ہے۔ آخرت میں نعمتیں انسان کے لامحدود تقاضوں کے مطابق لامحدود ہوں گی قرآن میں ہے ولکم فیھا ماتشتھیہ الانفس و تلذ الاعین۔ موجودہ زندگی میں انسان میں لامحدود تمنائیں رکھی گئی ہیں۔ اور محدود شکل میں یہاں انسان کی کچھ آرزوئیں پوری کر دی گئی ہیں یہی متاع الدنیا قلیل ہے۔ اور ساتھ ہی بتا دیا کہ آدمی کو لامحدود پورا کرنے کے لیے اس قوت وقدرت کے لازوال چشمہ کی تلاش میں نکلنا چاہیے جس کی لامحدودیت کی شہادت کائنات کا ذرہ ذرہ دے رہا ہے۔ جہاں لامحدود کمالات رکھنے والی ذات اپنے لامحدود کمالات کا مظاہرہ کرے گی اس طرح لامحدود مطالبات والی فطرت کو لامحدود مطلوبات سے متمتع ہونے اور لذت یاب ہونے کا موقعہ ہمیشہ ہمیشہ ملتا رہے گا۔ بہرحال متاع قلیل کہہ کر قرآن نے منکر ذ تکذب قوموں کی بالکل صحیح نقشہ کشی کردی ہے۔ اس کی تفصیل دیکھنا چاہتے ہو تو روس امریکہ اور برطانیہ بڑی بڑی ترقی یافتہ قوموں کا حال دیکھئے ان کے باہم رشک وحسد ان کی حرامکاریوں ان کی شراب نوشیوں ان کی سود خواریوں، ان کے جرائم۔ ان کے یہاں کے امراض خبیثہ۔ ان کے ہاں اسٹرائیکوں ہڑتالوں کثرت طلاق، کثرت فواحش معاشی ابتری کا حال دیکھئے اور پھر فیصلہ فرمایئے کہ متاع دنیا کا زیادہ سے زیادہ ذخیرہ رکھنے کے بعد بھی ان منکرین حق کو باوجود اپنی انتہائی ترقیوں کے فلاح کسی معنی میں بھی حاصل نہیں ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہے ثم الینا مرجعھم کہیں ضمیر غائب اور کہیں ضمیر خطاب کے ذریعے یہ انداز بیان آیا ہے۔ موت کے لیے قرآن میں اکثر خدا کی طرف لوٹ جانے کی اصطلاح اختیار کی گئی ہے یہ طرز ادا بیسیوں جگہ آیا ہے یہ بالکل بدیہی ہے کہ ہر رجوع کے مفہوم میں درود درآمد داخل ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام ارواح انسانی اللہ سبحانہ کے یہاں سے اس جسم وقالب میں آتی ہیں۔ اور موت کے وقت اس عناصر کی چہار دیواری سے نکل کر پھر ان کو وہیں واپس جانا ہے جہاں سے آئی تھیں۔ اس واپسی کے سفر میں ان

کا زادِ راہ صرف وہی ہوگا جو اس دنیا میں انہوں نے کمایا ہے یعنی ان کے اندرونی وبیرونی افکار اعمال اخلاق اور احوال اور اس کے بعد ان کی جو زندگی ہوگی وہ عناصر کی ترکیب سے نہیں بلکہ افکار و اعمال اخلاق و احوال کی ترکیب سے ہوگی۔ اسی لیے فرمایا ہے ثم نذیقہم العذاب الشدید بما یکفرون یہاں باء سببیہ لاکر بتا دیا کہ عذاب شدید کا سبب ان کی کافرانہ زندگی ہے یعنی دوزخ کا عذاب جو کچھ ہے وہ انسان کے اپنے ہی اعمال کا لازمی نتیجہ ہے۔ جس طرح دنیا کے ہر عمل کا کوئی نہ کوئی لازمی نتیجہ ہوتا ہے مثلاً کھانے کا نتیجہ شکم سیری پینے کا سیرابی بیماری کا بے آرامی گرنے کا چوٹ زہر کا موت غرض ہر کام کا ایک لازمی نتیجہ ہوتا ہے اسی طرح کافرانہ زندگی کا بھی ایک لازمی نتیجہ کافروں کو ملنے والا ہے جو آخرت کی زندگی میں ملنے والا ہے۔ جس طرح زہر کھا کر مرنے کی ذمہ داری خود ہم پر عائد ہوتی ہے اور ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم زہر کھا کر کیوں مر گئے اسی طرح ہم یہ سوال بھی نہیں کر سکتے کہ ہم کو اعمال کے بعد دوزخ کی سزا کیوں ملی کہ دونوں ہمارے اعمال کے لازمی نتائج ہیں۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ ۘ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ يٰقَوْمِ
إِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِي وَتَذْكِيرِي بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى
اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ
اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۷۱﴾
فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا
عَلَى اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۷۲﴾ فَكَذَّبُوْهُ
فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ وَاَغْرَقْنَا
الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۷۳﴾

اور پیش کرو ان کے سامنے حضرت نوح کا وہ واقعہ کہ جب
انہوں نے اپنی قوم سے یہ خطاب کیا[۸۳] لوگو! اگر تم کو میرا
دعوت پیش کرنا اور آیات الٰہی کے ذریعے نصیحت کرنا
گراں محسوس ہو رہا ہے تو میں نے سب سے ہٹ کر بس
اللہ پر بھروسہ کرلیا ہے۔ تم سب اپنے شرکا ساتھ لے
کر اپنا کام مل جل کر کر ڈالو ایسا کہ پھر تمہارے لیے گنجلک نہ باقی رہے

پھر جو کچھ کرنا ہے میرے ساتھ کر لو اور مجھے کوئی مہلت نہ دو [۸۴] اگر تم نے میری دعوت سے منہ پھیر لیا ہے تو مجھے کوئی نقصان نہیں کیونکہ میں نے اس پر کوئی مزدوری تم سے نہیں مانگی ہے۔ مجھے تو اس کام کا صرف اللہ سے اجر لینا ہے اور مجھے تو صرف یہی حکم ہے کہ اس کا فرمانبردار رہوں [۸۵] حضرت نوح کے مخاطبوں نے حضرت نوح کی تکذیب کی اس کے نتیجہ میں جب طوفان کی صورت میں اللہ کا عذاب آیا تو ہم نے حضرت نوح اور ان کے ساتھیوں کو بچا لیا اور ان کو جانشین بنا کر طوفان کی نذر کر دیا جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی تھی دیکھو ان لوگوں کا انجام کیسا رہا جن کو اللہ کے پیغمبر نے ڈرایا تھا [۸۶]

معانی مفردات

اجمعوا امرکم اجماع سے امر ہے اس کے معنے ہیں ایک رائے ہونے کے لوگوں کو اکٹھا کرنا یا اکٹھا ہونا۔ امر سے مراد فیصلہ ہے۔ ابو البقاء کہتے ہیں کہ اجمعت علی الامر سے محاورہ ہے علی محذوف ہے معنی ہیں کام کا پختہ فیصلہ کرنا۔ پھر کی رائے میں

اجماع بغیر حرف جر کے متعدی بنفسہ ہوتا ہے السدوسی کی رائے میں متعدی بنفسہ زیادہ فصیح ہے یعنی اجمعت الامر زیادہ فصیح ہے اجمعت علی الامر سے۔ اصلی معنے تو بکھرے ہوئے کو یک جا کرنے کے ہیں اور اجماع و جمع دونوں برابر ہیں کچھ کے خیال میں دونوں میں فرق ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جو مکر و کید میرے خلاف کرنا چاہتے ہو کر لو۔

غمۃ غم یغم سے ہے اس کے معنے چھپا دینے کے ہیں۔ حدیث میں ہے لا غمۃ فی فرائض اللہ اللہ کے فرائض میں چھپانا نہیں ہے ان کو تو علانیہ ہونا چاہیئے رنج و حزن کو غم اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ شادمانی اور خوشی کو چھپا دیتا ہے مطلب یہ ہے کہ اپنے معاملہ میں رنج و غم کو ہٹا کر خوب دل خوش کر لو۔ حدیث میں دعا ہے یا فارج الھم و یا کاشف الغمۃ

تاریخی واقعات سے استشہاد

تاریخی دلائل و شواہد ہے واضح کیا گیا ہے کہ کس طرح اللہ سبحانہ نے ان کو اس سرزمین میں اقتدار بخشا لیکن انہوں نے اقتدار پا کر ناشکری کی راہ اختیار کی۔ زمین میں اصلاح کی جگہ فساد برپا کیا، عدل و انصاف کو درہم برہم کیا بالآخر اللہ سبحانہ نے اصلاح حال کے لیے رسول روانہ کیا جس نے ان کو پرستش اور بندگی میں توحید کی دعوت دی۔ اللہ سبحانہ نے ان کو ایک خاص مدت تک مہلت دینے کے بعد اس قوم کو تباہ کر دیا لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ سارا قصہ ایک دو صحبتوں میں ختم ہو گیا تھا بلکہ جن تاریخی حقائق کا یہاں مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے وہ ایک نہایت طویل مدت میں پیش آئے تھے قرآن کا یہ خاص انداز ہے کہ وہ واقعات کو محض تاریخی داستان بنا کر پیش نہیں کرتا بلکہ واقعات کے ان اجزا کو پیش کرتا ہے جن کا مقام عبرت سے گہرا لگاؤ ہوتا ہے۔ ان واقعات سے ایک طرف قریش کو یہ بتانا ہے کہ اب تمہارا معاملہ بھی اسی کی عدالت میں ہے جس میں ان تمام قوموں کے مقدمات پیش ہو کر فیصلہ ہوئے کوئی وجہ نہیں کہ اگر تم نے بھی وہی روش اختیار کی جو ان قوموں نے اختیار کی تھی تو اس بے لاگ عدالت کا فیصلہ تمہارے لیے کچھ مختلف ہو اللہ سبحانہ کا قانون سب کے لیے یکساں ہے فرمایا کہ آپ انکو حضرت نوح کی سرگذشت سنائیے یعنی حضرت نوح اور ان کی قوم کا معاملہ اس حقیقت کے لیے ایک شاہد و حجت ہے ان کا اعلان بھی تھا کہ تم میری مخالفت

ہیں جو کچھ بھی کر سکتے ہو کر گذرو اگر میں صادق ہوں تو تمہاری کوئی کوشش میرے خلاف کامیاب نہ ہو گی نتیجہ نے فیصلہ کر دیا کہ کون سچا تھا اور کون اللہ کی سچائی کو جھٹلانے والا ہے۔

۸۳؎ اور پیش کرو ان کے سامنے حضرت نوح علیہ السلام کا وہ واقعہ جب انہوں نے اپنی قوم سے یہ خطاب کیا۔ یعنی اہل مکہ کو حضرت نوح اور ان کی قوم کا حال سنا تاکہ معلوم ہو کہ مکذبین و مفترین کو حقیقی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ ان کی اچھل کود چمک دمک محض چند روزہ ہے جو انجام کار ہلاکت ابدی پر منتہی ہوتی ہے۔ اہل مکہ کو قوم نوح کا قصہ سن کر عبرت حاصل کرنا چاہیے کہ اگر وہ خاتم الانبیاء کی تکذیب و عداوت اور اپنے مشرکانہ اعمال سے باز نہ آئے تو ان کا انجام بھی ویسا ہی ہو سکتا ہے جو حضرت نوح کی تکذیب کرنے والوں کا ہوا۔ نیز اس واقعہ کے بیان کرنے میں حضور اقدس کو تسلی دینا ہے کہ آپ ان لوگوں کی دشمنی اور شرارت سے دلگیر نہ ہوں ہر نبی کو اس قسم کے حالات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ پھر آخر میں حق ہی غالب ہو کر رہا اور حق و صداقت کے دشمن تباہ و برباد کر دیئے گئے۔ عام سامعین کو ان واقعات کے ایسے مفصل بیان سے یہ سبق ملتا ہے کہ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم باوجود امی ہونے اور کسی مخلوق کے سامنے ایک منٹ کے لیے بھی زانوئے تلمذ تہ نہ کرنے کے پچھلی قوموں کے اس قدر صحیح اور پختہ احوال بیان فرماتے ہیں جو بظاہر بدون تعلیم اور طویل استفادہ کے ممکن نہیں ناچار ماننا پڑے گا کہ آپ کا معلم کوئی انسان نہیں بلکہ سب انسانوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ یہ تو آپ کی سچائی کی ایک دلیل ہو گی [1]

قرآن کا عام انداز بیان یہ ہے کہ پہلے وجدانی دلائل بیان کرتا ہے پھر واقعات کے شواہد سے استدلال کرتا ہے۔ یہاں سے ان ہی تاریخی واقعات کو پیش کر کے مخاطبوں کے دل و دماغ میں بات اتاری ہے اور بتایا ہے کہ مفتری علی اللہ کبھی فلاح نہیں پا سکتا۔ اس کے لیے حضرت نوح اور ان کی قوم کا معاملہ ایک شاہد و حجت ہے۔ یہ تاریخی شہادت اس وقت پیش کی گئی ہے جب ان لوگوں کو معقول دلائل کے ساتھ پہلے سمجھایا جا چکا کہ ان کے انکار اور اعمال میں کیا غلطی ہے اور کیوں صحیح نہیں ہے اور اس کے مقابلہ میں حقیقی اور صحیح راہ کیا ہے اور کیوں صحیح ہے۔ اب ان کے اس طرز عمل کی طرف توجہ منعطف ہوتی ہے جو وہ اس

[1] افادات شیخ الاسلام

سیدھی اور صاف دعوت کے جواب میں اختیار کر رہے ہیں، دس گیارہ سال سے ان کی روش یہ تھی کہ وہ بجائے اس کے کہ اس معقول تنقید اور صحیح رہنمائی پر غور کر کے اپنی ناہمواریوں پر سوچتے اُلٹے صاحب دعوت کے دشمن ہو گئے اور دلائل کا جواب تھپڑوں سے اور نصائح کا جواب گالیوں سے دیتے۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ ہم اندھوں کے درمیان جو بینا موجود ہے وہ ہماری بینائی کا انتظام کرنے کے بجائے خود بھی نابینا ہو جائے ورنہ ہم زبردستی اس کی بینائی ختم کر دیں گے۔ یہ طرز عمل جو انہوں نے اختیار کر رکھا تھا یہ معاملہ کی انتہا ہو چکی تھی اس لیے آپ ان کو اللہ کے رسولوں اور ان کی قوموں کے درمیان ایسے حالات میں جو سنت الٰہی ہے اسی کو ان کو بتانے کا حکم ہو رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ اب تک تمہیں نبوت آیات ہدایت سنا رہی تھی اور حق کی طرف دعوت دی جا رہی تھی۔ مخالفین میں جس قدر صالح اجزا موجود تھے انہوں نے اس دعوت کو قبول کر لیا اب دعوت اس مرحلہ میں آ چکی تھی جب نبوت کے مخاطبوں میں مادہ فاسدہ کے سوا کوئی صلاحیت پذیر عنصر باقی نہیں رہا اس وقت ہلاکت آسمان کی بجلی فضا کی آندھی زمین کا سیلاب لوہے کی تلوار بن کر رونما ہوتی ہے۔ سورہ یونس زمانہ قیام مکہ کے آخری دور میں نازل ہوئی ہے اب ہدایت کی دعوت اپنے آخری انجام کو پہنچ گئی ہے اسی سلسلے میں پہلے حضرت نوح کا واقعہ سنانے کا حکم ہوا کہ ان کی ہلاکت کا فیصلہ اس وقت تک نہیں ہوا تھا جب تک آیات ہدایت سے قوم کے تمام صالح اجزا اس کے فاسد عنصر سے ممتاز نہ ہوئے۔ اور مومنین و کافرین ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو گئے۔ گویا یہ واقعات اس لیے سنائے جا رہے ہیں کہ انبیاء میں اللہ کی سنت کے مطابق قریش کی ہلاکت کے دن قریب آ گئے اسی لیے سارے تاریخی واقعات بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے قل فانتظروا انی معکم من المنتظرین۔

حضرت نوح کا قوم کو چیلنج

۵۵ لوگو! اگر تم کو میرا دعوت پیش کرنا اور آیات الٰہی کے ذریعے نصیحت کرنا گراں محسوس ہو رہا ہے تو میں نے سب سے ہٹ کر بس اللہ پر بھروسہ کر لیا ہے تم سب اپنے شرکاء کو ساتھ لے کر اپنا کام مل جل کر کرو۔ ایسا کہ تمہارے کام میں کوئی گنجلک نہ رہے پھر جو کچھ کرنا ہے میری ساتھ کر لو اور مجھے کوئی مہلت نہ دو۔ یعنی تمہاری خوشی و ناخوشی یا موافقت و

مخالفت کی مجھے ذرہ برابر پروا نہیں ہے تمام پیغمبروں کی طرح برابر میرا بھروسہ اللہ پر ہے۔ اگر تم میری فہمائش سے برا مانو تو مانا کریں اپنے فرائض منصبی کے ادا کرنے میں قصور نہیں کر سکتا تم برا مان کر مجھ سے دشمنی کرنا چاہو اور نقصان پہنچانا چاہو تو یہ چیز میرے ارادوں پر قطعاً اثر ڈالنے والی نہیں ہے جو کچھ تمہارے امکان میں ہے شوق سے کر گذرو میرے خلاف مشورہ کرکے کوئی تجویز پختہ کرلو اپنے رفقائے کار بلکہ فرضی معبودوں کو بھی جمع کرکے ایک غیر مشکوک اور غیر مشتبہ رائے پر قائم ہو جاؤ پھر متفقہ طاقت سے اسے جاری کر ڈالو۔ ایک منٹ بھی مہلت مجھے نہ دو پھر دیکھ لو کہ پیغمبرانہ استقامت و توکل کا پہاڑ تمام دنیا کی طاقتوں اور تدبیروں کو کچل کر کس طرح پاش پاش کر ڈالتا ہے [1]

اس آیت میں سب سے زیادہ اہمیت د شرکاء کم کو ہے اعراب کے اعتبار سے بھی اور معنویت کی راہ سے ہے۔ اعراب کی حد تک رہے امرکم پر معطوف کر کے منصوب کے تابع ہونے کی وجہ سے منصوب پڑھا ہے اور فعل محذوف مانا ہے اور مطلب یہ بتایا ہے اجمعوا امرکم واجمعوا شرکاء کم میرے خلاف جو کچھ کرنا چاہتے ہو اسے کرلو اور اپنے شریکوں کو بھی جمع کرلو دوسری صورت یہ ہے کہ و شرکاء کم کو مفعول معہ بناؤ واؤ کو بمعنے مع لو اور معنی یہ کرو کہ میرے خلاف جو کچھ کرنا چاہتے ہو اپنے شرکا کو ساتھ لے کر کرو۔ کچھ کی رائے میں فعل محذوف کا مفعول یہ ہے وادعو شرکاء کم یعنی جو کچھ میرے خلاف کرنا چاہتے کرلو اور اپنے شرکا کو بھی بلالو۔ دوسری بات یہ کہ شرکا سے کیا مراد ہے۔ کچھ شارحین قرآن لکھتے ہیں کہ ان کے بت مراد ہیں لیکن علامہ قرطبی کو یہ بات کھٹکی ہے وہ فرماتے ہیں والاصنام لا تصنع شیئا ولا فعل لها اصنام تو کچھ کرتے ہی نہیں ان کا تو کوئی کردار ہی نہیں ہوتا۔ اگرچہ علامہ خفاجی نے یہ توجیہ کی ہے کہ منہ بند کرنے کی خاطر بات کہی گئی ہے۔ لیکن پتے کی بات قاضی بیضاوی نے کہی ہے کہ معطوف علی امرکم بحذف المضاف اور علامہ خفاجی نے مضاف کو یہ کہوا کر کھول دی المعنی ذوی امرکم اور لکھا ہے کلام المصنف یمیل الیہ کہ قاضی بیضاوی کا تقاضا بھی یہی ہے۔ مطلب صاف ہے کہ حضرت نوح کا قوم سے خطاب ہے کہ تمہیں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

جو کچھ میرے خلاف کرنا ہے کرلو اور اس مہم میں ارباب اقتدار کو بھی ساتھ ملالو۔ یعنی شرکار سے مراد بت نہیں بلکہ ارباب اقتدار ہیں۔ آپ قرآن میں یہ بات پڑھ چکے ہیں کہ جب حضرت نوح نے قوم کو اللہ کی بندگی کی دعوت دی یاقوم اعبدوا اللہ مالکم من الہ غیرہ تو ارباب اقتدار نے کہا تھا قال الملا من قومہ انا لنراک فی ضلال مبین حضرت نوح کی قوم میں سے ارباب اقتدار نے کہا کہ ہم تو تجھے بالکل بھٹکا ہوا سمجھتے ہیں۔ خفاجی لکھتے الملا القوم الاشراف ملا بر سر اقتدار لوگوں کو کہتے ہیں۔ شاید آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ ان کو شرکا رکیوں کہا یہی بات سمجھنے کی ہے شرک صرف پرستش اور عبادت ہی میں نہیں ہوتا ہے بلکہ بندگی اور طاعت میں بھی ہوتا ہے حضرت نوح کی قوم پرستش میں یہی شرک کر رہی تھی یعنی ود۔ سواع، یعوق۔ یغوث اور نسر سے ان کے عابدانہ تعلقات تھے اور بندگی میں شرک کر رہی تھی۔ حضرت نوح کی دعوت کی ضرب صرف پرستش والے شرک پر نہ تھی بلکہ اس کے ساتھ ان کی ضرب کاری بندگی والے شرک پر بھی تھی اسی لیے سربراہان مملکت ان کی دعوت کے ویسے ہی مخالف تھے جیسے عام لوگ تھے۔ عام شارحین قرآن کی نظروں سے یہ بات اوجھل رہی ہے۔

آیئے اب حضرت نوح کی تقریر پر غور فرمایئے یاقوم ان کان کبر علیکم مقامی اے لوگو اگر تم پر میرا مقام بھاری اور بڑا ہو رہا ہے مقام مصدر بھی ہے اور قیام کے معنے ہیں مطلب یہ ہے کہ میرا تمہارے درمیان رہنا اور ٹھہرنا تمہیں شاق ہے دوسرے مقام کے معنے یہ ہیں کہ اگر تمہیں میرا یہ دعوت کا کام کرنا شاق ہو رہا ہے نبی بیک وقت دو چیزیں لے کر آتا ہے ایک منصب نبوت دوسرا مقام نبوت، منصب نبوت نام ہے اور مقام نبوت نام ہے دعوت کے کام کا۔ شیخ اکبر نے المحکم المربوط میں لکھا ہے اعلم ان مقام النبوۃ ھو الدعوۃ الی اللہ مقام نبوت نام ہے اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف بلانے کا آیت کا مطلب یہ ہے کہ لوگو اگر تمہیں میرا دعوت کام کرنا اور اس میں شب و روز محنت کرنا تمہاری گرانی کا باعث ہے۔ یہ کام حضرت نوح نے ۹۵۰ سال کیا ہے اور کتنا کیا ہے اس کا اندازہ کرنے کے لیے قرآن کا یہ بیان پڑھتے۔

رب انی دعوت قومی لیلا و نھارا فلم یزدھم دعائی الا فرارا۔

"خداوندا میں نے اپنی قوم کو ایک ایک رات اور ایک ایک دن دعوت دی ہے مگر ان میں صرف گریز پائی ہی کا اضافہ ہوا ہے۔"

اس لیے یہاں مقام سے مراد حضرت نوح کا دعوت الی اللہ کا کام ہے اور تذکیری بایات اللہ سے مراد یہ ہے کہ اگر تم پر میرا دعوت الی اللہ کا کام اور توحید پر بے لاگ اور کھلا خطاب گراں ہو رہا ہے تو مجھے تمہاری گرانی کی کوئی پروا نہیں ہے۔ تم جو چاہو میرے خلاف کرو میرا آسرا صرف اللہ سبحانہ کی ذات گرامی ہے۔ تم مجھے نقصان پہنچانے کے لیے جو تدبیر کر سکتے ہو کر لو خود ہی نہ کرو بلکہ اس میں ارباب اقتدار کو بھی شریک کر لو اور یہ کارگذاری اس انداز سے کرو کہ بعد میں تمہاری ہر کارکردگی میں کوئی گنجلک نہ رہے اور تمہاری گھٹن کا باعث نہ ہو۔ یعنی تدبیر کو خفیہ رکھنے کی ضرورت نہیں جو کچھ میرے خلاف جو کچھ کرنا چاہتے ہو کھلم کھلا کرو ثم اقضوا الی پھر میرے جو کچھ بھی تمہیں کرنا ہے کر گذرو ولا تنظرون اور مجھے کسی قسم کی کوئی مہلت نہ دو۔ ظاہر ہے کہ یہ بات آغاز نبوت میں نہیں کہی جا رہی ہے بلکہ کلام کا انداز بتا رہا ہے کہ اس وقت کہی جا رہی ہے جب دعوت کی محنت سے قوم کے صالح اجزا اس کے فاسد عنصر سے الگ ہو چکے ہیں اور اہل ایمان و اہل کفر میں ایک حد فاصل قائم ہو چکی ہے اور حضرت نوح کو بقیہ عناصر کے ایمان سے قطعی مایوسی ہو چکی ہے۔
یہ ایک طویل زمانہ تک اپنی قوم کو دعوت کے بعد قوم سے خطاب فرما رہے ہیں۔ یہی وہ منزل ہے جو قریش مکہ کے سامنے حضور اقدس پورے ۱۲ سال دعوت کے گذر جانے کے بعد رونما ہوئی۔ اسی لیے یہاں قریش کو تنبیہ کے لیے حضور اقدس کو حکم ہوا ہے کہ ان کو حضرت نوح کا واقعہ سنایئے اور بتایئے کہ ان پر بھی وہ وقت آنے والا ہے جو اپنے اپنے پیغمبر کے سامنے قوم نوح پر آ چکا تھا یعنی قبیلہ قریش میں سے وہ افراد صالحہ جو بے خوف و خطر حق کو قبول کر سکتے انہوں نے حق قبول کر لیا اب صرف وہ روسائے قریش رہ گئے جن میں حق قبول کرنے کی کوئی صلاحیت نہ تھی یا وہ ضعفا تھے جو ان روسار کی موجودگی میں حق کا ساتھ دینے کی قوت نہ رکھتے تھے۔ اب ضرورت ہوئی کہ ان روسا کے وجود سے ارض حرم کو پاک کیا جائے یہ واقعات اسی کی تمہید میں سنائے جا رہے ہیں۔ اور نبیوں اور امتوں کے بارے میں اللہ کے قانون اس کی سنت کو واضح کیا جا رہا ہے۔

میں اجیر نہیں رضا کار ہوں

؎ اگر تم نے میری دعوت سے منہ پھیر لیا ہے تو مجھے کوئی نقصان نہیں ہے کیونکہ میں نے اس پر تم سے کوئی مزدوری نہیں مانگی ہے۔ مجھے تو اس کام کا صرف اللہ سے اجر لینا ہے اور مجھے تو صرف یہی حکم ہے کہ اس کا فرمان بردار رہوں۔ یعنی تمہارے مقابلہ میں نہ جانی تکلیف سے گھبراتا ہوں اور نہ مالی نقصان کی کوئی فکر ہے کیونکہ میں نے خدمت تبلیغ و دعوت کا تم سے کچھ معاوضہ کبھی طلب نہیں کیا ہے جو یہ اندیشہ ہو کہ تمہاری ناخوشی سے میری تنخواہ بند ہو جائے گی یا کم از کم تم کو یہ کہنے کا موقعہ ملے گا کہ میری ساری جد و جہد مال کی حرص اور روپے کے لالچ سے تھی۔ میں جس کا کام کر رہا ہوں اور حکم بجالا رہا ہوں اسی کے ذمہ میری اجرت ہے جب میں اس کا فرمان بردار ہوں اور خدمت مفوضہ بے خوف و خطر انجام دیتا ہوں تو کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے فضل و رحمت کے دروازے مجھ پر نہ کھولے رکھے ؎

یہ آیت قرآنی حضرت نوح کی تقریر میں نہایت بلیغ ہے جس میں مخاطبوں کے سامنے رسالت کی پوری زندگی کی غرض و غایت کو سمیٹ دیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ میری بات کو جس طرح سرسری انداز میں تم نظر انداز کر رہے ہو اور اس پر سنجیدگی سے غور نہیں کرتے ہو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تم مجھے غرض مند سمجھتے ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تم ضرور سوچتے کہ جو شخص اپنی کسی ذاتی غرض کے بغیر دعوت و تبلیغ اور تذکیر و نصیحت کی یہ سب مشقتیں لگاتار برداشت کر رہا ہے جس کی اس تگ و دو میں تم کسی شخصی یا خاندانی مفاد کا شائبہ تک نہیں پا سکتے وہ ضرور اپنے پاس یقین و اذعان کی کوئی ایسی بنیاد اور ضمیر کے اطمینان کی کوئی ایسی وجہ رکھتا ہے جس کی بنا پر اس نے اپنا عیش و آرام چھوڑ کر اپنی دنیا پھر بنانے کی فکر سے بے پروا ہو کر اپنے آپ کو اس مشقت میں ڈالا ہے کہ صدیوں کے جمے اور رچے ہوئے عقائد، رسوم اور طرز زندگی کے خلاف آواز اٹھائے اور اس کی بدولت دنیا بھر کی دشمنی مول لے لے ایسی شخص کی بات کم از کم اتنی بے وزن نہیں ہو سکتی کہ اسے درخور اعتناء نہ سمجھا جائے اور اس پر

؎ افادات شیخ الاسلام

سنجیدہ غور وفکر کی ذراسی تکلیف نہ برداشت کی جائے۔ دراصل یہ ارباب اقتدار کو مخاطب کرکے کہا جارہا ہے کہ اگر تم میری بات سننے کے لیے تیار نہیں ہو تو اچھی طرح سمجھ لو کہ اس میں میرا کوئی نقصان نہیں ہے سرتاسر تمہارا ہی نقصان ہے میں جو کچھ تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں اگر میں اس کے عوض میں تم سے کسی اجرت کا طالب ہوتا تب تو تمہاری اس بیزاری کی مجھے کوئی پروا ہوتی کہ تم نے میرے مقام کی کوئی قدر نہیں کی لیکن جب میں تم سے کوئی تجارت نہیں کر رہا ہوں جس طرح مجھے مفت ملا ہے ویسے ہی میں تمہیں مفت دے رہا ہوں تو تم اگر اسے قبول نہ کرو گے تو خود ہی خسارے میں رہو گے۔ مجھے تو اجر جو ملنا ہے وہ اللہ کے ذمہ ہے کام اس کا ہے اور وہ مجھے مل کر رہے گا تمہارے رد و قبول سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مجھ پر یہ ذمہ داری ہی نہیں ڈالی گئی کہ لازماً تمہیں مسلم بناؤں۔ مجھ پر تو یہ ذمہ داری ہے کہ خود اللہ کا فرمان بردار بن کر رہوں۔

حافظ ابن جریر فرماتے ہیں :

لوگو! اگر میری دعوت و تبلیغ کے باوجود تم میری بات کو پذیرائی نہ دو گے اور حق سے منہ موڑ کر باطل ہی پر جمے رہو گے اقرار توحید اور اخلاص عبادت کو نہیں اپناؤ گے تو اس میں میرا کوئی نقصان نہیں بلکہ سرتاسر تمہارا اپنا ہی نقصان ہے۔ تمہارا اس لیے کہ تم نے اللہ کے معاملے میں اپنی ذمہ داری پوری نہیں کی اور میرا اس لیے نہیں کہ میں اپنی دعوت پر تم سے کسی مزدوری کا طالب نہیں ہوں نہ اپنے کام پر تم سے کسی بدلہ اور جزا کا خواہاں ہوں۔ میرا اجر تو اسی کے ذمے ہے جس کا میں کام کر رہا ہوں مجھے تو صرف اپنے رب کا کہا ماننا ہے اور اس کے حکم پر چلنا ہے اور اسی کی میں تمہیں دعوت دے رہا ہوں۔

علامہ آلوسی نے وامرت ان اکون من المسلمین پر یہ لطیف بات لکھی ہے کہ مجھے تو ان مسلمین کے زمرے میں شامل ہونے کا حکم دیا گیا ہے جو دین کی تعلیم کا کام اجیر بن کر نہیں بلکہ رضا کارانہ کرتے ہیں اور دین کو دنیا طلبی کے لیے ذریعہ نہیں بناتے ہیں۔

دنیا کی حرص و طمع وہ برائی ہے جس میں نفس کی دناءت پوری طرح ظاہر ہوتی ہے خصوصاً دنیا کی وہ حرص و طمع جو دین کو ذریعہ بنا کر دنیا کے حصول کے لیے ہو۔ اس کی برائی قرآن میں تقریباً سب نبیوں کی زبان پر آئی ہے لا اسالکم علیہ اجراً

آیت میں اسلام اپنے لغوی معنی میں ہے یعنی انقیاد و فرمان برداری اس سے معلوم ہوا کہ

نبوت کے کام کی غرض وغایت صرف ایک ہی ہوتی ہے اور وہ اللہ سبحانہ کی خوشنودی اور رضا مندی ہے۔ سارے حوادث اور مصائب کے سارے طوفانوں میں نبوت کی زبان پر لک العتبی حتی ترضی ہوتا ہے۔

تکذیب کرنے والوں کا انجام

۷۶ حضرت نوح کے مخاطبوں نے حضرت نوح کی تکذیب کی۔ اس کے نتیجہ میں جب طوفان کی صورت میں اللہ کا عذاب آیا تو ہم نے حضرت نوح اور ان کے ساتھیوں کو بچا لیا اور ان کو جانشین بنا دیا۔ اور ان لوگوں کو طوفان کی نذر کر دیا جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی تھی۔ دیکھو ان لوگوں کا انجام کیسا رہا جن کو اللہ کے پیغمبر نے ڈرایا تھا۔ یعنی جس کے پاس چشم عبرت ہو وہ دیکھ لے کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا ان لوگوں کو سینکڑوں برس نوح علیہ السلام نے نصیحت کی نفع وضرر سے آگاہ کیا جب کوئی بات مؤثر نہ ہوئی۔ بلکہ الٹا عناد فرار بڑھتا گیا اس وقت اللہ سبحانہ نے سخت طوفان پانی کا روانہ کیا۔ سب مکذبین غرقاب کر دیئے گئے صرف نوح علیہ السلام اور چند نفوس جو ان کے ساتھ تھے محفوظ رہے ان ہی سے آگے نسل انسانی چلی۔ اور ڈوبنے والوں کی جگہ یہی آباد ہوئے۔ نوح علیہ السلام کا کچھ قصہ سورۂ اعراف میں گذر چکا ہے[1]

حضرت نوح کا ظہور اس سرزمین میں ہوا تھا جو دجلہ اور فرات کی وادیوں میں ہے۔ دجلہ اور فرات آرمینا کے پہاڑوں سے نکلے ہیں اور بہت دور الگ الگ ہو کر عراق زیریں میں باہم مل گئے ہیں۔ پھر خلیج فارس میں سمندر سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ ارمینیا کے یہ پہاڑ ارادات کے علاقہ میں واقع ہیں اسی لیے انہیں تورات میں ارادات کا پہاڑ کہا ہے۔ ایک ایسے طوفان و سیلاب کے بعد ملک کی جو حالت ہو گئی ہو گی اس کی ہولناکی محتاج بیان نہیں ہے۔

آیت میں پہلے عذاب کو نہیں عذاب کی وجہ کو بیان کیا ہے فکذبوہ کے معنی حضرت نوح نے نبوت کا کام کیا اور ایک عرصہ تک کام کیا تھا اس جگہ تفریع ذکری کے لیے نہیں قوم تو تکذیب حضرت نوح کے اس کہنے سے پہلے بھی کر رہی تھی کہ اگر تم میری دعوت و تذکیر کو پوری طرح رد کر چکے۔ فکذبوہ کے معنی ہیں موقعہ کے لحاظ تکرار اور دوام بھی ہے یعنی جب وہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

لگاتار حضرت نوح کی تکذیب کرتے ہی رہے۔ یہاں اطناب کو چھوڑ کر ایجاز سے کام لیا ہے۔ طوفان کا ذکر کے بجائے پہلے حضرت نوح اور ان کے ساتھیوں کو طوفان سے بچانے کا ذکر کیا اول اس لیے کہ اللہ سبحانہ کے یہاں مخالفوں کی تباہی سے مقدم نبوت کے ہمنواؤں کو بچانا ہے ثانیاً اس لیے واقعہ کے سننے والوں کو حوصلہ ہو کہ اگر قریش کی ساتھ یہی تاریخ دہرائی گئی تو اہل ایمان محفوظ رہیں گے۔ اور بتا دیا کہ نبوت کے مخالفین سارے ختم ہو گئے اور ان مخالفین کی جگہ حضرت نوح اور ان کے ساتھیوں نے لے لی اب پورے ملک میں حضرت نوح کی کوئی اپوزیشن نہ تھی۔ مخالفوں کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے اغرقنا الذین کذبوا بآیاتنا کی تعبیر اس لیے اختیار کی کہ پتہ لگ جائے کہ مخالفین کی تباہی کا باعث آیات کی تکذیب ہے اور قریش کو معلوم ہو جائے کہ جو کچھ کل ہوا تھا۔ وہی آج بھی ہو گا۔ اگر قریش آج بھی تکذیب چھوڑ دیں تو تاریخ بدل سکتی ہے۔

آخر میں فرمایا کہ فانظر کیف کان عاقبۃ المنذرین۔ منذرین سے مراد تکذیبین ہیں۔ یہ انداز بیان تکذیب میں تکرار اور اصرار بتانے کی غمازی کر رہا ہے۔ یہاں علامہ خفاجی نے یہ لطیف نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ عموم رسالت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے حضرت نوح کی نبوت عمومی تھی یا علاقائی تھی۔ اہل علم کا اس میں اختلاف ہے اور اسی پر یہ مسئلہ بھی مبنی ہے کہ طوفان نوح عام تھا یا خاص علاقائی تھا جیسا کہ آیات و احادیث میں صراحت ہے ابن عطیہ مفسر نے نبوت کو بھی علاقائی اور طوفان کو بھی علاقائی قرار دیا ہے اور لکھا ہے وھو الراجح عند المحققین۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ
بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ
كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿٧٤﴾ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ
بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا
فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿٧٥﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ
مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٧٦﴾ قَالَ مُوْسٰٓى
اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَلَا يُفْلِحُ
السّٰحِرُوْنَ ﴿٧٧﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ
اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِى الْاَرْضِ ؕ وَمَا نَحْنُ
لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿٧٨﴾

ہم نے پھر روانہ کئے حضرت نوح کے بعد بہت سے رسول
ان کی قوموں میں۔ انہوں نے ان کے سامنے اللہ سبحانہ کے
کھلے احکام پیش کیے۔ وہ لوگ چونکہ پہلے جھٹلا چکے تھے اس
لیے وہ ان کھلے احکام کو ماننے کو تیار نہ تھے ۷۴ ہم اسی طرح

سرکشی میں حد سے گذر جانے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں ۸۸ پھر ان رسولوں کے بعد فرعون اور اس کے انتظامی سربراہوں کی طرف ہم نے موسیٰ اور ہارون کو اپنی آیات دے کر روانہ کیا مگر انہوں نے بڑائی کا مظاہرہ کیا اور وہ لوگ جرائم پیشہ تھے ۸۹ لہذا جب ان کے پاس حق ہماری جانب سے آیا تو وہ بول پڑے کہ یہ تو کھلا جادو ہے ۹۰ حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ تم سچائی کی رونمائی کے بعد سچائی کو جادو کہتے ہو کیا جادو یہ ہے حالانکہ جادوگر فلاح سے ہمدوش نہیں ہوتے ہیں ۹۱ انہوں نے کہا اے موسیٰ کیا تیرا مقصد یہ ہے کہ ہمیں ہمارے آبائی طریقہ سے ہٹا کر ملک میں اپنی دونوں کی حکومت قائم کرے ہم تو تمہارے اقتدار کو تسلیم نہ کریں گے ۹۲

مفردات کے معانی

نطبع ہم مہر لگا دیتے ہیں بند لگا دیتے ہیں چھاپ لگا دیتے ہیں۔ کندہ کر دیتے ہیں۔ فتح یفتح سے مضارع کا جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ کسی چیز کے کسی چیز میں اتارنے کو طبع کہتے ہیں یہ ختم سے عام ہے اور نقش سے خاص۔ اور طبع السیف کے معنے ہیں تلوار کا زنگ آلود

ہو جانا اور اس پر میل کچیل چڑھ جانا محاورہ ہے رجل طبع یعنی وہ شخص جس کے اخلاق دنی ہوں اور گندہ کہ کسی بے حیائی سے نہ شرماتا ہو چنانچہ بعض علما نے نطبع علی قلوب المعتدین میں طبع کو اسی پر محمول کیا ہے اور معنے بتائے کہ ہم ان کے دلوں کو زنگ آلود اور میلا کر دیتے ہیں۔ علامہ محمد طاہر پٹنی مجمع بحار الانوار فی غرائب التنزیل والاخبار میں لکھتے ہیں۔ طبع سکون کے ساتھ بمعنے ختم مہر لگا لے کے معنی میں آتا ہے اور حرکت با کے ساتھ طبع زنگ لگنے کے معنے میں آتا ہے طبع السیف سے بنا ہے پھر گناہ وغیرہ کے لیے استعمال ہونے لگا۔

دراصل جب انسان سے کفر و عدوان کا صدور ہوتا ہے تب اللہ سبحانہ کی جانب سے اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے اس کو تشبیہاً یوں ادا کیا کہ ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں بل طبع اللہ علیہا بکفرھم یہاں بھی علی قلوب المعتدین آیا ہے یعنی ان سے کفر اور عدوان پہلے ظاہر ہوا اور اس کا اثر طبع کی صورت رونما ہوا مطلب یہ ہے کہ عدوان کا صدور ان سے ہوتا رہا تو اس کا اثر یہ ہوا کہ دلوں سے صداقت شناسی اور اثر پذیری کا جوہر سلب ہو گیا یہی اللہ کی جانب سے طبع ہے۔ قرآن میں جہاں جہاں طبع کا ذکر ہے وہاں کفر عدوان فسق کو علت کے طور پر ضرور ذکر کیا گیا ہے۔ امام راغب نے یہی بات اس طرح سمجھائی ہے کہ ختم اور طبع دو طرح استعمال ہوتے ہیں بمعنے تاثیر الشئے کے یعنی کسی چیز کا کسی چیز میں اثر اور نشان چھوڑنا دوسرے خود وہ اثر جو نقش سے حاصل ہو یہاں پہلے معنے میں ہے سحر جادو۔ جادو کرنا سحر یسحر کا مصدر ہے لیکن فعل یفعل سے۔ فعل کے وزن پر یہ مصدر شاذ ہے۔ علامہ ابن خالویہ نحوی نے تصریح کی ہے کہ عربی زبان میں فعل یفعل فعلا کے وزن پر سوائے سحر یسحر سحرا کے کوئی مصدر نہیں ہے لیکن ابو حیان اندلسی نے یہ اضافہ کیا ہے کہ سوائے فعل اور سحر کے اور کوئی مصدر اس وزن پر اس باب سے نہیں آتا ہے۔ ابو حیان اندلسی نے لکھا ہے کہ سحر کی حقیقت کیا ہے، اس موضوع پر مختلف رائیں ہیں۔

اوّل یہ کہ وہ اعیان و حقائق کی تبدیلی اور لوگوں کی صورتوں کا بدلنا ہے۔

دوم یہ کہ دھوکہ بازی گری، ملمع سازی اور شعبدہ بازی کا نام سحر ہے جن میں واقفیت نہیں ہوتی یخیل الیہ من سحرھم انھا تسعیٰ بھی بتا رہی ہے یہ معتزلہ کی رائے ہے۔ شوافع میں سے ابو اسحاق استرا بادی کی یہی رائے ہے۔

سوم وہ حیلہ کے طور پر ایسا معاملہ ہے جو نظر بندی کر دیتا ہے اسی سے سحروا

ابن الناس ہے۔
چہارم یہ کہ وہ خدمت جنات کی ایک قسم ہے اور انہوں نے ہی اسے اپنے اجسام کی جنس لطیف اور اس کی کیفیات سے نکالا ہے۔
پنجم یہ کہ وہ ان اجسام سے مرکب ہے جن کو جمع کر کے جلایا جاتا ہے اور ان کی راکھ اور سیاہیاں بنا کر ان پر اسماء اور عزیمتیں پڑھی جاتی ہیں۔ پھر جہاں سحر کی ضرورت پڑتی ہے وہاں انہیں استعمال کیا جاتا ہے۔
ششم یہ کہ اس کی اصل طلسمات اور نیرنجات ہیں جو ستاروں کی خاصیت کی تاثیر پر بنائے جاتے ہیں۔
ہفتم یہ کہ وہ ان کلمات سے مرکب نہیں جو کفر پر مشتمل ہیں۔ کچھ لوگوں کی رائے میں یہ سب اقوال سحر کی قسمیں ہیں اور ان کے علاوہ اور بھی قسمیں ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ سحر کا وجود ہے۔ قرآن وحدیث دونوں میں اس کی تائید ہے۔
اگر اس کا کوئی وجود نہ ہوتا تو قرآن وسنت میں اس پر احکام نہ ہوتے اس پر پوری بحث انشاء اللہ سولہویں جلد میں آئے گی۔ سحر کی حقیقت پر امام ابوبکر الجصاص رازی نے احکام القرآن میں امام فخر الدین رازی نے مفاتیح الغیب میں اور علامہ ابن خلدون نے مقدمہ میں اور شاہ عبدالعزیز نے تفسیر عزیزی میں اور شیخ طنطاوی نے تفسیر الجواہر میں بڑی سیر حاصل بحثیں کی ہیں ہم انشاء اللہ ان سب سے استفادہ کریں گے۔

قصص وواقعات تذکیر کے دلائل میں

قرآن نے جہاں بھی گذشتہ قوموں کے حالات بیان کئے ہیں وہاں یہ بات واضح کر دی ہے کہ اس واقعہ کے بیان سے اس کا مقصود کیا ہے جب اس پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تورات کی طرح دنیا کی تاریخ بیان کرنی مقصود نہیں ہے بلکہ مقصود کچھ باتوں کا دلوں میں یقین واذعان پیدا کرنا ہے اور واقعات کو ان کے لیے بطور دلائل پیش کرتا ہے اور اس کے لیے دو باتیں ضرور ذہن میں رکھنی چاہئیں۔
اول یہ کہ یہاں ہر جگہ ایک ہی قانون ایک ہی انداز سے کام کر رہا ہے کوئی مقام نہیں جو قانون تخلیق میں دوسروں سے ممتاز ہو، لباس تو ضرور مختلف ہیں اور نام بھی جدا جدا ہیں مگر

حقیقت سب جگہ ایک ہے مثلاً حیوان کے لیے موت وحیات ہے۔ پھولوں کے لیے کھلنا اور مرجھانا ہے پتھروں کے لیے بننا اور بگڑنا ہے اجزا کے لیے ملنا اور بکھرنا ہے جو قانون حیوانات میں موت وحیات کا وہی نباتات میں کھلنا اور مرجھانا ہے اور جمادات میں بننا اور پامال ہونا ہے الفاظ بدل جاتے ہیں معنے نہیں بدلتے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ جب عالم مادی میں وحدت قانون کی بنیادی صل کام کر رہی ہے تو یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ عالم انسانی کا گوشہ اس سے باہر ہو۔ یہاں بھی وہی قانون کام کر رہا ہے جو عالم مادی کے تمام گوشوں میں کارفرما ہے۔ لہٰذا اگر عالم مادی میں آگ کا خاصہ جلانا ہے ٹھیک اسی طرح عالم انسانی میں بھی کفر کی ایک خاصیت ہے جیسے یہ ہو نہیں سکتا کہ آگ روشن ہو اور اس کے شعلوں سے ٹھنڈک نکلے ایسے ہی یہ نہیں ہو سکتا کہ کفر موجود ہو اور اس کی راہ سے قرب خداوندی حاصل ہو جائے

پھر جیسے عالم انسانی میں افراد کے اعمال کے انفرادی قوانین ہیں ایسے ہی قوموں جماعتوں کی سعادت وشقادت اور حیات موت کا بھی ایک قانون ہے جس طرح اللہ سبحانہ کے سارے قوانین میں ہم آہنگی ہے اسی طرح یہ قانون بھی ہمیشہ ایک ہی رہا ہے اور ہمیشہ ایک ہی طرح کے نتائج ظاہر ہوئے ہیں۔ زمانوں اور قوموں کے اختلاف سے اس کی تاثیر مختلف نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اللہ سبحانہ کے قوانین میں ہم آہنگی اور یکسانی ہے ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی، اسی کو قرآن میں سنت اللہ سے تعبیر کیا ہے۔

۸۷ ہم نے پھر روانہ کیے حضرت نوح کے بعد بہت سے رسول ان کی قوموں میں انہوں نے ان کے سامنے اللہ سبحانہ کے کھلے احکام پیش کیے وہ لوگ چونکہ پہلے جھٹلا چکے تھے اس لیے وہ ان کھلے احکام کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے یعنی حضرت نوح علیہ السلام کے بعد ہود، صالح ابراہیم لوط شعیب وغیرہ انبیا کو اپنی اپنی قوم کی طرف کھلے ہوئے نشانات دے کر بھیجا لیکن جس جہالت اور کفر کی حالت میں وہ لوگ اپنے اپنے پیغمبر کی بعثت سے پہلے تھے اور جن چیزوں کو پیشتر سے جھٹلاتے آرہے تھے یہ توفیق نہ ہوئی کہ انبیاء کے تشریف لانے اور سمجھانے کے بعد ان کو مان لیتے بلکہ جن اصول صحیحہ کی تکذیب پہلے قوم نوح کر چکی تھی ان سبھوں نے ان کے ماننے سے انکار کر دیا اور جب پہلی مرتبہ منہ سے نہ نکل گئی ممکن نہ تھا کہ پھر کبھی ہاں نکل سکے اسی بے ایمانی اور تکذیب حق پر آخر تک اڑے رہے [1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس آیت میں رسولوں اور ان کی قوموں کا اجمالاً تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے پہلے رسولوں کا حال بیان کیا ہے کہ حضرت نوح کے بعد جتنے رسول آئے ان کی پکار کیا تھی ان کی پکار کی نوعیت کیا تھی۔ ان کی دلیلیں کیا تھیں جو انہوں نے پیش کیں ان کا طریق کار کیا تھا جس پر وہ برابر کاربند رہے انہوں نے اپنے قدم جہاں ٹکائے تھے وہ جگہ کونسی تھی اور سہارے کے لیے جس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا وہ کون تھا پھر ان میں اور ان کی قوموں میں جو معاملات پیش آئے وہ کس قسم کے تھے اور ان معاملات میں ان کا جو قول و فعل رہا وہ کس قسم کا تھا ان ساری باتوں میں ہر رسول دوسرے رسول کی تصویر تھا اور ہر دعوت دوسری دعوت کا عکس تھی۔ کسی بات میں بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں سب اسی حال پیدا ہوئے کہ دنیوی طاقتوں اور حکمرانیوں میں سے کچھ نہ رکھتے تھے سب کا ظہور ایسے وقتوں میں جب خدا پرستی اور اللہ کی بندگی کی روشنی بجھ چکی تھی سب کی ایک ہی دعوت تھی سب نے ایک ہی طرح لوگوں کو بلایا سب نے کہا کہ اللہ سے عابدانہ تعلقات استوار کرو اس کے سوا تمہاری پرستاریوں کا کوئی مستحق نہیں سب نے کہا کہ اللہ کی بندگی کرو اللہ کے سوا تمہاری فرمانبرداریوں اور طاعتوں کے لائق کوئی نہیں ہے سب نے کہا کہ ہم علم و یقین لے کر آئے ہیں سب نے کہا کہ اللہ کی جانب سے صاف اور کھلے احکام لے کر آئے ہیں یہ ہے ثم بعثنا من بعدہ رسلاً الی قومھم فجاءوھم بالبینٰت کا مطلب۔ حضرت نوح کے ایک عرصہ دراز بعد ہم نے مختلف قوموں میں مختلف زمانوں میں مختلف رسول روانہ کئے۔ ان رسولوں نے ان قوموں کے سامنے اللہ سبحانہ کے کھلے کھلے احکام پیش کئے اور بتایا کہ ہمارا دعویٰ اسکے سوا کچھ نہیں کہ ہم عالم انسانی کی حد تک ایمان اور نیک عمل کے نتائج کی خوشخبری دینے والے اور کفر و اعمال بد کے نتائج سے ڈرانے والے ہیں ماننا نہ ماننا تمہارا کام ہے۔

اور اب ان قوموں کو دیکھو جن میں ان دعوتوں کا ظہور ہوا تھا یہاں ہر قوم اپنے طرز عمل میں ٹھیک ٹھیک دوسری قوم کی شبیہ ہے اور کس طرح گمراہی کا چہرہ ہمیشہ ایک ہی طرح کا رہا غور کرو کہ کوئی بات بھی ایسی ہے جس میں ظلم و فساد کی ایک نمود ظلم و فساد کی دوسری نمود سے ہم رنگ نہ رہی ہو سب نے اپنی اپنی باری دہی سب کچھ کیا جو ان میں سے کسی ایک نے کہا تھا۔ سب نے دعوت کا انکار کیا سب نے تکذیب کی سب نے ہنسی اڑائی سب نے دلائل سے بے رخی اختیار کی سب نے روشنیوں سے منہ موڑا سب نے سرکشی اور گھمنڈ سے مقابلہ کیا سب نے موعظت و دلائل کا جواب سب نے جبر و تشدد سے راستہ روکا۔

ظلم و تعدی سے دیا۔ سب کی زبانوں سے ایک ہی طرح کی صدائیں نکلیں۔ سب کے انکار و اعراض کا مزاج ایک ہی طرح کا رہا اور پھر سب کو غرور و طغیان نے آخر تک اس کی مہلت نہ دی کہ روشنی و تاریکی میں امتیاز کرتے فما کانوا لیومنوا بما کذبوا بہ من قبل میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ گویا نبیوں کی دعوت اور ان کی قوموں کے جواب کی پوری تاریخ کے سمندر کو ایک کوزہ میں بند کر دیا گیا ہے۔

شارحین قرآن فما کانوا لیومنو بما کذبوا بہ من قبل کی تفسیر میں حیرانیوں کا شکار ہیں۔ قاضی بیضاوی نے فرمایا کہ

"حضرت نوح کے بعد انبیاء کی قوموں کو ایمان لانے کی فکر میں رچ بس جانے سے توفیق ہی نہ ہوئی۔ کیونکہ وہ پہلے ہی سے نبوت کی تکذیب کے خوگر تھے۔"

ابوحیان اندلسی نے البحر المحیط میں بتایا کہ لام جحود یہ بتانے کے لیے آیا ہے کہ ان کا ایمان لانا ممتنع اور محال ہے۔ علامہ بقاعی نے فرمایا کہ تکذیب کے مجرم عادی ہونے کی وجہ سے کسی طرح بھی ان کو ماننے کی سعادت ہی نصیب نہ ہوئی نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ نے فتح البیان میں انکشاف فرمایا۔

"مطلب یہ ہے کہ قوموں میں سے کوئی بھی انبیاء کی دعوت کو ماننے کو تیار نہ ہوا کیونکہ وہ انبیاء کے آنے سے پہلے ہی دین کی تکذیب کرتے تھے۔"

حالانکہ معاملہ بالکل صاف اور واضح ہے کہ نہ ماننے میں سب کی ہم آہنگی تھی اور انکار و سرکشی میں سب کا طرز عمل ایک تھا۔ سب قوموں کا اعراض و انکار میں معاملہ بالکل ہم آہنگ رہا ہے ہمیشہ ایسا ہی ہوا کہ غرور و طغیان نے ان کو اس کی مہلت نہ دی کہ حق کو قبول کرتے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ جو لوگ عقل و فطرت کے بدیہیات و یقینیات کو جھٹلا دیتے ہیں ان کو رسول کے انذار سے کوئی نفع نہیں ہوتا ہے بلکہ صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ اعراض و انکار جن کا مزاج بن جاتا ہے اور غرور و سرکشی جن کی طبیعت ہوتی ہے ان کو رسولوں کی دعوت کو اپنانا راست ہی نہیں آتا ہے۔

حق قبول کرنے کی استعداد کا خاتمہ

۴۸؎ ہم اسی طرح سرکشی میں حد سے گذرنے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں جو لوگ تکذیب و
عداوت حق میں حد سے نکل جاتے ہیں ان کے دلوں پر مہر لگنے کی یہی صورت ہوتی ہے کہ اوّل
تکذیب کرتے ہیں پھر اس پر ضد اور اصرار کرتے کرتے محض دشمنی اور عناد کی روش اختیار کر لیتے
ہیں یہاں تک کہ دل کی ساری کلیں بگڑ جاتی ہیں اور قبول حق کی استعداد باقی نہیں رہتی ہے ؎۱
طبع کے معنے کی وضاحت ہو چکی ہے۔ طبع کی حقیقت جاننے کے لیے ضروری ہے کہ یہ سمجھ لیا
جائے کہ قرآن میں ختم اور طبع جہاں بھی آیا ہے وہ کفر کے نتیجے میں آیا ہے یعنی انسان سے جب
کفر کا صدور ہوتا ہے تو اس کے نتیجے کو تشبیہاً یوں ادا کیا کہ ان کے دلوں پر مہر لگ گئی کہ سمجھتے
نہیں طبع اللہ بکفرھم یعنی ان کفر کی وجہ سے اللہ نے مہر لگا دی ہے مقصد یہ ہے کہ
جب کفر کا صدور ہوتا رہا تو دلوں سے صداقت شناسی اور اثر پذیری کا جوہر سلب ہو گیا۔
پیش نظر آیت میں بھی مخاطبوں کا عدوان دلوں پر مہر لگنے کا سبب ہے یعنی وہ لگاتار عدوان
کرتے رہے اس کے نتیجے میں ان کے دلوں پر مہر لگ گئی یعنی ان کے دلوں سے حق آشنائی
کی استعداد اور حق پذیرائی کی صلاحیت ناپید ہو کر رہ گئی۔ اللہ کا قانون یہ ہے کہ جو شخص اندھا اور
بہرا بنتا ہے اور حق کا پیغام نہ سنتا ہے اور نہ اس پر عمل کرتا ہے اللہ سبحانہ پھر اس کو دیکھنے
اور سننے کی توفیق نہیں دیتا ہے اگر وہ ایسا کرے تو یہ ظلم ہو اور ظلم کے ہر شائبہ سے اس
کا ہر حکم اور ہر کام بری ہے۔ قرآن میں جہاں جہاں بھی اللہ سبحانہ کی مہر کا ذکر ہے وہاں اس
کے کفر و فسق کی علت ہمیشہ پہلے ذکر کر دی گئی ہے اس لیے ان آیتوں سے جبر پر استدلال
درست نہیں یہ ہے نبیوں اور ان کی قوموں کی داستان تاریخ کا وہ اجمالی نقشہ جو قرآن نے
یہاں پیش کیا ہے۔ نبیوں کی جانب سے دعوت اور قوموں کی جانب سے تکذیب کی داستان
سن لی۔ آئیے اسی آیت کی مدد سے یہ بھی معلوم کر لیجئے کہ نتیجہ دونوں کے حق میں کیا رہا۔ نتیجہ
بھی ہمیشہ ایک رہا اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس ایک کے خلاف ہوا ہو۔ ہمیشہ اللہ سبحانہ کے
فیصلہ کا انتظار کیا گیا اور ہمیشہ فیصلہ یہی ہوا کہ مومنوں نے نجات پائی سرکشوں کے لیے ہلاکت

؎۱ افادات شیخ الاسلام

ہوئی۔ یہ گویا اس معاملہ کا ایک قدرتی خاصہ تھا اور خاصہ کبھی بدل نہیں سکتا یہ آگ کے لیے گرمی تھی۔ برف کے لیے ٹھنڈک تھی سنۃ اللہ فی الذین خلوا من قبل۔

موسیٰ و ہارون کی پکار

۸۹ پھر ان رسولوں کے بعد فرعون اور اس کے انتظامی سربراہوں کی طرف ہم نے حضرت موسیٰ اور ہارون کو روانہ کیا اپنی آیات دے کر مگر انہوں نے بڑائی کا مظاہرہ کیا اور وہ لوگ جرائم پیشہ تھے یعنی جرائم پیشہ لوگ تھے نافرمانی کی خو قبول حق کی اجازت کہاں دیتی تکبر مانع ہوا کہ اللہ سبحانہ کی نشانیوں کو دیکھ کر اس کے سفراء کے سامنے گردن جھکائیں وجحدوا بھا واستیقنتھا انفسھم ظلما وعلوا یہ بھی تکبر تھا جس نے فرعون سے یہ الفاظ کہلائے الم نربك فینا ولیدا ولبثت فینا[1]

حضرت نوح کے ذکر کے بعد فرمایا کہ ان کے بعد بہت سے رسول آئے پھر حضرت موسیٰ کا ذکر کیا ان سب میں قدر مشترک یہ ہے کہ یہ سب اللہ جل شانہ کی پرستش اور اس کی طاعت کے داعی تھے اور ان کے مخاطب عوام اور ارباب اقتدار تھے۔ حضرت موسیٰ بھی اسی خدمت پر مامور تھے جس پر حضرت نوح، حضرت ہود حضرت صالح حضرت ابراہیم ان سے پہلے مامور تھے اور اسی خدمت پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تک سارے انبیا مامور ہوتے رہے اور وہ یہ کہ پرستش اور بندگی اللہ سبحانہ کے سوا کسی کی نہ کرو عابدانہ اور نیازمندانہ تعلقات بھی اسی قائم کرو اور طاعت بندگی بھی زندگی میں اسی کی کرو اسی کے وفادار شہری بن کر رہو اور یہ یقین کرو کہ اس زندگی کے بعد نہیں دوسری زندگی میں اللہ کے حضور پیش ہو کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ اللہ کی توحید اور آخرت کا عقیدہ سب نبیوں کی دعوت ہے، توحید عبادت میں بھی اور توحید طاعت میں بھی۔ اسی پر سارے نبیوں نے روحانی سیاسی معاشی اور قانونی نظام کی دعوت دی ہے۔ فلاح صرف ان کو ہی ہے جنہوں نے عبادت اور طاعت میں اللہ سبحانہ سے تعلقات استوار کئے ہیں یہی سورۃ یونس کا مرکزی موضوع ہے۔ یہی دعوت حضرت موسیٰ اور ہارون بھی فرعون اور اشراف حکومت کی طرف لے کر آئے حضرت موسیٰ و ہارون

[1] افادات شیخ الاسلام

کا پیش نہاد صرف شخصی استبداد کا خاتمہ نہیں تھا بلکہ عبادت و طاعت میں اللہ سے رابطہ کی دعوت تھی۔ فرعون کی جگہ اگر خود بنی اسرائیل بھی ہوتے پھر بھی دعوت ہی ہوتی"۔ یہاں علامہ بقاعی نے یہ خوب نکتہ آفرینی کی ہے کہ اب تک جن نبیوں کا تذکرہ ہوا ہے ان کی بعثت ان کی قوموں کی طرف ہوتی ہے اسی لیے قرآن نے سب کے لیے بھائی کی تعبیر اختیار کی ہے۔ اس کے برعکس حضرت موسیٰ کی بعثت فرعون اور فرعون کے اعیان حکومت کی طرف ہوتی ہے مدعا یہ ہے کہ انبیاء کی دعوت ایک ہی ہوتی ہے چاہے اپنے ہوں یا بیگانے ہم وطن ہوں یا غیر ملکی اور اجنبی۔ انبیاء کی دعوت کے سامنے رنگ، نسل زبان قوم اور وطن کی تفریقات نہیں ہوتی ہیں ان کی پکار ایک ہوتی ہے کہ اللہ سے عابدانہ اور مطیعانہ تعلقات قائم کرو اصنام و اوثان کی پرستش نہ کرو اور تخت و تاج کی طاعت نہ کرو۔ عبادت کا مستحق بھی اللہ ہے اور اطاعت کا حقدار بھی اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ کو مختلف معجزات عطا ہوئے تھے وہ اس لیے تھے کہ فرعون کو دکھا کر اسے حق کی طرف دعوت دی جائے قرآن کا انکشاف ہے کہ فرعون نے ان معجزات کو دیکھ کر بجائے حق کو قبول کرنے کے اپنی بڑائی کا مظاہرہ کیا اور حضرت موسیٰ کی دعوت کو پائے استکبار سے ٹھکرا دیا قرآن نے بتایا ہے کہ فرعون اور اس کے اعیان حکومت جرائم پیشہ لوگ تھے یعنی چھوٹے گناہ نہ کرتے تھے بلکہ بہت بڑے بڑے معاشرتی، عائلی فوجداری معاشی اور سیاسی جرائم کرتے تھے۔ اور صرف کرتے نہ تھے بلکہ جیسا کہ الخفاجی نے بتایا ہے کہ جرائم کے عادی اور فن کار تھے۔

حضرت موسیٰ کے بارے میں یہ سمجھنا کہ وہ ایک قومی لیڈر کی حیثیت سے صرف بنی اسرائیل کی آزادی چاہتے تھے بالکل بے ربط اور دعوت انبیاء سے بے خبر ہونے کی علامت ہے بلاشبہ حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو مصر سے نکالنے کا بھی فرعون سے مطالبہ کیا لیکن یہ تو اس وقت کیا جب ایک مدت تک کام کرنے کے بعد قانون الٰہی نے حضرت موسیٰ کے دشمن کو ہلاک کرنے کا فیصلہ کر لیا تو اللہ کی جانب سے بنی اسرائیل کو ساتھ لیکر مصر سے ہجرت کا حکم ہوا فرعون کی ہلاکت حضرت موسیٰ کا معجزہ عذاب تھا۔ اور معجزہ عذاب اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتا جب تک قوم کے سارے صالح اجزا اس کے فاسد عنصر سے الگ نہیں ہوتے اور مومنین اور کافرین ایک دوسرے سے پھوٹ کر جدا نہیں ہو جاتے اور رسول کو معاندین

کے ایمان سے قطعی مایوسی نہیں ہوجاتی ہے بنی اسرائیل کی آزادی خود مقصد نہیں بلکہ حصول مقصد کا ایک ذریعہ ہے اصل مقصد تو فرعون کی ہدایت اور حق کی طرف دعوت تھی آگے تفصیل آرہی ہے۔

حضرت موسیٰ کا اعلان حق

۹۰ لہٰذا جب حق ان کے پاس ہماری جانب سے آیا تو وہ بول پڑے کہ یہ تو کھلا جادو ہے یعنی عصا اور ید بیضا وغیرہ معجزات دیکھ کر اور موسیٰ علیہ السلام کی نہایت پرتاثیر تقریریں سن کر کہنے لگے کہ یہ سب کھلا جادو ہے کیونکہ ان کے خیال میں تمام مافوق العادت چیزوں کا آخری درجہ جادو ہی ہوسکتا تھا۔ ۱؎

سورت کے آغاز میں گذر چکا ہے قال الکافرون ان ھذا الساحر مبین۔ دونوں طرح پڑھا گیا ہے سحر مبین۔ یہاں بھی دو قراتیں ہیں سحر مبین اور ساحر مبین انبیاء کے مخاطب وحی ونبوت کا انکار کرتے ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی دیکھتے ہیں کہ یہ شخص دوسرے آدمیوں کی طرح نہیں ہے۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے پھر جب اس کی کوئی توجیہ سمجھ میں نہ آئی تو کہتے ہو نہ ہو یہ جادوگری ہے۔ ان کا یہ کہنا حضرت موسیٰ کی حیرت انگیز تاثیر کی سب سے بڑی شہادت ہے یعنی اس کا اثر اس درجہ نمایاں اور قطعی تھا کہ باوجود عناد وجحود کے اس سے انکار نہیں کرسکتے تھے اسے جادوگری سے تعبیر کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے حضرت موسیٰ کی صداقت کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ ان کا سخت سے سخت معاند بھی اس عجیب وغریب کشش وتاثیر سے انکار نہیں کرسکتے تھے جو آپ کی شخصیت اور آپ کی تعلیم میں پائی جاتی تھی اور چونکہ اعتراف حقیقت کے لیے تیار نہ تھے اس لیے مجبور ہو جاتے تھے کہ اسے جادو سے تعبیر کریں۔

عام شارحین قرآن نے آیت میں الحق سے مراد خود حضرت موسیٰ کی بات اور دعوت سے ہٹ کر دعوی نبوت کے دلائل یعنی معجزات لیے ہیں۔ حالانکہ قرآن کا انداز بیان اس احتمال کا ساتھ نہیں دیتا ہے قرآن نے ایک وقت میں دو باتیں کہی ہیں ایک یہ کہ جو کچھ حضرت

۱؎ افادات شیخ الاسلام

نے بات کہی ہے وہ حضرت موسیٰ کی نہیں ہماری ہے اور دوسری یہ کہ وہ الحق ہے۔ الحق حق سے ہے اور عربی حقق کا لغوی خاصہ ثبوت اور قیام ہے یعنی جو بات ثابت ہو اٹل ہو اسے حق کہتے ہیں اور باطل ٹھیک ٹھیک اس کی ضد ہے یعنی ایسی بات جو مٹ جانے والی اور باقی نہ رہنے والی ہو۔ اسی لیے قرآن نے سچائی کو حق سے اور انکار کو باطل سے تعبیر کرکے یہ بات واضح کر دی ہے کہ سچائی کا خاصہ ثبوت وقیام ہے اور انکار وسرکشی کے لیے مٹ جانا ہے علامہ البقاعی نے آیت کی تشریح اس طرح کی ہے۔

"جب ان کے پاس یعنی فرعون اور اس کے اعیان حکومت کے پاس حقانیت سے بھرپور حق ہماری جانب سے آیا یعنی یہ خود رسولوں کا پیغام نہیں تھا بلکہ اللہ کی جانب سے تھا وہ بغیر سوچے اور صورت حال پر غور کیے بغیر محض دشمنی اور اپنی بڑائی کی وجہ سے بول پڑے کہ یہ تو کھلا جادو ہے جیساکہ حضور انور کے مخاطبوں نے قرآن کے بارے میں کہا تھا کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔"

حافظ ابن کثیر نے ان ھذا لسحر مبین تاکیدی انداز سے یہ لطیف نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ حضرت موسیٰ کے مخاطبوں نے اس بات پر قسم اس لیے کھائی ہے کہ وہ جانتے تھے کہ جو بات حضرت موسیٰ کے بارے میں کہہ رہے ہیں یہ جھوٹ ہے اور سر تا سر بہتان ہے قرآن کی زبان میں اسی کا نام کفر جحود ہے۔ قرآن نے فرعون اور فرعونوں کے بارے میں بتایا ہے۔

وجحدوا بها واستيقنتها انفسهم ظلما وعلوا
"انہوں نے ازراہ ظلم وتکبر اس کا انکار کیا حالانکہ ان کا دل ان کی صداقت کا یقین کر چکا تھا۔"

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور مادہ پرستیوں میں اندھے ہو جاتے ہیں وہ نبوت کی ہدایت پر ایمان نہیں لاتے اور اس انکار کا اصلی سبب ان کا ظالمانہ طرز عمل اور اقتدار کا نشہ ہوتا ہے ورنہ ان کے دلوں کو پیغمبر کی صداقت کا یقین ہوتا ہے۔

جادو اور اعجاز میں فرق

۹۱ حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ تم سچائی کی رونمائی کے بعد سچائی کو جادو کہتے ہو۔ کیا جادو یہ ہے حالانکہ جادوگر فلاح سے ہم دوش نہیں ہوتے ہیں یعنی حق کو جادو کہتے ہو۔ کیا جادو ایسا ہوتا ہے اور کیا جادو کرنے والے نبوت کا دعوت کر کے حق و باطل کی کش مکش سے کامیاب نکل سکتے ہیں۔ سحر و معجزے میں تمیز نہ کر سکنا ان کوتاہ بینوں کا کام ہے جو سونے اور پیتل میں تمیز نہ کر سکیں۔ نبی کے روشن چہرے، پاکیزہ اخلاق نور تقویٰ، پر شوکت و عظمت احوال میں بدیہی شہادت اس کی موجود ہوتی ہے کہ جادوگری اور شعبدہ بازی سے انہیں دور کی بھی نسبت نہیں پھر اللہ کے رسول کو ساحر کہنا کس درجہ بے حیائی یا دیوانگی ہے ۔[1]

سحر اور اعجاز کے فرق پر متکلمین نے علم کلام کی کتابوں میں بہت کچھ لکھا ہے ہم یہاں تفصیل تو نہیں مگر کچھ اجمالاً اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

یہ سوال بلاشبہ بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ معجزہ سے جس طرح عجیب و غریب امور صادر ہوتے ہیں، سحر و طلسم نیرنگ شعبدہ سے بھی اس قسم کی باتیں دکھائی جا سکتی ہیں۔ سحر و طلسم کے الفاظ اگر اس بیسویں صدی میں مکروہ معلوم ہوں تو ان کے معنے مسمریزم اور ہپناٹزم کے سمجھ لیے جائیں۔ ایسی صورت میں ایک اللہ کے رسول اور ساحر و شعبدہ باز میں کیا فرق ہو گا۔ یہ سوال ہے جس پر علم کلام میں طول طویل بحثیں ہیں۔ معتزلہ اور ارباب ظواہر میں حافظ ابن حزم ظاہری کا یہ دعویٰ ہے کہ معجزے کے علاوہ سحر و طلسم و شعبدہ وغیرہ جو چیزیں ہیں وہ صرف فریب نظر ہیں۔ لیکن معجزے سے قلب ماہیت اور تبدیل حقیقت ہو جاتی ہے۔ اشاعرہ سحر و طلسم کی حقیقت کو مانتے ہیں لیکن یہ کہتے ہیں کہ معجزے سے جو عظیم الشان عجائبات سرزد ہوتے ہیں مثلاً سمندر کا خشک ہونا، چاند کا شق ہونا وغیرہ یہ چیزیں سحر و طلسم کے زور سے نہیں ہو سکتیں۔ حکمائے اسلام کا مسلک یہ ہے کہ معجزہ اور سحر میں فرق یہ ہے کہ صاحب معجزہ اپنی قوت کو خیر میں صرف کرتا ہے اور ساحر شر میں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان جوابات سے اشکال کی اصل گرہ نہیں کھلتی ایک شخص اپنے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دعویٰ کی ثبوت میں بظاہر ایک خارق عادت کرشمہ پیش کرتا ہے اب اس پر یہ بحث کہ یہ دھوکہ یا نظر بندی ہے یا امر الٰہی ہے یا معمولی کام ہے یا عظیم الشان کارنامہ ہے نہایت مشکل کام ہے کیونکہ ان اشیاء کے وقوع میں کوئی ظاہری امتیاز رونما ہو نہیں سکتا۔ نیز اس کا فیصلہ کہ یہ قوت خیر میں صرف ہو یا محل شر میں اس کے علاوہ کوئی تیسری شکل نہیں ہو سکتی بہت کچھ قابل بحث ہے۔ ایک مسمریزا اپنی قوت سے بعض بیماریوں کو دور کر دیتا ہے اور اس سے غریبوں کا علاج کرتا ہے یہ تو خیر اور نیکی کی چیز ہے کیا آپ اسے معجزہ کہہ دیں گے۔

اصل یہ ہے کہ معجزہ اور دیگر عجائبات میں دو عظیم الشان فرق ہیں ایک یہ کہ معجزہ براہ راست اللہ سبحانہ کا فعل ہوتا ہے اور دوسرے عجائبات امور اسباب طبعی و نفسی کے نتائج ہوتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ معجزے سے مقصود اعدائے دعوت الٰہی کی ہلاکت یا رسول خدا کی تائید اور مومنین کی حمایت اور برکت ہوتی ہے محض کھیل تماشہ شعبدہ بازی، بازیگری اس کا مقصد نہیں ہوتا اور سب سے آخری شے جو ان دونوں کے درمیان حد فاصل بن جاتی ہے یہ ہے کہ ساحر صرف تماشہ اور کرتب دکھاتا ہے اس کے ساتھ وہ اپنی زندگی کی پاکیزگی ارادے کی بے گناہی دل کی طہارت شریعت کی تبلیغ تزکیہ قلوب کا نہ وہ مدعی ہوتا ہے اور نہ یہ خواص اور کارنامے اس سے ظاہر ہوتے ہیں لیکن انبیاء علیہم السلام کی معصوم زندگی پاک اخلاق، مقدس اعمال اور دیگر پیغمبرانہ خصائص و کیفیات خود ان کی نبوت کی منادی کرتے رہتے ہیں۔ قدم قدم پر خدا ان کی دعوت کی تائید کرتا ہے۔ ان کی صدائے حق جماعتوں اور قوموں اور ملکوں میں روحانی انقلاب پیدا کر دیتی ہے ان کی سچائی روشنی اور صداقت پر ان کی سوانح حیات کا حرف حرف گواہ ہوتا ہے وہ سونے چاندی پر نہیں بلکہ دلوں پر اخلاص و ایثار اور صدق و صفا کی مہر لگاتے ہیں۔ ایک ساحر اور مسمریزر خواص اشیاء میں انقلاب پیدا کر سکتا ہے مگر کافر کو مومن بدکار کو عفیف بے باک کو متقی بخیل کو فیاض سخت کو نرم اور جاہل کو عالم نہیں بنا سکتا وہ لوہے کو زر خالص کی صورت میں بدل سکتا ہے لیکن کسی زنگ آلود دل کو جلا نہیں دے سکتا۔

یہ ظاہری اشتباہ صرف نبی و ساحری میں نہیں ہے بلکہ دنیا کی ہر حقیقت اسی طرح اپنے مقابل سے مشتبہ ہے۔ صبر اور بے صبری توکل اور عجز بخل و کفایت شعاری، سخاوت اور اسراف تنقید اور تنقیص حق گوئی اور گستاخی شجاعت اور تہور۔ ان میں باہم اس قدر التباس ہے

کہ انسان کی قوت تمیز کبھی کبھی دھوکا کھا جاتی ہے لیکن اہل نظر ان دونوں کے باہم تشابہ سے فریب میں نہیں آتے۔ ان دونوں کی ظاہری شکل و صورت بے شک ایک ہو مگر ان دونوں کے خصائص و آثار اس درجہ متفاوت ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے فرق و امتیاز کو فوراً پہچان لیتے ہیں جب پیغمبر اپنا معجزہ اور جادوگر اپنا کرتب دکھاتے ہیں تو ظاہری سیرت زائی کے لحاظ سے عوام کے نزدیک ایک لمحہ کے لیے گو دونوں ایک ہوں مگر جب حقیقت کا پردہ چاک ہو جاتا ہے تو ایک اخلاق کا مجسمہ پاکیزگی کا فرشتہ، شریعت کا حامل گنہ گاروں کا معالج اور دلوں کا طبیب ہوتا ہے اور دوسرا محض تماشا گر ہوتا ہے۔

ایک عطائی اور طبیب حاذق ایک معمولی سپاہی اور ایک بہادر جرنیل ایک حرف شناس اور ماہر علوم ایک مکار اور زاہد ایک بناوٹی اور حقیقی موتی کے درمیان شاید عوام فرق نہ کر سکیں مگر جب ان دونوں کے آثار و خصائص اور علامات و قرائن باہم رائے جائیں تو ظلمت و نور کی طرح ان دونوں میں علانیہ فرق محسوس ہو جاتا ہے۔ اور حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے مثنوی میں سحر و اعجاز کو اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے۔

آیئے آپ بھی لطف اندوز ہو جائے فرماتے ہیں۔

سحر را با معجزہ کردہ قیاس	ہر دو را بر مکر پندارد اساس
جادو کو معجزہ پر قیاس کر لیا	اور یہ سمجھا کہ دونوں کی بنیاد فریب پر ہے
زر قلب و زر نیکو در عیار	بے محک ہرگز نہ دانی ز اعتبار
تم کھوٹے اور کھرے سونے کو	کسوٹی کے بغیر ہرگز نہیں جان سکتے
ہر کرا در جان خدا بنہد محک	ہر یقین را باز داند از شک
اللہ نے جس کی روح میں کسوٹی رکھی ہے	وہی یقین و شک میں امتیاز کر سکتا ہے
چوں شود از رنج و علت دل سلیم	طعم صدق و کذب را باشد علیم
جب دل میں بیماری نہیں ہوتی	تو وہ سچ اور جھوٹ کے مزے کا پتہ لے لیتا ہے

اور فرق مراتب کو متعدد تشبیہات کے ذریعے سمجھایا ہے خلاصہ یہ ہے سینکڑوں اور ہزاروں چیزیں باہم مشابہ ہوتی ہیں میٹھے اور شور پانی رنگ میں یکساں ہوتے ہیں بھڑ اور شہد کی مکھی ایک ہی پھول چوستی ہیں ایک سے زہر اور دوسری سے شہد پیدا ہوتا ہے ہرن ایک ہی گھاس اور ایک ہی پانی پیتے ہیں مگر ایک سے مینگنیاں اور دوسرے سے مشک ہوتا ہے

بانس اور گنا ایک زمین میں اور ایک پانی سے پلتے ہیں مگر ایک بے مزہ اور دوسرا شیریں ہوتا ہے۔ ایک شخص غذا کھا کر بخل کی تصویر اور دوسرا اسی غذا سے نور خدا کا حامل ہوتا ہے۔ اس قسم کی مختلف تشبیہات سے متشابہات میں فرق مراتب کی توضیح کی ہے۔ بہرحال ساحر ایک تماشا گر ہوتا ہے اس میں یہ قدرت ہی نہیں ہوتی کہ وہ اس کے ذریعے تزکیہ نفوس مظہر اخلاق اور اصلاح عالم کا کام لے سکے یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی ساحر اور شعبدہ باز نے اصلاح کا فرض انجام نہیں دیا لیکن اللہ کا رسول اپنے معجزانہ کارناموں سے دنیا کو الٹ دیتا ہے بدی کے کانٹوں کو ہٹا کر نیکی کے گل وریحان سے اس خاکدان عالم کو سجا دیتا ہے مطلب یہ ہے کہ ظاہر نظر میں جادو اور معجزے کے درمیان جو مشابہت ہوتی ہے اس کی بنا پر فرعون اور اس کے اعیان حکومت نے اسے جادو قرار دے دیا مگر یہ نہ دیکھا کہ جادوگر کس سیرت واخلاق کے لوگ ہوتے ہیں اور کن مقاصد کے لیے جادوگری کرتے ہیں۔ کیا کوئی جادوگر بے دھڑک اور بے غرض کسی فرمان روا کے دربار میں آتا ہے۔ کیا جادوگر کا جادو اس کے کسی دعویٰ کی دلیل ہوتا ہے۔ اللہ کا رسول اپنے تئیں اللہ کا رسول ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور اس دعویٰ پر اعجاز کو بطور دلیل پیش کرتا ہے۔ کیونکہ نبوت ایک دعویٰ ہے کہ میں اللہ سبحانہ کا نمائندہ ہوں۔ اتنا عظیم دعویٰ کہ میں خدا کا نمائندہ ہوں اس دعویٰ کے لیئے بطور دلیل نبوت کو وہ عجیب چیز عطا کی جاتی ہے کہ ساری مخلوق اس کے کرنے سے عاجز ہوتی ہے وہ چیز نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتی ہے۔ اسی کو معجزہ کہتے ہیں۔

اس پورے مضمون کو حضرت موسیٰ نے اسحر ھذا کہہ کر پہلے یہ جتایا کہ کیا یہ جادو ہے اور پھر اس ساری داستان کو اس ایک فقرے میں سمیٹ دیا کہ ولا یفلح الساحرون کہ جادوگر فلاح نہیں پانتے ہیں یعنی جادوگر کسی پائدار کامیابی سے ہمدوش نہیں ہوتے ان کے کرشموں اور شعبدوں کی چمک دمک وقتی اور عارضی ہوتی ہے۔ یہ جملہ حضرت موسیٰ کی جانب سے فرعون اور اس کے اعیان حکومت کو ایک چیلنج بھی ہے کہ اگر اس کو سحر کہتے تو اس کے مقابلے میں جب تم ساحروں کو لاؤ گے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا اور تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ رسول کے معجزے اور ساحر کے سحر میں کیا فرق ہوتا ہے۔

حضرت موسیٰ پر سیاسی الزام

۹۲ انہوں نے کہا کہ اے موسیٰ کیا تیرا مقصد یہ ہے کہ ہمیں ہمارے آبائی طریقہ سے ہٹا کر ملک میں اپنی دونوں کی حکومت قائم کرے ہم تو تم دونوں کے اقتدار کو تسلیم نہ کریں گے یعنی تم معاذ اللہ دنیا کے حریص اور بدنیت ہو ایک سیاسی تحریک کو مذہبی رنگ میں پیش کرتے ہو۔ تمہاری غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ مذہب کے نام پر ایک انقلاب عظیم برپا کر کے اس ملک میں اپنی حکومت قائم کرو اور یہاں کے پرانے حکمرانوں قبطیوں کو برطرف کر دو۔ یاد رکھو کہ تمہاری یہ خواہش پوری ہونے والی نہیں ہے ہم لوگ ہرگز تمہاری بات نہ مانیں گے نہ تمہاری بزرگی کبھی تسلیم کریں گے [1]

موسیٰ علیہ السلام نے ایسی دندان شکن واقعاتی اور نمایاں ٹھوس حقیقت فرعون کے سامنے پیش کی کہ فرعون لاجواب ہو کر رہ گیا۔ لاجواب ہونے کی صورت میں انسانی طبیعت کی عام کمزوری یہ ہے کہ وہ ایسے مواقع پر قوت و طاقت کا سہارا لیتا ہے یا پھر دین آبائی کی آغوش میں پناہ لیتا ہے چنانچہ فرعون اور اس کے اعیان حکومت نے حضرت موسیٰ کے خلاف عوام کو بھڑکانے کے لیے ان پر آبائی دین اور ملک کی حکومت دونوں کے خلاف بغاوت برپا کرنے کا الزام لگایا کہ تم ہمارے آبائی دین سے ہمیں برگشتہ کرنا چاہتے ہو اور تمہاری خواہش یہ ہے کہ اس ملک کے اقتدار پر قبضہ کر و۔

آیت میں یہ بھی اشارا ہے کہ حضرت موسیٰ کا مطمح نظر صرف بنی اسرائیل کی رہائی نہ تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو فرعون اور اس کے درباریوں کو یہ اندیشہ کرنے کی ضرورت نہ تھی کہ حضرت موسیٰ کی دعوت پھیلنے سے سرزمین مصر کا دین بدل جائے گا اور ملک میں ہمارے بجائے ان کا اقتدار قائم ہو جائے گا ان کے اس اندیشے کی وجہ یہی تھی کہ حضرت موسیٰ اہل مصر کو بندگی حق کی دعوت دے رہے تھے اور اس سے وہ مشرکانہ نظام خطرے میں تھا جس پر فرعون کی حکومت اور مذہبی رہنماؤں کی پیشہ ورانہ زندگی قائم تھی۔ دراصل حضرت موسیٰ کی حیثیتیں دو تھیں ایک حیثیت آپ کی نبی ماننے والی بگڑی ہوئی امت کی اصلاح کی تھی اس حیثیت میں آپ جعز امہائی

[1] افادات شیخ الاسلام

مسلم قوم یعنی بنی اسرائیل کے بھی تھے اور دوسری حیثیت میں آپ قبطی قوم کیطرف دعوت حق لے کر آئے تھے ایک وقت میں آپ دو کام کر رہے تھے بگڑی ہوئی امت کی اصلاح اور منکرین حق کے سامنے حق کا اعلان۔

یہاں حافظ ابن کثیر کا یہ اضافی لوٹ پڑھنے کے لائق ہے کہ

اللہ سبحانہ نے حضرت موسیٰ کو فرعون کی آغوش میں شہزادہ کی حیثیت سے پرورش کرایا، پھر ان کو نبوت و رسالت سے سرفراز فرما کر فرعون کی طرف روانہ کیا صرف اس لئے کہ فرعون کو اللہ سبحانہ کی طرف یہ دعوت دی جائے کہ اپنے عابدانہ تعلقات اللہ سبحانہ سے استوار کر، لیکن فرعون نے آمرانہ اقتدار کے نشہ میں حضرت موسیٰ کی دعوت کو قبول نہیں کیا۔ اور صرف قبول نہیں کیا بلکہ تمرد استکبار کا مظاہرہ کیا۔ حضرت موسیٰ کی دعوت کے خلاف اعلان بغاوت کر کے اہل ایمان کو مٹانے کے درپے ہو گیا۔ حضرت موسیٰ سے مجادلہ اور مناظرہ کیا۔ پے درپے اور لگا تار معجزات کا مشاہدہ کرنے کے باوجود فرعون اور اس کے اعیان حکومت نے مجود و عناد اور مکابرہ کی راہ اختیار کی۔

اس سے پہلے انبیا کے جو تاریخی واقعات بیان ہوئے ہیں۔ ان میں اور حضرت موسیٰ کی تاریخی داستان میں بہت بڑا فرق ہے۔ انبیا کی تاریخی شہادتوں سے یہ ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ جو قوم نبوت کی دعوت اور اللہ کے پیغام کو ٹھکرا دیتی ہے اسے ضرور اپنے اعمال کی سزا ملتی ہے۔ اب حضرت موسیٰ کی زندگی کے دو پہلو پیش کئے جا رہے ہیں ایک پہلو یہ کہ حضرت موسیٰ امت دعوت سے مخاطب ہیں یہ فرعون اور فرعون کے اعیان حکومت اور مصر کے قبطی ہیں۔ امت دعوت کے دقائق میں کفار مکہ کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ دعوت حق کے مرحلے میں حق و باطل کی قوموں کا جو تضاد سب نظر آتا ہے اس سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے۔ حق کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ نبوت کا آغاز ایک فی قوم کی اقلیت سے ہوتا ہے اور بغیر کسی ساز و سامان کے اللہ کا رسول اس باطل کے خلاف لڑائی چھیڑ دیتا ہے جس کی پشت پر بڑی بڑی قوموں اور حکومتوں کی طاقت ہوتی ہے۔ لیکن نتائج کے لحاظ سے نبوت ہی غالب آکر رہتی ہے۔ نیز اس واقعہ میں یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ داعی حق کے خلاف جو چالیں چلی جاتی ہیں اور جن تدبیروں سے ان کی دعوت کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے وہ کس طرح الٹ جاتی ہیں اور یہ

کہ اللہ سبحانہ منکرین حق کی ہلاکت کا آخری فیصلہ کرنے سے پہلے ان کو کتنی کتنی طویل مدت تک سنبھلنے اور درست ہونے کے مواقع دیتا رہتا ہے اور جب کسی تنبیہ اور کسی روشن نشانی سے وہ متاثر نہیں ہوتے تو پھر وہ انہیں عبرتناک سزا دیتا ہے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُونِي بِكُلِّ سٰحِرٍ
عَلِيْمٍ ﴿۷۹﴾ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ
مُّلْقُوْنَ ﴿۸۰﴾ فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُؕ
اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۱﴾
وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۸۲﴾

ع ۱۲

اور فرعون اپنے اعیان حکومت سے کہا کہ ہر فنکار جادوگر میرے حضور میں پیش کرو [۹۳] جب جادوگر فرعون کی بارگاہ میں پیش ہو گئے تو حضرت موسیٰ نے جادوگروں سے مخاطب ہو کر کہا تمہیں جو کچھ کرنا ہے کرو [۹۴] پھر جب جادوگروں نے جو کچھ کرنا تھا کر لیا تو حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ جو کچھ تم نے کیا ہے یہ جادو ہی ہے [۹۵] بلاشبہ اللہ سبحانہ اسے ضرور ملیامیٹ کر دے گا۔ اللہ سبحانہ بگاڑ کرنے والوں کے کام کو نہیں سنوارتا ہے [۹۶] اور اللہ اپنے قوانین کے مطابق حق کو ضرور جماد عطا فرمائے گا۔ اگرچہ جرائم پیشہ لوگوں

کو کیسا ہی ناگوار ہو ۹۷

فرعون کا تاریخی چہرہ

فرعون شاہان مصر کا لقب ہے کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں ہے تین ہزار قبل مسیح زمانہ اسکندر تک فراعنہ کے اکتیس خاندان مصر پر حکمران رہے ہیں۔ سب سے آخری خاندان فارس کی شہنشاہی کا تھا جو ۳۳۲ سنہ قبل مسیح سکندر کے ہاتھوں مفتوح ہوا۔ ان میں سے حضرت یوسف کا فرعون ہکسیس عمالقہ کے خاندان سے تھا جو دراصل عرب خاندانوں ہی کی ایک شاخ تھی۔

یہ بات کہ حضرت موسیٰ نے کس فرعون کا زمانہ پایا ہے؟ عام مورخین عرب اور شارحین قرآن اس کو بھی عمالقہ ہی کے خاندان ہی کا فرمانروا بتاتے ہیں مشہور مؤرخ ابن قتیبہ لکھتا ہے۔ سام بن نوح کی اولاد میں سے عمالیق ہیں یہ متعدد قوموں کا مجموعہ تھے جو متفرق ہو کر ممالک میں پھیل گئے ان میں سے ہی مصر اور بابل کے حکمران ہیں ان امور پر ہم نویں جلد میں تبصرہ کر چکے ہیں۔ جدید مصری اثری تحقیق یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کے زمانہ کا فرعون رعمیس ثانی کا بیٹا منفتاح ہے۔

حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہاری نے قصص القرآن میں علامہ نجار کی قصص الدنیا کے حوالہ سے اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے اور ہم اس کا خلاصہ معالم القرآن کی جلد ۹ میں پیش کر چکے ہیں دیکھو ص ۸۴ جلد نہم

۹۷ اور فرعون نے اپنے اعیان حکومت سے کہا کہ ہر فن کار جادوگراں کو میرے حضور میں پیش کرو یہ گویا موسیٰ علیہ السلام کی تقریر کا جواب تھا یعنی رہا سحر اور معجزہ کا جھگڑا۔ اس کا ہم عملاً تصفیہ کئے دیتے ہیں کہ اس ملک کے بڑے بڑے ماہر جادوگر اکٹھے کیے جائیں۔ پھر ان کے خوارق کے سامنے معجزات دکھلائیں۔ دنیا مشاہدہ کرے گی کہ تم پیغمبر ہو یا معاذ اللہ جادوگر ہو۔ اس کے لیے فرعون نے تمام ملک میں گشتی جاری کر دی اور آدمی بھیج دیئے کہ مشاق اور ماہر جادوگر جہاں کہیں ہوں فوراً حاضر کیئے جائیں [1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

فرعون اور اس کے اعیان حکومت سے یہ حقیقت تو مخفی نہیں رہ سکتی تھی کہ نہ حضرت ساحر ہیں اور نہ جو کچھ وہ پیش کر رہے ہیں سحر ہے لیکن چونکہ ان کی بات مان لینے کی صورت اس کو اپنی اور اپنی مزعومہ خداوندی و حکمرانی کی موت نظر آتی تھی اس وجہ سے اس کو جائے فرار کی صورت یہی نظر آئی کہ ملک کے تمام ماہر جادوگروں کو بلا کر مقابلہ کرایا جائے کہ شاید اس طرح بات بن جائے۔ اگرچہ یہ ایک کھلی حماقت تھی لیکن کسی حقیقت کو نہ ماننے کی خواہش ایک ایسی خواہش ہے جس کی خاطر انسان بہت سی حماقتیں کرتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا زمانہ مصری تمدن کی جو تاریخ پیش کرتا ہے اس میں یہ بات بہت نمایاں نظر آتی ہے کہ مصری علوم و فنون میں جادو کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ اسی لیے ساحرین کا مرتبہ مصری معاشرے میں ایک ممتاز مرتبہ تھا حتیٰ کہ ان کو شاہی دربار میں بہت بڑا رسوخ حاصل تھا۔ جنگ و صلح پیدائش و موت کی زائچہ کشی کے لیے اور اہم سرکاری معاملات میں حالات کی دریافت کا وہ ہی مرکز سمجھے جاتے تھے اور ان کے علوم کو بڑی وقعت سے دیکھا جاتا تھا۔ مذہبی مقامات میں ان کو اہم جگہ دی جاتی تھی قدیم شاہی خاندانوں میں جو ممی حنوط شدہ نعشوں کے ساتھ جو کاغذات اور دستاویزیں برآمد ہوئی ہیں اور ان حجروں میں جو نقوش و تصاویر پائے جاتے ہیں ان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

قدیم قوموں کی عام گمراہیوں میں سے ایک گمراہی یہ بھی رہی ہے کہ وہ جادو پر خالص دینی حیثیت سے اعتقاد رکھتے تھے اور اس کے ہی ذریعے اپنی دینی زندگی کے احوال و ظروف تیار کرتے تھے۔ دینی عقیدت سے اس کو سیکھتے اور سکھاتے اور اس میں وہ اپنی اجتہادی قوتیں صرف کر کے نت نئی اختراعات کرتے۔ مصر، بابل، چین عراق اور ہندوستان کی تاریخ اس کی گواہ ہے۔

یہی وجہ تھی کہ مصری قوم پر فرعون اور اس کے اعیان حکومت کا یہ داؤ چل گیا کہ حضرت موسیٰ جادوگر ہیں اور یہ اپنے جادو کے اثر و رسوخ کو کام میں لا کر مصری حکومت پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اب اس کا علاج یہی ہے کہ اپنے ملک کے ماہر جادوگروں کو جمع کر کے سرعام حضرت موسیٰ کو شکست دی جائے۔ موسیٰ علیہ السلام نے بھی سرکار کے فیصلہ کو اس لیے غنیمت سمجھا کہ اعجاز نبوت اور ساحروں کے سحر کا مقابلہ ہوگا تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا اور ان کو ناچار حق و صداقت کے سامنے جھکنا پڑے گا نیز حضرت موسیٰ کے پیش نظر یہ بھی تھا کہ اگرچہ

وحی الٰہی کا تعین روشن حجت و برہان کے ذریعے ہو چکا ہے تاہم فرعون اور اعیان حکومت چونکہ دلائل نبوت کو سحر کہہ کر عوام کو اصل حقیقت سے بے خبر رکھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں اس لیے ضرورت ہے کہ عوام و خواص کے مجمع میں سحر و اعجاز کے امتیاز کی کھلم کھلا نمائش ہو جائے تاکہ اللہ کی بندوں کی ہدایت کے لیے اللہ کی آخری حجت بھی پوری ہو جائے۔

اعجاز و سحر کی نمائش

۸۰ جب جادوگر فرعون کے دربار میں پیش ہو گئے تو حضرت موسیٰ نے جادوگروں سے کہا کہ جو کچھ تمہیں کرنا ہے کرلو۔ دوسری جگہ مذکور ہے کہ ساحرین نے موسیٰ علیہ السلام سے دریافت کیا تھا کہ اپنا کرتب دکھلانے میں تم پہل کرتے ہو یا ہم کریں اس کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم کو جو دکھلانا ہے دکھا دو۔ کیونکہ باطل کی پوری زور آزمائی اور نمائش کے بعد حق کا آنا اور باطل کو نیچا دکھا کر ملیا میٹ کر دینا زیادہ مؤثر اور غلبہ حق کو زیادہ واضح کرنے والا ہے [۱]

حضرت موسیٰ کا یہ کہنا کہ جو کچھ تم پیش کرنا چاہتے ہو وہ پیش کرو اپنے مقام پر بہت بڑے اعتماد کی نشانی ہے۔ نبوت کو اللہ سبحانہ کے وعدہ نصرت پر پورا بھروسہ ہے کہ جادوگر جتنا بڑا جادو دکھائیں اللہ ان کی رہنمائی فرمائے گا۔ سورہ اعراف میں ہے کہ جادوگروں نے میدان مبارزت میں اترتے ہی کہا یا موسیٰ اما ان تلقی و اما ان نکون نحن الملقین اس سوال کے جواب میں حضرت موسیٰ نے یہ بات ارشاد فرمائی القوا اما انتم ملقون جو کچھ تمہیں کرنا ہے کرلو۔ نظم قرآن بتا رہا ہے کہ حضرت موسیٰ کے مقابلہ میں جادوگروں کی خواہش بھی تھی کہ پہل ہم کریں۔ جادوگر اس وقت تک حضرت موسیٰ کو اپنے ہی طرح کا جادوگر سمجھ رہے تھے اور گویا کہہ رہے تھے کہ مقابلہ ہمارے تمہارے ہی فن کا ہے۔ اب بتلاؤ کہ پہل کون کرے ہم یا تم اور صیغہ متکلم پر زور دے کر پہل میں اپنی رغبت ظاہر کر دی۔ حضرت موسیٰ نے ان کی خواہش تاڑ کر ان کو پہلے ہی موقع دیا کہ وہ اپنے فن کا مظاہرہ کریں اور فرمایا القوا ما انتم ملقون یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت موسیٰ کو پورا اعتماد تھا کہ ان کو اللہ سبحانہ کی تائید حاصل ہے۔ جادوگروں نے پیشہ ورانہ طور پر پہلے یہ اطمینان کر لیا کہ غلبہ کی صورت میں ان کو انعام ملیگا

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

جیسا کہ سورہ اعراف میں پڑھ چکے ہو اور سورہ الشعراء میں پڑھو گے قالوا ان لنا اجرا ان کنا نحن الغالبین فرعون نے اس کے جواب میں کہا نعم انکم اذا لمن المقربین یعنی انعام تو جو کچھ ملنا ہے وہ تو ملے ہی گا تم پر مزید نوازش یہ ہو گی کہ تم خاص مقربین میں شمار ہو گے مطلب یہ ہے کہ روپیہ پیسہ ہی نہیں ملے گا۔ بلکہ تم سرکار کے درباری اور کرسی نشین ہو گے۔ اس طرح فرعون اور جادوگروں نے خود ہی نبی اور جادوگروں کا عظیم اخلاقی فرق ظاہر کر دیا۔ دونوں کا تقابلی مطالعہ فرمایئے ایک طرف بنی اسرائیل جیسی پسی ہوئی قوم کا ایک بیکس اور بے بس فرد دس سال تک قتل کے الزام میں روپوش ہونے کے بعد فرعون کے دربار میں آتا ہے اور بڑے طنطنے کے ساتھ ڈنکے کی چوٹ کہہ رہا ہے۔ انی رسول من رب العالمین فرعون سے بات کرنے میں وہ ادنیٰ بھی جھجک محسوس نہیں کرتا اس کی دھمکیوں کی وہ ذرا برابر پروا نہیں کرتا۔ یہ نبوت کی شان ہے اس کے مقابلے میں جادوگروں کی صورت میں خالص مادیت ہے جن کو فرعون کے سرکاری دین اور اس کے خود ساختہ نظام حیات کو بچانے کے لیے بلایا گیا ہے مادیت ہاتھ جوڑ کر کہہ رہی ہے کہ سرکاری انعام ملنا چاہیے اور جواب سن کر کہ پیسہ بھی ملے گا اور قرب شاہی سے بھی نوازے جاؤ گے پھولے نہیں سمائے۔ یہ دو متقابل کردار خود زبان حال سے بول رہے ہیں کہ نبی کی شان کیا ہوتی ہے اور اس کے متقابل کا کیا مقام ہوتا ہے ؟ رسول اللہ کی نمائندگی کرتا ہے اور اس کا نعرہ لا اسالکم علیہ اجرا ہوتا ہے اور رسول کا مدمقابل ناخداشناسی کی نمائندگی کرتا ہے اور اس کا نعرہ ان لنا اجرا ان کنا نحن الغالبین ہوتا ہے۔ نبی کی ذات نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد سراپا ہدایت و رحمت اور مجسم امامت و پیشوائی کی تصویر ہوتی ہے۔

جادوگروں کی افسوں کاری

۹۵ [1] پھر جب جادوگروں نے جو کچھ کرنا تھا کر لیا تو حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ جو کچھ تم نے کیا ہے یہ بس جادو ہے جادوگروں نے اپنی لاٹھیاں رسیاں زمین پر پھینک دیں اور تخیل و نظر بندی سے دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہونے لگا گویا تمام میدان زندہ سانپوں سے بھرا ہوا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ صرف جادو ہے وہ جادو نہیں جسے فرعون اور اس کے ساتھیوں نے جادو کہا تھا [1] حضرت موسیٰ نے فرمایا ما جئتم بہ السحر۔ ما موصولہ ہے اور جملہ مبتدا ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

السحر مبتدا کی خبر ہے یعنی جو کچھ تم نے کیا ہے یہ جادو کے سوا کچھ نہیں ہے جادو ایک فن اور آرٹ ہے اس کی کوئی حقیقت ہے یا نہیں اس پر پہلے بحث ہو چکی ہے۔ جادو میں واقفیت ہے یا نہیں یہ مسئلہ تو اختلافی ہے لیکن جو جادو حضرت موسیٰ کے مقابلہ میں جادوگروں نے پیش کیا تھا وہ تخیل و فریب نظر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ قرآن میں اللہ سبحانہ نے اسے یخیل الیہ من سحرھم انھا تسعیٰ سے تعبیر کیا ہے یعنی جادوگروں کی رسیاں اور لاٹھیاں سانپ بن گئیں تھیں بلکہ ان کی شعبدہ گری سے دیکھنے والا خیال کرنے لگتا سانپ کی طرح حرکت کر رہی ہیں۔ کہیں فرمایا انما صنعوا کید ساحر ولا یفلح الساحر حیث اتی یہ جادوگروں کا فریب ہے اور جادوگر کیسا ہی تماشہ دکھائے حقیقت کی طرح کامیاب نہیں ہو سکتا سورہ اعراف میں جادوگروں کے متعلق فرمایا سحروا اعین الناس لوگوں کی آنکھیں جادو زدہ ہو گئی تھیں یعنی جادو کے شعبدوں کی کوئی حقیقت نہیں محض نگاہ کا دھوکا تھا سورہ اعراف میں جادوگروں کی شعبدہ بازی کو مایافکون فرمایا یعنی ان کی جھوٹی نمائش تھی۔

بتانا یہ ہے کہ شعبدہ گری کے فنون میں سے ایک فن ہے۔ آرٹ ہے حکمت اور علوم عقلیہ سے اس کا تعلق ہے۔ طلسمات و نیرنجات کا بھی ان علوم عقلیہ وماویہ سے تعلق ہے بلکہ طلسمات و نیرنجات تو محققین کی رائے کے مطابق اشراقی فلسفہ کی شاخ تھی۔ فلسفہ میں کمال حاصل کرنے والے ان فنون میں مہارت حاصل کرتے تھے شیخ مقتول شہاب الدین سہروردی کے متعلق کتابوں میں لکھا ہے کہ کبھی کبھار وہ اس قسم کے تماشے دکھلاتے تھے مثلاً لکھتے ہیں کہ دمشق سے نکلتے ہوئے راستہ میں شیخ الاشراق کا جھگڑا ایک چرواہے سے ہو گیا۔ گڈریے نے شیخ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ ایسا معلوم ہوا کہ مونڈھے سے شیخ کا ہاتھ اتر کر چرواہے کے ہاتھ میں چلا گیا۔ اس حال کو دیکھتے ہی بے چارہ چرواہا پریشان ہو گیا اور ہاتھ پھینک کر بھاگ گیا۔ شیخ نے بڑھ کر اسے اٹھا لیا اور اپنے ساتھیوں سے آکر مل گئے بجائے ہاتھ کے اصل میں رومال تھا مگر شیخ کی فنی مہارت سے چرواہے کو ہاتھ معلوم ہوا۔ امام اوزاعی سے ایک یہودی اشراقی کا قصہ بھی اسی قسم کا منقول ہے۔ یہودی نے ایک مینڈک پکڑا۔ امام اوزاعی بھی سفر میں تھے عیسائیوں کے ایک گاؤں میں جب یہودی اس مینڈک کو فروخت کرنے لگا تو دیکھنے والوں کو معلوم ہوتا تھا کہ سور کا بچہ ہے۔ کسی غریب عیسائی نے سور سمجھ کر خرید لیا جب یہودی قیمت لے کر گاؤں سے باہر آیا تو مینڈک اصلی صورت میں واپس آ گیا گاؤں والوں نے یہودی کا پیچھا کیا امام

اوزاعی کہتے ہیں کہ جونہی وہ لوگ قریب ہوئے یہودی کی گردن سے اس کا سرالگ ہوگیا اور زمین پر لٹنے لگا گاؤں والے یہ تماشا دیکھ کر واپس بھاگ گئے وہی سر جو بدن سے الگ پڑا معلوم ہوتا تھا امام اوزاعی سے پوچھ رہا تھا۔ اے ابو عمر کیا وہ لوگ چلے گئے انہوں نے کہا کہ ہاں تو اچھل کر سیدھا کھڑا ہوگیا۔ اتحاف میں ان اشراقی تماشوں کا ذکر طاشش کبری زادہ نے کیا ہے مشہور مصنف علامہ سکاکی کے متعلق لکھا ہے کہ ایک طرف تو وہ مفتاح العلوم جیسی کتاب لکھتے تھے اور دوسری طرف اسی قسم کے علوم و فنون کے ذریعے عجب تماشے دکھاتے تھے روضۃ الصفا میں لکھا ہے کہ بغداد میں وزیر سے ان کا ایک بار جھگڑا ہوگیا۔ سکاکی نے عمل کے زور سے سارے بغداد کی رگ باندھ دی۔ کسی کے گھر چراغ روشن نہیں ہوتا تھا تین دن کے بعد خلیفہ کو معلوم ہوا کہ سکاکی کی یہ شرارت ہے لجاجت سے کہلا بھیجا کہ لوگ پریشان ہیں اب اپنے عمل کو اٹھالیں۔ سکاکی نے بھی پیغام بر سے کہا۔ یہ قصے میں نے اس لیے نقل کئے ہیں کہ سحر ایک فن ہے۔ مسلمان بھی اپنے دور پستی میں اس میں لگے رہے۔ حکما میں یہ چیز میں اشراقی فلسفہ کی راہ سے آئی تھیں، لیکن اشراقی خواص ہوں یا عوام سب جانتے ہیں، کہ دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

قرآن نے حضرت موسیٰ کی زبانی یہی انکشاف کیا ہے کہ جادوگروں نے جس چیز کی نمائش کی ہے وہ صرف سحر ہے اور نبوت جو کچھ پیش کرتی ہے وہ سحر نہیں اعجاز ہے سحر فن ہے محنت وریاضت سے حاصل کیا جاسکتا ہے اعجاز فن نہیں ہے خود صاحب اعجاز کی محنت کا بھی اعجاز میں دخل نہیں ہوتا ہے۔ یہ بھی نبوت کی طرح وہبی ہے۔ اور اللہ کی جانب سے ہوتا ہے۔

جادو کا عمل صرف فساد ہے

۹۶ بلاشبہ اللہ سبحانہ اسے ضرور ملیا میٹ کردے گا۔ اللہ سبحانہ بگاڑنے کرنے والوں کے کام کو نہیں سنوارتا ہے یعنی بس تم اپنی قوت صرف کر چکے اب سنبھل جانا کہ اللہ اپنی قدرت و رحمت سے یہ سب بنا بنایا کھیل بگاڑ دیتا ہے جو میرے مقابلے میں پھر کبھی نہیں سنور سکے گا۔ کیونکہ اللہ سبحانہ کی عادت کے خلاف ہے کہ مصلح و مفسد کے مقابلہ کے وقت جب کہ اس سے مقصود خالص اتمام حجت ہو۔ مفسدوں اور شریروں کی بات سنوار دے

اور کلمہ حق کو پست و مغلوب کر دے [1]۔ قرآن نے نبوت کے جو خصائص و علامات بتائے ہیں ان سے خود معجزے اور سحر کا فرق اور ساحر و نبی کا امتیاز ظاہر ہوتا ہے۔ سحر و شعبدہ میں صرف دل لگی کے وقتی تماشے ہوتے ہیں لیکن معجزات قوموں اور جماعتوں کے صلاح و فساد تعمیر و تخریب ترقی و تنزل سامان ہوتے ہیں۔ ساحر کا مقصد کسی غیر معمولی واقعہ کا صرف حیرت انگیز طریقہ سے اظہار ہوتا ہے تاکہ وہ دیکھنے والوں کو تھوڑی دیر کے لیے متحیر کر دے لیکن نبی کا مقصد اپنے معجزات سے دنیا کی اصلاح قوموں کی دعوت، جماعتوں کی تہذیب اور دین الٰہی کی تقویت کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔ اللہ کا رسول بشیر نذیر نرکی بادی سراج منیر اور شاہد عالم ہوتا ہے، جادوگر ان تمام اوصاف سے خالی ہوتا ہے۔ ر حیرت انگیز تماشہ گری کے سوا کوئی اور ثمرات نتائج اس کے اندر نہیں ہوتی۔ قرآن میں حضرت موسٰی کے مد مقابل جادوگروں کے سحر کے متعلق جس قدر بیانات ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ سحر کی حقیقت کو نبوت کے مقابلے سے زیادہ تسلیم نہیں کرتا اور تخییل و نظر بندی سے اس کو وقعت نہیں دیتا۔

ساحر اور نبی میں اللہ تعالیٰ نے جو فرق بتایا وہ بھی ہے کہ نبی فلاح پاتا ہے اور جادوگر فلاح نہیں پاتا۔ نبی کے تمام اعمال، مساعی، جدوجہد اور معجزات کا مرکز و محور صلاح و فلاح اور خیر ہوتا ہے۔ اور جادوگر کا مقصد صرف دھوکا اور شر ہوتا ہے۔ اس آیت میں اسی بات کو بتایا گیا ہے ان اللہ سیبطلہ یعنی سحر و جادو ایک وقتی تماشا ہوتا ہے اور اعجاز کا اثر دائمی ہوتا ہے اور اس کے نتائج دنیا میں نہایت عظیم الشان ہوتے ہیں۔

احقاق حق کا قانون

[2] اور اللہ اپنے قوانین کے مطابق حق کو ضرور رواج عطا فرمائے گا اگرچہ جرائم پیشہ لوگوں کو کیسا ہی ناگوار ہو یعنی جو کچھ بھی ہے حق اور باطل کی کشمکش ہے حق اور باطل کیا ہے۔ کونسا قانون الٰہی ہے جو اس میں کام کر رہا ہے یہ واضح کیا ہے کہ صلاح اور اصلاح حق ہے اس کے مقابلہ پر فساد اور افساد باطل ہے۔ حق کے معنے عربی میں ثبوت اور قیام کے ہیں یعنی جو بات ثابت ہو، قائم رہنے والی اور اٹل ہو۔ قرآن نبوت کی دعوت کو حق اور اس کے انکار کو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

باطل کہتا ہے کیونکہ نبوت جو کچھ پیش کر رہی ہے وہ صلاح ہے اور نبوت کے مدمقابل جس چیز کے علمبردار ہیں وہ سرتاسر فساد ہے حق کا خاصہ نبوت و قیام ہے اور باطل کے لیے مٹ جاتا ہے نبوت جو حق کی علمبردار ہو کر باطل سے مقابلہ کرتی ہے یہ حق کی باطل پر چوٹ ہے اس مقابلہ میں باطل ختم ہو کر رہ جاتا ہے اس نقاعی سطائعہ میں احقاق حق اور ابطال باطل اللہ کا قانون ہے ویحق اللہ الحق بکلماتہ و یبطل الباطل یہ بقائے حق کا قانون ہے یعنی اللہ سبحانہ نے یہ قانون ٹھہرا دیا ہے کہ یہاں وہی چیز باقی رہ سکتی ہے جس میں صلاح ہو نفع ہو اور جس میں صلاح و نفع نہ ہو وہ ٹھہر نہیں سکتی۔ اسی کو قرآن کی زبان میں قضا بالحق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ مجرمین و مفسدین خواہ حق کو دبانے کی نبوت کے مقابلہ میں اپنے علوم فنون سے کتنی ہی کوششیں کریں لیکن اللہ سبحانہ حق کا بول بالا کرتا ہے۔

فَمَآ اٰمَنَ

لِمُوْسٰىٓ اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَ

مَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ؕ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ ۚ

وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ

اٰمَنْتُمْ بِاللّٰہِ فَعَلَیْہِ تَوَکَّلُوْٓا اِنْ کُنْتُمْ مُّسْلِمِیْنَ ﴿۸۴﴾ فَقَالُوْا
عَلَی اللّٰہِ تَوَکَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَۃً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۸۵﴾
وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِکَ مِنَ الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ ﴿۸۶﴾ وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی
مُوْسٰی وَاَخِیْہِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِکُمَا بِمِصْرَ بُیُوْتًا وَّاجْعَلُوْا
بُیُوْتَکُمْ قِبْلَۃً وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۸۷﴾

حضرت موسیٰ کی قوم میں سے حضرت موسیٰ کی بات چند نوجوانوں نے مانی۔ فرعون اور اس کے اعیان حکومت کے اس خوف سے کہ کہیں ان کو کسی فتنہ میں نہ ڈال دے۔ اور بلاشبہ فرعون ملک میں بڑا ہی سرکش تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ فرعون ظلم و استبداد میں چھوٹ تھا۔[۹۷] اور حضرت موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا لوگو! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو اور فی الواقع اسی کے فرماں بردار ہو تو صرف اسی پر بھروسہ کرو۔[۹۸] انہوں نے کہا کہ ہم نے اللہ ہی پر بھروسہ کیا۔ اے ہمارے رب اس ظالم گروہ کے لیئے ہمیں فتنوں کی آماجگاہ نہ بنا۔ اور ہمیں اپنی رحمت کے صدقے کفر پیشہ لوگوں سے بچا لے۔[۹۹]

اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کو حکم دیا کہ مصر میں اپنی قوم کے لیئے گھر بناؤ۔ اور گھروں کو قبلہ رُو بناؤ۔ اور نماز قائم کرو۔ اور اہل ایمان کو کامیابی کی خوشخبری دو ؏ ۸

مفردات کے معانی

ذریتہ۔ اصل میں چھوٹے بچوں کو کہتے ہیں۔ اگرچہ عرف میں چھوٹوں اور بڑوں دونوں کے لیئے استعمال ہوتا ہے۔ اصل میں اسم جمع ہے۔ لیکن مفرد اور جمع دونوں کے لیئے بولا جاتا ہے۔ ذریتہ کا مادہ کیا ہے۔ اس میں تین خیال ہیں۔ ایک یہ کہ ذرأ سے بنا ہے اس کے معنے پھیلانے اور پیدا کرنے کے ہیں۔ ہمزہ متروک ہے جیسے برأ سے بریۃ دوسرے یہ کہ اس کی اصل ذرویۃ ہے۔ تیسرے یہ کہ ذرٌ سے فعلیۃ کے وزن پر ہے۔ جس کے معنے بکھیرنے کے ہیں۔ جیسے قمریۃ۔

توکلوا تم بھروسہ کرو توکل سے ہے۔ جس کے معنے بھروسہ کرنے کے ہیں۔ شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں توکل کی یہ تعریف کی ہے کہ توکل یہ ہے کہ بندہ پر یقین اس قدر غالب ہو کہ جلب منافع اور دفع مضار کے اسباب اس کی محنت و کوشش میں سرد پڑ جائیں لیکن اللہ سبحانہ نے اپنے بندوں کے لیئے جو حدیں مقرر کی ہیں ان پر اعتماد کے بغیر ان میں کوتاہی نہ کرے اور ان پر عمل پیرا ہو۔ علامہ مجدالدین فیروز آبادی بصائر ذوی التمیز میں لکھتے ہیں کہ تمام اولیائے کرام کا اس پر اتفاق ہے کہ اسباب کی پابجائی کے توکل منافی نہیں ہے بلکہ اسباب پر عمل پیرا ہوئے بغیر توکل صحیح ہی نہیں ہے۔ اگر تارک اسباب ہو کر دعویٰ توکل کرتا ہے تو یہ سرتا سر بطالت ہے اور توکل فاسد ہے صوفیا میں حضرت سہل نے کیسی پیاری بات فرمائی ہے۔ اسباب میں رخنہ اندازی سنتہ میں رخنہ اندازی ہے۔ اور توکل میں رخنہ ایمان میں رخنہ ہے۔ توکل حضور اقدس کا حال ہے اور اسباب کی پابجائی آپ کی سنت ہے۔ حال پر عمل کرنے والے کو تارک سنتہ نہ ہونا چاہیے

اسی لیئے امام احمد فرماتے ہیں کہ توکل دل کے اعمال میں سے ایک عمل ہے اس کا جوارح سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تفصیل حافظ ابن القیم کی مدارج السالکین علامہ مرتضیٰ زبیدی کی اتحاف السادۃ المتقین میں ہے۔

حضرت موسیٰ اور اُمت اجابت

حضرت موسیٰ کی مخاطب دو اُمتیں ہیں۔ ایک امت دعوت دوسرے اُمت اجابت۔ امت دعوت۔ فرعون۔ مصر کی قبطی قوم اور فرعون کے اعیان حکومت ہیں اور امت اجابت سے مُراد خود بنی اسرائیل ہیں۔ ان کا تعلق خانوادۂ نبوت سے ہے۔ یہ رسولوں کی گود میں پلی ہوئی اُمت ہے حضرت ابراہیم کے حضرت اسحاق کے حضرت یعقوب ان کا ہی نام اسرائیل ہے ان کی اولاد کو بنی اسرائیل کہتے ہیں۔ بنی اسرائیل کا عروج صدیوں تک رہا ہے۔ یہ سلسلہ وحی و نبوت کے قائل تھے اور عقیدۂ جزا و سزا رکھتے تھے۔ علوم انبیاء اور معارف اولیاء کے حامل تھے جن شارحین قرآن نے الا ذریۃ من قومہ کی ضمیر کا مرجع فرعون کو قرار دیا ہے وہ اس سے اُمت دعوت مراد لیتے ہیں۔ یہ ہیں حافظ ابن کثیر اور جن لوگوں نے ضمیر کا مرجع آیت میں مذکور حضرت موسیٰ کو قرار دیا ہے وہ اُمت سے امت اجابت مراد لیتے ہیں یہ حافظ ابن جریر وغیرہ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اُمت سے امت اجابت مراد ہے یعنی بنی اسرائیل اس سے پہلے حضرت موسیٰ کے مخاطبات امت دعوت سے تھے اب امت اجابت سے شروع ہوئے ہیں۔ امت دعوت کے وقائع میں کفار مکہ کو یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ دعوت حق کے ابتدائی مراحل میں حق و باطل کی قوتوں میں بظاہر جو تناسب نظر آتا ہے اس سے دھوکہ نہ کھانا چاہیئے۔ حق و باطل کی آویزش کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ نبوت کا آغاز ایک ہی قوم سے ہوتا ہے۔ اور بغیر کسی سامان کے اس باطل کے خلاف لڑائی شروع کرتی ہے جس کی پشت پر بڑی بڑی قوموں اور حکومتوں کی طاقت ہوتی ہے پھر بھی بالآخر حق کا بول بالا ہوتا ہے۔ نیز اس میں یہ بھی بتایا ہے کہ داعی حق کے مقابلے میں جو چالیں چلی جاتی ہیں اور جن تدبیروں سے دعوت کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ وہ کس طرح الٹ جاتی ہیں۔ اور یہ کہ اللہ سبحانہ منکرین حق کی ہلاکت کا آخری فیصلہ کرنے سے پہلے ان کو کتنی کتنی طویل مدت تک سنبھلنے اور درست ہونے کے مواقع دیتا چلا جاتا ہے۔ اور جب کسی تنبیہ کسی سبق واقع اور کسی روشن نشانی سے وہ

اثر نہیں لیتے تو پھر انہیں کیسی عبرتناک سزا دیتا ہے۔

۹۷ حضرت موسیٰ کی قوم میں سے حضرت موسیٰ کی بات چند نوجوانوں نے مانی۔ فرعون اور اس کے اعیان کے اس خوف سے کہ کہیں ان کو کسی فتنہ میں نہ ڈال دے اور بلاشبہ فرعون ملک میں بڑا ہی سرکش تھا اور اس میں شک نہیں کہ فرعون ظلم و استبداد میں چھوٹ تھا۔ بنی اسرائیل فرعونیوں کے ہاتھوں سخت ذلت اور مصیبت اٹھا رہے تھے۔ اور پرانی پیشین گوئیوں کے مطابق منتظر تھے کہ فرعون کا خاتمہ کرنے اور اس کی سلطنت کا تختہ اُلٹنے والا اسرائیلی پیغمبر مبعوث ہو۔ موسیٰ علیہ السلام ٹھیک اسی شان سے تشریف لائے جس کا انہیں انتظار تھا۔ اس لئے تمام بنی اسرائیل حضرت موسیٰ کی بعثت کو نعمت عظمیٰ سمجھتے تھے۔ وہ دل سے حضرت موسیٰ کو سچا مانتے اور ان کی عزت کرتے تھے۔ مگر یہ آدمی فرعون اور فرعونی سرداروں سے خوف زدہ تھے اس لیئے ابتدا میں شرعی طور پر ایمان نہیں لائے وقت کے منتظر رہے کہ جس وقت حق کا غلبہ ہوگا مسلمان ہو جائیں گے۔ بنی اسرائیل کے تھوڑے سے نوجوانوں نے ہمت کر کے باوجود فرعونیوں سے خائف ہونے کے اپنے اسلام کا اظہار کیا۔ چند گنے چنے قبطی بھی جو فرعون کی قوم سے تھے مشرف با ایمان ہوئے۔ آخر میں جب موسیٰ علیہ السلام کا اثر اور حق کا غلغلہ بڑھتا گیا تب پوری قوم بنی اسرائیل کی جو تقریباً چھ لاکھ بالغ مردوں پر مشتمل تھی مسلمان ہوگئی یہاں ابتدا کا قصہ بیان ہوا ہے۔ سرداروں سے مراد یا تو فرعون کے حکام و عمال ہیں۔ یا بنی اسرائیل کے وہ سردار ہیں جو خوف و طمع کی وجہ سے اپنی ہم قوموں کو فرعون کی مخالفت سے ڈراتے تھے۔ اور بچلا دینے کا مطلب ہے کہ فرعون ایمان لانے کی خبر سنکر سخت ایذائیں پہنچائے۔ جن سے گھبرا کر ممکن ہے کہ بعض ضعیف القلب راہ حق سے پھسل جائیں لہ یہاں سے حضرت موسیٰ کا روئے سخن امت اجابت بنی اسرائیل کی طرف ہو گیا ہے اس صورت میں قومہ کی ضمیر کا مرجع بنی اسرائیل ہوں گے۔ اور معنے یہ ہوں گے کہ بنی اسرائیل میں سے کچھ نوجوانوں نے حضرت موسیٰ کی بات مانی۔ اس پہ بزرگوں کو یہ شبہ ہوا ہے کہ بنی اسرائیل کا پہلے ہی حضرت موسیٰ پر ایمان تھا۔ اس لیئے ان کے ایمان لانے کا تذکرہ بے معنی ہے۔ اس لیئے انہوں نے قومہ کی ضمیر کا مرجع فرعون کو قرار دیا اور مطلب یہ بتایا کہ فرعونیوں میں سے کچھ نوجوان حضرت موسیٰ پر ایمان لائے لیکن قرآنی سیاق اس کی تائید میں نہیں ہے آگے یا قوم ان کنتم آمنتم باللہ آ رہا ہے۔ جو پوری قوم کے ایمان کی خبر دے رہا ہے۔ ظاہر ہے یہ فرعونی

نہیں بنی اسرائیل ہیں۔ اصل بات یہاں آیت میں آئے ہوئے لفظ ایمان سے بگڑی ہے ایمان امانت سے بنا ہے۔ اور عربی میں اس کے استعمال دو ہیں ایک ایمان با کے ساتھ آتا ہے۔ جیسے امنا باللہ اس کے معنے تصدیق کرنا۔ باور کرنا کسی کی سچائی کا یقین کرنا۔ اور ایک لام کے ساتھ ایمان کا استعمال ہوتا ہے اس کے معنے بات ماننا۔ قرآن یہاں دوسری بات بتا رہا ہے۔ کہ حضرت موسیٰ کو نبی نہیں بلکہ فرعون کے ظلم و فساد اور جبر و استبداد کا تختہ اُلٹنے کے لیے بنی اسرائیل میں سے حضرت موسیٰ کی بات کچھ نوجوانوں نے مانی۔ اس سے اصل مطلب یہ ہوا کہ بنی اسرائیل کی پوری قوم میں سے چند نوجوانوں کو چھوڑ کر کوئی بھی اس بات پر آمادہ نہ تھا کہ فرعونی استبداد کے خلاف ان کی دعوتی جدوجہد میں ہاتھ بٹائے۔

اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ کی نبوت نہیں مانتے تھے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ حضرت موسیٰ کا اس جدوجہد میں ساتھ دے کر اپنے آپ کو فرعونی مظالم کا تختہ مشق نہ بنانا چاہتے تھے۔ اگرچہ بنی اسرائیل نسبی لحاظ سے نبیوں کی امت اور مسلمان تھے لیکن ایک مدت دراز کی غلامی نے ان میں اتنی سکت نہ چھوڑی تھی کہ کفر و ضلالت کی فرماں روائی کے مقابلے میں ایمان و ہدایت کا علم لے کر خود اٹھیں یا جو اٹھائے اس کا ساتھ دیں

اس سے امت اجابت کو یہ سبق سکھایا جا رہا ہے کہ جب کبھی عزائم و مقاصد کی خاطر شدائد کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وطن کے بڑے بوڑھے بہت کم کام آتے ہیں۔ زیادہ تر نئی نسل کے نوجوان ہی آگے بڑھتے ہیں کیونکہ بڑے بوڑھوں کی ساری زندگیاں ظلم و فساد کی آب و ہوا میں بسر ہو چکی ہوتی ہیں اور محکومی کی حالت میں رہتے رہتے عافیت کوشی کے عادی ہو جاتے ہیں۔ البتہ نوجوانوں میں نیا دماغ ہوتا ہے۔ نیا خون ہوتا ہے۔ نئی امنگیں ہوتی ہیں۔ ان کو مصائب اور تکلیفوں کا اندیشہ مرعوب نہیں کرتا ہے وہی پہلا قدم اٹھاتے ہیں۔ پھر سارے ان کے پیچھے چلنے لگتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہوئے فرعون کے قہر و استبداد نے بنی اسرائیل کے بڑے بوڑھوں کی ہمتیں سلب کر دی تھیں وہ شکر گذار ہونے

ا۔ افادات شیخ الاسلام

کی جگہ ایسی شکائتیں کرتے لیکن نوجوانوں کا حال یہ نہ تھا۔ ان میں ایک گروہ نکل آیا جنہوں نے حضرت موسیٰ کے احکام کی تعمیل کی۔

دراصل محکومانہ زندگی کا پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ عزم وہمت کی روح پژمردہ ہوجاتی ہے لوگ غلامی کی ذلت آمیز زندگی پر قانع ہوجاتے ہیں اور طلب وسعی کی راہوں سے جی چرانے لگتے ہیں۔ یہی حال بنی اسرائیل کا ہوگیا تھا۔ عرصہ تک مصریوں کی غلامی میں رہنے سے اس درجہ مسخ ہوگئے تھے۔ کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ آزادی وکامرانی کی طلب میں ان حقیر راحتوں سے کیوں ہاتھ دھو بیٹھیں جو غلامی کی حالت میں میسر آرہی ہیں۔ اس سے حضرت موسیٰ نے ان کو توکل اور اللہ پر اعتماد کی تلقین کی ہے۔

قرآن نے یہاں یہ بھی انکشاف کردیا ہے کہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ کے احکام کی تعمیل کیوں نہیں کررہے تھے کیا اس لیئے کہ ان کے دل حضرت موسیٰ کی نبوت پر ایمان سے خالی ہو گئے۔ قرآن بتارہا ہے کہ اصلی وجہ یہ تھی علی خوف من فرعون و ملائھم ان یفتنھم کہ ان کو فرعون اور اعیان حکومت کی طرف سے یہ خطرہ تھا کہ حضرت موسیٰ کی حمایت کے جرم میں ان کو کسی مصیبت میں نہ ڈال دے کیوں کہ ان فرعون لعال فی الارض وانہ لمن المسرفین یعنی ان کا خوف کھانا ہی کچھ بیجا نہ تھا کیونکہ اس وقت ملک میں فرعون کی مادی طاقت بہت زیادہ تھی اور اس کا ظلم وعدوان اور کفر و طغیان حد سے تجاوز کرچکا تھا کمزوروں کو ستانے کے لیئے بالکل چھوٹ اور بے لگام تھا[۱]
اس سے فما آمن کی تعبیر سے یہ نتیجہ نکالنا ہرگز درست نہیں ہے کہ بنی اسرائیل مسلمان نہیں تھے۔ علامہ آلوسی کا یہ کہنا بالکل برمحل ہے کہ یہ داستان آغاز نبوت کی ہے۔

توکل علی اللہ کی تلقین

۸۴ اور حضرت موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا، لوگو! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو اور فی الواقع اسی کے فرماں بردار ہو تو بس اسی پر بھروسہ کرو یعنی گھبرانے اور خوف کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک فرماں بردار مومن کا کام اپنے مالک کی طاقت پر بھروسہ کرنا ہے جسے اللہ سبحانہ کی لامحدود قدرت ورحمت پر یقین ہوگا۔ وہ یقیناً ہر معاملہ میں اللہ سبحانہ پر اعتماد

[۱] افادات شیخ الاسلام

کرے گا۔ اور اس اعتقاد کا اظہار جب ہی ہو سکتا ہے کہ بندہ اپنے کو بالکلیہ اللہ سبحانہ کے سپرد کر دے اسی کے حکم پر چلے اور تمامی جد و جہد میں صرف اسی پر نظر رکھے ؎۱
حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں ۔ قال یعنی اسرائیل حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل سے کہا۔
اور علامہ آلوسی کہتے ہیں قال موسیٰ لما رای تخوف المومنین جب حضرت موسیٰ نے اہل ایمان میں فرعون کا خوف دیکھا تو کہا اے میری قوم۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی بھی علامہ آلوسی کے ہمزبان ہیں ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ کا یہ خطاب فرعونیوں اور قبطیوں میں سے مشرف باسلام ہونے والوں سے نہیں ہو سکتا جب کہ ان کی تعداد بقول علامہ قرطبی فرعون کی بیوی بیٹی خازن اور خازن کی بیٹی سے زیادہ نہ تھی۔ حضرت موسیٰ کے مخاطب بنی اسرائیل ہیں یہ خطاب صاف بتا رہا ہے کہ بنی اسرائیل پورے کے پورے مسلمان تھے ان مسلمانوں ہی کو جن کو فرعون کی طاقت کا اندیشہ حضرت موسیٰ کی آواز پر لبیک کہنے میں رکاوٹ بنا حضرت موسیٰ سمجھا رہے ہیں۔ سورۂ اعراف میں بھی ایسے ہی تلقین دوسرے پیرا سے میں گذر چکی ہے بات ایک ہے صرف تعبیر میں بلاغت ہے یہاں جس بات کو فما آمن لموسیٰ الا ذریۃ من قومہ کے انداز میں ہی پیش کیا ہے اوذینا اعراف میں اسی بات کو اس طرح پیش کیا گیا۔ اوذینا من قبل ان تاتینا و من بعد ما جئتنا۔ اے موسیٰ تیرے آنے سے پہلے اور تیرے آنے کے بعد ہمیں بڑی تکلیفیں دی گئی ہیں۔

اُس جگہ تلقین کا پیرایہ جو اختیار کیا ہے وہ یہ ہے۔

استعینوا باللہ واصبروا

اللہ سے مدد مانگو اور ڈٹ جاؤ

استعینوا کو یہاں یا قوم ان کنتم آمنتم باللہ فعلیہ توکلوا ان کنتم مسلمین یعنی اگر تم واقعی مسلمان ہو۔ جیسا کہ تمہارا دعویٰ ہے تو فرعون کی طاقت سے خوف نہ کھاؤ۔ بلکہ اللہ کی طاقت پر بھروسہ کرو۔

اس میں تین باتوں کی تلقین کی گئی ہے۔ ایک ایمان دوسرے اسلام اور تیسرے توکل ایمان سے مراد تصدیق ہے اور اسلام سے طاعت میں اخلاص اور توکل سے کاموں کی کامیابی میں اللہ پر اعتماد ہے۔ اس میں دو شرطیں اور ایک جزا ہے ایمان و اسلام شرطیں

؎۱ افادات شیخ الاسلام

اور توکل جزا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ پر پیش پا افتادہ حالات کے بارے میں اعتماد کرنا تمہارے ایمان کا ناگزیر تقاضا ہے۔ اس کے بغیر ایمان صرف ایک دعویٰ ہے جس کی دلیل کوئی نہیں اور توکل کا موجود ہونا اللہ سے تمہارے تعلقات کے مخلصانہ ہونے کی علامت ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ سے کوئی کہے کہ اگر رشید آپ کو بلائے تو آپ بشرط قدرت ضرور جائیں۔ اس کی دعوت کا قبول کرنا رشید کے دعوت دینے پر موقوف ہے اور خود دعوت کا مدار قدرت ہے۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ یہ انداز بیان جزا کے شرط پر مرتب کرنے میں مبالغہ کا فائدہ دیتا ہے۔

یوں تو دنیا کا کوئی کام اور مقصد نہیں جو بغیر کسی جدوجہد کے محض زبانی دعووں سے پورا ہو جائے۔ مگر وہ مقصد جو اپنی عظمت میں اپنی آپ نظیر ہو۔ اس کے لیئے سعی و جہد کی کوئی معمولی مقدار کافی نہیں ہے۔ اللہ پر ایمان اس کی بندگی اس کے دین کی پیروی اور پھر اسے قانون و سیاست میں برسر اقتدار لانے کا مقصد وہ مقصد ہے۔ جس کے لئے بڑی ہی پختہ عزیمت کی ضرورت ہے۔ حضرت موسیٰ فرعون کے مقابلے میں یہی مقصد لے کر آئے ہیں۔ اس کی راہ میں مشکلات مصائب اور رکاوٹوں کا ہونا یقینی ہے حضرت موسیٰ نے اسی کی طرف یہاں ان کنتم امنتم باللہ فعلیہ توکلوا ان کنتم مسلمین فرما کر اشارا کیا ہے۔ اس راہ میں عوام کے فریب نعروں طنز وافترا جان ومال کا نقصان اور محبوب رجحانات کی قربانیوں سے سب کو ہی دوچار ہونا پڑتا ہے ہمیں بھی بھی اس میدان سے گذرنا ہوگا۔ اس میدان میں کامیابی کا راز صرف اور صرف اللہ سبحانہ پر ایمان ویقین۔ اس کی فرمان برداری اور اس پر بھرپور اعتماد و توکل میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فرعون کی طاغوتی طاقت سے پریشان نہ ہو۔ اللہ سبحانہ سے صحیح عابدانہ تعلقات استوار کرو۔ اور توکل کا دامن ہاتھ سے نہ دو۔ فتنوں اور آزمائشوں کی منزل توکل ہی سے سر ہوتی ہے۔ جس قدر اللہ پر اعتماد ویقین زیادہ ہوگا۔ اسی قدر اللہ کی مدد زیادہ ہوگی۔

نوجوانوں کا بھرپور اخلاص

۸۶ انہوں نے کہا کہ ہم نے اللہ ہی پر بھروسہ کیا۔ اے ہمارے رب اس ظالم گروہ کے

لیئے ہمیں فتنوں کی آماجگاہ نہ بنا اور ہمیں اپنی رحمت کے صدقے کفر پیشہ لوگوں سے بچالے.
موسیٰ علیہ السلام کی نصیحت پر انہوں نے اخلاص کا اظہار کیا کہ بے شک ہمارا بھروسہ خالص خدا پر ہے اسی سے دعا کرتے ہیں کہ ہم کو ان ظالموں کیلئے تختہ مشق نہ بنا. اس طرح کہ ہم پر اپنے زور طاقت سے ظلم ڈھاتے رہیں. اور ہم ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں ایسی صورت میں ہمارا دین ہی خطرے میں ہے. اور ان ظالموں یا دوسرے دیکھنے والوں کو یہ موقعہ ملے گا کہ اگر ہم حق پر نہ ہوتے تو تم پر ایسا تسلط و تفوق کیوں حاصل ہوتا اور تم اس قدر پست اور ذلیل کیوں ہوتے یہ خیال ان گمراہوں کو اور زیادہ گمراہ کر دے گا گویا ایک حیثیت سے ہمارا وجود ان کے لیئے فتنہ بن جائے گا. اور نجات کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں کافروں کی غلامی اور محکومی سے نجات دے اور دولت آزادی سے مالا مال فرما.[۱]

دعا سے پہلے حضرت موسیٰ کی دعوتِ توکل کا جواب علی اللہ توکلنا سے دیا ہے اور صیغہ ماضی میں دیا ہے صیغہ مستقبل میں نہیں دیا. یعنی کہا کہ ہم نے اللہ پر بھروسہ کر لیا یہ نہیں فرمایا کہ ہم اللہ پر بھروسہ کریں گے. آلوسی نے اس فرق تعبیر سے یہ بات خوب سمجھی ہے کہ یہ لوگ اپنے ایمان و اخلاص میں واقعاتی حقیقت رکھتے تھے. اور صرف یہی نہیں بلکہ تعبیر بھی حصر و قصر والی ہے یعنی ہمارا اعتماد صرف اللہ ہی پر ہے اور نہ اللہ کے سوا کسی پر نہیں ہے.

قرآن میں عبادت و توکل اور ایمان و توکل میں ہم آہنگی بتائی ہے مثلاً فاعبدہ وتوکل علیہ اور قل ھو الرحمٰن امنا بہ و علیہ توکلنا. بنی اسرائیل نے اسی کی تعمیل میں اعلان کیا. عَلَى اللهِ تَوَكَّلْنَا

توکل وکل سے باب تفعل ہے وکیل اسی سے ہے اس کے لفظی معنے بھروسہ کرنے کے ہیں اور اصطلاح میں اللہ سبحانہ پر بھروسہ کرنے کو کہتے ہیں لیکن کس بات میں بھروسہ کرنا کسی کام کے کرنے میں یا نہ کرنے میں. عشق مزاج صوفیوں نے ترک عمل اور اسباب و تدابیر سے بے پروائی اور خود کام نہ کرکے دوسروں کے سہارے جینے کا نام توکل کیا ہے. حالانکہ توکل نام ہے کسی کام کو پورا ارادہ و عزم اور تدبیر و کوشش کے ساتھ انجام دینے اور یہ یقین رکھنے

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

ہاکہ اگر اس کام میں بھلائی ہے تو اللہ سبحانہ اس میں ضرور ہی ہمیں کامیاب فرمائے گا اگر اگر تدبیر اور جدو جہد چھوڑ دینے کا نام توکل ہوتا تو دنیا میں لوگوں کو سمجھانے کے لیئے اللہ سبحانہ پیغمبر روانہ نہ کرتا اور نہ انبیا کو دعوت وتبلیغ کی خاطر جدوجہد، محنت و کوشش کا حکم دیتا اور نہ اس راہ میں جان و مال کی قربانی کو کہتا اور نہ رسول کو ایک ایک قبیلہ میں جاکر دعوت کے پیغام سنانے کی ضرورت ہوتی۔ بہر حال توکل نام ہے وہ سب کچھ کر گذرنے کا جو اپنے بس میں ہو اور جو اپنے بس میں نہ ہو اس کو اللہ ہی سے مانگنے کا۔ یا توکل نام ہے۔ اسباب کی حد تک سب کچھ کرنے کا اور نتائج کے لیئے اسباب پر نہیں مگر اللہ پر بھروسہ اور اعتماد کرنے کا۔ یہی مطلب ہے علیہ توکلوا کے قصر کا

اس کے بعد فرمایا۔ ربنا لا تجعلنا فتنۃ للقوم الظالمین آیت کی تشریح تو اجمالی شیخ الاسلام کی زبان سے آپ سن چکے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ دعا کا یہ پیمانہ بڑے وسیع مطالب اپنی گود میں لیئے ہوئے ہے۔ گمراہی اور بغاوت کا جب اقتدار عام ہو جاتا ہے تو اس وقت کچھ ارباب عزیمت حق کا بول بالا کرنے کے لیئے اٹھتے ہیں۔ ان کو کئی قسم کے ظلم پیشہ لوگوں سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے ایک طرف وہ مشینری ہوتی ہے جس کے ذریعے باطل کی گاڑی چل رہی ہے جو پوری طاقت سے ان داعیان حق کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے درپے ہوتی ہے۔ دوسری ان مردم شماری کے رجسٹر میں درج ہونیوالے حق پرستوں کا ایک گروہ ہوتا ہے جو ایمان کا تو مدعی ہوتا ہے مگر ایمان کے تقاضے پورے نہیں کرتا۔ یعنی اسلام کو اجتماعی زندگی میں قائم کرنے کو غیر ضروری لاحاصل یا حماقت سمجھتا ہے اور ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی اس خیانت پر مبنی زندگی کو کسی نہ کسی طرح لوگوں میں خوبصورت بنا کر پیش کرے تیسری طرف وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی حیثیت صرف تماشائی کی ہوتی ہے۔

اس صورت حال میں ان داعیان حق کی ناکامی اور مصیبت ان سب کے لیئے کئی طرح سے فتنہ بن جاتی ہے داعیان حق کو اقتدار پر قابض باطل کچل دے تو برسر اقتدار باطل پرست طبقہ کہتا ہے کہ حق ہمارے ساتھ تھا۔ نہ کہ ان لوگوں کے جو ناکام ہو گئے۔ دوسرے مردم شماری کے رجسٹر میں ایمان کی کھو کھلا دعویٰ کرنے والے کہتے ہیں کہ پہلے ہی کہتے تھے کہ طاقت سے ٹکر نہ لانی چاہیئے اس کا حاصل اس کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ تیسرا تماشائی طبقہ یہ فیصلہ کر دیتا ہے

کہ حق پر وہی ہے جو غالب آگیا۔ اس طرح اگر داعیان حق اپنی دعوت میں کوئی غلطی کر جائیں یا مصائب کو برداشت نہ کرنے کی وجہ سے ان میں کسی قسم کی کوئی کمزوری نظر آجائے تو بہت سے لوگوں کو باطل سے چمٹنے کیلئے ایک بہانہ مل جائے اور عرصہ دراز تک حق کی آواز کو بلند ہونے کے امکانات ختم ہو کر رہ جائیں۔ اس دعا میں بڑی معنویت ہے کہ اے مولیٰ ہمیں غلطیوں اور خامیوں سے بچا اور ہماری محنت کو ٹھکانے لگا۔ تاکہ ہمارا وجود تیری مخلوق کے لیئے سبب خیر بنے نہ کہ ظالموں کے لیئے سرکشی کا ذریعہ۔ اس کے بعد دعا میں فرمایا اور اپنی رحمت کے صدقے ہمیں کفر پیشہ لوگوں سے بچالے۔ یعنی ان کی غلامی اور محکومی سے ہم کو نجات دے اور دولت آزادی سے مالا مال کر۔ اس سے معلوم ہوا کہ کفر کی حاکمیت مسلمانوں کے لیئے فتنہ ہے اس سے بچنے کے لیئے محنت کرنا اور محنت کرتے ہوئے اللہ سے اچھے نتائج کے لیئے دعا کرنا ایمان واسلام کا ناگزیر تقاضا ہے۔

آیت میں بلیغانہ لطافت یہ ہے کہ شرطیں دو ہیں پہلے ان کنتم امنتم باللّٰہ اور دوسری ان کنتم مسلمین اور دونوں کے درمیان جزا ہے۔ شارحین قرآن یہاں حیران ہیں۔ اور طرح طرح کے الجھاؤ میں پڑ گئے ہیں۔ اور آیت میں بیان کردہ بات کو ایک حکم کو دو شرطوں کے معلق کرنے کے مترادف قرار دیا ہے۔ اردو شارحین قرآن میں صرف مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے اس طرف توجہ فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں کہ

اس آیت میں ایک حکم توکل کو دو شرطوں پر معلق فرمایا۔ دو شرطوں کے درمیان اس لئے ذکر فرمایا کہ نفس توکل کا وجوب تو نفس ایمان پر موقوف ومعلق ہے اور صدق توکل ظہور اسلام یعنی تفویض وتسلیم پر موقوف ومعلق ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے بھی بات اس انداز میں بیان فرمائی ہے۔

یہ حکم کو دو شرطوں میں معلق کرنے والی بات نہیں بلکہ اصل ایمان پر توکل کو معلق کیا ہے۔ اور حصول توکل کے لیئے اسلام کی شرط ہے۔

مطلب یہ ہے کہ توکل ایک قلبی کیفیت ہے اور ایک اس کی عملی زندگی میں مظاہرہ ہے عملی زندگی میں ظہور کیلئے اسلام شرط ہے اور قلب میں کیفیت کے لئے ایمان شرط ہے۔ دونوں چیزوں میں بہت بڑا فرق ہے گویا ایمان کا لازمی تقاضا اللہ سبحانہ پر توکل ہے اور

اس توکل کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو اپنے رب کے سپرد کر دے۔
لیکن علامہ شیخ محمد طاہر ابن عاشور کو شارحین قرآن کے بیان کردہ مطلب سے اختلاف ہے۔
وہ التحریر والتنویر میں فرماتے ہیں
یہ شرط پر شرط کو معلق کرنے والی بات ہے۔ ایمان تو نبوت کو مان لینے کا نام ہے۔ اور یہ خالصتہ دل کا عمل ہے اور یہ قلبی عمل شرعًا اسلام کے بغیر قابل اعتبار نہیں ہے اور اسلام نام ہے اس اقرار و اعتراف کا جو ایمان قلبی کو ظاہر کرے۔ اور یہ اقرار نا قابل اعتبار ہے جب تک تصدیق قلبی نہ ہو۔ لہذا ایمان اگر قلبی انفعال ہے تو اسلام جسمانی فعل ہے اور یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ کیونکہ کسی کی تصدیق قلبی کا علم بغیر اقرار اور طاعت کے ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ کسی بات میں واقعیت ممکن ہی نہیں جب تک اندر کے مطابق نہ ہو۔ قرآن ہی اس کا موید ہے۔ فان قالت الاعراب آمنا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم اور صحیحین میں حدیث جبریل ہی اس کی موید ہے۔ آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر وہ توکل نہ کریں گے تو مومن تو ہوں گے۔ مگر مسلم نہ ہوں گے اور نہ یہ مطلب ہے کہ اگر توکل کریں گے تو مسلم ہوں گے مومن نہ ہوں گے۔ آیت میں فعلیہ توکلوا دونوں شرطوں کی جزا ہے۔ آیت کا محمل یہی ہے اور بس۔
نظم الدرر میں علامہ بقاعی نے بھی اسی کی ہمنوائی کی ہے۔

اجتماعی زندگی کی بنیاد

۸۷ اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کو حکم دیا کہ مصر میں اپنی قوم کے گھر بناؤ۔ اور ان گھروں کو قبلہ بناؤ۔ اور نماز قائم کرو۔ اور اہل ایمان کو کامیابی کی خوشخبری دے دو۔
حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ فرعون کی ہلاکت کا وقت آیا تو حکم ہوا کہ اپنی قوم بنی اسرائیل کو ان میں شامل نہ رکھو۔ اپنا محلہ جدا بساؤ کہ آگے ان پر آفتیں آنے والی ہیں۔ اس وقت تمہاری قوم ظاہری طور پر بھی آفتوں سے الگ تھلگ رہے۔ مفسرین قرآن نے بتوا لقومکما بمصر بیوتا سے مراد یہ لی ہے کہ اپنے مکانوں میں کھڑے رہو۔ اور ان میں سے بعض کو عبادت کے لیے مخصوص کر لو۔ کیونکہ فرعون نے مسجدیں اور عبادت گاہیں خراب کر دی تھیں

کوئی باہر نکل کر اللہ سبحانہ کی عبادت نہ کرسکتا تھا۔ بحالت مجبوری حکم ہوا کہ مکان میں کوئی جگہ نماز کے لیئے مخصوص کرلی جائے جو قبلہ رو ہو۔ نماز ترک مت کرو کہ اسی کی برکت سے اللہ سبحانہ کی مدد آتی ہے۔ واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ۔ ہجرت سے پہلے مکہ میں مسلمانوں کا ایسا ہی حال تھا۔ اسی سے دنیا میں فتح و نصرت کی اور آخرت میں نجات و رضائے الٰہی کی خوشخبری ملے گی لـہ

پس آیت کی ایک تشریح تو یہی ہے جو آپ نے شیخ الاسلام کی زبان قلم سے سُنی ہے اس کے علاوہ بھی شارحین قرآن نے اس آیت کے مطالب پر دادِ تحسین دی ہے۔

اور مخدوم مہائمی نے ان تبوءا لقومکما بمصر بیوتا کا مطلب یہ بتایا ہے کہ اندرون شہر گھر بناؤ۔ شہر سے باہر گھر نہ بناؤ یا یہ مطلب ہے کہ تم بدستور اپنے گھروں میں ٹھہرے رہو۔ اور فرعونیوں کے خوف سے اپنے گھروں کو نہ چھوڑو اور آیت میں بیوتا چونکہ نکرہ آیا ہے اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ نئے گھر بنانے کا حکم ہے اگر ٹھہرنے کا حکم پہلے ہی گھروں کا ہوتا تو تعبیر یہ ہوتی ان تبوء القومکما بمصر بیوتکم مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل تو پہلے ہی مکانوں میں رہتے تھے اور شہر ہی میں رہتے۔ شہر میں رہنے والوں کو شہر ہی میں گھر بنانے کے حکم کے کیا معنی۔

علامہ محمد طاہر ابن عاشور نے اپنی مایہ ناز تفسیر التحریر والتنویر میں اس کو اس طرح سمجھایا ہے۔ کہ جن گھروں کے بنانے کا ان کو حکم ہوا تھا وہ خیمے یا جھونپڑیاں تھیں اور یہ ان گھروں کے علاوہ ہیں جن میں بنی اسرائیل پہلے رہتے تھے یہ گویا مستقبل میں مصر چھوڑنے کی تیاری کرائی جارہی تھی۔

یہ بات دھیان میں رہے کہ مصر شہر کا نام نہیں ملک کا نام ہے۔

اور کچھ لوگوں نے مکان بنانے کا مطلب یہ بتایا کہ مصر میں کچھ مکان اس غرض کے لیئے بنائے جائیں کہ جہاں اجتماعی طور پر اکٹھے ہو کر نماز ادا کی جائے۔ کیونکہ ایک بگڑی ہوئی امت کے لیئے دینی رُوح کو پھر سے زندہ کرنے اور اس کی منتشر طاقت کو از سر نو مجتمع کرنے کے لیئے اسلامی طرز پر جو کوشش بھی کی جائے گی اس کا پہلا قدم یہی ہوگا۔ کہ اس میں نماز باجماعت کا نظام قائم کیا جائے۔ اس صورت میں آیت کا منشا یہ ہوگا کہ مصر کے مختلف حصوں میں کچھ مکانات مسجد کی

حیثیت سے بنائے جائیں جن میں بنی اسرائیل اوقات نماز میں مجتمع ہو کر نماز ادا کریں۔

اور کچھ بزرگوں نے آیت کے معنے حضرت ابراہیم نخعی اور عکرمہ کے حوالہ سے حضرت عبداللہ بن عباس نے یہ بتائے ہیں کہ اپنے گھروں میں مسجدیں بنائیں اور ان میں نماز ادا کریں۔ امام بغوی نے اس کو اکثر مفسرین کا مختار بتایا ہے اور اس کا پس منظر یہ بتایا ہے کہ بنی اسرائیل عبادت صرف عبادت گاہوں میں کرتے تھے اور یہ عبادت گاہیں شہری زندگی میں سرعام اور سب کی نگاہوں میں ہوتی ہیں۔ حضرت موسیٰ کی تشریف آوری کے بعد بنی اسرائیل کی عبادت گاہوں کو فرعون نے سرکاری طور پر خلاف قانون قرار دیا اور ان کو گرا دیا۔ اللہ سبحانہ نے حضرت موسیٰ کے حوالہ سے ان کو حکم دیا کہ گھروں میں عبادت گاہیں بنائیں اور نماز پڑھیں۔ یعنی کام بھی ہو جائے اور خلاف قانون کا اندیشہ بھی نہ رہے۔

اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ مطلب دو ہیں ایک یہ کہ مکان رہائش کے لیئے بناؤ دوسرے یہ کہ مکان عبادت کے لیئے بناؤ۔ ان دونوں کو ذہن میں رکھ کر آگے آنے والے فقرے کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

واجعلوا بیوتکم قبلۃ جو لوگ مکان کو عبادت کے لیئے کہتے ہیں وہ اس فقرے کے معنے یہ بتاتے ہیں کہ مکانوں کو قبلہ رو بناؤ اور ان میں نماز پڑھ لیا کرو۔ تاکہ تمہاری نمازوں کا فرعون کی سرکار کو پتہ نہ ہو اور مشہور مفسر ابن عطیہ نے عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے یہی بتایا ہے۔ قبلہ دراصل جہت کعبہ کو کہتے ہیں۔ مصر میں کعبہ کی جہت وہی ہے جو مدینہ میں ہے یعنی مشرق و مغرب کے درمیان ہے اور قبلہ رو بنانے میں وہاں یہ حکمت بتائی ہے کہ آفتاب دن کے بیشتر حصے میں ان کے گھروں میں رہے گا۔ اور یہ صحت و تندرستی کے لیئے مفید ہے یہاں کچھ لوگوں کو یہ بھی لکھ دیا ہے کہ حضرت موسیٰ کعبہ کیطرف نماز پڑھتے تھے۔ لیکن علامہ خفاجی نے شہاب میں اسے خلاف مشہور قرار دیا ہے۔

جن لوگوں نے مکان کو رہائش کے لیئے بنایا ہے وہ اجعلوا بیوتکم قبلۃ کے معنے یہ بتاتے ہیں کہ گھروں کو آمنے سامنے بناؤ۔ اور کچھ یہ کہتے ہیں کہ مکانوں کو ساری قوم کے لئے مرکز بناؤ۔ اور کچھ لوگوں نے آیت کے رُخ کو عموم سے ہٹا کر مخصوص کر دیا ہے اور گھروں سے مراد حضرت موسیٰ و ہارون کے گھر ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ چونکہ دعوت و ہدایت کی

مرکز کی حیثیت انہی گھروں کو حاصل تھی۔ اس وجہ سے اس عبوری دور میں ان ہی کو عارضی طور پر قبلہ کی حیثیت دے دی گئی۔ لیکن اس خیال کی بازارِ تحقیق میں کوئی قیمت نہیں ہے اصل بات وہی ہے کہ مکانوں کو عبادت گاہوں کے طور پر بنایا گیا اور قبلہ رو بنایا گیا تھا۔ اور یہ مکان بھی خیموں کی صورت میں تھے تاکہ کوچ کے وقت میں کسی تکلف اور تکلیف سے دوچار نہ ہوں۔

اس کے بعد ارشاد ہوا ہے کہ واقیموا الصلوٰۃ اور نماز قائم کرو یعنی اب مسجدیں بنانا چونکہ فرعون کے استبدادی قانون کی وجہ سے تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔ اس لیئے نماز گھروں ہی میں ادا کر لیا کرو۔ اب مسجدوں کی حاضری ضرور نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا اگر مقاصد تک پہنچنے کے وسائل خطرے میں پڑ جائیں تو مقاصد کو نہ چھوڑا جائے گا لیکن چھوڑ دیئے جائیں گے۔ اسلام کی ابتدائی زندگی میں بھی یہی حکم تھا۔ فرعون کی حکومت بنی اسرائیل کو مساجد میں نماز پڑھنے سے روکتی تھی۔ اس لیئے اس حالت میں حکم ہوا کہ اپنے گھروں کو قبلہ رو بنا کر ان ہی میں نماز پڑھو۔ معلوم ہوا کہ نماز صرف درجاتی ترقیوں ہی کا ذریعہ نہیں بلکہ اہل ایمان کی اجتماعی زندگی کی بھی یہی اساس ہے کیونکہ جس بات کے بعد ایک جماعت اسلامی جماعت تسلیم کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ زبان سے نبوت کی پیش کردہ دعوت کا اقرار کرے اور عمل میں نماز کا محسوس پیمانہ ضرور پیدا کرے۔ یاد رہے کہ نماز مسلمانوں کی جماعتی زندگی کی بنیادی شرط ہے۔ ایک فرد اگر نماز میں کوتاہی کرتا ہے تو بلا ریب گناہگار ہے لیکن اگر ایک جماعت بحیثیت جماعت نماز ترک کرتی ہے تو وہ اسلامی زندگی کی بنیادی شناخت سے محروم ہو جاتی ہے۔

آخر میں فرمایا وبشر المومنین اہل ایمان کو کامیابی کی بشارت دید و جو نماز کا سجدوں سے تعلق ہے وہی کامیابی اور کامرانی کا اہل ایمان کے لیئے نماز سے تعلق ہے یہاں المومنین سے مراد وہی ہیں جنہوں نے علی اللہ توکلنا حضرت موسیٰ کی دعوت توکل کے جواب میں فرمایا تھا۔ ارشاد ہوا کہ ان صادق الایمان نوجوانوں کو کامیابی اور بامرادی کی مستقبل میں اور آخرت میں بشارت اور خوشخبری دے دو۔ ان کے توکل کا مطلب کہ اللہ سبحانہ نے عقائد، عبادات، اخلاق اور معاشرت تمدن اور معیشت، سیاست عدالت کے معاملات میں جو حدیں مقرر کی ہیں وہ ان کو پوری پابندی کے ساتھ محفوظ

رکھتے ہیں اپنے انفرادی واجتماعی عمل کو اپنی حدود کے اندر محدود رکھتے ہیں اور نہ انہی قوانین کے بجائے خودساختہ قوانین یا انسانی ساخت کے دوسرے قوانین کو اپنی زندگی کا ضابطہ بناتے ہیں۔ ان کو بہترین انجام کی حالات کی ناخوشگواریوں میں خوشخبری دیدو کہ دشمن کے مقابلہ میں ان کی مدد کی جائے گی۔ اور یہ کامیاب ہوں گے۔

بیان تعبیر میں تفنن کرکے بلیغ لطافت آگئی ہے۔ جب گھروں کے بنانے کا ذکر ہوا تو مخاطب حضرت ہارون اور موسیٰ کو کیا اور جب مکانوں کو قبلہ رو بنانے اور نماز قائم کرنے کا حکم ہو تو مخاطب حضرت موسیٰ اور ہارون کے ساتھ بنی اسرائیل کے صادق الایمان مومنین کو کیا اور جب بشارت کا ذکر ہوا تو صرف حضرت موسیٰ کو مخاطب کیا۔

قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ نے آیت کی اس لطیف بلاغت کو اس طرح پیش کیا ہے کہ سب سے پہلے صرف حضرت موسیٰ اور ہارون کو مخاطب کیا کہ اپنی قوم کے لیئے مصر میں گھر بناؤ۔ کیوں کہ ان دونوں ہی کو قوم کے سربراہوں سے مل کر اس معاملہ میں پایۂ تکمیل پہنچانا تھا۔ پھر گھروں کو مسجد بنانے اور نماز قائم کرنے کے لیئے پوری قوم کو مخاطب کیا کیونکہ یہ کام ہر ایک سے مطلوب تھا۔ اور آخر میں بشارت کے موقع پر صرف حضرت موسیٰ کو مخاطب کیا۔ کیونکہ بشارت دینا صرف صاحب شریعت ہی کا کام ہے۔ علامہ بقاعی نے نظم الدرر میں یہ کہہ کر اس میں اور لطافت پیدا کر دی کہ بنائے مساجد اور اقامت صلوٰۃ کا تعلق چونکہ پورے اجتماعی نظم سے ہے اس لیئے جمع کے صیغہ سے تعبیر کیا ہے اور کامیابی کی بشارت کا تعلق چونکہ امیر اور سربراہ سے امر ہونے کی وجہ سے ہے اس لیئے تعبیر میں وحدت پیدا کر دی اس میں سربراہ کی عظمت اور اس کی اہل ایمان میں عقیدت کا اظہار بھی مقصود ہے۔

امام بغوی یہاں یہ عجیب بات کہ بشر المومنین کے مخاطب حضرت موسیٰ نہیں بلکہ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ لیکن انداز تعبیر اس کی اجازت نہیں دیتا۔ آپنے پوری آیت پر ایک جامع نظر بھی ڈال لیجیئے۔

نماز میں ان لوگوں کو جو ایمان لائے ذریۃ من قومہ سے تعبیر کیا ہے ذریۃ کے لغوی معنے کم سن اولاد کے ہیں۔ یہاں چونکہ قوم کے ساتھ ذریہ کا لفظ آیا ہے اس

لئے یہ لفظ لغوی ہی میں آیا ہے۔ یعنی قوم بنی اسرائیل بوڑھے نہیں بلکہ نوجوان اس سے معلوم ہوا کہ جب کسی مقاصد و عزائم کی راہ میں شدائد و محن کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو قوم کے بڑے بوڑھوں سے بہت کم امید کی جا سکتی ہے زیادہ تر نئی نسل کے نوجوان ہی آگے بڑھتے ہیں۔ کیوں کہ بوڑھوں کی زندگیاں ظلم و فساد کی آب و ہوا میں بسر ہو چکتی ہیں اور غلامی کی حالت میں رہتے رہتے عافیت کوشی کے عادی ہو جاتے ہیں البتہ نوجوانوں میں نیا دماغ ہوتا ہے نیا خون ہوتا ہے نئی امنگیں ہوتی ہیں۔ انہیں شدائد و محن کا خوف مرعوب نہیں کرتا وہی پہلے قدم اٹھاتے پھر ساری قوم ان کے پیچھے چلنے لگتی ہے۔ مصر میں حضرت موسیٰ کو ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہونا پڑا۔ فرعون کے جبر و استبداد نے بنی اسرائیل کے بڑے، بوڑھوں کی ہمتیں سلب کر دی تھیں۔ وہ شکر گذار ہونے کی جگہ الٹی شکائتیں کرتے تھے لیکن نوجوانوں کا یہ حال نہ تھا۔ ان میں ایک گروہ نکل آیا جس نے حضرت موسیٰ کے احکام کی تعمیل کی [1]

---

[1] ترجمان القرآن

وَ

قَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۸۸﴾ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾

اور حضرت موسیٰ نے جناب الٰہی میں دعا کی، خداوندا۔ تو نے فرعون اور اس کے امراء کو دنیا کی زندگی میں شان وشوکت اور مال ودولت دے رکھا ہے اے ہمارے آقا اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ لوگوں کو راہ حق سے بھٹکا رہے ہیں ۸۸ خداوندا ان کی دولت کو مٹا دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے کہ اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں ۸۸ اللہ نے فرمایا کہ تم دونوں کی دعا قبول ہو گئی۔ دونوں ڈٹے رہو۔ اور ان لوگوں کے پیرو کار نہ بنو جو نا آشنائے راہ حق ہیں ۸۹

مقابلے کے وقت حق پر استقامت

اور دن کا پتہ نہیں مگر میرا ذوق تفسیر یہ کہتا ہے کہ اللہ سبحانہ کی جانب سے حضرت موسےٰ و ہارون کو جب وحی آئی ان تبوا لقومکما بمصر بیوتا تو اس سے حضرت موسیٰ نے یہ سمجھا ہے کہ فرعون کی ہلاکت کا وقت قریب آگیا ہے۔ شاہ صاحب نے موضح القرآن میں لکھا ہے کہ جب فرعون کی ہلاکت کا وقت آیا تو حکم ہوا کہ اپنی قوم کو ان میں شامل نہ رکھو۔ اپنا محلہ الگ بساؤ۔ کہ ان پر آفتیں آنے والی ہیں۔ اس وقت تمہاری قوم ظاہری طور پر آفتوں سے الگ رہے اور آپ کی قوم ان کی آفت میں شامل نہ ہو۔ (موضح القرآن)

بہرحال حضرت موسیٰ نے اس حکم سے یہی سمجھا کہ فرعون کی ہلاکت قریب آگئی۔ کیونکہ عذاب اس وقت تک نہیں آتا جب تک آیات ہدایت سے قوم کے تمام اجزاء صالحہ اس کے فاسد عنصر سے الگ نہیں ہو جاتے اور مومنین کا فرق ایک دوسرے سے پھٹ کر جدا نہیں ہو جاتے اور رسول کو بقیہ عناصر کے ایمان سے قطعی مایوسی نہیں ہو جاتی۔ حضرت نوحؑ نے ایک طویل زمانے تک اپنی قوم کو دعوت دی۔ اور اس کے بعد مایوس ہو کر انہوں نے آخری معجزے کی دعا کی ربّ لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا۔ اس کے بعد طوفان آیا اور قوم نوح کو بہا کر لے گیا۔ اسی طرح حضرت موسیٰ نے جب وحی کے حکم سے سمجھ لیا کہ ان پر عذاب آنے والا ہے۔ اور ان کے ایمان کی کوئی آس باقی نہ رہی تو اس قسم کی دعا کی اس موقع پر اس قسم کی دوسرے انبیاء نے بھی کی ہیں۔ شاہ صاحب نے دعا کا پس منظر بڑا ہی لطیف فرمایا ہے لکھا ہے کہ اس سے پہلے یہ ہوتا کہ عذاب کی کوئی کرن نظر آتی تو کہتے کو ہم مانیں گے۔ عذاب ختم ہو جاتا دعا اس لیئے مانگی کہ یہ جھوٹا ایمان نہ لائیں۔ ان کی شان و شوکت کو بالکل ملیا میٹ کر دے۔ اس پر حکم آیا کہ دعا قبول ہوگئی۔ تم اپنا کام جم کر کرو۔ کسی نوع سے ان کی ہم نوائی نہ کرو۔ یہ بے علم لوگوں کا ٹولہ ہے۔

انلہ اور حضرت موسیٰ جناب الٰہی میں دعا کی خداوندا تو نے فرعون اور اس کے امراکو دنیا کی زندگی میں شان و شوکت اور بھرپور مال و دولت دے رکھا ہے۔ اے ہمارے آقا اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ لوگوں کو راہ حق سے بہکا رہے ہیں۔ یعنی ہر قسم کا سامان رونق و آرائش کا دیا۔ مثلاً حسن

صورت سواری عمدہ پوشاک اثاث البیت وغیرہ اور مال و دولت کے خزانے سونے اور چاندی کی کانیں عطا فرمائیں۔ اگر لیضلوا میں لام تعلیل ہے تو مطلب یہ ہے کہ تکوینی طور پر یہ سامان ان نابکاروں کو اس لیئے دیا گیا ہے کہ مغرور ہوکر خود گمراہ ہوں اور دوسروں کو گمراہ کرنے میں خرچ کریں۔ بڑی آزادی سے دل کھولکر زور لگائیں۔ آخر میں دیکھ لیں گے کہ وہ کچھ بھی کام نہ آیا۔ جب خالق خیر وشر اللہ ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہے بلاشبہ خلق شر میں ہی مجموعہ کائنات کے اعتبار سے کوئی حکمت ضرور ہوگی وہی حکمت شریروں کو اس قدر سامان عطا کرنے میں ہے۔

کلا نمد هؤلاء وهؤلاء من عطاء ربك

اور

انما نملی لهم لیزدادوا اثما۔

بعض مفسرین نے لیضلوا میں لام عاقبت لیا ہے جیسے فالتقطه آل فرعون لیکون لهم عدوا وحزنا

میں لام عاقبت ہے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ یہ سامان دیا تو اس لیئے تھا کہ بھلائی کے کاموں میں خرچ کریں اور نعمتوں کو لے کر منعم حقیقی کو پہچانیں۔ اس کے شکر گذار بندے بنیں۔ مگر اس کے برخلاف انہوں نے اپنی بدبختی سے خدا کی نعمتوں کو لوگوں کے بہکانے اور گمراہ کرنے میں ایسا بے دریغ خرچ کیا گویا وہ اسی کام کے لیئے ان کو دی گئیں تھیں۔ اس تفسیر پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا۔ [1]

حضرت موسیٰ نے یہ دعا وحی کے اشارے سے معلوم کرکے کی۔ ایسے ہی حضرت نوح نے بھی لمن یومن من قومك زبان وحی سے سنکر جناب الٰہی میں طوفان سے پہلے کی حضرت موسیٰ نے یہاں ان تبوأ لقومکما کا اشارا پاکر یہ دعا کی۔ حضرت نوح نے فرمایا خداوندا اب زمین پر بسنے والا کوئی کافر نہ چھوڑ۔ جب تک وہ زندہ رہیں گے تیرے نام کی تقدیس نہ ہوگی اور نہ ان کی نسل سے کوئی تیرا نام لینے والا پیدا ہوگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

خداوندا تو نے ان کو شان وشوکت اقتدار وجاہ دیا ہے۔ اس کے نشے میں چور ہو کر یہ تیرے بندوں کو کفر کی راہ پر لگا رہے ہیں۔ یہ دُعا زمانہ قیام مصر کے بالکل آخری زمانے میں کی ہے جیسے حضرت نوح نے ۹۰۰ سال محنت ومشقت کے بعد دعا مانگی۔ ایسے ہی حضرت موسیٰ نے یہاں سارے معجزات دکھائے ہر طرح سے ان کے سامنے دعوت پیش کرنے کے بعد دُعا مانگی۔ اس سے یہ نکتہ بھی واضح ہو کر سامنے آ گیا کہ انبیاء تھک کر بد دُعا نہیں کرتے ہیں بلکہ اللہ کی مرضی پا کر دعا کرتے ہیں۔ طائف میں ساری تکلیفوں کے باوجود یہ دعا آتی ہے لک العتبیٰ حتی ترضیٰ یہ بالکل نبوت کی ابتدائی زندگی ہے حضرت موسیٰ نے دُعا اس وقت فرمائی جب قبول حق کے لیئے ساری تدبیریں کر چکے۔ اتمام حجت کے بعد اگر کوئی قوم ایمان نہیں لاتی تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اس میں قبول حق کی تھوڑی سی رمق بھی باقی نہیں ہے اب اگر وہ دنیا میں رہے تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ لوگوں کی گمراہی کا ذریعہ بنیں گے۔

ان سے خیر کی اب کوئی توقع نہیں ہے اس لیئے قانون یہی ہے کہ جن قوموں پر کسی رسول کے ذریعے اتمام حجت ہو جاتی ہے۔ منکرین کو ایک خاص وقت تک مہلت ملنے کے بعد لازماً ان کو تباہ کر دیا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ نے بھی اسی قانون کے مطابق دعا اس وقت کی جب ان پہ یہ بات واضح ہو گئی کہ ان سرکشوں کی بیہوشی عذاب کے بغیر ختم نہ ہو گی۔

یہ بات بھی یہاں سمجھنے کی ہے لیضلوا میں لام کے بارے میں شارحین قرآن نے تین راہیں اختیار کی ہیں لام تعلیل، لام عاقبت اور لام امر لام تعلیل اور لام عاقبت کی بنیاد پر مطالب آپ شیخ الاسلام کی زبانی سن چکے ہیں۔ پہلی دو صورتوں میں لیضلوا مضارع منصوب ہے جب کہ لام امر ہونے کی صورت میں مضارع مجزوم ہے۔ زمخشری قاضی بیضاوی اور علامہ طیبی کا میلان لام امر کی طرف ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ اے مولائے کریم یہ نعمتیں تو نے ان کو اس لیئے ارزانی فرمائی ہیں کہ وہ تیری بندگی کریں اور تیری رضا کے جویا ہوں لیکن تیرے انعامات کی فراوانی نے ان میں عبادت کی جگہ بغاوت طاعت کی جگہ معصیت وطغیانی پیدا کی ہے جب صورت حال یہ ہے تو ان کو جادہ حق سے لوگوں کو بہکانا ہی چاہیئے۔ طاغی، باغی اور عاصی سے ہدایت کی نہیں اضلال ہی کی توقع ہونی چاہیئے۔ باغی تو دوسروں کو بغاوت ہی پر اکسائے گا۔ جو خود طغیانی کا شکار ہو وہ دوسروں کی ہدایت کا ذریعہ کیسے بنے گا۔ شان وشوکت مال ودولت

اور عزت و اقتدار کے زور پر ان کو ضلالت ہی کو پروان چڑھانا چاہیئے اس طرح
یہ نقرہ بھی ان کے حق میں بد دعا بن گیا
محققین کی رائے یہی ہے کہ یہ لام عاقبت ہے لام امر اور لام تعلیل نہیں ہے
کچھ لوگوں نے یہاں حرف استفہام محذوف مانگراس میں تعجب اور حیرت کے معنے لئے
ہیں۔ امام رازی کا میلان اسی طرف ہے اور مطلب یہ کیا یہ مال و دولت اور شان و شوکت
آپ نے ان کو اس لیئے دی ہے کہ وہ لوگوں کو گمراہ کریں۔ لیکن اس تشریح میں کوئی جان
نہیں ہے۔ اگرچہ مولانا آزاد۔ مولانا مودودی کے انداز ترجمہ سے امام رازی کی ہمنوائی
محسوس ہوتی ہے۔ لیکن بات زیادہ وزنی وہی جس میں لام عاقبت ہے یعنی تو نے ان
کو جو شان و شوکت اور مال و اسباب دیا ہے وہ ان کے لیئے شکر گذاری کے بجائے
طغیان و فساد کا سبب بنے اس لئے اے ہمارے رب اب تو ان کو مزید مہلت نہ دے
کہ یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں۔

کفر کے غلبہ کیلئے بد دعا

یعنی خداوندا تو ان کی دولت کو مٹا دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے کہ اس وقت تک
ایمان نہ لائیں جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام مدت دراز تک
ہر طرح ہدایت کر چکے۔ اور عظیم الشان معجزات دکھلا چکے مگر معاندین کا جحود و عناد بڑھتا ہی
رہا۔ حتیٰ کہ تجربہ اور طول صحبت یا وحی الہٰی سے پوری طرح ثابت ہو گیا کہ یہ لوگ کبھی ایمان لانے
والے نہیں تب ان کی ہلاکت کی دعا فرمائی تاکہ ان کی گندگی سے دنیا جلد پاک ہو۔ اور دوسروں
کے لیئے ان کی بد انجامی درس عبرت ہو جائے آپ نے بد دعا کی کہ خداوندا تو ان کے اموال
کو تباہ اور ملیا میٹ کر دے۔ اور ان کے دلوں پر سخت گرہ لگا دے۔ جن میں ایمان
و یقین نفوذ نہ کرے۔ بس اسی وقت یقین حاصل ہو۔ جب اپنی آنکھوں سے عذاب الیم
کا مشاہدہ کریں۔ یہ دعا ان کے حق میں ایسی سمجھو جیسے ابلیس کو لعنۃ اللہ اور کفار کو خذلہم اللہ
کہا جاتا ہے حالانکہ ان کی ملعونیت اور خذلان کا فیصلہ پیشتر سے کیا جا چکا ہے۔ حضرت
شاہ صاحب نے آیت کو دوسرے انداز میں سمجھایا ہے۔ فرماتے ہیں۔ سچے ایمان کی ان سے

اُمید نہ تھی مگر جب کوئی آفت پڑتی تو جھوٹی زبان سے کہتے کہ اب ہم مانیں گے۔ اس پر عذاب تھم جاتا فیصلہ نہ ہوتا۔ دُعا اس لیئے مانگی کہ جو جھوٹا ایمان نہ لائیں۔ دل ان کے سخت رہیں۔ تاکہ عذاب پڑ جائے اور کام فیصلہ ہو جائے [۱]

قاضی ثناءاللہ پانی پتی فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے یہ دعا اس وقت کی جب بالکل آخری زمانہ قیام مصر میں فرعون اور اس کے امراء سے مایوس ہو گئے جب لگاتار معجزے دیکھ لینے اور دعوت و تبلیغ کی حجت پوری ہو جانے کے بعد بھی فرعون اور اس کے رؤسائے مملکت دعوتِ حق کی دشمنی پر ڈھٹائی دکھلاتے رہے۔ اللہ سبحانہ نے حضرت موسیٰ کو بذریعہ وحی بتا دیا کہ یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے یہ گویا ٹھیک دعا ہوئی جو خود ان کے بارے اللہ سبحانہٗ کا فیصلہ تھا یعنی یہ کہ ان کو ایمان کی توفیق ارزانی نہ ہو گی۔ یہاں قاضی صاحب نے یہ لطیف نکتہ آفرینی کی ہے کہ اگر ان کا کفر پہ مرنا معلوم نہ ہو تو پھر یہ دُعا جائز نہیں ہے کیونکہ نبوت آتی ہے ان کو ایمان کی دعوت دینے کے لیئے اور یہ شبہ کفر پر موت کے معلوم ہو جانے کے بعد دعا کا کیا فائدہ ہے۔ ایمان کیلئے کیونکہ اس سے مقصود اللہ کے دشمنوں سے اظہار بغض اور اعلان بیزاری ہے اور یہ ایمان کا تقاضا ہے۔

یہاں یہ بات بھی دھیان میں رکھنی چاہیئے کہ نبوت کو جھٹلانے والوں نے نبوت کے سارے دلائل اور ساری نشانیوں سے آنکھیں بند کر کے ہمیشہ اس بات پر اصرار کیا ہے کہ جب تک ان کو وہ عذاب نہ دکھایا جائے جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے اس وقت تک وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ یہی مطالبہ فرعون اور اس کے امراء کا بھی تھا۔ ان کی اسی ذہنیت کو سامنے رکھ کر ان کے ایمان سے کلیتہً مایوس ہو جانے کے بعد اور رضی الٰہی کا اشارا معلوم کرنے کے بعد ان کے لیئے اللہ سبحانہ سے درخواست کی۔ یہاں علامہ آلوسی نے رُوح المعانی میں اور علامہ خفاجی نے عنایۃ القاضی میں یہ عجیب بحث چھیڑ دی ہے کہ کسی کے کفر پر راضی ہونا اگر کفر ہے تو حضرت موسیٰ نے فرعون کے لیئے یہ دعا کیوں کی فلا یومنوا حتی یروا العذاب ان بزرگوں نے جو کچھ اس موضوع

---

[۱] افاداتِ شیخ الاسلام

پر لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ غیر کے کفر پر راضی ہونا اس وقت کفر ہے جب کفر کو بنظر استحسان دیکھے اور اگر کسی ظالم اور معاند کے لیئے یہ بد دعا کرے کہ اسے اللہ اس ظالم سے انتقام لے اور کفر پر اسے مار تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن اسی بات کو جس خوبصورت انداز میں علامہ بقاعی نے نظم الدرر میں پیش کیا وہ پڑھنے کے لائق ہے۔

یہ آیت اپنے مخاطبوں کو بتا رہی ہے کہ کسی کے لیئے کفر پر راضی ہونا کفر کو اچھا سمجھنے کو مستلزم نہیں ہے امام حلیمی نے اپنی کتاب المنہاج میں لکھا ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی مسلمان کے لیئے کفر کی تمنا کرے تو اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ تمنا ایسی ہو جیسے ایک دوست کسی دوست کے لیئے کسی اچھی چیز کی تمنا کرتا ہے چاہتا ہے کہ یہ اچھی چیز دوست کو مل جائے۔ یہ تو بلاشبہ کفر ہے اور ناجائز ہے۔ کیونکہ کفر کو اچھا سمجھنا اور اس پر رضا یقیناً کفر ہے۔ دوسرے یہ کہ تمنا ایسی ہو جیسے دشمن کسی دشمن کے لیئے کوئی بری چیز کی تمنا کرتا ہے یہ کفر نہیں ہے کیونکہ اس میں کفر کا استحسان نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے لیئے تمنا کی کہ کفر پر اس کی موت پر ہو تاکہ عذاب کی سنگینی سے دوچار ہو۔ اور صرف تمنا نہیں کی بلکہ جناب الٰہی میں دعا کی اور حق سبحانہ نے بجائے حضرت موسیٰ کو کچھ کہنے کے دعا کو شرف قبولیت بخشا۔ اور عزالدین عبدالسلام کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کا دشمن قتل کر دیا گیا اور اسے خوشی ہوئی تو کیا وہ گنہگار ہوگا۔ اگر وہ اس لیئے خوش ہوا کہ اللہ کی نافرمانی کا ارتکاب ہوا تو بلاشبہ گنہگار ہے اور اس لیئے خوش ہوا کہ مقتول کے شر سے نجات ملی تو کوئی مضائقہ نہیں۔

یہ مسئلہ شوافع ۔ اور احناف کے فتاویٰ میں زیر بحث ہے۔ اور شوافع میں نووی نے شرح المہذب اور روضۃ الطالبین اور احناف میں سے ایک سے زیادہ علما نے اسے موضوع بحث بنایا ہے

دُعا کی قبولیت کی بشارت

سو اللہ نے فرمایا کہ تم دونوں کی دعا قبول ہو گئی۔ دونوں ڈٹے رہو۔ اور ان لوگوں کے پیروکار نہ بنو۔ جو ناآشنائے راہ حق ہیں۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ دعا کرتے تھے اور حضرت ہارون علیہ السلام آمین کہتے جاتے تھے۔ اس سے دعو تکما فرمایا۔ چونکہ تمہاری

دعا قبول ہو چکی ہے اس لیئے دونوں اپنا کام استقلال اور ثابت قدمی سے انجام دیتے رہو۔ اگر قبولیت دعا کے اثرات دیر سے ظاہر ہوں تو نادان لوگوں کی طرح شتابی مت کرو۔ وقت مقرر پر ہی ہو کر رہے گا۔ گھبرانے سے کچھ حاصل نہیں لہ

حضرت موسیٰ اور ہارون کو دعوت و اصلاح کی جو ذمہ داری سپرد کی گئی تھی اس ذمہ داری کے احساس کی یاد دہانی کرائی گئی ہے کہ دعا کی قبولیت کی بشارت سنکر اور ان پر عذاب کی خبر سن کر اس میں کمی نہ ہو۔ بلکہ اس میں بھرپور استقامت اور استقلال سے محنت کرو۔ اور لگاتار کام کرتے جاؤ۔ عذاب کا لانا ہمارا کام ہے تمہارا کام نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تم اپنی ذمہ داری میں کمی کر دو۔ تمہیں تو حکم کے مطابق اپنے کام میں لگے رہنا چاہیئے عذاب کے لیئے وقت علم الٰہی میں متعین ہے اس موضوع پر سوچنا تمہارا کام نہیں ہے تم پر جو ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ اس پر مضبوطی سے قائم رہو اور اپنا کام کیئے جاؤ۔ ادھر ادھر مت دیکھو۔ زندگی کے کسی گوشے میں ان بے علم اور بے خبر لوگوں کی راہ اختیار نہ کرنا۔ اپنے دائرے کے اندر رہو مگر اپنے طریقہ پر قائم رہو۔ ان پہ عذاب لانا تمہاری طاقت نہیں تمہاری طاقت کا سرچشمہ دعوت و اصلاح کا کام ہے اسی کی تمہیں فکر ہونی چاہیئے۔ اسی میں لگے رہنا چاہیئے۔ کہ اصلی اور بنیادی کام ہے۔ اس کو آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ

جو لوگ نا آشنائے حقیقت ہیں اور مصالح حکمتہا ئے خداوندی سے بیگانے ہیں وہ طغیان کے سامنے دعوت حق کی بے بسی اور حق کی راہ میں کام کرنے والوں کی پے در پے اور لگاتار نامرادیاں اور طاغوت کی دنیوی سربلندیاں اور شان و شوکت دیکھ کر یہ خیال کرنے لگتے ہیں۔ کہ یہ باطل پرست ہی اللہ کے پسندیدہ ہیں اس لیئے انکو دنیا میں جاہ و جلال ملا ہے۔ اور اللہ سبحانہ کو ان ہی کا برسر اقتدار رہنا منظور ہے۔ اس خام خیالی کی بنا پر یہ نادان یہ سمجھ لیتے ہیں کہ دعوت و اصلاح پر وقت لگانا اور محنت کرنا بیکار اور بے وقت کی راگنی ہی ہے مناسب یہی کہ بچے کھچے دین پر گذارہ کر لو۔ لیے چوڑے ہاتھ مارنے کی ضرورت نہیں ہے اس آیت میں حضرت ہارون اور حضرت موسیٰ کو مخاطب کر کے اس دور کے مسلمانوں

لہ افادات شیخ الاسلام

سمجھایا ہے کہ اس قسم کی غلطی عذاب کی خبر سنکر تم نہ کرنا منشا یہ ہے کہ پوری استقامت سے ساتھ ساری ناخوشگواریوں کے باوجود کام میں لگے رہو کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں بھی وہی غلط فہمی ہو جائے جو ایسے حالات میں بے خبر اور نادان لوگوں کو عام طور سے لگ جایا کرتی ہے آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تم دونوں کی دعا قبول ہو چکی ہے لہذا تم دونوں بے فکر ہو کر اپنے منصبی کام دعوت و تبلیغ میں لگے رہو۔ اور تاخیر عذاب سے غمگین ہو تمہاری دعا قبول ہو چکی ہے۔ عذاب کا ظہور اپنے وقت پر ہوگا اور تم نادانوں کی راہ پر نہ چلنا جو جلدی چاہتے ہیں یا جن کو وعدہ الٰہی پر اطمینان نہیں ہوتا۔ سو تم یقین جانو کہ تمہاری دعا قبول ہو چکی ہے ان پر عذاب ضرور نازل ہوگا۔ مگر بمقتضائے حکمت و مشیت اس میں کچھ توقف ہوگا۔ اور اپنے وقت پر اس کا ظہور ہوگا۔ جلد بازی اور بے اطمینانی یہ کام نادانوں کا ہے۔

یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ
دُعا کی قبولیت کی بشارت میں حضرت موسیٰ اور ہارون کو فرعون کی ہلاکت کی خبر دے دی گئی ہے کہ واقعی ان کے مالوں کو غارت کیا جائے گا۔ اور یہ ایمان نہیں لائیں گے اور عذاب الیم کا نشانہ بنیں گے۔ ان کی شان و شوکت اور تہذیب و تمدن کی وہ خوش نمائی جس کی وجہ سے دنیا ان پر اور ان کے طور و طریقہ پر فریفتہ ہے سب دریا برد کر دیئے جائیں

دوسری طرف تعالٰی نے تعقیب نے یہ بھی اشارہ دیا کہ دعا کے بعد اس کام کے ہونے میں کچھ عرصہ لگے گا بشائد ابن جریح۔ محمد بن کعب اور علی ابن الحسین نے اسی انداز تعبیر سے چالیس سال کا عرصہ سمجھا ہے۔ اگر دعا کے فوراً بعد ظہور عذاب ہوتا تو یہ ارشاد نہ ہوتا کہ اپنے کام پر جمے رہو اور دعوت و تبلیغ کرتے رہو اور ان بے خبر لوگوں کی راہ نہ چلنا۔

اجیبت دعو تکما سے یہ اشارہ بھی ہو رہا ہے کہ حضرت موسیٰ اگر دعا مانگ رہے تھے تو حضرت ہارون آمین کہہ رہے تھے دونوں کی دعا کہکر بتا دیا کہ دعا تو اپنی جگہ دعا ہے مگر آمین بھی دعا ہے کیوں کہ اس کے معنی ہی دے اور قبول کر۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ مقتدی کا امام کی قرأت پر آمین کہنا ہی مقتدی کی قرأت

ہے حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں۔

وہ لوگ جو مقتدی کی آمین کہنے کو سورۃ فاتحہ کی قرأت کے قائمقام کہتے ہیں ان کا استدلال یہی آیت ہے۔

آیئے اب آیت پر ایک دوسرے پہلو سے نظر ڈالیئے ۔ ۔ ۔ ۔ اگر آپ انداز بیاں سے اس نتیجہ پر پہنچے کہ دعا کی اجابت کے اعلان کے بعد اس کا عملی ظہور چالیس سال کے بعد ہوا تو اس کا مطلب صاف یہ ہے کہ اسی عرصہ میں کام کرنے کے لیئے حضرت موسیٰ و ہارون کو کام کرنے کی ہدایت اور کام کا طریق کار بتایا جا رہا ہے۔

سورہ شوریٰ میں حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کی قریش کی اندھی بہری مخالفت کا ذکر کیا ہے ارشاد ہوا ہے کہ

اگر تیرا رب پہلے ہی یہ فرما چکا نہ ہوتا کہ ایک وقت مقرر تک فیصلہ کو مؤخر کیا جائے تو آپ کے مخالفین کا کام تمام ہو چکا ہوتا اور بلاشبہ آپ کے مخالفین میں اہل کتاب بھی آپ کے بارے میں بڑی اضطراب انگیز حالت میں ہیں۔

اس کے بعد عنا ولا کر ارشاد ہوا۔

فلذالک فادع فاستقم کما امرت ولا تتبع اھواءھم

چونکہ یہ حالت ہو چکی ہے اس لیئے آپ ان کو دعوت دیجیئے اور آپ کو جیسے حکم دیا گیا ہے اس پر ڈٹ جایئے اور ان لوگوں کی چاہتوں کی اتباع نہ کیجیئے۔

یعنی ان کو راضی کرنے کے لیئے اللہ کے دین میں کوئی رد و بدل نہ کرنا۔ کچھ دو اور کچھ لو۔ کے اصول پر ان بے خبر لوگوں سے کوئی مصالحت نہ کرو۔ ان کے اوہام اور تعصبات اور جاہلانہ طریقوں کے لیئے دین اسلام میں کوئی گنجائش محض اس لالچ میں آ کر نہ نکالو کہ کسی نہ کسی طرح ہماری دعوت کو قبول کر لیں جس کو ماننا ہے اللہ کے اصلی اور خالص دین کو مانے

• اللہ کا دین لوگوں کی چاہتوں سے بدلا نہیں جا سکتا

آیئے اب یہی بات سورہ جاثیہ میں پڑھیئے۔ یہاں بھی دعوت کا مقابلہ کرنے اس کا مذاق اڑانے میں پیش پیش تھے۔ قرآن نے حضور انور کو مخاطب کر کے فرمایا۔

ثم جعلناک علی شریعۃ من الامر فاتبعھا ولا تتبع اھواء الذین

لا یعلمون۔

پھر اے نبی ہم نے تم کو الامر کے معاملہ میں ایک عظیم شریعت پر قائم کیا ہے۔ لہذا بس تم اسی کی پیروی کرو اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو علم سے بیگانے ہیں۔ دونوں میں بھرپور ہم آہنگی ہے فرق ہے تو صرف یہ کہ یہاں حضرت موسیٰ اور ان کا مخاطب فرعون ہے اور وہاں حضور انور صلے اللہ علیہ السلام ہیں اور ان کے مخاطب قریش مکہ اور اہل کتاب یہود و نصاریٰ وہاں بھی بغاوت کی نسبتہ فرعون کی طرف ہے۔ اور یہاں بھی بغیا کہہ کر بغاوت کا ان کو مجرم گردانا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ اور ہارون سے کہا جا رہا ہے۔ فاستقیما ولاتتبعان سبیل الذین لا یعلمون اور وہاں حضور انور سے یہی بات کہی جا رہی ہے کہ فاتبعھا ولا تتبع اھوأالذین لا یعلمون۔ تعبیر مختلف ہے لیکن روح دونوں جگہ ایک ہے۔ قرآن عزیز کو جو شخص بھی آنکھیں کھول کر پڑھے گا اسے یہ بات صاف نظر آئے گی کہ قرآن اپنے ماننے والوں کو کفر اور کفار کی رعیت فرض کر کے مغلوبانہ حیثیت میں مذہبی زندگی بسر کرنے کی تلقین نہیں کرتا ہے بلکہ برعلانیہ اپنی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے ماننے والوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ دین حق کی فکری، اخلاقی، مذہبی اور قانونی وسیاسی حیثیت سے غالب کرنے کے لیئے جان لڑا دیں۔ کسی جگہ بھی برسر اقتدار کفر سے کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر مصالحت نہ کریں اس معاملہ میں پوری استقامت اور استقلال کا مظاہرہ کریں۔ اور کفر کی زندگی کے کسی گوشہ میں پیروی نہ کریں۔ یہ چیز دونوں میں مشترک ہے۔

انا ارسلنا الیکم شاھدا علیکم کما ارسلنا الی فرعون رسولا

ہم نے تمہاری طرف اعلان حق کرنے والا ایسا ہی رسول روانہ کیا جیسے فرعون کی طرف رسول روانہ کیا تھا۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ
بَغْيًا وَّعَدْوًا ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ
اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝۹۰
اٰۗلْــٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۹۱
فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ۭ وَ
اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ۝۹۲ ع ۱۰

اور سمندر پار کر دیا ہم نے بنی اسرائیل کو۔ ظلم و شرارت سے فرعون اور اس کے فوجیوں نے اُن کا پیچھا کیا۔ اور حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ جب فرعون غرق ہونے لگا۔ تو وہ بول پڑا کہ میں اس بات پر ایمان لے آیا کہ اس ہستی کے سوا کوئی معبود نہیں ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان لے آئے ہیں۔ اور میں بھی اسی کا فرماں بردار ہوں۔ اب ایمان۔ حالانکہ اس سے پہلے تو برابر نافرمانی کرتا رہا ہے۔ اور دُنیا کے فسادیوں سے ایک بڑا فسادی

تھا ۱۰۴ لہٰذا ہم آج ہم تیرے جسم کو بچالیں گے تاکہ تیرے بعد آنے والوں کے لیئے ہماری قدرت کی نشانی کا کام دے۔ اور اکثر انسان ہماری نشانیوں سے بالکل غافل ہیں ۱۰۵

حضرت موسیٰ کی ہجرت اور فرعون کی ہلاکت

اب وہ منزل سامنے آگئی جب اللہ کے رسول کو اپنی جماعت کو ساتھ لے کر ہجرت کا حکم ہوتا ہے۔ حضرت نوح کو مع رفقاء کے کشتی پر چڑھا کر کفار سے الگ کر دیا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم نمرود کے ملک سے اپنی ہجرت کا اعلان کرتے ہیں انی مہاجر الیٰ ربی حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکل جاتے ہیں۔ کیونکہ جب تک یہ ہجرت نہیں ہو لیتی اور مومن وکافر جدا نہیں ہو جاتے۔ معجزۂ عذاب ظاہر نہیں ہوتا مصر میں رہتے ہوئے مسجد مکان بنانے کا حکم اس کی تمہید تھی۔ حضرت نوح جب تک کشتی پر سوار نہ ہوئے۔ طوفان نہ آیا۔ حضرت ابراہیم کلدانیوں کے ملک عراق سے نکل کر شام اور مصر نہ چلے گئے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ جب تک بنی اسرائیل کو لیکر دریا پار نہیں ہوئے عذاب نہیں آیا۔ اور جب پار ہو گئے تو اللہ کا عذاب فرعونیوں پر غرق کی صورت میں آیا۔ مومنین کو نجات اور کافروں کو ہلاکت ملی۔ اللہ کا دستور اور اللہ کی صفت یہی ہے اس میں کوئی تغیر و تبدل ناممکن ہے کہ جب مادہ فاسد کے سوا کفار کی جماعت کرنی صلاحیت پذیر عنصر باقی نفس یعنی اس کثیف مادے سے چھٹ کر تمام اجزائے لطیفہ الگ ہو جاتے ہیں۔ اور ڈھیر میں پھونس کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا تو اس وقت معجزہ ہلاکت امتحان کی بجلی فضا کی آندھی زمین کا سیلاب لوہے کی تلوار بن کر رونما ہوتا ہے۔ اور روئے زمین کو ان کے وجود کی نجاست سے پاک کر دیتا ہے۔ حضرت موسیٰ کو متعدد معجزے عنایت ہوئے مگر وہ اس لئے کہ ان کو دکھا کر فرعون کو حق کی طرف دعوت

دی جائے جب ایک مدت کے بعد اہل مصر میں سے جس قدر ایمان لا سکتے تھے لے آئے
تو حضرت موسیٰ کو شق بحر کی آیت ہلاکت ملی اور رود احمر کی لہریں فرعون کو اس کے
سارے ساز و سامان اور امرائے دربار کے ساتھ ہمیشہ کے لیئے نگل گئیں ان آیات
میں اسی آیت ہلاکت کو پیش کیا گیا ہے۔

۹۰ اور سمندر پار کر دیا ہم نے بنی اسرائیل کو۔ ظلم و شرارت سے فرعون اور
اس کے فوجیوں نے ان کا پیچھا کیا۔ اور حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ جب فرعون غرق
ہونے لگا تو وہ بول پڑا کہ میں اس بات پر ایمان لایا کہ اس ہستی کے سوا کوئی نہیں ہے
جس پر بنی اسرائیل ایمان لے آئے ہیں اور میں اسی کا فرماں بردار ہوں۔ حکم ہوا کہ اب
ایماں۔ حالانکہ اس سے پہلے تو برابر نا فرمانی کرتا رہا اور تو دنیا کے فسادیوں میں سے ایک
بڑا فسادی تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کئی لاکھ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلے فرعون کو خبر ہوئی
تو ایک لشکر جرار لے کر تعاقب کیا۔ تاکہ اس کے پنجہ ظلم سے چھوٹنے نہ پائیں۔ بنی اسرائیل جب
بحر قلزم کے کنارے پہنچے تو سخت پریشان ہوئے آگے سمندر پیچھے فرعون کا لشکر دندناتا
چلا آرہا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے تسلی دی اور حق تعالیٰ شانہٗ کے حکم سے لاٹھی سمندر پہ ماری
سمندر کا پانی اِدھر اُدھر کھڑا ہو گیا۔ اور درمیان میں اللہ سبحانہٗ نے بارہ راستے خشک بنا
دیئے یہ پار ہوئے ادھر فرعون لشکر سمیت سمندر کے کنارے خشک راستے دیکھ کر سب نے
گھوڑے ڈال دیئے۔ جب ایک ایک کر کے تمام فوج دریا کے درمیان پہنچی پانی کو حکم
ہوا کہ مل جائے فوراً پانی کے طبقات مل گئے۔ سب لشکر اور سامان سمندر کی موجوں کی نذر
ہو گیا۔ فرعون نے دیکھا کہ اب ڈوبتا ہوں اس وقت گھبرا کر ایمان و اسلام کا لفظ زبان
پہ لایا شاید بنی اسرائیل کا معبود ایمان کا لفظ سنکر دریا کی موجوں سے باہر نکالدے
اس پر اللہ سبحانہٗ کی جانب سے ارشاد ہوا کہ الآن وقد عصیت قبل یعنی ساری عمر
مخالف ہو کر گمراہی پھیلاتا اور شرارتیں کرتا رہا اب عذاب دیکھ کر یقین لایا اس وقت
کا یقین کیا معتبر ہے۔ فلم یک ینفعهم ایمانهم لما رأوا باسنا سنة الله
التی قد خلت فی عباده وخسر هنالك الكافرون۔

(تنبیہ) قبض روح اور معائنہ عذاب کے وقت ایمان لانا ایمان غرغرہ۔ ایمان باس

ایمان یاس کہلاتا ہے جو اہل السنۃ والجماعت کے نزدیک نافع نہیں۔ شیخ عبدالوہاب شعرانی نے کتاب الیواقیت والجواہر میں فتوحات مکیہ سے عبارت نقل کی ہے۔ جس میں ایمان فرعون کی نسبت یہی تصریح ہے۔ اور دیباچہ میں لکھا ہے کہ فتوحات کے نسخوں میں ملحدین زنادقہ نے بہت سی عبارتیں مدسوس کر رکھی ہیں۔ میرے پاس جو نہایت مستند اور معتبر نسخہ ہے اس میں ان عبارتوں کا پتہ نہیں ہے واللہ اعلم۔ اخیر وقت میں فرعون سے لفظ امنت کہلا کر حضرت موسیٰ کی دعا فلا یومنوا حتٰی یروا العذاب الالیم کی مقبولیت کا اللہ سبحانہ نے مشاہدہ کروایا[1]

یہ اللہ سبحانہ کے عجائب قدرت میں سے ہے کہ جس مقام سے سمندر نے بنی اسرائیل کو خشک راستہ دیا اس مقام سے گذرتے ہوئے فرعون اپنی فوجوں کے ساتھ غرق ہو گیا۔ فرعون کے تعاقب کو قرآن نے بغی وعدوان سے تعبیر کیا ہے فرعون کا یہ فعل یوں تو ہر پہلو سے سرکشی اور تعدی تھا۔ لیکن اس کا یہ پہلو خاص طور پہ قابل لحاظ ہے کہ مدت کی کش مکش کے بعد فرعون نے خود بنی اسرائیل کو جانے کی اجازت دی تھی۔ اس اجازت کے بعد پیچھے سے اپنی فوجیں لے کر جانا ایک ایسی زیادتی تھی۔ جو اس کی ساری زیادتیوں پر بازی لے گئی۔

مصر سے فلسطین جانے کے دو راستے تھے۔ ایک خشکی کا راستہ ہے اور وہ قریب ہے۔ اور دوسرا بحر احمر کا راستہ یعنی اس کو عبور کر کے بیابان سینا کی راہ ہے اور یہ دور کا راستہ ہے۔ لیکن اللہ سبحانہ کی حکمت کا تقاضا یہی ہوا کہ وہ خشکی کی راہ چھوڑ کر دور کی راہ اختیار کریں اور قلزم کو پار کر کے جائیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ اس راہ کو اللہ سبحانہ نے اس لئے ترجیح دی کہ خشکی کے راستہ سے گزرنے میں فرعون اور اس کی فوج سے ضرور جنگ ہوتی۔ کیوں کہ انہوں نے بنی اسرائیل کو قریب ہی آ لیا تھا۔ اگر دریا کا معجزہ پیش نہ آتا تو فرعون بنی اسرائیل کو واپس لے جانے میں کامیاب ہو جاتا اور چونکہ بنی اسرائیل کو صدیوں کی غلامی نے بزدل اور پست ہمت بنا دیا تھا۔ اس لیئے وہ خوف اور رعب کی وجہ سے کسی طرح فرعون کے ساتھ جنگ کرنے پر تیار نہ ہوتے تورات سے

[1] افادات شیخ الاسلام

ہی اس توجیہہ کی تائید نکلتی ہے اس میں مذکور ہے اور جب فرعون نے ان لوگوں کو جانے کی اجازت دی تو خدا ان کو فلسطینیوں کے راستہ سے نہیں لے گیا اگرچہ ادھر سے نزدیک پڑتا کیونکہ خدا نے کہا ایسا نہ ہو کہ لوگ لڑائی بھڑائی دیکھ کر پچھتانے لگیں اور مصر کو لوٹ جائیں۔ بلکہ خداوند ان کو چکر دلا کر بحر قلزم کے بیابان کے راستے لے گیا (خروج)

نیز فرعون اور قوم فرعون کو ان کی نافرمانی اور سرکشی کی پاداش اور عظیم الشان اعجاز کے ذریعے ظالم دنیا پر اقتدار سے مظلوم ومقہور قوم کی نجات کا عظیم الشان مظاہرہ کرنا تھا اس لئے یہ راستہ اختیار کیا۔

بہرحال حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر راتوں رات بحر احمر کی راہ پر ہو لیئے اور روانہ ہونے سے پہلے مصری عورتوں کے زیورات جو ایک تہوار کے لیئے مانگے تھے واپس نہ کر سکے۔

ادھر پرچہ نویسوں نے فرعون کو اطلاع کی کہ بنی اسرائیل مصر چھوڑ کر راہ فرار اختیار کر رہے ہیں اور شہروں سے نکل گئے۔ فرعون نے اسی وقت ایک زبردست فوج کو ساتھ لیا۔ اور ان کا تعاقب کیا اور صبح ہونے سے پہلے پہلے ان کے سر پر جا دھمکا بنی اسرائیل نے پو پھٹنے کے وقت پیچھے مڑ کر دیکھا تو دیکھ کر گھبرا گئے اور کہنے لگے۔

کیا مصر میں قبریں نہ تھیں جو تو ہم کو مرنے کے لیئے بیابان میں لے آیا ہے۔ تو نے ہم سے یہ کیا کیا کہ ہم کو مصر سے نکال لایا کیا ہم تجھ سے مصر میں یہ بات نہ کہتے تھے کہ ہم کو رہنے دے کہ ہم مصریوں کی خدمت کریں۔ (خروج)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو تسلی دی اور فرمایا خوف نہ کرو۔ اللہ سبحانہ کا وعدہ سچا ہے وہ تم کو بچائے گا۔ اور تم ہی کامیاب ہو گے اور پھر درگاہ الٰہی میں دعا کی اللہ نے حضرت موسیٰ کو حکم دیا کہ لاٹھی پانی پر مارو راستہ بن جائے گا۔ انہوں نے لاٹھی ماری اور راستہ بن گیا۔ بنی اسرائیل پار ہو گئے۔ فرعون اور اس کا لشکر بھی بنی اسرائیل کے پیچھے اسی راستہ پر چل پڑا۔ جب اسرائیل کا ہر فرد سلامتی کے ساتھ کنارے پر پہنچ گیا تو پانی بحکم الٰہی اپنی حالت پر آ گیا۔ جب فرعون غرق ہونے لگا تو بول پڑا امنت انہ لا الہ الا الذی امنت بہ بنوا سرائیل وانا من المسلمین مگر یہ ایمان چونکہ واقعی

ایمان نہ تھا بلکہ بے قراری میں ایک اضطرابی نعرہ تھا۔ اس لیئے جواب ملا

الآن وقد عصیت قبل وکنت من المفسدین

یعنی اللہ سبحانہ خوب جانتا ہے کہ تو مسلمین میں سے نہیں بلکہ مفسدین میں سے ہے۔

فی الواقع فرعون کا یہ نعرہ عذاب کو آنکھوں سے دیکھنے کے بعد اضطراری اور بے اختیاری نعرہ تھا اور مشاہدہ عذاب کے وقت اس کی یہ صدا دراصل حضرت موسیٰ کی دُعا کا واقعاتی مظہر تھا یہاں شارحین قرآن نے ایمان فرعون کی بحث چھیڑ دی ہے۔ علامہ دوانی اور شیخ اکبر محی الدین عربی کے بارے میں یہ بات بتائی ہے کہ وہ اس نعرے کی وجہ سے ایمان فرعون کے قائل ہیں۔ ایک جواب تو وہی ہے جو شیخ الاسلام نے دیا ہے۔ اور دوانی کے بارے میں علامہ خفاجی نے یہ انکشاف کیا ہے کہ دوانی کے بارے میں اس موضوع پر لوگوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ دوانی پر الزام ہے۔ یعنی خود فاضل حلبی کی تاریخ حلب میں پڑھا ہے کہ وہ رسالہ دوانی کی تصنیف نہیں بلکہ محمد بن بلال نحوی کے رشحات قلم ہیں۔ قزوینی نے اس کا رد لکھا ہے کہ یہ بے نام مصنف شہرت کا بھوکا ہے اس کی حیثیت بالکل بدنام ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا کی ہے اور اس رو اپنی بے نام جیسی ہے جس نے شہرت کی خاطر زمزم میں پیشاب کر دیا تھا۔

محی الدین عربی کی صفائی میں شیخ الاسلام کے علاوہ آلوسی۔ خفاجی اور دوسرے شارحین قرآن نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن اس موضوع پر علامہ جمال الدین قاسمی نے اپنی تفسیر محاسن التاویل میں جو داد تحقیق دی ہے وہ اس قابل ہے کہ اس کو پڑھا جائے۔ علامہ قاسمی نے شیخ عطار کی کتاب الفتح المبین فی رد اعتراض المعترض علی محی الدین کے حوالہ سے لکھا ہے خلاصہ یہ ہے۔

فتوحات مکیہ میں شیخ محی الدین ابن العربیؒ جہنمیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فرعون جہنمی ہے اور جہنم کے اس خاص طبقہ میں ہے۔ جس کے باسی اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ ایک دوسرے موقعہ پر حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کی اس دعا کا تذکرہ کرتے ہوئے اعوذ بک منک لکھا ہے۔ یہ مقام اتحاد ہے حضور نے پناہ لی ہے جس کا انا ربکم الاعلی بن فرعون علم بردار تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ شیخ محی الدین ابن عربی کے نزدیک بھی فرعون ایسا ہی کافر ہے جیسا کہ ساری اُمت کا اس میں موقف ہے۔

اب یہ حقیقت بالکل بے غبار ہوگئی ہے کہ فرعون کے ایمان والی روایات ان بزرگوں کے متعلق بناوٹی ہے کچھ لوگوں نے اور بھی جوابات دیئے ہیں لیکن وہ جوابات تحقیقی نہیں ہیں۔

بہر حال حضرت موسیٰ کے معجزات دو قسم کے تھے۔ معجزہ ہدایت اور معجزہ ہلاکت یہاں ذکر معجزہ ہدایت کا نہیں بلکہ معجزہ ہلاکت کا ہے۔ سارے شارحین قرآن اس پر متفق ہیں کہ یہ معجزہ ہلاکت ہے اس کے ظہور کے بعد ایمان معتبر نہیں ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔ فامن حیث لم ینفعہ الایمان امام نسفی مدارک میں لکھتے ہیں کہ اب جب کہ انکشاف آخرت شروع ہو چکا اور قبول ایمان کا وقت نہیں رہا آلوسی بالساعۃ فی وقت الاضطرار۔ امام رازی فرماتے ہیں۔ اب جبکہ ہمارے عذاب کا مشاہدہ ہونے لگا ایمان لایا انما نومن عند نزول العذاب والایمان فی ھذا الوقت غیر مقبول امام قرطبی فرماتے ہیں کہ وقت ایمان کا نہیں اس وقت کا ایمان لایا سود مند نہیں والایمان لا ینفع حینئذ

قدرت خداوندی کی ایک نشانی

۱۰۵ لہٰذا آج ہم تیرے جسم کو بچالیں گے تاکہ تیرے بعد آنے والوں کیلئے ہماری قدرت کی نشانی کا کام دے اور اکثر انسان ہماری نشانیوں سے غافل ہیں۔ موضح القرآن میں ہے کہ جب بے وقت ایمان لایا بے فائدہ ایسے ہی اللہ سبحانہ نے مرے پیچھے اس کا بدن دریا میں سے نکال کر ٹیلے پر ڈال دیا کہ بنی اسرائیل دیکھ کر شکر کریں اور پیچھے آنے والے اس کے حال سے عبرت پکڑیں۔ ورنہ اس کو بدن کے بچنے سے کیا فائدہ جیسا بے فائدہ ایمان تھا ایسا ہی بے فائدہ نجات مل گئی۔

جدید تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ فرعون کی لاش آج تک محفوظ چلی آرہی ہے۔ لیکن الفاظ قرآنی کی صحت اس کے ثبوت پر موقوف نہیں ہے۔ اتفاقاً بنی اسرائیل کے نجات پانے اور فرعون کے غرق ہونے کا واقعہ عاشورا کے دن ہوا اور اتفاق سے آج بھی بندہ یہ سطور لکھ رہا ہے یوم عاشورا ۱۴۲۸ھ اللہ سبحانہ ہو ہم کو دنیا و آخرت میں

اپنے عذاب سے محفوظ رکھے اور دشمنانِ دین کا بیڑا غرق کرے آمین [۱]
آیت کا مضمون بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے یعنی اللہ سبحانہ کا یہ فیصلہ ہے کہ فرعون کے جسم کو غرق ہونے سے نجات دی جائے گی۔ تاکہ آنے والی قوموں کے لیئے قدرت حق کی نشانی ہو اسی لیئے قدیم مفسترین کو حل مطلب میں مشکلات پیش آتی ہیں لیکن اگر وقت نظر سے کام لیا جائے تو مطلب بالکل واضح ہے۔

قدیم مصریوں میں حنوط کا طریقہ رائج تھا۔ یعنی بادشاہوں اور امیروں کی نعشیں ایک خاص طرح کا مصالحہ لگا کر ایک عرصہ تک محفوظ کر لی جاتیں چنانچہ اٹھارہویں صدی کے اوائل سے لے کر اس وقت تک بے شمار نعشیں مصری نکل چکی ہیں۔ اور دنیا کا کوئی عجائب خانہ نہیں ہے جس کے حصے میں دو چار نعشیں نہ آئی ہوں۔ اس طرح کی نعشوں کے لیئے "ممی" کا لفظ یونانیوں نے استعمال کیا تھا۔ جو غالباً خود مصریوں کی اصطلاح تھی۔
آیت کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرمایا تو اب موت سے تو نہیں بچ سکتا مگر تیرا جسم سمندر کی موجوں سے بچا لیا جائے تاکہ وہ حسبِ معمول ممی کر کے رکھا جائے اور آنے والی نسلوں کے لیئے عبرت و تدبر کا موجب ہو۔ اگر مصریات کے بعض علما کی یہ تحقیق درست ہے کہ یہ فرعون امیسس ثانی تھا تو اس کا بدن آج تک زائل نہیں ہوا۔ کیونکہ اس کی ممی نکل آئی ہے اور قاہرہ کے دار الآثار میں صحیح و سالم موجود ہے [۲]۔
آج تک وہ مقام جزیرہ نمائے سینا کے مغربی ساحل پر موجود ہے۔ جہاں فرعون فرعون کی لاش تیرتی ہوئی پائی گئی تھی۔ اس کو موجودہ زمانے میں جبل فرعون کہتے ہیں۔ اور اسی کے قریب ایک گرم چشمہ ہے جس کو مقامی آبادی نے حمام فرعون کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس کی جائے وقوع ابو زنیمہ سے چند میل شمال کی جانب ہے۔ اور علاقے کے باشندے اسی جگہ کی نشاندہی کرتے ہیں۔ کہ فرعون کی لاش یہاں پڑی ہوئی تھی۔ اگر یہ ڈوبنے والا فرعون وہی منفتہ ہے جس کو زمانہ حال کی تحقیق نے فرعون موسیٰ قرار دیا ہے تو اس کی لاش آج تک قاہرہ کے عجائب خانے میں موجود ہے ۱۹۰۷ء میں سر گرافتن

---

[۱] ترجمان القرآن [۲] تفہیم القرآن

نے اس کی ممی پر سے پٹیاں کھولی تھیں تو اس کی لاش پر نمک کی تہ جمی ہوئی تھی۔ جو کھاری پانی میں اس کی غرقابی کی کھلی نشانی ہے ۲؎

اگر مصری مقالہ نگار کا مضمون صحیح ہے کہ متفقہ اعمیس ثانی ہی فرعون موسیٰ تھا تو بلاشبہ اس کی نعش آج تک محفوظ ہے اور سمندر میں تھوڑی دیر غرق رہنے کی وجہ سے اس کی ناک کو مچھلی نے کھا لیا ہے۔ اور آج وہ مصریات کے عجائب گھر میں تماشا گاہ خاص و عام بنے

یہاں یہ بات اور جان لینی چاہیئے کہ قرآن حکیم میں حضرت موسیٰ کے قصے کے سلسلہ میں دو فرعونوں کا ذکر آتا ہے۔ ایک وہ جس کے زمانے میں آپ پیدا ہوئے اور جس کے گھر میں آپ نے پرورش پائی۔ دوسرا وہ جس کے پاس آپ اسلام کی دعوت اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ لے کر پہنچے اور جو بالآخر غرق ہوا۔ موجودہ زمانے کے عام محققین کا میلان اس طرف ہے کہ پہلا فرعون کا زمانہ حکومت ۱۲۹۲ سے ۱۲۲۵ قبل مسیح تک رہا اور دوسرا فرعون جس کا ذکر بیان ہو رہا ہے منفتاح تھا جو اپنے باپ اعمیس دوم کی زندگی میں ہی شریک حکومت ہو چکا تھا۔ اور اس کے مرنے کے بعد سلطنت کا مالک ہوا۔

وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝۹۳

اور بے شک ہم نے بنی اسرائیل کو بہترین ٹھکانا دیا اور ان کو اچھی اچھی نعمتیں ارزانی کیں[۱۰۶] پھر انہوں نے نبوت کی راہ عمل سے علم آنے کے باوجود علیحدگی اختیار کر لی۔ اللہ سبحانہ روز قیامت ان کے اس اختلاف کا فیصلہ فرمائیگا[۱۰۷]

بنی اسرائیل پر اللہ کا انعام

یہاں ذکر مذہب یہود کا نہیں ایک مخصوص قوم و نسل کا ہے۔ بنی اسرائیل نام کسی مذہب فرقہ یا عقیدہ کا نہیں ایک خاص نسل کا ہے قرآن میں فضیلت مذہب یہود کی نہیں بلکہ نسل یہود کی بیان کی گئی۔ یہ سوال کہ اس نسل کی فضیلت کس وجہ سے ہے۔ اور وہ کون سی ایسی نعمت ہے جو بحیثیت نسل بنی اسرائیل کے لیے بلا شرکت غیرے مدتوں مخصوص رہی۔ اگر کہیئے کہ دولت یا حکومت یا تجارت یا کثرت آبادی تو اول تو یہ

انعامات اللہ کے خود اس درجہ کے نہیں کہ ان کا ذکر اس شان و اہتمام کے ساتھ کیا جائے اور انہیں کو معیارِ فضیلت بنایا جائے اور اس سوال کا جواب تاریخ کی زبان سے ایک ہی ملتا ہے کہ وہ دولت یا اللہ کی نعمت مسلک توحید تھا۔ دنیا کی تاریخ کے جس دور میں ساری قومیں اور ساری نسلیں کم و بیش شرک میں مبتلا تھیں تو نسل اسرائیل ہی ایک ایسی قوم تھی جو من حیث القوم توحید کی علمبردار تھی۔ عقیدۂ توحید اور عقیدہ رسالت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ رسالت کی قائل صرف وہی قوم ہوگی جس کا عقیدہ توحید واضح و پختہ ہوگا۔ اور انبیاء و رسل جہاں تک کسی نسل کا تعلق ہے۔ نسل اسرائیل ہی میں مسلسل پیدا ہوتے رہے ہاں متفرق طور پر کسی دوسری نسل میں بھی کبھی کبھی پیدا ہو گئے ہوں تو وہ اس کے منافی نہیں ہے۔ دنیا کی، ساری دوسری قوموں میں جس وقت ظہور اوتاروں کا ہو رہا تھا اور وہ قومیں عناصر پرستی مظاہر پرستی، دیوتا پرستی، بُت پرستی، غرض شرک ہی کی کسی نہ کسی صورت میں گرفتار تھیں انبیاء و رسل اور اُن کی تعلیمات کے پرچار صرف بنی اسرائیل میں تھے اور توحید و رسالت کی دعوت صرف ساری نسل کی شاخ اسرائیل کے حصہ میں آئی تھی۔ موجودہ یہود بھی اپنے اسلاف کی یہ امتیازی حیثیت یاد ہے۔ بہرحال نسل اسرائیل کے لیئے مبوء صدق سلسلہ نبوت کی وجہ سے تھی۔ مبوا صدق کے معنی منزل حسن اور مکان خوب دل پسند کے۔ عربی محاورہ میں صدق کا مفہوم بہت وسیع ہے۔

۲۱ۃ اور بے شک ہم نے بنی اسرائیل کو بہترین ٹھکانا دیا اور ان کو اچھی اچھی نعمتیں ارزانی کیں۔ یعنی فرعونیوں کو ہلاک کر کے اول ملک مصر دیا۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد عمالقہ کو نکال کر ملک شام دیا گیا۔ دونوں ملک سرسبز و شاداب ہیں۔ جہاں سبزی اور لذیذ چیزوں کی افراط ہے۔ غرضیکہ بنی اسرائیل کو حلال و طیب نعمتوں سے مالامال کر دیا لہ شیخ الاسلام نے مصر بتایا ہے۔ اس پر تفصیلی بحث سورہ الشعراء میں آرہی ہے۔ یہاں فلسطین و شام کے علاقے مراد قدیم شارحین قرآن نے بھی یہی مراد لی ہے عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں ھو الاردن والشام قتادہ ابن زید ضحاک کہتے ہیں المراد بلاد الشام و بیت المقدس۔ لیکن یکبارگی نہیں بتدریج عمل میں آیا ہے۔ پہلے وہ واقعات وادی سینا میں پیش آتے ہیں۔ جن کا ذکر قرآن میں ہے۔ مثلاً بنی اسرائیل کا حضرت موسیٰ سے مطالبہ کرنا۔ اجعل لنا الٰھا کما لھم آلھۃ حضرت موسیٰ

پانی کا مطالبہ کرنا۔ بنی اسرائیل نے بحر احمر کو پار کر کے جس سرزمین میں قدم رکھا یہ لق و دق بے آب و گیاہ میدان سے شروع ہوتی ہے۔ تورات کی زبان میں اسے بیابان شور، سین وادی سینا نیہ کہتے ہیں اور کوہ طور تک اس کا دامن وسیع ہے۔ یہاں شدید گرمی پڑتی ہے دور دور تک پانی اور سبزہ کا نام و نشان نہیں ہے۔ بنی اسرائیل کو صرف پینے کے لیئے پانی ہی کی ضرورت نہ تھی کھانے کے لیئے خوراک بھی ان کی مانگ تھی۔ من و سلویٰ کا واقعہ بھی وادی سینا میں پیش آیا۔ کھانے اور پینے کے انتظام کے بعد سر چھپانے اور تپتی دھوپ سے حفاظت کا واقعہ بھی اسی جگہ پیش آیا۔ جسے قرآن تظلیل غمام کہہ کر پکارا۔ اور جب ایک عرصہ وادی سینا میں رہتے گزر گیا تو ایک خوراک سے گبھرا کر غذائی نیرنگیوں کا بھی اسی وادی تیہ میں مطالبہ کیا۔ اور اسی وادی کے زمانہ قیام میں حضرت موسیٰ کو تورات بھی ملی۔ حضرت موسیٰ کوہ طور گئے اس زمانہ میں حضرت ہارون کو اپنا نائب بنا گئے۔ غیبت کے زمانے میں گوسالہ پرستی کا ڈرامہ پیش آیا۔ ان سب واقعات کے بیتنے میں کتنا عرصہ گذرا۔ اس کا کسی تاریخ میں مثبت انداز میں ذکر نہیں۔ ان واقعات کے بعد حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو میدان کارزار میں اترنے کی دعوت دی اور کہا۔ یا قوم ادخلوا الارض المقدسة التی کتب اللہ لکم۔ بنی اسرائیل میں ابھی تک غلامانہ زندگی کے آثار موجود تھے یہ سنکر جوابات قرآن نے بتائی کہ انہوں نے کہا ان فیھا قوما جبارین اور صاف انکار کر دیا۔

انا لن ندخلھا ابدا ما داموا فیھا فاذھب انت وربک فقاتلا انا ھاھنا قاعدون۔ اس کے بعد کیا ہوا قرآن ہی کا بیان ہے کہ پورے چالیس سال اسی وادی سینا میں رہے اور انھا محرمة علیھم اربعین سنة۔ حضرت ہارون کی وفات بھی وادی تیہ میں جبل ہود پر ہوئی اور حضرت موسیٰ نے تجہیز و تکفین کی اس کے بعد حضرت موسیٰ کی وفات بھی اسی وادی میں ہوئی۔ حضرت موسیٰ نے آخری وقت میں یہ دعا کہ مجھے ارض مقدس سے قریب کر دے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر میں اس جگہ ہوتا تو تم کو حضرت موسیٰ کی قبر کا نشان دکھا دیتا کہ وہ سرخ ٹیلہ

لہ افادات شیخ الاسلام

کے قریب اس جگہ دفن ہیں ۔

ضیاء المقدسی کہتے ہیں کہ اریحا میں سرخ ٹیلہ کے قریب ایک قبر ہے جس کو حضرت موسیٰ کی قبر بتایا جاتا ہے ۔ یہ میدان تیہ کے بالکل قریب ہے اور اسی جگہ وہ کثیب احمر سرخ ٹیلہ ہے جس کا حدیث میں ذکر ہے ۔

تورات اور کتب تاریخ میں ہے کہ حضرت موسیٰ کی عمر ایک سو بیس سال ہے ۔

تورات میں حضرت موسیٰ کی وفات کا ذکر متعدد مقامات پر کیا گیا ہے ان میں سے ایک جگہ اس طرح ہے ۔

اور موسیٰ موآب کے میدانوں میں سے نبو کے پہاڑوں پر پسگہ کی چوٹی پر جو یریحو کے مقابل ہے چڑھ گیا اور خداوند نے ساری زمین جلعاد سے لے کر دان تک اس کو دکھلائی اور شمال کا سارا ملک پہلے سمندر تک اور جنوب کا سارا ملک اور وادی اریحو جو کھجوروں کا شہر ہے ۔ اس کی وادی کا میدان صفر تک اس کو دکھایا اور خداوند نے اس سے کہا یہی وہ ملک ہے جس کی بابت میں نے ابراہام ، اسحاق اور یعقوب سے کہا کہ اسے میں تمہاری نسل کو دوں گا ۔ سو میں نے ایسا کیا تو اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لے ۔ پھر تو اس پار وہاں نہ جائے گا ۔ پس خداوند کے بندے موسیٰ نے خداوند کے کہنے کے مطابق رہیں مراتب کے ملک میں پائی اور اسے موآب کی ایک وادی میں بیت ___ کے سامنے دفن کیا ۔ پھر آج تک کسی کو اس کی قبر معلوم نہیں اور موسیٰ وفات کے وقت ۱۲۰ برس کا تھا [1]

اس تفصیل سے بتانا یہ چاہتا ہوں کہ بنی اسرائیل نے ایک عرصہ تک وقت تیہ میں گذارا تو وہ مصر واپس آئے اور نہ فلسطین دار فاسقین تھا ۔ یہاں اسرائیل سے مقصود وہ لوگ نہیں ہیں جو سمندر پار کر کے وادی تیہ میں پہنچے بلکہ ان کی اولاد مراد ہے جو ایک عرصہ کے بعد فلسطین پر قابض ہوئے ۔ یہ سرزمین اپنی سرسبزی شادابی خوش پیداواری کے لیے شروع سے آج تک مشہور چلی آرہی ہے ۔ آج بھی جغرافیہ کی کتابوں میں اس کے بارے میں بھی تفصیلات ملیں گی ۔ مبوأ صدق سے مراد فلسطین اور شام اور جزیرہ نما سینا ہے ۔ یہ

[illegible]

یہ مقام علاقہ مصری شہنشاہی کا حصہ تھا کیونکہ اس وقت فرعون کی حکومت شام سے لیبیا اور بحیرہ روم کے سواحل سے حبش تک تھی۔

بنی اسرائیل کی ناشکرگذاری

۱ پھر انہوں نے علم آنے کے باوجود نبوت کی راہ عمل سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اللہ سبحانہ روز قیامت ان کے اس اختلاف کا فیصلہ کرے گا یعنی مادی انعام و اکرام کے ساتھ دینی و روحانی نعمت سے سرفراز فرمایا کہ تورات مقدس کا علم دیا۔ جس میں دین کے اصول و فروع بیان ہوئے تھے اور اگلوں پچھلوں کے بارے میں خبریں تھیں ان واضح حقائق سے خبردار ہونے کے باوجود لائق نہ تھا کہ ایسی صاف چیزوں میں اختلاف کر کے آپس میں پھوٹ ڈالیں۔ اور فرقہ بندی کی نحوست میں گرفتار ہوں۔ مگر باوجود علم صحیح اور خبر صادق پہنچ جانے کے طرح طرح کے اختلافات پیدا کیئے اور پھوٹ ڈال کر رہے۔ بعض احکام میں اپنے پیغمبر موسیٰ علیہ السلام سے کٹ حجتی جیسے ذبح بقرہ کے واقعہ میں گذرا۔ بعد میں آنے والے خصوصاً خاتم النبیین کی اکثر نے تکذیب کی حالانکہ ان کے متعلق بہت سی پیشین گوئیوں پر مطلع ہو چکے تھے بلکہ بعثت محمدی سے پہلے نبی آخرالزماں کی آمد کے منتظر تھے اور مشرکین سے کہتے تھے کہ ہم پیغمبر آخرالزماں کے ساتھ ہو کر تمہاری خبر لیں گے نہ صرف اس مسئلہ میں اختلاف ہوا بلکہ اپنے مذہب میں تحریف کر کے اصول و فروع بدل ڈالے اور رفتہ رفتہ بیسیوں فرقے پیدا ہو گئے۔ مسیح علیہ السلام کے تین سو برس کے بعد قسطنطین اعظم ایک فلسفی مزاج بادشاہ تھا۔ از راہ نفاق دین نصرانیت میں داخل ہوا۔ تو پادریوں نے اس کی خاطر جدید قوانین وضع کیئے اور نئی شریعت بنا لی۔ اس نے ان کے لیئے بڑے بڑے گرجے اور معابد و مشاہد تعمیر کرائے اور اس نئے دین مسیحی کی جو اصلی مسیحیت کو بگاڑ کر کیا گیا تھا۔ خوب اشاعت ہوئی۔ بجز چند تارک الدنیا راہبوں کے جو بستیوں سے الگ جنگلوں اور پہاڑوں میں جا رہے تھے کوئی شخص اصلی دین مسیحی پر قائم نہ رہا۔ صلیب کی پرستش مشرق کی طرف نماز پڑھنا۔ کلیساؤں میں مسیح و مریم وغیرہ کی تصاویر پوجنا۔ خنزیر وغیرہ کو حلال کرنا اور اس طرح کی تحریفات نے حقیقی مسیحیت کو بالکل مسخ کر ڈالا۔ اور یہ ہی مسخ شدہ مسیحیت ساری دنیا میں پھیل گئی۔ یہ زمانہ تھا جب ملک شام بیت المقدس جزیرہ اور بلادِ

روم پر نصاریٰ کا تسلط تھا تا آنکہ فاروق اعظم کے عہد میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان ممالک کو نصاریٰ کے قبضہ سے نکالا۔ اور للہ الحمد والمنہ[۱]

یہ آیت کی ایک تشریح ہے جو آپ نے مولانا عثمانی کی زبان سے سنی آیئے دوسرے شارحین کی زبانی بھی آیت کی تفسیر سُن لیجئے۔

یہ ناشکری اور ناسپاسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے اتنے احسانات کے مورد ہونے کے بعد اللہ کے دین اور اس کی کتاب و شریعت کے معاملے میں یہودنے کی۔ انہوں نے اس کے اندر طرح طرح کے اختلافات پیدا کرکے پائی ہوئی حقیقۃ گم کر دی اور اسی سرگشتگی اور حیرانی میں پھر مبتلا ہوگئے جس سے اللہ تعالیٰ نے اس اہتمام سے نکالا تھا حتی جاءھم العلم سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ وہ بدقسمت قوم ہے۔ جس نے رات کی تاریکی میں نہیں بلکہ پورے دن کی روشنی میں ٹھوکر کھائی۔ اس وجہ سے سارا بارالزام اس کے اپنے ہی کاندھوں پر ہے۔

ان ربك یقضی بینھم یہ دھمکی ہے یہود کو آج انہوں نے اللہ کے دین کے معاملے میں جو دھاندلی مچائی ہے اور کتاب الٰہی کی جن حقیقتوں پر پردہ ڈالا ہے سب کے فیصلے کے لیئے اللہ نے ایک دن مقرر کیا ہُوا ہے۔ اس دن سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ اور ہر شخص اپنے جُرم کی نوعیت کے لحاظ سے سزا پائے گا۔

یہ بھی لکھنے والوں نے اسی آیت پر لکھا ہے کہ

ان نعمتوں کا مقتضا تو یہ تھا۔ کہ بنی اسرائیل ہمیشہ سپاس گذار رہ کر توحید و رسالت کے عقائد کے علمبردار تھے۔ لیکن اس کے برعکس انہوں نے دین حق سے انحراف و اختلاف کی راہ اختیار کی اور وہ بھی بیانات نبوّت سننے کے بعد

اور یہ بھی اسی آیت کی تشریح کی گئی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ بعد میں انہوں نے اپنے دین میں جو تفرقے برپا کیئے نئے نئے مذاہب نکالے اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کو حقیقت کا علم نہیں تھا۔ اور ناواقفیت کی بنا پر انہوں نے مجبوراً ایسا کیا بلکہ فی الحقیقت یہ سب کچھ ان کے اپنے نفس کی شرارتوں کا نتیجہ تھا۔ اللہ سبحانہ کی

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

کی بات ہے انہیں بجا طور پر بتا دیا گیا تھا کہ دین حق یہ ہے۔ یہ اس کے اصول ہیں یہ اس کے تقاضے اور مطالبے ہیں۔ یہ کفر و اسلام کے امتیازی حدود ہیں۔ طاعت اس کو کہتے ہیں۔ معصیت اس کا نام ہے۔ ان چیزوں کی باز پرس اللہ سبحانہ کے یہاں ہوگی۔ اور یہ قواعد ہیں جن پر دنیا میں تمہاری زندگی قائم ہونی ہے۔ مگر ان صاف صاف ہدایتوں کے باوجود انہوں نے ایک دین کے بیسیوں دین بنا ڈالے اور اللہ کی دی ہوئی بنیادوں کو چھوڑ کر کچھ دوسری ہی بنیادوں پر اپنے مذہبی فرقوں کی عمارتیں کھڑی کر لی ہیں۔

یہ بات بھی اس آیت کے مطالب میں کہی گئی ہے۔

انہوں نے دین حق میں اختلاف ڈالا۔ یعنی اپنے دین کے بارے میں یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بارے میں یہاں تک کہ ان کے پاس احکام توریت کا علم آگیا اور ان کو یقین آگیا کہ اصل عزت ہدایت اور اتباع شریعت میں ہے۔ مال و دولت کی عزت چند روزہ ہے چاہیئے تھا کہ سب اتباع شریعت پر متفق ہو جاتے جس کے ذریعے یہ عزت ملی ہے۔ لیکن افسوس کہ مختلف ہوگئے۔ یا یہ معنی ہیں کہ بنی اسرائیل کو علم تھا۔ کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وہی نبی آخر الزماں ہیں جن کے مبعوث ہونے سے پہلے آپ کی نبوت پر ایمان رکھتے تھے اور جن کی صفتیں تورات میں مذکور ہیں لیکن جب اللہ سبحانہ نے آپ کو مبعوث بنا کر روانہ کیا تو از راہ عداوت آپ کے بارے میں اختلاف کیا۔

اور اسی آیت کا یہ مطلب بھی بتایا گیا ہے کہ

چاہیئے تھا کہ ہماری اطاعت کرتے لیکن انہوں نے الٹا اس میں اختلاف کرنا شروع کر دیا۔ اور غضب یہ کہ انہوں نے جہل کی وجہ سے اختلاف نہیں کیا۔ یہاں تک کہ ان کے پاس احکام کا علم پہنچ گیا تھا۔ اور پھر اختلاف کیا۔ آگے اس اختلاف پر وعید ہے کہ یقینی بات ہے کہ آپ کا رب اختلاف کرنے والوں کے درمیان قیامت کے دن ان امور میں فیصلہ کرے گا۔ جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے۔

اور کچھ لوگوں نے اس طرح بھی سمجھایا۔

آخر آیت میں پھر ان کی کجروی اور غلط کاری کا ذکر ہے۔ کہ ان میں بھی بہت سے لوگوں نے اقتدار پانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر نہ کی اور اس کی اطاعت سے پھر گئے تورات میں جو نشانیاں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ لوگ پڑھتے تھے اس کا تقاضا یہ تھا کہ آپ کے تشریف لانے

کے بعد سب سے پہلے ہی لوگ ایمان لائے۔ مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے تو یہ سب لوگ نبی آخر الزماں پر ایمان رکھتے تھے اور ان کی نشانیوں اور ان کے ظہور کی خبریں لوگوں کو بتاتے تھے اور اپنی دعاؤں میں نبی آخر الزماں کا وسیلہ دے کر دعا کرتے تھے مگر جب نبی آخر الزماں تشریف لائے تو وہ اختلاف میں پڑ گئے۔ کچھ لوگ ایمان لائے اور باقیوں نے انکار کر دیا۔ آیت میں حضور اقدس کی تشریف آوری کو العلم سے تعبیر کیا ہے۔

یہ تو ہوئے متاخرین اور ان کی تشریحات۔ آیئے متقدمین کی زبانی بھی آیت کی تشریح سن لیجئے۔

متقدمین میں حافظ ابن جریر کا نام سب سے پہلے ہے وہ فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہ کا ارشاد فما اختلفوا حتی جاء ھم العلم اس کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں پر بنی اسرائیل میں سے مذکورہ بالا انعامات کئے تھے انہوں نے اختلاف کیا تاآنکہ وہ چیز ان کے پاس آگئی جسے وہ جانتے تھے یعنی حضور اقدس کی تشریف آوری سے پہلے ان کو پتہ تھا کہ آپ کی بعثت ہونے والی ہے اس پر سب کا اتفاق تھا۔ اور سب مانتے تھے لیکن جب ان کی جانی پہچانی چیز آئی تو اختلاف کر بیٹھے کچھ نے مانا اور اکثر نے نہ مانا اس صورت میں العلم سے مراد حضور انور کی ذات گرامی ہے یعنی علم بمعنی معلوم ہے۔

اور کچھ کی رائے میں یہاں العلم سے مراد کتاب اور وحی ہے۔

حافظ ابن کثیر اپنی مشہور تفسیر میں فرماتے ہیں۔

انہوں نے مسائل علم کے باوجود اختلاف کیا اور اختلاف ان کو مناسب نہ تھا۔ کیونکہ اللہ سبحانہ نے ان کے سامنے سب کچھ کھول کر بیان کر دیا تھا: حدیث میں ہے کہ یہودی اختلاف ۷۱ فرقوں میں ظاہر ہوا۔ عیسائی اختلاف نے ۷۲ فرقوں کی شکل اختیار کر لی اور میری امت کا اختلاف ۷۳ فرقوں کی صورت میں نمایاں ہوگا۔ ایک جنتی ہوگا۔ باقی سب دوزخی ہوں گے۔ صحابہ نے دریافت کیا کہ جنتی کون ہوگا۔ فرمایا جس پہ میں اور میرے صحابہ ہیں۔

قاضی بیضاوی اپنی مشہور تفسیر میں فرماتے ہیں۔

انہوں نے اپنے دین میں اختلاف کی راہ تورات پڑھنے اور اس کے احکام جاننے کے بعد اختیار کی۔ یا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے حضور اقدس کے بارے میں اختلاف آپ کی صداقت کو جان لینے کے بعد کیا ہے۔

مشہور مفسر قرآن علامہ قرطبی اپنی تفسیر الجامع لاحکام میں کہتے ہیں۔

انہوں نے حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم کے بارے میں حضور کی تشریف آوری کے بعد اختلاف کیا ہے یہاں علم بمعنی معلوم

علامہ محمود آلوسی بغدادی رُوح المعانی میں لکھتے ہیں۔

بنی اسرائیل اپنے دینی مسائل میں اختلاف کا شکار نہیں ہوئے بلکہ اپنے رسول کے احکام کے پیروکار رہے مگر بعد اس کے کہ انہوں نے تورات پڑھی اور اس کے احکام سے واقف ہو گئے۔ اور کچھ کہتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل حضور اقدس کے بارے اختلاف کا شکار اپنی کتاب میں حضور کے اوصاف پڑھنے کے بعد ہوئے۔ پہلی تشریح کی بنیاد پر بنی اسرائیل سے اگر وہی ہیں جن کے بارے میں بوانا بنی اسرائیل فرمایا ہے تو حضرت موسیٰ کے زمانے میں نہ انہیں تورات میں اختلاف اور نہ حضور کی نبوت ہی میں اختلاف ہوا۔

امام رازی نے تفسیر کبیر ابوحیان نیشاپوری اندلسی نے البحر المحیط اور علامہ نیشاپوری نے نظام القرآن قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے تفسیر مظہری اور جناب نواب صدیق حسن خان نے فتح البیان اور علامہ شوکانی نے فتح القدیر میں تھوڑے سے اختلاف تعبیر کے ساتھ آیت کی یہی تشریح پیش کی ہے۔ یعنی ان بزرگوں کی پیش کردہ تشریح کو میں نے بتکرار سمجھنے کے لیئے پڑھا ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ میں اس پر مطمئن نہیں ہوں۔

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ کیوں؟

وجہ اس کی یہ اور صرف یہ ہے کہ سیاق قرآنی کہہ رہا ہے کہ بنی اسرائیل کی مدح کی جا رہی ہے۔ مگر ان بزرگوں کی تشریحات ببانگِ دہل کہہ رہی ہیں کہ اس آیت میں بنی اسرائیل کی مذمت ہو رہی ہے۔

فما اختلفوا فا تفریع کے لیئے ہے۔ یعنی اللہ کی جانب سے ان کو بہترین مقام ملنے اور ان کو اللہ سبحانہ کی جانب سے نعمتوں کی ارزانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی زندگی میں ان نعمتوں کا

کفر نہیں پیدا ہوا بلکہ انہوں نے شکر کیا ایسا نہیں ہوا جیسے ان مشرکین مکہ نے جن کو اللہ سبحانہ نے حرم میں ٹھکانا دیا امن وچین کی زندگی۔ رزق کی فراوانی عطا کی۔ لیکن ان انعامات کا شکریہ ادا کرنے کی جگہ کفر کو انہوں نے اپنایا۔ بنی اسرائیل کسی بھی نبوت کو ماننے میں پیچھے نہیں رہے۔ انہوں نے ہمیشہ نبوت کا استقبال کیا ہے۔ اختلاف خلف سے ہے۔ جس کے معنی پیچھے کے ہیں۔ یہ تو اب جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی جانب سے قرآن کی صورت میں علم لے کر آئے پیچھے رہ رہے ہیں۔ یہ بعد میں آنے والے بنی اسرائیل جو نبوت کے شدید مخالف بن کر سامنے آئے ہیں ورنہ ان کے اسلاف کی تاریخ تو انبیا کو ماننا ہے۔ اس طرح حضور کے زمانے میں موجودہ یہودیوں کو ان کے اکابر کا نمونہ پیش کر کے ملامت کی ہے، یہی مطلب ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس کی اس بات کا کہ وہ یہودی مراد ہیں جو حضور کے زمانے میں تھے۔ یہ لوگ قرآن کے آنے سے پہلے آنے والے پیغمبر کو مانتے تھے۔ قرآن آنے کے بعد حضور کی تصدیق میں پیچھے رہے۔ یہ حقیقت ہے کہ یہودی نسل نے نبوت کی اس انداز میں تصدیق نہیں کی جس انداز میں ان کو کرنی چاہیئے تھی۔ چند گنتی کے یہودیوں کو چھوڑ کر کسی نے آپ کو نہیں مانا۔ اسی لیئے آگے فرمایا ہے ان ربك لیقضی بینھم یوم القیامۃ فیما کانوا یختلفون ان اخلاف بنی اسرائیل کا آپ کی نبوت سے پیچھے ہٹ جانے کا فیصلہ اللہ سبحانہ روز قیامت فرمائے گا۔ اسلاف کے کارنامے ان کو کام نہ آئیں گے اس لیئے کہ جو دین کو گمراہی سے بچنے کی تدبیر کر لینی چاہیئے۔ تاکہ روز قیامت مواخذہ نہ ہو۔

آیت کی یہ تشریح علامہ محمد طاہر ابن عاشور نے اپنی تفسیر التحریر والتنویر میں پیش کی ہے۔ اس میں ایک درجہ معنویت ہے۔ اور سیاق وسباق سے ہم آہنگ ہے۔

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْئَلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۹۵﴾

لہٰذا اگر آپ کو ماضی کے ان واقعات میں جو ہم نے آپ پر پیش کئے ہیں بفرض محال کوئی شک ہے تو ان کی تصدیق ان سے کر لیجئے جو آپ سے پہلے کتاب پڑھ رہے ہیں۔ بلا شبہ جو کچھ آپ کے رب کی جانب سے آپ کی طرف آئے ہیں یہ امر واقعہ اور حقیقت ہے اس میں شبہ و شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے ۱۰۸ اس میں شک کرکے ان لوگوں میں سے نہ ہو جائیے جو آیاتِ الٰہی کی تکذیب کرکے نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاتے ہیں ۱۰۹

بلاغت کا ایک لطیف نکتہ

یہاں شارحین قرآن نے ایک عجیب و غریب بحث چھیڑ دی ہے لیجئے آپ بھی سن لیجئے بحث

یہ کہ یہاں قرآن میں حضور اقدس صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب بنا کر کہا ہے فان کنت فی شک سوال یہ ہے کہ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جو مہبط وحی ہیں آپ کو شک کیسے ہو سکتا ہے! اگر آپ کو بھی وحی میں شک ہو سکتا ہے تو یہ دوسروں کو بدرجہ اوّل ہونا چاہیئے۔ اس شبہ کو دور کرنے کی خود ان لوگوں نے جن کے ذہنوں میں یہ شبہ پیدا ہوا ہے۔ ایک طرح سے نہیں مختلف انداز میں کوشش کی ہے۔ پہلے شبہ کی بنیاد و اساس معلوم کر لیجئے بنیاد یہ ہے کہ عربی زبان میں اذا یقینیات کے لیئے تو ممتنعات کے لیئے اور ان مشکوکات کے لیئے استعمال ہوتا ہے اور یہاں ان استعمال ہوا ہے۔ بزرگوں نے اس شبہ کا جو جواب دیا ہے اس میں بڑا تنوع اور نیرنگی ہے یہاں سب کا نقل کرنا ایک طویل عمل ہے اس لئے اردو شارحین قرآن سے نہیں مشہور تفاسیر سے کچھ ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔ شیخ الاسلام مولانا عثمانی فرماتے ہیں۔

بظاہر یہ خطاب پیغمبر علیہ السلام کو ہے لیکن حقیقت میں آپ کو مخاطب بنا کر دوسروں کو سنانا مقصود ہے۔ جو ایک امی کی زبان سے ایسے عظیم الشان حقائق و واقعات سنکر حیرت زدہ رہ جاتے تھے اور جہل تعصب کی وجہ سے ان کی واقعیت میں شک و تردد کرتے تھے ورنہ ظاہر ہے کہ آپ خود ہی اپنی لائی ہوئی چیز کے بارے میں کیسے شک کر سکتے تھے اور جس کی طرف تمام دنیا کی دعوت دینے اور پہاڑ سے زیادہ مضبوط یقین سننے والوں کے قلوب میں پیدا کر دیتے تھے اس کو خود اپنی زبان سے کیسے جھٹلاتے۔ چند آیات کے بعد صاف فرما دیا۔ ان کنتم فی شک من دینی آیت صاف بتلا رہی ہے کہ شک کرنے والے دوسرے لوگ تھے جن کے مقابلہ میں آپ اپنے غیر متزلزل اور اصل عقیدہ کا اعلان کر رہے ہیں۔

حضرت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ بیان القرآن میں فرماتے ہیں۔

ظاہر میں خطاب آپ کو ہے مگر مقصود دوسروں کو ہے آپ کو خطاب کرنے میں ایک تو مبالغہ ہے اس دلیل کی کفایت میں کیونکہ صاحب وحی جو بلا واسطہ تلقی من اللہ و من الملئکہ کرتا ہے۔ جب تلقی من اہل العلم جو تلقی من اللہ کا واسطہ ہے اس کے لیئے کافی ہوگی جو تلقی بلا واسطہ کر ہی نہیں سکتا اس کے لیئے تو وہ تلقی بدرجہ اولی کافی ہوگی۔

لہ افادات شیخ الاسلام ۱۔ پ ۱۱

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب معارف القرآن میں لکھتے ہیں۔
آیت میں بظاہر خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے مگر یہ ظاہر ہے کہ آپ کو وحی میں شک ہونے کا احتمال نہیں اس لیے اس خطاب کے ذریعے اُمت کو سنانا مقصود ہے خود آپ مقصود نہیں ہیں۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی معارف القرآن میں فرماتے ہیں۔
بظاہر خطاب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن درحقیقت مخاطب دوسرے لوگ ہیں۔ اس لئے کہ جس پر اللہ کی وحی نازل ہو رہی ہے اس کو شک وشبہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس خطاب کے اصلی مخاطب وہ لوگ ہیں جو شک وشبہ میں پڑے ہوئے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں۔
قرآن کا اسلوب بیان یہ ہے۔ کہ مومنوں سے خطاب مقصود ہوتا ہے لیکن پیغمبر اسلام کو کرتا ہے۔ مثلاً یا ایھا النبی اذا طلقتم الخ پس یہاں بھی اگرچہ خطاب پیغمبر اسلام سے ہے۔ مگر مقصود مومنوں کی وہ ابتدائی جماعت ہے جو آغاز دعوت کی بے چارگی ومظلومی میں ایمان لائی تھی۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی تفہیم القرآن میں فرماتے ہیں۔
یہ خطاب بظاہر نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر دراصل بات ان لوگوں کو سنانی مقصود ہے جو آپ کی دعوت میں شک کر رہے تھے۔ اور اہل کتاب کا حوالہ اس لیئے دیا گیا ہے کہ عرب کے عوام تو آسمانی کتابوں کے علم سے بے بہرہ تھے اور ان کے لیئے یہ آواز ایک نئی آواز تھی مگر اہل کتاب کے علماء میں سے جو لوگ معتدین اور منصف مزاج تھے وہ اس امر کی تصدیق کر سکتے تھے کہ جس چیز کی دعوت قرآن دے رہا ہے یہ وہی چیز ہے جس کی تمام انبیاء دعوت دیتے رہے ہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحی تدبر قرآن میں فرماتے ہیں۔
بعض مرتبہ خطاب بظاہر پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم سے ہوتا ہے لیکن اس میں جو عتاب مضمر ہوتا ہے اس کا رُخ منکرین ومکذبین کی طرف ہوتا ہے وہ اپنی ضد کی وجہ سے چونکہ لائق خطاب نہیں رہ جاتے اس لئے بات پیغمبر کو خطاب کر کے کہی جاتی ہے۔

ان سب کی حیثیت تاویل کی ہے۔ شیخ الاسلام اور حضرت تھانوی کو چھوڑ کر اوروں کی تاویل میں بھی تضاد ہے۔ مولانا ابو الکلام فرماتے ہیں کہ حضور اقدس مخاطب ہیں مگر خطاب میں مقصود حضور نہیں بلکہ مومنوں کی وہ جماعت ہے جو آغاز دعوت کی بیچارگی اور مظلومی میں ایمان لائی تھی. مولانا مودودی فرماتے ہیں کہ روئے سخن ان لوگوں کی طرف ہے جو آپ کی دعوت میں شک کر رہے تھے۔ اور مولانا اصلاحی فرماتے ہیں کہ اس میں عتاب مضمر ہے اس کا رُخ منکرین و مکذبین کی طرف ہے وہ اپنی ضد کی وجہ سے چونکہ قابل خطاب نہیں ہیں اس لئے بات پیغمبر کو خطاب کرکے کہی جا رہی ہے۔

یہ سب تاویلات اِس لیے کی جارہی ہے کہ یہ بات طے کرلی گئی ہے کہ عربی میں اِنۡ ان باتوں کے لیئے آتا ہے جن کا ہونا مشکوک ہو حالانکہ یہ کلی قانون نہیں ہے۔ اذا جب یقین کے لیئے آتا ہے۔ اور لو جیسے ممتنع اور محال کے لیئے آتا ہے ان ممکن اور مستحیل دونوں کے لیئے آتا ہے بلکہ محال عقلی کے لیئے بھی آتا ہے قرآن میں ان معنی میں آیا ہے۔

قل ان کان للرحمان ولد فانا اول العابدین

حالانکہ اللہ سبحانہ کے ولدیت کا تصور ہی ممکن نہیں ہے۔ ایسے ہی قرآن میں ان محال عادی کے لیئے بھی آیا ہے۔ جیسے

ان استطعت ان تبتغی نفقا فی الارض او سلما فی السماء فتاتیھم بآیۃ۔

اتنی بات ضرور ہے کہ محالات میں ان کا استعمال کم ہے۔ ابو حیان لکھتے ہیں ان کا مستقبل میں مستحیلات کے لیئے استعمال تھوڑا ہے۔ آگے لکھتے ہیں کہ یہ جگہ بھی ان ہی مواقع میں سے ہے۔ چونکہ عام شارحین قرآن کی نگاہ سے یہ نکتہ ذرا اوجھل رہا ہے۔ اس لیئے ان کو تاویلات کا سہارا لینا پڑا ہے اور آیت کی تشریح کے لیئے مختلف انداز اختیار کئے اب معنے یوں ہوں کہ اگر بغرض محال آپ کو اس میں کسی طرح کا شک ہے تو ان لوگوں سے پوچھ لیجئے جو پہلے کتابیں پڑھتے رہے ہیں اب معنی صحیح ہیں کسی تاویل کی ضرورت نہیں ہے آیئے اب آیت کا مطلب سنیئے۔

۱۰۸ لہذا اگر آپ کو ماضی کے ان واقعات میں جو ہم نے آپ پر پیش کیئے ہیں بغرض محال کوئی

شک ہے تو ان کی تصدیق ان سے کر لیجئے۔ جو آپ سے پہلے کتابیں پڑھتے ہیں۔ یہ امر واقعہ اور حقیقت ہے اس میں شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے جیسے فما اختلفوا کا فقرہ بطور تفریع کے ہوا تھا اور رزقنا کے بعد آیا تھا ٹھیک اسی طرح ان تمام واقعات کے بعد جن کو قرآن مکہ والوں کے لیئے بطور نصیحت اور عبرت بیان کیئے ہیں یہ تفریع آئی ہے۔ اس تفریع کے ذریعے اسلوب بیان مختلف ہوا ہے پہلے انداز بیان میں اور اس میں مکذبین نبوت پر تعریض ہے۔ پہلے اسلوب میں اہل مکہ کو خبردار کیا گیا تھا کہ تم پر بھی وہی کچھ بیتے گی جو حضرت موسیٰ کے مکذبین پر گذر چکی اور اس اسلوب و انداز میں ان پر اہل کتاب کی شہادت کے ذریعے تعریض کی گئی ہے اگر ان حقائق سے تم بے خبر ہو تو حیان کا رول کی شہادت ان واقعات پر دیکھ لو اس سورت انزلنا سے یہاں مراد وہ واقعات تاریخی ہیں جو اس صورت میں بیان ہوئے ہیں۔
آیت کے دو ہی مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ فی شک کی ظرفیت حقیقی ہے اور شک بولا گیا ہے اور مراد ارباب شک ہیں یعنی اگر آپ بالفرض ان میں سے ہیں جو ان واقعات کے ہونے میں شک کرتے ہیں۔ جیسے فتنہ بولکر اہل فتنہ اور قریہ بولکر اہل قریہ مراد لیتے ہیں تو ان واقعات کی تصدیق کے لیئے ان کے سامنے اہل کتاب کی تاریخی شہادت پیش کیجئے وہ وہی کچھ بتائیں گے جو آپ سنا رہے ہیں۔ اس طرح شک کرنے والوں کا شک سر عام مٹ کر رہ جائے گا۔
اس طرح یہ آیت گرامی مشرکین مکہ کے خلاف ان کی معذرت کو ختم کرنے کے لیئے اہل کتاب کی شہادت کے ذریعے ایک بڑی حجت ہو گی۔

اگر فان کنت فی شک میں فی کی ظرفیت مجازی ہو اور روئے سخن حضور اقدس کی طرف ہے اور بات فی الواقع حضور کو مخاطب کر کے مشرکین کو سنائی جارہی ہے یہ انداز سخن حکما اور اخلاقیین اپناتے ہیں۔ جیسے قرآن ہی میں ہے لئن اشرکت لیحبطن عملک۔

دونوں مطالب فاسال الذین یقرءون الخ سے بھرپور انداز میں ہم آہنگ ہیں۔ اس سے یہ اشارہ ہے کہ اہل کتاب کے بیان کتابوں میں یہ واقعات صحیح ہیں اور ان کی تاریخی حیثیت مضبوط اور پائیدار ہے۔ اگر یہ واقعات تورات میں صحیح نہ ہوتے تو قرآن ان کو شہادت میں پیش نہ کرتا۔

آیت میں لقد جاءك الحق استیناف بیانی ہے یعنی ایک اٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے۔ مخاطبوں کے ذہن میں یہ سوال اُبھرا کہ ان سے پوچھ کر کیا ہوگا۔ جواب میں فرمایا کہ حق وہی ہوگا۔ جو تیرے رب کی جانب سے تیرے پاس آچکا ہے۔ اس انداز بیان اختیار کرنے کا مقصد چونکہ بطور تعریض سامعین کے علم کی تربیت ہے نہ کہ نبوت کے علم کی۔ اس لیئے جملہ پر تاکیدی حرف لائے۔ ایک لام قسم، دوسرے قد تاکہ منکر کو یارائے انکار نہ ہو۔

فلا تکونن من الممترین میں مشرکین پر چوٹ ہے کہ آپ ان سے چوکنے رہیں۔ جو ضد اور فساد میں حق کو شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور شک کے کانوں سے سنتے ہیں۔ پوری آیت کا مطلب یہ ہے کہ لوگو! اگر تمہیں ان واقعات کی صداقت میں کوئی شک ہے تو اہل کتاب سے دریافت کرو وہ تمہیں بتائیں گے کہ یہ واقعہ اور حقیقت ہے۔ اب حق تمہارے پاس رب محمد کی جانب سے آچکا ہے اس لیئے اب تم اس میں شک نہ کرو اور نہ ہی اس کی تکذیب کرو۔ اگر ایسا کروگے تو اس میں سر تا سر تمہارا ہی گھاٹا ہے۔ مشرکین کو بتا دیا گیا کہ جو واقعات بھی ماضی میں ہو چکے ہیں ان کی کاپی آج بھی ہوگی۔ اگر اعمال وہی ہوں گے جن کی بنا پر وہ گرفت میں آ بیٹھے تھے۔ واقعات حضرت موسیٰ کے فرعون ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر عہد کے فرعون اور ہر پیغمبر کے معاندین کے ساتھ یہی برتاؤ ہوتا ہے زمانہ نبوت محمدی کے فرعونوں کی نفسی کیفیت یہی تھی کہ ان کو نشانیاں دکھائی جاتی تھیں، مگر انہیں فساد کی کور باطنی کے باعث تسکین نہ ہوتی تھی کیونکہ ان کے شک و شبہ کا منشا محض عناد ہے حق طلبی نہیں ہے اگر حق طلبی مقصود ہوتی تو ایمان لے آتے

انسانی نفسیات کا خاصہ ہے کہ جب کسی کی طرف سے اس کے جذبات مخالفانہ ہوتے ہیں تو وہ اس کی کسی بات کو حسن ظن پر محمول نہیں کرتا اور اس کو اس کی ہر بات میں شر و خبث اور بدی ہی نظر آتی ہے۔ جلی سے جلی واضح سے واضح برہان بھی اس کے اختراع اور اس کے قلب کے شک کو دور نہیں کر سکتے۔ معاندین جو انبیائے کرام کے مکارم اخلاق حسن تعلیم اور دیگر علمی و عملی کمالات کو باور نہیں کرتے اور ان کے بیئے اور بدیہی دعووں کو بھی تسلیم کرنے کے لیئے آمادہ نہیں ہوتے اور ہر قسم کی دلیلوں کو سن لینے کے بعد بھی وہ اپنے لا علاج مرض شک سے نجات نہیں پاتے تو وہ انبیاء سے معجزوں کا مطالبہ کرتے ہیں اور شک اور

بدگمانی سے انہیں یقین ہوتا ہے کہ ہماری طرح کا ایک مدعی انسان کبھی ایسی عجیب و غریب کام پر قدرت نہیں رکھتا اس لیئے وہ کبھی کوئی معجزہ نہ دکھائے گا۔ اور اس طرح اس کی رسوائی عالم آشکارا ہو جائے گی۔ معجزات کو دیکھ کر معاندانہ رُوح ان کے دلوں کے شکوک کو دُور نہیں ہونے دیتی اور بدگمانی انہیں بتاتی ہے کہ اگرچہ یہ خرق عادت ہے۔ مگر یہ خدائی کرشمہ نہیں بلکہ یہ شیطانی عمل ہے اور سحر و جادو کی قوت ہے۔ حضرت موسیٰ نے فرعون کو متعدد معجزات دکھائے مگر ہر ایک کے جواب میں انہیں یہی سُننا پڑا کہ یہ جادو ہے کفار قریش کا بھی یہی حال تھا۔ کہ جب کوئی معجزہ دیکھتے تو کاہن اور جادوگر کی پھبتی کس دیتے۔ اس موقعہ پر پہنچکر جو کچھ فرعون کے ساتھ ہوا وہی کچھ قریش مکہ کے ساتھ بھی ہوتا ہے قرآن کی کچھ مختلف سورتوں میں ان واقعات کو بکثرت بیان کیا گیا ہے۔ نیز اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنا دستور اور قانون فرمایا ہے جس میں تغیر اور تبدّل ناممکن ہے۔ یہی بات یہاں آگے آ رہی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ
رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٩٦﴾ وَلَوْ جَاءَتْهُمْ كُلُّ آيَةٍ حَتَّىٰ يَرَوُا
الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ﴿٩٧﴾ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ آمَنَتْ فَنَفَعَهَا
إِيمَانُهَا إِلَّا قَوْمَ يُونُسَ لَمَّا آمَنُوا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ
الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ ﴿٩٨﴾

بلا شبہ وہ لوگ جو قانون الٰہی کا نشانہ بن چکے ہیں وہ ایمان نہ لائیں گے خواہ ان کے پاس ساری ہی نشانیاں آجائیں جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں گے ۹ؔ۰ پس کیا کوئی بستی ایسی ہے یونس کی بستی کے علاوہ کہ ایمان لائی ہو۔ اور اس کا ایمان اس کے لئے نفع بخش ہوا ہو۔ یونس کی قوم جب ایمان لے آئی تو ہم نے دُنیا کی زندگی میں رسوائی کے عذاب کو ان سے ہٹا دیا۔ ایک خاص مُدت تک ان کو سر و سامان حیات سے فائدہ اٹھانے کی مہلت دی ۹۸

فرعون کی ہلاکت کا خدائی قانون

گمراہی کا چہرہ ہمیشہ ایک ہی طرح رہا ہے۔ کوئی واقعہ ایسا نہیں ہے جس میں ظلم و فساد کی ایک نمود سے ظلم فساد کی دوسری نمود ہمرنگ نہ ہو۔ سب قوموں نے وہی کچھ کیا جو ان میں سے کسی ایک نے کیا تھا۔ سب نے دعوت سے انکار کیا۔ سب نے داعیوں کا مذاق اڑایا۔ سب نے دلائل سے بے رُخی کی سب نے روشنیوں سے آنکھیں بند کرلیں سب نے سرکشی اور گھمنڈ دکھائی سب نے جبر و تشدد سے حق کی راہ روکنی چاہی سب نے موعظت و دلائل کا جواب ظلم و تعدی سے دیا۔ سب کی زبانوں سے ایک ہی طرح کی صدائیں نکلیں۔ سب کے اعراض و انکار میں ہم آہنگی رہی۔ پھر سب کو غرور و طغیان نے آخر وقت تک اس کی مہلت نہ دی کہ ہدایت و ضلالت کا فرق سمجھتے۔ نتیجہ بھی ہمیشہ ایک رہا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس کے خلاف ہوا ہو۔ ہمیشہ اللہ سبحانہٗ کے فیصلہ کا انتظار کیا گیا اور ہمیشہ فیصلہ یہی ہوا کہ اہل ایمان نے نجات پائی۔ سرکشوں کے لیئے ہلاکت یہ گویا اللہ کا قانون ہے حکم رب ہے یہ کبھی بدل نہیں سکتا یہ گویا آگ کے لیئے گرمی برف کے لیئے ٹھنڈک ہے۔

سنۃ اللہ فی الذین خلوا من قبل ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا

یہ اعمال کے خواص کا قانون ہے بے شمار قومیں اسی زمین پر گذر چکی ہیں۔ ان کی بھی آبادیاں تھیں بسر بفلک عمارتیں تھیں فکر و عمل کی سرگرمیاں تھیں یہاں فرعون ہی کی سرگذشت نہیں بلکہ سرگزشتیں ہی سرگزشتیں ہیں۔ سعادت و شقاوت سب کے لیئے ہے۔ اگر ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے تو کیا لیے روسائے مکہ تم سمجھتے ہو کہ اللہ سبحانہٗ اپنا قانون اپنا کلمہ معطل کر دے گا۔ اور تمہارے لیئے اس قانون میں کوئی اثر نہ رہے گا۔

۹۶-۱۰ بلاشبہ وہ لوگ جو قانون الٰہی کا نشانہ بن چکے ہیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ خواہ ان کے پاس ساری نشانیاں آجائیں۔ جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں گے۔ ان آیات میں پیغمبر کی زبان سے قرآن کے ہر مخاطب کو متنبہ کیا کہ کفر و تکذیب کی بیماری شک سے شروع ہوتی ہے۔ اگر تم کو قرآن کے بیان کردہ واقعات میں شک و شبہ ہو تو اس کا فوراً علاج کرو۔ یعنی جو لوگ کتب سابقہ کا علم رکھتے ہیں۔ ان سے تحقیق کرلو۔ آخر ان میں کچھ آدمی سچے اور انصاف

پسند بھی ہیں وہ بتائیں گے کہ نبی امی نے جو کچھ فرمایا ہے کہاں تک درست ہے بلا شبہ جو کچھ آپ لائے وہ سچ کے سوا کچھ نہیں ہے وہ پروردگار کا اتارا ہوا ہے جس میں شک و تردد کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر بیہودہ شکوک کا علاج نہ کیا جائے تو چند روز میں شک ترقی کر کے اترا د جدل اور اتر اترقی کر کے تکذیب کی حد تک پہنچ جائے گا۔ جس کا نتیجہ خسران وخرابی کے سوا کچھ نہیں۔ تکذیب کے بعد ایک اور درجہ ہے جہاں پہنچکر دل پر مہر لگ جاتی ہے تکذب کرتے کرتے قبول حق کی استعداد ہی برباد ہو جاتی ہے۔ ایسا شخص اگر دنیا جہاں کے سارے نشان دیکھ لے تب بھی ایمان نہ لائیگا اسے عذاب الیم دیکھ کر ہی یقین آئے گا۔ جب کہ اس یقین سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ کلمتہ ربک۔ رب کی بات سے غالباً وہ ہے جو دوسری جگہ فرمایا لاملئن جھنم من الجنتہ و النّاس اجمعین۔ جن لوگوں پر بدبختی سوا استعداد اور شامت اعمال سے یہ بات علم الہٰی میں ثابت ہو چکی ہے۔ یہاں ان کا ذکر ہے [1]

یہ جملہ ان الذین یا تو استیناف ہے اور ان پیشانی پر بات کو مضبوط بنانے کے لیئے لگایا ہے اور الذین سے مقصود مقرر ومعین اشخاص ہیں اور مطلب یہ کہ بات ثابت شدہ اور ایک بے غبار حقیقت ہے کہ حضور اقدس کے مخاطبوں اور حضرت موسیٰ کے مخاطبوں میں کوئی فرق نہیں ہے دونوں کا معاملہ اعمال اور اعمال کے نتائج میں واضح اور صاف ہے وہ بھی ایمان کیلئے عذاب الیم کے مشاہدے کی انتظار میں ہے اور یہ بھی عذاب الیم کے انتظار میں تھے۔ جب اعمال میں یکسانی ہے تو اعمال کے نتائج میں بھی یکسانی ہوگی فرعونیوں کی ایسی حالت کی طرف حضرت موسیٰ نے اپنی فلا یومنوا حتی یروا العذاب الالیم میں اشارا کیا تھا۔ حضور صلے اللہ وسلم کے مخاطبوں کی اسی حالت کی طرف یہاں قرآن نے حتی یروا العذاب الالیم کہہ کر اشارا کیا ہے۔

اپ پوچھ سکتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے۔

اس لیئے کہ قوموں اور جماعتوں کی سعادت وشقاوت کا قانون ایک ہے اور جس طرح اللہ سبحانہ کے سارے قوانین یکساں ہیں عالمگیر ہیں غیر مبدل ہیں اسی طرح یہ قانون بھی ہمیشہ ایک

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہی طرح رہا ہے اور ہمیشہ ایک ہی طرح کے احکام و نتائج بھی ظاہر ہوئے ہیں۔ زمانوں اور قوموں کے اختلاف سے اس کی تاثیر مختلف نہیں ہوتی جس طرح سنکھیا کا خاصہ ہلاکت ہے خواہ کسی ملک اور کسی زمانہ میں کھایا جائے اسی طرح قانون ہلاکت کے احکام و نتائج ہی ایک رہے ہیں خواہ کسی ملک اور کسی زمانہ میں پیش ہوں یہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت موسیٰ کے زمانے میں تو فرعونیوں کے حق میں سنکھیا کا خاصہ ہلاکت ہو۔ اور اب حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قریش کے لیئے زندگی ہو جائے۔ لہذا جو کچھ ماضی میں فرعونیوں کے لیئے پیش آچکا ہے ضروری ہے کہ اب قریشیوں کے لیئے ہی پیش آئے۔ اس میں کبھی تبدیل نہیں ہو سکتی کیونکہ کلمہ رب میں تبدیلی نہیں ہو سکتی ہے پیچھے پڑھ آئے ہو۔ لا تبدیل لکلمات اللہ

اگر ان الذین حقت کو تعلیل قرار دیا جائے کہ گذشتہ قوموں کے ساتھ جو کچھ ہوا ہوا ہے اس کی علت یہ ہے کہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ طبیعتیں جب حق سے عناد کرتے کرتے اس درجہ پہ پہنچ جائیں تو ان کو ایمان کی توفیق نہیں ہوتی وہ عذاب الیم کو دیکھ کر ہی مانتے ہیں۔ مگر اس وقت کا ماننا سودمند اور نافع نہیں ہوتا ہے اس میں بھی قریش کو تعریضاً بتا دیا گیا ہے کہ تم بھی ماننے کے لیئے فرعونیوں کی طرح عذاب الیم کا انتظار کر رہے ہو۔ تم طالب حق نہیں ہو۔ تمہارے دلوں پر ضد تعصب اور ہٹ دھرمی کے تالے لگے ہوئے ہیں اور دنیا کے عشق میں مدہوش اور آخرت سے بے فکر ہو۔

تاریخ کی روشنی میں قریش کو تنبیہ

ف ایسا کیوں نہ ہوا کہ یونس کی بستی کے علاوہ اور کوئی بستی ایمان لے آتی کہ اسے اس کا ایمان فائدہ دیتا۔ یونس کی قوم جب ایمان لے آئی تو ہم نے دنیا کی زندگی میں ان کی رسوائی کا عذاب ان سے ہٹا دیا اور ایک خاص مدت تک ان کو سروسامان حیات سے فائدہ اٹھانے کی مہلت دی یعنی جتنی بستیاں اور شرارتوں کی وجہ سے مستوجب عذاب ٹھہریں ان میں سے کسی کو اسی طرح ایمان لانے کی نوبت نہ آئی جو عذاب الہٰی سے نجات دیتا صرف یونس علیہ السلام کی قوم کی ایک مثال ہے۔ جس نے ایمان لاکر اپنے کو عذاب الہٰی سے بال بال بچا لیا جو بالکل ان کے سروں پر منڈلا رہا تھا۔ اللہ سبحانہ نے ایمان کی بدولت دنیوی زندگی میں ان کے سر پر آنے والی بلا ٹال دی۔ اور

جس وقت تک انہیں دنیا میں رہنا تھا۔ یہاں کے فوائد و برکات سے متنتفع کیا۔ مفسرین نے نقل کیا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام سرزمین موصل میں اہل نینوی کی طرف مبعوث ہوئے وہاں کے لوگ بت پرست تھے۔ یونس علیہ السلام لگاتار سات سال تک پند و نصیحت کرتے رہے انہوں نے ایک نہ سنی یوماً فیوماً انکار و تکذیب بڑھتا رہا۔ آخر حضرت یونس علیہ السلام نے تنگ آکر ان کو آگاہ کیا کہ باز نہ آئے تو تین دن کے اندر عذاب آنے والا ہے جب تیسری شب آئی یونس علیہ السلام آدھی رات گذرجانے پر بستی سے نکل کھڑے ہوئے صبح ہوتے ہی آثار عذاب کے نظر آنے لگے۔ آسمان پر نہایت ہولناک اور سیاہ بادل چھا گئے۔ جس سے سخت دھواں نکلتا تھا وہ ان کے مکانوں سے قریب ہوتا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ ان کی چھتیں بالکل تاریک ہوگئیں یہ آثار دیکھ کر جب انہیں ہلاکت کا یقین ہو گیا تو یونس کی تلاش ہوئی وہ نہ ملے تو سب لوگ عورتوں اور بچوں سمیت بلکہ مواشی اور جانوروں کو بھی ساتھ لے کر جنگل میں نکل آئے اور سچے دل سے اللہ کی طرف رجوع ہوئے خوف سے چیخیں مارتے تھے اور بڑے اخلاص و تضرع سے اللہ سبحانہ کو پکار رہے تھے چاروں طرف سے آہ و بکا کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور کہتے جاتے تھے امنا ما جاء بہ یونس۔ حق تعالیٰ نے ان کے تضرع و بکا پر رحم فرمایا اور آثار عذاب جو پیدا ہوچکے تھے اٹھا لیئے گئے۔

یہاں علمائے سلف کے دو قول ہیں۔ اکثر علما کہتے ہیں کہ ابھی اصل عذاب کا ان کو معائنہ نہ ہوا تھا۔ صرف علامات و آثار نظر آئے تھے ایسے وقت کا ایمان شرعاً نافع اور معتبر ہے۔ ایمان یاس جو معتبر اور نافع نہیں ہے اس سے مراد یہ ہے کہ عین عذاب کو دیکھ کر ایمان لائے جیسے فرعون نے سمندر کی موجوں میں پھنس کر اقرار کیا تھا۔ بعض علماء کے نزدیک قوم یونس کا ایمان بھی ایمان یاس تھا۔ جو عام ضابطہ کے مطابق نافع نہ ہونا چاہیئے۔ لیکن حق تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے خلاف قاعدہ بطور استثنا اس قوم کا ایمان معتبر گردانا۔ فرعون کے ایمان کی طرح رد نہیں فرمایا۔ اس کے بعد پھر اختلاف ہے کہ ان کا ایمان صرف دنیوی زندگی تک معتبر ہے کہ دنیا میں آنے والا عذاب ٹل گیا یا آخرت میں بھی موجب نجات ہوگا۔ حافظ ابن کثیر نے دوسرے احتمال کو ترجیح دی ہے یعنی دنیا و آخرت دونوں جگہ معتبر ہوگا واللہ اعلم حضرت شاہ صاحب نے نہایت لطیف و دقیق طرز پر آیت کی تفسیر کی ہے یعنی دنیا میں عذاب دیکھ کر یقین لانا کسی کو کام نہیں مگر قوم یونس کو اس واسطے کہ ان پر حکم عذاب نہ پہنچا

تھا حضرت یونس کی شتابی سے محض صورت عذاب نمودار ہوئی تھی تاکہ ان کی نگاہوں میں حضرت یونس کی بات جھوٹی نہ ہو۔ وہ ایمان لائے پھر بچ گئے اور صورت عذاب ہٹائی گئی اسی طرح مشرکین مکہ کہ فتح مکہ میں اسلامی فوج ان پر پہنچی قتل و غارت کے لیئے لیکن ان کا ایمان قبول ہو گیا۔ اور امان ملی ؎[1]

آیت کی تشریح سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجیئے۔

حضرت یونس علیہ السلام کا عبرانی نام یوناہ تھا جو عربی میں یونس ہو گیا۔ ان کا زمانہ آٹھویں صدی قبل مسیح کے وسط کا ہے ان کا معاصر اسرائیلی بادشاہ یربعام تھا جس کا زمانہ ۷۸۰ء ق م تا ۷۴۱ء قبل مسیح ہے رہنے والے شہر نینوا کے تھے۔ جو اپنے زمانے میں اسیریا کی بر قوت حکومت کا پایۂ تخت تھا۔ اور آج تک عراق میں جہاں موصل ہے۔ اس کے مقابل دریائے دجلہ کے بائیں کنارے پر واقع ہے۔ اس وقت شہر کا رقبہ ۱۸۰۰ ایکڑ تھا۔ اس کی قدامت اس سے ظاہر ہے کہ اس کا ذکر حورابی کے نوشتوں میں ملتا ہے۔ ۲۲۸۵ء قبل مسیح میں۔ حضرت یونس بنی اسرائیل کے نبیوں میں سے ہیں اور عہد عتیق کے نوشتوں میں ایک نوشتہ ان کے نام سے بھیجا ہے۔ اس میں کچھ تفصیل تو ملتی ہے مگر وہ چنداں قابل اعتماد نہیں ہے کیونکہ اولاً تو وہ صحیفہ آسمانی نہیں ہے اور نہ ہی خود حضرت یونس کا نوشتہ ہے بلکہ ان کے چار پانچ سو برس بعد کسی نامعلوم شخص نے تاریخ یونس کے نام سے لکھ کر کتب مقدس میں شامل کر دیا ہے۔ ثانیاً اس میں دور از کار باتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ جن کا سر پاؤں کوئی نہیں۔

جمہور علما کی تفسیر کے مطابق صحیح بات یہی ہے کہ حضرت یونس کی قوم پہ عذاب نہیں آیا بلکہ کچھ ابتدائی آثار نمودار ہوئے تھے جن میں سب سے بڑا اثر حضرت یونس کا عذاب کی دعا کر کے بستی کو چھوڑ دینا تھا جسے لوگوں نے فوراً محسوس کیا اور دوسرے آثار و قرائن کو دیکھ کر یقین کر لیا کہ یونس علیہ السلام بے شک اللہ کے سچے پیغمبر ہیں اور ایمان لے آئے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی اور حافظ ابن کثیر نے حضرت عبداللہ بن مسعود حضرت عبداللہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بن جبیر اور امام مجاہد سعید بن جبیر سے یہی نقل کیا ہے اور کہا ہے سلف الصالحین یہی تفسیر کرتے تھے حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔

غرض گذشتہ بستیوں میں سے کوئی بستی ایسی نہ تھی کہ اس کے باشندے اپنے نبیوں پر کامل ایمان لے آئے جس طرح یونس کی قوم یونس پر ایمان لے آئی۔ اور یہ باشندگان نینوی تھے اور ان کے ایمان لانے کا واقعہ ہے۔ کہ ان کے عذاب کے زمانے کا ڈر پیدا ہو گیا تھا جس سے ان کے پیغمبر نے ان کو ڈرایا تھا۔ جب انہوں نے عذاب کے آثار محسوس کئے اور دیکھا کہ حضرت یونس ان میں موجود نہیں ہیں اس وقت اللہ کی جناب میں پناہ گیر ہو گئے اور اللہ سے مدد مانگی۔

حضور اقدس کو تسلی

اسی آیت کی تشریح میں اس پہلو پر بھی غور فرمایئے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تمنا کا سارے نعمت ایمان سے مالامال ہو جائیں۔ مختلف سورتوں اور مختلف شکلوں میں مظاہرہ ہوتا تھا۔ آیت میں یہ کہہ کر آپ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ تاریخ نبوت میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے کہ پوری کی پوری بستی نعمت ایمان سے مالامال ہو گئی ہو۔ ہر پیغمبر کے ساتھ ایمان کے معاملہ میں صورت حال یہی رہی ہے کہ کچھ نے مانا اور کچھ نے نہیں مانا۔ صرف حضرت یونس کی قوم ساری تاریخ میں ایک منفرد مثال ایسی ہے کہ ایک حادثہ کی وجہ سے پوری کی پوری قوم نے آپ کی دعوت ایمان کو قبول کر لیا اور ان کا ایمان ان کے لیئے نافع اور سودمند ہوا۔ ذہن میں سوال اٹھا ہوا کہ ان کو کیا نفع ہوا۔ فرمایا جب ایمان کی نعمت سے ہمدوش ہو گئے تو اس کے نتیجے میں دنیوی ذلت و رسوائی کی جگہ ان کو عزت و رفعت ملی اور وقت مقرر تک ان کو دنیا کی زندگی میں بہت فائدہ اٹھانے کا موقعہ ملا۔ اسی طرح یہ آیت سیاق و سباق سے مربوط ہو گئی۔ سباق میں قانون بتایا تھا کہ جن میں طلب نہیں ہوتی ہے ان کو خود بخود ایمان نہیں ملتا ہے۔ بے طلب افراد آیات معجزات سے بھی ایمان نہیں لاتے ایمان کے لیئے طلب اہم اور بنیادی شرط ہے ایمان نام ہے دل کی پہنائیوں سے صداقت کو مان کر قبول کر لینے کا۔ لہذا جو لوگ طلب نہیں رکھتے وہ کبھی ایمان نہیں لاتے یہ معاملہ صرف آپ کے ساتھ نہیں سارے

سارے نبیوں کے ساتھ رہا ہے۔ سب کو کچھ نے مانا اور کچھ نے نہ مانا ہے۔ صرف حضرت یونس کی خوش قسمت تاریخ میں ایسی قوم ہے کہ اس نے بلا استثنا حضرت یونس کی آواز پر لبیک کہی۔

سباق میں بتایا جارہا ہے کہ ایمان ارادی اور اختیاری چیز ہے بلا جبر و اکراہ سے آپ کسی کے مفہوم میں ایمان داخل نہیں کر سکتے ہیں۔ ارادی و اختیاری ہونے کی وجہ سے ایمان و کفر قابل جزا و سزا ہیں۔

یہ گویا تاریخ کی روشنی میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی کہ آپ سے پہلے جس قدر بھی انبیاء آئے ہیں ان میں سے کسی بھی رسول کے مخاطب سارے کے سارے ایمان نہیں لائے۔ ساری تاریخ انبیاء میں صرف ایک مثال قوم یونس کی اس سے مستثنیٰ ہے کہ وہ پوری کی پوری قوم ایمان لے آئی تھی۔

اس طرح آیت قرآن اپنے مطالب کے لحاظ سے دو کام دے رہی ہے۔ قریش مکہ کو دھمکی بھی ہے اور حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کو تسلی بھی ہے فلولا کانت قریۃ الخ میں فا تفریع کیلئے ہے اور لولا کے اصل معنے تو کسی کام پر انگیختہ کرنے کے آتے ہیں۔ اگر گذرے ہوئے حالات بارے تو بیخ تندیم اور تغلیط کا کام دیتا ہے۔ اور ایسے موقع پر اس کا مدخول ماضی ہوتی ہے مقصود اہل مکہ کو شرم دلانا ہے اور ایمان کے لیئے برانگیختہ کرنا ہے۔

لما امنوا جملہ مستانفہ ہے۔ استثنائی معنے کو کھولا گیا ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ اللہ سبحانہ کا معاملہ اہل مکہ کے ساتھ وہی ہوگا جو قوم یونس کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ بھی عذاب کی علامات دیکھکر مسلمان ہوئے تھے اور اہل مکہ بھی جب فتح مکہ کے موقعہ پر فوجوں اور اسلامی لشکر کی آمد کی خبر سنیں گے تو سب نعمت ایمانی سے ہمدوش ہو جائیں گے اور واقع بھی یہی ہے کہ اگر وہ ایمان نہ لاتے تو وہ روز یوم الملحمہ ہوتا۔ ایمان لانے کی وجہ سے یوم المرحمہ بن گیا۔ شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں۔

اسی طرح مکہ کے لوگ فتح مکہ میں ان پر فوج اسلام پہنچی قتل و غارت کو لیکن ان کا ایمان قبول ہوگیا اور امان مل گئی۔

جس طرح قوم یونس علامات عذاب دیکھ کر ایمان سے ہمدوش ہوتی تھی۔ اسی طرح اہل مکہ صرف اسلامی لشکر کی آمد مکہ میں سنکر ایمان لے آئے نہ مقابلہ کیا اور نہ قیدی بنے اس طرح آپکی

قوم کے سارے لوگ آہستہ آہستہ داخل ایمان ہو گئے صرف شریر قسم کے لوگ اس سے محروم رہے اور وہ مختلف غزوات میں کام آ گئے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اپنی قوم کی تباہی کی دعا مانگی۔ لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بدر میں جو دعا مانگی تو صرف اہل ایمان کی نصرت و فتح کی دعا مانگی۔ اہل مکہ کی تباہی اور بربادی کی دعا نہیں مانگی۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم مکہ سے مایوس ہو کر طائف تشریف لے گئے وہاں بھی کوئی حق سننے والا نہ تھا۔ بازار اور راستہ میں شریروں نے پتھر مارے یہاں تک کہ قدم مبارک خون آلود ہو گئے۔ آپ مکہ واپس آ رہے تھے کہ فرشتہ جبال نے آپ کو ندا دی کہ اگر اجازت ہو تو پہاڑوں سے ان کو چکنا چور کر دیا جائے۔ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اب بھی بد دعا نہیں کی اور بارگاہ الٰہی میں عرض کی کہ یا اللہ ان کو ہلاک نہ کر شائد ان کی نسل سے کوئی توحید کا پرستار پیدا ہو۔ صحیح بخاری اور مسلم میں ہے کہ حضرت عائشہ نے آپ سے دریافت کیا کہ یارسول اللہ اُحد کے علاوہ آپ پر سخت دن کون سا تھا۔ فرمایا وہ دن جب میں نے طائف کے سردار عبد یالیل کے سامنے اپنے کو پیش کیا اور اس نے انکار کیا میں مغموم واپس آ رہا تھا۔ کہ فرشتہ جبال نظر آیا اس کے بعد کفار کی ہلاکت کا فرشتہ کی اجازت طلبی اور اپنا جواب بیان کیا۔ حضور اقدس نے اس دن کو ایام مصائب کی تاریخ میں سب سے زیادہ سخت دن اس لیئے فرمایا کہ یہ قریش کی فرصت اور مہلت کی آخری گھڑی تھی اب ہلاکت ان کے سروں پر منڈلا رہی تھی۔ اور حضور اقدس کو اس کا صدمہ تھا۔ اسی صدمہ کا اظہار آپ نے حضرت عائشہ کے جواب میں اس انداز سے کیا۔

وَلَوْ شَآءَ
رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِى الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ
النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ
تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا
يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ
وَمَا تُغْنِى الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ فَهَلْ
يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ قُلْ
فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ ثُمَّ نُنَجِّىْ رُسُلَنَا
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ ع

اے پیغمبر اگر تیرا پروردگار چاہتا تو سارے زمین والے مومن ہو جاتے
تو کیا آپ ان کو مجبور کر کے ایمان والے بنائیں گے[۱] اور یاد رکھو
کوئی جان اللہ کے حکم کے بغیر ایمان نہیں لا سکتی اور اللہ سبحانہ ان
لوگوں کو گندگی میں رکھتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے[۲] اب ان

سے کہدیجئے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے ان کو غور سے دیکھو
اور جو مانتے نہیں ہیں ان کو نشانیاں اور ڈراؤنی باتیں کچھ فائدہ نہیں
دیتی ہیں ۱۰۱ لہذا کیا یہ لوگ ماننے کے لیے گذشتہ تاریخ کے
دہرائے جانے کا انتظار کر رہے ہیں اگر ایسا ہے آپ فرمائیے انتظار کرو.
میں بھی انتظار کرنے والوں میں تمہارے ساتھ ہوں ۱۰۲ پھر اس وقت
ہم اپنے رسولوں کو اور اہل ایمان کو بچالیں گے. ایسا ہی ہو کر رہے گا
اہلِ ایمان کو بچا لینا ہماری ذمہ داری ہے ۱۰۳

ایمان میں جبر و اکراہ نہیں ہے

قرآن نے جا بجا یہ حقیقت واضح کی ہے کہ انسانی طبیعت و استعداد کا اختلاف فطری ہے اور اللہ سبحانہ کی مشیت یہی ہوئی کہ یہ اختلاف ظہور میں آئے اگر وہ چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی طرح کی طبیعت ایک طرح فکری و علمی حالت پر مجبور کر دیتا مگر اس نے ایسا نہیں چاہا اس کی حکمت کا یہی فیصلہ ہوا کہ انسان میں ہر طرح کی حالت پیدا کرنے کی استعداد ہو۔ اور ہر طرح کی راہ اس کے آگے کھول دی جائے۔ وہ اگر ہونا چاہے تو زیادہ سے زیادہ اونچا ہونا چاہئے اور اگر پست ہو۔ جائے تو زیادہ سے زیادہ پستی میں گر سکے تنوع و استعداد کا نتیجہ ہے کہ فکر و عمل کے ہر گوشہ میں مختلف حالتیں پیدا ہو گئیں۔ ایک فرد و جماعت کا ذوق ایک طرح کا ہوا دوسرے کا دوسری طرح کا۔ ایک کی سمجھ ایک طرف گئی دوسرے کی دوسری طرف ایک نے ایک راہ پسند کی کہ حق ہے دوسرے نے اسی سے انکار کیا کہ حق نہیں ہے اور پھر اسی اختلاف فکر و عمل نے ہدایت و سعادت اور شقاوت و ضلالت کی وہ کشمکش پیدا کر دی۔ جسے قرآن آزمائش حیات سے تعبیر کرتا ہے۔ لیبلوکم ایکم احسن عملاً وہ تمہیں کشمکش

حیات کی آزمائش میں ڈالتا ہے تاکہ کھل جائے کہ تم میں سے کون ہے جس کے عمل سب سے زیادہ اچھے ہوتے ہیں کیونکہ اس کش مکش میں کامیاب وہی ہوگا جو اپنے عمل میں احسن وانفع ہوگا۔

اس آیت میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے! مختصر لفظوں میں کتنی عظیم الشان بات کہدی فرمایا فکر و استعداد کا اختلاف یہاں ناگزیر ہے اور ایمان کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ زور زبردستی سے کسی کے اندر ٹھونس دی جائے یہ تو اسی کے اندر پیدا ہوگا جس میں فہم وقبول کی استعداد ہے پھر اگر تم پر یہ بات شاق گذری ہے کہ کیوں لوگ ایمان نہیں لاتے تو کیا آپ لوگوں کو مجبور کریں گے کہ نہیں۔ تمہیں ضرور مان ہی لینا چاہیئے۔

اس آیت نے یہ حقیقت بھی کھول دی ہے کہ قرآن کے نزدیک دین و ایمان کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے۔ جس میں جبر و اکراہ کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ سورہ بقرہ کی آیت اس بارے میں قرآن کا مقررہ قانون ہے۔ لا اکراہ فی الدین [۱]

الف اے پیغمبر اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو سارے زمین والے مومن ہو جاتے تو کیا آپ ان کو مجبور کر کے ایمان والے بنائیں گے یعنی آپ کو یہ قدرت نہیں کہ زبردستی کسی کے دل میں ایمان اتار دیں اللہ سبحانہ چاہتا تو بے شک سب آدمیوں کے دلوں میں ایمان ڈال سکتا تھا۔ مگر جب کہ پہلے متعدد مواضع پر تقریر کی جا چکی ہے ایسا کرنا اس کی تکوینی مصلحت و حکمت کے خلاف تھا۔ اس لیے نہیں کیا ہے [۲] مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کی یہی مشیت میں ہوتی کہ اس کی زمین میں صرف اہل ایمان ہوں اور کفر کا نام و نشان نہ ہو تو اللہ سبحانہ کے لیے یہ کام کوئی مشکل نہ تھا کہ تمام روئے زمین کے انسانوں کو مومن ہی پیدا کرتا۔ اور نہ ہی مشکل تھا کہ سب کے دل اپنے ایک تکوینی اشارے کے ذریعے ایمان کی طرف پھیر دیتا۔ لیکن انسان کی تخلیق میں جو حکیمانہ مقصد اللہ سبحانہ کے پیش نظر ہے وہ شرمندہ ظہور نہ ہوتا۔ بلاشبہ اللہ سبحانہ کو کفر پسند نہیں ایمان پسند ہے۔ لبشرطیکہ لوگ اپنی عقل اور اپنے مجز کی راہنمائی میں ایمان لائیں۔

یہاں یہ بات ذہن نشین کر لیجیے کہ یہاں دو صداقتیں ہیں ایک یہ کہ اللہ سبحانہ کی اجازت کے بغیر درخت کا ایک پتہ بھی گر نہیں سکتا دوسری یہ کہ ہر جان اپنے کاموں کے ہاتھوں گرد ہے یعنی اللہ کی ہمہ گیر قدرت وسیع اختیار اور ناقابل رد مشیت کے باوجود اس نے خود اپنے اختیار خود اپنی مشیت اور خود اپنی حکمت سے انسان کو ارادہ اور ارادے کے

---

[۱] ترجمان القرآن۔ [۲] افادات شیخ الاسلام ۔ ،،

مطابق اپنے کام کرنے والے اعضا کو ہلانے کی مشروط طاقت دی ہے۔ یہی ارادہ اور اعضا کو حرکت دینے کی محدود طاقت اور قدرت انسان کی ذمہ داری، تکلیف باز پرس اور مواخذہ کی بنیاد ہے اور اسی پر اس کے اعمال اخلاق اور معاملات کی پوری عمارت کھڑی ہے اس تطبیق سے نہ تو اللہ سبحانہ کی قدرت و اختیار کی وسعت میں فرق آتا ہے اور نہ انسان کا تمام تر مجبور ہونا لازم آتا ہے اللہ جب چاہے انسان سے اپنے دیئے ہوئے اختیار کو چھین لے۔ مگر ایک وقت مقرر تک اپنے بنائے ہوئے قانون کے مطابق انسان کو ارادہ و اختیار سے محروم نہیں کرے گا۔ فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر

ایمان کے باب میں سنت الٰہی

۱۰۰ اور یاد رکھو کوئی جان اللہ کے حکم کے بغیر ایمان نہیں لاسکتی اور اللہ سبحانہ ان لوگوں کو گندگی میں رکھتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے خدا کی مشیت و توفیق اور حکم تکوینی کے بغیر کوئی ایمان نہیں لا سکتا اور یہ حکم و توفیق ان ہی کے حق میں ہوتی ہے۔ جو اللہ کے نشانات میں غور کریں اور عقل و فہم سے کام لیں۔ جو لوگ سوچنے اور سمجھنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے انہیں اللہ تعالیٰ کفر و شرک کی گندگی میں پڑے رہنا دیتا ہے [۵]

یہاں اذن الٰہی کا کلامی موشگافیوں سے الگ ہو کر مطلب سمجھ لیجئے۔ یہاں اذن تکوینی اور تقدیری ہے یعنی نفس انسانی میں اللہ سبحانہ نے ایسی صلاحیت اور استعداد تکوینی طور پر رکھی ہے جس کے ذریعے وہ حق و باطل میں تمیز کر سکتا ہے۔ صلاح و فساد کے فرق کو سمجھ سکتا ہے۔ نظر صحیح کے ذریعے صحیح چیز کی اسے معرفت حاصل ہو سکتی ہے۔ اللہ کی عطا کردہ اس قوت کو استعمال کرتا ہے اور اپنے اندر ارادہ کرتا ہے تو اللہ کی جانب سے اسے خیر کی صلاح کی اور حق پر چلنے کی توفیق ارزانی ہو جاتی ہے اسلئے طاعت اور معصیت دونوں ارادی اور اختیاری ہیں۔ اس میں اللہ سبحانہ کا حکیمانہ دستور یہ ہے کہ جو شخص طاعت و معصیت میں اپنی عقل کو ٹھیک کرتا ہے اس کے لئے اللہ سبحانہ کی جانب سے حقائق تک پہنچنے کے اسباب و ذرائع اس کی محنت اور جد و جہد کے مطابق مہیا کر دیئے جاتے ہیں۔ اور اسی کو صحیح علم پانے اور ایمان لانے کی توفیق ارزانی ہوتی ہے اور وہ لوگ جن میں حق کی طلب ہی نہیں ہوتی اور جو تلاش حق کے لئے اپنی عقل کو استعمال ہی نہیں کرتے تو ان

[۵] افادات شیخ الاسلام

کو اللہ سبحانہ کی توفیق نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیئے اللہ سبحانہ کے خزانہ میں جہالت، گمراہی، غلط اور غلط بینی کی نجاست کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہاں دو تاریں ہیں ایک بندے کے پاس ہے۔ یہ ارادہ کا تار ہے دوسرا اللہ سبحانہ کے پاس ہے اور یہ توفیق کا تار ہے دونوں تار حرکت کرتے ہیں تو ایمان کی روشنی ظاہر ہوتی ہے۔ یا یوں کہہ دیجیئے یہاں دو روشنیاں ہیں ایک اندر کی روشنی اور دوسری باہر کی روشنی۔ ایک بندے کے ارادے کی روشنی دوسری اللہ کی توفیق کی روشنی جب تک دونوں وجود ہی تندرست اور صحیح نہ ہوں حقیقت نظر نہیں آتی۔ سو کیا کیسی وجود میں آئیں اور خود میں استعمال کرے جب تک باہر روشنی نہ ہو آنکھ کچھ نہیں دیکھ سکتی۔ اور دوپہر میں آفتاب کتنا ہی تاباں ہو لیکن اندھا دیکھ نہیں سکتا۔ یہ اللہ کا قانون اور سنتہ ہے۔ جو بھی ایمان لاتا ہے۔ وہ اللہ کے حکم اور توفیق سے ایمان لاتا ہے اور یہ توفیق ان کو ملتی ہے۔ جو اللہ سبحانہ کی بخشی ہوئی تکوینی استعداد عقل اور سمجھ سے کام لیتے ہیں۔ جو لوگ عقل اور سمجھ سے کام نہیں لیتے اور اس کے لیئے ارادہ نہیں کرتے ان کی بصیرت پر اللہ سبحانہ ان کے اعمال کی نجاست مسلط کر دیتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ اتباع ہوا کا شکار ہو کر اتباع ہدیٰ سے محروم ہو جاتے ہیں۔

اذن اللہ کا مقابلہ یجعل الرجس علی الذین لا یعقلون سے کرکے بتا دیا گیا ہے کہ ایمان کی حالت عقل و تبصیر کی لا فانی اور فرزانگی کی حالت ہے۔ اور کفر و نفاق جہل و کودی اور گندگی و نجاست کی حالت ہے۔

علامہ بقاعی نے یہ بات بہت خوب لکھی ہے کہ علی الذین لا یعقلون سے ان لوگوں پر تعریض ہے جو اپنے آپ کو سب سے بڑے فرزانے صاحب بصیرت اور تمام علوم و فنون کا مالک سمجھتے ہیں لیکن دین کے معاملے میں عقل کو استعمال نہیں کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ساری برائیوں کا گہوارہ بنے رہتے ہیں۔

سلا آپ ان سے کہہ دیجیئے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے ان کو غور سے دیکھو اور جو مانتے نہیں ہیں ان کو نشانیاں اور ڈراونی باتیں کچھ فائدہ نہیں دیتی ہیں۔ یعنی سوچنے اور غور کرنے والوں کے لیئے آسمان و زمین اللہ سبحانہ کی قدرت و حکمت اور توحید و تفرید کے کیا کچھ نشان موجود ہیں بلکہ ذرہ ذرہ اور پتہ پتہ اس کی توحید پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن جو کسی بات کو ماننا اور تسلیم کرنا نہیں چاہتا اس کے لیئے یہ سب نشانات و دلائل بیکار ہیں۔ اور ڈرانے والے پیغمبر کی تنبیہ و تخویف بھی غیر

مؤثر ہے لہ دراصل اللہ سبحانہ نے اپنی روحانی کائنات کو بھی ایک نظام اور اصول کے تحت رکھا ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیئے کہ ان مصالح اور اسباب کا پتہ لیں جن کی وجہ سے باوجود قدرت کے اور باوجود شدت ضرورت کے معجزات سے کلیتہً انکار کیا گیا یا ان کے ظہور میں تاخیر ہوئی۔ اصل بات یہ ہے کہ معجزات کے ذریعے جو لوگ ایمان لاتے ہیں ان کا ایمان محض جبری تقلیدی اور بالواسطہ ہوتا ہے۔ وہ لوگ اپنے دلوں میں انبیاء کے محاسن تعلیم کا کوئی خاص ذوق نہیں رکھتے ہیں۔ صرف معجزہ کی قوت اور اعجوبگی ان کو متحیر اور مبہوت کر دیتی ہے حالانکہ نبوت کی تعلیم کا سب سے بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کی جماعت میں ایسے افراد شامل ہوں جو شریعت کے رمز شناس اور اس کے اسرار حکم سے ذوق آشنا ہوں۔ قرآن کی زبان میں اسی کو شرح صدر اور انشراح قلب کہا جاتا ہے۔ اس قسم کے لوگوں کے لیئے معجزات کی ضرورت نہیں ہوتی ان کے لئے آفتاب و ماہتاب آسمان و زمین دن اور رات غرض دنیا کا ایک ایک ذرہ معجزہ ہوتا ہے اور اللہ سبحانہ کی وحدانیت اور پیغمبر کی نبوت پر بلا واسطہ دلالت کرتا ہے۔ ان کے لیئے صرف تفکر اور بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی گروہ ہے جس پر سب سے زیادہ انبیاء کی نگاہ انتخاب پڑتی ہے اور وہ ان کو صرف تفکر و اعتبار کی ترغیب دیتے ہیں۔ اس گروہ کے بالمقابل ایک کور باطن فرقہ اور بھی ہوتا ہے جس پر نظام فطرت کے دوسرے شواہد و آیات کی طرح معجزات کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ انبیاء کو ابتداً بعثت سے انہی دو گروہوں سے سابقہ پڑتا ہے اور چونکہ فطرتاً ایک معجزات سے بے نیاز ہوتا ہے اور دوسرے پر معجزات کا کوئی اثر نہیں پڑتا اس لیے ان دونوں گروہوں کے لیئے معجزات بیکار ہو جاتے ہیں۔ اور اس بنا پر نبوت معجزہ پیش کرنے سے انکار کرتی ہے۔ اس آیت میں بیان کیا ہے

قل انظروا جملہ اسی بات کو ہے یعنی اٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے۔ جب یہ بات بتائی گئی ولو شاء ربك الخ اللہ مشیت ہی نے طبائع میں اختلاف رکھا ہے آپ جبراً ایمان کسی کے اندر نہیں اتار سکتے تو معاً سوال پیدا ہوا کہ پھر میں کیا کروں؟ جواب میں فرمایا قل آپ ان کو کائنات میں نظر کی دعوت دیں اس سے معلوم ہوا کہ معرفت حقیقت کی راہیں صرف دو ہیں نظر اور فکر۔ یہاں نظر سے نظر قلبی اور بصری دونوں مراد ہیں۔ فکر یہ کہ اللہ سبحانہ کی دی ہوئی عقل سے کام لیں اور سوچیں اور سمجھیں یہی نظر قلبی ہے اور نظر بصری یہ کہ کارخانہ ہستی کے عجائب و دقائق کا مشاہدہ کریں اور اس سے بصیرت حاصل کریں۔ جو شخص ان دو باتوں سے محروم ہے وہ اندھا بہرا ہے اور گمراہی سے

لوٹنے والا نہیں ہے اسے دنیا بھر کی نشانیاں کام نہیں دے سکتی ہیں. یہاں لفظ عن قوم کو نکرہ لاکر اس کی صفت لا یومنون لاکر یہ بتانا ہے کہ بے ایمانی ان کا قومی شعار بن چکی ہے اگر جملہ عن قوم لا یومنون کی جگہ عمن لا یؤمنون ہوتا تو یہ معنویت نہ پیدا ہوتی. عنبری کے شعر میں بھی یہی بات کہی گئی ۔

قوم اذا الشر ابدی ناجذیہ لھم — طاروا الیہ زرافات ووحدانا

یعنی میدان جنگ میں شجاعت کے جوہر دکھانا ان کا قومی نشان ہے ۔

مطالبہ عذاب کا جواب

۱۰۲ لہذا اب کبھی کیا یہ لوگ ماننے کے لیئے گذشتہ تاریخ کے دہرائے جانے کا انتظار کر رہے ہیں اگر ایسا ہے تو آپ فرما دیجئے کہ انتظار کرو میں بھی انتظار کرنے والوں میں تمہارے ساتھ ہوں ایسی ضدی اور معاند قوم کے لئے جو کسی دلیل اور نشان کو نہ ماننے اور کچھ باقی نہیں بجز اس کے کہ گذشتہ مکذبین پر جو آفات وحوادث نازل ہوئے ہیں ان کا یہ بھی انتظار کریں سو بہتر ہے کہ ہم اور تم دونوں مل کر اس وقت کا انتظار کرتے ہیں. تاکہ صادق وکاذب کا آخری فیصلہ سامنے آجائے ل‍ہ

کفار کے لیئے نتائج سے معجزات کی دو قسمیں ہوتی ہیں. معجزہ ہدایت اور معجزہ ہلاکت. نبوت پہلے کفار کو ہدایت کی نشانیاں دکھاتی ہے اور ان کو حق کی دعوت دیتی ہے. کفار کی کثیر تعداد میں جس قدر صالح اجزا ہوتے ہیں وہ اس دعوت کو قبول کرتے جاتے ہیں یہاں تک کہ بالآخر وہ وقت آجاتا ہے جب مادہ فاسد کے سوا کفار میں کوئی صلاحیت پذیر عنصر باقی نہیں رہتا یعنی اس کثیف مادے سے چھٹ کر تمام اجزائے لطیفہ الگ ہو جاتے ہیں اور ڈھیر بھوسں کے سوا باقی کچھ نہیں رہتا تو اس وقت آیت ہلاکت آسمان کی بجلی فضا کی آندھی. زمین کا سیلاب لوہے کی تلوار بن کر رونما ہوتی ہے. اور سطح خاکی کو ان کے وجود کی نجاست سے پاک کر دیتی ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک سے زیادہ معجزے عطا ہوئے کہ ان کو دکھا کر فرعون کو حق کی طرف دعوت دی جائے جب ایک مدت کے بعد اہل مصر میں سے جس قدر لوگ ایمان لا سکتے تھے لے آئے تو حضرت موسیٰ کو شق بحر کا معجزہ ہلاکت عنایت ہوا. حضرت نوح معجزہ طوفان حضرت

صالح کو ناقہ اور حضرت لوط کو ہلاکت سدوم کی نشانی اور حضرت شعیب کو آیت رجفہ عطا ہوئی ان میں سے ہر معجزہ اور نشانی کے بعد معاندین کی ہلاکت استیصال اور بربادی ہوئی۔ قرآن نے اسی کو مثل الذین من قبلھم کہاہے کہ ہر پیغمبر کی قوم میں اسی طرح ہوتا چلا آیا ہے۔ یہاں ھل استفہامیہ کے ذریعے قریش مکہ سے یہی سوال کر رہا ہے کہ معجزات ہدایت تو یکے بعد دیگرے آچکے ہیں۔ اب تمہیں صرف معجزہ ہلاکت کا انتظار ہے۔ اس آیت میں قریش کو اسی کی اطلاع دی جارہی ہے کہ اب تمہاری فرصت اور مہلت کی آخری گھڑی ہے۔ اور معجزہ ہلاکت تمہارے سر پر ہے

فقل فانتظروا میں فا تفریع کے لیئے ہے یعنی جب معجزات ہدایت اور ڈراونی باتیں ان کو کام نہیں دیتی ہیں۔ تو پھر کیا کررہے ہیں اب معجزہ ہلاکت کا انتظار ہے پیغمبر ان سے کہو اگر تم بھی چاہتے ہو تو بس انتظار کرو کہ گذشتہ قوموں جیسا تمہاری ساتھ معاملہ ہو۔ یہاں انی معکم من المنتظرین میں اٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے ہم تو انتظار کریں گے آپ کیا کریں گے۔ فرمایا تم ہلاکت کا انتظار کرو۔ میں اللہ سبحانہ کی مدد کا انتظار کروں گا۔ آیت میں معیت نفس انتظار میں ہے۔ نتیجہ انتظار میں نہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ کو قریش کے لیئے معجزہ ہلاکت کا بے حد صدمہ تھا۔ تاہم قریش کو آخری کی اس آیت میں اطلاع دی اور وہ نادان استہزا کرتے تھے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں اکثر کہتے کہ جس ہلاکت کی آنے کی بار رہے وہ کب آئے گی۔

ویقولون لولا انزل علیہ آیۃ من ربہ فقل انما الغیب للہ فانتظروا انی معکم من المنتظرین۔

وہ کہتے ہیں کہ کیوں نہیں اتاری گئی نشانی اس کے رب کی طرف سے آپ فرما دیجئے کہ غیب تو اللہ ہی جانتا ہے تم انتظار کرو میں تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔

اہل ایمان کے لیئے بشارت

ف۱۰۵ پھر اس وقت ہم اپنے رسولوں کو اور اہل ایمان کو بچالیں گے ایسا ہی ہو کر رہے گا۔ اہل ایمان کو بچا لینا ہماری ذمہ داری ہے یعنی جیسی پہلی قوموں کے ساتھ ہماری عادت رہی ہے کہ منکرین کو ہلاک کرکے پیغمبروں اور مومنین کو بچایا۔ اسی طرح موجودہ اور آئندہ مومنین کی نسبت ہمارا وعدہ ہے

کر ان کو نجات دیں گے۔ آخرت میں عذاب الیم سے اور دنیا میں کفار کے مظالم اور سختیوں سے ہاں شرط یہ ہے کہ مومنین مومنین ہوں یعنی وہ صفات وخصال رکھتے ہوں جو قرآن وحدیث میں مومنین کی بیان ہوئی ہیں لہ

پہلی آیت میں مخالفین کو معجزہ ہلاکت کی اطلاع دی گئی تھی۔ اور عذاب والی جگہ میں اللہ کا رسول اور اہل ایمان بھی رہتے ہیں۔ اس لیے فرمایا۔ ثم ننجی رسلنا والذین آمنوا علامہ بقاعی فرماتے ہیں کہ ثم تراخی کے لئے آتا ہے۔ اس سے معلوم ہو کہ قریش مکہ کا ابتلا طویل ہوگا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ اس وقت رسول اور اہل ایمان کی نجات کا عمل بڑا عظیم اور کذالک سے یہ بات جتائی کہ جیسا کافروں کو معجزہ ہلاکت کے ذریعہ ہلاک کرنا ہمارا کام ہے اور اہل ایمان کو بچالینا ہماری ذمہ داری ہے۔

نبوت جو مقصد لے کر آتی ہے خواہ کسی قدر مشکلات پیش آئیں کتنی ہی رکاوٹیں ہوں کتنی ہی تکلیفوں اور زحمتوں کا سامنا ہو۔ بالآخر وہ مقصد کامیاب ہی ہوتا ہے۔ نبوت کی سیرت اور اس کی دعوت کی تاریخ خود اس پر گواہ ہے۔

انهم لهم المنصورون وان جندنا لهم الغالبون۔

نہ صرف دنیا میں بلکہ آخرت میں بھی ان ہی کو اور ان کے ذریعے اہل ایمان کو کامیابی ہوگی۔ نبوت کی تاریخ میں ایسے سخت وقت آتے ہیں جب ان کو اپنی قوم کی ہدایت سے پوری مایوسی ہو جاتی ہے۔ اور امید کی روشنی کسی طرف سے دکھائی نہیں دیتی اور عذاب میں تاخیر کی وجہ سے ان کے منکر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کو عذاب کی دہمکی جھوٹ دی گئی تو دفعتہ امید کا دروازہ کھلتا ہے۔ اور اللہ سبحانہ کی تائید ونصرت کے پہرے اس طرح آتے دکھائی دیتے ہیں کہ صالح لوگوں کے لئے دل قبول کے لیے کھول دیئے جاتے ہیں اور معاندوں پر کسی نہ کسی طرح عذاب آکر ان کا استیصال کر دیتا ہے۔ اللہ سبحانہ کی اسی نصرت کا ان کو یقین ہوتا ہے کہ وہ ہر مشکل کو اس ارادہ میں جھیل لیتے ہیں اور اپنے سروں کو ہتھیلیوں پر لیئے پھرتے ہیں۔ مخالفتوں کی فوج ولشکر، تیغ وخنجر اور خوف وخطر کے باوجود اپنی دعوت میں کوئی کمی نہیں ہونے دیتے اور کسی قیمت پر بھی مخالفوں سے صلح پر آمادہ نہیں ہوتے۔ منکروں کو شروع شروع میں ان کی ظاہری بیچارگی اور تنہائی دیکھ کر ان کی ناکامی کا گمان ہوتا ہے لیکن اللہ سبحانہ ان کے سوء ظن کی تردید کر کے فرماتا ہے۔ فلا تحسبن اللہ مخلف وعدہ

ورسلہ۔ ازل کے دن ہی یہ قانون بن چکا ہے کہ سچائی کے ان پکارنے والوں ہی کی آخر جیت ہوگی
کتب اللہ لاغلبن انا ورسلی۔

علامہ آلوسی یہاں یہ بات بے حد وزنی لکھی ہے کہ آیت بتا رہی ہے کہ مدار نجات ایمان ہے۔
قاضی بیضاوی کا یہ استنباط بھی لطیف ہے کہ حقا علینا ننجی میں المؤمنین ہی ذمہ داری کا وجوب وعدے
کی وجہ سے ہے۔ کسی استحقاق کی بنیاد پر نہیں کیونکہ مخلوق کا خالق پر کوئی حق نہیں ہے بہرحال قرآن عزیز
نے اس حقیقت کو بار بار مختلف پیرایوں میں واضح کیا ہے کہ عذاب الہٰی جب آتا ہے صرف
کافروں اور منکروں پر آتا ہے اور اہل ایمان کو اس سے بچا لیا جاتا ہے اور یہیں سے یہ بات بھی
واضح ہو جاتی ہے کہ تکوینی حادثہ جس میں مومن و کافر سب بلا امتیاز و تفریق مبتلا ہو جاتے ہیں۔
ہرگز صحیح معنے میں عذاب الہٰی نہیں زیادہ سے زیادہ اسے ایک تنبیہ کہا جا سکتا ہے۔

آیت میں اہل ایمان کی نجات اور اہل کفر کی ہلاکت کا جو مسئلہ بیان ہوا ہے وہ ایک عظیم
حقیقت کا انکشاف کرتا ہے کہ نبوت کے مدمقابل ارباب اقتدار کو ہلاک کر دیا جاتا ہے۔
اور اہل ایمان کو بچا لیا جاتا ہے۔ تو لازماً اقتدار اہل ایمان کو منتقل ہو جاتا ہے۔ بتانا یہ چاہتا
ہوں کہ نبوت جو مشن لے کر آتی ہے وہ آخری عملی شکل کے لحاظ سے ایک دینی اور اسلامی
حکومت کا قیام ہی ہوتا ہے ورنہ دشمنوں کی ہلاکت اور اہل ایمان کے بچانے میں کوئی معنویت ہی
نہیں ہے۔ اس طرح ان واقعات و قصص کا بنیادی مطالبہ یہ ہے کہ نبوت کا مشن لے کر چلنے والوں
کا منتہائے نظر لازماً یہ ہونا چاہیئے کہ اقتدار نبوت کے کام کرنے والوں کے ہاتھ میں ہو۔ یہی دعوت نبوت
کا حد کمال ہے۔ اس پر تفصیلی بحث انشاءاللہ اٹھارہویں پارے میں آ رہی ہے۔

قُلْ
يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ فِي شَكٍّ مِنْ دِينِي فَلَا أَعْبُدُ الَّذِينَ
تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ أَعْبُدُ اللَّهَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُمْ ۖ
وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٠٤﴾ وَأَنْ أَقِمْ وَجْهَكَ
لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٠٥﴾ وَلَا تَدْعُ
مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۖ فَإِنْ فَعَلْتَ
فَإِنَّكَ إِذًا مِنَ الظَّالِمِينَ ﴿١٠٦﴾ وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا
كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ ۖ وَإِنْ يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهِ ۚ
يُصِيبُ بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۚ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿١٠٧﴾

اے اللہ کے رسول لوگوں سے کہہ دو کہ اے لوگو! اگر تم میرے دین کے معاملے میں کہیں شک میں ہو تو سن لو کہ میں ان کی عبادت نہیں کرتا ہوں جن کی تم اللہ سے ورے عبادت کرتے ہو۔ بلکہ میں تو صرف اس اللہ

کی عبادت کرتا ہوں جس کے قابو میں پوری طرح تمہاری جانیں ہیں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ ایمان والوں سے ہوں اور اے پیغمبر اپنے آپ کو سب سے ہٹا کر دین کا ہو کر رہ جا اور مشرکین میں سے ہرگز نہ ہو ۱۰۶ اور اللہ سے ورے ان کو نہ پکار جو تجھے نہ نفع دیتے ہیں نہ نقصان پس اگر تو نے ایسا کیا تو تو بھی ان ظالموں میں سے ہو جائے گا ۱۰۷ دیکھو اگر اللہ کی جانب سے کوئی تکلیف آئے گی تو اسے اللہ کے سوا ہٹانے والا کوئی نہیں ہے اور اگر تمہارے ساتھ کسی خیر کا ارادہ کرے گا تو اس مہربانی کو لوٹا دینا کسی کے بس کی بات نہیں ہے اللہ کی شان یہ ہے جسے چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے اپنے فضل سے نوازتا ہے وہ بہت ہی بخشش والا اور بڑا ہی مہربان ہے ۱۰۸

اسلام واضح اور صاف ہے

دین اسلام صاف اور واضح راستہ ہے اس میں اہم اور بنیادی چیز ایمان باللہ ہے ایمان باللہ کے ناگزیر تقاضے یہ ہیں۔ اللہ کے سوا کوئی دوسری ہستی نہیں جو خود بخود وجود رکھتی ہو۔ یہاں ہر چیز مخلوق ہے اللہ کی پیدا کی ہوئی ہے اسی کی ملک ہے اسی کی محتاج ہے اسی کی محکوم ہے کوئی چیز کوئی مخلوق اپنے اندر ذاتی صفت نہیں رکھتی ہے۔ جو وصف بھی کسی میں ہے وہ اللہ کا عنایت کردہ ہے اور صرف اسی وقت تک اس کے پاس رہ سکتا ہے جب تک وہ چاہے۔ اللہ سبحانہ کی ذات اقدس ساری کائنات سے مختلف ہے

اور کسی طرح سے بھی کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے۔ کسی بڑی سے بڑی ہستی پر اس کو قیاس نہیں کیا جا سکتا ہے نہ وہ کسی کا باپ ہے نہ بیٹا اور نہ وہ اور ہستی کے ساتھ متحد ہے نہ اس کے اندر حلول کرتا ہے وہ جسم نہیں رکھتا ہے اور نہ جسمانیت رکھتا ہے۔ صرف وہی ہے جس کی رضا جوئی کی انسان کو فکر کرنی چاہیئے۔ وہی انسان کے سارے کاموں کا محرک ہونا چاہیئے۔ اور اصل مقصد بھی سارے اعمال صرف اللہ کے لیئے مخصوص رکھنے چاہئیں خواہ وہ پرستش کی قسم ہوں اور خواہ بندگی کی قسم سے ہوں۔ سجدہ صرف اللہ کو کیا جا سکتا ہے نذر صرف اسی کے نام کی مانی جا سکتی ہے۔ دعا صرف اسی سے کی جا سکتی ہے نادیدہ پناہ صرف اسی کی ڈھونڈی جا سکتی ہے۔ غیبی امداد کے لیئے صرف اسی کو پکارا جا سکتا ہے۔ جذبات و احساسات بھی اللہ کے ساتھ خاص کر دینے چاہئیں جن کے اندر پرستش کی روح پائی جاتی ہو توکل صرف اسی پر کیا جائے۔ امیدیں صرف اسی سے وابستہ کی جائیں۔ تقویٰ صرف اس کا اختیار کیا جائے۔ خوف اسی کا رکھا جائے حقیقی محبت صرف اسی سے کی جائے۔ اس پوری کائنات میں اقتدار اعلیٰ اسی کا مانا جائے۔ حکم دینے منع کرنے اور اپنی مرضی پوری کرانے کا اصلی مستحق وہی ہے حقیقی شارع اور حقیقی قانون ساز بھی وہی ہے۔ اللہ سبحانہ کے سوا اور کوئی نہیں جو اپنے اندر معبودیت کی شان رکھتا ہو۔ جو پوجے جانے کا مستحق ہو۔ جس کی رضا چاہی جائے۔ کوئی اور نہیں جو اس لائق ہو کہ اس کے آگے پیشانیاں جھکیں نذریں پیش کی جائیں۔ کوئی اور نہیں جسے ولی کارساز حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے جس سے دعائیں اور حاجتیں مانگی جائیں اور جسے غیبی مدد کے لیئے پکارا جائے۔ کوئی اور نہیں جس پر توکل کیا جائے۔ دل میں جس کا خوف اور خشیت رکھا جائے۔ جس سے امیدیں وابستہ کی جائیں اور جس سے حقیقی محبت رکھی جائے۔ کوئی اور نہیں جس کے پاس حقیقی اقتدار ہو اور جو بال برابر بھی کسی کو نفع یا نقصان پہنچا سکے۔ جو کسی کے لیئے قانون بنانے اور اپنا حکم چلانے کا ذاتی استحقاق رکھتا ہو اور جس کی بے قید اطاعت جائز ہو۔ یہ ہے نبوت کا دین۔ یہی اسلام کی بنیاد ہے ۱۱۶ اے اللہ کے رسول لوگوں سے کہدو کہ اے لوگو! اگر تم میرے دین کے معاملے میں کسی شک میں ہو تو سن لو کہ میں ان ہستیوں کی عبادت نہیں کرتا ہوں جن کی تم اللہ سے ورے عبادت کرتے ہو۔ بلکہ میں تو صرف اس اللہ کی عبادت کرتا ہوں جس کے قابو میں پوری طرح تمہاری جانیں ہیں اور مجھے تو حکم دیا گیا ہے کہ ایمان والوں کے

معاشرے کا فرد ہوں۔ اور اے پیغمبر اپنے آپ کو سب سے ہٹا کر دین کا ہو کر رہ جا اور مشرکین سے کسی طرح کا لگاؤ نہ رکھ۔ یعنی اگر میرا طریقہ اور مسلک دینی تمہاری سمجھ میں نہیں آتا ہے اس لیئے اسکی نسبت شکوک و شبہات میں پھنسے ہوئے ہو تو میں اپنے دین کا اصل اصول جو توحید خالص ہے سمجھائے دیتا ہوں خلاصہ یہ ہے کہ میں تمہارے ان فرضی معبودوں کی عبادت سے سخت متنفر اور بیزار ہوں جس کے اختیار کرنے کا امکان بھی کبھی میری طرف سے دل میں نہ لانا۔ میری عبادت خالص اس اللہ کے لیئے ہے۔ جس کے قبضے میں تمہاری سب کی جانیں ہیں کہ وہ جب تک چاہے انہیں جسموں میں چھوڑے رکھے اور جب چاہے ایک دم کھینچ لے گویا موت وحیات کا رشتہ جس کے ہاتھ میں ہے بندگی اسی کی ہو سکتی ہے نہ صرف یہ کہ جوارح سے اس کی بندگی کی جائے۔ ضروری ہے۔ کہ دل میں اس کی توحید پر پورا یقین و ایمان ہو۔ اسی دین حنیف پر جو ابراہیم خلیل اللہ کا دین ہے پوری ہمت اور توجہ سے مستقیم رہ کر شرک جلی وخفی کا تسمہ نہ لگا رہنے دیا جائے۔ جس طرح عبادت اسی کی کریں استعانت کے لیئے بھی اسی کو پکاریں۔ کیوں کہ ہر قسم کا نفع و نقصان اور بھلائی برائی تنہا اسی کے قبضے میں ہے ؎

اگرچہ شارحین قرآن نے اس کو قل انظروا آیت کے ساتھ مربوط کیا ہے مگر دراصل فهل ینتظرون الا مثل ایام الذین الخ کے بعد جب یہ کہا گیا کہ ان سے کہو کہ تم اپنی ہلاکت کا انتظار کرو میں تمہاری ساتھ اپنی نصرت کا انتظار کر رہا ہوں اور اس کے بعد ارشاد کہ اپنے رسولوں اور اہل ایمان کا بچا لینا ہمارے ذمہ ہے یہاں پہنچ کر معاً سوال پیدا ہوا کہ اس مرحلہ پر نبوت کا فرض کیا ہے فرمایا آپ کا کام یہ ہے کہ آپ لوگوں کو دین کی حقیقت بتائیں۔ یہاں الناس سے مشرکین مکہ مراد ہیں یا پوری امت دعوت مراد ہے آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس دین کی معرفت کے بارے میں تمہیں کوئی شک ہے مجھے تو تمہارے دین کے غلط ہونے کا یقین کامل ہے لیکن اگر تم میرے دین کی معرفت میں کسی شک کا شکار ہو تو تمہیں میرے دین کا یہ خلاصہ سمجھ لینا چاہیئے کہ میں ان ہستیوں کی عبادت نہیں کروں گا۔ جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو۔ میرے عابدانہ تعلقات تو ہر حال میں اللہ سبحانہ سے وابستہ رہیں گے جس کے قبضہ میں تم سب کی جانیں ہیں۔ یہاں لفظ

؎ افادات شیخ الاسلام

تو فی کے لانے میں بڑی گہری معنویت ہے یہ ان کے مسلمات سے استدلال ہے۔ کیونکہ ان کا مشرکانہ ذہن اس حد تک نہیں بگڑا تھا کہ موت وحیات پر بھی اپنے معبودوں کے لیئے کوئی دعوی رکھتے ہوں اور اس میں ان پر ایک میٹھی سی تعریض بھی ہے کہ تم اس کردار کے ذریعے اپنی موت کو دعوت دے رہے ہو پورے دین کا چہرہ ایسے بلیغ اور لطیف انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ پہلے جملہ منفیہ لا کر شرک کا ابطال کیا گیا ہے۔ اور بعد میں جملہ مثبتہ کے ذریعے توحید عبادت کا اعلان کیا ہے گویا لا اعبد الذین تعبدون من دون اللہ بنا بت کر رہا ہے لا الہ اور اعبد اللہ الذی یتوفاکم آیا ہے الا اللہ کی جگہ اور یہی دین نبوت کا خلاصہ ہے ذہنوں میں کوئی تصور واضح اسی وقت ہوتا ہے جب کہ اس کے مخالف تصور کو ساتھ کے ساتھ اور پہلے بیان کر دیا جائے۔ اس لئے اہم اصول ونظریات کی وضاحت کے وقت عموماً اس بات کا اہتمام ضرور کیا جاتا ہے۔ کہ ان کے مخالف اصولوں کو ان کے بالمقابل رکھا جائے۔ توحید عبادت سے زیادہ کس نظریے اور عقیدے کی اہمیت ہو سکتی ہے۔ یہاں توحید عبادت کا چہرہ پیش کرتے ہوئے جو جملہ مثبتہ لائے ہیں اس میں اللہ سبحانہ کی ساری صفات کو چھوڑ کر اللہ الذی یتوفاکم یعنی وہ جس کا تمہاری موت وحیات پر پورا پورا اور ہر وقت قبضہ وقابو ہے جو تم پہ ایسا حاکمانہ اقتدار رکھتا ہے کہ تمہاری زندگی کے انفاس کا بقا اس کی مرضی پر موقوف ہے۔ میں تو صرف اسی کی پرستش اور بندگی کرتا ہوں۔ اسی کی بندگی اور اطاعت کرتا ہوں۔ اور سب کو چھوڑ کر صرف اسی کی عبادت اس لئے کرتا ہوں کہ زندگی اور موت پر صرف اس کا اقتدار ہے کمال بلاغت یہ ہے کہ وہ الذی یتوفانی کی جگہ الذی یتوفاکم فرمایا۔ اس طرح ایک ہی تعبیر میں۔ دعوی۔ دلیل دعوی اور دعوت تینوں جمع ہو گئے اور اس میں یہ تعریض بھی آگئی ہے کہ مجھے ہی نہیں تمہیں بھی اس کی عبادت کرنی چاہیئے۔ یہ تمہاری ضلالت ہے کہ اس کے سوا اوروں کی عبادت کرتے ہو۔

آخری فیصلہ کن اعلان

۱۰۶ اور اللہ سے ورے ان کو نہ پکارو جو تجھے نہ نفع دیتے اور نہ نقصان اگر تو نے ایسا کیا تو تو ان ظالموں میں سے ہو جائے گا۔ ہر قسم کا نفع ونقصان اور بھلائی برائی تنہا اسی کے قبضے میں ہے۔ مشرکین کی طرح ایسی چیزوں کو مدد کے لیئے پکارنا جو کسی نفع ونقصان کی مالک نہ ہوں سخت

بے موقع بات بلکہ ظلم عظیم یعنی شرک کا ایک شعبہ ہے۔ اگر بفرض محال نبی سے ایسی حرکت صادر ہو تو ان کی عظیم الشان شخصیت کے پیش نظر ظلم اعظم ہو گا۔[1]

اگرچہ شارحین قرآن نے فان فعلت کو لا تدع من دون اللہ الخ کے ساتھ جوڑا ہے اور فعل کو دعا کیلئے کنایہ قرار دیا ہے۔ لیکن میرے خیال میں فان فعلت دونوں ممانعتوں پر تفریع ہے۔ یعنی لا تکونن من المشرکین اور لا تدع من دون اللہ۔ مطلب ان دونوں میں جو بھی کردار اختیار کیا جائے اس کی معذرت قبول نہ ہو گی۔ پہلے کا تعلق بندگی سے ہے اور دوسرے کا تعلق پرستش سے ہے۔ علت دونوں کی ظلم ہے۔ بندگی کے بارے میں لا تکونن من المشرکین یعنی ان لوگوں سے ہرگز تعلق نہ رکھو جو اللہ کی حاکیت میں کسی طور سے غیر اللہ کو شریک کرتے ہیں۔ اہل ایمان کو ایک جگہ مخاطب کر کے فرمایا ہے۔ وان اطعتمو هم انکم لمشرکون اگر ان کی اطاعت کرو گے تو بلا شبہ تم بھی شرک کرنے والے ہو۔ اس حاکیت میں شرک کے لیے سہارا خواہ ان کی اپنی ہوائے نفس ہو یا کوئی دوسرا انسان ہو یا انسانوں کی کوئی جماعت ہو۔ پس مطالبہ صرف مثبت انداز میں نہیں بلکہ منفی انداز میں بھی ہے۔ کہ ان لوگوں سے علیحدگی اختیار کر لو جو کسی صورت میں شرک کی آلودگی رکھتے ہیں۔ صرف انفرادی زندگی میں نہیں بلکہ اجتماعی نظام مسجدوں اور عبادت گاہوں میں ہی نہیں۔ بلکہ درس گاہوں عدالت خانوں میں بھی۔ قانون سازی کی مجالس میں بھی سیاست کے ایوانوں میں بھی۔ معیشت کے مختلف گوشوں میں بھی۔ غرض ان لوگوں سے اپنا طریقہ الگ کر لو۔ جنہوں نے اپنے افکار و اعمال اخلاق، معیشت۔ معاش اور قانون کا نظام نا خدا شناسی اور خدا کی کھلم کھلا بغاوت پھر یا نام نہاد خدا پرستی اور نفس پرستی پر قائم کر رکھا ہے۔ پھر مطالبہ صرف یہی نہیں یہ تو بندگی میں اور اطاعت میں شرک سے متعلق ہے بلکہ پرستش میں بھی شرک سے کھول کر منع کیا ہے کہ اللہ سے ورے کسی کے سامنے دعا کے لیے ہاتھ نہ اٹھا خواہ کوئی روح ہو جن ہو یا فرشتہ ہو ولی ہو نبی ہو یا کوئی مادی یا خیالی یا وہمی وجود ہو۔ کیا بلیغ اور لطیف انداز ہے کہ عبادت کے موقع پر الذین تعبدون من دون اللہ کی تعبیر اختیار فرمائی اور دعا کے موقع پر مالا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ینفعہ کا انداز اپنایا۔ پہلی تعبیر ذوی العقول کی ہے جب کہ دوسری تعبیر بے جان اور غیر ذوی العقول کی ہے مشرکین جن بتوں اور مورتیوں کی پرستش کرتے تھے۔ ان کی دو حیثیتیں تھیں۔ ایک وہ اشخاص ہیں جو مٹی، لوہے لکڑی اور پتھر سے بتوں کی صورت میں بنائے جاتے ہیں اور ایک وہ شخصیتیں ہیں جن کے یہ بت اور مورتیاں ہیں قرآن شخصیتوں کے اعتبار سے تعبیر ذوی العقول کی اور ٹھاکروں اور اشخاص کے اعتبار سے تعبیر غیر ذوی العقول کی اختیار کرتا ہے۔ اختلاف تعبیر سے دونوں کی ممانعت مقصود ہے یعنی پرستش کی حدود میں اشخاص سے دعا کی اور شخصیتوں سے بھی دعا کی ممانعت ہے نہ بت سے دعا کرو اور نہ اس سے دعا کرو جس کا بت بنایا گیا ہے۔ ان میں سے کسی سے بھی عابدانہ لگاؤ ایمان کی بربادی ہے یہی حکم قبر اور صاحب قبر کا ہے۔ ان سے عابدانہ تعلقات بھی شرک جلی ہے۔ جب تک شرک کی آلودگی سے دامان ایمان محفوظ نہ ہوگا توحید ایک بے معنی اور بے حقیقت دعویٰ ہے۔

اللہ سبحانہ کی حقیقی عظمت

۱۱۸ دیکھو اگر اللہ کی جانب سے کوئی تکلیف آئے گی تو اسے اللہ کے سوا ہٹانے والا کوئی نہیں ہے اور اگر تمہارے ساتھ اللہ خیر کا ارادہ کرے گا تو اس مہربانی کو لوٹا دینا کسی کے بس کی بات نہیں ہے اللہ کی شان یہ ہے جسے چاہتا ہے اپنے بندوں میں اپنے فضل سے نوازتا ہے۔ وہ وہ بہت ہی بخشش والا اور بڑا ہی مہربان ہے۔ جب ان چیزوں کے پکارنے سے منع کر دیا جن کے قبضے میں تمہارا بھلا یا برا نہیں ہے تو مناسب ہوا کہ اس کے بالمقابل مالک علی الاطلاق کا ذکر کیا جائے جو تکلیف و راحت اور بھلائی برائی کے پورے سلسلہ پر کامل اختیار اور قبضہ رکھتا ہے جس کی بھیجی ہوئی تکلیف کو دنیا میں کوئی ہٹا نہیں سکتا اور جس پر فضل و رحمت فرمانا چاہیئے کسی کی طاقت نہیں کہ اسے محروم کر سکے لے یہ آیت پہلی آیت سے مربوط ہے۔ پہلے بتایا گیا تھا۔ لا تدع من دون اللہ ما لا ینفعک ولا یضرک۔ مشرکین عرب کا عقیدہ تھا کہ دیوتا اور ان کے بت اللہ کی طرف سے دونوں عالم میں مختار کل ہیں دینے اور نہ دینے کا اور اس عالم میں بخشنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ اس عقیدے کا نام ان کے یہاں شفاعت تھا۔ اور یہ دیوتا اسی معنے میں ان کے شفیع تھے قرآن نے پہلے اعلان کیا ہے کہ یہ تصور غلط ہے وہ

کسی طرح کے کسی نفع و نقصان کے مالک نہیں ہیں اس کے مقابلے میں اس آیت میں اللہ سبحانہ کی عظمت کا جلوہ نمایاں کیا۔ جو آسمان کے اوپر سے لے کر زمین کے نیچے تک تنہا مالک ہے اس کے کاروبار میں دوسرا شریک نہیں۔ اس کی شاہنشاہی میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں۔ اس کے کارخانہ قدرت میں کوئی دوسرا ساجھی نہیں کائنات کا کوئی ذرہ اس کے حکم سے باہر نہیں۔ دنیا کی کوئی چیز اس کی نگاہوں سے چھپی نہیں۔ شجر و حجر، جنگل پہاڑ، صحرا اور دریا، سورج چاند، دریا، زمین و آسمان۔ انسان و حیوان۔ زبان والے اور بے زبان سب اس کے آگے سربسجود اور اس کی تسبیح و تہلیل میں مصروف ہیں۔ وہی ایک قوت والا ہے سب کمزور ہیں۔ وہی ایک علم والا ہے سب نادان ہیں۔ اسی کو بقا ہے سب فانی ہیں۔ وہ ہی ایک بے نیاز ہے سب محتاج ہیں۔ سب اس کے بندے ہیں وہی ایک شہنشاہ ہے۔ عرش سے فرش تک جو کچھ ہے وہ اس کا ہے۔ اور اس پر اس کی حکمرانی ہے وہ اگر کسی کو سزا دے تو اسے اس کے سوا ہٹانے والا کوئی نہیں۔ اگر وہ کسی کے ساتھ بھلائی کرے تو اس کے فضل و کرم کا روکنے والا کوئی نہیں ہے گویا یہ آیت بتا رہی ہے کہ کائنات کی کوئی طاقت ارادہ الٰہی میں روک نہیں بن سکتی۔ ارادہ نفع کا ہو نقصان کا۔

آیت میں نقصان کے ذکر میں مس کا ذکر ہے جب کہ خیر میں ارادہ آیا ہے۔ قاضی بیضاوی نے اس کی معنویت پر یہ بات خوب فرمائی ہے کہ خیر کے ارادہ یہ بتانے کے لیئے لائے ہیں کہ خیر کا ارادہ بالذات ہے اور یہ اصل ہے اور ضرر ایک اضافی چیز ہے، اس کا ظہور رحمت الٰہی کے موقعہ پہ ہوتا ہے۔ اور اس سے بڑھ کر لطافت یہ ہے کہ ضرر کے موقعہ پر ضمیر لائے لیکن خیر کیلئے ضمیر نہیں لائے بلکہ فرمایا و ندراد مقصد بتانا یہ ہے کہ دنیا میں خیر جو کچھ جتنی کچھ بھی ہے وہ کسی استحقاق کی بنا پر نہیں بلکہ محض اللہ کا فضل ہے۔ فلا راد لفضلہ

آخر میں فرمایا یصیب بہ من یشاء من عبادہ، اللہ سبحانہ اپنے فضل سے جسے چاہتا ہے نواز دیتا ہے یہاں اصابت، کو مجمل رکھا ہے اس کے اسباب کی تفصیل نہیں کی مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ خیر کا فیضان اسباب کے تحت ہی کرتا ہے اور بغیر اسباب کے بھی۔ کیونکہ فضل الٰہی عموم رحمت کی وجہ سے بندوں پہ عام ہے برخلاف ضرر کے کہ اس کا وقوع ہمیشہ اسباب ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ خواہ اسباب خاص ہوں یا عام۔ بالکل آخر میں ارشاد ہوا ہے وھو الغفور الرحیم یعنی اللہ سبحانہ کی جانب سے بندوں پر خیر کا فیضان خیر محض اس کی رحمت اور اس فیضان خیر کے لیئے

اللہ سبحانہ بندوں کی ان کوتاہیوں گناہوں کو معاف کرتا ہے جو خیر کے راستہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ اگر پہلے اللہ کی بات سے مغفرت کا فیضان نہ ہو تو بندوں میں اصابت خیر کی اہلیت اور صلاحیت ہی نہ ہو۔ اسی لئے اسلام میں استغفار کی بے حد اہمیت ہے۔ استغفار گناہوں کا کفارہ ہے۔ کیونکہ انسان کے تمام کاروبار اصل چیز اس کا دل ہے اسی سے وہ پاک ہوتا ہے اور اسی سے وہ ناپاک بنتا ہے۔ انسان کا دل اگر خلوص کے ساتھ کسی وقت اللہ سبحانہ کی طرف رجوع کرے اور اپنی تقصیروں اور فروگذاشتوں پر اس کی بارگاہ میں نادم و شرمسار ہو کر اللہ سے معافی مانگے اسی کا نام استغفار ہے اللہ کی ذات الغفور ہے گناہوں کے آثار کو مٹا کر انسان کو اپنی رحمت کے فیضان کے قابل بناتی ہے آیت میں اسی نکتہ کی وجہ سے اس قدر مقدم ہے۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ
اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا
يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَاۤ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۱۰۸﴾ وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى
اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚۖ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾

اے اللہ کے رسول کہدو لوگو! تمہارے رب کی جانب سے تمہارے پاس حق آچکا ہے۔ لہٰذا جو شخص اس کی رہنمائی میں زندگی گذارے گا۔ اس کا فائدہ اسی کو ہوگا۔ اور جو شخص اس کی راہ سے بھٹک جائے گا۔ تو اس کا نقصان خود اٹھائے گا۔ اور میں اللہ کی جناب میں تمہارے اعمال کا ذمہ دار نہیں ہوں ۱۰۸ اے پیغمبر اب تو صرف اسی چیز کا اتباع کیجئے جو وحی الٰہی آپ کو بتا رہی ہے۔ اور اللہ کا فیصلہ ہونے تک آپ اسی پر ڈٹے رہیئے۔ اللہ ہی بہترین فیصلہ کرنیوالا ہے۔ ۱۰۹

محمد رسول اللہ کی دعوت میں اصل الاصول دو باتیں ہیں ۔ ایک توحید کامل دوسرے رسالت عمومی ۔ اس سے پہلی آیت میں توحید کامل کو پیش کیا ہے اور اس آیت میں یا ایھا الناس کہہ کر عموم رسالت کو پیش فرمایا ہے ۔ یعنی جو حق آپ لے کر آئے صرف اسی شہر اسی ملک اور اسی زمانے کے لوگوں کے لیے نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لیئے ہے یہ بات قرآن کی مکی سورتوں میں ایک سے زیادہ تعبیرات میں دہرائی گئی ہے کہیں فرمایا ہے ۔

واوحی الی ھذا القرآن لانذرکم بہ ومن بلغ

یہ قرآن میری طرف وحی کے ذریعے آیا ہے تاکہ میں تمہیں تنبیہ کروں اور ان سب کو جن جن کو یہ پیغام پہنچے ۔

سورۃ اعراف میں ہے :۔

قل یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا الذی لہ ملک السماوات والارض

کہہ دو اے انسانو، میں تم سب کی طرف اس اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہت کا مالک ہے ۔

سورہ فرقان میں ہے :۔

تبارک الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعالمین نذیرا

بڑی بابرکت ہے وہ ذات گرامی جس نے اپنے بندے پر قرآن اتارا تاکہ جہانوں کو ڈرسنانے والا ہو۔

یہ سب مکی سورتوں میں اعلان ہوا ہے ۔ اس سورت میں آخر میں توحید کے ساتھ عموم رسالت کو پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہی حق ہے اور یہی ہدایت کاملہ ہے اور سب کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہی وہ حق ہے ۔ جس کو حضرت ابراہیم وحضرت اسماعیل اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے ماننے والوں نے کھو دیا تھا ۔ اب جس کو میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں ۔

قل للذین اوتوا الکتاب والامیین اسلمتم فان

اسلموا فقد اهتدوا وان تولوا فانما علیک البلاغ

اسے رسول اہل کتاب اور اہل مکہ سے کہدو کہ کیا تم نے اسلام قبول کر لیا۔ اگر انہوں نے قبول کر لیا تو وہ ہدایت پر آگئے۔ اور اگر نہیں کیا تو تمہاری ذمہ داری صرف حق کا پیغام پہنچا دینا ہے۔

بہر حال یہ اس سورت کا آخری پیغام اور پوری تذکیر کا نچوڑ ہے اس لیے اس رکوع میں پہلے توحید کامل کا پورا نقشہ پیش کر کے آخر میں عموم رسالت کی تصویر پیش کی ہے یہی ہدایت نامہ ہے اور یہی ساری سورت کا خلاصہ ہے۔

۱۰۹ اسے اللہ کے رسول کہدو لوگو! تمہارے رب کی جانب سے تمہارے پاس حق آچکا ہے لہذا جو شخص اس کی رہنمائی میں زندگی گذارے گا۔ اس کا فائدہ اسی کو ہوگا۔ اور جو بھٹک جائے گا تو اس کا نقصان خود اٹھائے گا۔ میں اللہ کی جانب سے تمہارے اعمال کا ذمہ دار نہیں ہوں یعنی حق واضح طور پر دلائل و براہین کے ساتھ پہنچ چکا ہے جس کے قبول نہ کرنے کا کوئی معقول عذر کسی کے پاس نہیں ہے۔ اللہ سبحانہ کی آخری حجت بندوں پر قائم ہو گئی ہے اب ہر ایک اپنا نفع اور نقصان سوچ لے۔ جو اللہ سبحانہ کی تبلائی راہ پر چلے گا دنیا و آخرت میں کامیاب ہوگا اور جو اسے چھوڑ کر ادھر ادھر بھٹکتا پھرے گا۔ خود پریشان اور ذلیل و خوار ہوگا۔ اپنے بھلے برے کو خوب سمجھ کر ہر شخص اپنے مستقبل کا انتظام کرے۔ راستہ پسند ہو اختیار کرے پیغمبر کوئی مختار بنا کر نہیں بھیجے گئے جو تمہارے افعال کے ذمہ دار جوابدہ ہوں۔ ان کا کام صرف آگاہ کر دینے اور راستہ بتا دینے کا ہے اس پر چلنا چلنے والے کے اختیار میں ہے [۱]

اس آیت میں غور طلب دو باتیں ہیں۔

ایک من اھتدی الخ یعنی حق کی صداقت کی دعوت کا معاملہ سر تا سر سمجھنے بوجھنے اور سمجھ بوجھ کر اختیار کر لینے کا ہے اس میں نہ تو کسی طرح کی زبردستی ہے اور نہ کسی طرح کی لڑائی جھگڑا۔ تمہاری بھلائی کے لیے ایک بات کہی گئی ہے اگر سمجھ میں آجائے تو مان لو نہ آئے تو نہ مانو۔ اگر مان لوگے تمہارا ہی بھلا ہوگا۔ نہ مانوگے تو تمہارا ہی نقصان ہوگا۔ ہر شخص کو اپنا اختیار ہے چاہے بھلائی کی راہ چلے اور بھلائی کمالے اور چاہے برائی کی

راہ چلے اور برائی کمالے اگر کوئی بھلائی کی راہ چلے گا تو کسی کو کچھ نہ دے گا اور اگر برائی کی راہ چلے گا تو کسی کا نقصان نہ کرے گا۔ اپنی اپنی راہ اور اپنی اپنی چال من عمل صالحاً فلنفسہ ومن اساء فعلیھا۔

دوسرے وما انا علیکم بوکیل اس میں پوری صراحت کے ساتھ واضح کردیا کہ داعی کی حیثیت کیا ہے۔ فرمایا میں داعی اور مذکر ہوں مجھے تم پر وکیل نہیں بنایا گیا ہوں یعنی میرا کام یہ ہے کہ نصیحت کی بات سمجھا دوں یہ نہیں ہے کہ نگہبان بنکر تم پر مسلط ہو جاؤں اور سمجھ لوں کہ مجھے تمہاری ہدایت کی ٹھیکیداری مل گئی ہے۔ دوسری جگہ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے یہی بات اس طرح کہی گئی ہے۔ ما انت علیھم بجبار آپ ان لوگوں پر حاکم جابر کی طرح مسلط نہیں ہیں۔ کہ جبراً و قہراً بات منوالیں نیز فرمایا لست علیھم بمصیطر آپ کو ان لوگوں پر داروغہ نہیں بنایا گیا ہے کہ مانیں نہ مانیں اب ان کو ضرور حق پر چلانے کے ذمہ دار ہیں

نیز متعدد مقامات پر یہ حقیقت واضح کی گئی ہے۔ نبوت کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ سچائی کی پکار ہے۔ حق پہنچانا نصیحت کی بات کرنا ایمان و عمل کے نتائج کی خوش خبری دینا اس سے زیادہ نبوت کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے یہ کس قدر واضح اور صاف راہ ہے اگر دنیا دعوت حق کی یہ روح سمجھ لیتی تو کوئی انسان دوسرے انسان سے محض فکر و عمل کے اختلاف کی وجہ سے برسر پیکار نہ ہوتا۔ افسوس کہ انسان کی سرکشی نے کبھی اس حقیقت کو نہ مانا۔ اور یہی بات سارے جھگڑوں کی بنیاد یہی ملے گی ۔ انبیا کی سیرت اور قرآن میں ان کے واقعات پڑھو ہر جگہ نزاع کی بنیاد یہی ملے گی۔ انبیاء ہمیشہ یہی صدا بلند کرتے رہے ہمارا کام تمہیں نصیحت کرنا ہے ماننا نہ ماننا تمہارا کام ہے۔ اگر نہیں مانتے تو تم اپنی راہ چلو۔ ہمیں اپنی راہ چلنے دو۔ اور نتائج کا انتظار کرو لیکن نبوت کے مخالف کہتے تھے کہ نہ تو تمہاری بات مانیں گے اور نہ تمہیں تمہاری راہ چلنے دینگے نویں پارے میں حضرت شعیب کی سرگذشت میں پڑھ چکے ہو کہ جب ان کی قوم کے سرکشوں نے کہا لنخرجنك یا شعیب والذین امنوا معك اولتعودن فی ملتنا

تو انہوں نے جواب میں کہا او لو کنا کارھین۔

حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم اور انکے مخالفین میں بنا نزاع یہی تھی حضور فرماتے تھے کہ میری راہ تبلیغ و تذکیر کی ہے۔ مخالفین کہتے تھے۔ ہماری راہ جبر و تشدد کی ہے۔ مخالفین کہتے تھے۔ ہماری

راہ جبر و تشدد کی ہے۔ آپ فرماتے اگر میری بات سمجھ میں آجائے تو مان لو نہ سمجھ میں آئے تو ماننے والوں کو ان کی راہ چلنے دو۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری بات تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے تمہیں ماننی ہی چاہیئے نہیں مانو گے تو جبراً منوائیں گے۔

یہاں قرآن نے ما انا علیکم بوکیل کہہ کر اپنے مخاطبوں کو تذکیر اور توکیل کا فرق سمجھایا ہے اور ہر داعی حق کو بتایا ہے کہ تمہارا کام تذکیر ہے توکیل نہیں ہے: تذکیر یہ کہ جس بات کو تم حق سمجھتے ہو اس کی دوسروں کو بھی ترغیب دو اور یہ یاد رکھو کہ ماننے اور نہ ماننے کا اور پسند کرنے اور نہ کرنے کا حق مخاطب کو ہے تم منوانے کے ذمہ دار نہیں ہو اور توکیل یہ کہ ڈنڈا لیکر کھڑے ہو جاؤ اور جو تمہاری بات نہ مانے اس کے پیچھے پڑ جاؤ۔ تم داعی ہو اللہ کی جانب سے ہدایت وضلالت کے ٹھیکدار نہیں ہو۔ جب نبوت کا منصب ہی تذکیر و دعوت ہے تو پھر کسی دوسرے شخص کے لیئے یہ کب روا ہے کہ دعوت کے میدان میں وکیل و جبار بن جائے۔

گویا قرآن نے اپنے مخاطبوں کو اس طرح دعوت کے حدود بتا دیئے ہیں دعوت کے کام میں دو حق ہیں اور ان دونوں کو اپنی اپنی حد کے اندر رہنا چاہیئے داعی کا حق تذکیر و تبلیغ کا ہے جب کہ مدعو کا حق ماننے یا نہ ماننے کا ہے بلاشبہ ہر شخص کو یہ حق ہے کہ جس بات کو وہ حق سمجھتا ہے اسے دوسروں کو بھی سمجھائے۔ لیکن حق کو منوانا اس کا کام نہیں ہے۔ بتانا اس کا حق ہے ماننا یا نہ ماننا مخاطب کا حق ہے۔ آپ جس بات کو حق سمجھتے ہیں یہ آپ کا فرض ہے کہ آپ اسے دوسروں تک پہنچائیں۔ اگر آپ اس میں کوتاہی کریں گے تو اللہ کے حضور جوابدہ ہوں گے۔ یہی تبلیغ و تذکیر ہے اور جوابدہی اس میں ہے کہ تم نے تبلیغ کی باتیں کیں اس میں نہیں کہ مخاطبوں نے مانا یا نہیں مانا۔

قرآن نے ایک ہی فقرے میں معاملہ کے دونوں پہلوؤں کی حفاظت کر کے ان کی حدبندیوں کی ایک لائن کھینچ دی ہے۔ اس نے ایک طرف تذکیر و دعوت پر زور دیا ہے تاکہ حق کی طلب و قیام کی روح پامال نہ ہو۔ دوسری طرف انسان کی شخصی آزادی بھی محفوظ کر دی کہ جبر و تشدد کو راہ نہ مل سکے۔ حدبندی کا یہی پیمانہ ہے اسے اپنی جگہ سے اگر ہٹاؤ گے دونوں میں سے ایک بات ضرور غلط ہو جائے گی۔ اگر دعوت و تذکیر کا قدم آگے بڑھے گا۔ فکری آزادی نہ رہے گی۔ اگر آزادی کے مطالبہ پر زور دو گے تو حق و عدل۔ طلب و قیام کا نظام درہم برہم ہو جائیگا یہ

چودہ سو سال پہلے قرآن نے عرب کے ایک امی کے ذریعے انسان کے بنیادی حقوق کا اعلان کیا ہے۔
مطلب یہ ہو کہ میرے ذمے تمہیں راہ راست پر لانا نہیں ہے میرا کام صرف یہ ہے کہ تمہارے سامنے راہ حق پیش کر دوں۔ اس کے بعد تم اگر گمراہی کو اپنے اختیار اور صواب دید سے اپناؤ تو مجھ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ علامہ آلوسی نے یہ بات اس سے معلوم کی ہے۔
یہ آیت اشارہ کر رہی ہے کہ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کسی کو ایمان پر مجبور نہ کرتے تھے۔ آپ کا فرض تو صرف تذکیر و تبلیغ تھا۔

نبوّت کا کام وحی کی پیروی ہے

۱۰۹ اور اے پیغمبر آپ تو صرف اس چیز کا اتباع کیجئے جو اللہ کی وحی آپ کو بتا رہی ہے اور اللہ کا فیصلہ ہونے تک اس پر ڈٹے رہیئے اللہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ اس میں ان حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی دی گئی ہے کہ اگر یہ لوگ حق قبول نہ کریں تو آپ ان کے غم میں نہ گھلائیں آپ حق تعالیٰ شانہ کے احکام کی پیروی کرتے رہیئے۔ اور تبلیغ وغیرہ کے کام میں لگے رہیئے اور جو شدائد اس کی راہ میں آئیں ان کو برداشت کیجئے۔ مخالفین کی ایذا رسائیوں کا تحمل کرتے رہنا چاہیئے۔ یہاں تک اللہ سبحانہ آپ کے اور ان کے درمیان بہترین فیصلہ کر دے یعنی حسب وعدہ آپ کو منصور و غالب کرے یا جہاد کا حکم بعیجدے تم سورہ یونس علیہ السلام تعالےٰ وفضلہ الحمد علےٰ ذالک[1]

ہمیں اس قسم کی آیت کی تشریح میں یعنی ایک غلط فہمی کو دُور کرنا ہے جو بعضوں کو اس تعلم کی آیات کے سمجھنے میں پیش آتی ہے۔ قرآن میں ایک سے زیادہ جگہ یہ بات دہرائی گئی ہے کہ رسُول کا کام وحی کا اتباع کرنا ہے۔ اس سے بعض کوتاہ بینوں کو یہ دھوکا ہو گیا ہے کہ رسول کا کام صرف وحی الٰہی کی تبلیغ ہے یعنی قرآن پاک کے الفاظ کو بعینہ انسانوں تک پہنچا دینا اس کا کام ہے۔ اور اس کے معانی کی تشریح اور اس کے مطالب کی توضیح نہ رسول کا منصب ہے نہ اس کا اس کو کوئی حق ہے۔ ان کے خیال میں رسول کی حیثیت صرف ایک قاصد اور نامہ بر کی ہے شاندان کو یہ دھوکا اتباع وحی کے حکم کے علاوہ لفظ رسول سے ہی ہوا ہے۔ جس کے لفظی معنے پیامبر اور قاصد کے ہیں۔ لیکن وہ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ قرآن نے جہاں رسول کہا ہے وہاں نبی۔ مبشر۔ نذیر۔ سراج منیر۔ صاحب

[1] افادات شیخ الاسلام

حکمت۔ صاحب خلق عظیم۔ صاحب مقام محمود۔ مجتبیٰ مصطفےٰ ۔مبین معلم۔ ذکی۔ داعی۔ حاکم۔ مطاع۔ امر۔ ناہی بھی تو کہا گیا ہے۔ کیا یہ اوصاف و القاب صرف ایک نامہ بر اور قاصد کے ہیں۔ اس کے پیغام کے مفہوم اور مطالب کی تشریح وتفسیر کا آج تو ہر عربی دان کو حق حاصل ہے اور اس کی اصل حقیقت تک پہونچ جانے کا ہر مدعی کو دعویٰ ہے مگر خود صاحب وحی کو وحی کے وقت نہ مفہوم و معنی کا علم تھا اور نہ اس کی تشریح کا اسے حق تھا۔ ان ھذا الا من اعاجیب الزمن

وہ اپنے اس اشتباہ کو اس انداز میں ہی پیش کرتے ہیں کہ اسلام میں شرع اور وضع قانون کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیئے تسلیم کیا گیا ہے۔ اگر رسول کے لیئے بھی وحی کتابی سے الگ شرع سازی کا حق تسلیم کر لیا جائے تو یہ اتباع وحی کے منافی ہونے کے ساتھ ایک اور شارع کو تسلیم کر لینا ہے۔

اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ ہم رسول کو شارع نہیں بلکہ شارح مانتے ہیں اور اجتہاد کو مثبت نہیں مظہر مانتے ہیں کیا عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر جج صاحب حکومت کے قانون کی تشریح کرتا ہے تو وہ اپنے اس عمل سے سلطان وقت بن کر قانون سازی کا منصب حاصل کرتا ہے یا صرف قانون کے مفہوم کا شارح ہوتا ہے۔ یہی حیثیت آسمانی عدالت کے اس قاضی کی ہے۔ جس کو ہم نبی رسول معلم۔مبین کہتے ہیں ۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ اپنے ہر پیام اور مقصد اور مفہوم اور فیصلہ سے صرف وحی کے اسی طریقہ خاص کے ذریعے اپنے رسول کو مطلع نہیں کرتا جو طریقہ قرآن کی وحی کے لیئے ہے بلکہ وحی کی تینوں قسموں میں سے کسی بھی طریق سے اپنی بات کو رسول تک پہنچا دیتا ہے۔ اور ان میں ہر طریق کی وحی کی طاعت تمام امت پر لازم ہے خواہ وہ وحی ہو جو الفاظ الٰہی کی قید کے ساتھ آئی ہو۔ جس کو قرآن کہتے ہیں یا ربانی مفہوم و معنی رسول کے الفاظ میں ادا ہوں جس کو حدیث و سنت کہتے ہیں۔ الغرض خواہ وہ کتاب الٰہی کے ذریعے ہو یا حکمت ربانی کے فیض سے ہو۔

لیکن دونوں کی وحی میں فرق ہے۔ وحی تو دونوں ہیں مگر چونکہ قرآن حکیم وحی ہونے کے ساتھ اپنے اندر شان اعجاز اور اس کے الفاظ میں شان تعبد ہے اس لیئے اس کی روایت باللفظ ہے برخلاف کے سنت کے چونکہ معجزہ نہ تھی اور نہ اس کے لفظوں میں شان تعبد تھی۔ اس لیئے اس کے الفاظ نہیں بلکہ معانی و مطالب آپ پر نازل ہوتے تھے اور اس کو آپ اپنے لفظوں میں مخاطبوں کے

احوال اور تقاضوں کے مطابق پیش فرماتے تھے۔ بالفاظ دیگر قرآن و سنت میں وہی فرق ہے۔ جو اردو زبان میں نامہ اور پیام میں ہوتا ہے۔ یہ فرق حافظ جلال الدین السیوطی نے الاتقان فی علوم القرآن میں امام الحرمین کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

اللہ سبحانہ کی جانب سے نازل شدہ کلام دو قسم کا ہے ایک قسم یہ کہ اللہ سبحانہ حضرت جبریل سے فرمائیں کہ ہمارے رسول کو ہمارا یہ پیغام پہنچا دو کہ اللہ سبحانہ فرماتا ہے کہ فلاں کام کرو ایسے کرو۔ حضرت جبریل حضرت حق سبحانہ کا پیغام سنتے ہیں۔ بعد ازیں حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لاتے ہیں اور اللہ سبحانہ کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ بات اللہ سبحانہ کی ہوتی ہے۔ اور تعبیر حضرت جبریل کی۔ قال ما قال ربه ولم تكن العبارة تلك العبارة۔ اس کی اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بادشاہ اپنے معتمد سے کہے کہ فلاں شخص سے کہو بادشاہ کہتا ہے کہ کام ٹھیک کیا کرو۔ اس پیغام کو اگر قاصد یوں پہنچا دے سستی مت ہو محنت کرو۔ تو تعبیر کے اس اختلاف سے ادائے پیغام میں کوئی فرق نہ آئے گا اور اسے فرض رسالت میں کوتاہی نہ کہیں گے۔ دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ سبحانہ حضرت جبریل سے کہیں کہ یہ خط ہمارے رسول کو جا کر دو اس کے سامنے پڑھو۔ حضرت جبریل تشریف لاتے ہیں اور بلاکم و کاست اور بغیر ردو بدل خط آکر سناتے ہیں۔ اور ان کے سامنے پڑھ دیتے ہیں۔

حافظ جلال الدین السیوطی فرماتے ہیں کہ پہلی قسم سنت اور دوسری قسم قرآن ہے اور امام الحرمین کے نظریہ کی تائید میں لکھتے ہیں " میں نے سلف سے اس کی تائید دیکھی ہے۔ غالباً اسی جوہری فرق کی وجہ سے قرآن نے اتباع وحی اور تلاوت وحی میں فرق کیا ہے۔ قرآن میں دو قسم کے حکم ہیں کہیں وحی الٰہی کی اتباع پر زور دیا گیا ہے جیسے زیر تشریح آیت میں اور کہیں وحی کی تلاوت کا حکم ہے۔ جیسے اتل ما اوحی الیک من الکتاب مگر قرآن نے ان دونوں میں فرق کیا ہے۔ قرآن میں جہاں وحی کی تلاوت کا حکم دیا گیا ہے۔ ما اوحی کے ساتھ الکتاب کی قید ضرور لگا دی ہے۔ مثلاً اتل ما اوحی الیک من کتاب ربک اور اسی قسم کے دوسرے مقامات۔ لیکن جہاں وحی کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے وہاں لفظ کتاب کی قید ہٹا دی گئی ہے۔ اوروں کا پتہ نہیں میں اس

اس سے یہی سمجھتا ہوں کہ قرآن اپنے مخاطبوں کے ذہن و دماغ میں یہ بات اتارنا چاہتا ہے کہ وحی جو ذات نبوت پر آئی ہے وہ قرآن ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ قرآن کے باہر بھی وحی ہے۔ کتابی وحی کی تلاوت کی جاتی ہے اس کے لفظوں میں شان اعجاز کے ساتھ شان تعبد بھی ہے غیر کتابی وحی کی اتباع کی جاتی ہے گویا تلاوت الفاظ میں تعبد کی وجہ سے کتابی وحی کی خصوصیت ہے۔ اور اتباع کا دائرہ کتابی وحی اور غیر کتابی وحی کے لیئے عام ہے۔

آخر میں ارشاد ہوا واصبر حتی یحکم اللہ وھو خیر الحاکمین۔ حافظ ابن کثیر نے معنے بتا یئے ہیں کہ جو لوگ آپکی مخالفت کر رہے ہیں ان کی مخالفتوں کو سہتے جایئے۔ یہی معنے علامہ آلوسی نے کئے ہیں لیکن کچھ علماء نے معنے یہ بتائے ہیں کہ اللہ سبحانہ کی طاعت پر جمے رہیئے ابوحیان اندلسی نے آیت کے معنے یہ بتلائے ہیں کہ اللہ کی طاعت پر ڈٹے رہیئے نبوت کی ذمہ داری کا بوجھ برداشت کیجیئے اور فرائض رسالت کی ادائیگی میں حالات کا مقابلہ تن کر کیجیئے۔ آگے صبر کی غایت جو بتائی ہے اس سے حافظ ابن کثیر کے معنے کی تائید ہوتی ہے۔ ظاہر ہے طاعت کے لیئے حتی یحکم اللہ غایت نہیں تکالیف برداشت کرنے کے لیے یہ غایت ہو سکتی ہے۔ یعنی یہاں تک اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق آپ کی مدد ہے اور آپ کو مخالفین پر غلبہ حاصل ہو۔ یہ مکی زندگی میں دعوتی اور فکری جہاد اور اس پر محنت کے نتائج کا ذکر ہے یعنی اس دور میں لوگوں کے سامنے اسلام کو دلائل کی قوت کے ساتھ مسلح کر کے پیش کیا جا رہا تھا۔ لوگوں کے سامنے اس کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی کی جا رہی تھی اور ان کے ذہن کی گرہیں کھولی جا رہی تھیں اسی کو قرآن نے اللہ کی مدد کہا ہے۔ اللہ کے مددگار بننے کا فیصلہ اس وقت ہوتا ہے جب دین کی دعوت اپنی عام تبلیغ و تفہیم سے گزر کر شدید مخالفتوں کی زد میں آجاتی ہے اس وقت کہا جاتا ہے واصبر حتی یحکم اللہ اسی کا نام جہاد کبیر ہے۔

اس پارے کی تفسیر یہیں ختم کرتا ہوں آیندہ بارہواں پارہ سورہ ہود سے شروع ہوگا۔ اس پارے کی تفسیر میں یہ آخری سطریں ہیں جو اس کوتاہ علم اور کمترین عمل کے قلم سے سات سو تہتر ۷۷۳ صفحات کے سپرد ہوئی ہیں۔ جو باتیں صحیح ہیں وہ اللہ سبحانہ کا فضل و انعام ہیں۔ اور جو غلط یا کمزور ہیں وہ میری کم علمی کم فہمی اور نادانی کا نتیجہ ہیں۔ اللہ سبحانہ سے دعا ہے وہ فرمائے

پارہ نمبر ۱۱

کہ میری کوتاہیوں کو معاف فرمائے اور اپنی باتوں کے لئے قبولیت کے دروازے کھولدے
رب تقبل منی معالم القران انك انت السمیع العلیم وصلی الله
علی خیر خلقه محمد واله اجمعین برحمتك یا ارحم الراحمین